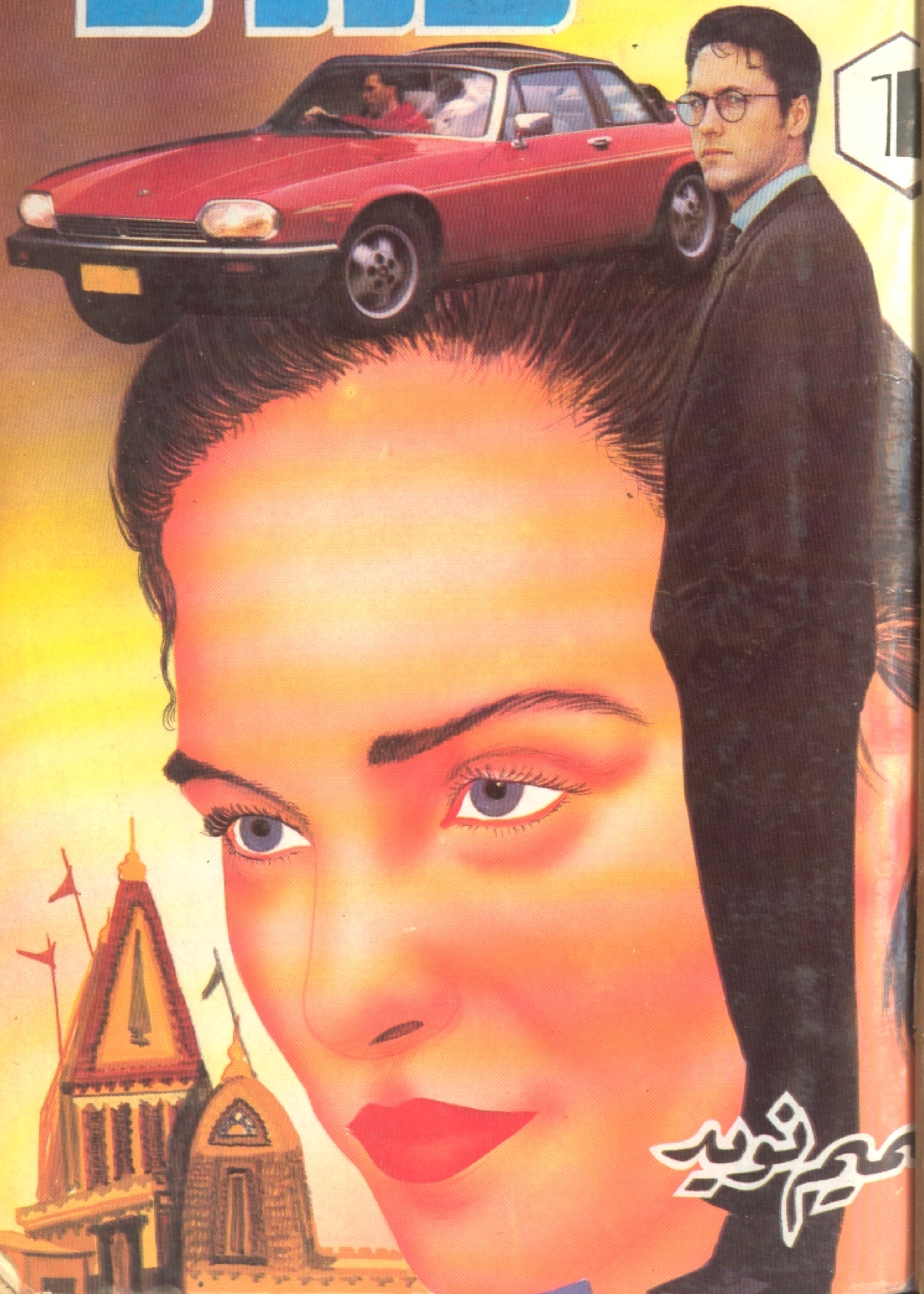
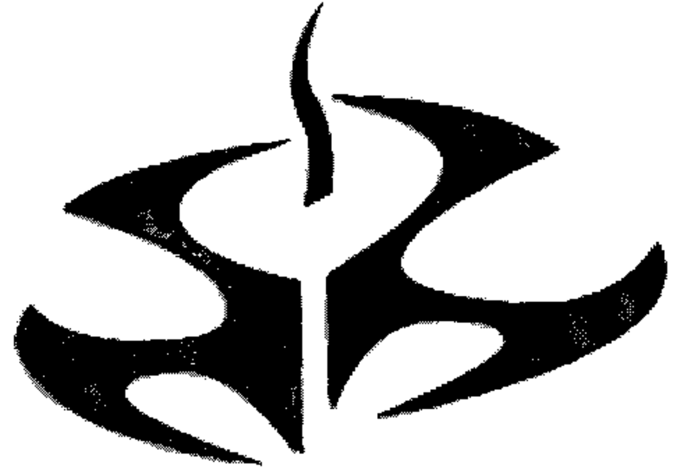
طارنوش

قت پر حیران و پریشان رہنے والا "طارنوش"
ایک حفاظتی خوشبو حصار میں لئے رہتی تھی۔





Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

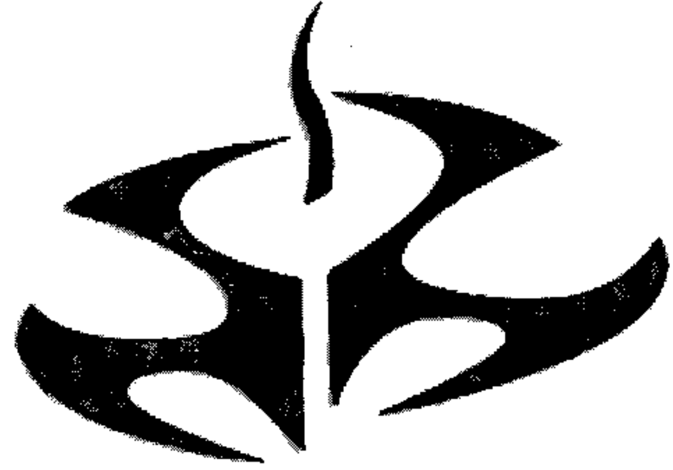
ایک پراسرار وجود کی تہلکہ خیز سرگزشت
ایک بے مثال خودنوشت

طارنوش

حصہ اوّل

شمیم نوید

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون:7248599-7229762



Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

11 - عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور فون:7229762-7248599

پیش لفظ

ہم نے اب تک متعدد پراسرار سلسلہ وار ناول لکھے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی اور اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ پڑھنے والوں نے ہمیں پسند کیا اور پذیرائی ملی۔

اس ضمن میں لکھے جانے والے دیگر ناول سے یہ ناول ذرا مختصر ہے۔

ہم اپنے وطن عزیز کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس نسبت سے یہ ناول خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کا پس منظر تحریک آزادی ہے۔ انگریزوں نے ہمیں اپنا غلام بنائے رکھنے کے لئے کیا کیا سازشیں کیں اور آزادی کے متوالوں نے ان کا توڑ کس طرح کیا' جگہ جگہ اس ناول میں آپ کو اس کے تاریخی شواہد ملیں گے۔ کہانی کی بنت میں خاص طور پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ دلچسپی کا عنصر کہیں کم نہ ہو' پراسرار ہونے کے باوجود بھی تحریر بے مقصد نہ رہے۔

کتابی صورت میں یہ ناول پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یکجا طور پر اس کا مطالعہ آپ کے ذوق اور معیار پر پورا اترے گا۔

اس مختصر مگر بھرپور ناول کے بارے میں مزید کچھ لکھ کر ہم آپ کے تجسس کو کم کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ہماری یہ کاوش آپ کو سکون اور معیاری تفریح فراہم کر سکے تو اسے ہم اپنی کامیابی تصور کریں گے۔

طالب دعا

شمیم نوید
کراچی



اس وقت میری عمر مشکل سے بارہ سال ہوگی جب پہلی بار مجھے وہ پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا۔ میں ممی اور ڈیڈی کے ساتھ گرجا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ممی نے مجھ سے کمرے میں جاکر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کہا تھا۔ کپڑے بدل کر میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کسی نادیدہ وجود نے میرا راستہ روک لیا ہو۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رک گیا اور مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی لمحے ایک نسوانی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی "تمہیں گرجا نہیں جانا!۔ تم گرجا نہیں جاؤ گے!" سرگوشی میں حکم تھا۔

میں اسی تحکمیہ سرگوشی کے زیر اثر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا مگر یہ میرا اختیاری فعل نہیں تھا۔ میں بڑبڑا رہا تھا۔ "میں گرجا نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔"

سرگوشی کا سحر ٹوٹا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ سرگوشی کرنے والی آواز کا سایہ جیسے ابھی تک میرے اوپر محیط تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ میں کمرے میں اکیلا تھا اور میرا جسم نمایاں طور پر کانپ رہا تھا۔

"بیٹا! گرجا جانے کو دیر ہو رہی ہے۔" ممی کی آواز میں نے سنی اور میرا خوف کم ہونے لگا۔ وہ مجھ سے جلدی آنے کا کہہ رہی تھیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کس طرح خود کو سنبھالا اور کانپتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرے سے باہر آنے تک میرا خوف خاصا کم ہو چکا تھا۔

"ارے! تمہارا چہرہ کیوں پیلا پڑ رہا ہے؟" مجھ پر نظر پڑتے ہی ممی حیرت سے بولیں۔ "کیا ہوا تمہیں؟"

"کک۔ کچھ۔ نہیں۔ کچھ نہیں ممی!" میں مشکل سے کہہ سکا۔

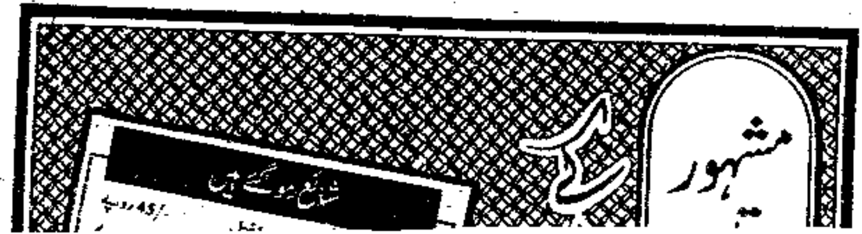
"لگتا ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ڈیڈی میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

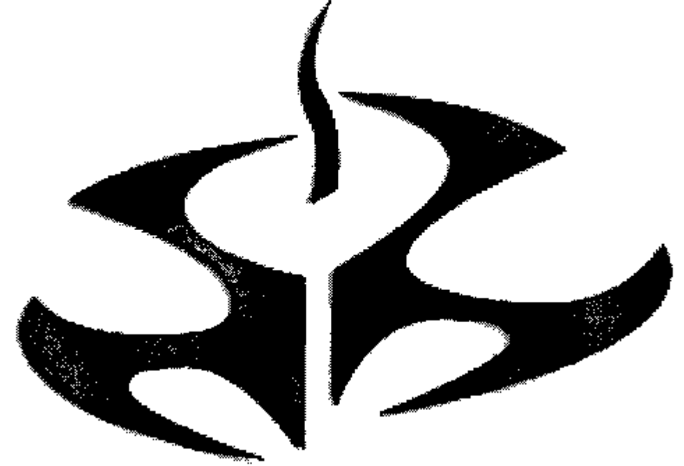
"مگر یہ پچھلے اتوار کو بھی ہمارے ساتھ گرجا نہیں گیا تھا۔ اب یہ بڑا ہو گیا ہے اور اسے۔۔۔"

"نہیں!" ڈیڈی نے ممی کی بات کاٹ دی۔

ڈیڈی شاید کچھ اور بھی کہنے والے تھے کہ میں ہمت کر کے بول اٹھا۔ "آپ چلی جائیں ممی!۔ میں گھر ہی میں رہوں گا۔"

گھر میں رہنے کا مطلب گرجا جانے سے انکار ہی تھا۔ اپنے انکار پر میں نے ڈیڈی کے چہرے کا رنگ جاتے کہیں





نتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے پر غصے کے بجائے شرمندگی
ے سے آثار تھے۔ انہوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی' پھر اپنے
لے میں پڑی ہوئی سونے کی چھوٹی سی صلیب پر ہاتھ پھیرا اور
ں کو مخاطب کیا۔ "اسے گرجا چلنے پر مجبور نہ کرو۔ یہ بات
یک نہیں ہے۔"

"کیوں ٹھیک نہیں ہے؟" ممی تیز آواز میں بولیں۔

"اس وقت یہ بحث نہ کرو' ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"
ڈی ناگواری سے کہنے لگے۔ "کیوں ٹھیک نہیں؟ تمہارے
ں سوال کا جواب میں دے دوں گا مگر اس وقت نہیں۔ آؤ
و!" انہوں نے یہ کہتے ہوئے ممی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ممی نے آواز دے کر ملازم کو بلایا اور میرا خیال رکھنے کے لیے اس سے کہہ کر ڈیڈی کے ساتھ چلی گئیں۔

اس روز کے بعد معلوم نہیں ڈیڈی نے ممی کو کیا سمجھایا کہ انہوں نے پھر کبھی مجھ سے گرجا چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے بائبل پڑھنے کی تاکید کرنا بھی چھوڑ دی۔ میرے لیے ان کے رویے میں یہ تبدیلی خاصی حیران کن تھی۔ بہرحال مجھے ایک بوجھ سے نجات مل گئی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے ممی اور ڈیڈی کے ساتھ گرجا جانا بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ اس وقت میں نہیں سمجھ سکا۔ اس وقت کیا' برسوں یہ راز میرے لیے راز ہی رہا۔

اب تک مجھے گھر پر ہی تعلیم دی جاتی رہی تھی۔ میرے ٹیوٹرز میری طرف سے بہت مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے براہِ راست چھٹی کلاس میں داخلہ مل سکتا ہے۔ میری تعلیمی اہلیت کے بارے میں میرے ٹیوٹرز کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ مجھے چھٹی کلاس میں داخلہ مل گیا۔ ڈیڈی نے مجھے ایک مشنری اسکول میں داخل کرایا تھا۔ جلد ہی میرا شمار اسکول کے ذہین طلبہ میں ہونے لگا۔ کتابیں تو مجھے پہلے بھی عزیز تھیں اور اب بھی میں محنت سے پڑھ رہا تھا' مگر اسکول کا ماحول قطعی پسند نہیں تھا۔ دوسری بات جو میرے لیے الجھن کا سبب تھی' میرا نام تھا۔ اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلے مجھے یہ صورتحال پیش نہیں آئی تھی۔ جو پہلی مرتبہ میرا نام سنتا' اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرتا۔ اسکول میں داخل ہونے کے بعد پہلے ہی دن میرے کلاس ٹیچر نے بھی دو مرتبہ میرا نام پوچھا تھا۔ جیسے انہوں نے جو کچھ سنا ہے' اس کی تصدیق چاہتے ہوں۔ اب خود مجھے بھی اپنا نام اجنبی سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میرے جتنے کلاس فیلو تھے ان میں سے کسی کا نام بھی مجھ سے ملتا جلتا نہیں تھا۔ اس الجھن سے تنگ آکر میں نے ایک دن ممی سے پوچھ ہی لیا۔ "میرا یہ نام آپ نے رکھا تھا یا ڈیڈی نے؟ کس نے رکھا تھا میرا نام؟"

یہ کوئی ایسا سوال نہیں تھا کہ ممی ایک دم چونک اٹھتیں مگر ہوا یہی تھا۔ "تم۔ تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟" انہوں نے بھی سے سوال کر دیا۔

"اس لیے پوچھ رہا ہوں ممی کہ میرا نام سن کر لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں' مجھ سے اس کا مطلب بھی پوچھتے ہیں' میں کیا جواب دوں۔ بتائیں؟۔ کیا مطلب ہے اس نام کا؟۔ اور ایسا نام کیوں رکھا ہے آپ نے؟"

"میں نے نہیں رکھا یہ نام اور نہ مجھے اس کا مطلب معلوم ہے۔" ممی کے چہرے سے خلافِ توقع گھبراہٹ سی ظاہر ہونے لگی۔ اسی وقت ڈیڈی آگئے اور انہوں نے مجھے پیار کیا۔ ڈیڈی کی آمد سے ممی کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ انہوں نے اپنی بلا ڈیڈی کے سر ڈال دی اور بولیں۔ "یہ کچھ پوچھ رہا ہے۔"

"کیا بات ہے بیٹے؟ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر محبت سے کہا۔

پھر جب میں نے اپنا سوال دہرایا تو ان کی کیفیت بھی ممی سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی چونک اٹھے تھے۔

چند لمحے ڈیڈی خاموش رہے' پھر کہنے لگے۔ "لوگوں کی باتوں کا اثر نہ لیا کرو بیٹے! لوگ تو ہر بات میں کیڑے نکالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارا نام منفرد ہے اور یہ نام۔ میرے ایک پادری دوست نے رکھا تھا۔ اس کا مطلب کیا ہے؟۔ میں نہیں پوچھ سکا۔ ویسے کوئی اچھا ہی مطلب ہوگا۔ تم۔ تم ایسی فضول باتوں میں مغز نہ کھپایا کرو۔ ٹھیک ہے نا بیٹے!" انہوں نے پیار سے میرا رخسار تھپتھپایا۔

"جی بہتر ہے ڈیڈی!" کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی مگر ڈیڈی کی بات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ جانے کیوں مجھے ڈیڈی کی بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی میرا عجیب و غریب نام ان کے کسی پادری دوست نے رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ڈیڈی پر جھوٹ بولنے کا شبہ ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو ممی اور ڈیڈی مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ یہ احساس اس وقت اور شدید ہو گیا جب ڈیڈی کا ایک دوست کلکتے سے دہلی آیا۔ وہ ہمارے ہی گھر ٹھہرا تھا۔ اس کی نظر جب پہلی بار مجھ پر پڑی تو حیرت سے بولا "ارے یہ اتنا بڑا ہو گیا!"

"ہاں۔" ڈیڈی مسکرا کر بولے۔ "پہلے جب تم نے اسے دیکھا تھا تو یہ صرف دو سال کا تھا۔"

ڈیڈی اور ان کا وہ پرانا دوست شام کی چائے پی رہے تھے۔ میں جب کچھ دیر بعد اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا تو ڈیڈی کے دوست نے دھیمی آواز میں ڈیڈی سے کہا۔ "ڈیسوزا! کم سے کم اس کا نام تو بدل دیا ہوتا!"

"آہستہ بولو!" ڈیڈی کی سرگوشی ابھری۔ "کہیں وہ نہ سن لے! وہ بہت حساس لڑکا ہے اور نام کے معاملے میں تو بہت ہی زیادہ حساس ہے۔"

میرا جی چاہا کہ ان دونوں کی باتیں چھپ کر سنوں' مگر وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی' مجبوراً مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا جہاں ان دونوں کی آوازیں پہنچنا ممکن نہیں تھیں۔

ڈیڈی کا وہ دوست ایک ہفتے ہمارے یہاں رہا۔ اس دوران میں ایک اور ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ وہ ممی سے باتیں کر رہا تھا اور میں ذرا فاصلے پر تھا۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا' مگر میں نے اس کا جملہ سن ہی لیا تھا۔ اس نے ممی سے کہا تھا "تم لوگ کیسے عیسائی ہو کہ اسے اپنے ساتھ گرجا بھی نہیں لے جاتے! اس طرح تو ایک دن یہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

جواباً ممی بولی تھیں۔ "تم جانتے ہو کہ ہم بے۔ ہم۔ ہمارے لیے وہی سب کچھ ہے اور۔ اور ہم اسے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر حال میں خوش!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ممی کی آواز قدرے بھرا گئی تھی۔

وہ مزید کچھ کہنے والا تھا مگر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس کا منہ کچھ کہنے کے لیے کھل کر پھر بند ہو گیا۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ پھر ممی اور وہ شخص بھی وہیں آگیا۔ ملازمہ میز پر کھانا لگانے لگی۔ ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں تھے۔

ایک ہفتے ہمارے گھر رہ کر وہ شخص چلا گیا' مگر ذہنی طور پر مجھے پریشان کر گیا۔ آخر اسے اس بات سے کیا دلچسپی تھی کہ میں گرجا کیوں نہیں جاتا یا ڈیڈی نے میرا نام کیوں نہیں بدلا؟ نام بدلنے سے اس کا کیا مطلب تھا؟ یہ اور ایسے بہت سے سوال میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے اور میں بے چین ہو جاتا۔ میں کس سے ان سوالوں کے جواب پوچھتا!

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے میں نے اپنے اندر ایک واضح تبدیلی محسوس کی۔ ہر چند کہ میں ایک مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اسکول میں یہ میرا آخری سال تھا' مگر اسکول کے مذہبی ماحول اور مذہبی تعلیم نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت تحریک اپنے عروج پر تھی۔ حکمران عیسائی تھے اور میری پرورش بھی ایک عیسائی گھرانے ہی میں ہوئی تھی لیکن میرا جھکاؤ ان کی طرف نہیں تھا' میری ہمدردیاں عیسائیوں کے ساتھ نہیں تھیں۔ بہ ظاہر مجھے اس کا ایک ہی سبب نظر آتا تھا۔ میں نے گزشتہ ایک سال کے دوران میں کئی سیاسی جلسوں میں شرکت کی تھی اور یہ جلسے حکمران طبقے کے خلاف تھے۔

میں سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا ہوں' یہ بات ڈیڈی سے چھپی نہ رہ سکی۔ میں آخر کب تک رات کو دیر سے گھر آنے کے لیے بہانے بناتا! میں اس روز ایک ایسے جلسے میں شرکت کرکے آرہا تھا جس میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی پرجوش تقریر کی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو دلائل دیے تھے اور جو حقائق بیان کیے تھے' ان کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔

ڈیڈی اس وقت تک میرے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ میں ان کے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے بچ کر گزر رہا تھا کہ انہوں نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ان کے کمرے میں چلا گیا۔

"جی ڈیڈی!" میں بولا اور نظریں جھکا لیں۔ میری حالت اس وقت کسی ایسے چور کی سی تھی جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

"کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟" ان کی آواز میں خلافِ توقع قدرے سختی تھی۔

"ولیم کے گھر۔"

"جھوٹ مت بولو!" انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "وہ تو خود یہاں آیا تھا۔ آج تم اسکول بھی نہیں گئے!"

ولیم میرا کلاس فیلو تھا۔ کبھی کبھار ہم دونوں مل کر اسٹڈی کر لیتے تھے۔ کبھی وہ میرے گھر آجاتا اور کبھی میں اس کے گھر چلا جاتا۔ ڈیڈی بھی اسے جانتے تھے۔ میں نے اسی لیے اس کے گھر سے آنے کا بہانہ کیا۔ اسی غرض سے میں کتابیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ میرا جھوٹ نہ کھلے

مجھے کیا خبر تھی کہ وہ کمبخت آج خود میرے گھر آکر بھانڈا پھوڑ دے گا۔ یہ اطلاع بھی اسی سے ڈیڈی کو مل سکی تھی کہ آج میں اسکول ہی نہیں پہنچا۔ دراصل دن کے وقت آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ تھا۔ اسکول جانے کے بجائے میں اس جلسے میں چلا گیا تھا۔

"بولو خاموش کیوں ہو؟ جواب دو میری بات کا۔ کہاں سے آرہے ہو؟ اور آج اسکول کیوں نہیں گئے؟" ڈیڈی نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کردی۔

"...ں سے پوچھ لو' بتا دے گا۔ اس میں اتنے ناراض ہونے کی کیا بات ہے!" ممی بول اٹھیں اور انہوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

"تم اس کی حمایت مت لو! نرمی ہی نے تو اسے بگاڑ دیا ہے۔ تمہیں کچھ نہیں معلوم کہ یہ کیا کرتا پھر رہا ہے! اگر بتا دوں تو حیران رہ جاؤ گی۔ یہ۔ یہ تمہارا لاڈلا حکومت کے خلاف ہونے والے سیاسی جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔"

"نہیں!" ممی بے یقینی سے بولیں۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی نے غلط اطلاع دی ہوگی۔"

"مجھے غلط اطلاع ملی ہوگی! تم تو یہ نہ کہو' تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے۔ مجھے تو غلط خبر مل ہی نہیں سکتی۔"

ڈیڈی کی یہ بات سن کر میں چونک اٹھا۔ مجھے صرف اتنا علم تھا کہ ڈیڈی ایک بڑے سرکاری افسر ہیں' لیکن ان کی ذمے داریاں کیا ہیں اور وہ کس محکمے سے وابستہ ہیں' میں نے یہ کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ پھر ڈیڈی نے مزید جو کچھ کہا' اس سے میں بڑی حد تک یہ بات سمجھ گیا کہ حکومت کے کس محکمے سے ان کا تعلق ہو سکتا ہے! یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ آج میرا کلاس فیلو ولیم اگر میرے گھر نہ بھی آتا تو بھی ڈیڈی کو میری آج کی مصروفیت کا علم ہو جاتا۔

"تمہارے لاڈلے پر مجھے بہت دن سے شک تھا۔" ڈیڈی نے کہا۔ "میں نے اس کی کتابوں کے درمیان' جس روز حکومت دشمن اخبار "ہمدرد" دیکھا تھا اسی دن میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ یہ اخبار حکومت کے ایک باغی لیڈر کا ہے اور اس لیڈر پر بہت جلد بغاوت کا مقدمہ۔" ڈیڈی کچھ کہتے کہتے رک گئے اور میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ ڈیڈی جس باغی لیڈر کا ذکر کرتے کرتے رک گئے تھے' یہ وہی لیڈر تھا جس کی پُر اثر اور سحر انگیز شخصیت نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ آج رات میں اسی لیڈر کی تو تقریر سن کر آرہا تھا۔ ہمدرد اخبار اسی لیڈر محمد علی جوہر کا تھا جس کی ایک ایک بات

میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ ذرا توقف کے بعد ڈیڈی پھر بولنے لگے۔ ممی تصویر حیرت بنی ہوئی ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ "اس کے لچھن دیکھ کر میں نے اپنے محکمے کے لوگوں سے اس کی نگرانی شروع کرادی۔ ان کی تفصیلی رپورٹ مجھے آج ہی ملی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو نوجوان آیا تھا' اس کا تعلق بھی میرے محکمے سے ہے۔ اس کی رپورٹ کے مطابق اس وقت بھی یہ اسی باغی لیڈر کے جلسے میں سے شرکت کرکے آرہا ہے۔"

ممی کے لیے یقیناً یہ انکشافات قطعی غیر متوقع تھے۔ ان کے چہرے سے حیرانی اور ملال دونوں ہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب جب کہ کوئی بات راز نہیں رہی تھی' میرا خاموش رہنا بھی بے سود تھا۔ میں نے سوچا کہ ڈیڈی چاہے جو کچھ سوچیں اور جو چاہے کہیں' میں اپنے دل کی بات ضرور کہوں گا۔

"ڈیڈی!" میں آہستہ سے بولا "آپ جس شخص کو باغی کہہ رہے ہیں' وہ باغی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی قوم کا نجات دہندہ ہے۔ کبھی آپ۔ آپ بھی اس کی تقریر سنیں گے تو۔ تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ وہ دلائل اور ثبوت کے ساتھ بات کرتا ہے۔ وہ۔ وہ سچا ہے ڈیڈی! ہم۔ ہم بھی تو ہندوستانی ہیں! وہ ہمارے ہی لیے تو جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ ملک ہمارا ہے انگریزوں کا نہیں اور۔ اور اگر ہم انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو۔ تو یہ ہمارا حق ہے!" میں نے رک رک کر اور بڑی ہمت کرکے وہ باتیں کردیں' جو میرے دل میں تھیں۔

اس دوران میں ڈیڈی مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میں ان کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔ وہ نہیں ہوں جس کی انہوں نے پرورش کی ہے۔ ان کے چہرے سے انتہائی دکھ کا اظہار ہونے لگا۔ پھر جب وہ بولے تو ان کی آواز بھاری اور بھرائی ہوئی سی تھی۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ۔ کہ تم اس حد تک آگے بڑھ چکے ہو' تم۔ اتنے بگڑ چکے ہو!۔ تم میری زندگی بھر کی کمائی ہو۔ میں۔ میں تمہیں ضائع نہیں ہونے دوں گا! تمہیں نہیں معلوم میرے بچے! تم۔ تم نہیں جانتے کہ تم جن لوگوں کے پیچھے جا رہے ہو' وہ۔ وہ تمہیں موت کی اندھیری وادیوں کی طرف لے جائیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ ڈیڈی میری باتیں سن کر انتہائی برہم ہو جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کے جذباتی اور دکھی لہجے نے میرے دل پر بڑا اثر کیا تھا۔ میں انہیں دلگرفتہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس حد تک وہ یقیناً درست کہہ رہے تھے کہ میں جس راستے پر چل نکلا تھا وہ دار و رسن کو جاتا تھا۔ فرق صرف

اتنا تھا کہ میرے نزدیک وہ قربانی تھی اور ڈیڈی کے خیال میں موت کی اندھیری وادیاں!

ڈیڈی کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے چہرے سے انہوں نے شاید یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اندر سے پگھل رہا ہوں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور میں خود کو مجرم تصور کر رہا تھا۔ نادانستگی میں ہی سہی' میں نے ان کا دل دکھایا تھا۔ اس احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

اسی وقت ڈیڈی کی آواز پھر ابھری۔ "آؤ!۔ آؤ میرے بچے! میرے سینے سے لگ جاؤ!۔ تم نے اب تک لاعلمی میں جو کچھ کیا اسے میں نے معاف کیا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ ان راہوں پر چلنے سے گریز کرو گے۔ یہ راہیں ہمیں جدا کر دیں گی۔ اور سنو! تم نے جو کچھ کہا' ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں بھی اس سے متفق ہوں مگر۔ مگر میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ۔ کہ ایک یقینی موت کو قبول کرلوں اور۔ اور اس طرح تمہارے مستقبل کو بھی تاریک کر دوں۔ میں۔ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ میرے پیروں میں مجبوریوں کی زنجیر پڑی ہے۔"

ڈیڈی کے آخری الفاظ ختم ہونے تک میں ممی کے پاس سے اٹھا اور ڈیڈی کے سینے سے لگ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور ڈیڈی کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی میرے شانے بھگو رہے تھے۔ ممی بھی رونے لگیں۔

آنسوؤں میں دلوں کا سارا غبار بہہ گیا۔ اس روز مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ ممی اور ڈیڈی سے میں کتنی محبت کرتا ہوں۔ انہوں نے میرے پیروں میں اپنی محبت کی زنجیر ڈال دی تھی اور یہ زنجیر میرے لیے سرمایۂ حیات تھی۔ میں نے انہی جذبات کے زیر اثر ڈیڈی اور ممی سے وعدہ کرلیا کہ اب حکومت کے خلاف منعقد ہونے والے کسی جلسے میں شرکت نہیں کروں گا۔ ڈیڈی نے یہ اعتراف کرکے کہ وہ بھی میرے خیالات سے متفق ہیں' میرے جذبۂ بغاوت کو تھپکی دے کر سلا دیا تھا۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر مجھے وہی پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ وہی نسوانی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو برسوں پہلے میں نے سنی تھی اور ڈر گیا تھا۔ سرگوشیوں میں مجھ سے کہا جا رہا تھا۔ "تم نسلاً عیسائی نہیں ہو۔ تمہیں اسی لیے برسوں پہلے گرجا نہ جانے کی تاکید کی گئی تھی۔ تم کون ہو؟ رفتہ رفتہ تمہیں اس سوال کا جواب خود بہ خود ملتا جائے گا۔ ابھی سب کچھ جان لینے کا وقت نہیں آیا۔ تم اسے برداشت نہیں کرپاؤ گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر خود تمہارے وجود کے اسرار کھلتے جائیں گے۔"

جس وقت مجھے یہ سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں' ایک لطیف سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی خوشبو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ممکن ہے کہ جب بارہ سال کی عمر میں پہلی بار مجھے یہ پُراسرار سرگوشی سنائی دی تھی' اس وقت بھی یہ مخصوص خوشبو میرے کمرے میں پھیلی ہو اور میں اسے خوف کے سبب محسوس نہ کر سکا ہوں۔ میں اس خوشبو کی کوئی وضاحت نہیں کر سکتا' ہاں یہ ضرور علم ہے کہ اس نے میرے احساس پر ایک خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ سرگوشیاں ختم ہوتے ہی وہ خوشبو معدوم ہو گئی تھی۔ اس بار بھی مجھے خوف تو اب بھی آیا تھا مگر اتنا نہیں جتنا پہلی بار محسوس ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب عمر کا فرق تھا اور غالباً وہ خیالات بھی تھے جو سرگوشیاں سننے کے بعد خود بہ خود میرے ذہن میں پیدا ہونے لگے تھے۔ ان خیالات کا مرکز وہ ایک سوال تھا جو بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر میں نسلاً عیسائی نہیں ہوں تو پھر کون ہوں؟ میرے لیے یہ بڑی عجیب اور ناقابل یقین سی بات تھی۔ ڈیڈی عیسائی تھے' ممی عیسائی تھیں' پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں نسلاً عیسائی نہیں تھا؟ تمام رات میں سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا اور پھر جب میرا ذہن سوچتے سوچتے تھک گیا تو میری آنکھ لگ گئی۔ شاید اس وقت صبح ہونے والی تھی۔

دوسرے دن میں اسکول نہیں جا سکا۔ ملازمہ نے مجھے وقت پر جگایا بھی مگر میں یہ کہہ کر دوبارہ سو گیا کہ میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔ ممی سے کہہ دو' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں سونا چاہتا ہوں۔

دوپہر کے قریب میں سو کر اٹھا تو ممی میری طرف سے فکر مند تھیں۔ میں نے یہ کہہ کر انہیں تسلی دی کہ کوئی خاص بات نہیں' بس رات کو ذرا نیند نہیں آئی۔ دن بھر میرے ذہن میں وہی سوال گردش کرتے رہے جنہوں نے مجھے گزشتہ رات سونے نہیں دیا تھا۔ میں اس روز گھر سے نہیں نکلا۔

نسلاً عیسائی نہ ہونے کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب تھا جسے شعوری طور پر قبول کرنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میرے تمام تر اضطراب کی وجہ یہی تھی۔ جس سے میں دوچار ہو رہا تھا' وہ میرے لیے سوہانِ روح تھا جس میں ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ چند روز میں نے یہ ذہنی دباؤ برداشت کیا اس لیے کہ میرے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے۔ میں نے اپنی توجہ پڑھائی کی طرف منتقل کردی اور خود کو یہ

دھوکا دینے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ پُراسرار سرگوشیاں محض وہم تھیں۔ اسی دوران میں میرے احساس پر ایک اور ضرب پڑی۔ خلافت کی تحریک کے علی برادران مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ چلائے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ڈیڈی نے روا روی میں کئی دن پہلے یہ پیش گوئی کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ حکومت کے اس اقدام سے واقف تھے۔ مجھے بھی قبل از وقت آئندہ پیش آنے والے اس الیے کا علم ہو گیا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ میں کم از کم یہ تو کر ہی سکتا تھا کہ کسی بھی طرح مولانا محمد علی جوہر تک یہ اطلاع پہنچا دیتا۔ انھیں پہلے سے ہوشیار کر دیتا کہ حکومت ان کے خلاف کیا قدم اٹھانے والی ہے۔ ممکن ہے اس طرح وہ گرفتاری سے بچ جاتے۔ میری یہ سوچ میٹرک کے ایک طالب علم کی سوچ تھی۔ اس وقت میرا ذہن اتنا بالغ نہیں تھا کہ سوچتا' مولانا جوہر یہ اطلاع ملنے کے باوجود بھی گرفتار ہونا پسند کرتے۔

ان دنوں ڈیڈی کی سرکاری ذمے داریاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں اور وہ دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ انھیں میری طرف سے اطمینان تھا کہ میں اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوں۔ میرے اندر کیا پیکار جاری ہے' وہ اس سے قطعی بے خبر تھے۔ ایک عیسائی ہونے کے ناتے' مجھے خلافت تحریک سے کیوں لگاؤ ہے؟ مسلمان رہنماؤں سے کیوں محبت ہے؟ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے میرا کیا تعلق ہے؟ علی برادران کی گرفتاری پر مجھے اتنا رنج کیوں ہے؟ ان سوالوں نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

اپنی گرفتاری سے خاصا پہلے مولانا جوہر' جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسی درس گاہ میں اپنی بقیہ تعلیم حاصل کروں گا۔ جیسے تیسے ذہنی دباؤ کے باوجود میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور حسب معمول امتیازی نمبروں سے پاس ہوا۔

ڈیڈی مجھے بقیہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن بھیجنا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں تو پہلے ہی سے ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ جب میں نے ڈیڈی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ چونک اٹھے۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ بے یقینی کے سے لہجے میں بولے۔ "تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لو گے!"

"مگر ڈیڈی' جامعہ ملیہ میں داخلہ لینے کا مطلب یہ کب ہے کہ میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتا ہوں؟" میں

نرمی سے بولا۔

"براہ راست اگر نہیں تو بالواسطہ یہی مطلب ہے۔ وہ مخصوص نظریات رکھنے والے لوگوں کی درس گاہ ہے۔ ان نظریات کا اثر تم پر بھی پڑے گا جو میں نہیں چاہتا۔ تم ایک عیسائی ہو اور تم نے ایک مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے' تمھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ۔۔۔"

معلوم نہیں مجھے سمجھانے کے لیے ڈیڈی اور کیا کیا کہتے رہے۔ میں تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو ایک مانوس خوشبو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی اور سرگوشی کر رہی تھی "اس سے انکار کر دو کہ تم عیسائی ہو!۔ کہہ دو کہ تم عیسائی نہیں ہو!" لہجہ حسب معمول تاکیدی ہی تھا۔

میں بڑبڑانے لگا۔ "میں عیسائی نہیں ہوں۔" اور پھر میری آواز بلند ہوتی گئی۔ میں جیسے اپنے حواس میں نہیں تھا۔

"کیا ہوا تمھیں؟۔ کیا ہو گیا تمھیں میرے بچے؟۔ یہ تمھارے چہرے کا رنگ کیسے بدل گیا؟۔ تمھارا چہرہ سرخ۔ سرخ ہو رہا ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ ڈیڈی نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا ہے اور اب وہ ممی کو آوازیں دے رہے ہیں "ایلن!۔ ایلن! جلدی آؤ!۔ دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے نہیں معلوم' اس دوران میں میرے چہرے میں کیسا تغیر رونما ہوا کہ ڈیڈی اتنے گھبرا گئے۔ کچھ دیر مجھ پر وہی کیفیت طاری رہی اور میں ایک ہی جملہ بار بار بلند آواز میں دہراتا رہا' پھر وہ خوشبو رخصت ہو گئی۔

"اسے۔ اسے اندر کمرے میں لے چلو!" میں نے ممی کی خوف زدہ آواز سنی۔

ڈیڈی مجھے سہارا دے کر آگے بڑھانے لگے تو میں بول اٹھا "میں خود چل سکتا ہوں ڈیڈی!" اب میری حالت اعتدال پر آ چکی تھی۔

ڈیڈی کے چیخنے چلانے کی وجہ سے گھر کے ملازمین بھی ں جمع ہو گئے تھے۔ ڈیڈی نے انھیں تاکید کی۔ "ابھی تم وں نے جو کچھ سنا ہے' اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا! جاؤ!۔ تم ں جاؤ!۔ اگر تم میں سے کسی کی ضرورت پیش آئی تو میں بلا ں گا۔"

ملازمین چلے گئے۔ ممی اور ڈیڈی کے ساتھ میں اس رے میں آ گیا جو ان دونوں کا مشترکہ بیڈ روم تھا۔ ڈیڈی نے مجھے اپنی مسہری پر لٹا دیا حالانکہ میں کسی قسم کی نقاہت یا کمزوری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں صرف ڈیڈی کا دل رکھنے کے لیے مسہری پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر ممی اور ڈیڈی بھی میرے یب ہی بیٹھ گئے تھے۔ اب تک ان دونوں کے چہروں سے رمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ممی کے چہرے پر تو خوف کے ثار بھی تھے۔

"تمھیں کیا ہو گیا تھا میرے بچے؟" ڈیڈی نے محبت و فقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہہ ے تھے؟"

میں ذرا جھجکا اور وہی جملہ ایک بار پھر دہرا دیا جو اس رار سرگوشی کے زیر اثر بار بار کہتا رہا تھا۔

"یہ تمھیں کس نے بتایا کہ تم عیسائی نہیں ہو؟" ڈیڈی نے نرمی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم یہ۔ یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟۔ کوئی وجہ تو ہو اس کی!"

"وجہ بھی میں نہیں جانتا' مگر اتنا جانتا ہوں کہ کوئی رار طاقت تھی جو بار بار یہی بات مجھ سے کہلوا رہی ہے۔" میں نے ڈیڈی کو سچ سچ بتا دیا۔

"پُراسرار طاقت!" ڈیڈی حیرت سے بولے۔

"جی۔ جی ہاں۔" میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

پھر میں نے ممی اور ڈیڈی سے کچھ نہیں چھپایا۔ انھیں پُراسرار سرگوشی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ ں حیران حیران سے میری باتیں سنتے رہے۔ اس عرصے ں ان دونوں نے کئی بار اشاروں سے صلیب کے نشان گے۔ وہ دونوں مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے' اس کا مجھے اندازہ تھا۔ ان کے سوا دنیا میں میرا اور تھا بھی کون! پھر میں ان سے کس طرح یہ باتیں چھپا لیتا۔

"یہ۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جب۔ جب تم نے مجھے از دے کر بلایا تھا تو۔ تو وہ خوشبو میں نے بھی محسوس کی ۔" ممی مرتعش سی آواز میں بولیں۔

"ہاں مجھے بھی خوشبو محسوس ہوئی مگر۔" ڈیڈی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔

اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک مدت سے جو بات خواہش کے باوجود میں نہیں کہہ سکا تھا' اس وقت وہ بات کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنے اندر ہمت پیدا کر کے وہ بات کہہ ہی دی۔

میری بات سن کر وہ دونوں ہی چونک اٹھے۔ ذرا دیر بعد ڈیڈی بولے۔ "تمھیں یہ اندازہ کیسے ہوا کہ ہم دونوں تم سے کچھ چھپا رہے ہیں؟ کیا یہ بات بھی تمھیں کسی نادیدہ وجود نے بتائی ہے؟۔ اس سلسلے میں بھی تم نے وہی پُراسرار سرگوشی سنی ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات میں نے خود ہی محسوس کی ہے۔" پھر میں نے ڈیڈی کے اس دوست کا تذکرہ کیا جو کلکتے سے آ کر ہمارے یہاں ٹھہرا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔" ممی نے ڈیڈی کو مخاطب کیا "کہیں ایسا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پُراسرار نادیدہ وجود ہمیں کوئی نقصان پہنچا دے۔ مجھے ۔ مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ممی کی آواز کانپ رہی تھی۔ "کہیں یہ اسی۔ اسی کی بھٹکتی ہوئی روح نہ ہو جس نے مرنے سے پہلے ہم سے عہد لیا تھا۔ وہ۔ وہ عہد جس پر ہم۔ ہم دونوں ہی نے اب تک عمل نہیں کیا۔"

"لیکن۔ لیکن ابھی۔ ابھی وہ عہد پورا کرنے کا وقت ہی کہاں آیا ہے۔" ڈیڈی رک رک کر سمجھانے والے انداز میں بولے "ابھی تو یہ بچہ ہے تم۔ تم تو ناحق خوفزدہ ہو رہی ہو۔ اگر یہ اسی کی بھٹکتی ہوئی روح ہے تو۔ تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی کیوں کہ ہم نے اس کے ساتھ بھلائی ہی کی تھی۔"

"تم کچھ بھی کہو ڈیسوزا' میں یہی کہوں گی کہ یہ سرگوشیاں کرنے والی اسی کی بھٹکتی ہوئی روح ہے ورنہ وہ۔ وہ اسے گرجا میں جانے سے نہ روکتی ... وہ اسے یہ۔ یہ نہ بتاتی کہ۔ کہ یہ نسلاً عیسائی نہیں ہے۔ مان لو ڈیسوزا کہ اگر ہم نے اس سے بدعہدی نہیں بھی کی تو۔ تو اس کی امانت میں خیانت کرنے کا تھوڑا بہت جرم ہم سے یقیناً سرزد ہوا ہے۔ بولو' ڈیسوزا' کیا ہم نے یہ نہیں چاہا کہ۔ کہ اسے عیسائی بنا دیں؟۔ کیا ہم نے یہ کوشش نہیں کی کہ اسے اپنے ساتھ گرجا لے جایا کریں؟ میرا خداوند مجھے معاف کرے کہ میں۔ میں بھی اس جرم میں برابر کی شریک رہی۔" ممی ایک عجیب

سی کیفیت میں بولے چلی جا رہی تھی اور ڈیڈی سر جھکائے ان کی بات سن رہے تھے۔ ممی جو کچھ کہہ رہی تھیں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم حد سے زیادہ جذباتی ہو رہی ہو ایلین! خود کو سنبھالو!" ممی چپ ہو گئیں تو ڈیڈی بولے۔

میں ان دونوں کی باتیں بڑے صبر و تحمل سے سن رہا تھا۔ مجھے اندازہ بھی تھا کہ انہی دونوں کی باتوں سے وہ راز افشا ہو گا جس کی مجھے جستجو ہے۔ سرگوشیاں کرنے والے نادیدہ وجود کو میں بھٹکی ہوئی روح سمجھ رہا تھا۔ [illegible] ڈیڈی اور خود ممی کسی بدروح کا تذکرہ بھی کر رہی تھیں۔ انہوں نے بھی کی امانت میں خیانت کی بھی بات کی تھی۔ مگر یہ ساری باتیں جو ابھی تک میرے لیے [illegible] تھیں مجھے بے ربط سی لگ رہی تھیں۔

"تو کیا ایلین [illegible] ہم کسی کی امانت میں خیانت کے مرتکب نہیں ہوئے؟" ڈیڈی ممی کے ساتھ ممی کو سمجھا رہے تھے۔ "سنو ایلین! [illegible] کیا تم [illegible] ہو؟"

"[illegible] ناقابل معافی ہے۔" ممی [illegible] جواب دیا۔

"[illegible] سوال یہ ہے کہ [illegible] خداوند کی [illegible] کیا [illegible] جرم ہے؟ [illegible] عیسائی [illegible] چاہا۔ اسے خداوند کے بیٹے کی حمد و ثنا کے لیے گرجا میں [illegible] کیا ہم نے کوئی جرم کیا؟ ہم نے کسی کی امانت میں خیانت کی ہے؟" [illegible] ڈیڈی [illegible] اگر [illegible] وہ [illegible] ہم کیوں اس کے لیے یہ سوچتے یہ کوشش کرتے کہ یہ نیکی اور سچائی کی راہ پر [illegible] کہ آدمی جو [illegible] کرتا ہے [illegible] جس سے محبت کرتا ہے [illegible] محبت کا تقاضا [illegible]

[illegible]

عیسائی نہیں ہے۔ وہ اسے گرجا میں جانے سے منع کر گئی۔

"تم پھر وہی باتیں دہرا رہی ہو ایلین! ان باتوں سے فائدہ نہیں۔ تم توہم کا شکار ہو گئی ہو! ہمارا نہیں [illegible] عقیدہ ہے کہ مرنے والوں کی روحیں بھٹکتی ہیں! وہ کسی بات کر سکتی ہیں۔"

"تو۔ تو پھر وہ کون ہے جو اس سے سرگوشیاں کرتی ہے اور۔ اور اسے وہ باتیں بتاتی ہے جو اس کے علم میں نہیں تھیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ممی کی اس بات کا کوئی [illegible] اور صحیح جواب ڈیڈی کے پاس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ [illegible] دیر خاموش رہ کر بولے "یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہرگز [illegible] ہے اور نہ وہ ہے جو تم اسے سمجھ رہی ہو۔ کائنات کے [illegible] سے اسرار ہیں ایلین جنہیں آج تک آدمی نہیں سمجھ [illegible] ممکن ہے یہ بھی کوئی ایسا ہی اسرار ہو۔"

"ڈیڈی!" میں نے خاصی دیر صبر کرنے کے بعد دونوں کی گفتگو میں مداخلت کی۔ "مجھے بتائیں کہ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ اور ان باتوں سے میرا کیا [illegible] ہے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی [illegible] میں عیسائی نہیں ہوں؟" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے [illegible] تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ جس ذہنی دباؤ کو میں [illegible] برداشت کیا تھا اب وہ میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

"ہاں میرے بچے! تم [illegible] واقعی عیسائی نہیں ہو۔"

ڈیڈی کے یہ الفاظ میرے لیے کسی دھماکے سے کم [illegible] تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں [illegible] ہو۔ نہیں معلوم کہ میں کب اسی عالم میں چیخ اٹھا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے!" میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"خود کو سنبھالو میرے بچے! خود کو سنبھالو۔ [illegible] کچھ سنا سچ ہے۔ بہت کڑوا سچ مگر اس کا کوئی [illegible] [illegible] میں اب بھی تمہارا ڈیڈی ہوں اور [illegible] تمہاری ممی ہے۔ ماں اور باپ کا رشتہ صرف خون [illegible] نہیں ہوتا بیٹے! یہ۔ یہ عورت جو تمہارے سامنے [illegible] ہے۔ تم اس دن سے اس کی آغوش میں ہو جس دن اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ۔ یہ تمہاری ماں [illegible]" ڈیڈی کی آواز جذبات کی شدت سے اٹک گئی۔ [illegible] وہ مزید کچھ نہ کہہ سکے۔

خاصی دیر کمرے میں ایک بوجھل سی خاموشی [illegible]

[illegible] ڈیڈی، ممی اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور [illegible] سب شاید از سر نو اپنے آپ کو دریافت کرتے رہے۔ [illegible] آنسوؤں کی دھند میں ایک دوسرے کو پاتے رہے!

پھر ڈیڈی کے اصرار پر ممی نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے لیے [illegible] حیران کن تھا۔ ممی ہی کی زبانی میں جو واقعات بیان کر رہا ہوں جن سے میری شخصیت کے بہت سے گوشے مجھ پر [illegible] روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ ممی دھیرے دھیرے مجھے [illegible] سب کچھ بتا رہی تھیں اور میں توجہ و انہماک سے [illegible] ان کی باتیں سن رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک سرد اور تاریک رات تھی جس کے بطن سے وہ [illegible] جو طلوع ہوا اور ہمارا گھر روشنی سے بھر گیا۔ اس سے [illegible] ہم نے اپنے دروازے پر ایک معصوم سی دستک سنی [illegible] دروازہ تمہارے ڈیڈی نے کھولا اور پھر مجھے پکارا۔ میں [illegible] اس مظلوم کی فریاد سنی۔ وہ تمہارے ڈیڈی سے کہہ رہی [illegible] "وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ قتل کر دیں گے مجھے! خدا کے [illegible] مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دیں۔"

میں نے دیکھا وہ ایک بڑی سی چادر میں اپنا جسم چھپائے [illegible] تھی۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھنے کی [illegible] کوشش کی مگر واضح طور پر نہ دیکھ سکی۔ اس نے ایک بار پھر [illegible] الفاظ دہرائے۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی [illegible] ہم نے اسے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ وہ سردی سے [illegible] رہی تھی۔ سو میں نے اسے گرم بستر میں سلایا۔ وہ بھوکی [illegible] اسے کھانا کھلایا اور اس رات کچھ بھی نہ پوچھا کہ وہ کون [illegible] کہاں سے آئی ہے اور کون لوگ اسے مار ڈالنا چاہتے [illegible] مجھے یہ تاکید تمہارے ڈیڈی نے کی تھی۔ تمہارے [illegible] کا کہنا یہ تھا کہ ابھی یہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے جو [illegible] پوچھنا ہے صبح پوچھنا فی الحال اسے سو جانے دو۔

اس کے جسم پر جو لباس تھا اسی سے میں نے یہ جانا کہ [illegible] مہذب مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اس [illegible] حسین اور معصوم تھی کہ آج تک میں اس کا چہرہ نہیں [illegible] سرخ و سفید رنگ، ستواں ناک، دراز قد، گھنے لمبے [illegible] بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں اور چھریرا جسم! اس کے [illegible] چہرے سے نظریں ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ وہ سو بھی گئی تو [illegible] تک اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ ظالم لوگ [illegible] جو اسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟

اور پھر دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ وہ ظالم کوئی غیر [illegible] تو اسی کے گھر والے تھے جو اپنی خود ساختہ جھوٹی

عزت پر اسے [illegible]

مگر کیوں؟ [illegible] والے تمہیں [illegible] کیوں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اس لیے کہ [illegible]"

"تمہاری شادی ہو گئی؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"جی ہاں میں شادی شدہ ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے راز فاش ہو جانے کے بعد اپنے گھر والوں کو بھی یہی بتایا تھا مگر انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ میری بات پر یقین کرنے کے بجائے انہوں نے مجھے مار ڈالنا چاہا۔"

"تو کیا تمہارے والدین نے تمہاری شادی نہیں کی تھی؟ کیا تم نے کسی سے چھپ کر شادی کر لی تھی؟"

"ہاں میرے والدین کو میری شادی کا علم نہیں تھا۔"

"اگر تم نے کسی سے شادی کر لی تھی تو پھر تمہارا شوہر تمہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا؟ یا تم اس کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئیں؟"

"وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا تھا اور مجھے بھی اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ کبھی یہ راز کھل جائے گا۔"

"تم کہاں رہتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ تمہارے والدین کہاں رہتے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔

"میں قرول باغ میں۔"

"مجھے بتاؤ کہ تمہارا شوہر کہاں رہتا ہے؟ اور ایسی کیا مجبوری تھی کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے گیا؟ ہم تمہیں اس کے پاس پہنچا دیں گے۔" میری بات سن کر اس نے خاموشی اختیار کر لی اور میں سمجھ گئی کہ وہ میرے ان سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتی۔ اس کی خاموشی پر مجھے غصہ نہیں آیا اور نہ میں نے اسے جواب دینے پر مجبور کیا۔ تاہم یہ ایک فطری سی بات تھی۔ میں نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی تھی اور اتنا حق تھا اسے میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب دینا چاہیے تھے لیکن اس پر غصہ آنے کے بجائے مجھے پیار آ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر توقف کے بعد اسے پھر مخاطب کیا۔

"کب سے تمہارا شوہر تم سے نہیں ملا؟ اس نے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"کئی مہینے ہو گئے کہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا۔" وہ نظریں جھکا کر بولی "مگر وہ بے وفا نہیں ہے۔ وہ ضرور آئے گا۔"

"تمہارے گھر والوں نے بھی تو تم سے اس کے بارے میں پوچھا ہو گا کہ وہ کون ہے؟ کیا تم نے انہیں کچھ بتایا تھا؟"

"نہیں۔"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ میں وہ عہد توڑنا نہیں چاہتی جو میں نے اس سے کیا تھا۔ اس نے شادی کی پہلی رات مجھ سے عہد لیا تھا کہ میں کسی بھی حالت میں اور کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ میں نے اپنے محبوب سے کیا ہوا وہ عہد آج تک نہیں توڑا۔ اپنے عہد کو قائم رکھنے کے لیے میں نے بہت مار کھائی' بڑا ظلم برداشت کیا ہے۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں مگر اپنا عہد نہیں توڑ سکتی۔" اس کا اندازِ گفتگو سچا اور مشتاق تھا۔

میرے جن سوالوں کے جواب اس نے نہیں دیے تھے' آپ ان کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "یقین کرو کہ میں تمہیں کبھی تمہارا عہد توڑنے پر مجبور نہیں کروں گی۔ تم جب تک چاہو میری چھوٹی بہن بن کر اس گھر میں رہو۔"

میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور میں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ دیر تک میرے سینے سے لگی روتی رہی۔

پھر چند روز بعد اسی نے مجھے بتایا کہ جس رات وہ ہمارے گھر آئی تھی' اسی رات اس کے گھر والے اسے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اس نے چھپ کر دن کے وقت اپنے والد اور بھائیوں کی باتیں سن لی تھیں۔ اس کے والد اور بھائیوں نے متوقع رسوائی سے بچنے کے لیے یہی طے کیا تھا کہ رات کو خاموشی کے ساتھ اسے گلا گھونٹ کر مار دیا جائے۔ انہوں نے لاش ٹھکانے لگانے کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں جو چھوٹا سا باغ تھا' وہاں انتہائی رازداری کے ساتھ اس کی قبر کھودی گئی تھی۔ اس کی والدہ کو قتل کے اس منصوبے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ گھر کے مردوں نے ایک بات طے کی تھی اور اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس کی قسمت ہی تھی کہ اسے اپنے گھر سے فرار ہونے کا موقع مل گیا ورنہ شاید وہ زندہ نہ بچتی۔ میرے بے حد اصرار پر اپنے والدین کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس کے والدین کا تعلق دہلی کے ایک معزز نواب خاندان سے تھا۔ ان کی کوٹھی ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی مگر شاید انہیں یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو کسی عیسائی کے گھر میں پناہ مل سکتی ہے یا وہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی عیسائی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے۔ خود اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے دروازے پر دستک دینے سے پہلے خود اسے یہ معلوم نہیں تھا۔ اپنے چار دیواری سے باہر وہ کم ہی نکلی تھی۔ گھر کے باہر کی دنیا کے لیے اجنبی ہی تھی۔ ایک تو خود اس نے انتہائی احتیاط کی کہ کبھی ہمارے گھر کے دروازے تک نہیں آئی کہ اس پر نظر پڑ سکتی۔ عموماً وہ اسی کمرے میں رہتی تھی جو ہم نے اس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اسی کمرے میں اب تم رہتی ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم نے بھی اس کے بارے میں کسی کو بتانے سے حتی الامکان گریز کیا۔ تمہارے ڈیڈی نے گھر کے ملازمین کو بھی اس سلسلے میں سختی سے تاکید کر دی تھی۔ اس کے والدین اور بھائیوں نے ممکن ہے اسے تلاش کیا ہو' تلاش میں ناکام ہو کر شاید صبر کر لیا ہو۔ اس کے گھر والوں نے یقیناً یہی سمجھا ہو گا کہ وہ گھر سے فرار ہو کر اسی شخص کے پاس چلی گئی ہے جسے اپنا شوہر بتا رہی تھی۔

ہمارے یہاں رہتے ہوئے اسے تقریباً چار مہینے ہوئے تھے کہ اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ تمہارے ڈیڈی نے اسے اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا مگر اس کی طبیعت نہ سنبھلی۔ ایک روز اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ ساری رات میں اس کے کمرے میں رہی اور جاگتی رہی۔ وہ مجھ سے بار بار کہتی رہی کہ میں اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤں مگر ایسی حالت میں اسے میں کس طرح تنہا چھوڑ سکتی تھی۔ اس رات کا واقعہ ہے کہ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر مجھ سے ایک عہد لیا۔ وہ مضمحل سی آواز میں بولی۔ "باجی! اب شاید میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ وہ۔۔۔ میرے شاید اب نہیں آئے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "آپ لوگوں نے ایک مظلوم کو اپنے گھر میں پناہ دے کر جو احسان کیا ہے' اس کا اجر آپ کو خدا ضرور دے گا۔ اگر آپ لوگ مجھے نہ ملتے تو شاید۔۔۔ شاید میں اب تک زندہ نہ ہوتی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ سے ایک۔۔۔ ایک بات کہنا تھی۔ اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کیا خبر کب۔۔۔ کب میری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں' مجھے نہیں معلوم کہ میں ماں بن بھی سکوں گی یا نہیں' اپنے محبوب' اپنے شوہر کی نشانی کو دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر میں اس وقت تک زندہ نہ رہی۔۔۔ ماں بن ہی گئی تو۔۔۔ تو۔۔۔"

"تم زندہ رہو گی۔۔۔ ضرور زندہ رہو گی اور۔۔۔ اور اپنے بچے کی خوشیاں دیکھو گی۔" میں نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ کر کہا۔

"میں آپ کو اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر۔ میرے محبوب نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں بیٹے کی ماں بنوں تو اس کا نام طارنوش رکھوں۔"

"طارنوش!" میں حیرت سے بولی کیوں کہ میں نے کبھی پہلے کسی کا یہ نام نہیں سنا تھا۔ میرے لیے یہ نام اجنبی' نامانوس اور عجیب سا تھا۔

"ہاں طارنوش۔" اس نے نحیف آواز میں اس نام کے ہجے بتا کر تصدیق کی۔

"مگر یہ تو بڑا عجیب سا اور مشکل سا نام ہے۔ تم نے اپنے شوہر سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اپنے ہونے والے بیٹے کا یہ نام کیوں رکھنا چاہتا ہے؟"

"پوچھا تھا اور اس نے مجھے یہ نام رکھنے کی وجہ بھی بتائی تھی' مگر۔۔۔ مگر میں نے اس سے جو عہد کیا تھا اسی کے سبب مجبور ہوں۔ میں یہ نام رکھنے کی وجہ بھی نہیں بتا سکوں گی۔ ہاں اتنا بتا سکتی ہوں کہ یہ نام بڑا محترم ہے۔ میں اپنے محبوب کی خواہش کا احترام ضرور کروں گی۔ اگر زندہ رہ گئی تو۔۔۔ اور واقعی ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ میں۔۔۔ میں اپنے بیٹے کا نام طارنوش ہی رکھوں گی۔"

وہ ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ تمہارے ڈیڈی بھی جاگ اٹھے۔ مجھے کمرے میں نہ پا کر وہ بھی اپنے سلیپنگ گاؤن کا بند باندھتے ہوئے وہیں چلے آئے۔ تمہارے ڈیڈی بھی اس کی علالت سے فکر مند تھے۔ انہوں نے مجھ سے اس کی طبیعت پوچھی۔

"ڈیسوزا! تم جا کر سو جاؤ' تمہیں صبح دفتر بھی جانا ہے۔ میں اس کے پاس موجود ہوں۔ یہ۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔"

"مگر چہرے سے تو یہ ٹھیک نہیں لگتی۔ تم کہو تو میں موٹر نکال کر اسے ابھی کسی اسپتال میں لے جاؤں!"

"نہیں" میرے کچھ بولنے سے پہلے وہ بول اٹھی اور اپنے اوپر پڑی ہوئی چادر کھینچ کر درست کرنے لگی۔ پھر اس نے ڈیسوزا سے کہا۔ "اچھا ہوا کہ اس وقت آپ بھی آگئے۔ کیا خبر پھر زندگی مجھے اتنی مہلت دے یا نہ دے کہ میں وہ بات آپ سے کہہ سکوں جو میرے دل میں ہے۔ آپ کی نیند تو خراب ہوئی' آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی' مگر صرف کچھ دیر۔ گھڑی بھر کو میرے پاس بیٹھ جائیں۔ میں نے آپ دونوں سے اپنے دل کی بات کہہ دی تو۔۔۔ تو پھر سکون سے مر سکوں گی۔"

تمہارے ڈیڈی' مسہری کے سہانے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ "ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اگر۔۔۔ اگر میں۔۔۔ میں ماں بننے تک زندہ رہ جاؤں اور۔۔۔ اور پھر میری زندگی مجھ سے وفا نہ کرے تو۔۔۔ تو آپ دونوں نے مجھ پر جو احسان کیا ہے' مجھے پناہ دی ہے۔ تو میرے بچے کو بھی اس سے محروم نہ کیجیے گا۔ پھر۔۔۔ پھر جب وہ باشعور ہو جائے تو۔۔۔ تو اسے یہ ضرور بتا دیجیے گا کہ۔۔۔ کہ اس کی ماں مسلمان تھی۔"

"ہم تم سے عہد کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہو گا!" تمہارے ڈیڈی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تمہارے بچے کو ہم تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے' مگر صرف اتنا ہی جتنا ہمارے علم میں ہے یا تم نے ہمیں بتایا ہے۔"

خود میں نے بھی اسے اس عہد پر قائم رہنے کا یقین دلایا۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور آسودگی کا اظہار ہونے لگا۔ صبح ہونے تک حیرت انگیز طور پر اس کی طبیعت سنبھل گئی اور پھر وہ سو گئی۔ سارا۔۔۔ دن وہ ٹھیک رہی' لیکن رات ہوتے ہی اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اسی رات وہ ماں بن گئی' ایک بیٹے کی ماں' طارنوش کی ماں!

مجھے۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ اسی رات کے آخری پہر اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی امانت میرے سپرد کر دی تھی اور۔۔۔ اور میں نے اس کے نوزائیدہ بیٹے طارنوش کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ رات اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ ادھر سورج طلوع ہوا ادھر اس کی زندگی کا ماہتاب غروب ہو گیا۔

ہم بے اولاد تھے' سو ہم نے طارنوش کو خداوند کی نعمت سمجھ کر قبول کر لیا اور اس کا شکر بجا لائے۔ ہم نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا اور خداوند نے ہم پر اپنی برکتیں نازل کیں۔ ہم نے ایک لبِ مرگ عورت سے جو عہد کیا تھا' سو پورا کیا اور۔۔۔ اور آج۔۔۔ آج وہ دن بھی آگیا کہ ہم نے طارنوش کو اس کی ماں کی خواہش کے مطابق وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمارے علم میں تھا۔

***

ممی نے مجھے سب کچھ بتانے کے بعد ڈیڈی کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "ڈیسوزا کوئی ایسی بات تو نہیں رہ گئی جو میں

طارنوش کو بتانا بھول گئی ہوں؟"

"نہیں ایلین' تم نے تمام واقعات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ میرے خیال میں تم کچھ بھی نہیں بھولی ہو۔" ڈیڈی نے تصدیق کی پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "طارنوش بیٹے! اب تو تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں رہی جو تم ہم سے معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"کاش میری مرحومہ ماں نے آپ کو میرے والد کے بارے میں کچھ بتا دیا ہوتا!" میرے لہجے میں حسرت تھی۔ "کاش میرے والد نے ان سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ میرے والد کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی۔" یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے ننھیال والوں کا خیال آیا اور میں نے ان کے متعلق ڈیڈی سے پوچھ لیا۔

"ہاں تمہارے نانا اور ماموں اب بھی یہیں قرول باغ کی اسی کوٹھی میں رہتے ہیں۔" پھر مجھے ڈیڈی نے ان کے ناموں اور پتے سے بھی آگاہ کر دیا' اس کے بعد کہنے لگے۔ "بیٹے! انہوں نے یقیناً تمہاری ماں پر ظلم کیا مگر خداوند نے معافی اور درگزر کی تلقین کی ہے۔ حالات کا جبر بعض اوقات آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ وہ درندوں سے بھی زیادہ سفاک اور بے رحم بن جاتا ہے۔ تم۔ تم انہیں بھول جاؤ۔ انہیں معاف کر دو!"

ڈیڈی نے شاید میرے چہرے سے دلی جذبات کا اندازہ لگا لیا تھا' وہ مجھے اسی لیے عفو و درگزر کی تلقین کر رہے تھے۔ میرے دل میں واقعی ان ظالموں کے لیے انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ جنہوں نے میری ماں پر ظلم و تشدد کیے تھے اسے قتل کرنا چاہا تھا اور گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ ڈیڈی سے اپنے دلی جذبات چھپانے کی خاطر میں نے جواباً کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیڈی! میں۔ میں ان لوگوں کی مجبوریاں سمجھ رہا ہوں۔ میرے دل میں تو صرف یہ خواہش ہے کہ اب نہیں تو ایک نہ ایک دن انہیں یہ ضرور بتا دوں' وہ۔ وہ جسے انہوں نے جان بچانے کے لیے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا' میں اسی مظلوم کا بیٹا ہوں!"

"مگر اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا بیٹے؟۔ کیا فائدہ اس سے؟" ڈیڈی نے مجھے سمجھایا۔

"اس سے ڈیڈی' شاید میرے دل کو قرار آ جائے۔ شاید میں انہیں ان کے ظلم کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ شاید ان کے چہروں پر ندامت کی تحریر پڑھ کر اپنی ماں پر کیے جانے والے ظلم کی تپش کچھ کم ہو جائے اس طرح۔ اس طرح یقیناً میری مظلوم ماں کی روح کو بھی سکون ملے گا کہ اس کے بیٹے نے ظالموں کو ان کے ظلم کا احساس دلا دیا۔"

معلوم نہیں ڈیڈی میری بات سے مطمئن ہو سکے یا نہیں' لیکن پھر انہوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ان باتوں میں رات کے کھانے کو خاصی دیر ہو گئی تھی۔ ممی نے کھانے کے لیے کہا اور میں ڈیڈی کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

ڈیڈی اور ممی سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا' اس کی روشنی میں اب میرے لیے یہ جاننا دشوار نہیں رہا کہ غیر ارادی طور پر میرا جھکاؤ مسلمانوں کی طرف کیوں تھا! میں ایک مسلمان ماں کا بیٹا تھا اور یقیناً میرا یہ رجحان موروثی اور فطری تھا۔ میں نادانستگی میں اپنی اصل کی طرف لوٹ رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے میں اپنے نانا اور ماموؤں کے بارے میں معلومات جمع کرنے لگا۔ میرے نانا کا نام نواب فرقان علی تھا۔ وہ ابھی تک حیات تھے اور بڑے طمطراق کے آدمی تھے۔ انگریز غاصب حکمرانوں نے سب کچھ چھین لیا تھا مگر اب بھی اتنا تھا کہ خوئے نوابی نہیں گئی تھی۔ اب بھی انہیں گھر سے کہیں باہر جانا ہوتا تو ٹم ٹم میں بیٹھ کر نکلتے تھے۔ انگرکھا زیب تن ہوتا اور سر پر جچی ہوئی دو پلی ٹوپی۔ سرخ و سفید چہرے پر گھنی مونچھیں' اوپر کے رخ تنی رہتی تھیں۔ شاید وہ مونچھوں کو سخت رکھنے کے لیے ان پر کچھ لگاتے تھے۔ میرے دونوں ماموں بھی نانا کی ہوبہو تصویر تھے۔

میرا ایک ماموں زاد میری ہی عمر کا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اس سے تعلقات استوار کر لیے۔ اس کا نام عظمت علی تھا۔ اسے اپنے والد' یعنی میرے بڑے ماموں کی طرح شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے شطرنج کھیلنا نہیں آتی تھی۔ عظمت علی ہی سے قربت حاصل کرنے کے لیے میں نے شطرنج سیکھی۔ اس شطرنج کے کھیل کے باعث میری اور اس کی دوستی پکی ہو گئی۔

عظمت علی ہی سے دوستی کے ناتے پہلی بار میں اس چار دیواری میں داخل ہوا جس کی حدود میں میری ماں کے لیے قبر کھودی گئی تھی۔ عظمت علی ہی کیا اس کے گھر کے کسی فرد کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ اس گھر اور اس گھر کے افراد سے میرا کیا رشتہ ہے؟ یوں بھی ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں بھی فارغ تھا اور عظمت علی بھی! عظمت علی سے مجھے قریب آنے کا موقع مل گیا تو اسی کے توسط سے میں نے دانستہ گھر کے دوسرے افراد سے بھی قریب ہونا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ میرے حسن اخلاق اور شائستگی کے سبھی اسیر ہوتے چلے گئے۔ اس گھر میں موجود حسین چہرے پہلے سخت پردے میں رہتے تھے لیکن اب بھی کبھار مجھے اپنی جھلک دکھانے لگے۔ پردے سے کبھی کسی کی جھلک نظر آ جاتی اور برق جمال حسن مجھے تڑپا دیا کرتا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس گھر میں تین حسین و نوجوان چہرے ہیں۔

بڑے ماموں کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا عظمت علی سے بڑا تھا جو علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا اور دو عظمت علی سے چھوٹے تھے جو ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ تین بیٹیوں میں سے ایک عظمت علی سے دو سال بڑی اور ایک' سال بھر چھوٹی تھی۔ تیسری بیٹی کی عمر ابھی چار سال تھی۔ چھوٹے ماموں کی صرف ایک بیٹی تھی جو عظمت علی کی ہم عمر تھی' باقی تین بیٹے تھے اور سبھی چھوٹے۔

رابعہ' زاہدہ اور زیبا ان تینوں کے نام تھے۔ زاہدہ اور زیبا بڑے ماموں کی بیٹیاں تھیں' رابعہ چھوٹے ماموں کی۔ تینوں کی تینوں چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں۔ میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ تینوں ہی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سماتیں پھر وہ "تین تلواریں" کس طرح سما جاتیں۔ میں ان تینوں کے حسن کا معترف ضرور تھا مگر ان میں سے کسی کے لیے بھی میرا دل تیزی سے نہیں دھڑکا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ میں نے اپنے انتقام کی راہیں متعین کر لی تھیں اور تو اور میں نے ممی ڈیڈی کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ عظمت علی سے میری بڑھتی ہوئی دوستی دیکھ کر ڈیڈی نے ایک بار سمجھایا ضرور تھا کہ میں کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھاؤں۔ میں نے انہیں مطمئن کر دیا کہ میرا کوئی خطرناک ارادہ نہیں ہے۔

اب عظمت علی مجھ سے ہر اچھی بری بات کرنے لگا تھا۔ ایک روز شطرنج کھیلتے ہوئے ایک چال چلنے کے بعد وہ مجھ سے اچانک بولا۔ "کبھی تم نے کسی سے عشق کیا ہے؟"

"پہلے چال تو چلنے دو یار! تم تو مجھے عشق کے چکر میں پھنسا کر مات دے دو گے۔ تمہارا گھوڑا شہ دینے کے لیے پر تول رہا ہے' پہلے تو اسے لگام دے دوں!"

یہ کہہ کر میں نے پیدل کے زور پر اپنا گھوڑا بھی ڈھائی گھر چل دیا تاکہ عظمت علی یا تو گھوڑے سے گھوڑا اڑا دے یا پیچھے ہٹ جائے۔

اس نے ہنستے ہوئے اپنا گھوڑا پیچھے ہٹا لیا اور بولا۔ "تم تو ایک دم لڑائی بھڑائی پر اتر آئے ہو۔" پھر وہ ذرا سا توقف کر کے بولا۔ "ہاں میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا' تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔"

"ہاں وہ۔ عشق!" میں نے چال سوچتے ہوئے کہا۔ "دراصل یار ابھی میری عمر اس قابل نہیں ہوئی کہ عشق کروں۔ ویسے ایک بات اور بھی ہے کہ اب تک کسی نے گھاس ہی نہیں ڈالی۔" میں اسی لمحے ایک مانوس خوشبو محسوس ہوئی اور میری نظر سامنے پڑے ہوئے ریشمی پردے کی طرف اٹھ گئی۔ دریچے پر پڑا ہوا ریشمی پردہ لمحے بھر کو اپنی جگہ سے ہٹا اور میری نظر کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ کسی کا روئے زیبا تھا جو اپنی چھب دکھا کر چلمن کے پیچھے چلا گیا۔ دریچہ عظمت علی کی پشت کی طرف تھا اور میرے بالکل سامنے۔ یہ دریچہ گھر کی اندرونی سمت کھلتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ خوشبو لگانے کا شوق اس گھر میں کس کو تھا۔ یہ زیبا کی من پسند خوشبو تھی اور اسی خوشبو کے سبب میں پہچان لیتا تھا کہ پردے کے پیچھے کون ہے۔ اس وقت مجھے زیبا ہی کا روئے زیبا نظر آیا تھا۔ وہ عین اس وقت وارد ہوئی تھی جب میں عظمت علی سے یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اب تک کسی نے گھاس ہی نہیں ڈالی۔ پردہ اٹھا کر اور اپنا روئے زیبا دکھا کر اس نے مجھے گھاس ڈالنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

عظمت علی کی نظریں بساط پر جمی ہوئی تھیں کیوں کہ میں اس دوران میں چال چل چکا تھا۔ میری توجہ زیبا کی طرف مبذول ہو گئی تھی یہی وجہ ہوئی کہ میں غلط چال چل گیا اور عظمت علی نے اس سے فائدہ اٹھا کر میرا وزیر پیٹ لیا۔ اب

اگلا مرحلہ شہ اور مات کا رہ گیا تھا لہٰذا میں نے شکست قبول کر لی۔ یوں بھی عظمت علی شطرنج کا اچھا کھلاڑی تھا۔ مجھے تو شطرنج کھیلتے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے۔ پورا وزیر کم ہو جانے کے بعد بازی کھیلنا میرے لیے یوں بھی ممکن نہیں تھا۔ اگلی بازی کے لیے بساط پر مہرے لگانے سے پہلے عظمت علی آہستہ سے بولا۔ "پہلے عشق کی بازی پر گفتگو ہو جائے۔"

"مگر تم نے یہ بازی لگائی کس سے ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا اور پردے کی طرف نظر اٹھائی۔ وہ خوشبو رخصت ہو چکی تھی۔ "تک دیکھ لیا دل شاد کیا۔" کی مصداق ہیشہ کی طرح وہ اپنا جلوہ دکھا کر چلی گئی تھی۔

"وہ ایک سنگ دل ہے۔ کبھی اس کا دل ہی نہیں پگھلتا۔ ظالم سے جب بھی نظریں چار ہوتی ہیں' منہ بنا لیتی ہے۔" عظمت علی اپنی محبوبہ کا دکھڑا سنانے لگا۔

"اس کا تو مطلب یہ ہوا جانِ عزیز کہ تم تنہا بازی کھیل رہے ہو' دوسری طرف سے چال نہیں چلی جا رہی۔"

"واقعہ اب تک تو یہی ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "تم اگر اسے دیکھو تو تم بھی دل تھام کر رہ جاؤ۔ کہو تو کسی روز تمہیں بھی اس کا دیدار کرا دوں!"

"کیا؟" میں چونک اٹھا۔ "یار تم کسی زن بازاری کے چکر میں تو نہیں پھنس گئے کہ جس کا دیدار اتنا عام ہے کہ مجھے بھی شربتِ دیدار پلانے کی دعوت دے رہے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے پیارے! تم غلط سمجھ رہے ہو بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ پردہ نہیں کرتی۔ اس کا نام کلونت کور ہے اور وہ پہاڑ گنج میں رہتی ہے۔"

"تو یہ قصہ ہے!" میں مسکرایا۔ "تم نے بھی حد کر دی! دل آیا بھی تو ایک غیر مذہب دوشیزہ پر! تمہارے حصے میں بڑا سخت امتحانی پرچہ آیا ہے جس میں ایک سو ایک فیصد فیل ہونے کے امکانات ہیں۔ تمہارے اور اس کے درمیان تو ایک ایسی دیوار کھڑی ہے پیارے کہ اگر اس چکر میں جونک لگ بھی گئی تو تم دونوں مل کر بھی اس دیوار کو نہیں گرا سکو گے۔"

"اب اتنا سنگین مسئلہ بھی نہیں ہے' مسلمان کر لیں گے اسے! مگر پہلے وہ ہمارے جذبِ شوق کا جواب تو دے۔" وہ رنگین مزاج عاشقوں کی طرح بولا۔

پھر اس نے روز ہی کلونت کور کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے میرے دل میں بھی یہ اشتیاق پیدا ہو گیا کہ دیکھوں تو سہی' وہ آخر ہے کیا شے' جس کے حسن کی مدح سرائی میں عظمت علی نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔

پہاڑ گنج میں عظمت علی کا ایک دوست فرید احمد رہتا تھا۔ اسی کے گھر سے لگا ہوا گھر اس غارت گر ہوش کا تھا۔ فرید احمد اور اس کے گھر کی چھت سے چھت ملی ہوئی تھی۔ چھت پر چڑھ کر اس کے گھر میں جھانکنے میں آسانی بھی تھی۔ شام کو چار بجے کے قریب وہ عموماً کپڑے سکھانے چھت پر آتی تھی۔ میں عظمت علی اور فرید احمد ہم تینوں ہی وقت سے پہلے "مورچہ" لگا کر چھت پر بیٹھ گئے۔ چھت پر ایک چھپر بھی پڑا ہوا تھا۔ ہم تینوں اس کے سائے میں کھڑے ہو گئے ورنہ گرمی مزاج پوچھ رہی تھی۔ اگر شوقِ دیدار نہ ہوتا تو ہرگز میں دھوپ اور گرمی میں چھت پر جانے کو راضی نہ ہوتا۔ فرید احمد اور اس کی چھت کے درمیان چھوٹی سی دیوار تھی جس کی بلندی تین فٹ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ گویا دیدارِ یار میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت آیا جس کا ہم تینوں ہی کو بے چینی سے انتظار تھا۔

"تم نے کچھ سنا فرید!" اچانک عظمت علی بول اٹھا۔ "چھم چھم پائل بول رہی ہے۔ وہ وہ آ رہی ہے۔"

"ہاں پائل کی آواز تو آ رہی ہے۔" فرید احمد نے تصدیق کی۔ "وہ سیڑھیاں چڑھ رہی ہو گی۔"

"اب دیکھنا تم پیارے! اسے دیکھ کر تمہارے ہوش نہ اڑ جائیں تو کہنا۔" عظمت علی نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"واقعی بڑی قابلِ دید شے ہے۔ دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے سارنگی کے تار کھنچے ہوئے ہوں۔" فرید احمد نے یہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"یار عظمت' محبوبہ تو تمہاری ہے اور مزے لے رہے ہیں بھائی فرید۔" میں ہنس کر بولا۔

کچی عمر کا عشق ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتا اور شاید عظمت علی کا عشق بھی ابھی ہوس کی منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ غالباً اسی لیے اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ ممکن ہے فرید احمد میری بات کا کوئی جواب دیتا کہ اسی وقت وہ سراپا قیامت چھم چھم کرتی چھت پر آ گئی۔ وہ ہم سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور اس کی نظر ابھی تک ہماری طرف نہیں اٹھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کی بڑی سی بالٹی تھی جس میں اوپر تک بھیگے ہوئے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ عظمت علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسے دیکھ کر واقعی میرے ہوش اڑ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے دھوپ میں ایک دم تیزی آ گئی ہو۔ وہ ہلکی گلابی پھول دار

قمیص اور گلابی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک مسکتا گلاب نظر آئی۔ اس کے گلے میں دوپٹا نہیں تھا اور سر کے لمبے سیاہ گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بالٹی رکھنے کو جھکی تو مجھے شاخِ خمیدہ کی یاد آ گئی۔ اس نے بالٹی سے ایک کپڑا اٹھا کر پھیلایا اور اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھٹکے دینے لگی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ گویا کائنات زیر و زبر ہو رہی تھی۔ زلفوں کی آوارہ لٹیں اس کے کمان ابروؤں کو بار بار چوم رہی تھیں۔ زرپاش پیشانی کا ہلال' زلفوں کی گھٹاؤں میں ابھر رہا تھا' ڈوب رہا تھا۔ سرخ رخسار دھوپ کی تمازت سے اور بھی سرخ ہو رہے تھے اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سامنے موجود الگنی پر کپڑا پھیلا دیا اور پھر دوبارہ بالٹی کی طرف مڑی۔ وہ دنیا جہان سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھی۔ میری نظریں اس پر جم کے رہ گئی تھیں۔ ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

اس شعلۂ جوالا پر تمہارا حق ہے۔ میرے اندر جیسے کوئی بولا اور میں خود فراموشی کے عالم میں اس دیوار تک پہنچ گیا جو دونوں چھتوں کے درمیان تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ میری نظروں کی تپش نے اسے شاید میری طرف متوجہ کر دیا۔ اس نے میری طرف نظر اٹھائی۔ معلوم نہیں وہ اعجازِ عشق تھا یا کچھ اور کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نہیں ابھرے۔ میری اور اس کی نظریں چار ہو چکی تھیں۔ میں مبہوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ کوئی چنگاری ادھر بھی وجود کے نہاں خانوں سے ابھری جس کی جھلک لمحہ بھر کو مجھے اس کی آنکھوں میں نظر آئی۔ وہ جس حالت میں تھی اسی حالت میں کھڑی رہ گئی تھی۔ یہ صرف چند لمحے تھے جو مجھے صدیوں پر محیط محسوس ہوئے۔ وہ مسکرائی اور اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا کپڑا جھٹک کر الگنی پر ڈال دیا۔

"ابے یار تم تو بڑے تیز رفتار ثابت ہو رہے ہو! یاروں کو پیچھے ہی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔" عظمت علی میرے قریب پہنچ کر بولا۔

میں وادیٔ کیف و نشاط سے نکل آیا اور چونک کر عظمت علی کی طرف یوں دیکھا جیسے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ فرید احمد بھی پیچھے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "پسند آئی نا؟ ہے نا پری ملکہ وکٹوریہ!"

میرے جی میں آئی' کہہ دوں کہ ابے گھامڑ اس کے آگے ملکہ وکٹوریہ کی کیا حیثیت ہے' مگر میں خاموش ہی رہا۔ کلونت کور کو ملکہ وکٹوریہ کہنا میرے نزدیک اس کے حسن کی توہین کے مترادف تھا۔

پھر وہ دونوں کلونت کور پر بازاری قسم کے جملے چست کرتے رہے مگر میں خاموش رہا۔ مجھے تو اس غارت ایمان کو دیکھنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ اسے اس قدر دیکھنے کے باوجود بھی میں نے جیسے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ نگاہوں کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ میں آخر دیکھتا بھی کیا کیا کہ وہاں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔

جب سے وہ دونوں میرے قریب آ کر کھڑے ہوئے تھے کلونت کور نے ایک نگاہ غلط انداز بھی ان پر ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ ہاں ان کے بازاری فقروں کا رد عمل اس پر ضرور ہوا تھا۔ اب مجھے اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آنے لگے۔ عظمت علی کو بھی یقیناً اس بات کا احساس ہو گیا تھا مگر وہ عجب ڈھیٹ تھا۔ اس نے استاد داغ کا ایک شعر پڑھ دیا۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

جواب میں کلونت کور نے عظمت علی کو ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھا جیسے کچا چبا جائے گی۔ پھر وہ خالی بالٹی اٹھا کر تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "لفنگا کہیں کا!" یہ الفاظ گویا عظمت علی سے اس کی نفرت کا اظہار تھے۔ عظمت علی ڈھٹائی سے "ہائے" کر کے رہ گیا۔

"اب نیچے چلو یار' وہ چھما چھم تو چلی گئی۔" فرید احمد اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور ہم سب چھت سے نیچے اتر آئے۔

اس رات خواب اور بیداری دونوں ہی حالت میں کلونت کور میرے حواس پر چھائی رہی۔ دوسرے ہی دن سے میں اس کے گھر کے پھیرے لگانے لگا اور مجھے شوقِ دیدار میں ناکامی نہیں ہوئی۔ تیسرے دن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ گھر کا سودا سلف لے کر لوٹ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی اور پھر اس کے حسین ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ میں بہ ظاہر بے تعلق سا بنا ہوا گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا اور اسے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے میرے دل پر پاؤں دھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک موجِ رواں کی مانند۔ اندازِ خرام ایسا تھا جیسے زمانہ اس کے قدموں میں ٹھوکریں کھا رہا ہو۔ بسنتی جوڑا اس پر اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ قریب سے قریب تر آتی گئی اور میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی ادھیڑ عمر ماں آگے آگے تھی اور وہ دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ قریب آئی تو میری اور اس کی نظریں مل گئیں۔ ایک عالم گزر گیا جی پر' میں نے محسوس کیا کہ ان نگاہوں میں میرے لیے پیغام

محبت تھا اور لبوں پر مچلتے ہوئے تبسم میں انداز پذیرائی۔ وہ مجسم خوشبو میری کشتِ جاں کو مہکاتی ہوئی بہت پاس سے گزر گئی۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہیں اریب قریب کہیں فرید احمد بھی گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔ میں تو اس وقت چونکا جب فرید احمد نے پیچھے سے اچانک میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "آج عین موقعے پر پکڑے گئے استاد! کل بھی میں نے تمہیں گلی کے پھیرے لگاتے دیکھا تھا مگر تم جانے کہاں اُڑن چھو ہو گئے۔ یاروں سے یار ماری نہیں چلے گی پیارے! ہم تو مل بانٹ کر کھانے والے ہیں۔"

اس دوران میں اس کی طرف مڑ چکا تھا۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔" میں اس سے بولا۔ "میں تو تمہاری ہی طرف آرہا تھا کہ اچانک وہ نظر آ گئی اور یہاں رک گیا۔"

"دیکھو یار مجھ سے زیادہ نہ اڑو! جھوٹ بولنا بھی ایک فن ہے جو یقیناً تمہیں نہیں آتا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ تم پہ مرمٹی ہے۔ اس روز بھی چھت پر وہ تمہیں دیکھ کر مسکرائی تھی اور آج بھی میں نے اسے مسکراتے دیکھ لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مجھ سے اور عظمت علی سے زیادہ خوبصورت ہو مگر اس پر پہلا حق ہم دونوں کا ہے اور میں۔ میں تو برسوں سے اس کے لیے ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر رہا ہوں مگر ظالم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ عظمت علی کو بھی میں نے ہی پہلی بار اس کا دیدار کرایا تھا۔ اب البتہ تمہاری آمد سے کچھ امید بندھی ہے۔ توقع ہے کہ کچھ نہ کچھ دال دلیا ہو جائے گا لیکن تم بالا ہی بالا ہاتھ کی صفائی دکھانے پر آمادہ لگتے ہو۔ چلو آؤ چلو! بیٹھ کر رسان سے بات کریں گے۔" فرید احمد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

فرید احمد بڑا کائیاں لگتا تھا' اسے غوطہ دینا آسان نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مزید کج بحثی نہیں کی اور ہتھیار ڈال دیے۔ عشق رقیب کو برداشت نہیں کرتا مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ رقیب کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں تھا بلکہ رقیب دیدارِ یار میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ سو میں اس کے ساتھ چل دیا۔

فرید احمد مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں لے آیا جہاں مونڈھے پڑے تھے اور ایک طرف موٹی سی دری زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا اور اس نے سامنے والا مونڈھا سنبھال لیا۔

"دیکھو مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر صنفِ نازک کے لیے بڑی کشش ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبوتری ہمارے اڈے پر بیٹھنے کے بجائے تمہارے اڈے پر بیٹھنے کے لیے پر نہ تول رہی ہوتی۔" فرید احمد کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے شیشے میں اتارنا چاہتا ہو۔ "میں نے عظمت علی سے بھی کل یہی بات کہی تھی مگر وہ نواب زادہ کسی کو خاطر میں لاتا ہے! وہ تو خود کو شہزادہ گلفام سمجھتا ہے۔ خیر اس کا ذکر چھوڑو! وہ چاہے تو اس معرکے میں ہمارے ساتھ رہے نہ چاہے نہ رہے۔ ساتھ رہے گا تو وہ بھی مزے کرے گا' نہیں تو ہم دونوں کافی ہیں۔"

اپنی دانست میں وہ بڑی فراخ دلانہ پیش کش کر رہا تھا اور میں مصلحت کے تحت اس کی خرافات سننے پر مجبور تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ مزید بولا۔ "بولو کیا کہتے ہو؟ اگر تمہیں عظمت علی کا خیال ہے تو میں اسے اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔"

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی ملاقات میں بے تکلفی کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ اس میں کچھ عمر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ فرید احمد بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس سے پہلی ملاقات میں مجھے ایسا لگا کہ برسوں کی شناسائی ہو۔ پھر یہ تو یوں بھی اس سے دوسری ملاقات تھی۔ میں نے سوچا کہ فرید احمد کو پُل بنائے بغیر ندی پار اترنا مشکل ہے۔ اسے برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ وہ خود ہی کھیل ہو رہا تھا تو مجھے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ رہی گلونت کور تو مجھے پورا یقین تھا کہ فرید احمد کو گھاس نہیں ڈالے گی۔ فرید احمد بھی اس کا اعتراف کر چکا تھا۔ کھیل بالکل سیدھا سیدھا تھا۔ گلونت کور تک پہنچنے کے لیے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو استعمال کرنا چاہتے تھے اسے مجھ پر صرف اتنی برتری حاصل تھی کہ اس کا گھر گلونت کور کے گھر سے ملا ہوا تھا اور میرے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ اسے کسی بھی مرحلے پر ناک آؤٹ کیا جا سکتا تھا۔ عشق کی اس بازی میں واضح طور پر مجھے اپنی جیت نظر آ رہی تھی۔ عشق و ہوس میں جو فرق ہوتا ہے' وہی فرق میرے اور فرید احمد کے درمیان تھا۔ میں نے اسی لیے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی پیش کش قبول کر لی۔

پھر اس روز شام سے کچھ پہلے میں فرید احمد کے گھر پہنچ گیا۔ فرید احمد اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ابتدا میں میرے اور گلونت کور کے درمیان نہیں آئے گا اور مجھے اس سے خلوت میں ملنے کا موقع دے گا۔ اسی کے ساتھ اس نے رازداری کا وعدہ بھی کر لیا تھا کہ عظمت علی کو ان ملاقاتوں کی خبر نہیں ہو گی۔

چھت پر ہم دونوں ساتھ ہی گئے مگر جب پائل کی صدا سنائی دینے لگی تو وہ پہریداری کے فرائض انجام دینے کے لیے زینے پر جا بیٹھا۔ چھت پر دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور صرف چھپر کے نیچے سایہ تھا مگر عشق میں آدمی سایہ طلب کب ہوتا ہے! آرام طلبی مزاجِ عشق پر گراں گزرتی ہے۔ سو میں بھی سائے سے نکل کر دھوپ میں آ گیا اور دونوں چھتوں کی درمیانی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

حسبِ معمول وہ چھم چھم کرتی ہوش اڑاتی آئی اور چھت پر آتے ہی مجھے دیکھ لیا مگر ایسی بن گئی جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ کپڑے سکھاتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے بار بار مجھے دیکھتی رہی۔ اس دوران میں اس کے حسین ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ بکھرتی رہی۔ میں کچھ نہ بولا کہ بولنا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ وہ مجھ سے اتنے قریب تھی کہ اگر میں کچھ کہتا تو وہ سن لیتی۔ دیوار کے اس طرف میں تھا' اس طرف وہ الگنی پر کپڑے پھیلاتی ہوئی وہ کچھ اور قریب آ گئی اور اسی لمحے جیسے میری سماعت میں رس گھل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا تھا۔ "آج اکیلے کیسے ہو؟ تمہارے لفنگے دوست کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں میرے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا حالانکہ میں نے سفید جھوٹ بولا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" اس نے اسی طرح براہِ راست میری طرف دیکھنے سے گریز کیا اور جھک کر بالٹی سے ایک کپڑا اٹھانے لگی۔

"طارنوش۔" میں نے بتایا۔ اس نے زیرِ لب میرا نام دہرایا۔

"عجیب نام ہے۔ بالکل تمہاری ہی طرح عجیب!" وہ مسکرائی۔ بالٹی اب کپڑوں سے خالی ہو چکی تھی۔ اس نے خالی بالٹی اٹھائی اور پھر اپنی گھنی پلکوں کی چلمن اٹھا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جیسے گنگناتی آواز میں سوال کیا۔ "کل بھی چھت پر آؤ گے نا؟"

"ہاں۔" میں بوجھل سی آواز میں بولا۔ شاید نشۂ حسن سے میری آواز بوجھل ہو گئی تھی۔

میرا جواب سن کر وہ مست کن انداز میں زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ زینے تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی دفعہ مڑ مڑ کر دیکھا اور اپنی نظروں کے تیر چلائے۔ میں کسی زخمی ہرن کی طرح ان تیروں کو اپنے دل میں اتارتا رہا مگر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔

پھر یہ ملاقاتیں روز ہونے لگیں۔ انہی ملاقاتوں کے درمیان اسے میرے بارے میں اور مجھے اس کے متعلق بہت

کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ فرید احمد کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ وہ اب صاف صاف الفاظ میں مجھ سے یہ مطالبہ کرنے لگا تھا کہ میں کسی دن گلونت کور کو اس کی بیٹھک میں بلا لوں۔ اس کی ہوس اب مزید انتظار کی متحمل نہیں ہو رہی تھی۔ میں اسے طرح دے رہا تھا کہ ابھی وہ ڈھب پر نہیں آئی۔

ایک روز شام کو جب میں حسبِ معمول اس کے گھر پہنچا تو وہ بہت اکھڑا ہوا تھا۔ میں اسے رام کرنے کے لیے بولا۔ "کیا ہوا یار' آج تو تم بالکل اداس بلبل لگ رہے ہو۔"

"چھوڑو یار! میں نے سوچا کچھ تھا اور ہو کچھ گیا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا ہو گیا؟ کچھ بتاؤ گے بھی!" میں بولا حالانکہ مجھے سب کچھ معلوم تھا کہ اس کا منہ کیوں بنا ہوا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔

"بتا دوں' کیا سوچا تھا! برا تو نہیں مانو گے؟"

"تم کہو' نہیں مانوں گا برا۔"

"میں نے بلبل سے بلبل پکڑنا چاہا تھا' مگر اے بسا آرزو کہ...."

"تو اب کیا ایسی آفت ٹوٹ پڑی میری جان! بلبل تو زیرِ دام آ چکی ہے' بس ذرا دانہ دنکا چگنے لگے' ڈور کھینچ لوں گا۔" میں نے اسی کی زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "بس تھوڑا سا صبر کر لو!"

"میں صبر کرتا رہوں اور تم بلبل سے چونچ لڑاتے رہو! میں اندھا نہیں ہوں۔ سب دیکھتا رہتا ہوں میں کہ تم اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے کیا کیا کارروائیاں کرتے رہتے ہو!۔ اور وہ۔ اسے تو میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔ ہم سے تو بڑی پارسا بنتی تھی وہ۔"

"اچھا اب غصہ تھوک دو! میں آج اسے گھات پر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے یہ سوچ کر اسے دلاسا دیا کہ کہیں وہ کم بخت واقعی رقیبِ روسیاہ نہ بن جائے اور آج ہی سے مجھے نہ ڈرخاوے۔

"اگر تم کہتے ہو تو میں تمہیں آخری موقع دے دیتا ہوں۔ اب میں مزید الو بننے پر تیار نہیں ہوں۔ آج بھی رات کو تم اسے بیٹھک میں آنے پر آمادہ نہ کر سکے تو اپنا پتا صاف سمجھنا۔ میں تمہیں اس سے مزید ملنے کا موقع نہیں دوں گا۔ پھر میں جانوں اور وہ!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی دھمکی بڑی مشکل سے برداشت کی۔

میں چھت پر پہنچا تو وہ لپک کر دیوار کے قریب آگئی اور شاکی لہجے میں بولی۔ "آج تم نے بڑی دیر کردی آنے میں؟"

"ہاں۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "ایک عذاب مخص میری جان کو لپٹ گیا تھا۔" میں نے اب تک فرید احمد کے ناپاک عزائم سے اسے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ فرید احمد کو میرا مخلص دوست ہی سمجھ رہی تھی مگر اب پانی سر سے گزر گیا تھا۔ مجبوراً میں نے مختصر الفاظ کا سہارا لے کر اسے فرید احمد کا اصل چہرہ دکھا دیا۔

"اتنا کمینہ ہے وہ!" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"اس پر خاک ڈالو اور یہ سوچو کہ اب ہم کہاں مل سکتے ہیں؟ وقت کم ہے اور ابھی تم نے شاید آدھے ہی کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر ایک دم اس کے چہرے پر رونق آگئی "میری ایک سہیلی ہے شانتی۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اسی محلے میں رہتی ہے۔ اس کا باپ چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔ فالج ہو گیا ہے اسے۔ وہ۔ وہ جگہ بہت۔ بہت ٹھیک ہے ملنے کے لیے!۔ مگر میں۔ میں روز وہاں نہیں جا سکتی۔ دوسرے تیسرے دن تو خیر اب بھی ہو آتی ہوں۔" پھر وہ جلدی جلدی مجھے شانتی کے گھر کا پتا سمجھانے لگی۔ شانتی کا گھر وہاں سے دو گلی پیچھے تھا۔

"زندہ باد!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "آخر نکال ہی لی نہ تم نے یا ملن کی راہ! میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں تو میں نے اسے فرید احمد کی طرف سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔

"جان سے ماردوں گی اسے ' اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔" وہ جلال میں آگئی۔ "میں سوار ہلونت سنگھ دی کڑی آں کے کیدڑ دی تھی!"

پھر اس سے اگلے روز صبح دس بجے شانتی کے گھر ملاقات کا طے ہو گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ بدبخت فرید احمد نے تو اپنی دانست میں میرا پتا ہی صاف کر دیا تھا۔ مجھے خوشی یہ تھی کہ اب وہ تاپتا رہ جائے گا اور میں "بلبل" کو لے اڑوں گا۔

"کیا رہا؟" وہ میرے ساتھ زینے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ہنکارا۔ "مان گئی کہ نہیں یا اٹھوانا پڑے گا سالی کو؟"

"وہ کرپان چلانا بھی جانتی ہے پیارے!" میں نے اس سے تفریح لینے کو کہا۔

"وہ ظالم تو خود کرپان ہے!" حسب معمول اس نے سسکاری بھری' پھر لہجہ بدل کر کہنے لگا۔ "وہ تو خیر دیکھا جائے گا کہ وہ کیا کیا چلانا جانتی ہے' فی الحال تو تم مجھے جلانے کی کوشش مت کرو اور مطلب کی بات بتاؤ! آج رات کو وہ آرہی ہے بیٹھک میں کہ نہیں؟"

"میں نے تم سے کہا تھا نہ یار کہ کچھ دن میں مان جائے گی مگر تم میری بات سن کر ہی نہیں دے رہے۔"

"اب بھی مزید کچھ دن چاہئیں تمہیں!۔ بہت خوب!۔ اتنی بڑی دلی میں ایک میں ہی تمہیں الو کی دم فاختہ نظر آیا ہوں!"

"وہ تو خیر تم ہو۔" میں نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔ اب ہم نیچے بیٹھک میں آگئے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"اگر تم الو کی دم فاختہ نہ ہوتے تو اتنا بے صبرا پن نہ دکھاتے۔ معلوم ہے کیا ہوا؟" میں نے اسے مزید گھیرنے کی خاطر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا؟ بولو!" وہ میری چال میں آگیا اور متجسس نظر آنے لگا۔

"تمہارے بے صبرے پن کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کبوتری نے آشیانے پر بیٹھنے سے ہی انکار کر دیا۔"

"کیا مطلب!۔ میں سمجھا نہیں۔"

"اب سمجھنے کو رہ بھی کیا گیا ہے میرے اداس بلبل! دھوتی کی ناک میں لنگوٹی بھی گئی۔" میں اسی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جو اسے پسند تھی۔

"تم صاف صاف بتاؤ نہ یار کہ بات کیا ہوئی اس سے؟ تم نے کیا کہا؟ وہ کیا بولی؟ کچھ پتا تو چلے کہ آخر ہوا کیا؟"

"دراصل میں نے گول مول رکھنے کے بجائے واضح طور پر عرض وصال کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ جو عرضی میں نے اسے پیش کی ہے اس پر اپنے بھائی فرید احمد کے دستخط بھی ہیں یعنی تم بھی مشتاق وصل یار ہو۔ مقام وصل سے بھی میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق اسے آگاہ کر دیا کہ وہ تمہاری بیٹھک ہو گی۔ پھر تو جناب اللہ دے اور بندہ لے! آپے سے باہر ہو گئی وہ! اور کہنے لگی کہ کرپان سے پیٹ پھاڑ دوں گی فرید احمد کا! اسی سے تو مجھے پتا چلا کہ وہ کرپان چلانا بھی جانتی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے خوشامد درآمد کر کے اسے ٹھنڈا کیا ورنہ تو وہ اسی وقت کرپان لینے جا رہی تھی۔ مجھے بھی اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اب میں تمہاری چھت پر نظر آیا تو زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"ارے ظالم تم نے یہ کیا کر دیا! اگر اس نے اپنے باپ

سے کہہ دیا تو کیا ہو گا؟ وہ تو ویسے ہی آتے جاتے مجھے بڑی خونخوار نظروں سے دیکھتا ہے۔ میں تو ہیں اس سردار کے بچے سے تو میرے ابا بھی دبتے ہیں۔ تم نے مروا دیا مجھے تو! ارے یہ معاملے بڑے چپ چپاتے نمٹائے جاتے ہیں تاکہ سانپ نکل جانے کے بعد لاٹھی پیٹنے سے کچھ نہ ہو۔ پہلے تو ہمیں کسی بھی طرح اس بلبل کے پر کاٹنے تھے۔ تم نے تو اسے ہشکار اڑا ہی دیا۔ بڑا غضب کیا تم نے پیارے' بڑا غضب کیا!۔ تم تو نرے اناڑی نکلے۔ ارے اس طرح عرض وصل کی عرضیاں منظور ہوتی ہیں!۔ الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔"

"یار! تمہاری تو ہوا شٹ ہونے لگی اتنی سی بات پر! اور ابھی تم اسے اٹھوا لینے کی باتیں کر رہے تھے!" میں نے اسے تپایا۔

"یہ تمہیں اتنی سی بات لگ رہی ہے!۔ کمال کرتے ہو! جسے تم اتنی سی بات کہہ رہے ہو' اس پر تو خون ہو جاتے ہیں خون! بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ سوچنے دو مجھے کہ اب کیا کیا جائے اور۔ اور بہتر یہ ہے کہ اب تم یہاں سے کھسک ہی لو! دو چار دن ادھر نہ آنا اور میں بھی اس چھپن چھری کے سامنے نہیں پڑوں گا۔ خدا کرے وہ اپنے باپ کو کچھ نہ بتائے۔"

فرید احمد سے میں نے خاصی تفریح لے لی تھی اور اس کی ساری اکڑ فوں نکل گئی تھی اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ ڈیڈی کا اصرار تھا کہ میں اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے لندن جانے پر راضی ہو جاؤں۔ وہ تو مجھے ملک سے باہر بھیجنے کی بات کر رہے تھے اور میں دہلی تک چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کو مقدمہ بغاوت میں دو سال قید کی سزا ہو گئی تھی۔ انہوں نے دہلی میں جو ایک درس گاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تھی اس نے کام شروع کر دیا تھا مگر مولانا کی گرفتاری کی وجہ سے اس کا نظم و نسق ابھی بہتر نہیں ہوا تھا۔ میں اگر ضد پر اڑ جاتا تو یہ مجبوری ڈیڈی کو میری بات ماننی ہی پڑتی اور مجھے اس درس گاہ میں داخل کرا دیتے' لیکن اب میں ان سے زیادہ ضد نہیں کرتا تھا۔ انہوں نے جس طرح میری بے سہارا ماں کو سہارا دیا تھا اور جس طرح مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا' اس کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ میں نافرمانی پر اتر آتا۔ میں ان کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے دل کے تقاضوں کی بھی خبر تھی۔ کلونت کور کو چھوڑ کر بھلا میں کیسے کہیں چلا جاتا۔ میری اور اس کی ملاقاتیں جاری تھیں اور اب ملاقاتوں میں گرم جوشی آگئی تھی۔ میرا اور اس کا عشق اب عہد و پیماں کی منزلوں میں داخل ہو چکا تھا۔

دوسری جانب ایک خاص مقصد کے حصول کی خاطر اپنے نانا نواب فرقان علی کی کوٹھی میں بھی میری آمد و رفت خاصی بڑھ گئی تھی۔ میرا زیادہ تر وقت انہی کے ہاں گزرتا۔ اپنے گھر کی حیثیت تو اب میرے لیے ایک سرائے کی سی ہو گئی تھی۔ نواب صاحب کی کوٹھی میں اب مجھ سے پردہ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ میری حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ظاہری اخلاق اور تہذیب و شائستگی سے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ جس گھر میں تین تین جوان لڑکیاں موجود ہوں وہاں ایک اجنبی نوجوان کو بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت دے دی جائے' مگر وہ زمانہ ایسا ہی تھا۔ جسے ایک بار اپنا کہہ دیا جاتا پھر وہ ہر حال میں اپنا ہی ہوتا تھا پرایا نہیں۔ معزز اور روایتی گھرانوں میں تعلقات اور دوستی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ جب گھر کے اور افراد موجود ہوتے تو میں رابعہ' زاہدہ اور زیبا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ وہ تینوں بھی محتاط رہتیں مگر انہیں یا مجھے جیسے ہی کوئی موقع مل جاتا ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ یہ بڑا خطرناک کھیل تھا۔ میں الگ الگ ان تینوں ہی غزالانِ خوش خرام و خوش اندام کو آہستہ آہستہ زیر دام لا رہا تھا۔ میں یہ کھیل پورے اعتماد سے کھیل رہا تھا اس لیے کہ اس گھر میں اب میرا اعتبار قائم ہو چکا تھا۔

ان حالات میں دہلی سے میرا کہیں جانا' ممکن نہیں تھا مگر ڈیڈی اور ممی کو کس طرح مطمئن کیا جائے' یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسی دوران میں ایک روز جب میں رات کے وقت نواب صاحب کی کوٹھی سے واپس آیا تو ڈیڈی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"کیا سوچا تم نے؟" ڈیڈی نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہارا سال ضائع ہو جائے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے بیٹے! میں نے اس مسئلے کا ایک حل نکالا ہے۔ اگر تم لندن جانا نہیں چاہتے ہو تو علی گڑھ چلے جاؤ! وہاں کا معیارِ تعلیم بھی برا نہیں ہے۔ رہی یہاں دہلی کے جامعہ ملیہ میں داخلے کی بات تو میرے خیال میں فی الحال یہ مناسب نہیں ہے' کسی بھی طرح مناسب نہیں! پہلے بھی میں اس سلسلے میں تم سے تفصیلی بات کر چکا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں عجب گو مگو کے عالم میں تھا کہ کہوں تو کیا کہوں!

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہو رہا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ فی الحال ڈیڈی سے سوچنے کی کچھ مہلت لے لوں اور میں نے یہی کیا۔

"کوئی فیصلہ کرنے میں اتنی دیر نہ لگا دینا کہ داخلوں کا وقت ہی گزر جائے۔" انہوں نے مجھے تاکید کی، پھر بولے۔ "جاؤ اب آرام کرو۔"

ڈیڈی کے کمرے سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا ذہن بے حد الجھا ہوا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ اچانک مجھے وہی پُراسرار خوشبو محسوس ہوئی جس سے میں اب مانوس ہو چکا تھا۔ پھر آشنا سرگوشی ابھری۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! تم فی الحال یہیں دہلی میں رہو گے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ اس پُراسرار نادیدہ وجود نے میری رہنمائی کے لیے پیش گوئی کی تھی۔ اب تک مجھ سے سرگوشیوں میں جو کچھ کہا جاتا رہا تھا، وہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ مجھے اسی لیے یقین سا آ گیا کہ پیش گوئی درست ثابت ہو گی۔ ہاں میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا کس طرح ممکن ہے؟ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ چند ہی لمحوں میں وہ خوشبو معدوم ہو گئی۔ اب میں اس سے حواس باختہ نہیں ہوتا تھا۔ بڑی حد تک میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اس لیے میں آرام سے سو گیا۔

دوسرے دن جب میں رات کا کھانا کھا کر نواب صاحب کی کوٹھی جانے والا تھا کہ ڈیڈی آ گئے۔ انہیں آج دفتر سے لوٹنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی اور ممی فکر مند تھیں۔ ڈیڈی کے آنے سے میں بھی کچھ دیر کو رک گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے ڈیڈی کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آئے تھے اور میں اس کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ ڈیڈی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئے اور ٹانگیں پھیلا دیں۔

"ڈیسوزا!" ممی نے ڈیڈی کو مخاطب کیا۔ "تم آج کچھ الجھے الجھے سے لگ رہے ہو، دیر سے بھی آئے ہو، کیا بات ہے؟"

"بتاتا ہوں، پہلے ایک کپ عمدہ سی چائے پلوا دو۔" ڈیڈی طویل سانس لے کر بولے۔ "اتنے میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"وقت تو خیر کھانے کا ہے مگر تم کہتے ہو تو میں چائے بنوا دیتی ہوں۔" ممی بولیں اور ملازمہ کو چائے بنانے کے لیے کہا۔

"کھانا میں نے صاحب لوگوں کے ساتھ دفتر ہی میں کھا لیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے ڈیڈی لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

آج رات میں نے زیبا سے کوٹھی کے عقبی باغ میں ملنے کا وعدہ لے لیا تھا مگر یہاں صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ مجھے رکنا پڑا۔

کچھ دیر بعد جب ڈیڈی لباس تبدیل کر کے آ گئے تو چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ممی سے بولے۔ "میرے کپڑے اور دیگر ضروری سامان تمہیں سوٹ کیس میں رکھنا ہے اور ہولڈ آل بھی اسٹور سے نکلوانا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی؟ کیا تم کہیں جا رہے ہو؟ کہیں باہر؟" ممی نے پوچھا۔

"ہاں۔" ڈیڈی نے جواب دیا۔ "مجھے فوری طور پر کلکتے بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں مجھے کم از کم دو ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ کل ہی صبح مجھے روانہ ہونا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے! چلے جاؤ۔" ممی نے کہا۔

"سرکاری ذمے داریاں تو خیر اپنی جگہ ہیں، انہیں تو خیر میں کسی طرح بھگت ہی لوں گا۔ مجھے اصل پریشانی اس کی طرف سے ہے۔" ڈیڈی نے میری طرف اشارہ کیا۔

"وہ کیوں ڈیڈی؟" میں بول اٹھا۔

"تمہارے داخلے کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا نا! کل بھی میں نے تم سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ وقت اب کم رہ گیا ہے اور ایسے موقع پر مجھے مجبوراً کلکتے جانا پڑ رہا ہے۔"

"میری طرف سے آپ قطعی فکر نہ کریں ڈیڈی! جب تک آپ کلکتے سے لوٹ کر آئیں گے، میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر چکا ہوں گا۔" میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"ٹھیک ہے، لیکن میرے آنے کے بعد تم ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرو گے!"

"بہتر ہے۔" میں سعادت مندی سے بولا۔ اس وقت میرے ذہن میں وہ سرگوشی گونج رہی تھی جو میں نے گزشتہ رات سنی تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے پہلے سے یقین تھا۔ پندرھویں دن ڈیڈی کا تار ملا کہ ابھی وہ دہلی نہیں آ سکتے۔ حکومت کی طرف سے انہیں مزید ایک مہینے کلکتے میں رکنے کے احکام مل گئے تھے۔ اسی میں داخلوں کا وقت گزر گیا۔ ممی نے ایک آدھ بار دبی دبی زبان میں اس سلسلے میں کہا بھی مگر میں ٹال گیا۔

عظمت علی نے اس دوران جامعہ ملیہ میں داخلہ لے لیا تھا کیوں کہ وہ دہلی کی رنگینیاں چھوڑ کر علی گڑھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی بس وہ خانہ پُری کے لیے پڑھ رہا تھا کہ نواب

خاندان کا فرد ہو کر جاہل نہ کہلائے۔ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس کے سارے مشغلے وہی تھے جو فکرِ معاش سے آزاد کسی رئیس گھرانے کے فرد کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ میں بھی چاہتا تو جامعہ ملیہ میں داخلہ لے سکتا تھا، لیکن ڈیڈی کی مرضی کے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنا ایک تعلیمی سال ضائع ہو جانے پر افسوس تو تھا مگر ڈیڈی کی ناراضی منظور نہیں تھی۔ جامعہ ملیہ میں داخلہ لینے کو وہ صاف صاف منع کر چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی وجہ ان کی سرکاری ملازمت بھی تھی۔ یہ جامعہ ایک ایسے شخص کے نام سے منسوب تھی، مسلمانوں کے لیے اس کی بنیاد ایک ایسے شخص نے ڈالی تھی جو انگریز کی حکومت کا باغی تھا اور جو بغاوت کے ہی الزام میں سزا بھگت رہا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز حکمراں بوکھلا گئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی مکمل آزادی کا نعرہ بلند کر چکے تھے۔ انگریز اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ ظلم و تشدد کر کے آزادی کے حق میں اٹھنے والی آوازوں کو دبا دیں گے۔ انہیں یہ گمان تھا کہ ہندوستان کے رہنما قید و بند کی صعوبتوں سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیں گے، مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے جیل جانا قبول کر لیا مگر آزادی کا سودا نہیں کیا۔

ان دنوں ہندوستان بھر کے تقریباً تمام ہی بڑے بڑے رہنما قید کر دیے گئے۔ ان میں مسلمان رہنماؤں کی اکثریت تھی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد سبھی قید تھے اور جو ابھی زیرِ دام نہیں آ سکے تھے ان کے لیے کوششیں جاری تھیں۔ کچھ پر مقدمات چلا کر سزائیں سنائی جا چکی تھیں اور کچھ پر مقدمات چلائے جا رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک رہنما تحریر و تقریر کا بادشاہ تھا مگر زبان و قلم پر لگائی جانے والی پابندیوں نے ان کے حوصلے اور مضبوط کر دیے۔

کلکتے میں بھی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی کلکتے ہی میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ ڈیڈی کا شمار کیوں کہ اعلیٰ سرکاری افسران میں ہوتا تھا اس لیے مجھے شبہ تھا کہ وہ انہی مقدمات کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے ثبوت فراہم کرنے کے لیے وہاں بھیجے گئے ہیں۔ اس شبے کے سبب مجھے اپنے آپ پر ندامت سی تھی۔ یہ احساس میرے لیے باعثِ ندامت تھا کہ میں جس شخص کو ڈیڈی کہتا ہوں اور جس نے میری پرورش کی ہے، وہ شخص ظالم حکمرانوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔ ہاں ڈیڈی کے کلکتے جانے اور خلافِ توقع وہاں رک جانے کی وجہ سے میں ابھی تک دہلی ہی میں تھا۔ کچھ عرصے پہلے ایک نادیدہ پُراسرار وجود نے جو پیش گوئی کی تھی کہ تم فی الحال دہلی ہی میں رہو گے، یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔ یہی میری خواہش بھی تھی اور میری محبوبہ کلونت کور بھی یہی چاہتی تھی۔

کچھ تو ممی ڈیڈی کا دل رکھنے کی خاطر اور کچھ یہ سوچ کر کہ میرا ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا ہے، میں نے دن کا کچھ وقت حصولِ علم میں لگا دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم بھی میں نے گھر ہی پر ٹیوٹرز کے ذریعے حاصل کی تھی۔ اب میں نے پھر یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ممی اس سے خوش ہو گئیں کہ میں اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بجائے گھر پر ٹیوٹرز کے ذریعے پڑھنے میں اخراجات خاصے تھے مگر ممی کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ وہ بخوشی یہ اخراجات برداشت کرنے پر راضی ہو گئیں۔ یوں بھی بچپن سے انہوں نے مجھے پیسے کے معاملے میں تنگ دست نہیں رکھا تھا۔ میری جیبیں ہمیشہ بھری رہتی تھیں۔ میری ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ گھر پر پڑھنے سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ڈیڈی جب کلکتے سے لوٹ کر آئیں تو انہیں میرے تعلیمی سال کے ضائع ہو جانے کا زیادہ رنج نہ ہو۔ پھر یہی ہوا، ڈیڈی جب تقریباً دو ماہ بعد کلکتے سے لوٹ کر آئے تو انہوں نے میرے اس اقدام کو بہت سراہا اور کہا کہ تم اپنی تعلیمی استعداد بڑھا لو، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں براہِ راست سیکنڈ ایئر میں داخلہ مل جائے۔ مسلم اورینٹل کالج علی گڑھ کے انگریز پرنسپل تک میری رسائی مشکل نہیں ہے۔ میں خود تمہارے ساتھ علی گڑھ چلوں گا اور میرے خداوند نے چاہا تو اگلے سال سیکنڈ ایئر میں تمہیں داخلہ مل جائے گا۔

میں اب تک نام ہی کا مسلمان تھا۔ مجھے اپنے مذہب کی بنیادی باتوں تک کا علم نہیں تھا۔ عربی، فارسی اور اردو پڑھنے کے لیے میں نے ایک الگ ٹیوٹر رکھ لیا تھا۔ اسی کے ساتھ میں اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی کرنا چاہتا تھا، مگر وہ میری اگلی منزل تھی کیوں کہ اسلامی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں عربی، فارسی اور اردو ہی میں تھیں اور یہ تینوں زبانیں ابھی میں سیکھ رہا تھا۔ یا تو یہ میری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کا اثر تھا یا پھر اپنے استادوں کے بہ قول میں غیر معمولی ذہین طالب علم تھا کہ تینوں ہی زبانیں میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ سیکھ رہا تھا۔

صرف حصولِ علم ہی میں نہیں بلکہ میں کئی جہتوں میں بہ یک وقت انتہائی تیز رفتاری کا ثبوت دے رہا تھا۔ نواب صاحب کی کوٹھی کے تینوں "غزال" اب میرے اشارے پر

چوکڑیاں بھرنے لگے تھے۔ ہر غزال کی خواہش تھی کہ پہلے اسے شکار کیا جائے اور میں ان تینوں ہی کو اب تک چکر دے رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک ایسا حیران کن پُراسرار واقعہ رونما ہوا کہ میں اپنے وجود کی گتھیاں سلجھانے میں کچھ اور بھی الجھ گیا۔

یہ ایک ملگجی شام کا واقعہ ہے کہ جب میں نواب صاحب کی کوٹھی میں تھا۔ حسب معمول عظمت علی سے میری شطرنج کی بازی جمی ہوئی تھی کہ زیبا وہاں آگئی اور ٹھنک کر بولی۔ "آپ لوگ باغ میں چلیں اور ہمیں جھولا جھلائیں۔"

میں نے زیبا کی طرف دیکھا۔ غرارہ سوٹ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے مجھے اشارہ کیا۔ عطر بھی اس نے جی بھر کے لگایا تھا' مہک رہی تھی۔

"پگلی ہو گئی ہو کیا! دیکھ نہیں رہیں کہ یہاں زبردست بازی لگی ہوئی ہے!" عظمت علی بساط سے اپنا رخ اٹھا کر چال چلتے ہوئے بولا۔

"اللہ اتنا حسین موسم ہے' آسمان پر بادل گھر گھر کر آرہے ہیں اور آپ ہیں کہ یہاں بند ہیں۔" زیبا ایک ادا سے بولی۔

"گھر میں کوئی اور نہیں ہے جو تم ہمارا بھیجا چاٹ رہی ہو! کسی ملازمہ کو ساتھ لے جاؤ۔ تمہیں بادل گھر گھر کے آنے کی پڑی ہے اور یہاں اپنا بادشاہ گھرا ہوا ہے۔"

"دادی اماں نے ساری ملازماؤں کو باورچی خانے میں بھیج دیا ہے۔ کچھ خبر بھی ہے جناب کہ کڑھائی چڑھنے والی ہے۔ گرما گرم پوریاں کچوریاں تلی جانے والی ہیں۔ دادا حضور کا فرمان ہے' کسی اور کا نہیں کہ دادی اماں ٹال جاتیں۔"

"لیکن تم تو ٹلو یہاں سے اللہ کی بندی!" عظمت علی بولا "رابعہ باجی ہیں' زاہدہ باجی ہیں' ارے کسی کو بھی ساتھ لے جاؤ باغ میں جھولا جھولنے کو!"

اسی وقت میں نے اپنا وزیر آگے بڑھایا اور شہ دی۔

"وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں سو رہی ہیں جناب! سبق پڑھائے جا رہے ہیں کہ اسے لے جاؤ' اسے لے جاؤ مگر خود نہیں ٹل کے دے رہے اپنی جگہ سے! دیکھیں اگر آپ لوگوں نے ہمیں زیادہ ستایا نا تو معلوم ہے کہ ہم کیا کریں گے۔ ہم بازی بگاڑ دیں گے!" یہ کہہ کر وہ جھکی اور یوں جھکی کہ میرے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ شاید وہ دانستہ عظمت علی سے قدرے دور اور مجھ سے لگ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے یوں اچانک جھکنے سے میرا سارا وجود خوشبو کے گرداب میں گردش کرنے لگا۔ اس کے جسم کا لمس دیوانہ کر دینے والا تھا' مگر دیوانہ بہ کار خویش ہشیار تھا سو جلد سنبھل گیا۔

میں نے خود پر قابو پانے کے بعد اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "سنو! بس چند چالوں کی بات ہے' مان جاؤ! تمہارے بھیا کو مات ہونے والی ہے۔"

"کوئی لوٹ نہیں بچ رہی ہے کہ مات ہونے والی ہے!" عظمت علی نے اکڑ کر کہا۔ "پیدل دوں گا پیدل! بچو وزیر پٹ ہونے والا ہے۔" یہ کہہ کر جوش میں اس نے اگلی چالیں گنے بغیر میرا وزیر مار لیا' پھر چہچہایا "بڑے آئے تھے وزیر سے شہ دینے!"

جس خانے میں میرا وزیر تھا اب وہاں اس کا رخ آگیا تھا۔ اس کے بادشاہ کو چلنے کے لیے کوئی گھر نہیں بچا تھا۔ آگے خود اس کے پیدلوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اس کے رخ سے دانستہ اپنا وزیر پٹوایا تھا کہ بادشاہ کو کوئی چال چلنے کی جگہ نہ رہے۔ اگر وہ اگلی چالیں گن لیتا کہ میرا وزیر پیٹ لیا تو کیا صورت ہوگی' پھر اتنا بے بس نہ ہوتا۔

میرا اشارہ پا کر زیبا میرے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی تھی اور میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"چلو مات ہو گئی تمہیں!" میں نے چال چلنے سے پہلے ہنس کر عظمت علی کو مخاطب کیا۔

"اندھی نہیں لگ رہی یار ے! چال چلو۔ تم پورا وزیر کم ہو کھد بڑ کھد بڑ کر رہوں گا!" عظمت علی جواباً بولا۔

"اندھی تو لگ بھی گئی جان عزیز! افسوس کہ تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا گھوڑا اٹھایا اور بولا۔ "یہ شہ!۔۔۔ اور یہ مات!"

عظمت علی حق دق رہ گیا' پھر کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا "واقعی اندھی لگ گئی!"

زیبا کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیا اور بولی۔ "اب شرافت سے کھڑے ہو جائیں اور ہمیں باغ میں چل کر جھولا جھلائیں ہم دوسری بازی کھیلنے نہیں دیں گے۔"

"اچھا چلو بابا!" عظمت علی نے بھنا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری وجہ سے میں بازی ہارا ہوں۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "چلو تم بھی اٹھو! ابھی تم ٹلو گے نہیں' ایک بازی اور لگے گی۔"

"تین بازیاں ہو چکی ہیں جن میں سے تم دو ہار چکے ہو۔ بس ہو گیا آج کی بازیوں کا فیصلہ! مجھے اب جانے ہی دو۔" میں نے دانستہ مسکرا کر کہا میں جانتا تھا کہ عظمت علی مجھے ہرگز نہیں جانے دے گا۔ انکار سے میرا مقصد محض یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے ان دونوں کے ساتھ باغ میں جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

"بالکل نہیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "تمہیں رکنا پڑے گا!"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے' میں یہیں ہوں' تم زیبا کو جھولا جھلا کر آجاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے زیبا کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس نے مجھ پر آنکھیں نکالی تھیں۔

"اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ میں تمہیں جیت کر چپکے سے کھسک جانے کا موقع دے دوں۔ اٹھو! ساتھ چلو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"مجبوراً۔" میں ان دونوں کے ساتھ باغ میں آگیا۔ موسم واقعی بہت حسین ہو رہا تھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ زیبا نے غلط نہیں کہا تھا۔ بڑے سے ایک پیڑ کی ڈال پر جھولا پڑا تھا۔

"جلدی بیٹھو جھولے میں!" عظمت علی مسکرا کر زیبا سے بولا۔

"بیٹھتے ہیں بھئی' ایسی بھی کیا آفت ہے!" زیبا اپنا غرارہ سنبھالتی ہوئی جھولے پر بیٹھ گئی۔

عظمت علی اور میں باری باری اسے جھولا جھلانے لگے۔ اسی وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔

"ایسے میں گرم گرم کچوریاں ہوں نا تو مزا آجائے۔" زیبا جھولا جھولتے ہوئے عظمت علی سے بولی۔

میں سمجھ گیا کہ اس بہانے زیبا وہاں سے عظمت علی کو ٹرخانا چاہتی ہے۔

"ہاں واقعی یہ بات تو ٹھیک کہہ رہی ہو تم! میں ابھی کسی ملازمہ سے کہہ کر آتا ہوں کہ ہم باغ میں ہیں' ہمارے لیے کچوریاں لے کر آجائے۔" عظمت علی فوراً بول اٹھا۔ وہ زیبا کے داؤ میں آگیا اور ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتا ہوا کوٹھی کی طرف چل دیا۔ زیبا کو جھولا جھلانے کا "فرض" وہ مجھے سونپ گیا۔

"اور زور سے!۔۔۔ اور زور سے!" زیبا جھولا جھولتے ہوئے بلند آواز میں بولی۔ اس دوران عظمت علی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب نظر آنے والے پیڑوں کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ زیبا اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ پینگ لے کر واپس آئی تو اس نے دونوں پیر زمین پر ٹیک دیے اور جھولا رک گیا۔ اس کا جسم میرے سینے سے آلگا۔ میں نہ تو فرشتہ تھا اور نہ پتھر کا بنا ہوا کہ مجھ پر حسین موسم اور حسین جسم کے قرب کا نشہ طاری نہ ہوتا۔ میں نے اسے اپنی دونوں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

"اف! یہاں کوئی دیکھ لے گا' چھوڑ دیں ہمیں!" اس کی ترغیبی آواز نے میرا نشہ اور سوا کر دیا۔

ان لمحات میں مجھ پر نہ جانے کیا ایسی وحشت طاری ہوئی کہ اسے گھسیٹ کر دور گھنے پیڑوں کے پیچھے لے گیا۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا کہ وقت کتنا گزر چکا ہے! میں تو اس وقت چونکا جب اردگرد سے "زیبا!۔۔۔ زیبا!" کی صدائیں سنائی دینے لگیں اور اس وقت تو مجھ پر سناٹا بیت گیا جب میں نے سامنے ہی عظمت علی کو آتے دیکھا۔ وہ صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ راہِ فرار مسدود تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" زیبا نے گھبرا کر سرگوشی کی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اسے میری آغوش سے اٹھنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔

"تم کہہ دینا کہ ٹھوکر کھا کر یہاں گر گئی تھیں اور پھر بے ہوش ہو گئیں۔۔۔ اور میں۔۔۔ میں عظمت علی کے جاتے ہی چلا گیا تھا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ۔۔۔ کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے فرار ہو جاؤں۔" میں نے بھی جواباً دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔

میں نے کہنے کو تو زیبا سے کہہ دیا تھا مگر اوسان میرے بھی خطا ہو چکے تھے ہر طرف سے زیبا کو صدائیں لگانے والے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور عظمت علی تو بے حد قریب پہنچ چکا تھا۔ زیبا خوف اور متوقع رسوائی کے سبب میری آغوش میں سمٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اب فرار کا وقت گزر چکا تھا۔ زیبا اگر اپنے حواس نہ کھو بیٹھتی تو میں لپک کر کسی قریبی پیڑ ہی پر چڑھ گیا ہوتا۔

میرا دل انتہائی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے وجود کو دہکتے ہوئے انگاروں پر پھینک دیا ہو۔ میں نے گھبرا کر زیبا کو اپنی آغوش سے دور دھکیل دیا اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل گئی۔

"زیبا!" عظمت علی چیخا اور دوڑ کر پیڑ کی دوسری جانب سے اچانک میرے سامنے آگیا۔

عظمت علی کے سامنے آنے سے چند ہی لمحے پہلے میں خوف زدہ کر دینے والے پُراسرار تجربے سے گزر چکا تھا۔ مجھے اپنا جسم نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا جسم غائب ہو چکا تھا۔ میں ایک نادیدہ وجود میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں عظمت علی کو بالکل اپنے سامنے زیبا پر جھکتے دیکھ رہا تھا مگر یقیناً عظمت علی مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔

پھر میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں رکا اور تقریباً دوڑتا ہوا پہلے باغ سے اور پھر کوٹھی کی حدود سے نکل گیا۔ اس دوران میں کوٹھی کے ملازمین اور مکین دونوں ہی سے میری مڈبھیڑ ہوئی مگر ان میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں حالانکہ ان کے درمیان ہی سے گزرا تھا مگر انہیں نظر نہیں آیا تھا۔

کوٹھی سے نکل آنے کے بعد مجھ پر شدید خوف کا غلبہ ہو گیا۔ میرا جسم جانے کیسے مجھ سے کھو گیا تھا' جدا ہو گیا تھا۔ کیا میرا جسم مجھے اب کبھی واپس نہیں ملے گا؟ کیا میں بھٹکتی ہوئی کوئی آوارہ روح بن گیا ہوں؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ خوف کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اپنی حالت پر انتہائی رنج ہونے لگا۔

اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک مجھے شدید قسم کی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اسی کے ساتھ مجھے میرا جسم واپس مل گیا۔ زندگی میں شاید اتنی خوشی مجھے کبھی نہیں ملی جو اس لمحے محسوس ہوئی۔ میں زور سے ہنس پڑا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ میں اس شخص کی پروا کیے بغیر ہی اپنی ہی دھن میں مست تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

گھر پہنچ کر بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کر کے جب میں اپنے کمرے میں آگیا تو گزرے ہوئے دہشت ناک واقعے کے متعلق سوچنے لگا۔ کسی بھی طرح یہ عقل میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں یہ سوچ کر فکرمند ہو گیا کہ اگر پھر کبھی ایسا ہو گیا اور میرا جسم مجھے واپس نہ ملا تو کیا ہو گا؟

"ایسا نہیں ہو گا۔" میرے کانوں میں ایک مانوس سرگوشی ابھری اور میرا کمرا خوشبو سے مہکنے لگا۔ "تم سے کہا گیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر خود تمہارے وجود کے اسرار کھلتے جائیں گے' سو یہ اسرار کھل رہے ہیں۔ ان سے خوف زدہ یا ملول ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تو اس پر خوش ہونا چاہیے کہ قادرِ مطلق نے تمہارے حیرت انگیز وجود کو ایسی خوبیوں سے مالا مال کیا ہے جو دوسرے انسانوں کو میسر نہیں۔ شکر بجا لاؤ اس کا کہ جو ہر شے پر قادر ہے۔ تمہارے وجود میں جو پُراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں' وہ رفتہ رفتہ ہی تم پر ظاہر ہوں گی اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ تمام تر قوتیں تمہارے ارادے کی پابند ہو جائیں گی۔ اس دن کا انتظار کرو کہ وہ دن ابھی آیا نہیں۔" انہی الفاظ کے ساتھ سرگوشیاں بند ہو گئیں اور مانوس خوشبو بھی میرے کمرے

سے غائب ہو گئی۔

میں جس حالت میں بیٹھا تھا دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا اور میری سماعت میں وہی سرگوشیاں گونجتی رہیں جو اب معدوم ہو چکی تھیں۔ کیا واقعی میں دنیا میں رہنے والے تمام انسانوں سے مختلف ہوں' یہ خیال میرے اندر ایک احساس تفاخر پیدا کرنے لگا۔ مجھے تصویر کا دوسرا رخ نظر آنے لگا مجھ سے کہا گیا تھا کہ میرے وجود میں پُراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں' قادرِ مطلق نے مجھے بڑی خوبیوں سے مالا مال کیا ہے۔ اگر میں بذاتِ خود ایک پُراسرار تجربے سے نہ گزر چکا ہوتا تو شاید مجھے ان سرگوشیوں پر اتنا یقین نہ آتا۔

"میں عام انسانوں سے مختلف ہوں۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا "میں ان سے برتر ہوں۔ مگر کیوں؟۔ ایسا کیوں ہے؟ وجہ کیا ہے اس کی؟" بڑبڑاتے بڑبڑاتے میں خود ہی چپ ہو گیا میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر میں اپنے گزرے ہوئے اس پُراسرار واقعے پر غور کرنے لگا۔ میں ایک یقینی رسوائی اور ممکنہ ذلت سے بچ گیا تھا۔ زیبا کو میری آغوش میں دیکھ لیا جاتا تو یقیناً آئندہ نواب صاحب کی کوٹھی میں قدم نہ رکھ پاتا۔ پھر جو کچھ میں نے سوچا تھا پورا نہ ہوتا۔ ان سنسنی خیز لمحات کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک میرے اندر سرخوشی کی ایک لہر سی پیدا ہونے لگی۔ میں ایک اور ہی نہج پر سوچ رہا تھا۔ اگر میری یہ اہلیت میرے ارادے اور خیال کی پابند ہو جائے یعنی میں جب نظر آنا چاہوں' نظر آؤں اور جب چاہوں نظر نہ آؤں تو کیا صورت پیش آئے گی؟ پھر تو میں بلا روک ٹوک جہاں چاہوں گا آجا سکوں گا۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

پہلا خیال مجھے کلونت کور کا آیا کہ میں بلا جھجک اس کے گھر میں داخل ہو رہا ہوں۔ مجھے یہ پروا نہیں کہ گھر میں کون کون موجود ہے' میں سب کے سامنے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے جاتا ہوں اور۔ اور اس سے خراجِ محبت وصول کرنے لگتا ہوں۔ صفحۂ ذہن پر ابھرنے والے اس لذت انگیز منظر نے مجھ پر بے خودی سی طاری کر دی۔ پھر میرے

خیال کی رو زیبا' زاہدہ اور رابعہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ دوسرا سکون بخش منظر میرے ذہن میں ابھرا۔ خوشبو میں بسی ہوئی زیبا محوِ خواب ہے۔ میں اس کی خواب گاہ میں داخل ہوتا ہوں' اسے جگاتا ہوں اور اپنے سے قریب کر لیتا ہوں۔ اسی وقت کمرے میں کوئی داخل ہوتا ہے۔ یہ زیبا کی ماں ہے' مگر میں نظر نہیں آتا۔ وہاں سے میں رابعہ کے پاس پہنچتا ہوں۔ وہ اپنی دادی کے کمرے میں ہے اور وہاں گھر کے دیگر افراد بھی موجود ہیں لیکن میں نہیں ڈرتا اور رابعہ کے قریب پہنچ جاتا ہوں۔ میں اس کے کان میں سرگوشی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ کمرے سے باہر آجاتی ہے۔

اس روز میں نے اپنی چشمِ تصور سے بہت حسین منظر دیکھے۔

دوسرے دن صبح کے وقت مجھے کلونت کور سے نہیں ملنا تھا۔ ہفتے بھر میں اس سے بس دو تین روز ہی ملاقات ہو پاتی تھی۔ دوپہر کے بعد میرے ٹیوٹرز آجاتے تھے جو تقریباً شام تک مجھے پڑھاتے تھے عموماً میں شام کے وقت ہی نواب صاحب کی کوٹھی کا رخ کرتا تھا لیکن گزشتہ روز جو واقعہ پیش آیا تھا' اس نے میرے اندر تجسس پیدا کر دیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس واقعے کا گھر والوں پر کیا ردِعمل ہوا اور میرے وہاں سے غائب ہو جانے کے بعد زیبا پر کیا گزری؟ میں نے اسی لیے ناشتا کرتے ہی نواب صاحب کی کوٹھی کا رخ کیا۔ مجھے علم تھا کہ اس وقت عظمت علی نہیں ہو گا اور وہ مدرسے گیا ہو گا مگر اب کوٹھی میں اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد بھی مجھ سے خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔

کوٹھی میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک ملازمہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ زیبا کی طبیعت خراب ہے اور اسے بخار آگیا ہے۔

وہ بڑی کوٹھی چار حصوں میں تقسیم تھی۔ اس کا ایک حصہ بڑے نواب صاحب' یعنی میرے نانا نواب فرقان علی اور میری نانی کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرے حصے میں بڑے ماموں نواب زادہ عرفان علی رہتے تھے۔ دائیں جانب والے حصے میں چھوٹے ماموں نواب زادہ غفران علی کی سکونت تھی۔ کوٹھی کا بیرونی حصہ مردانہ کہلاتا تھا جس سے ملحق مہمان خانہ تھا۔ اس مہمان خانے کو مردانے حصے ہی میں شمار کیا جاتا تھا۔ کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد بائیں جانب سرونٹ کوارٹرز کے سامنے گھاس کے بڑے بڑے قطعے تھے۔ گھاس کے ان قطعوں اور باغ کے درمیان سڑک تھی جو کوٹھی تک جاتی تھی۔

ملازمہ سے جب مجھے زیبا کی علالت کے بارے میں معلوم ہوا تو میں کوٹھی کے اس حصے کی طرف چل دیا جو میرے بڑے ماموں نواب زادہ عرفان علی اور ان کے اہل و عیال کے لیے مخصوص تھا۔ میں کیوں کہ بڑے ماموں ہی کے بیٹے عظمت علی کا دوست تھا۔ اس لیے بڑے ماموں مجھ سے کچھ زیادہ ہی شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ عموماً نواب خاندانوں کا یہ اصول تھا کہ جب اولاد جوان ہو جاتی تھی تو اسے الگ کمرا دے دیا جاتا تھا۔ زیبا جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی اور اس کی بڑی بہن زاہدہ بھی! اس لیے ان دونوں کے کمرے الگ الگ تھے۔

میں کوٹھی کے اس حصے میں پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے بڑے ماموں آتے دکھائی دیے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ہر وقت اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی "مشغلے" میں مصروف آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی مونچھیں نکیلی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں جنہیں وہ بل پہ بل دے کر اور نکیلا بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ظاہر ہے نواب زادے تھے' ان کی مونچھیں کیسے نیچی ہو سکتی تھیں لیکن انہیں کیا معلوم کہ ان کی مونچھوں کو نیچا کرنا ہی میرا مقصدِ حیات تھا۔ ان ہی مونچھوں کے بل نے تو میری ماں کو گھر سے بے گھر کیا تھا۔ بڑے ماموں بھی تو ان تین افراد میں شامل تھے جو میری ماں کو قتل کر دینا چاہتے تھے' انہیں قبر میں اتار دینے کے خواہش مند تھے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو میں اس عالمِ رنگ و بُو میں آنکھیں نہ کھول پاتا۔ انہی احساسات و جذبات کے سبب جب بھی میری ماں کے ان تینوں مجرموں میں سے کوئی میرے سامنے آجاتا تھا تو میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ میں بہ مشکل خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ ابتدا میں یہ صورتحال میرے لیے امتحان کی سی حیثیت رکھتی تھی مگر رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی بڑے ماموں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی لمحہ بھر کو مجھے طرارہ سا آیا لیکن میں سنبھل گیا۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور قریب آکر رک گئے تھے۔

"آداب!" میرا ہاتھ پیشانی کی طرف اٹھ گیا۔

"جیتے رہو!" انہوں نے اپنی بھاری آواز میں مجھے دعا دی' پھر چٹکی سے مونچھ کو بل دیتے ہوئے کہنے لگے۔ "میاں سنا ہے تم بھی کل یہیں باغ میں تھے۔ غالباً عظمت میاں ہمیں بتا رہے تھے۔ پھر تم کہاں چلے گئے تھے؟ ملازمین میں سے بھی کسی نے تمہیں کوٹھی سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حد تو یہ ہے میاں کہ کوٹھی کے پھاٹک پر موجود چوکیدار کی نظر بھی

تم پر نہیں پڑی۔ ہاں برخوردار زیبا کا کہنا ہے کہ تم باغ سے عظمت میاں کے جاتے ہی چلے گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر قصہ کیا ہوا!"

بڑے ماموں کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ گزشتہ روز جو واقعہ پیش آیا تھا' اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خاصی تحقیق و جستجو کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کرنا تھا اس لیے فوراً ہی بولا۔

"جی ہاں' میں تو عظمت کے جاتے ہی چلا گیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ میں خاصی تھکن محسوس کر رہا تھا اور عظمت مزید ایک بازی کھیلنے کی ضد کر رہے تھے۔ ہم دونوں تین بازیاں کھیل چکے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ شطرنج کی تین بازیاں ذہنی طور آدمی کو کس قدر تھکا دیتی ہیں' مگر واقعہ کیا ہے؟ آپ کچھ تجسس نظر آ رہے ہیں۔"

چہرے سے ہی بڑے ماموں پہنچے ہوئے "فقیر" لگتے تھے۔ جوانی میں شاید انہوں نے بھی ایسی بہت سی "بازیاں" کھیلی تھیں۔ وہ غالباً اسی لیے مجھے ٹٹولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں شاید مجھ پر شک ہو گیا تھا۔ کسی جوان لڑکی کا اتنی دیر کے لیے بے پتا ہو جانا' پہلے سے وہاں ایک نوجوان کا موجود ہونا اور پھر کسی کی نظر میں آئے بغیر اس نوجوان کا غائب ہو جانا' ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں ایسی نہیں تھیں کہ صرف لڑکی کے بیان پر اکتفا کر لیا جاتا۔

میری بات کے جواب میں بڑے ماموں نے گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ جیسے چہرے سے اندازہ لگانا چاہتے ہوں کہ واقعی مجھے کچھ معلوم نہیں یا انہیں بے وقوف بنانے کے لیے "بھولا بادشاہ" بنا ہوا ہوں۔ پھر وہ بولے۔ "تم نے ٹھیک کہا میاں' ہم واقعی تجسس ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کوٹھی کی حدود میں پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم ابھی تک اس گتھی کو سلجھا نہیں پائے۔" یہ کہتے ہی انہوں نے اچانک سوال کر دیا۔ "برخورداری زیبا کو جب ٹھوکر لگی تو کیا تم نے اسے نہیں سنبھالا؟"

سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اگر میں پہلے سے چوکنا اور محتاط نہ ہوتا تو یقیناً چکرا جاتا۔ میں نے اسی لیے بلا جھجک فوراً جواب دے دیا۔ "کب اور کہاں ٹھوکر لگی انہیں؟ میں تو انہیں جھولا جھولتے ہوئے چھوڑ گیا تھا! ابھی جب میں یہاں آیا ہوں تو ایک ملازمہ نے البتہ یہ ضرور بتایا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ میں انہی کی عیادت کے لیے جا رہا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے کہیں چوٹ تو نہیں آئی انہیں؟"

"میاں' بات یہ ہے کہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے' آگے پیچھے دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ ٹھوکریں کھانے ہی کی عمر ہے یہ۔" ان کا لہجہ معنی خیز تھا اور نظریں اب تک میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری طرف سے ان کے دل میں شک کی گرہ پڑ چکی ہے۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "کل شام یہاں کیا واقعہ رونما ہوا' اگر تمہارے علم میں نہیں تو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تم عیادت کو جا ہی رہے ہو۔ ہمیں ذرا کچہری جانے کی جلدی ہے ورنہ تم سے مزید گفتگو کرتے۔" یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گئے۔

"جی۔ جی بہتر ہے۔" میں اس کے سوا اور کہتا بھی کیا۔

"اگر تمہارے علم میں نہیں۔" بڑے ماموں کے الفاظ واضح طور پر اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ میری طرف سے ابھی مطمئن نہیں ہوئے۔ میں جب اس قدر محتاط اور چوکنا ہونے کے باوجود انہیں مطمئن نہیں کر سکا تو ظاہر ہے کہ زیبا ان کی جرح کے آگے کہاں ٹھہر پائی ہو گی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ساری گڑبڑ زیبا ہی کے بیان سے پھیلی ہو گی۔ مجھ پر اسی لیے شک کیا جا رہا تھا۔ حقیقت جاننے کے لیے اب میں تیز قدمی سے زیبا کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

زیبا مجھے کمرے میں اکیلی نہیں ملی۔ بڑی ممانی بھی اس کے پاس تھیں۔ زیبا کی چار سالہ بہن بھی اپنی ماں کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا انہیں؟" میں نے بڑی ممانی کو آداب کرنے کے بعد پوچھا۔

میری آواز سن کر زیبا نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ میرے آنے سے پہلے بند کیے پڑی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے اپنے سینے پر پڑا ہوا دوپٹا درست کیا۔ ممانی مجھے جواب دے کر جواباً بولیں۔ "بخار آ گیا ہے۔ یہ سب کل بارش میں بھیگنے کا نتیجہ ہے۔"

بڑے ماموں کی نسبت ممانی سیدھی تھیں۔ میں نے ان سے جو کچھ پوچھا انہوں نے صاف صاف بتا دیا' پھر زیبا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھنے لگیں۔

ہوا یہ تھا کہ جب عظمت لوٹ کر باغ میں گیا تو مجھے اور زیبا کو وہاں نہیں پایا جہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے ہم کو پہلے خود ہی ادھر ادھر تلاش کیا' پھر کوٹھی میں جا کر ہم دونوں کی گمشدگی کے بارے میں بتا دیا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ بڑے ماموں کے کانوں تک بات پہنچ گئی۔ پھر تو ذرا سی دیر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے گھر کے سارے ملازمین کو تلاش میں لگا دیا اور خود بھی باغ میں پہنچ گئے۔ عظمت کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بڑے ماموں نے باغ میں شکار کا سماں باندھ دیا۔ جس طرح جنگل میں شیر کا ہانکا ہوتا ہے' انہوں نے اسی طرح باغ میں ملازمین کو پھیلا دیا اور انہیں ہر طرف سے آگے بڑھتے ہوئے وہاں پہنچنے کی تاکید کی جہاں جھولا پڑا ہوا تھا۔ خود وہ اور عظمت علی بھی اس "ہانکے" میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے۔ پھر "شیر" تو نکل گیا' اس کی "دُم" رہ گئی۔

عظمت علی اپنی بہن کی ڈری ڈری چیخ سن کر ہی اس تک پہنچا تھا اور پھر بڑے ماموں اور ملازمین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ممانی نے جس طرح یہ واقعہ بیان کیا' اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ بڑے ماموں نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں کوئی بات فرض کر لی تھی۔ بہ قول ممانی کے' بڑے ماموں نے زیبا سے پہلا سوال میرے ہی بارے میں کیا تھا کہ میں کہاں گیا؟ بدحواسی میں زیبا نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم اس کے بعد زیبا کو کوٹھی میں بھیج دیا گیا اور میری تلاش شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں کوٹھی کے تمام ہی ملازمین حتیٰ کہ چوکیدار اور مالی سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ کسی نے مجھے دیکھا ہوتا تو کچھ بتاتا بھی۔ بعد میں زیبا نے میری پڑھائی ہوئی پٹی کے مطابق جو کہانی سنائی' اس پر بڑے ماموں نے بہت بحث کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب میں پہلے ہی وہاں سے چلا گیا تھا تو "مجھے نہیں معلوم" کیوں کہا؟ زیبا کا خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھنا بھی اس کہانی کو جھوٹ ثابت کر رہا تھا۔ وہ اگر بے ہوش ہی ہو گئی تھی تو بے ہوشی کے دوران میں اس کی چیخ کیسے نکلی؟ یا اگر وہ پہلے ہی ہوش میں آ چکی تھی تو وہاں سے اٹھی کیوں نہیں؟ پکارنے والوں کی صداؤں کا اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے جب گھبرا کر زیبا کو اپنی آغوش سے دور دھکیل دیا تو اس کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکلی تھی۔ زیبا کے پاس باپ کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے وہ چیخنے سے صاف مکر گئی تھی۔ اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ جب میں چلا گیا تو وہ موسم کا لطف لینے کی غرض سے باغ میں ٹہلتی ہوئی ایک طرف نکل گئی اور کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آنے پر اس نے عظمت علی کو اپنے قریب دیکھا۔ زیبا کے بیان کو غلط ثابت کرنے کے لیے بڑے ماموں نے اس جگہ کا ایک بار پھر تفصیلی جائزہ لیا تھا جہاں گھنے پیڑوں کے درمیان وہ میری آغوش کی زینت بنی تھی۔ وہاں زمین پر پڑی ہوئی کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے زیبا کو ٹھوکر لگ سکتی ہو۔ پھر باغ سے لوٹ کر آنے کے بعد انہوں نے زیبا کے سر کا "معائنہ" بھی کیا تھا۔ سر پر چوٹ کا کوئی خفیف

سا نشان بھی نہیں تھا۔ ممانی سے بڑے ماموں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صرف ٹھوکر کھا کر کسی کا بے ہوش ہو جانا قطعی ممکن نہیں ہے۔ زیبا جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی زبان کھلواؤ۔ ورنہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا! اب تک زیبا اپنے اسی بیان پر اڑی ہوئی تھی' مگر باپ کے خوف سے اسے بخار آ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے بھی بڑے ماموں وہیں ہو کر گئے تھے اور ممانی سے پوچھا تھا کہ زیبا نے زبان کھولی یا نہیں؟

باپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی یقیناً زیبا سوتی بن گئی تھی۔

ایک تو ماں کا دل اور دوسرے سیدھا پن! ممانی نے اسی لیے مجھے ایک ایک بات بتا دی تھی' یہ خیال کیے بغیر کہ اس معاملے کا ایک فریق خود میں بھی تھا۔ وہ تو مجھ سے الٹی اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھیں۔ "وہ تو شروع سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں۔ ہیں ہی ابتدا سے شکی مزاج! اتنی سی بات پر بچی کی جان آدھی کر دی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ بیٹے کہ جب اور کوئی بات ہی نہیں تو یہ غریب کیا کہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی' ممانی کی وہاں موجودگی کے سبب میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں زیبا سے کہہ دیا کہ وہ اپنے بیان پر اڑی رہے۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اقرار میں سر ہلا دیا۔

پھر میں وہاں مزید نہیں رکا۔ بڑے ماموں کا رویہ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ زیبا کے غیر منطقی بیان نے انہیں میری طرف سے شک میں ڈال دیا تھا۔ کوٹھی سے نکلتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ اب کم از کم چند روز ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔ خود کو خواہ مخواہ آزمائش میں ڈالنا فضول تھا۔ میں وہاں آتا جاتا رہتا تو بڑے ماموں مجھے کریدتے رہتے۔

میری توقع کے عین مطابق دوسرے ہی روز شام کو عظمت علی خود مجھ سے ملنے آ گیا۔

"یار' تم تو بالکل گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے! کل شام بھی تم نہیں آئے اور آج بھی میں تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک کر خود آیا ہوں۔ آج تو ابا جان بھی تمہیں پوچھ رہے تھے۔" عظمت علی کا دل میری طرف سے بالکل صاف ہے' یہ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"حیرت ہے کہ تمہارے ابا جان مجھے پوچھ رہے تھے!" میں بولا "حالانکہ انہی کے رویے کی وجہ سے میں نے کوٹھی میں آنا جانا ترک کیا ہے۔"

"تمہارا بھی جواب نہیں یار! وہ تو ہر بات کے پیچھے پڑ

جاتے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے زیبا کی جان نہیں چھوڑی۔ اماں بھی سخت پریشان ہیں۔ ایسے میں وہاں جی بولائے گا کہ نہیں! اس پر یہ کہ تم بھی قلعہ بند ہو کے بیٹھ گئے اپنے گھر میں! اسے یاری نہیں کہتے پیارے! اپنا تو اصول یاری میں یہ ہے کہ یار پر مکمل اعتماد کرو۔ میں تم پر پورا اعتماد کرتا ہوں۔"

"مجھے اس سے کب انکار ہے کہ دوست ہر حال میں دوست رہتے ہیں' ان کی خوشیاں اور غم مشترک ہوتے ہیں' مگر تم ہی سوچو کہ جب اس فضا میں شکوک اور شبہات کا زہر گھلنے لگے تو دل پر کیا گزرے گی!"

"شکوک و شبہات کا زہر! کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس نے تم پر شک کیا؟"

"تمہارے ابا جان نے۔" یہ کہہ کر میں نے عظمت علی کو مختصراً اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جو میرے اور بڑے ماموں کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے عظمت سے کہا۔ "اور تم تو خود اس بات کے گواہ ہو کہ میں تم لوگوں کے ساتھ باغ میں نہیں جا رہا تھا۔ تم خود ہی زبردستی مجھے اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"اب سمجھ میں آیا کہ ابا جان مجھ سے بھی تمہارے بارے میں اتنی پوچھ گچھ کیوں کر رہے تھے! یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ انہیں تو اس انداز میں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ زیبا تو بہت معصوم ہے جیسی وہ میرے لیے ویسی تمہارے لیے!"

میرے جی میں تو آئی کہ میں عظمت علی کے اس خیال کی فوری تردید کر دوں مگر مصلحت آڑے آ گئی۔ ذرا توقف سے عظمت علی مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔ "ویسے دوست کی حیثیت سے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ہمارے یہاں آنا جانا ترک نہ کرو۔ اگر ابا جان خواہ مخواہ تمہاری طرف سے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اس سے ان کے شکوک و شبہات کو اور بھی تقویت ملے گی۔ وہ یہی سوچیں گے کہ تمہارے دل میں واقعی خدانخواستہ کوئی چور ہے اسی لیے تم نے آمد و رفت بند کر دی۔"

عظمت علی کی یہ بات میرے دل کو بھی لگی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں بولا۔ "کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو' مگر اس میں کچھ سبکی سی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی فضا اور ایسے حالات میں آنا جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی تمہارا مشورہ ہے تو سوچوں گا اس پر!"

"یہ کی نہ تم نے یاروں والی بات! چلو آج اس خوشی میں جی بی روڈ کا ایک پھیرا لگا کر آتے ہیں۔ راستے میں کچھ دیر فرید احمد سے گپ شپ لڑائیں گے اور اسے بھی ساتھ لے لیں

گے۔ اگر موقع لگا تو اس جانِ بہار کے بھی دیدار کر لیں گے جس کے دیدار کو ایک مدت سے آنکھیں ترس گئی ہیں۔" عظمت علی کا اشارہ کلونت کور کی طرف تھا۔ "کم بخت فرید احمد تو کسی طرح اس کے دیدار ہی کرانے پر اب راضی نہیں ہوتا۔"

پہلے بھی عظمت کئی بار مجھ سے جی بی روڈ چلنے کا کہہ چکا تھا' مگر میں ٹال گیا تھا حسن کو سرِبازار سجا دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس روز بھی میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی' لیکن وہ نہیں ٹلا۔ یوں بھی وہ ایک بڑے اور معزز خاندان کا فرد تھا جہاں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ ایسے معزز خاندانوں میں یہ بیماری عام تھی کہ ادھر لڑکے بالوں نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا' ادھر بازارِ حسن کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ کچھ اعلیٰ خاندانوں میں تو ان ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے تہذیب و شائستگی اور ادب آداب کی "تربیت گاہ" کا درجہ رکھتے تھے۔ ہرچند کہ کم از کم ننھیال کی طرف سے میرا تعلق بھی ایک نواب خاندان ہی سے تھا مگر آج تک میرا دل اس پر مائل نہیں ہوا تھا۔ میں نے جی بی روڈ کا نام تو سنا تھا لیکن کبھی وہاں گیا نہیں تھا۔ اس لیے مجھے وہاں جانے میں تامل بھی تھا مگر عظمت علی سے مراسم رکھنا میری ضرورت تھی۔ سو بادل ناخواستہ میں جی بی روڈ جانے پر آمادہ ہو گیا اور میری رضامندی سے عظمت بہت خوش ہوا۔

ڈیڈی کے آنے سے پہلے ہی میں عظمت کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ ممی سے میں نے احتیاطاً کہہ دیا تھا کہ میری واپسی میں دیر ہو سکتی ہے۔

فرید احمد ہمیں گھر پر نہیں ملا۔ اس کے چھوٹے بھائی نے ہمیں بیٹھک میں بٹھا دیا اور اسے ڈھونڈنے چلا گیا۔ عظمت علی نے کلونت کور کا ذکر چھیڑ دیا جس سے میں گریز کرنا چاہتا تھا۔ "یار" ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک فرید احمد نے دیدار یار پر پابندی کیوں لگا دی؟ یہ قول اس کے کلونت کور نے ایک دن اسے کہاں وکھا کر دھمکی دی تھی کہ اب تم یا تمہارے دوست چھت پر تاک جھانک کرتے نظر آئے تو پیٹ پھاڑ دوں گی۔ تمہاری سمجھ میں آتی ہے یہ بات کہ واقعی کلونت کور ایسی نازک اندام لڑکی نے فرید احمد پر کرپان نکال لی ہو گی اور فرید احمد ایسا دھینگڑی ڈر گیا ہو گا؟ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے کہ فرید احمد اکیلے ہی اکیلے مزے اڑا رہا ہے۔"

"اس لڑکی میں آخر کون سے ایسے لعل جڑے ہیں جو تم اس پر اتنے لٹو ہو؟"

"ارے ظالم تم تو یہ نہ کہو! تم نے تو اس ستم گر کو دیکھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہارے سینے میں دل ہی نہیں اور اگر ہے تو جذبات سے خالی ہے۔"

"ہاں یار اس کی باتوں میں مت آنا۔ یہ چھپا رستم ہے۔" عقب سے فرید احمد کی آواز آئی۔

کچھ دیر ہم لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اسی خوش گپیوں میں وقت گزر گیا اور مغرب کی اذان ہو گئی۔ اسی کے ساتھ ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ہم تانگے میں بیٹھ کر جی بی روڈ کی طرف چلے تو راستے میں فرید احمد نے کسی ریحانہ کا ذکر کیا۔ وہ دھیمی آواز میں عظمت علی سے کہہ رہا تھا۔ "بس کچھ ہی دن پہلے وہ آئی ہے۔ منہ بولتا جادو ہے بنگال کا! میں اسے جا کے ایک بار دیکھ آیا ہوں' یہ بڑی بڑی آنکھیں اور یہ بال ہیں ظالم کے۔ آج ادھر جانکی بائی کی طرف نہیں چلیں گے۔"

فرید احمد کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بازار کا چکر لگا کر آ جائیں گے اور عظمت علی نے ایسی ہی کوئی بات کہی بھی تھی' مگر ان کے ساتھ مجھے کسی طوائف کے کوٹھے پر بھی چڑھنا پڑے گا' یہ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ میں نے فرید احمد کی بات سے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ وہ دونوں پہلے بھی کوٹھے جھانکتے رہے ہیں اور پرانے پاپی ہیں۔

تانگا اس بازار میں پہنچ کر ایک جگہ رکا تو مجھے یوں لگا جیسے میلا لگا ہو۔ ہر طرف گہما گہمی اور رونق تھی۔ کہیں نوعمر لڑکے مہکتے پھولوں کے ہار لیے ادھر سے ادھر لپک رہے تھے تو کہیں گلوریاں بن رہی تھیں۔ کوئی شیروانی پہنے اکڑا ہوا چلا جا رہا تھا تو کوئی اپنی دھوتی سنبھالے بالکونیوں پر سجے ہوئے چہروں کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر شادابی اور بے فکرا پن تھا۔ کہیں سے طبلہ گمکنے کی آواز آ رہی تھی تو

کہیں چھنا چھن گھنگھرو بول رہے تھے۔ میں تو وہاں آ کر جیسے کھو سا گیا۔ تانگے سے اتر کر میں ایک طرف کھڑا ہو کر ساری ہاؤ ہو دیکھ رہا تھا۔

"چلو یار!" اچانک عظمت علی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں چونک اٹھا۔

"سنو! بازار کا چکر لگا لیتے ہیں مگر ہم کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں چڑھیں گے۔" میں نے اپنے دل کی بات عظمت علی سے کہہ دی۔

فرید احمد بول اٹھا۔ "گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز! یہ بھی خوب رہی۔ اماں اب یہاں آ ہی گئے ہیں تو کیا ویسے ہی لوٹ جائیں! مجھے خبر نہیں تھی کہ تم اتنے خشک ہو۔ ریحانہ کو رقص کرتے دیکھو گے تو دل تھام کے رہ جاؤ گے۔" وہ مجھے للچانے لگا۔

پھر میں نے لاکھ چاہا کہ انہیں روک لوں اور خود بھی اوپر نہ جاؤں مگر وہ نہ مانے۔ عظمت علی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "اگر تم نے اب بھی اپنی ضد نہ چھوڑی تو ہم دونوں تمہیں ڈولی ڈنڈا کر کے لے جائیں گے اور خلقِ خدا تمہارا تماشا دیکھے گی۔"

بادل ناخواستہ میں ان دونوں کے ساتھ قریبی زینے پر چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ فرید احمد آگے آگے تھا' میں اور عظمت علی اس کے پیچھے تھے۔ چند قدم چل کر فرید احمد ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جس پر ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر سے ہارمونیم' سارنگی طبلے اور گھنگھروؤں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

"آؤ!" فرید احمد ہماری طرف مڑ کر بولا اور ہاتھ سے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم سب پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ میری پہلی نظر اس "شعلۂ رقصاں" پر پڑی جو اس بڑے کمرے کے وسط میں طبلے کی تھاپ پر قیامت جگا رہی تھی۔ فانوس روشن تھے۔ سازندے ایک جانب اندرونی دروازے کے قریب دیوار سے لگے بیٹھے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہی کے پاس ایک ادھیڑ عمر عورت سامنے بڑا سا نقشین پاندان رکھے "جگالی" کر رہی تھی۔ سفید چاندنی کے درمیان قالین بچھا ہوا تھا۔ اسی قالین پر سرخ ساری میں لپٹا ایک شعلہ رقصاں تھا۔ دونوں جانب دائیں بائیں کی دیواروں سے لگے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ان گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے تماش بین بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کچھ فاصلے سے پیک دان رکھے

تھے۔ کمرا خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اکثر تماش بینوں کے ہاتھوں سے خوشبودار پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے لباس بھی معطر محسوس ہو رہے تھے۔

میں ابھی اس کمرے کا تفصیلی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ عظمت علی نے مجھے ٹہوکا دیا اور جھک کر پیروں سے جوتے اتارنے لگا۔ فرید احمد ہم سے پہلے ہی جوتے اتار کر دائیں جانب ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں ہم دونوں بھی بیٹھ سکیں۔ میں نے جوتے اتارے اور نرم گدے پر بچھی ہوئی سفید چاندنی پہ قدم رکھتا ہوا۔ عظمت علی کے عقب میں بڑھا۔

اس وقت تک وہاں زیادہ تماش بین جمع نہیں ہوئے تھے۔ ہم جہاں بیٹھے تھے اس سے ذرا ہٹ کر دو افراد بیٹھے تھے اور سامنے والی دیوار کے ساتھ چار افراد کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ ایک شخص تنہا بھی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ رقص کرنے والی صرف رقص کر رہی تھی گا نہیں رہی تھی۔

ہم ابھی سنبھل کر بیٹھے ہی تھے کہ رقص ختم ہو گیا۔ "واہ واہ" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ رقاصہ کا ہاتھ اظہار تشکر میں پیشانی تک پہنچ گیا۔ اسی کے ساتھ وہ جھکی بھی تھی۔ کچھ تماش بینوں نے اس کے قدموں میں چاندی کے روپے پھینکے جنہیں قالین سے اٹھا کر وہ ادھیڑ عمر عورت کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ روپے اس نے عورت کے حوالے کر دیے تھے۔ ہمارے قریب ہی جو دو افراد بیٹھے تھے' وہ اٹھنے لگے تو ادھیڑ عمر عورت جو نائکہ تھی بولی۔ "حضور! پان تو کھاتے جایئے!"

وہ دونوں "اچھا" کہہ کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ نائکہ نے پان کی تھالی رقاصہ کو تھما دی۔ وہ اٹھی اور پہلے انہی دونوں کی طرف بڑھی جو جانے والے تھے۔

"یہ ہے ریحانہ۔" فرید احمد نے بتایا۔

میں نے اسے دیکھا۔ گندمی رنگ تھا مگر ناک نقشہ اچھا تھا۔ جسم متناسب اور قد لمبا تھا۔ پیچھے سے بال کھلے ہوئے تھے اور آگے سے کسے ہوئے تھے۔ ان میں بیلے کے پھولوں کا ایک گجرا بھی اٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں بڑی اور خوبصورت تھیں جن میں کاجل لگا تھا۔ اب وہ پانوں کی تھالی لے کر ہماری طرف بڑھ آئی تھی۔

"شکریہ! ہم پان نہیں کھاتے۔" عظمت علی نے کہا اور اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر تھالی میں رکھ دیا۔ تھالی میں پہلے سے دو روپے پڑے تھے۔

وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ فرید احمد نے اس سے پوچھا۔ "تم اردو جانتی ہو؟"

"تھوڑا تھوڑا اردو آتا ہے ہم کو۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا' پھر اٹھ کر سامنے بیٹھی ہوئی ٹولی کی طرف چلی گئی۔ ان چاروں کے روبرو بھی وہ اسی طرح باادب بیٹھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ ساز دوبارہ چھڑ گئے۔ اس دوران میں ایک قبول صورت نوجوان لڑکی اندرونی دروازے سے نکل کر سازندوں کے قریب آ بیٹھی تھی۔ رقاصہ ریحانہ' نائکہ کے پاس بیٹھی تھی۔

"تن کے بیٹھے ہیں!" چاروں افراد کی ٹولی نے بلند آواز میں فرمائش کی۔

قبول صورت مطربہ نے مسکرا کر اقرار میں سر ہلایا اور پیچھے مڑ کر سازندوں کو کچھ ہدایت دی۔ وہ چاروں استاد داغ دہلوی کی یہ غزل شاید پہلے بھی گانے والی سے سن چکے ہوں گے جس کا مطلع یہ تھا۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

لڑکی تو قبول صورت ہی تھی مگر آواز غضب کی تھی۔ اس نے سماں باندھ دیا۔ وہ جب غزل کے مقطع پر پہنچی۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بھگدڑ سی مچ گئی ہو۔ کسرتی اور گٹھیلے جسم کے تین آدمی ریشمی پردہ اٹھا کر اندر آ گئے۔ ان کے حلیے عجب تھے۔ کپڑے کی بنیان نما جھڑیاں ہی ان کے اوپری جسموں پر تھیں' سر گھٹے ہوئے تھے اور لمبی چوٹیاں گردن تک آ رہی تھیں۔ کمرے میں ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی سازندوں کے ہاتھ رک گئے۔ ساز خاموش ہو گئے۔ کمرے کی فضا پر بوجھل اور ناگوار سا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

یہ سکون انہی تینوں میں سے ایک کی بھاری آواز سے ٹوٹا۔ اس نے حقارت آمیز انداز میں وہاں بیٹھے ہوئے تمام تماش بینوں کو حکم دیا۔ "چلو بے یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ راجا جی آ رہے ہیں۔" وہ سین کو شین بولنے کا عادی لگتا تھا۔

فرید احمد کی زبان میں تو ہر وقت کھجلی ہوتی ہی رہتی تھی۔ کوئی اور تو خیر کچھ نہیں بولا' فرید احمد جواباً بول اٹھا۔ "بے لاؤ و کے! تجھے بات کرنے کی تمیز ہے! اس نے کھول رہے تجھے کھونٹے سے! یہ کیا تیرے راجا جی کی اماں کا کوٹھا ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ مال خرچتے ہیں' پیسے ہی نہیں آ کر بیٹھ جاتے یہاں!"

"جدا باد۔ جدا باد!" سامنے بیٹھے ہوئے تنہا شخص نے فرید احمد کی حوصلہ افزائی کے لیے ہانک لگائی۔ وہ شاید "زندہ

باد" کہنا چاہتا تھا۔

"اوئے رگھو! تو اش جدا باد کو شنبھال' میں اش شالے کو دیکھتا ہوں!" وہی پہلا دیو قامت اپنے ایک ساتھی سے بولا' پھر اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے اپنے تیسرے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تو نیچے جا کے راجا جی شے کہہ دے' ابھی اوپر نہ آئیں۔ مخھن ہی میں پدھاریں! میں ان شب شالوں کو بھگاتا ہوں ابھی!"

بلے سر گھٹے کا تیسرا ساتھی پردہ اٹھا کر چلا گیا تو وہ فرید احمد کو گھورتا ہوا چپل پیروں سے اتارے بغیر سفید چاندنی پر بڑے بڑے قدموں سے آگے بڑھا۔

اسی وقت نائکہ نے آگے بڑھتے ہوئے بھگو سے بلند آواز میں کہا "بس کر بھگو! میرے کوٹھے پر جھگڑا فساد نہ کر! میں خود ان لوگوں سے کہہ دیتی ہوں کہ چلے جائیں۔"

"تو چپ رہ بوڑھی گھوڑی! ورنہ تیرے بھی لگام ڈال دوں گا!" سر گھٹا جس کا نام بھگو تھا' غرایا۔

نائکہ بدحواس سی نظر آنے لگی' پھر اس نے سارنگیے کو مخاطب کیا۔ "تو جلدی سے بھاگ کر سوارے کو بلا لا' کہنا کہ بائی جی نے فوراً بلایا ہے' کوٹھے پر جھگڑا ہو گیا ہے۔ اسی وقت اس کم بختی مارے کو غرانے کی لگی ہے! دیکھ پیچھے والے زینے سے چلا جا۔ سن! وہ کالو کے گتے پر ہو گا۔" پھر اس نے مطربہ اور رقاصہ دونوں کو اندر گھر میں بھیج دیا۔

ادھر تو سارنگی نواز بوڑھا اندرونی دروازے کی طرف لپکا ادھر بھگو نے "جدا باد" کا نعرہ مارنے والے کی ٹھکائی شروع کر دی' پھر اسے پیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا اور باہر دھکا دے دیا۔ یہ رنگِ محفل دیکھ کر چاروں افراد کی ٹولی بھی "جدا باد" کے پیچھے پیچھے کھسک لی۔ تماش بینوں میں اب وہاں ہم تینوں رہ گئے تھے۔ بھگو اب ہمارے سر پر آ گیا۔ مجھ سے یا عظمت علی سے اس نے کچھ نہیں کہا اور جھک کر فرید احمد کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

"چھوڑو یار اسے!" عظمت علی نے بھگو سے کہا۔ "ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ایسے کیسے چلے جاؤ گے مہاراج! اش نے راجا جی کا اپمان کیا ہے۔ اشے۔ اش کتے کے پلے کو تو نہیں چھوڑوں گا میں!" یہ کہتے ہی اس نے فرید احمد کو اس طرح ایک ہاتھ سے اوپر اٹھا لیا جیسے فرید احمد کوئی ہلکا سا کھلونا تھا۔ اب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور فرید احمد کو ایک ہاتھ سے اوپر اٹھائے جا رہا تھا۔ فرید احمد کا گریبان اب بھی اس کے آہنی پنجے کی گرفت میں تھا۔ فرید احمد کی دونوں ٹانگیں ہوا میں معلق تھیں اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔

فرید احمد بہرحال ہمارے ساتھ آیا تھا۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ ہرچند کہ اسے ان سانڈ قسم کے غنڈوں سے زبان درازی نہیں کرنا چاہیے تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم اسے ان غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے۔ یہی سوچ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔ "چھوڑ دے اسے ورنہ اچھا نہیں ہو گا!"

عظمت علی بھی اب میرے تیور دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میری بات کے جواب میں بھگو حقارت سے ہنس کر بولا۔ "ابے شالو! تم تو دیکھنے بھی 'مشلا (مسلمان) لگتے ہو۔ تمہیں مارنا تو پن (ثواب) ہے۔" اس نے اب بھی فرید احمد کو ایک ہاتھ سے اٹھا رکھا تھا۔ اس سے اس کے بازو کی مچھلی نمایاں ہو گئی تھی۔

مجھے اور عظمت علی کو اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھ کر بھگو کا ساتھی رگھو تیزی سے ہماری طرف لپکا۔

"تو الگ کھڑا رہ رگھو! میں ان تینوں کو ابھی ناک رگڑواتا ہوں۔" یہ کہتے ہی بھگو نے فرید احمد کو جھولا دے کر کسی مردہ چھپکلی کی طرح دیوار کی طرف اچھال دیا۔ فرید احمد کا سر دیوار سے ٹکرایا اور پھر اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ شاید سانس گھٹنے کے سبب یا پھر دیوار سے سر ٹکرانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

فرید احمد سے نمٹ کر بھگو میری طرف مڑا اور مجھے موٹی سی گالی دے کر میرے پیٹ پر لات ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں دور جا گرا اور اذیت کے سبب دہرا ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا تھا اسی لیے میں عظمت علی کا حشر نہ دیکھ سکا۔ میں نے اس کی صرف چیخ سنی تھی۔

نائکہ کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح مدد کے لیے چیخے جا رہی تھی۔ اس عرصے میں سازندے بھی بھاگ لیے تھے۔

اچانک مجھے وہی پُراسرار سی مانوس خوشبو محسوس ہوئی' اسی کے ساتھ میرے کانوں میں نسوانی سرگوشی ابھری "اٹھو کہ تم ایک غیر معمولی وجود ہو۔ اٹھو کہ تم ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ شکست ہستی ہو۔ تمہیں کوئی زیر نہیں کر سکتا!۔ کوئی نہیں! تم ناقابلِ شکست ہو۔"

وہ خوشبو ابھی معدوم ہی ہوئی تھی کہ حقیقتاً میرے جسم میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ ان میں اتنی شدت تھی کہ میرا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ ان جھٹکوں کے ساتھ ہی پیٹ پر پڑنے والی ضرب کی اذیت قطعی غائب ہو گئی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بجلیاں اب بھی میرے رگ و پے میں دوڑ رہی

تھیں۔ اب وہاں نائیکا بھی نہیں تھی۔ اندرونی کمرے کا دروازہ بند نظر آرہا تھا۔ نائیکا نے اندر جاکر شاید دروازہ بند کر لیا تھا کہ کہیں دنگے فساد میں اس کے چوٹ چپیٹ نہ آجائے۔ فرید احمد اب تک دیوار کے قریب بے حس و حرکت پڑا تھا۔ عظمت علی گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بھکو کی بند ھی ہوئی مٹھی میں تھے۔ سر کے بال کھنچنے کی وجہ سے عظمت علی کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

"ابے او چھنگی! تو پھر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ تیری تو۔۔۔" بھکو نے مجھے پھر گالی دی اور عظمت علی کے بالوں کو جھٹکا دے کر اسے ایک طرف لڑھکا دیا۔ یقیناً اب وہ پہلے مجھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔ اسی وقت بھکو کا تیسرا ساتھی بھی آگیا جسے اس نے نیچے بھیجا تھا۔ بھکو نے اسے بھی مداخلت سے روک دیا۔ اسے یقیناً اپنی طاقت پر بڑا غرور تھا جس کا مظاہرہ میں دیکھ چکا تھا۔

"جلدی کر بھکو! راجا جی کہتے ہیں کہ کہیں پولیس نہ آجائے۔ اور وہ بنگالن نرتکی (رقاصہ) کدھر گئی؟ راجا جی نے کہا ہے کہ وہ اب اوپر نہیں آئیں گے۔ ہمیں اس نرتکی کو اٹھا کر لے چلنے کا حکم دیا ہے راجا جی نے!" بھکو کے تیسرے ساتھی نے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے اسے اٹھانا کون سی بڑی بات ہے! اندر ہے وہ مگر پہلے ان سالوں کو تو۔۔۔ ان مشٹوں کو تو پچھاڑ لوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں بے تلے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر وحشت و درندگی کے آثار تھے۔ وہ کسی مرکھنے بیل کی طرح سر جھکائے، آنکھیں چڑھائے میری طرف آرہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو اس طرح پھیلا رکھے تھے جیسے مجھے ان کے درمیان لے کر بھینچ ڈالنا چاہتا ہو۔

میرے سارے وجود میں ایک طوفان گردش کر رہا تھا اور پھر وہ طوفان کی زد میں آہی گیا۔ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا۔ وہ شاید میرا بھی وہی حشر کرنا چاہتا تھا جو فرید کا کیا تھا۔ مجھے بھی شاید وہ اٹھا کر دیوار سے دے مارنا چاہتا تھا، مگر میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے طوفانی رفتار سے لپک کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ میرا گھونسا اس کی دائیں آنکھ کے نیچے رخسار کی ابھری ہوئی ہڈی پر پڑا تھا۔ گھونسا پڑتے ہی وہ بری طرح ڈکرا کر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے رخسار کی کھال پھٹ گئی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔

"اٹھ حرام زادے اٹھ!" میں چیخا اور مجھے خود اپنی

آواز اجنبی سی لگی۔ وہ نہیں اٹھا تو میں نے جھپٹ کر اس کے پہلو میں زبردست ٹھوکر لگائی۔ خلافِ توقع اس کا بھاری جسم اپنی جگہ سے اچھلا اور مخالف سمت کی دیوار سے ٹکرا کر طبلے کی جوڑی پر جا گرا۔ اسی دوران میں اس کے منہ سے تیز چیخ بھی نکلی تھی۔ طبلے کی جوڑی سے لڑھک کر اس کا جسم نیچے آرہا۔ وہ دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اسی کی طرف متوجہ تھا کہ اچانک مجھے اپنی پشت پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ میں نے جھک کر اور اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے دوسرے بدمعاش کو سامنے فرش پر دے مارا۔ اسی نے عقب سے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ مجھے خود بھی حیرت تھی کہ میں نے اس کے اتنے بھاری جسم کو کس آسانی سے اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ پھر تیسرے شیطان نے بھی اپنی حسرت نکالنے میں دیر نہیں کی تھی۔ اس نے ہارمونیم اٹھا کر میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔ میں اسی لیے زقند بھر کر ایک طرف ہو گیا تھا اور پلٹ کر اس کے ایک کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہارمونیم دور جا گرا تھا۔ میری انگلیوں کی گرفت اس کی کلائی پر سخت ہوتی جا رہی تھی اور اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ عظمت علی اپنی تکلیف بھول کر حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر تو بیٹھ گیا مگر شاید ابھی اس میں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

اسی دوران میں بھکو اٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ کسی شرابی کی طرح جھومتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جس نے مجھ پر پیچھے سے چھلانگ لگائی تھی اور فرش پر میرے قریب ہی پڑا تھا، اس نے بھی لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ایک ٹانگ پکڑ لی۔ وہ مجھے گرانے کے لیے زور لگا

رہا تھا مگر مجھے میری جگہ سے خفیف سی حرکت دینے میں بھی کامیاب نہ ہوا۔ میں نے اپنے دائیں پیر کی ٹھوکر سے اس کی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ ڈکرایا۔ میری ٹھوکر کی ضرب سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس نے میری بائیں ٹانگ چھوڑ دی اور اپنی لہولہان پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر تڑپنے لگا۔

جس کی دائیں کلائی میری گرفت میں تھی اس نے بائیں ہاتھ سے میری گردن دبوچنا چاہی۔ میں نے اس کی کلائی پر ہلکا سا دباؤ ڈالا، اسی کے ساتھ اپنے بائیں ہاتھ کا الٹا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس نے میری گردن چھوڑی ہی تھی کہ میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی صاف آواز میں نے بھی سنی۔ اس کے منہ سے بڑی بھیانک چیخ بلند ہوئی اور پھر اس کا بے ہوش جسم میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی کلائی میں نے پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ پیشانی پر ضرب کھانے والا بھی اس عرصے میں تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا

اب وہ پہلا دیو قامت بھکو ہی میرے مقابل تھا۔ وہ جھومتا جھامتا میرے نزدیک تو آگیا، مگر شاید اسے مجھ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

"تجھے اب ڈر کیوں لگ رہا ہے! آگے بڑھ نا! ہم تو مسلا ہیں! تمہیں مارنا تو پُن ہے۔" میں نے اسے للکارا۔

میری توقع کے خلاف اچانک وہ سر جھکا کر مُردہ سی آواز میں کہنے لگا "یہاں سے جانے دو مجھے!"

"ایسے کیسے چلے جاؤ گے مہاراج!" میں نے اس کے لہجے اور الفاظ کی نقل اتاری۔ "اپنے راجا جی کے ایمان کا بدلہ نہیں لو گے۔"

پھر میں نے اس سے بالکل اس طرح کھیلنا شروع کر دیا جیسے شیر اپنے بے بس شکار سے کھیلتا ہے۔ اسی عرصے میں فرید احمد کو ہوش آگیا۔ وہ میرے ہاتھوں اس "گینڈے" کو پٹتے دیکھ کر حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔ مجھے اسی سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ہوش میں آگیا ہے۔ اس نے پُرجوش انداز میں اور بالکل بچوں کے سے انداز میں مجھ سے کہا تھا۔ "چپاتی بنا دو کمینے کو!"

"نہیں!" میں نے عظمت علی کی آواز سنی اس نے مجھ سے کہا "بس بہت ہو گیا! اب اسے چھوڑ دو!"

"تم دونوں نیچے چلو میں ابھی آرہا ہوں۔" میں جواباً بولا بھکو کو اپنے رو برو گھگیاتے ہوئے دیکھ کر اور اس کی پٹائی کرتے ہوئے مجھے عجب سی لذت محسوس ہو رہی تھی۔ میں

اسی لیے ابھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس کے مت بجھے بجھے ہاتھ جڑ رہا تھا تاکہ وہ جلد بے ہوش نہ ہو جائے۔ اب وہ مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے صرف مدافعت کر رہا تھا۔

حالانکہ میرا لہجہ تحکمیہ نہیں تھا مگر عظمت علی اور فرید احمد جو ایک قتالہ کے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔ انہیں گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اچانک بھاری قدموں کی چاپ ابھری اور پھر پردہ اٹھا کر چار پولیس والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اسی لمحے میں نے بھکو کی کھوپڑی پر ٹھوکر ماری۔ وہ میرے دونوں پیروں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چیختا ہوا دور جا گرا اور پھر اس کا جسم ڈھیلا ہو گیا۔ احتیاط کے باوجود ٹھوکر کچھ زیادہ ہی زور کی پڑ گئی تھی۔ میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

پولیس والوں میں سے ایک کی بغل میں چھوٹا سا ڈنڈا دبا ہوا تھا۔ وہ شاید ان کا افسر لگتا تھا۔ اسی نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "پکڑ لو اسے!"

حکم سنتے ہی تینوں پولیس والے میری طرف لپکے۔ میں نے سوچا کہ مجھے ان کے ہاتھ نہیں آنا چاہیے۔ پھر میں نے انہیں کمرے میں دوڑانا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ موقع ملتے ہی کھلے دروازے سے نکل کر بھاگ جاؤں، مگر دروازے کے بیچ وہ پولیس افسر ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے خود بھی اپنی رفتار پر حیرت ہو رہی تھی۔ ابھی تک وہ تینوں میرے جسم کو چھونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ایک قتل میں کہیں ہو آ دوسرے لمحے میں کہیں۔ میں پولیس والوں سے بھڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ بھلا ان سے میرا کیا جھگڑا تھا!

معلوم نہیں کیسے پولیس افسر کو یہ خیال آیا کہ کہیں میں دروازے سے نکل کر بھاگ نہ جاؤں۔ یہ اندازہ میں نے پولیس افسر کی اس حرکت سے لگایا کہ اس نے کمرے کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور پھر سپاہیوں کو برا بھلا کہتا ہوا میرے پیچھے دوڑنے لگا تھا۔

اب فرار کا واحد راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میری نظر ایک دریچے پر پڑی۔ سمت کا تعین میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ دریچہ یا تو اندر گھر کی طرف ہو گا یا اس راہداری میں کھلتا ہو گا جو بیرونی دروازے کے سامنے تھی۔ دوڑتے ہوئے میں نے ایک دم جست بھری اور اس دریچے پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ دریچہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا۔

"یہ مر جائے گا' وہاں سے گر کے۔ اتر آؤ!" پولیس افسر اپنا ڈنڈا لہراتا اور ہانپتا ہوا دریچے کی طرف دوڑا اور سپاہیوں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔ میرا رخ سڑک کی طرف تھا اور میں دوسری منزل کے دریچے میں کھڑا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا۔ مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی تھی جس کا ازالہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک سپاہی بھاگتا ہوا دریچے کے قریب پہنچ گیا اور اس نے میرا ایک پیر پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ شاید میرا پیر پکڑ کر مجھے دریچے کے نیچے سے گھسیٹ لینا چاہتا تھا۔ میں اس وقت ڈرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ سپاہی قریب آجائیں تو میں ان کے عقب میں کودوں' پھر بھاگتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچوں اور کنڈی کھول کر باہر نکل جاؤں۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ سپاہی میری ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹنے کی کوشش کرے گا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ جب اس سپاہی نے میرے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو غیر ارادی طور پر میں نے وہ پیر اٹھا لیا اور اسی لیے میرے جسم کا توازن بگڑ گیا۔ میں دریچے سے سڑک کی طرف گرا۔ حیرت انگیز امر یہ تھا کہ مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا اور میں نے اپنے جسم کو بہت آہستہ آہستہ نیچے گرتے دیکھا۔ مجھے اپنا جسم بے حد ہلکا لگ رہا تھا۔ میں کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا کے دوش پر بہتا ہوا دھیرے دھیرے نیچے آ رہا تھا۔

نیچے بازار میں آتے جاتے جن لوگوں نے مجھے دوسری منزل کے ایک دریچے سے گرتے دیکھا' ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں' پھر ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ لوگ اب تصویر حیرت بنے مجھے آہستہ آہستہ نیچے آتے دیکھ رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ ایسا حیران کن اور ناقابل یقین منظر انہوں نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہوگا۔ اب وہ چیخنا بھول گئے تھے۔

سڑک پر جس جگہ میں گرنے والا تھا۔ وہاں لوگوں کا ٹھٹھ لگ گیا۔ جب میں اور نیچے آگیا تو لوگ دائرے کی صورت میں پیچھے ہٹ گئے۔ سڑک سے میں اب چند فٹ ہی دور رہ گیا تھا کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے' یہ سوچ کر میں نے اپنے دونوں پیر اس طرح سیدھے کر لیے جس طرح کوئی پرندہ اڑتے اڑتے کہیں بیٹھنے سے پہلے اپنے دونوں پنجے نیچے کر لیتا ہے۔ میرے جوتے اوپر ہی رہ گئے تھے اور میں ننگے پیر تھا۔ اس وجہ سے اور بھی محتاط تھا۔ سڑک پر میں بہت اطمینان سے اتر گیا۔ میرے جسم کو ہلکا سا جھٹکا بھی نہیں لگا تھا۔ سڑک پر میں بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ دائرے کی صورت میں کھڑے ہوئے لوگ میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔

فضا سے نیچے آتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ فوراً مجھے اس علاقے سے کہیں دور نکل جانا چاہیے۔ اگر میں یہیں رہا تو پولیس مجھے دوبارہ بھی پکڑنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں تیزی کے ساتھ ایک طرف بڑھا اور لوگ گھبرا کر ادھر ادھر ہو گئے۔

"رک جاؤ' ہم بھی آ رہے ہیں۔" عقب سے میں نے عظمت علی کی آواز سنی مگر میں رکا نہیں۔ عظمت علی اور فرید احمد بھی یقیناً بھیڑ میں موجود تھے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے لیے وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تیزی کے ساتھ میں قریب ہی نظر آنے والی ایک نیم تاریک سی گلی میں گھس گیا۔ جلد از جلد میں ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا جنہوں نے مجھے سڑک پر اترتے دیکھا تھا۔

"ادھر۔ وہ ادھر گیا ہے۔ اس گلی میں!" لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور میری رفتار میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ میں اس گلی سے ایک اور سنسان سی گلی میں مڑ گیا۔ اب میں تقریباً دوڑ رہا تھا۔

گلیوں ہی گلیوں میں اس علاقے سے کافی دور نکل آیا اور پھر سڑک پر آ کے ایک خالی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے نے شاید میرے ننگے پیروں پر توجہ نہیں دی تھی ورنہ میری طرف سے کھٹک جاتا اور مجھے قرول باغ لے جانے کی ہامی نہ بھرتا۔ پھر اپنے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے بھی مجھے یہی خیال تھا۔ ممی یا ڈیڈی میں سے کوئی پوچھتا کہ میں ننگے پیر کیوں ہوں اور اپنے جوتے کہاں چھوڑ آیا؟ تو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ دروازہ ملازمہ نے کھولا اور میں تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ پھر میں نے اپنے کمرے تک پہنچنے میں انتہائی سرعت کا ثبوت دیا تھا۔

جیسے ہی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا' میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ اسی کے ساتھ مجھ پر ایک دم اتنی نقاہت طاری ہو گئی کہ بہ مشکل اپنی مسہری تک پہنچ سکا اور پھر اس پر جیسے ڈھے گیا۔ چند ہی لمحے بعد میری حالت اعتدال پر آگئی۔

یہ سب کیا تھا؟ کیا ہے؟ گزرے ہوئے حیرت ناک واقعے کی تفصیلات میرے ذہن میں اجاگر ہونے لگیں۔ مجھے اب یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی میں نے تن تنہا تین وہ ہیکل سرکشوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے اندر ایسی ناقابل یقین اور حیرت انگیز طاقت کس طرح پیدا ہو گئی تھی؟ میں تو ان میں سے کسی ایک کے سامنے چند لمحے نہیں ٹک سکتا تھا۔ اس کے بعد میرا پولیس والوں کے ہاتھ نہ آنا' میری تیز رفتاری بھی عقل کو دنگ کر دینے والی تھی اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات تھی کہ دوسری منزل سے نیچے گرنے کے باوجود معمولی چوٹ تو دور کی بات ہے' مجھے ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ اب خود مجھے یہ سوچ کر خوف آ رہا تھا کہ میں دوسری منزل سے گر گیا تھا۔

میرا وجود آخر ہے کیا معمّا جو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟ میرے اندر یہ پُراسرار قوتیں کیوں ہیں؟ مجھے ہی ایسی نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے جو روئے زمین پر بسنے والے کسی انسان کو عطا نہیں کی گئیں؟ میں عام انسانوں سے مختلف کیوں ہوں؟ کیا بھید ہے اس میں؟ مجھے سنائی دینے والی وہ نسوانی سرگوشیاں کس کی ہیں جو بروقت میری رہنمائی کرتی ہیں' پیش آنے والے واقعات سے مجھے آگاہ کرتی ہیں اور مجھ پر میرے وجود کے اسرار کھولتی ہیں؟ اس نادیدہ انسانی وجود سے میرا کیا رشتہ ہے؟ بہت دن پہلے ممی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ میری ماں کی بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ وہ میری ماں ہی ہے؟ اسی کی بھٹکتی ہوئی روح ہے؟

"نہیں!" پُراسرار سرگوشی ابھری اور میں نے وہی مانوس و مخصوص خوشبو محسوس کی۔ اس نادیدہ وجود نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے تھے۔ مجھے اس کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ "میں تمہاری ماں کی بھٹکتی ہوئی روح نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو تم؟ کسی کی روح ہو؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب نادانستگی میں اس نادیدہ وجود سے میں سوال کر بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے کبھی مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسے مخاطب کر سکتا۔

"میں کسی کی روح نہیں ہوں۔" مجھے اپنے سوال کا جواب ملا۔

پھر تم نظر کیوں نہیں آتیں؟ یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا تو ضرور مگر میری زبان تک نہ آسکا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

"میں نظر بھی آسکتی ہوں۔ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ میں اپنی مرضی کے مطابق ہر صورت میں ظاہر ہو سکتی ہوں سنو کہ تمہارے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں

سے میں واقف ہوں۔ مجھے علم ہے کہ خود میرا نادیدہ وجود بھی تمہارے ذہن میں متعدد وسوسے پیدا کرتا ہے۔ سو میرے بارے میں فی الحال صرف اتنا جان لو کہ قادر مطلق نے میرے وجود کی تخلیق آگ اور ہوا سے کی ہے' ایسی آگ کہ جس میں نور بھی تھا اور ظلمت بھی! آگ ایسی کہ اس میں دھواں نہ تھا' مگر یہ باتیں ابھی پوری طرح تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تمہارے شعور کو ابھی بلوغت کی حدوں میں لے کر آنا ہے اور سنو کہ قرآن پڑھا کرو! اس کتاب حکمت سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ وہ ایک ایسی عظیم کتاب ہے جس میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ واقعی اس کی باتیں سمجھنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

"غور سے رک رک کر اور سمجھ کر قرآن پڑھو!" اس نے پھر مجھے تاکید کی۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔" میرے لبوں نے جیسے خود بہ خود حرکت کی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا کہ جب وہ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں سے واقف ہے تو پھر ان کے جواب کیوں نہیں دیتی؟

"تو جان لو کہ تمہارے وجود میں ایسا حفاظتی نظام پوشیدہ ہے جو خود بہ خود اس وقت حرکت میں آجاتا ہے جب تمہیں کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ آج اور ایک بار پہلے بھی تمہیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے کیوں کہ تم اپنے اندر چھپی ہوئی ان حیران کن قوتوں سے ناآشنا ہو اس لیے مجھے تمہاری رہنمائی کرنا پڑی ہاں تم یہ سوچنے میں حق بجانب ہو کہ میں نے تمہاری رہنمائی کیوں کی؟ سو میرے اور تمہارے درمیان ماں بیٹے کا رشتہ تو نہیں' مگر تم میری اولاد ہی کی طرح ہو۔ تم میری ایک عزیز ہستی کی نشانی ہو۔ تمہاری رہنمائی کرنا میرا فرض تھا اور ہے اور فرض ہے۔ سو میں نے یہ فرض پورا کیا اور پورا کرتی رہوں گی' اس وقت تک جب تک میری زندگی ہے۔" اس کی سرگوشیوں کے دوران جو سوالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے' وہ ان کے بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ "ہاں موت میرا بھی مقدر ہے' ہر وجود کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ میں اس سے مبرا نہیں ہوں۔"

"کیا وہ عزیز ہستی میری ماں تھی جس کے سبب تم مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہو؟" ایک سوال میری زبان تک بھی آگیا۔

"ہاں تمہاری ماں بھی مجھے عزیز تھی' مگر ابھی میں نے جس عزیز ہستی کا ذکر کیا' وہ تمہاری ماں نہیں تھی۔ وہ کون

تھی؟ تمہارے اس سوال کا جواب فی الحال نہیں دیا جا سکتا۔ سنو کہ قبل از وقت کچھ باتیں جان لینا کس قدر نقصان دہ ہوتا ہے۔ وقت کو اپنا سفر طے کرنے دو اور علم حاصل کرو کہ علم حاصل کرنا سب سے افضل ہے۔"

"میں... میں یقیناً علم حاصل کروں گا اور... اور ایک روز یہ جان لوں گا کہ قادرِ مطلق نے میرے وجود میں یہ حیرت انگیز قوتیں کیوں جمع کر دی ہیں! مجھے ان نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے جو کسی انسان کو عطا نہیں ہوئیں!" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"ہاں... یقیناً ایک روز تم یہ جان لو گے اور اتنا تمہیں میں بھی بتا سکتی ہوں کہ تمہارے وجود کا بھید تمہارے نام میں چھپا ہوا ہے۔ یہ نام ایک پردہ ہے اور جس دن یہ پردہ اٹھ گیا یا خود تم نے اس پردے کو اٹھا دیا تم پر تمہارے وجود کی بہت سی حقیقتیں منکشف ہو جائیں گی... تم نے ٹھیک سوچا' میں یہ بھید جانتی ہوں' یہ پردہ اٹھا سکتی ہوں' مگر ابھی پردہ اٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ صبر کرو طارنوش میرے بچے ابھی صبر کرو!"

"تمہارا نام کیا ہے؟ میں تمہیں کس نام سے یاد رکھوں؟ کس نام سے پکاروں؟... اور... اور کیا کبھی میں نے تمہیں پکارا تب... تو تم میری پکار سن لو گی؟ میرے پاس آ جاؤ گی؟" میں نے رک رک کر اس سے پوچھا۔ میری آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس سے میرا بہت قریبی رشتہ ہو۔

"تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میرا نام اسنی ہے اور سنو کہ یہ ضروری نہیں' جب تم مجھے پکارو میں آ ہی جاؤں' مگر میں تمہاری طرف سے غافل نہیں رہتی۔ میں تمہارے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتی ہوں۔ اس لیے کہ ابھی تم اپنے وجود کی حیرت ناکیوں سے پوری طرح آگہی نہیں رکھتے اور... اور اس کی ایک بڑی وجہ اور بھی ہے۔ تمہیں... تمہیں کچھ ایسی قوتوں کی طرف سے بھی خدانخواستہ خطرہ پیش آ سکتا ہے جن سے ابھی تم واقف نہیں ہو۔ میں اسی لیے تم سے قریب رہنے کی کوشش کرتی ہوں کہ وہ... وہ جنہوں نے تمہارے باپ کو قتل کروا دیا... کہیں تمہیں بھی کوئی نقصان نہ پہنچا دیں... نہیں! اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی... خدا حافظ!"

میں بے چین ہو کر اسے پکارتا رہ گیا' مگر وہ نہیں لوٹی' اس کی مخصوص خوشبو معدوم ہو چکی تھی۔

یہ انکشاف میرے لیے انتہائی ہولناک تھا کہ میرے والد کو قتل کیا جا چکا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔ میری یہ آس بھی ٹوٹ گئی تھی کہ اگر میں اپنی ماں کو نہیں دیکھ سکا تو زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے والد سے میری ملاقات ہو جائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے تھے اور کب ممی میرے کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ میں تو اس وقت چونکا تھا جب ممی کا ہاتھ مجھے اپنے شانے پر محسوس ہوا تھا۔

ممی کو اس عالم میں اپنے پاس دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں ان کے سینے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ "میں بے سایہ ہو گیا ممی... بے سایہ ہو گیا!"

"تجھے کیا... کیا ہو گیا میرے بچے۔ کیا ہو گیا؟" ممی کی آواز بھی بھرا گئی۔

"ممی!... ممی' میرے والد کو قتل کروا دیا گیا... وہ... وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ممی... چلے گئے!" میں ممی کے سینے سے لگا ہوا بلبلا رہا تھا اور روئے جا رہا تھا۔ "میں یتیم ہو گیا۔ آج میں یتیم ہو گیا ممی!"

میرے زور زور سے رونے کی آوازیں سن کر ڈیڈی بھی وہیں آ گئے۔ انہوں نے ممی سے میرے رونے کی وجہ پوچھی ان کے لہجے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ... یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے والد کو قتل کروا دیا گیا۔" ممی نے بہ مشکل بتایا۔ "معلوم نہیں یہ کہاں گیا تھا؟ اور... اور کہاں سے یہ خبر سن کے آیا ہے!"

ڈیڈی نے محبت سے میری پیٹھ تھپکی اور دلاسا دیتے ہوئے بھاری آواز میں بولے۔ "مجھے بتا... بتا میرے بچے کہ تیرے والد کو کس نے قتل کروایا ہے؟... یقین کر کہ وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ اسے ڈیسوزا پھانسی کے پھندے تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے آنسو بھری آنکھوں سے ڈیڈی کی طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر ان کے گلے سے لگ گیا۔ "مجھے... مجھے نہیں معلوم ڈیڈی کہ... کہ میرے والد کو کس نے قتل کیا ہے! اگر... اگر یہ معلوم ہوتا تو... تو میں خود اس قاتل کو زندہ نہ چھوڑتا۔"

"نہیں میرے بچے! ایسا نہ کہو' قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا۔" ڈیڈی نے مجھے سمجھایا۔ "تمہیں اگر کبھی معلوم بھی ہو جائے کہ تمہارے والد کا قاتل کون ہے تو تم صرف اور صرف قانون کا سہارا لو گے۔ خود اس سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کرو گے!"

ڈیڈی کے دیر تک سمجھانے اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے میں نے اوپری دل سے یہ وعدہ کر لیا کہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ پھر جب میری طبیعت کچھ سنبھل گئی تو انہوں نے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔

اسنی کے علاوہ وجود سے ڈیڈی اور ممی دونوں ہی باخبر تھے۔ میں نے اسی لیے انہیں بتا دیا کہ اپنے والد کے قتل کی خبر مجھے کس سے ملی ہے!

"خداوند تمہاری ماں کی روح پر اپنی برکتیں نازل کرے' خود اس نے بھی ہمیں تمہارے والد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی ہم نے اسے اس کا وہ عہد توڑنے پر مجبور کیا جو اس نے اپنے شوہر سے کیا تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تمہارے والد کے متعلق کچھ معلوم ہوا ہے' مگر افسوس کہ خبر ملی بھی تو اندوہناک!"

ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ "وہ جو تم سے سرگوشیاں کرتی ہے' سچی ہے کہ آج تک اس نے کوئی جھوٹ بات نہیں کی' مگر... مگر تم... تم یتیم نہیں ہو میرے بچے! تمہارے ممی ڈیڈی ابھی زندہ ہیں... زندہ ہیں!" ڈیڈی کی آواز شدت جذبات سے کانپنے لگی اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

میرا دل ایک بار پھر بھر آیا اور میں نے ڈیڈی سے بوجھل آواز میں کہا "آپ... آپ ٹھیک کہتے ہیں... م... میں یتیم نہیں ہوں... زندہ ہیں میرے ماں باپ!"

وہ شب میرے لیے شب گریہ تھی۔ میں نے دیر تک گریہ کیا اور پھر مجھے صبر آنے لگا۔ میرے رب نے مجھے صبر دیا اور میں نے صبر کیا۔ اسی رات میں نے یہ بھی سوچا کہ جو لوگ میری ماں کو قتل کروانا چاہتے تھے' وہی میرے باپ کے قاتل بھی تو ہو سکتے ہیں۔ بعد میں کسی طرح انہیں علم ہو گیا ہو گا کہ میری ماں نے کس سے شادی کی تھی! کیا خبر میرے والد خود میری ماں کی تلاش میں قاتلوں کے دروازے تک پہنچ گئے ہوں اور یہ راز کھل گیا ہو۔

مجرم مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ دوسرے ہی دن میں وہاں پہنچ گیا' یہ نواب فرقان علی کی کوٹھی تھی۔ اسنی نے میرے وجود میں چھپی ہوئی جن حیرت انگیز اور پُراسرار قوتوں کا انکشاف کیا تھا' ان سے واقف ہونے کے بعد میرے دل سے خوف نکل گیا تھا۔ میرے اطمینان اور بے خوفی کے لیے یہ یقین کافی تھا کہ میرے وجود میں ایسا حفاظتی نظام پوشیدہ ہے جو خود بہ خود اس وقت حرکت میں آ جاتا ہے جب مجھے کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ اب میرے سلگتے ہوئے احساسات مزید انتظار کے متحمل نہیں تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ اپنی ماں کا انتقام لینے کے لیے رفتہ رفتہ انہیں ذلت و رسوائی کی حد تک لے جاؤں گا اور پھر انہیں پچھتاوے کی موت

ماروں گا' مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ پہلے مجھے اپنے اندر چھپی ہوئی قوتوں کا عرفان نہیں تھا' وگرنہ نواب زادہ عرفان علی کی موجودگی میں یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

میرا سینہ دھواں دے رہا تھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شاید اسی لیے بڑی کوٹھی میں رہنے والے بڑے لوگوں کو یہ گمان تک نہ ہوا کہ میں نے آج کس ارادے سے وہاں قدم رکھا ہو گا۔ گزشتہ روز بازار حسن میں پیش آنے والے واقعے سے عظمت علی انتہائی مرعوب تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ قدرے سوجا ہوا تھا۔

"طارنوش! کل تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ہم تمہیں آوازیں دیتے رہ گئے!" عظمت علی مجھ سے بولا۔ ہم دونوں اس وقت کوٹھی کے مہمان خانے میں تھے۔ پھر اس نے پیش آنے والے واقعے پر اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا دوست کہ تم اتنے بہادر اور طاقتور ہو!"

"بھول جاؤ اس قصے کو اور یہ بتاؤ کہ تمہارے والد اس وقت کہاں ہیں؟"

عظمت علی گڑبڑا گیا۔ "وہ کوٹھی ہی میں ہیں' مگر... زیبا والے معاملے پر ان سے بات نہ کرنا۔"

"کیوں؟... کیوں نہ بات کروں؟" میرا لہجہ بدل گیا۔ "انہوں نے مجھ پر شبہے کا اظہار کیا تھا اور میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا شبہ غلط نہیں ہے۔"

"کک... کیا؟... تم کیا کہہ رہے ہو طارنوش؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں!" میرا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟... رک جاؤ طارنوش! میں' میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والا ہوں جو... جو مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ایک ملازمہ نے بتائی ہے۔ اگر تم... تم خود اس وقت نہ آتے تو میں... میں تمہارے گھر آتا۔ میں اسی لیے تم سے کہہ رہا تھا کہ زیبا والے معاملے پر ابا جان سے گفتگو نہ کرنا۔"

میں رک گیا اور سپاٹ آواز میں عظمت علی سے پوچھا۔ "بتاؤ تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟"

"زیبا نے تم سے اقرارِ محبت کر لیا ہے اور... اور ابا جان اس پر سخت برہم ہیں۔ انہوں نے اماں جان سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ زیبا کا ہاتھ ایک عیسائی کے ہاتھ میں نہیں دیں گے اور... اور انہوں نے زیبا کو بہ طور سزا آج دوپہر کے بعد سے اس کے کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ زیبا کو دوپہر کا کھانا بھی نہیں دیا گیا اور اب... اب شام ہو گئی ہے

و صبح سے بھوکی ہے۔ سارا گھر ایک عذاب میں گرفتار ہے۔ دادا حضور تک بھی یہ بات پہنچ گئی ہے اور انہوں نے ابا جان کو طلب کرلیا ہے۔ ابا جان اس وقت انہی کے پاس ہیں اور۔۔۔"

عظمت علی نے کچھ اور بھی کہا ہوگا مگر شدید غصے کے سبب میں مزید کچھ اور نہیں سن سکا۔ مجھے اپنی ماں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات یاد آ رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس کوٹھی میں ایک اور قبر کھودنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایک بار پھر تاریخ کو دہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نے نظر بھر کر عظمت علی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور بے چارگی تھی۔ وہ زیبا کا بھائی اور میرا دوست تھا۔ یقیناً اس کے دل میں میرے لیے گنجائش تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت تمہارے ابا اور خاندان کے دیگر بڑوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کے لیے فارنوش! جذبات میں نہ بہو۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤ میرے دوست!" عظمت علی کا انداز مجھے سمجھانے والا تھا۔ "تم۔۔۔ فارنوش تم مجھے اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگتے۔"

"میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہوں عظمت علی! اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ لوگ زیبا کو قتل کر دیں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم!" عظمت علی کو میری بات پر یقین نہیں آیا، اس کا اظہار اس کے لہجے سے ہو رہا تھا۔ اسے میرے انکشاف پر حقیقت کا گمان نہیں تھا۔ "میں تمہاری بات پر کس طرح یقین کر لوں! کوئی باپ یا دادا بھلا اپنی بیٹی یا پوتی کو کیسے قتل کر سکتا ہے!"

"میں فی الحال تمہاری بات کا جواب نہیں دے سکتا۔" یہ کہتا ہوا میں حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

عظمت علی خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ میرے قدم تیزی کے ساتھ حویلی کے اس حصے کی جانب بڑھ رہے تھے جو اس گھر کے سربراہ نواب فرقان علی کے لیے مخصوص تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو نواب صاحب کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کے سامنے ایک ملازم کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "بڑے نواب صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔"

"اندر کون کون ہے؟" عظمت علی نے آہستہ سے پوچھا۔

ملازم کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ بڑے نواب صاحب نے دونوں نواب زادوں کو اپنے حضور طلب کیا ہوا تھا۔

مجھے طیش آگیا۔ "اندر کوئی بھی ہو، میں ہر قیمت پر کمرے میں جاؤں گا!"

عظمت علی میرے تیور بھانپ گیا تھا۔ اس نے ملازم کو اشارہ کیا کہ مجھے اندر جانے دے۔ ملازم دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے دیر نہیں کی اور دروازہ دھڑدھڑا دیا۔

"کون ہے یہ گستاخ؟" اندر سے آنے والی آواز میں تیزی اور غصہ تھا۔ یہ آواز نواب صاحب کی تھی جس میں بڑھاپے کے باوجود بلا کا رعب و دبدبہ تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ "فارنوش۔ میں فارنوش ہوں۔" میری آواز میں بھی تیزی اور غصہ تھا۔

"فارنوش!" عظمت علی کے والد، یعنی میرے بڑے ماموں کی آواز تھی۔ "اچھا ہوا کہ تو خود چل کر یہاں تک آگیا۔"

اسی کے ساتھ نواب صاحب کی آواز گونجی۔ "طمنچہ ہمیں دو عرفان علی! یہ ہمارا حکم ہے اور دروازہ کھول دو!"

میں سمجھ گیا کہ میری آمد کی اطلاع پاتے ہی بڑے ماموں نے طمنچہ نکال لیا تھا اور بڑے نواب صاحب ان سے طمنچہ مانگ رہے تھے۔ عظمت علی میرے برابر تھرتھرا کھڑا تھا۔ خوف سے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی۔

بڑے ماموں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر اندر گھسیٹا۔ "عظمت علی! تم یہاں سے چلے جاؤ اور ملازم سے کہو کہ کسی کو ادھر نہ آنے دے!" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

یہ نواب صاحب کی نشست گاہ تھی اور وہ سامنے ہی بڑی سی چوکی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑے طمطراق سے بیٹھے تھے۔ طمنچہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ قریب ہی دوسرے گاؤ تکیے کے سہارے میرے چھوٹے ماموں نواب زادہ غفران علی بیٹھے ہوئے تھے۔

"ابا حضور! مجرم حاضر ہے۔" یہ کہتے ہوئے ماموں نے میرے گریبان کو جھٹکا دے کر مجھے آگے دھکیلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے ذرا سی کوشش میں اپنا گریبان ان سے چھڑا لیا۔

"تمہاری موت ہی تمہیں کھینچ کر یہاں لائی ہے۔" نواب صاحب گرجے۔ "تم نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی

ر اس گھر کی عزت یعنی زیبا۔" اتنا کہہ کر وہ رک گئے ... کہنے لگے۔ "تم نے ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے۔"

"میں نے کسی کی عزت خاک میں نہیں ملائی۔" میں ... ف صاف مکر گیا، پھر بولا۔ "اگر زیبا نے مجھ میں دلچسپی لینے ... وئی اظہار کیا ہے تو یہ اس کا یک طرفہ خیال ہے۔"

"ہم اسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے!" نواب صاحب ... میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ میں جانتا ہوں نواب صاحب کہ آپ زیبا کو زندہ ... ں چھوڑیں گے۔ زیبا تو آپ کی پوتی ہے، آپ نے تو اپنی ... سعدیہ کو معاف نہیں کیا تھا۔"

میرے لہجے کے ٹھہراؤ اور اس انکشاف سے ان تینوں ... چہروں کی رنگت بدل گئی۔ چند لمحے کو کمرے میں بوجھل سی ... وشی پھیل گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" نواب صاحب کی آواز نے ... ت توڑا۔ وہ مجھ سے سوال کر رہے تھے۔

"مطلب یہ ہے نواب صاحب کہ آپ نے بہت عرصے ... اس حویلی کے باغ میں اپنی بیٹی کے لیے جو قبر کھدوائی ... ، وہ اب تک خالی پڑی ہے۔ آپ لوگ اس وقت یہی ... وچ رہے ہوں گے کہ اس قبر میں زیبا کو دفن کر دیا ... ئے۔"

"تم کیا بک رہے ہو!" میرے بڑے ماموں عرفان علی ... اٹھے۔ اب ان کا لہجہ ذرا سا نرم پڑ گیا تھا۔

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زیبا اور سعدیہ بیگم کے ... ایک سے ہیں۔" میرے انکشاف نے ان تینوں کو ... ال سا کر دیا تھا۔ میں نے ان کی انا کے تابوت میں آخری ... ں ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "اور میں۔۔۔ میں اسی بدنصیب سعدیہ ... ٹا ہوں۔" میری آواز میں ارتعاش تھا۔

میں نے دیکھا وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف سوالیہ ... وں سے دیکھ رہے تھے۔ غالباً صورتِ حال ان کی سمجھ میں ... ب آ رہی تھی۔ ان کے چہرے ستے گئے۔ نواب صاحب کی ... انی پر الجھن اور پریشانی کی لکیریں واضح تھیں مگر کچھ ہی دیر ... وہ اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پانے میں کامیاب ... گئے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ حالات سے سمجھوتے پر ... نہیں۔

پھر وہی ہوا جو میرا قیاس تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولے ... مارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم سعدیہ بیگم کے بیٹے ہو؟"

میں دھیمی اور پُرسکون آواز میں بولا۔ "مجھے اس پر فخر ... کہ میں ان کا بیٹا ہوں اور اس پر شرمندہ ہوں کہ میرا کوئی رشتہ آپ سے بھی ہے۔" میں کسی مصلحت کو آزمانا نہیں چاہتا تھا۔

"ہم تم سے ثبوت طلب کرتے ہیں!" نواب صاحب نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"مجھے ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نواب صاحب! میں اس رشتے کے حوالے سے اپنی کسی خواہش کی تکمیل نہیں چاہتا۔ مجھے نہ کسی جاگیر کی ضرورت ہے نہ دولت و جائداد کی! میں ایسے رشتے کا ثبوت فراہم ہی نہیں کرنا چاہتا جس کا کوئی حوالہ آپ لوگ بنیں۔" مجھے اپنے لہجے کی کڑواہٹ کا احساس تھا۔

"لڑکے! زبان درازی نہ کر! اور یہ نہ بھول کہ ہم گستاخوں کی زبان ان کی گدی سے کھنچوا لیتے ہیں۔" نواب صاحب چیخ اٹھے۔

"آپ مجھے میری ماں کی طرح مظلوم اور بے بس نہ سمجھیں نواب صاحب!" میں نے ان کے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ کو میری ماں پر جو ظلم کرنا تھے، کر لیے۔ آپ نے انہیں گھر سے بے گھر کیا۔ آپ سنگ دل اور بے رحم ہیں۔ آپ نے ظلم کی انتہا کر دی تھی۔" میری آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ "خود ساختہ عزت اور اپنی جھوٹی انا پر آپ نے اپنی بیٹی کو قربان کر دیا۔ آپ کیسے باپ ہیں؟ اور یہ لوگ۔۔۔ یہ کیسے بھائی ہیں؟ لعنت ہے ایسے رشتوں پر!" میرے لہجے میں حقارت در آئی۔

"تم ہم سے جواب طلبی کر رہے ہو، ہم سے! اور ہمارے پاس تمہاری باتوں کا صرف اور صرف ایک ہی جواب ہے لڑکے! یہ کہ ہم تمہیں موت کی نیند سلا دیں!" غصے کے سبب نواب صاحب کی آواز بدل سی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھیڑیا غرا رہا ہو۔ الفاظ ختم ہوتے ہی ان کے ہاتھ میں تھمے ہوئے طمنچے کی نال اوپر اٹھنے لگی۔ انہوں نے میرے سینے کا نشانہ لیا تھا۔

*



اگر مجھے اپنے اندر چھپی ہوئی حیرت انگیز قوتوں کا یقین نہ ہوتا تو شاید موت کو اتنے قریب دیکھ کر حوصلہ ہار دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور بے خوفی سے بولا "چلائیے گولی نواب صاحب! آپ نے میری ماں کو پہلے ہی مار دیا' میرے باپ کو قتل کر دیا' اب میرا سینہ بھی چھلنی کر دیجیے!"

"تمہارا باپ!" نواب صاحب یہ کہتے ہوئے چونک اٹھے۔

"ہاں میرا باپ!" میں نے ترکی بہ ترکی کہا "اس کے قاتل بھی تو آپ ہی ہیں!"

"ہم۔۔۔ ہم تمہارے باپ کو نہیں جانتے!۔۔۔ ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا مگر۔۔۔ مگر ہم سعدیہ۔۔۔ سعدیہ کے بارے میں ضرور جاننا چاہیں گے کہ وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے!" اب نواب صاحب کی آواز سے واضح طور پر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹنا شروع ہو رہے ہیں۔

"میں اس وقت تک اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک آپ میرے باپ کے قتل کا اعتراف نہیں کر لیں گے!" میری آواز میں تلخی تھی۔

"کاش ہم نے تمہارے باپ کو واقعی اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہوتا!" نواب صاحب کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور غصہ بھی! چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولے "تمہارے حکم کے باوجود تم نے اب تک یہ ثبوت پیش نہیں کیا کہ تم سعدیہ بیگم کے بیٹے ہو!" ان کا انداز جواب طلبی کا سا تھا' مگر اب آواز میں پہلے جیسی سختی باقی نہیں رہی تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

"میں پہلے بھی آپ کی اس بات کا جواب دے چکا ہوں نواب صاحب کہ مجھے ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت میرے یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ سے اپنے باپ کے قتل کا اعتراف کرا سکوں" میں اپنی بات پر قائم رہا۔

"تم حد ادب سے بار بار تجاوز کر رہے ہو لڑکے!" نواب صاحب پھر برہم ہو گئے "حالانکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ سعدیہ بیگم کے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے تمہیں ہلاک

کر دیں۔ تم ہمارے قہر کو آواز دے رہے ہو!" ان کی بڑی سرخ آنکھوں میں پریشانی تھی۔ غالباً وہ اس رویے کے بارے میں متذبذب تھے' جو انہیں مجھ سے روا رکھنا تھا

"ابا حضور!" سنا میرے بڑے ماموں نواب زادہ ... علی بول اٹھے "یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اس کی ... کھلوانے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا ... شکنجے میں کسنا پڑے گا۔ جب اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں گی ... خود ہی سارا سبق فر فر سنانا شروع کر دے گا۔"

"بھائی جان کا مشورہ درست ہے ابا حضور!" میرے ... چھوٹے ماموں نواب زادہ نصراللہ علی نے بھی تائید کی ... مجھے ایذا رسانی کے آلات لانے کی اجازت مرحمت ... فرما دیجیے! موجودہ حالات کے پیش نظر اس کی زبان کھلوانا ... ضروری ہو گیا ہے۔ ہم تینوں کے سوا جن باتوں کا علم ...





...نہیں تھا' آخر اسے وہ باتیں کیسے معلوم ہو گئیں! اس کا وجود ...ہماری عزت و آبرو کے لیے شدید خطرہ بن سکتا ہے۔"

نواب صاحب اپنے دونوں بیٹوں کی باتیں سن کر کچھ دیر ...خاموش رہے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ...فیصلہ نہیں کر پا رہے۔ پھر جب وہ بولے تو ان کی آواز میں ...سختی و سفاکی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "اس مسئلے کا ایک حل ...یہ بھی تو ہے کہ یہ قصہ ہمیشہ کے لیے یہیں ختم کر دیا جائے۔ ...اس گستاخ لڑکے کی زبان بند کر دی جائے' اسے موت کی نیند ...سلا دیا جائے۔ یوں بھی یہ اسی سزا کا مستحق ہے کہ اس نے ...ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے" یہ کہہ کر نواب صاحب نے ...تصدیق طلب نظروں سے باری باری اپنے دونوں بیٹوں کی ...طرف دیکھا۔

"بجا فرمایا ابا حضور!" بڑے ماموں نے کہا "مگر اس ...طرح اب یہ قصہ ختم نہیں ہو گا۔ سعدیہ بیگم کے بارے میں ...ہمیں تو اب یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"تو پھر ٹھیک ہے' مار مار کر ادھ موا کر دو اس کی کھال! اسے ...اس وقت تک اذیتیں دو جب تک یہ زبان نہ کھولے!" ...نواب صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔

میں ان کی یہ ساری باتیں اس طرح سنتا رہا جیسے ان ...باتوں کا تعلق مجھ سے نہ ہو اور وہ میرے بجائے کسی دوسرے ...کو اذیتیں دینے کی بات کر رہے ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں ...ایک فیصلہ کیا اور پھر بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ نواب ...صاحب کی طرف بڑھنے لگا۔

"رک جاؤ' ورنہ میں گولی مار دوں گا!" نواب صاحب ...گرجے

"پھر چلائیے نا گولی' روکا کس نے ہے!" میں بدستور ...ان کی طرف بڑھتا رہا۔ اس وقت میرے ذہن میں پُراسرار ...پیشین گوئیاں کرنے والی اسیّ کے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ ...تمہارے وجود میں ایسا حفاظتی نظام پوشیدہ ہے جو خود بہ خود ...اس وقت حرکت میں آ جاتا ہے جب تمہیں کوئی خطرہ درپیش ...ہو۔ اسی یقین پر میں نے دانستہ خود کو شدید خطرے میں ...ڈال رہا تھا۔ میری نظریں نواب صاحب کے ہاتھ میں موجود ...طمنچے پر جمی ہوئی تھیں' جس کی نال میری طرف اٹھی ہوئی

اچانک میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نواب ...صاحب کی انگلی کا دباؤ طمنچے کے ٹریگر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے ...گرمی محسوس ہوئی اور میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ ...اسی وقت دو باتیں ہوئیں۔ میرا وجود غائب ہو گیا اور کمرا

زبردست دھماکے سے گونج اٹھا۔

نواب صاحب نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ ان کی چلائی ہوئی گولی مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر میرے نادیدہ وجود کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ میرے لیے یہ ایک اور حیرت ناک تجربہ تھا کہ نادیدہ ہونے کے بعد میرے جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ پہلی بار نادیدہ ہونے کے بعد میں خوف زدہ ہو گیا تھا مگر اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا جسم واپس مل جائے گا۔ اسی دوسرے تجربے کے دوران میں مجھے ایک بات کا احساس اور ہوا۔ یہ احساس بھی میرے لیے عجیب ہی تھا۔ میرا جسم خود میری اور دوسروں کی نظروں سے اوجھل تو ہو گیا تھا لیکن اس کی موجودگی کسی شک و شبے سے بالاتر تھی۔ میرے تمام حواس بیدار تھے۔ میں چل پھر سکتا تھا' اپنے جسم کو حرکت دے سکتا تھا۔

مجھے اپنی نظروں کے سامنے غائب ہوتے دیکھ کر وہ سب گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ شدید حیرت نے انہیں بے جان مجسموں کے مانند بنا دیا تھا۔ ہر چند کہ مجھے اس طمنچے سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا' پھر بھی میں نے آگے بڑھ کے نواب صاحب کے ہاتھ سے طمنچہ چھین لیا۔

نواب صاحب تیورا کر جوکی پر ڈھیر ہو گئے۔ یقیناً ان کے بوڑھے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

"ابا حضور!۔۔۔ ابا حضور!" کہتے ہوئے ان کے دونوں بیٹے ان پر جھک گئے۔ میں طمنچہ ہاتھ میں تھامے ان کے قریب ہی کھڑا تھا' مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھے ورنہ شاید طمنچے کو فضا میں معلق دیکھ کر وہ دونوں بھی چیخ اٹھتے۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میرے والد کو انہی لوگوں نے قتل کیا ہے تو اس کا علم میرے دونوں ماموؤں کو بھی ہو گا بلکہ ممکن ہے یہ دونوں ہی میرے والد کے قاتل ہوں۔ میں ابھی اس سلسلے میں ان دونوں سے استفسار کرنے ہی والا تھا کہ مجھے اسیّ کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔ میں چونک اٹھا۔

"طارنوش!" اسیّ کی سرگوشی ابھری "میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارے والد کے قاتل یہ لوگ نہیں ہیں۔"

"پھر۔۔۔ پھر کس نے انہیں قتل کیا ہے؟" میں بڑبڑایا۔

"معلوم ہو جائے گا تمہیں! مگر ابھی نہیں۔ ابھی تمہارے یہ جاننے کا وقت نہیں آیا۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں اسیّ سے مزید کوئی سوال کر سکتا اس کی مخصوص خوشبو معدوم ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جا چکی

ہے۔ بہرحال اس کی آمد سے مجھے کم از کم یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ نواب صاحب یا ان کے دونوں صاحب زادے میرے والد کے قتل میں ملوث نہیں ہیں۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ میرے والد کو کس نے اور کیوں قتل کیا ہے؟ اسی کو یقیناً اس سوال کا جواب معلوم تھا مگر کسی سبب ابھی وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

نواب صاحب اور میرے دونوں ماموں' میری ماں کے سلسلے میں تو یقیناً مورد الزام ٹھہرائے جا سکتے تھے لیکن میرے والد کے قتل سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے غلط قیاس کیا تھا۔ جو کچھ سوچ کر میں یہاں آیا تھا' وہ غلط ثابت ہونے کی صورت میں میرا غصہ بڑی حد تک کم ہو گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے مجھے زیبا کا خیال آگیا۔ میں اب یہاں آ ہی گیا تھا تو کم از کم وقتی طور پر اسے بھوک پیاس کے عذاب سے نجات دلا سکتا تھا۔ بہرحال مجھی سے اقرار محبت کے سبب وہ اس عذاب میں گرفتار ہوئی تھی۔ ابھی تک میرے ذہن میں یہ نہیں آیا تھا کہ میں اسے اس کے گھر والوں کے ظلم و ستم سے کس طرح بچا سکتا ہوں!

زیبا کا خیال آتے ہی میں نے اس کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ طمنچہ میں نے چوکی کے قریب ایک طرف ڈال دیا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اس لیے آواز نہیں ہوئی۔ جب میں کمرے کے بند دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا تو نواب صاحب کو ہوش آگیا۔ میرے چھوٹے ماموں نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ میں نے اچانک نواب صاحب کی آواز سنی تو میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"طارنوش ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ کہاں گیا؟" نواب صاحب پوچھ رہے تھے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ نواب صاحب کو سہارا دے کر گاؤ تکیے کو ان کی کمر کے پیچھے رکھنے والے میرے بڑے ماموں تھے۔

"ابا حضور! وہ۔۔۔ کوئی خبیث روح معلوم ہوتا ہے جو۔۔۔ جو کمرا بند ہونے کے باوجود غائب ہو گیا!" بڑے ماموں نے جواب دیا۔

معلوم نہیں مجھے کیا سوجھی کہ میں ایک دم بول اٹھا "جسے آپ خبیث روح کہہ رہے ہیں' وہ اس وقت بھی اسی کمرے میں موجود ہے۔"

میری آواز سن کر وہ تینوں ہی اچھل پڑے۔ ان کے چہروں سے شدید خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

ان کے خوف سے فائدہ اٹھا کر میں نے انہیں دھمکی دی

"سنیے! اگر آپ لوگوں نے زیبا پر ظلم و ستم توڑے تو میں سب کا جینا حرام کر دوں گا! آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"ہم ۔۔۔ مگر تم ۔۔۔ تم کون ہو؟" چھوٹے ماموں نے ... کر کے پوچھا۔

مجھ سے جو سوال کیا گیا تھا' اس کا سبب محض خ... ورنہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے لیے میری آواز اجنبی تھی۔ میں نے اسی لیے جواب میں کچھ نہیں کہا اور دروا... کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دروازے کے قریب پہنچ ... نے اطمینان سے کنڈی کھولی اور پھر باہر نکل گیا۔

"وہ ۔۔۔ وہ جا رہا ہے ۔۔۔ وہ چلا گیا!" اپنے ... مجھے بڑے ماموں کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

دروازے کے باہر ملازم موجود تھا مگر ظاہر ہے اسے نظر نہیں آیا۔ اس کے قریب سے گزر کر میں ... کے ساتھ زیبا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے ... ایک راہداری سے گزرتی ہوئی رابعہ نظر آئی۔ وہ گلا... سوٹ میں خود بھی ایک شرارہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ... تین تلواروں میں سے ایک تھی جو بہ یک وقت میر... میں نیام ہونے کی آرزومند تھیں۔ رابعہ میرے ... ماموں کی بیٹی تھی۔ میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا۔

"ٹھہرو رابعہ!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر ... سے اسے مخاطب کیا۔

"طارنوش!" وہ رک گئی اور پھر چونک کر اد... دیکھنے لگی۔

میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پھر خرا... وصول کرنے لگا۔

"چھوڑ دو مجھے ۔۔۔ چھوڑ دو!" وہ وحشت زدہ آوا... اور میری گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگی۔

"اچھا جاؤ' پھر کبھی سہی!" یہ کہتے ہوئے میں ... چھوڑ دیا۔

وہ میری گرفت سے نکلتے ہی اس طرح وحشت... ایک طرف بھاگی جیسے موت اس کے تعاقب میں ہ... یہ ہوئی کہ کسی نے اسے یوں بھاگتے ہوئے نہیں... ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ میں نے چند روز پہلے... تصور سے جو حسین منظر دیکھے تھے' انہی میں سے ایک... حقیقت بن گیا تھا۔ میں ایک کیف آگیں تجربے... تھا۔ اسی لذت سے سرشار میں زیبا کے کمرے تک... دروازے پر کنڈے چڑھی ہوئی تھی۔ آس پاس ...

نہیں تھا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو میرے لیے کچھ فرق نہ پڑتا۔

دروازے کی کنڈی کھول کر میں بلا جھجک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا معلوم نہیں کیوں کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے اعصاب کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میں نے دائیں جانب بچھی ہوئی مسہری کی طرف نظر دوڑائی۔ زیبا اس پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر مسہری کے قریب پہنچ گیا پھر میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

زیبا کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ میں ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ یقیناً اس نے چوڑیاں پیس کر کھا لی تھیں۔ ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے اس نے موت کو گلے لگا لیا تھا' خودکشی کر لی تھی۔ ایک باپ کے ظلم نے ایک بیٹی کی جان لے لی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ زیبا کے معاملے میں میں نے خود کو بھی مجرم محسوس کیا۔ میری ہی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی میرا دل دکھ سے بھر گیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہر چند کہ مرنے والی سے مجھے محبت نہیں تھی مگر وہ تو مجھے چاہتی تھی۔ میں تو اس گھر کے افراد سے انتقام لینا چاہتا تھا' انہیں پچھتاووں کی موت مارنے کا ارادہ رکھتا تھا' پھر خود پچھتاوے کا شکار کیسے ہو گیا تھا؟ بازی الٹ کیسے گئی تھی؟ معلوم نہیں کب تک اور کتنی دیر میں انہی سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا! مجھے ہوش اس وقت آیا جب اسی گھر کی ایک ملازمہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کسی کو مخاطب کر کے بلند آواز میں بتا رہی تھی کہ زیبا کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

میں بوجھل قدموں کے ساتھ زیبا کے کمرے سے نکل گیا۔ میری بڑی ممانی' ملازمہ کے ساتھ کمرے کی طرف آ رہی تھیں۔ وہاں کچھ ہی دیر بعد کہرام مچنے والا ہے' اس خیال ہی سے میرا دل کٹنے لگا۔ پھر میں وہاں مزید نہیں رکا اور تیزی کے ساتھ کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی اس کوٹھی سے نکل کر میں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اسی کے ساتھ میرا جسم مجھے واپس مل گیا۔ اپنے گھر پہنچنے تک میری آنکھوں میں زیبا کا چہرہ گھومتا رہا' اس کی بھولی باتیں یاد آتی رہیں۔ میں سوچتا رہا کاش اس نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی! میں نے تو معاملے کو سنبھال ہی لیا تھا۔ میری واضح تنبیہ کے

بعد یقیناً زیبا پر مزید ظلم و ستم نہ کیے جاتے اور پھر شاید اسے خودکشی کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔

جو واقعات آج پیش آئے تھے' انہیں مد نظر رکھتے ہوئے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ زیبا کی بے وقت موت سے مجھ کو بھی آگاہ کیا جائے گا! اب اس کوٹھی والوں سے میرے ملنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ میرے وجود کو وہ لوگ بھلا کس طرح برداشت کر سکتے تھے! میں نے تو ان کی عزت و وقار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ انہیں خود انہی کی نظر میں گرا دیا تھا' ان کے اصل چہرے بے نقاب کر دیے تھے۔

پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ زیبا کی ناوقت موت کی اطلاع مجھے نہیں دی گئی۔ دوسرے دن صبح اس کا جنازہ اٹھا۔ گھر کے باہر میں پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔ زیبا کا جنازہ قبرستان لے جایا جا رہا تھا۔ آگے بڑھ کر میں بھی اس میں شریک ہو گیا۔ جس وقت میں اس مظلوم و بے گناہ لڑکی کے جنازے کو کاندھا دے رہا تھا' دل ہی دل میں کہہ رہا تھا' زیبا! مجھے معاف کر دینا کہ تم میرے انتقام کی زد میں آگئیں۔

اسی دوران میں میری نظر عظمت علی اور خاندان کے دوسرے افراد پر بھی پڑی۔ مجھے جنازے میں شریک دیکھ کر ان کے چہروں پر کھچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ دور تک جنازے کے ساتھ جا کر میں لوٹ آیا۔ زیبا کے جنازے کو کاندھا دے کر اور اپنی دانست میں اس سے معافی مانگ کر میرے دل کو بڑی حد تک سکون حاصل ہو گیا تھا۔ اس روز مجھے اپنی محبوبہ کلونت کور سے بھی ملنا تھا۔ اس کے عشق میں اب بڑی شدت آگئی

تھی۔ ہماری ملاقاتیں حسب دستور ہفتے میں کم سے کم دو دن اس کی سہیلی شانتی کے گھر ہو جاتی تھیں۔ شانتی ہم دونوں کے عشق کی رازداری ہوئی تھی۔

وقت مقررہ پر میں پہاڑ گنج پہنچ گیا۔ کلونت کور مجھ سے پہلے اپنی ہندو سہیلی شانتی کے گھر پہنچ چکی تھی۔ مجھے اور کلونت کور کو بیٹھک میں چھوڑ کر شانتی اندر گھر میں چلی گئی۔ میرے چہرے سے یقیناً اداسی کا اظہار ہو رہا تھا جو کلونت کور سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے طارنوش، تم کچھ اداس اداس سے لگ رہے ہو؟" وہ بولی۔

کلونت کور کو میں زیبا کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا اس لیے زبردستی مسکرا کر کہنے لگا "نہیں تو! میں کیوں اداس ہوتا؟ ہاں رات کو کوشش کے باوجود سو نہیں سکا جس کی وجہ سے طبیعت کچھ نڈھال ہے۔ شاید اسی لیے میں اداس اداس لگ رہا ہوں۔"

"کیوں، سوئے کیوں نہیں؟ کوئی خاص بات تھی کیا؟" وہ فکرمند لہجے میں پوچھنے لگی۔

"دراصل تمہاری طرف دھیان چلا گیا تھا" میں نے بہانہ بنایا "مجھے یہ خیال آگیا تھا کہ ہم ایک کس طرح ہوں گے!"

"کبھی کبھی میں بھی یہ سوچنے لگتی ہوں تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ کوئی راہ نکالو طارنوش! ہم اس طرح کب تک بچھڑے رہیں گے؟ یونہی کب تک چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟ جب سے ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے، وہ میری شادی کی باتیں کرنے لگی ہے۔ مجھے تو یہ باتیں سن سن کر ڈر لگنے لگا ہے۔ اگر سچ مچ انہوں نے کسی اور سے میری شادی کردی تو کیا ہوگا؟" یہ کہتے ہوئے کلونت کور میرے قریب آگئی۔

ہرچند کہ شانتی کے گھر میں کلونت کور اور میں ہر طرح محفوظ رہتے تھے اور ملاقات کے دوران میں وہ نہیں آتی تھی پھر بھی ہم محتاط رہتے تھے۔ وہ بہرحال دوسرے کا گھر تھا، مگر وہ لمحات بڑے جذباتی تھے۔ میں نے کلونت کور کو خود سے قریب تر کرلیا اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولا "تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا! تم ــــ تم میری ہو، صرف اور صرف میری ہو ــــ میری ہی رہوگی۔"

جذبات کا دریا چڑھتا رہا اور دو محبت کرنے والے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہوتی رہیں۔ حالانکہ میرے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا مگر میں اسے دلاسے دیتا رہا۔ مجھ پر لیکن اس پر بھی خود فریبی کی کیفیت طاری تھی۔ خوش گمانیاں عارضی طور پر ہی سہی، سکون تو پہنچا دیتی ہیں۔ یہی حال اس وقت ہم دونوں کا تھا۔

میں اس دن پہاڑ گنج سے لوٹ رہا تھا تو میرے ذہن پر ایک بوجھ یہ بھی تھا۔ اگر کلونت کور کے گھر والوں نے واقعی اس کی شادی کسی سے کردی تو؟ اس سے زیادہ سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں تو اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اسی روز شام کے وقت ڈیڈی کو دفتر سے آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ نواب فرقان علی کی کوٹھی کا ایک ملازم ان سے ملنے آگیا۔ وہ ڈیڈی کے لیے نواب صاحب کا کوئی پیغام لے کر آیا تھا۔ ہمارے ایک ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ پھر جب ڈیڈی اس سے ملنے ڈرائنگ روم میں گئے تو میں بھی تجسس سے مجبور ہو کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

نواب صاحب کا ملازم، ڈیڈی کو یہ پیغام دینے آیا تھا کہ نواب صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ملازم کے جانے سے پہلے میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔

ڈیڈی کے لیے یہ بلاوا غیر متوقع تھا۔ ان کے علم میں تھا کہ میں نواب صاحب کے یہاں آتا جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نواب صاحب سے میرا کیا رشتہ ہے؟ محلے داری کے ناتے نواب صاحب سے ڈیڈی کی رسمی سی سلام دعا تھی، مگر میل ملاپ یا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں نواب صاحب نے بلوایا تھا۔ میں نے اسے بھی نواب صاحب کا تمکنت و غرور ہی تصور کیا۔ انہیں اگر ڈیڈی سے ملنا ہی تھا تو خود بھی آسکتے تھے۔

اس خلاف توقع بلاوے کا پس منظر جاننے یا پھر کچھ اور سوچ کر ڈیڈی میرے کمرے میں آگئے۔ انہوں نے مجھے نواب صاحب کے پیغام سے آگاہ کیا، پھر کہنے لگے "طارنوش بیٹے! تمہارے خیال میں نواب صاحب نے مجھے کیوں بلایا ہوگا؟"

نواب صاحب کے بلاوے کا مقصد کسی حد تک میری سمجھ میں آگیا تھا، مگر میں نے لاعلمی کا اظہار ہی کیا، پھر بولا "ڈیڈی! وہ نواب ہوں گے تو اپنے گھر کے! آپ کوئی ان کی عملداری میں نہیں بستے کہ وہ آپ کو اپنے حضور طلب فرمائیں" میرے لہجے میں تلخی تھی۔

"مت بھولو طارنوش کہ وہ تمہارے بزرگ ہیں۔ تمہیں ان کے لیے ایسے الفاظ ادا نہیں کرنا چاہئیں۔ جہاں

تک مجھے بلانے کا تعلق ہے تو وہ بہرحال عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ میں اگر ان کے بلانے پر چلا جاؤں گا تو اس سے میری عزت کم نہیں ہو جائے گی۔ محلے داری اور اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ویسے تم ان کی طرف سے کچھ برگشتہ سے معلوم دیتے ہو، تم سے تو ان کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوگئی؟" ڈیڈی نے مجھے کریدنا چاہا۔

"ان سے مل کر آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کیا بات ہے؟" میں نے کوئی قطعی بات نہیں کی، پھر کچھ سوچ کر بولا "ویسے میرا اندازہ یہی ہے کہ وہ میرے ہی متعلق آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہوں گے۔ اخلاقی تقاضے سے مجبور ہو کر اگر آپ خود ہی ان سے ملنے جارہے ہیں تو میری تجویز یہ ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے ڈیڈی کہ اگر نواب صاحب میرے بارے میں کوئی غلط بیانی کریں تو میں ان کے منہ پر اس کی تردید کرسکوں۔"

ڈیڈی میری بات سن کر کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے اور پھر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوگئے۔ ڈیڈی لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں بھی جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

ذرا ہی دیر کے بعد میں ڈیڈی کے ساتھ نواب صاحب کی کوٹھی کی طرف جارہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ کوٹھی پر عجیب سی سوگواری طاری تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ زیبا کی اچانک موت ہی تھی۔ مجھے اور ڈیڈی کو کوٹھی کے مردانہ حصے کی نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ آج میں اس کوٹھی میں بالکل اجنبیوں کی طرح آیا تھا۔

غالباً نواب صاحب کو ملازم نے بتادیا تھا کہ میرے ڈیڈی اکیلے نہیں آئے ہیں اور ان کے ساتھ میں بھی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ نشست گاہ میں آئے تو مجھے وہاں دیکھ کر چونکے تو نہیں البتہ ان کے چہرے پر میں نے تناؤ سا ضرور محسوس کیا۔ میرے ڈیڈی انہیں آتے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے اور مجبوراً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا حالانکہ میں ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"تشریف رکھیے!" نواب صاحب نے ڈیڈی کے سلام کا جواب دے کر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ پھر جب ہم دونوں بیٹھ گئے اور نواب صاحب نے بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی تو بولے "ڈیسوزا صاحب! ہرچند کہ ہم آپ سے خلوت میں گفتگو کرنے کے متمنی تھے مگر یہ صاحبزادے بھی ساتھ آگئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمیں پہلے انہی کے متعلق گفتگو کرنا تھی" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نواب صاحب نے میری طرف سخت تیز نظروں سے دیکھا۔

ڈیڈی سنبھل کر بیٹھ گئے، پھر بولے "جی ارشاد ہو نواب صاحب! میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"ہمارے علم و اطلاع کے مطابق یہ صاحب زادے آپ کے فرزند ہیں۔ ہم آپ سے اس کی تصدیق چاہتے ہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔

ڈیڈی، نواب صاحب کی اس بات پر چونکے، پھر چند لمحے بعد بولے "میں کچھ سمجھ نہیں سکا نواب صاحب کہ اس میں تصدیق کی کیا بات ہے؟"

"کوئی تو بات لازماً ایسی ہے ڈیسوزا صاحب، جو ہم تصدیق چاہتے ہیں" نواب صاحب اپنی بات پر قائم رہے، پھر کہنے لگے "ہم یہ تصدیق کیوں چاہتے ہیں، اس کی وجہ بھی آپ سے بیان کردیں گے۔ پہلے آپ ہمارے سوال کا جواب دے دیں۔"

"یہ تو سبھی کو علم ہے ... نواب صاحب کہ طارنوش میری ہی اولاد ہے" ڈیڈی نے بالآخر جواب دیا۔

"مگر طارنوش کا دعویٰ ہے کہ ہماری گمشدہ صاحب زادی سعدیہ بیگم اس کی ماں ہیں" نواب صاحب نے تیز لہجے میں کہا "کیا آپ اس دعوے کے باوجود اپنے گزشتہ بیان پر قائم رہیں گے ڈیسوزا صاحب؟"

اسی دوران میں ڈیڈی نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور میں نے نظریں جھکالی تھیں۔

"نواب صاحب! اگر صرف خون ہی کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں تو ــ تو پھر طارنوش سے میرا کوئی رشتہ نہیں" ڈیڈی کی آواز میں دکھ تھا۔ وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید بولے "میں بس اتنا کہوں گا کہ طارنوش کی ماں کو میں نے اپنی بہن کی طرح سمجھا تھا اور اس رشتے سے بہن کی اولاد اپنی ہی اولاد کے برابر ہوتی ہے۔ طارنوش کو میں اپنی اولاد ہی کی طرح چاہتا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ طارنوش عیسائی نہیں، مسلمان ہے!" نواب صاحب کا انداز خودکلامی کا سا تھا۔

"جی ہاں طارنوش مسلمان ہے اور میں نے اس سے یہ بات بھی نہیں چھپائی" ڈیڈی بولے "خداوند خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے طارنوش کی ماں سے جو عہد کیا تھا، اسے پورا کرنے میں کامیاب رہا۔"

میں نے نواب صاحب کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ ڈیڈی کی بات سن کر وہ مضطرب سے ہوگئے تھے۔ وہ فوراً ہی بول اٹھے "عہد کیا تھا؟ اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا یہ بات ماضی کی

ہے؟"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گفتگو اب کس مرحلے میں داخل ہونے والی ہے! اب گفتگو میں میرا مداخلت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں اسی لیے ڈیڈی کے ساتھ آیا بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈیڈی جواب میں کچھ کہتے، میں نے نواب صاحب کو مخاطب کیا "ضروری نہیں نواب صاحب کہ آپ کے ہر سوال کا جواب دیا جائے" میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی تھی "میں جانتا ہوں کہ آپ ڈیڈی سے میری ماں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں اور ڈیڈی یا میں آپ کو کچھ بھی نہیں بتائیں گے!"

"طارنوش!" ڈیڈی مجھ سے بولے "اپنے بزرگوں سے اس طرح کلام نہیں کیا کرتے بیٹے!" ان کی آواز میں نرمی تھی۔

"مگر ڈیڈی، میں ــــ میں انہیں اپنا بزرگ نہیں سمجھتا!" میرے لہجے کی چبھن برقرار رہی "انہیں میری ماں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا کوئی حق نہیں!"

"نہیں طارنوش بیٹے، نہیں!ــ یہ ظلم ہے اور ــــ اور میں ایک باپ پر یہ ظلم نہیں کر سکتا" ڈیڈی نے جذباتی ہو کر کہا۔

"تو انہوں نے میری ماں پر ظلم کیا، اس کا حساب ان [illegible] کس ترکی بہ ترکی بولا۔

"اس کا حساب ان سے خداوند لے گا اور وہی سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ جب تک یہ قصہ دبا ہوا تھا، دبا رہا مگر اب خود تم ہی نے اس قصے کو چھیڑ کر اخلاقی طور پر مجھے اس کے لیے مجبور کر دیا ہے کہ میں نواب صاحب کو ان کی صاحبزادی سعدیہ بیگم کے بارے میں حقائق سے آگاہ کروں۔"

میرے اندر اتنی ہمت و جرأت نہیں تھی کہ ڈیڈی کی نافرمانی کر سکتا اس لیے خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"پوچھیں نواب صاحب! آپ سعدیہ بیگم کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" ڈیڈی، نواب صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"وہ سب کچھ جو آپ اس کے متعلق جانتے ہیں" نواب صاحب بھاری آواز میں بولے۔

پھر ڈیڈی نے از اول تا آخر نواب صاحب کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ان کے علم میں تھا اور جس سے میں بھی واقف تھا۔

میں نے اس دوران میں نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جنہیں منہ پھیر کر انہوں نے چھپانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ڈیڈی جب وہ دکھ بھری داستان سنا چکے نواب صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ڈیسوزا صاحب بہ خدا آپ عظیم انسان ہیں۔ یقیناً آپ نے ہم پر احسان عظیم کیا ہے، ایسا احسان جو ہم چاہیں بھی تو زندگی بھر نہیں اتار سکتے۔ کاش!ــ کاش سعدیہ مرحومہ نے خاندانی روایات کی پاسداری کی ہوتی!ــ کاش اس نے ہمارے علم و اطلاع میں لا کر شادی کی ہوتی تو ــ تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ اب ہمیں یقین آگیا کہ طارنوش، ہماری سعدیہ ہی کا فرزند ہے اور ہم یہ بھی سمجھ گئے کہ اس کے انداز و اطوار میں یہ باغیانہ پن، تلخی اور خود سری کیوں ہے؟ــ یہ سب حالات کا تقاضا ہے۔ ہماری دولت و جائیداد میں مرحومہ کا جو حصہ تھا، وہ ہم طارنوش کے نام ــ"

"نہیں!" میں نواب صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا "مجھے کچھ نہیں چاہیے!ــ کچھ بھی نہیں! میں نے اس غرض سے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں سعدیہ بیگم کا بیٹا ہوں۔ میں ــــ میں تو آپ لوگوں کو آپ کے ظلم کا احساس دلانا چاہتا تھا، اس کے سوا میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔"

"تمہارا جو بھی مقصد رہا ہو، اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں، مگر جو تمہارا حق ہے وہ ہم ضرور ادا کریں گے۔ ہم تمہاری حق تلفی کرنا نہیں چاہتے" نواب صاحب نے کہا "نادانستگی میں تمہاری ماں پر جو ظلم ہوا ہم ــــ ہم اس پر شرمندہ ہیں" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شدت جذبات سے نواب صاحب کی آواز بوجھل ہو گئی۔

ان کے اس طرح اظہار شرمندگی کا یقیناً میرے دل پر اثر ہوا، مگر فوراً ہی مجھے زیبا یاد آگئی اور میں بولا "ظلم تو آپ کے خاندان کے خمیر میں شامل ہے نواب صاحب! اس ظلم کا تازہ شکار زیبا ہے، جس کا کفن بھی ابھی میلا نہیں ہوا ہوگا۔"

"ہمارے زخموں کو نہ چھیڑو کہ اب ہمارے اندر کچھ سہنے کا حوصلہ نہیں اور ــــ اور اب تو کم از کم ہمیں اجنبیوں کی طرح مخاطب نہ کرو! ہم ــــ ہم تمہارے لیے نواب صاحب نہیں بلکہ نانا ــ نانا حضور ہیں۔ میرے بچے! ہمیں ــ ہمیں نانا حضور کہو!" نواب صاحب کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

میرے اندر انتقام کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ شاید یہ اس خاندان کے لہو کا اثر تھا جو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ میرا سر جھکتا چلا گیا اور پھر میں نے مزید نشتر زنی نہیں کی۔

"طارنوش بیٹے!" نواب صاحب پھر بولے "یہ گھر اب تمہارا ہے۔ اس کے دروازے تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ تم چاہو تو یہاں رہ بھی سکتے ہو۔ ہم تمہارے لیے کوٹھی کا ایک حصہ مخصوص کر دیں گے" انہوں نے پیش کش کی۔



"نہیں!" میں نے انکار کر دیا "میں ڈیڈی ہی کے ساتھ رہوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی" وہ بولے "مگر ہم تم سے یہ ضرور کہیں گے کہ یہاں آتے جاتے رہنا۔ تمہاری صورت کو ہماری آنکھیں ترستی رہیں گی۔ آؤ!ــ آؤ اب ہمارے سینے سے لگ جاؤ!ــ اٹھو میرے بچے!" انہوں نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔

میں نے لاکھ چاہا کہ اپنی جگہ بیٹھا رہوں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھ کر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا اور پھر میں نواب صاحب یعنی اپنے نانا کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گیا۔ انہوں نے میری پیشانی اور رخساروں پر بوسوں کی بارش کر دی پھر مجھے سینے سے لگا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے تپتی ہوئی دھوپ میں سایہ مل گیا ہو۔ زندگی میں پہلی بار مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ پھر خود بہ خود میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ان آنسوؤں میں دل کا سارا غبار بہہ گیا۔ میرے نانا بھی رو رہے تھے اور میں بھی رو رہا تھا۔

"میرے بچے!" میرے نانا میری پشت تھپک کر مجھے تسلیاں دینے لگے "چپ ہو جاؤ! نہ روؤ ورنہ ہمارا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"نانا حضور!" میرے منہ سے جیسے خود بہ خود نکلا۔

انہوں نے ایک بار پھر میری پیشانی چوم لی، پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے "آؤ ہمارے ساتھ! ہم تمہاری نانی اور ماموؤں کو یہ خوش خبری سنائیں" پھر انہیں ڈیڈی کا خیال آگیا اور بولے "آپ تشریف رکھیے! ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے لیے چائے بھجواتے ہیں۔"

"اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں نواب صاحب! میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں" ڈیڈی نے کہا۔

"نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے! آپ پہلی بار تو غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ ابھی تو ہمیں آپ کا منہ بھی میٹھا کرانا ہے، طارنوش کے ملنے کی خوشی میں!"

مجبوراً ڈیڈی کو رکنا پڑا۔ میں اپنے نانا نواب فرقان علی کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

یہ دنیا واقعی دکھ سکھ کا میلا ہے، اس کا عملی تجربہ مجھے اس روز ہوا۔ وہ گھر جس میں گزشتہ روز سے صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی، وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ اس گھر کا کوئی فرد بھی ایسا نہیں تھا جو میرے لیے اجنبی رہا ہو۔ وہ مجھ سے اور میں ان سب سے واقف تھا مگر اب یہ واقفیت لہو کے رشتوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے نانا نے گھر کے تمام افراد کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر ایک ملازم مٹھائی لے آیا اور سب کا منہ میٹھا کرایا گیا۔

میرے دوست اور ماموں زاد عظمت علی کو شاید یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ میں پھر کبھی اس گھر میں قدم رکھ سکوں گا۔ وہ اپنی جوان بہن کی موت پر اداس تو تھا مگر مجھ سے بڑی خوش دلی اور محبت کے ساتھ ملا۔ زیبا سے بڑی بہن زاہدہ اور چھوٹے ماموں کی بیٹی رابعہ کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے، مگر میرے متعلق انکشاف سے ان کے چہروں پر بھی رونق آگئی۔

اس رات جب میں ڈیڈی کے ساتھ اپنے نانا کی کوٹھی سے واپس آ رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری روح سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی تھی۔ گھر پہنچ کر ڈیڈی نے ممی کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ بھی کھل اٹھیں۔ پھر ممی اچانک فکر مند سی ہو کر بولیں "مگر ــــ مگر ڈیسوزا، وہ ــــ وہ لوگ ہمارے بیٹے کو ہم سے چھین تو نہیں لیں گے؟"

"نہیں ایلن! ایسی کوئی بات نہیں" ڈیڈی نے پُراعتماد آواز میں جواب دیا "ہمارا بیٹا ہمارے ہی پاس رہے گا۔"

ممی اس طرح خوش نظر آنے لگیں جیسے انہیں سارے جہان کی دولت مل گئی ہو۔ محبت سے بڑی دولت دنیا میں کوئی نہیں، یقیناً وہ شخص خوش نصیب ہے جسے یہ دولت حاصل

ہے۔ میں نے اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کے دوبارہ استوار ہوجانے کے باوجود ممی اور ڈیڈی کو ترجیح دی تھی اور یہ محبت ہی کا تقاضا تھا۔

اس روز کے بعد سے میری زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ بڑی حد تک اب میرا انداز فکر مثبت رخ اختیار کر گیا تھا۔ مجھے اپنی ننھیال والوں سے وہ محبت ملی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ساری محبت جو شاید ان کے دلوں میں میری ماں کے لیے تھی' میرے حصے میں آگئی تھی۔ مجھے صرف ایک معاملے میں کچھ خجالت اور کچھ پریشانی کا شکار ضرور ہونا پڑا۔ یہ معاملہ رابعہ اور زاہدہ کا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے چاہتی تھیں اور اس میں میری شہ کو بڑا دخل رہا تھا لیکن وہ ضد اور بات تھی اس وقت میں انتقام میں اندھا ہو رہا تھا۔ ان دنوں میرے پیش نظر صرف یہ تھا کہ کس طرح بھی ممکن ہو میں اپنے ننھیال والوں کو اذیت میں مبتلا کروں اور یہی وجہ تھی کہ میں نے رابعہ اور زاہدہ کو اپنا اسیر بنالیا تھا۔ اب جب سے صورت حال میں تبدیلی آئی تھی مجھے اپنے اس فعل سے گھن سی آنے لگی تھی۔ میں اکثر حیران ہو کر سوچتا کہ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیا نفرت انسان سے تمام اخلاقی اقدار چھین لیتی ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ رابعہ اور زاہدہ سے میرا رویہ سگے بھائی جیسا ہی ہو گا کیونکہ بہرحال وہ میری بہنیں ہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ اتنا آسان نہ ہو گا لیکن یہ تو مجھے کرنا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سختی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

ایک روز زاہدہ نے مجھے تنہا پا کر گھیر لیا۔ وہ زیبا مرحومہ کی بڑی بہن تھی۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے رہنے لگے ہو" زاہدہ نے کہا "میں تم سے اس سلسلے میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں' میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے کمرے میں" اس نے جواب دیا "تم سے گفتگو کے لیے تنہائی ضروری ہے اور یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔"

"پھر بھی سہی" میں نے اسے ٹالنا چاہا "عظمت علی کی اور میری بازی جمنے والی ہے۔ وہ بس نہا کر آنے ہی والا ہو گا۔"

"نہیں! تمہیں چلنا پڑے گا میرے ساتھ" وہ اپنی ضد پر اڑ گئی "بازی پھر جمالینا۔"

مجبوراً مجھے زاہدہ کی بات ماننا پڑی اور میں نشست گاہ سے اٹھ کر اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے بیٹھتے ہی کہا۔

"تمہارے رویے میں تبدیلی کیوں آگئی ہے؟ اب تو تم تنہائی ملنے کے باوجود بھی قریب نہیں آتے" اس کا لہجہ شکایتی تھا "حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب ــــ اب یہ سب مناسب نہیں ہے" میں نے اسے سمجھایا۔

"پہلے اور اب میں آخر کیا فرق پڑ گیا ہے؟" وہ بولی اور مجھ سے مزید لگ کر بیٹھ گئی۔

"پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے اور میرے درمیان کیا رشتہ ہے! اس رشتے سے تم میری بہن لگتی ہو اور ــــ اور میں اب تمہیں بہن ہی سمجھتا ہوں۔ یوں بھی تم مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہو اور اس اعتبار سے اگر میں عظمت علی کی طرح تمہیں باجی بھی کہوں تو غلط نہیں۔"

میرے الفاظ اس پر جیسے بجلی بن کر گرے اور وہ مجھے پھیلی ہوئی آنکھوں سے یوں دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ خاصی دیر کے بعد اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی "طارنوش! تم ــــ تم شاید زیبا کو چاہتے تھے اور ــــ اور شاید اسی لیے ــــ اسی لیے مجھے ــــ" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"زاہدہ! بھول جاؤ پچھلی باتوں کو! جو کچھ ہوا' وہ نادانستگی میں ہوا۔ اب ــــ اب اسے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔"

"بھول جاؤں!" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں "کاش! میں ــــ میں بھول سکوں۔"

میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ دیے اور دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ سمجھی یا نہیں' لیکن میں نے بہرحال اپنا فرض پورا کر دیا۔ اس دن کے بعد سے کم از کم زاہدہ میرے لیے مسئلہ نہیں بنی۔ اس نے شاید اپنے سینے پر صبر کا پتھر رکھ لیا تھا۔ اب صرف رابعہ کا معاملہ رہ گیا تھا جس کے انداز و ادا اور مجھ سے بے تکلفی دن بدن خطرناک حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ میری طرف سے کسی قسم کی پیش قدمی نہ ہونے کے باوجود اس کی وارفتگی میں کمی نہیں تھی۔ اس کا انداز تو عمر عاشقوں کا سا تھا۔ تنہائی ملتے ہی وہ میرے قریب آجاتی اور پھر بے باکی کا اظہار کرنے لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری عاشق ہے اور میں اس کا معشوق! بہ حیثیت عاشق جو سلوک اس کے ساتھ میرا ہونا چاہیے تھا' وہ اس کا میرے ساتھ تھا۔ اس نے اب تک میری سرد مہری کی

بھی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اگر زاہدہ کی طرح حرف شکایت زبان پر لاتی تو شاید میں اسے بھی زاہدہ کی طرح سمجھانے کی کوشش کرتا۔ پھر جب اس کی دراز دستیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو آخر کار خود مجھے ہی زبان کھولنا پڑی۔ اس شام وہ زبردستی مجھے باغ میں گھسیٹ لے گئی تھی۔ میں اور وہ ایک گھنے درخت کے نیچے نیم دراز تھے۔ حسب معمول اس نے پہل شروع کردی۔ میری طرف کروٹ لے کر وہ کہنی کے بل اٹھی اور پھر میرے چہرے پر جھکنے لگی۔ اس کی سانسوں کی گرمی میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔

میں نے اپنے اور اس کے درمیان کلائی حائل کر دی۔ وہ درمیان سے میری کلائی ہٹانے کے لیے زور لگانے لگی۔

"بس کرو رابعہ! مجھے تمہاری یہ حرکتیں قطعی پسند نہیں" میرے لہجے میں سختی بھی تھی اور ناگواری بھی۔

"کیوں بھئی' کیوں پسند نہیں؟" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"بتاتا ہوں۔ پہلے تمیز اور شرافت سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ" میں سنجیدگی سے بولا۔

"مگر پہلے ــــ" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پھر جھکنے کے لیے زور لگایا۔

"ہرگز نہیں!" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ پھر میں خود ہی اسے ایک طرف دھکیلنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے طارنوش!" اس کی آواز میں حیرت اور قدرے خفگی تھی۔ میں نے اسے دھکیلتے ہوئے بہرحال اس کی نازکی کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ شاید خفگی کی وجہ یہی تھی۔ میری کلائی اس کی گردن پر تھی۔ غالباً پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی گردن پر بھی میری کلائی کا دباؤ پڑا تھا۔ میں نے یہ اندازہ اس سے لگایا کہ وہ ایک طرف گرتے ہی اپنی گردن سہلانے لگی تھی۔

"رابعہ! کیا تمہیں یہ احساس ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کیا رشتہ ہے؟" میں نے بات شروع کی۔

"ہاں معلوم ہے مجھے" وہ بلا جھجک بولی "میرے اور تمہارے درمیان محبت کا رشتہ ہے اور اس رشتے سے بڑا کوئی رشتہ نہیں!"

"مگر یہ رشتہ تمہارے اور میرے درمیان اس وقت پیدا ہوا تھا جب ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم بہن بھائی ہیں" میں نے دانستہ "بہن بھائی" پر زور دیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا طارنوش!" اس کے لہجے کی بے باکی برقرار تھی "میں بہرحال تمہاری سگی بہن تو نہیں ہوں!"

"لیکن میں ــــ میں تمہیں اب اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں" میں نے وہ حربہ آزمایا جو پہلے زاہدہ پر آزما چکا تھا۔

"اگر تم ایسا سمجھنے لگے ہو تو یہ تمہاری حماقت ہے اور کم از کم میں احمق نہیں ہوں" وہ بے کھٹکے بولے جا رہی تھی "تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ماموں زاد' خالہ زاد' چچا زاد اور پھوپھی زاد جتنے بھی اس طرح کے رشتے ہیں' ایسے بہن بھائی ہیں' ان کے درمیان ایک نیا رشتہ بھی پیدا ہو سکتا ہے یعنی وہ ایک دوسرے کو اپنا سکتے ہیں۔ شرعاً اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں' جائز ہیں' حرام یا ناجائز نہیں۔ اس سلسلے میں تمہیں خواہ مخواہ کے وہم اور وسوسے کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو کسی سے پوچھ کر دیکھ لو۔"

"تم مجھے اتنا بے وقوف اور نا علم کیوں سمجھ رہی ہو! میں بھی یہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم بتا رہی ہو۔" میں جھنجلا کر بولا۔

"اگر تم سب کچھ جانتے ہو تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا رابعہ' مگر میرے لیے مسئلہ ہے! میں تمہیں بہن کے سوا کچھ اور سمجھنے کو تیار نہیں ہوں" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"یہ کیا تم نے بہن بہن کی رٹ لگا رکھی ہے! تم جو چاہے سمجھتے رہو لیکن میں تمہیں جو سمجھتی رہی ہوں' وہی سمجھوں گی۔"

"تو سمجھتی رہنا!" میں اٹھ کھڑا ہوا "مگر یہ خیال رہے کہ آج کے بعد مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا!"

"سنو طارنوش!" اس کی آواز ایک دم نرم پڑ گئی "کیا مصالحت کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی؟"

"قطعی نہیں!" میں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ پھر میں وہاں مزید نہیں رکا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت کی طرف چل دیا۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں عموماً رابعہ جیسی لڑکیاں نہیں ہوتی تھیں۔ رابعہ الگ ہی مزاج اور کینڈے کی لڑکی تھی جس کا پورا اندازہ مجھے پہلے نہیں تھا۔ اس کے بعد کئی بار رابعہ نے میری گھیرا گھاری کی مگر میرا رویہ نہیں بدلا۔ میں نے اسے اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ رفتہ رفتہ وہ میری طرف سے مایوس ہوتی چلی گئی اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔

دن کا خاصا حصہ میں اپنے ٹیوٹرز سے تعلیم حاصل کرتے

میں صرف کر رہا تھا۔ میں نے چند ہی ماہ میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ عربی ' فارسی اور اردو ' تینوں زبانوں پر عبور حاصل کرلیا تھا ' اس کے ساتھ ساتھ قرآن شریف بھی ختم کرچکا تھا۔ میرے ٹیوٹرز بھی میری تیز رفتاری پر حیران تھے۔ کچھ عرصے سے اسلامی تاریخ میرے زیر مطالعہ تھی۔ مجھے اس سے پہلے یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اتنا دلچسپ مضمون ہے۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون کی لکھی ہوئی "تاریخ ابن خلدون" کی اب چند ہی آخری جلدیں پڑھنے کو رہ گئی تھیں۔ ٹیوٹرز کے جانے کے بعد رات کو بھی میں تاریخ کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ حصولِ تعلیم اور مطالعے سے جو وقت بھی بچتا تھا ' وہ عموماً میں اپنی ننھیال ہی میں گزارتا تھا۔ روز ہی میں وہاں جاتا تھا اور پھر رات کا کھانا وہیں کھا کر لوٹتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اچانک ایک دن میرے نانا نواب فرقان علی مجھے اپنے ساتھ خلوت میں لے گئے۔ خلافِ توقع انہوں نے جب اپنی خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تو مجھے کچھ حیرانی سی ہوئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ پوچھ سکتا ' وہ خود ہی مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہہ کر بولے "طارنوش بیٹے! ہمیں تم سے کچھ اہم گفتگو کرنا ہے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس دوران میں کوئی مداخلت کرے۔ ہم تم سے کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں جو کافی عرصے سے ہمارے لیے الجھن کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ کچھ پوچھنے سے قبل ہم یہ یقین دہانی چاہتے ہیں کہ تم دروغ گوئی یا اخفائے راز کی کوشش نہیں کروگے" وہ میرے سامنے ہی آبیٹھے تھے اور آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں نانا حضور کہ نہ تو جھوٹ بولوں گا اور نہ آپ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کروں گا" میں نے انہیں یقین دلایا۔

"ہمارا پہلا سوال تم سے یہ ہے کہ جس روز تم نے پہلی بار یہ انکشاف کیا تھا کہ تم سعدیہ بیگم کے بیٹے ہو تو اس روز نظروں سے اوجھل کس طرح ہوگئے تھے؟" انہوں نے پوچھا ' پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی مزید بولے "خرقِ عادت کا ایسا مظاہرہ چند بزرگانِ دین سے منسوب تو ضرور سنا گیا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے نظروں سے اوجھل ہوگئے مگر کسی عام آدمی میں یہ وصف دیکھنے میں نہیں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی قطب ' ولی یا ابدال سے بیعت ہو اور انہی کے طفیل تمہارے اندر یہ وصف پیدا ہوگیا ہے؟ یہ وصف کسی پہنچے ہوئے مردِ خدا کی عطا تو نہیں؟"

نانا جان نے مجھ سے جو کچھ معلوم کیا تھا ' اس کے بارے میں مجھے بھی یہ اندازہ تھا کہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مرحلے پر وہ یہ استفسار ضرور کریں گے۔ میں انہیں اب دل سے قبول کرچکا تھا ' اس کے علاوہ یہ یقین بھی دلا چکا تھا کہ نہ جھوٹ بولوں گا ' نہ کچھ چھپاؤں گا۔ میں نے اسی لیے بلا جھجک کہہ دیا "نانا حضور! قدرت نے مجھے کچھ ایسی پُراسرار قوتیں عطا کی ہیں جو عام انسانوں میں نہیں ہیں۔ یہ پُراسرار قوتیں اس وقت خود بہ خود متحرک ہوجاتی ہیں جب مجھے کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ یہ قوتیں ارادی نہیں غیر ارادی ہیں ' یعنی میرے ارادے کو ان میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یقین کریں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں۔ میں کسی قطب ' ولی یا ابدال کا مرید نہیں ہوں۔ اس روز بھی کیوں کہ میری زندگی خطرے میں پڑگئی تھی اس لیے میرے اندر چھپی ہوئی پُراسرار قوتیں بیدار ہوگئی تھیں اور میں آپ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اور یوں ایک یقینی موت سے بچ گیا تھا۔"

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہرچند کہ ناقابلِ یقین ہے مگر تمہارا لہجہ اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے۔ ہم بہرحال جھوٹ اور سچ کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے بیان کیا ہے تو بڑی حیرت انگیز بات ہے" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہے ' پھر ایک اور اہم سوال کیا "یہ بتاؤ طارنوش بیٹے کہ تم اپنے والد کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"صرف اس قدر نانا حضور کہ انہیں قتل کیا جاچکا ہے" میں نے بتایا۔ مجھے علم تھا کہ وہ میرے صرف اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے اس لیے میں نے انہیں بچپن سے اب تک سنائی دینے والی پُراسرار سرگوشیوں کے متعلق بھی بتادیا ' مگر کچھ سوچ کر اسی کا نام نہیں بتایا۔ اپنی معلومات کا ذریعہ میں نے انہی پُراسرار سرگوشیوں کو بتایا تھا۔ آخر میں انہیں میں نے یہ بھی بتادیا کہ اب تک مجھ سے جو سرگوشیاں کی جاتی رہی ہیں ' وہ غلط ثابت نہیں ہوئیں اس لیے اپنے والد کے قتل ہونے کا بھی مجھے پورا یقین ہے۔

"تم نے بڑی عجیب اور پُراسرار باتیں بتائی ہیں طارنوش بیٹے! اگر خود ہم نے اپنی آنکھوں سے تمہیں نظروں سے اوجھل ہوتے نہ دیکھا ہوتا تو شاید ہمیں ان باتوں پر ہرگز یقین نہ آتا۔ ہماری دعا ہے کہ تمہاری عمر دراز ہو اور خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے میری طرف جھک کر میری پیشانی چوم لی۔

اسی روز انہوں نے کچھ کاغذات میرے حوالے کیے۔ ان کاغذات کی رو سے میں ان کی جائداد کے ایک حصے کا مالک بن گیا تھا۔ اس جائداد میں ایک باغ بھی تھا ' اس کے علاوہ چار مکانات تھے جو باڑہ ہندو راؤ میں کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ اب اس کرائے کا حق دار بھی میں ہی تھا۔ جائداد کے ساتھ ہی ایک لاکھ نقد روپیا بھی میرے حصے میں آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بینک اکاؤنٹ کھولنے کو کہا تھا۔ اگلے ہی روز ان کی ہدایت اور تاکید پر میں نے بینک اکاؤنٹ کھول لیا اور پھر اسی دن میرے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپیا منتقل ہوگیا۔ اس زمانے میں ایک لاکھ روپیا بہت بڑا سرمایا ہوتا تھا گویا اب میں لکھ پتی بن گیا تھا۔

اس عرصے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میری والدہ سے بڑی ایک بہن اور ہیں جن کی شادی علی گڑھ کے ایک نواب خاندان میں ہوئی تھی۔ میری بڑی خالہ کا نام سعیدہ بیگم تھا۔ اب تک میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔

گردشِ روز و شب اسی طرح جاری رہی۔ تاریخ کے مطالعے کے بعد میں نے اب عہدِ حاضر کے سیاسی حالات کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ یہ مطالعہ بین الاقوامی نوعیت کا حامل تھا۔ اس سے میرے ذہن میں متعدد سوالات پیدا ہونے لگے جن کا تعلق اقوامِ عالم میں مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال اور ان کے مستقبل سے تھا۔

پھر گرمی کا موسم شروع ہوگیا۔ چند ہی ماہ بعد درس گاہوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔ عظمت علی کے بڑے بھائی رحمت علی جو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے دہلی آگئے۔ انہی کے ساتھ میری خالہ کے بیٹے نواب زادہ عطا اللہ خاں بھی تھے۔ بھائی جان رحمت علی اپنے چھوٹے بھائی عظمت علی کے قطعی برعکس تھے۔ وہ بی اے کے آخری سال میں تھے۔ وہ نہایت متین ' سنجیدہ اور بردبار تھے۔ کچھ ایسی ہی شخصیت کے حامل میرے خالہ زاد عطا اللہ خاں تھے۔ ان دونوں ہی کی شخصیتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بھائی رحمت علی اور بھائی عطا اللہ خاں ہم جماعت تھے۔ دونوں ہی حضرات کو سیاست سے خصوصی شغف تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ان دونوں کی گفتگو سے ہوا۔ عظمت علی ان دونوں کی صحبت سے بھاگتا تھا مگر میرا معاملہ مختلف تھا۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان دونوں کی صحبت میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں۔ میرے لیے ان دونوں ہی کی شخصیتوں میں عجیب سی کشش تھی۔ عموماً میں ان دونوں کی گفتگو کے دوران میں کچھ بولنے سے گریز ہی کیا کرتا تھا ' لیکن ایک روز بھائی عطا اللہ خاں نے جب تحریکِ خلافت کی مخالفت میں بولنا شروع کیا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی جوہر کو میں اپنا آئیڈیل تصور کرتا تھا۔ ہرچند کہ ڈیڈی کی نصیحت اور ان سے سیاسی جلسوں میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ میں اب تک نبھا رہا تھا لیکن میرے خیالات وہی تھے۔ ان خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو طارنوش!" بھائی عطا اللہ خاں میری بات سن کر بولے "میرے نزدیک بھی مولانا محمد علی جوہر قابلِ تعظیم رہنما ہیں ' مگر میں انہیں ہرگز قابلِ تقلید نہیں سمجھتا۔ قابلِ تعظیم اور قابلِ تقلید ہونا بالکل الگ الگ باتیں ہیں۔ مولانا جوہر کیوں میرے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں؟ اس سوال کے جواب میں میرے پاس بڑی مضبوط دلیلیں ہیں مگر شاید تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکوگے۔ اس کے لیے موجودہ بین الاقوامی سیاست اور اس کا پس منظر جاننا بہت ضروری ہے۔"

"آپ فرمائیں تو سہی ' ممکن ہے کہ میں اس پس منظر و پیش منظر سے واقفیت رکھتا ہوں" میں نے بغیر کسی بڑے دعوے کے بات شروع کی۔

بھائی عطا اللہ خاں میری بات سن کر چونکے اور پھر معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگے ' پھر انہوں نے مجھ سے کہا "تم اسے کوئی امتحان خیال نہ کرنا ' میں صرف یہ جاننے کے لیے سوال کر رہا ہوں کہ واقعی موجودہ بین الاقوامی سیاست پر تمہاری نظر ہے۔ یہ بتاؤ کہ انگریزوں نے ترک سلطنت کے عرب علاقوں کے بارے میں فرانسیسیوں اور روسیوں سے کیا معاہدہ کیا ہے؟"

"اس معاہدے کے تحت وہ ترک سلطنت کے عرب علاقوں کو آپس میں بانٹ لیں گے" میں نے فوراً جواب دیا۔

بھائی عطا اللہ خاں اور بھائی جان رحمت علی دونوں ہی میرا جواب سن کر حیران سے رہ گئے۔ انہیں یقیناً مجھ سے درست جواب کی توقع نہیں رہی ہوگی۔

ابھی وہ دونوں خاموش ہی تھے کہ میں بول اٹھا "تحریکِ خلافت اور اس کے رہنما ایسی ہی سازشوں کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آج سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لبوں پر کیا الفاظ مچل رہے ہیں! بولیں اماں محمد علی کی ' جان بیٹا خلافت پہ دے دو! بی اماں کے دل سے اٹھی ہوئی یہ صدا کیا آپ نے نہیں سنی؟" میرا لہجہ جذباتی ہوگیا۔

"طارنوش! بلاشبہ تم نے مجھے حیران کردیا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے باخبر ہوگے! لیکن اس کے باوجود

میں پھر وہی کہوں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ موجودہ سیاسی حالات میں تحریک خلافت لاحاصل ہے 'قطعی لاحاصل!'"

میں گم صم ہوکے رہ گیا تھا۔ اسی وقت بھائی رحمت علی کی آواز ایک تیز نشتر کی طرح میرے دل میں اترنے لگی 'وہ کہہ رہے تھے "آج مسلمانوں کے لیے آسمان سے آگ برس رہی ہے اور وہ جلتے سورج کے نیچے سفر کررہے ہیں۔ دور تک ان کے لیے تپتا ہوا صحرا ہے۔ جس میں کوئی شجر سایہ دار نہیں کہ وہ اس کے نیچے بیٹھ کر گھڑی بھر کو بھی دم لے لیں۔ کوئی مہربان ہاتھ ایسا نہیں کہ جو ان کے سروں پر ہو اور جو ان کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔ کوئی آواز انہیں دلاسا دینے والی نہیں۔ ان کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا مقدر ذلت و رسوائی ٹھہرا ہے۔ تو پھر ایسے میں کوئی محمد علی کیوں جان دے دے؟ اگر جان دے بھی دے تو اس سے حاصل کیا ہے؟ یہ قربانیاں رائگاں جائیں گی طارنوش! ترک عثمانی خلافت کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اس وقت عرب صرف عرب بن گئے ہیں اور ترک محض ترک! معاف کرنا 'میرے نزدیک اپنی اپنی قومیتوں کے مفاد اور خود غرضی کے تحت وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہاں ہندوستان میں جو کچھ ہوا 'کیا تم نہیں جانتے! انگریز نے جو کھیل یہاں کھیلا تھا 'وہی کھیل وہاں کھیل رہا ہے۔ اب وہاں بھی بہت سے میر جعفر اور میر صادق 'انگریز کو مل گئے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سادہ لوحی پر مجھے ہنسی آتی ہے اور۔۔۔ اور یقین کرو کہ غصہ بھی آتا ہے۔ یہاں کے مسلمان اب بھی اس خلافت کے لیے بے چین ہیں جس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ وہ چندے جمع کرکر کے ترکی روانہ کررہے ہیں 'طبی وفد ترکی جارہے ہیں اور۔۔۔ اور مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کے انگریز وائسرائے کو بار بار تنبیہہ کررہے تھے کہ ترک خلیفہ اور خلافت کے معاملے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو زخم نہ کیا جائے۔ اس پر لطیفہ یہ کہ وہ اس طرح کی تنبیہیں ان انگریز حکمرانوں کو کررہے تھے جنہوں نے گزشتہ برسوں میں خلافت ترکیہ کو مختلف ہتھکنڈے استعمال کرکے مفلوج بنا رکھا تھا۔"

بھائی رحمت علی کے طویل مکالمے کے بعد دیر تک ایک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ پھر بھائی عطا اللہ خاں نے مجھے مخاطب کیا "اب تمہاری سمجھ میں آرہا ہے طارنوش کہ انگریز ساری دنیا میں ہر مسلمان کا دشمن ہے! ایسے میں کسی محمد علی جوہر یا اس کی آواز پر لبیک کہنے والوں کو خلافت کے لیے جان دینے کی قطعی ضرورت نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔" اس کے بعد بھائی عطا اللہ خاں نے ایک اور ایسی مدلل بات کی کہ میری آنکھیں کھل گئیں "سنو طارنوش! برا نہ ماننا میرے خیال میں ہندوستان کے مسلمان عقل و ہوش سے بیگانہ ہوچکے ہیں 'حماقت میں مبتلا ہیں 'انہیں نہیں معلوم کہ ایک غلام ملک کے غلام باشندے اپنے آقا کی منشا کے بغیر کسی کی مدد نہیں کرسکتے۔ خلافت پر جان دینے سے پہلے انگریزوں کی غلامی سے نجات پانا ضروری ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا مطالبہ کرکے صحیح سمت میں ایک قدم اٹھایا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جب مسلمان خلافت کے تحفظ کی خاطر اپنی فوجیں روانہ کریں گے تو انہیں کوئی نہیں روک سکے گا! اسے خود غرضی نہ سمجھنا طارنوش! مگر کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر کب سے مظالم نہیں ڈھائے جارہے! پلاسی کی جنگ سے جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون تک ہم پر کیا کیا ستم نہیں توڑے گئے! پھر اس کے بعد سے اب تک ہمیں بھوک اور جہالت کے اندھے غاروں کی طرف دھکیلنے کے لیے کیا کیا نہیں ہوا؟ بولو طارنوش! اس وقت سے آج تک عرب یا ترکی کے کسی محمد علی نے ہماری حمایت میں ایک لفظ بھی کہا؟ کسی بھی عثمانی خلیفہ یا شریف مکہ نے ہماری غمگساری کی 'ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا؟ کیا ہم مسلمان نہیں تھے؟ ان کے کلمۂ خیر کے مستحق نہیں تھے؟ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام سرد مہری اور بے حسی ایک زوال آمادہ قوم کی فطرت ہے۔ جنگ پلاسی سے اب تک کوئی ایک آواز بھی ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بلند نہیں ہوئی۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے طارنوش کہ جس سے کسی طرح کوئی بھی ذی شعور اور صاحب بصیرت شخص انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

مجھے اعتراف ہے کہ اس روز میرے خالہ زاد اور ماموں زاد دونوں بڑے بھائیوں نے میری زبان بند کردی تھی۔ انہوں نے مجھے لاجواب کردیا تھا۔ بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جو راہِ نجات طے کی تھی 'اس سے انکار ممکن نہیں تھا 'یعنی خلافت پر جان دینے کے بجائے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔

انہی چپقلشوں کے درمیان یہ طے پایا کہ میں بھی بھائی راحت علی کی طرح علی گڑھ میں اپنی خالہ سعیدہ بیگم کے یہاں رہوں گا۔ میں اس لیے بھی آمادہ ہوگیا کہ یوں مجھے بھائی رحمت علی اور بھائی عطا اللہ خاں کی صحبت میسر رہے گی۔ اب مجھے بہرحال اپنی تعلیم پوری کرنے کے لیے علی گڑھ جانا تھا۔

حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے میں صرف اور صرف ایک رکاوٹ تھی اور وہ رکاوٹ تھی کلونت کور! میں اسے دہلی میں چھوڑ کر علی گڑھ جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ کہیں میری غیر موجودگی میں اس کے والدین اسے کسی کے پلے نہ باندھ دیں؟ مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی میرے پیش نظر تھی کہ میں کلونت کور کی خاطر اپنا تعلیمی مستقبل تباہ نہیں کرسکتا تھا۔ ان دنوں میں سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا کیوں کہ میرے علی گڑھ جانے میں صرف چند روز رہ گئے تھے۔ اس عرصے میں کلونت کور سے میری ملاقاتیں جاری تھیں لیکن اب تک مجھ میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہوسکی تھی کہ اسے دہلی چھوڑ کر جانے کے متعلق بتا سکتا۔ بالآخر ایک دن مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا۔ اسی روز شام کو مجھے اپنے ماموں زاد اور خالہ زاد کے ہمراہ علی گڑھ روانہ ہونا تھا۔

میں کلونت کور سے الوداعی ملاقات کرنے حسب معمول شانتی کے گھر چلا آیا۔ کلونت کی سہیلی کا گھر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم وارفتگانِ شوق ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ جانِ وفا میری منتظر تھی۔

"طارنوش! بہت راہ دکھاتے ہو" وہ اک ادائے دلبری سے بولی۔

"ہاں کلونت مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی" میں نے محبت پاش نظروں سے اس کے حسین سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ سوچ کر میرا دل خون ہوگیا کہ جلد ہی مجھے کلونت کو چھوڑ جانا ہے۔ جانے پھر کب ہماری ملاقات ہو؟ میں اس ملاقات کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔

"تم نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ کچھ دیر ہوگئی اور ادھر میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے پتھر ہوگئیں" اس نے بڑے ناز بھرے لہجے میں شکایت کی۔

"میری جان" میں وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھا۔

"ہٹیئے۔ ہم نہیں بولتے بھلا آپ کو ہماری کیا پروا۔"

"ایسا نہ کہو کلونت۔ تم تو ہر لمحے 'ہر آن میرے اندر زندہ رہتی ہو۔ بھلا میں تم سے بے پروا کیسے رہ سکتا ہوں؟" میں نے محبت سے اسے یقین دلایا۔

میری بات سن کر وہ بھی میرے قریب ہوگئی "طارنوش! تم میری زندگی ہو۔ جس دن تم نہ رہے میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔ جب تم نہیں ہوتے تو میرے لیے ہر چیز اپنی دلکشی کھودیتی ہے۔ میں۔۔۔ میں اب مزید تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکتی" اس نے مدہوش سے لہجے میں سرگوشی کی۔

کلونت کور کی بات سن کر میں سہم سا گیا۔ کلونت تو اس چند روزہ فرقت کی روادار نہ تھی جب کہ میں آج اسے اپنی روانگی کی خبر دینے آیا تھا۔

"کلونت سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی تمہاری جدائی گوارا نہیں لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک طویل زندگی پڑی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو کسی قابل بنانا ہے۔ اس کے لیے مجھے علم حاصل کرنا ہوگا۔ اچھا ہوا یہ ذکر تم نے خود چھیڑ دیا۔ آج میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا کہ میں پڑھنے کے لیے علی گڑھ جارہا ہوں۔ یہ کچھ عرصے کی علیحدگی کا دکھ تو ہمیں سہنا ہی پڑے گا" میں نے جلدی جلدی کلونت سے وہ مشکل بات کہہ ڈالی جسے کہنے کے خیال سے میں پریشان تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں طارنوش۔ مذاق نہ کرو" کلونت کور نے پریشان ہوکر کہا۔

"میں مذاق نہیں کررہا کلونت۔ آج شام کی گاڑی سے میں علی گڑھ روانہ ہوجاؤں گا" میں نے دکھی دل سے اسے بتایا۔

"تم۔۔۔ تم چلے گئے طارنوش تو۔۔۔ تو پھر میرا کیا ہوگا؟" کلونت کور آبدیدہ ہوکر بولی۔

"تم ہی تو بتا رہی تھیں کہ اب تمہاری ماتا جی پوری طرح صحت یاب ہوچکی ہیں" میں نے کہا۔

"تو۔۔۔ تو اس سے تمہارے جانے کا کیا تعلق؟" وہ حیران سی ہوکر کہنے لگی۔

"ظاہر ہے کہ اب وہ پہلے کی طرح تمہاری شادی کرنے میں جلدبازی نہیں کریں گی" میں نے دلیل دی۔

پھر میں نے اسے لاکھ دلیلیں دیں بہت سمجھانا چاہا مگر کون محبت کرنے والا ایسا ہے جو بہ خوشی فراقِ یار پر آمادہ ہوجائے! بھلا پھر کلونت کور کیسے راضی ہوجاتی۔ اس نے یقیناً اوپری دل سے میرے مستقبل کی خاطر مجھے علی گڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ میرے لیے یہی بہت تھا۔

طویل جدائی کے خیال سے اس روز میں اور کلونت کور دونوں ہی کچھ زیادہ جذباتی ہوگئے۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کے وجود میں خود کو تلاش کرتے رہے۔ میرے دل پر وصلِ یار کی شبنم قطرہ قطرہ گرتی رہی اور میں نہال ہوتا رہا۔ میرا سارا وجود ایک تیز نشے کی لہر میں ڈھلا جارہا تھا۔ میں نے اسی عالم میں دور کہیں سے آتی ہوئی ایک آشنا آواز سنی مگر فوری طور پر مجھے یاد نہ آسکا کہ وہ آواز کس کی ہے نہ ہی مجھے خطرے کا احساس ہوسکا۔

"یہی گھر ہے۔ وہ اس وقت بھی یہاں موجود ہیں" اسی

آشنا آواز میں کسی نے کہا تھا۔

"دیکھ اگر تیری اطلاع غلط ہوئی فرید تو ہم تیرے ٹکڑے کردیں گے" جواباً کوئی غرایا تھا۔

فرید؟۔ کون فرید؟ میرے ذہن کے کسی گوشے میں سوال ابھرا۔ کون لوگ ہیں یہ اور کیا باتیں کررہے ہیں؟ ممکن ہے کہ مجھے ان سوالوں کے جواب مل جاتے مگر اسی لمحے کلونت کور کے انفاس کی خوشبو مجھ پر محیط ہوگئی۔ میرا ذہن پھر قرب کی لذت میں حل ہو ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔

اچانک بیٹھک کا دروازہ بہت زوردار آواز سے کھلا اور چار پانچ سکھ اندر آگئے۔ میں اچھل پڑا۔ سب سے آگے کلونت کور کا بڑا بھائی تھا جس کی آنکھوں میں خون سا اترا ہوا لگ رہا تھا۔ ان سبھی نے اپنی اپنی کرپانیں نکال لی تھیں۔

وہ سب سخت طیش میں تھے۔ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں جب کہ غصے کی زیادتی سے ان کے چہرے سُت رہے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو چکے ہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کوئی بڑا واقعہ ہوکر رہے گا۔ میں نے ایک نظر کلونت پر ڈالی وہ مارے خوف کے زرد پڑی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کے بدن میں خوف کا ایک قطرہ نہ ہو۔ ان کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی اور آنکھوں میں بلا کی بے بسی تھی۔

"بے غیرت" کلونت کور کا بڑا بھائی اتنی زور سے گرجا کہ اس کی آواز پھٹ گئی تھی "میں تیرے اور تیرے اس مُسلے عاشق کے ٹکڑے کردوں گا" وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

"ٹھہرو" میں نے مضبوط آواز میں زور سے کہا "کیا بات ہے؟ کیا تم سب پاگل ہوگئے ہو۔ رسانیت سے بات کرو" میں نے سارے معاملے کو سمجھتے ہوئے بھی کچھ مہلت حاصل کرنے کے لیے کہا۔

"رسانیت سے بات کریں" ایک تلخ آواز ابھری "دیکھو سالا پوچھ رہا ہے کہ کیا بات ہے" ایک اور غضب ناک آواز نے تبصرہ کیا۔ کلونت کور کا بھائی میری للکار پر کچھ دیر کو ٹھٹھر گیا تھا۔ وہ اپنی انگارہ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ کلونت کور اس کے تیور دیکھ کر کچھ اور سمٹ گئی۔

"یہ بے غیرت عورت جو تجھ سے لپٹی کھڑی ہے اور آج ۔ آج میں کلنک کے اس ٹیکے کو ہمیشہ کے لیے مٹادوں گا اور اسی کے ساتھ تیرے ناپاک وجود کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔" کلونت کے بھائی نے تپی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"ان دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردو" کوئی پوری قوت سے چیخا۔

"دیکھو۔ دیکھو جذباتی نہ بنو۔ یہ معاملہ بات چیت سے بھی طے ہوسکتا ہے" میں نے ایک آخری کوشش کرڈالی۔

"بات چیت کے بچے" اچانک ہی ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور وہ سب انتہائی اشتعال کے عالم میں ہماری طرف جھپٹ پڑے۔ میں جان گیا کہ اب کچھ بھی ممکن نہ تھا۔

کلونت کور کا بھائی اور اس کے ساتھی مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ موت میرے سر پر آپہنچی تھی عین اسی لمحے مجھے انتہائی شدید گرمی لگی اور میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ اسی کے ساتھ دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے سینے سے باہر آجائے گا۔ تکلیف واذیت اور گھبراہٹ کے وہ صرف چند ہی لمحات تھے جن کے دوران میں کلونت کور کو ایک طرف ہٹا کر میں اس سے الگ ہوگیا تھا۔ انہی لمحات میں مجھے کلونت کور کی تیز چیخیں سنائی دی تھیں اور پھر میرا وجود نادیدہ ہوگیا تھا۔ میں کلونت کور کے قریب ہی کھڑا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بڑا روح فرسا منظر تھا۔ کلونت کور کا بھائی جنونی انداز میں اپنی بہن کے سینے میں کرپان اتار رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں پوری طرح اپنے حواس میں آتا اس نے پے درپے اپنی بہن کے سینے گردن اور جسم کے دوسرے حصوں کو گود ڈالا۔

"ارے وہ مُسلا کہاں بھاگ گیا؟" کوئی چیخ کر بولا۔

اسی کے ساتھ میں اپنے حواس میں آگیا اور تیزی کے ساتھ جھک کر کلونت کور کے بھائی کے ہاتھ سے خون آلود کرپان چھین لی مگر مجھے دیر ہوچکی تھی۔ کھلونا ٹوٹ چکا تھا۔ کلونت کور ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر جاچکی تھی۔ اس کا خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

یہ درندہ چاہے کلونت کور کا بھائی ہی سہی مگر اس نے میری کلونت کور کو قتل کیا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے سوچا اور اس پر وار کرنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری کلائی پکڑلی ہو۔ اسی کے ساتھ اسی کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی اور پھر اس کی پُراسرار سرگوشی میری سماعت میں گونجنے لگی "طارنوش! تم اسے قتل نہیں کروگے۔ اپنی بہن کو قتل کرکے یہ شخص تو خود اپنی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال چکا ہے تم کیوں اس کا خون اپنی گردن پر لیتے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جلد ازجلد یہاں سے فرار ہوجاؤ! یہ شخص اور اس کے ساتھی



...ی سے بچنے کے لیے تمہارا نام زبان پر نہیں لائیں گے۔ ...انہوں نے یہ کوشش کی بھی تو میں ایسا نہیں ہونے دوں ...کرپان پھینک دو!"

میرا ذہن یقیناً اسی کی پُراسرار قوتوں کے زیر اثر آچکا ... میں نے اسی لیے وہی کیا جو اسی نے کہا تھا۔ جب میں ...کرپان پھینکی تو کلونت کور کا بھائی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "میں ...اپنی بہن کو قتل کردیا!۔ میں قاتل ہوں۔ قاتل ہوں! ...اپنی بہن کا قاتل!"

کلونت کور کے بھائی کے ساتھیوں کو بھی اب ہوش آچکا ...کہ کیا ہولناک واقعہ پیش آچکا ہے! وہ مجھے بھول کر کلونت ...کی لاش کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جارہے تھے۔ میں ...ی کے ساتھ بیٹھک سے نکلا اور پھر راہداری عبور کرکے ...ری سے گزرتا ہوا گھر کے صدر دروازے سے باہر نکل ...یا۔

...گلی کے نکڑ پر مجھے فرید احمد کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ...ری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں سب کچھ سمجھ چکا تھا کہ ...ب فرید احمد ہی کا کیا دھرا ہے۔ وہ یقیناً کچھ روز سے ...ونت کور اور میری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ...ی نے کلونت کور کے بھائی کو مطلع کیا ہوگا۔

میرا وجود اب تک نادیدہ تھا۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ...ے میں لپک کر فرید احمد کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میرا زناٹے ...ر تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ چیخ اٹھا۔ جو لوگ ادھر سے ...گزر رہے تھے فرید احمد کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اسی وقت ...میرا گھونسہ اس کے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر کچھ دور جاگرا۔

"بچاؤ بچاؤ!" وہ کسی چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح ...چیخنے لگا اور اس کے گرد بھیڑ لگ گئی۔

"کیا ہوا؟۔ کیا ہوا؟" لوگ اس سے پوچھے جارہے تھے ...تم کیوں چیخ رہے ہو؟"

وہ کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کررہا تھا کہ میری بھرپور ...ٹھوکر اس کی کنپٹی پر پڑی اور وہ چیخ کر بے سدھ ہوگیا۔ ابھی ...میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے اس کے دائیں پیر ...پر اپنا پیر رکھ دیا اور پھر جھک کر اس کا پیر پوری قوت سے اوپر ...اٹھالیا۔ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے کسی ذبح ہوتے بکرے کی طرح ڈکرایا۔ میں فرید احمد کی دوسری ٹانگ توڑنے والا تھا کہ اسی وقت گلی میں شور بلند ہوا۔ کلونت کور کا بھائی چیختا ہوا چلا آرہا تھا "میں قاتل ہوں۔ قاتل ہوں۔۔ میں نے اپنی بہن کو قتل کردیا ہے۔۔ قتل کردیا ہے اسے!"

بھیڑ ادھر متوجہ ہوگئی اور مجھے اسی کی تاکید یاد آئی کہ جلد ازجلد یہاں سے فرار ہوجاؤ۔ فرید احمد کے لیے اتنی سزا بھی کافی تھی۔ میں تیزی کے ساتھ گلی سے نکل کر اس سڑک پر آگیا جو مجھے قریبی تانگا اسٹینڈ تک پہنچا سکتی تھی۔

تانگا اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے راستے میں مجھے سخت سردی لگی اور اسی کے ساتھ مجھے میرا جسم واپس مل گیا۔ سامنے ہی ایک پیڑ کے نیچے خالی تانگا کھڑا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر قرول باغ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس وقت میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور میری آنکھوں میں اپنی محبوبہ کلونت کور کے قتل کا منظر گھوم رہا تھا۔

گھر پہنچ کر میں اپنے کمرے میں بند ہوگیا اور کافی دیر تک میری حالت اعتدال پر نہیں آسکی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو ممی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"طارنوش بیٹے!" ممی نے مجھے مخاطب کیا "کیا کھانا نہیں کھاؤ گے؟ تمہاری وجہ سے آج تمہارے ڈیڈی بھی دوپہری کو دفتر سے آگئے ہیں تاکہ ہم سب ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھاسکیں۔ شام کو تو تم چلے ہی جاؤ گے پھر۔ پھر کیا خبر کتنے دن بعد ہم ساتھ کھانا کھاسکیں۔" آخری الفاظ کے ساتھ ہی ممی کی آواز بھاری ہوگئی۔ میری جدائی کا خیال ان کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھا۔

کچھ کھانے پینے کو میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن ممی ڈیڈی کی دل رہی کی خاطر مجھے ڈائننگ ٹیبل تک جانا ہی پڑا۔

"یہ پہلا موقع ہے بیٹے کہ تم اتنے طویل عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو رہے ہو مگر ظاہر ہے کہ یہ تمہارے مستقبل کے لیے ضروری ہے ورنہ ہم کبھی یہ گوارا نہ کرتے" ڈیڈی کہنے لگے "اس لیے میرے بچے اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میری اداسی کو ڈیڈی نے محسوس کرلیا تھا اور وہ اس کا سبب کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔ میں اسی لیے زندگی

مسکرا کر بولا "میں اداس تو نہیں ہوں ڈیڈی!"

"تم زبان سے کچھ بھی کہو مگر تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اداس ہو۔ خیر یہ ایک فطری بات ہے" انہوں نے ڈش سے میری پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا "داخلوں میں ابھی تقریباً ایک مہینا ہے۔ ویسے تو تمہارے اپنے بہت عزیز وہاں ہیں لیکن اگر میری ضرورت ہوگی تو میں بھی آجاؤں گا۔ کوشش یہ کرنا کہ سیکنڈ ائر میں داخلہ مل جائے! اور ہاں خط پابندی سے ضرور لکھتے رہنا تاکہ ہمیں تمہاری خیریت ملتی رہے۔"

"بہتر ہے ڈیڈی!" میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

پھر اسی شام کو میں زخمی دل لیے اپنے دونوں ماموں زاد اور خالہ زاد کے ہمراہ دلی سے علی گڑھ روانہ ہوگیا۔

کلونت کور کے شہر کو چھوڑتے ہوئے میرے دل پر عجب قیامت گزر رہی تھی۔ وہ میری پہلی محبت تھی اور اسے میری آنکھوں کے سامنے بے دردی سے قتل کردیا گیا تھا۔ مجھے یاد آیا "اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا کہ اگر میں اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس نے اپنی بات سچ کردکھائی تھی۔ میں اس کے لیے کچھ بھی تو نہ کرسکا تھا۔ کاش ۔ کاش! میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

سارے راستے میں خاموش بیٹھا کلونت کور کے تصور میں گم رہا۔ میرے دونوں بھائی میری حالت سے بے خبر اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ میں کلونت کور کے لیے بے حد دکھی تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ وہ مرچکی تھی اور مجھے ابھی زندہ رہنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے اسے بھولنا ہوگا کیونکہ اب کچھ بھی تو ممکن نہ تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو شاید میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ حالانکہ یہ بھی کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ اس کی زندگی میں بھی اکثر میں یہ سوچ کر پریشان ہوجایا کرتا تھا کہ وہ اور میں دونوں الگ الگ عقیدے اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں ہم کیسے ایک ہوسکیں گے۔ مگر اب تو سب کچھ ختم ہی ہوگیا تھا۔ اب مجھے اسے فراموش ہی کرنا تھا۔ میں ان ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ گاڑی علی گڑھ پہنچ گئی۔

میرے خالو جان خان بہادر نواب ثناء اللہ خاں کی کوٹھی شہر کی ایک مضافاتی آبادی دودھ پور میں تھی۔ اس وقت سورج غروب ہوچکا تھا جب ہم ٹرین کے ذریعے علی گڑھ پہنچے اسٹیشن سے نکل کر ہم نے دودھ پور کے لیے تانگا کرلیا۔

دلی کے مقابلے میں مجھے علی گڑھ بہت پُرفضا اور پُرسکون شہر معلوم ہوا۔ یہ میرے لیے پہلا موقع تھا کہ میں دلی سے باہر نکلا تھا۔

خالو جان کی کوٹھی بھی میرے نانا کی کوٹھی سے چھ نہیں تھی بلکہ کچھ بڑی ہی ہوگی۔ بھائی عطاءاللہ خاں دلی دوران قیام ہی میرے متعلق اپنے والدین کو وہ سب کچھ ا خط میں لکھ چکے تھے جو انہیں میرے بارے میں معلوم تھا۔ میری خالہ جان اور میری والدہ بس دو ہی بہنیں تھیں دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میں ج خالہ جان کے سامنے پہنچا اور بھائی عطاءاللہ خاں نے ان کہا "امی! ذرا پہچانیے تو یہ کون ہے؟" تو خالہ جان "میری سعدیہ کا بیٹا" کہہ کر مجھے اپنے سینے سے لگالیا ا رونے لگیں۔

خالو جان کے علاوہ گھر کے دوسرے تمام افراد بھی سے بڑی محبت سے ملے۔ بھائی عطاءاللہ خاں کے علاوہ خا جان کی بس ایک بیٹی اور تھی جو میری ہم عمر ہی ہوگی۔ اس نام شگفتہ تھا اور وہ نام ہی کی طرح شگفتہ لگتی بھی تھی۔ وہ گر کالج میں فرسٹ ائر کی طالبہ تھی اور اب سیکنڈ ائر میں جا والی تھی۔ خالہ جان نے ابھی اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی نہیں کی تھی۔ میری ننھیال کی نسبت یہ خاندان ذرا چھوٹا تھا۔

میرے لیے پہلے ہی سے الگ کمرے کا بندوبست کردیا تھا اور یہ کمرا بھائی عطاءاللہ خاں کے کمرے کے برابر ہی تھا۔ میں نے اپنا سامان اس کمرے میں رکھوادیا۔

اس رات کھانا کھاکر ہم کوٹھی ہی کے باغ میں ٹہلنے نکل گئے۔ باغ میں ہر طرف خوب صورت گلابوں کے تختے مہک رہے تھے۔

"طارنوش!" ٹہلتے ٹہلتے بھائی عطاءاللہ خاں نے مجھے مخاطب کیا "تمہیں ایک بات بتادوں کہ ابا حضور قبلہ کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دینا! اور نہ یہاں آنے والے مہمانوں کی بات کبھی توجہ سے سننا! ہرچند کہ وہ میرے والد ہیں مگر یہ سچ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ہے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں۔ تم ایسے ذہین نوجوان کو غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انگریز ہمیشہ اپنے کاسہ لیسوں ہی کو خطابات سے نوازتے ہیں۔ میرے والد بھی ایسے ہی خطاب یافتہ افراد میں سے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں یہ بھی سوچنے لگتا ہوں کہ کاش میں ان کا بیٹا نہ ہوتا!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بھائی عطاءاللہ خاں کی آواز سے دکھ کا اظہار ہورہا تھا۔

یہ موضوع کیونکہ بھائی عطاءاللہ خاں کے لیے تکلیف دہ تھا اس لیے میں نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر سیاست پر گفتگو شروع کردی میں بولا "بھائی جان! آج میں آپ سے ایک بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے آپ کے خیالات

یاسی نظریات سے صدفی صد اتفاق ہے۔ واقعی ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت تحریک خلافت کے بجائے تحریک آزادی کی ضرورت ہے۔"

"طارنوش! مجھے تم سے یہی توقع تھی میرے بھائی!" ھائی عطاءاللہ خاں کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔ میں ت کا رخ بدلنے میں کامیاب رہا تھا۔

"لیکن آزادی کے حصول کی راہ کیا ہو بھائی جان؟" میں سوال کیا۔

"طارنوش کے سوال کا جواب تم دو برادر عزیز!" بھائی طاءاللہ خاں نے میرے ماموں زاد رحمت علی کی طرف دیکھتے وئے کہا۔

"ہم طویل عرصے تک تبادلۂ خیالات کرنے اور اچھی ح غور و فکر کے بعد ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ آزادی کے صول کی صرف اور صرف ایک ہی راہ ہے۔" یہ کہہ کر بھائی حمت علی چند لمحے خاموش رہے پھر بولے "اور طارنوش وہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد ہے۔"

"مسلح جدوجہد!" میں چونک کر کہنے لگا۔

پھر چند ہی روز میں میرے دونوں بڑے بھائیوں نے مجھے س معاملے میں بھی اپنا ہم خیال بنا ہی لیا۔ وہ انگریزوں کے لاف خفیہ اور مسلح جدوجہد کے قائل تھے۔ وہ چھاپا مار جنگ کے حق میں تھے "ایسی جنگ جو سرکاری نظم و نسق کو تہ و بالا دے' ہندوستان کے مختلف علاقوں میں افراتفری یلادے تاکہ انگریز جلد از جلد ہندوستان چھوڑنے کے لیے انوں کے رہنماؤں کی شرائط ماننے پر مجبور ہوجائیں۔ ان کے دیک یہ راہ بڑی طویل اور صبر آزما تھی' اس کے ساتھ انیاں چاہتی تھی۔

اب تک میں نے اندازہ لگایا تھا کہ میرے دونوں ائیوں کے خیالات اس وقت کے عام ہندوستانی مسلمانوں ے قطعی مختلف تھے جو خلافت پر جان دینے کے عملی ظاہرے کررہے تھے۔ یہ خیالات ان مسلمانوں سے بھی لف تھے جنہوں نے ریشمی رومال کی تحریک چلائی تھی اور ان مسلمانوں سے تو بالکل ہی مختلف جو انگریزوں ہی کو اپنا آقا لیم کرچکے تھے۔ ان خیالات کا کوئی علاقہ ان نوابوں سے ی نہیں تھا جن میں سے ایک یعنی ملتان کے نواب نے ائت عیاری کا ثبوت دیتے ہوئے ریشمی رومال تحریک کے ارے راز افشا کردیے تھے اور یوں خود کو انگریزوں کا نمک لال ثابت کردیا تھا۔

اپنے دونوں بھائیوں کی باتوں میں سے میں نے ایک نتیجہ اور بھی اخذ کیا تھا کہ وہ مجھے ذہنی طور پر ایک نیک مقصد کے لیے تیار کررہے ہیں مگر میں نے زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ابھی مجھے علی گڑھ آئے تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میرے دونوں بھائی کچھ دن کے لیے علی گڑھ ہی کی ایک تحصیل اترولی جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ خالو جان کے چھوٹے بھائی نواب بقا اللہ خاں کی وہاں جاگیر تھی۔ بہ ظاہر وہ دونوں محض سیر و تفریح کے لیے جارہے تھے لیکن میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں جو اب تک ان سے بہت گھل مل گیا تھا انہوں نے ایک مرتبہ بھولے منہ کو بھی یا اخلاقاً بھی مجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ اگر واقعی وہ محض سیر و تفریح کے لیے اترولی جارہے ہوتے تو مجھ سے بھی ساتھ چلنے کے لیے ضرور کہتے۔ میرے ذہن میں تجسس پیدا ہونے لگا اور اسی کے زیر اثر میں نے آخر خود ہی ان دونوں کے ساتھ چلنے کو کہہ دیا۔

حالانکہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس پر وہ دونوں فکرمند ہوجاتے مگر ہوا یہی!

"اچھا ٹھہرو!" وہ دونوں یہ کہہ کر کمرے کے ایک گوشے میں چلے گئے اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کی باتیں سن سکوں مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر ان کی گفتگو طویل ہوتی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے وہ کسی اہم مسئلے پر بحث کررہے ہوں۔ خدا خدا کرکے ان کی بحث ختم ہوئی۔ وہ یقیناً کسی نتیجے تک پہنچ چکے تھے۔ میں اس دوران میں بے چینی سے ان کی بحث ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

"طارنوش! تم ہمارے ساتھ نہ چلو تو بہتر ہے" بھائی عطاءاللہ خاں نے میرے قریب آکر کہا "ہم وہاں ایک خاص مقصد کے تحت جارہے ہیں اور جس کے حکم پر جارہے ہیں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ ہاں رحمت علی کا یہ کہنا درست ہے کہ ہم جس کے حکم پر اترولی جارہے ہیں اس سے تمہیں بھی اپنے ساتھ لے چلنے کی اجازت حاصل کرلیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کل تک رکنا پڑے گا۔"

"مگر وہ شخص ہے کون جس سے آپ میرے ساتھ چلنے کے لیے اجازت لینا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تمہیں ساتھ لے جانے کی اجازت مل گئی تو ہم اس کے بارے میں بتادیں گے ورنہ نہیں" بھائی رحمت علی نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"آپ اسی وقت جاکر اس شخص سے اجازت کیوں نہ لے آئیں!" میں نے تجویز پیش کی۔

"نہیں' یہ ممکن نہیں ہے" بھائی عطاءاللہ خاں نے بتایا "ہم آج شام چار بجے سے پہلے اجازت حاصل نہیں کرسکتے۔ وہ شخص ہم سے چار بجے ہی ملے گا۔"

"پھر تو یہ مجبوری ہے" میں نے مایوسی سے سرہلایا' پھر بولا "اچھا ٹھیک ہے میں شام تک انتظار کرلوں گا۔"

میرا یہ قیاس درست ہی ثابت ہوا تھا کہ وہ دونوں محض سیرو تفریح کی خاطر اترولی نہیں جارہے تھے' ان کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ کیا؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا' لیکن اسی روز مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ وہ دونوں سائیکل پر ساڑھے تین بجے کہیں گئے تھے اور پانچ بجے کے قریب لوٹ آئے تھے۔ میں نے ان کے چہروں سے ایک دبے دبے سے جوش کا اندازہ لگایا۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اندر سے دروازہ بند کرکے اس میں کنڈی ڈال دی تھی۔ اس پر میں کچھ حیران تو ہوا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"طارنوش! مبارک ہو تمہیں کہ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو" بھائی عطاءاللہ خاں نے میرے قریب بیٹھتے ہی پرجوش آواز میں کہا۔

میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ اس میں مبارک باد دینے کی کیا بات تھی!

"معلوم ہے ہم وہاں کس لیے جارہے ہیں؟" اس مرتبہ بھائی رحمت علی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ٹھہرو رحمت علی! ابھی مزید کچھ کہنے یا بتانے کی ضرورت نہیں۔ جوش میں ہم سے ایک بڑی غلطی ہونے والی تھی۔ ہم نے مجاہد اول کی تاکید کو نظرانداز کردیا تھا۔ پہلے طارنوش سے ہم یہ تو معلوم کرلیں کہ یہ ہمارا ساتھی بننے پر آمادہ بھی ہے یا نہیں؟" بھائی عطاءاللہ خاں بول اٹھے۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا میں بولا "میں بغیر یہ جانے کہ آپ کے مقاصد کیا ہیں' آپ کا ساتھی بننے پر آمادہ ہوں۔ مجھے آپ دونوں پر پورا پورا بھروسا ہے۔ میں آپ دونوں کو جان چکا ہوں' یہی میرے لیے کافی ہے۔"

"نہیں طارنوش' صرف یہی کافی نہیں ہے" بھائی عطاءاللہ خاں نے کہا "یہ زندگی کا سودا ہے' زندگی بھر کا سودا! قربانی کا سودا' سب کچھ ایک مقصد کے حصول کی خاطر تج دینے کا سودا! ہمیں نہیں معلوم کہ تم یہ مہنگا سودا کرنے پر راضی ہوجاؤ گے اس لیے پہلے یہ سن لو کہ ہم دونوں نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا ہے' اس کی منزل موت بھی ہوسکتی ہے! یہ بڑا پرخطر راستہ ہے اور ایک ایسا طارنوش کہ جس سے واپسی ممکن نہیں۔"

"مجھے منظور ہے بھائی جان' منظور ہے!" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"تو پھر سنو طارنوش کہ ہم دونوں ایک خفیہ وطن پرست تنظیم کے رکن ہیں۔ یہ تنظیم کفن بردوشوں اور سرفروشوں پر مشتمل ہے۔ ہم تمہیں بھی اس وطن پرست تنظیم کا رکن بنانا چاہتے ہیں کیونکہ تم ذہنی طور پر ہمارے خیالات سے اتفاق کرچکے ہو" بھائی عطاءاللہ خاں مجھے بتانے لگے "میں اس تنظیم کا مقصد تمہارے سامنے بیان کررہا ہوں۔ اگر تم اس مقصد سے متفق نہیں ہوگے تو تمہیں تنظیم کا رکن بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ سنو! اس تنظیم کا مقصد خواب غفلت میں پڑی ہوئی قوم اور اس کے رہنماؤں کو عملی طور پر یہ بتانا ہے کہ آزادی کی راہ میں لہو کے چراغ جلانا پڑتے ہیں۔ آزادی کے لیے بھیک نہیں مانگی جاتی بلکہ ہتھیار اٹھانا پڑتے ہیں۔ جھکنے میں آزادی نہیں ملتی بلکہ زور بازو سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہمارے رہنما سیاسی محاذ پر جنگ لڑ رہے ہیں' ہم ان کے لیے اپنے لہو سے راہ ہموار کریں گے۔ محدود پیمانے پر ہم چھاپا مار کارروائیاں فی الحال شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم ان کارروائیوں کے ذریعے عوام کے دلوں میں دبی ہوئی آزادی کی چنگاریوں کو بھڑکتے شعلوں میں تبدیل کردیں گے۔ بہ طور خاص ہم مسلمان رہنماؤں کو مجبور کریں گے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے تسلیم کرائیں۔ جیسا کہ میرے علم میں ہے طارنوش' تم تاریخ اور موجودہ بین الاقوامی سیاست کے ساتھ اس خطے کی سیاست پر بھی تمہاری گہری نظر ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اب سے چند برس پہلے میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کرالیا گیا تھا' مگر بعد میں ہندوؤں نے اسے تسلیم نہیں کیا جس کا ثبوت نہرو رپورٹ ہے۔ نہرو رپورٹ کے جواب اور رد میں مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کیے جنہیں ہندوؤں نے مسترد کردیا اور یہ معاملہ ابھی تک التوا میں پڑا ہوا ہے۔ سو سیاسی محاذ جن کا منصب ہے' انہیں لڑنے دو' ہمارا میدان اور راستہ ان سے مختلف ہے' ہرچند کہ مقصد ہم دونوں کا ایک ہے! ہمارا راستہ قربانیوں کا راستہ ہے۔ اس راستے پر ہمیں صرف جان دینا ہے۔ اس کے عوض نہ ہمیں کسی صلے کی

تمنا ہے اور نہ ہم کسی ستائش کے طلبگار ہیں۔ اور سنو طارنوش! ہماری یہ جنگ صرف انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ قوم فروشوں کے خلاف بھی ہے' ان میر جعفروں اور میر صادقوں کے خلاف بھی ہم اعلان جنگ کررہے ہیں جنہیں ملت فروشی کے بدلے خطابات' القابات اور جاگیریں ملتی ہیں! بولو طارنوش' صدق دل سے بتاؤ کیا تم تنظیم کے ان مقاصد سے پوری طرح متفق ہو؟" آخر میں بھائی عطاءاللہ خاں نے مجھ سے دریافت کیا۔

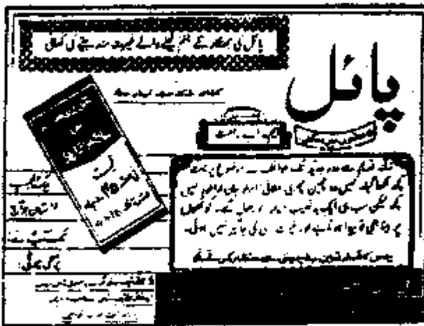
"بھائی جان! میں سلام کرتا ہوں ان سرفروشوں کو جنہوں نے اپنے لہو سے آزادی کے چراغ روشن کرنے کا عہد کیا ہے اور سلام کرتا ہوں اسے کہ جس نے اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کا رکن بننا میرے لیے باعثِ صد افتخار ہوگا" میں نے واقعی سچے دل سے کہا۔

"تو پھر آج ہی رات تمہیں ہمارے ساتھ تنظیم کے سربراہ سے ملنے کے لیے چلنا پڑے گا کیوں کہ وہ کل صبح اس شہر سے چلا جائے گا" بھائی رحمت علی نے بتایا۔

"کہاں چلا جائے گا؟ کیا وہ علی گڑھ میں نہیں رہتا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں سے کہاں جائے گا' کچھ نہیں کہا جاسکتا" اس مرتبہ بھائی عطاءاللہ خاں بولے "ہاں اس کے بارے میں ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ علی گڑھ میں نہیں رہتا۔ ہم سب اسے مجاہد اول کہتے ہیں۔"

پھر مجھے اس خفیہ تنظیم کے سربراہ کے بارے میں اپنے دونوں بھائیوں سے جو کچھ معلوم ہوا' وہ یہ تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ نقاب میں اپنا چہرہ چھپائے رہتا ہے۔ وہ ایک سچا مومن ہے۔ وہ نہ صرف انگریزوں اور ہندوؤں کا دشمن ہے بلکہ مسلمانوں کے ہر دشمن کا دشمن ہے۔ وہ سراپا آگ ہے' آتش فشاں ہے! انقلاب اور بغاوت کے شعلے اس کی نس نس میں کوندتے ہیں۔ آزادی کے شہیدوں کی روحیں اس میں حلول کرگئی ہیں۔ وہ ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کی حکمتِ عملی اور ان کی سیاست کو مسلمانوں کے لیے زہر تصور کرتا ہے۔ بہ حیثیت مسلمان اسے تحریک خلافت سے ہمدردی ضرور ہے مگر وہ اس تحریک کو ہندوستانی مسلمانوں کی قوت اور وقت کا زیاں خیال کرتا ہے۔ اس کے سیاسی تجزیے دوسرے مسلم رہنماؤں سے قطعی مختلف ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس وقت عرب انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اپنی عصبیت کے ساتھ ساتھ لالچ' اقتدار کے لالچ میں خلافت کے گلے پر چھری



پھیر رہے ہیں۔ ایسے میں ہندوستانی مسلمانوں کو خلافت کے مسئلے پر قربان کرنا لاحاصل ہے۔ تنظیم کے مجاہد اول کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وسط ہند کا باشندہ ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ میں انگریزوں اور عربوں کے خلاف ایک زیر زمیں خفیہ تنظیم کے گوریلوں کی قیادت کررہا تھا۔ انگریزوں اور عربوں کا بڑا مقصد ترک خلافت کا خاتمہ تھا جو وہ حاصل کرچکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی ترکوں کو میسوپوٹامیہ اور عرب علاقوں سے پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی کیوں کہ انگریزوں اور عرب بدوؤں کی فوج نے ان پر جو یلغار کی تھی' اسے وہ نہیں روک سکے تھے۔ اس تنظیم کے سربراہ نے عملی طور پر عثمانی خلافت کے حق میں جنگ کی تھی۔ اسے چھاپا مار جنگوں کا بڑا تجربہ تھا۔ اب وہ مشرق وسطیٰ میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد ہندوستان آگیا تھا اور یہاں اس نے انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے کا عہد کیا تھا۔ وہ اسی عظیم مقصد کے لیے اپنے اردگرد جاں نثاروں اور سرفروشوں کو جمع کررہا تھا۔ یہ سب کچھ انتہائی رازداری کے ساتھ ہورہا تھا۔ تنظیم کی رکنیت اختیار کرنے والے مسلمانوں سے قرآن حکیم پر ہاتھ رکھوا کر وفاداری اور رازداری کا عہد لیا جاتا تھا۔ یہی عہد آج شب مجھے بھی کرنا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا عجیب' دلچسپ اور پرکشش معلوم ہورہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا رخ متعین کرلیا تھا۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے کہ میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی مگر میں جاگ رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کر میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ دستک دینے والے حسب توقع بھائی عطاءاللہ خاں ہی تھے۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اب تک ان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ جانا کہاں ہے! مجھے ان پر مکمل اعتماد تھا۔

عمارت سے نکل کر وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے کوٹھی کے

عقبی باغ کی طرف بڑھے۔ باغ سے گزر کر وہ عقبی پھاٹک پر چڑھے۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں ایسا ہی کیا اور کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔

"کیا ہمیں پیدل ہی چلنا پڑے گا؟" پہلی بار کوٹھی سے نکل کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں۔" بھائی عطاء اللہ خاں نے بھی آہستگی سے جواب دیا "ہمیں زیادہ دور نہیں چلنا۔ کالج کے صدر دروازے کے سامنے جو چھوٹا سا باغ ہے وہیں ہماری ملاقات مجاہدِ اول سے ہوگی۔ اس نے مجھے بتادیا ہے کہ وہ باغ کے کس حصے میں ہوگا؟"

اس کے بعد میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بھائی عطاء اللہ خاں کے ساتھ چلتا رہا۔ میرے دل میں عجیب سی کھدبد ہو رہی تھی۔ آج رات میں بہرحال ایک پُراسرار شخصیت سے ملنے والا تھا۔

ہم شمالی سمت سے اس باغ میں داخل ہوئے جو اب نقوی پارک کہلاتا ہے۔ دائیں جانب کچھ فاصلہ طے کرکے ہم جیسے ہی بائیں طرف مڑے، ہمیں اپنے قریب ہی سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "خوش آمدید میرے بچو! جو سال بھی گزرتا ہے سروں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔"

"اور یہی سروں کے مینار ہماری منزل کا نشان ہیں۔" جواب میں بھائی عطاء اللہ خاں بولے، وہ رک چکے تھے اور ان کے ساتھ میرے قدم بھی ٹھہر گئے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ یقیناً یہ شناختی جملے ہیں کیوں کہ باغ میں تاریکی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مجاہدِ اول آواز بدل کر بول رہا تھا۔

"تم دونوں بیٹھ جاؤ!" میں نے مجاہدِ اول کی آواز سنی جو کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک ہیولے کے مانند نظر آرہا تھا۔

بھائی عطاء اللہ خاں کے ساتھ میں بھی گھاس پر بیٹھ گیا۔

"میں مجاہدِ اول کے حکم پر طارنوش کو لے آیا ہوں۔ یہ میری خالہ کا بیٹا ہے۔" بھائی عطاء اللہ خاں نے کہا۔

"مگر آج کے بعد طارنوش سے تمہارا صرف اور صرف ایک رشتہ ہے۔ آج سے یہ تمہارا بھائی نہیں بلکہ تنظیمی ساتھی ہے اور یہ رشتہ ہر رشتے سے افضل ہے۔" یہ کہہ کر مجاہدِ اول براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا "طارنوش! کیا تم نے ہماری تنظیم کے اغراض ومقاصد جان لیے؟"

"ہاں اے مجاہدِ اول! مجھے میرے تنظیمی ساتھی نے سب کچھ بتادیا ہے اور میں ان اغراض ومقاصد سے پوری طرح متفق ہوں۔" میں نے بلا جھجک کہا۔

"مجھے خوشی ہوئی طارنوش کہ تم نے میری پہلی ہی تاکید پر فوراً عمل کیا اور اپنے خالہ زاد کو بھائی نہیں تنظیمی ساتھی کہا۔" مجاہدِ اول اپنے مخصوص لہجے اور بھاری آواز میں بولا۔ "تمہیں معلوم ہے طارنوش کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ سنو کہ ان کے گھر شام غریباں کے منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کی تمام آرزوئیں اور امنگیں قتل کی جاچکی ہیں اور یہ مقتل انگریزوں کے تعاون سے خود انہوں نے اپنے لیے سجائے ہیں۔ اب ہر طرف تمناؤں کی خاک اڑ رہی ہے اور دور تک امیدوں کے بے کفن لاشے لہولہان پڑے ہیں۔ خیموں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ تہذیب ومعاشرت کی بستیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ انگریز وزیراعظم لائیڈ جارج خوش ہے کہ اس نے ترک حکومت کے عرب حصوں کو پانچ ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے۔ اس نے مسلم مرکزیت کی سب سے بڑی علامت کو ختم کردیا ہے۔ کیسا بھیانک ہے یہ انجام اور کتنا مایوس کن ہے یہ ماحول! اس کے باوجود میں پُریقین ہوں کہ دکھ بھری غلامی کی یہ رات جلد ختم ہوجائے گی اور آزادی کا سورج طلوع ہوگا۔ پھر کوئی شریف حسین، کوئی عرب شیخ، کوئی مسلمان لارنس آف عربیا کی پُرفریب چالوں میں نہیں آئے گا۔ میرے بچو! کیا تم بھی اس یقین میں میرے شریک ہو؟"

"ہاں اے مجاہدِ اول!" میں اور بھائی عطاء اللہ خاں ایک ساتھ بولے۔

"طارنوش۔ ہماری صفوں میں تم پہلے مجاہد ہو جسے اتنی آسانی سے ہم نے اپنے درمیان قبول کرلیا ہے۔ جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟"

"نہیں۔ مجاہدِ اول بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"طارنوش! تمہارے جن دو تنظیمی ساتھیوں نے تنظیم میں شمولیت کے لیے تمہارا نام پیش کیا تھا وہ ہمارے نہایت جاں نثار اور قابلِ اعتماد ساتھی ہیں اس لیے ہم نے تمہیں اپنا ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے سرپرست انگریز کی خفیہ پولیس کے اہم عہدے دار ہیں۔ اس کے باوجود ہم تمہیں اپنے درمیان خوش آمدید کہتے ہیں لیکن یاد رکھنا، ہم غداروں کو دوسری سانس کی مہلت نہیں دیا کرتے۔ ہمارے سامنے ایک عظیم تر مقصد ہے اور اس کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنا ہم اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔" مجاہدِ اول ایک لمحے کو خاموش ہوئے پھر بولے "تمہیں قبول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم ایک غیر معمولی نوجوان ہو اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ایسے

نوجوانوں کی اشد ضرورت ہے۔ سنو کہ دو طاقت ور جذبے ایسے ہیں جو انسان کو عزم اور حوصلے کی روشنی بخشتے ہیں محبت اور نفرت! ہمیں مسلمانوں کے ہر دشمن سے نفرت ہے اور ہر مسلمان سے اور اپنے نصب العین سے محبت ہے۔ سنو میرے بچو! نفرت اور محبت کے ان جذبوں کی عزت کرو، ان کی لو اتنی تیز کرو کہ تمہارا دشمن جل کر راکھ ہوجائے اور یہی آگ تمہارے دوستوں کے لیے گلزار بن جائے۔ آؤ طارنوش! اللہ کی اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر ہم عہد کریں کہ اپنی تنظیم اور نصب العین کے وفادار رہیں گے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مجاہدِ اول کا ہیولا آگے بڑھ آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کچھ دیکھا جو یقیناً قرآن شریف ہی تھا۔ مجاہدِ اول ہی اپنے ساتھ قرآن شریف لایا تھا۔

پھر مجاہدِ اول سمیت ہم نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر تنظیم سے وفاداری کا عہد کیا۔ اس کے بعد مجاہدِ اول مجھے تنظیم کے لائحہ عمل اور طریقہ کار کے بارے میں مختلف ہدایات دیتا رہا اور اسی کے ساتھ ساتھ معلومات فراہم کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی بتادیا کہ پورے ملک کے مختلف گوشوں میں تنظیم کے ارکان محدود پیمانے پر چھاپا مار سرگرمیوں کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ میرے دونوں بھائی کی تربیت حاصل کرنے اترولی جارہے تھے اور ان کے ساتھ میں بھی جارہا تھا۔

مجاہدِ اول نے رخصت ہونے سے پہلے جو آخری بات کی اس نے مجھے مضطرب کردیا۔ میرے لیے یہ ایک انکشاف ہی تھا۔

"عطاء اللہ خاں! کیا تم اپنے تنظیمی ساتھی طارنوش کے نام کی حقیقت جانتے ہو کہ اس سے کیا مراد ہے؟" مجاہدِ اول نے کہا تھا۔

"نہیں اے مجاہدِ اول! مجھے نہیں معلوم۔" بھائی عطا اللہ خاں نے جواب دیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

"کاش جیسا کہ اس کا نام ہے یہ ویسا ہی تنظیم کے لیے ثابت ہو" مجاہدِ اول بولا، پھر اس نے انکشاف کیا "طارنوش ابوالجن کا نام تھا۔ تمہیں علم ہی ہوگا کہ کرۂ ارض پر انسانوں سے پہلے جنات ہی آباد تھے۔ سو کرۂ ارض پر جس طرح پہلے انسان حضرت آدمؑ تھے اسی طرح حضرت آدمؑ سے قبل پہلے جن حضرت طارنوش تھے جن سے جنات کی نسل بڑھی۔ طارنوش ہی کو کچھ کتب میں سوما لکھا گیا ہے اور ان کا لقب جان بتایا گیا ہے مگر حضرت آدمؑ پر جو صحیفے اترے ان میں طارنوش ہی ہے اس لیے ہم اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ طارنوش کے والدین نے یہ نام کیوں پسند کیا مگر کسی انسان کا یہ نام رکھنا عجیب سی بات ہے۔"

اس کے بعد مجاہدِ اول اور بہت کچھ کہتا رہا مگر میں سن کر بھی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میری سماعت میں تو اس وقت امی کے کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ تمہارے وجود کا بھید تمہارے نام میں چھپا ہوا ہے۔ یہ نام ایک پردہ ہے اور جس دن یہ پردہ اٹھ گیا یا خود تم نے اس پردے کو اٹھادیا تم پر تمہارے وجود کی بہت سی حقیقتیں منکشف ہوجائیں گی اور آج اس نام کا پردہ اٹھ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میری والدہ نے میرے والد کی خواہش پر میرا یہ نام رکھا تھا۔ مجاہدِ اول یقیناً کوئی صاحبِ علم شخص تھا کہ جو معما آج تک کسی سے حل نہیں ہوسکا تھا اس نے حل کردیا تھا مگر یہ انکشاف مجھے کچھ اور بے چین کرگیا تھا۔ میرے والد نے آخر میرا یہی نام کیوں تجویز کیا تھا؟ کیا سبب تھا اس کا؟ جنات سے آخر میرا کیا تعلق؟ انہی سوالوں کے گرداب میں معلوم نہیں کب میں بھائی عطاء اللہ خاں کے ساتھ مجاہدِ اول سے رخصت ہوکر باغ سے نکلا اور جانے کب کوٹھی پہنچا! مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ دوسرے دن صبح مجھے اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ اترولی جانا تھا اس لیے بھائی عطاء اللہ خاں مجھے جلد سوجانے کی تاکید کرکے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں جس عالم میں تھا اس میں نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں بے چینی کے ساتھ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نام سے پردہ اٹھ جانے کے باوجود ابھی تک مجھ پر میرے وجود کی کوئی بھی حقیقت منکشف نہیں ہوئی تھی اور میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ امی نے مجھ سے غلط بیانی کی ہوگی۔

اچانک میرا کمرا خوشبو سے بھر گیا۔ اس کے ساتھ امی کی پُراسرار سرگوشی سنائی دی "یقیناً تمہاری امی نے تم سے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔ سنو کہ جب آج تمہارے نام کا پردہ اٹھ ہی گیا ہے تو کچھ حقیقتوں کا انکشاف کیا جاسکتا ہے۔ تم یہی جاننا چاہتے تھے ناکہ آخر تمہارا وجود ہے کیا معما جو خود تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تمہارے ہی اندر حیرت انگیز پُراسرار قوتیں کیوں ہیں؟ تمہیں ایسی نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے جو روئے زمین پر بسنے والے کسی انسان کو عطا نہیں کی گئیں؟ تم عام انسانوں سے مختلف کیوں ہو؟ مجھ سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ اور اب۔۔۔ اب تمہارے ذہن میں کچھ اور نئے سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کہ تمہارے والد نے تمہارا یہی نام کیوں تجویز کیا؟ اس کا کیا سبب تھا؟ جنات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ میں آج تمہارے ان تمام سوالوں کے جواب

دے دوں گی۔ ان سوالوں کے علاوہ بھی تم نے جو پوچھا اور میں نے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا تو ضرور ان سوالوں کے جواب دوں گی۔"

میں پوری توجہ سے اسیٰ کی باتیں سننے لگی۔ وہ میرے وجود کے اسرار کھول رہی تھی۔

O☆O

"سنو طارنوش! تمہارا وجود یقیناً حیرت انگیز ہے لیکن کوئی معما نہیں بلکہ جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ میں ابتدا سے تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔

روئے زمین پر حضرت آدمؑ کی آمد سے قبل اللہ تعالیٰ کی ایک اور مخلوق آباد تھی۔ انہیں ہم جنات کہتے ہیں اور ان کے وجود کی گواہی قرآن حکیم نے بھی دی ہے۔ مجاہد اول نے طارنوش کے متعلق تمہیں سچ ہی بتایا ہے۔ تو جس طرح انسانوں میں یہ رواج ہے کہ وہ اپنے جد امجد کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھتے ہیں اس طرح جنات میں بھی یہ رواج ہے۔ سو اسی لیے تمہارے والد نے تمہارا نام اپنے جد اعلیٰ کے نام پر طارنوش تجویز کیا۔ درمیان میں سوال نہ کرو اور میری باتیں توجہ سے سنو! قادرِ مطلق نے آگ اور ہوا سے جنات کو تخلیق کیا۔ یہ ایسی آگ تھی جس میں نور بھی تھا اور ظلمت بھی ایسی آگ کہ جس میں دھواں نہ تھا۔ جنات کے وجود کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں ملا ئکہ اور جنات کا ذکر ایک سو اٹھارہ جگہ موجود ہے۔ جنات کے بابت پوری تفصیل سے میں تمہیں پھر کبھی آگاہ کروں گی۔ فی الحال وہ باتیں جان لو جو تم سے متعلق ہیں اور جن کا جاننا تمہارے لیے ضروری ہے۔ انسانوں ہی کی طرح جنات بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنات میں یہودی، عیسائی، ہندو، آتش پرست، ستارہ پرست اور مسلمان بھی شامل ہیں۔ مذہبی اعتبار سے جنات کو پانچ بڑے فرقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا فرقہ کافر ہے، کھلا کافر! اور یہ فرقہ کفار انسانوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ ہندو انہیں مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ دوسرا فرقہ منافق کہلاتا ہے۔ یہ بہ ظاہر اہل ایمان میں سے لگتا ہے اور خود کو مسلمان بھی کہتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ان کی بھی جنات میں خاصی بڑی تعداد ہے۔ تیسرا فرقہ فاسق ہے جو خود فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے اور انسانوں کو بھی اس طرف مائل کرتا ہے۔ مغربی اقوام کو بے غیرتی و بے حیائی کی طرف اسی فرقے نے راغب کیا ہے۔ یہ وہاں مختلف خون آشام بلاؤں کے نام سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ چوتھا فرقہ بدخلق ہے۔ یہ فرقہ انسانوں کے دل و دماغ میں اور ان کی روحوں میں غرور، کینہ اور حسد ڈالتا ہے۔ یہی انسانوں کو نجاست کی طرف کھینچتا ہے۔ پانچواں یعنی آخری فرقہ اہل ایمان کا ہے۔ یہ وہ جنات ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ حضور سرورِ کائنات پر سب سے پہلے ایمان لانے والے سات جن تھے۔ اس واقعے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی آیت میں بھی کیا ہے۔ جنات کے حضور اکرمؐ پر ایمان لانے کا واقعہ یہ ہے۔ رسول کریمؐ طائف سے واپسی میں ایک مقام نخلہ میں ٹھہرے۔ نصف شب کے قریب حضورؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ نصس کے ساتھ جن حسا، مساشامرہ، ناصر، ابن الارب، امین اور اخصم آئے۔ انہوں نے نماز میں حضورؐ کی قرأت سنی اور اسلام لے آئے۔ انہی ساتوں نے جنات کے مختلف قبائل میں تبلیغ کی۔ اس تبلیغ کے نتیجے میں ہاموس کے جد امجد یوسف بن یاسف ایمان لائے۔ انہی کی نسل میں ہاموس پیدا ہوا جو اہل ایمان میں سے تھا۔ ہاموس بڑا نیک اور فسق و فجور سے دور رہنے والا تھا۔ اسی ہاموس کو ایک واقعہ پیش آیا اور وہ پریشان ہوگیا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ ہاموس پرواز کرتا ہوا ایک شہر کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ اس کی نگاہ ایک آدم زادی پر پڑی جو اپنی عالی شان حویلی کی چھت پر اپنے بال سکھا رہی تھی۔ وہ اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ اسے دیکھنے کے لیے چھت پر اتر گیا۔ پہلی ہی نظر میں ہاموس اس پری وش پر عاشق ہوگیا تھا۔ معلوم ہے تمہیں طارنوش وہ کون تھی؟ اس کا نام سعدیہ بیگم تھا اور وہ دہلی کے ایک نواب فرقان علی کی صاحب زادی تھی۔ پہلی بار تو ہاموس کی ہمت نہیں ہوئی کہ سعدیہ بیگم کو مخاطب کرسکتا مگر کئی روز بعد جب ایک بار پھر سرشام سعدیہ بیگم اسے چھت پر تنہا نظر آئی تو ہاموس ایک انسانی قالب اختیار کرکے اس سے ملا۔ ہاموس نے ایسا وجیہہ اور دل آویز انسانی قالب اختیار کیا تھا کہ سعدیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر یہ ملاقاتیں حویلی کی چھت اور باغ میں روزانہ ہی ہونے لگیں۔ سعدیہ نے بھی ہاموس کو پسند کرلیا تھا۔ چند ہی روز کے بعد ہاموس نے سعدیہ کو اپنی حقیقت سے آگاہ کردیا کہ وہ جنات کی نسل سے ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی بتادیا کہ وہ مسلمان ہے۔

ایک جن اور آدم زادی کا عشق پروان چڑھتا رہا، یہاں تک کہ یہ راز عالم جنات میں افشا ہوگیا کہ ہاموس کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انہی دشمنوں میں سے ایک جنیہ طرطبہ بھی تھی۔ طرطبہ کافرہ تھی اور وہ ہاموس کو چاہتی بھی تھی۔ ہاموس کو اپنانے کی خاطر وہ مسلمان ہونے پر بھی آمادہ تھی، لیکن ہاموس نے اسے ٹھکرادیا۔ اس کافرہ نے اسی لیے قبیلے کے سردار ملیقا کے پاس جاکر ہاموس کی شکایت کی کہ وہ ایک آدم زادی کے عشق میں مبتلا ہے اور اس سے ملتا بھی ہے۔ طرطبہ نے ہاموس پر یہ الزام بھی لگایا کہ ہاموس اپنی محبوبہ سے ناجائز تعلقات بھی استوار کرچکا ہے۔ یہ ہاموس پر بہتان تھا جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بہ حیثیت مسلمان ہاموس بہ قول طرطبہ زنا کا مرتکب ہوا تھا۔ ملیقا نے اسے طلب کرلیا اور اس سلسلے میں استفسار کیا۔ ہاموس نے یہ اقرار تو کرلیا کہ ایک آدم زادی سعدیہ سے عشق کرتا ہے اور اس سے ملتا بھی ہے مگر زنا کے بہتان کو رد کردیا۔ سردار قبیلہ نے حکم سنایا کہ اب ہاموس اس آدم زادی سے نہیں ملے گا پھر الزام کی تحقیق ہوئی اور ہاموس بے گناہ قرار پایا۔ وہ سعدیہ سے زنا کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔

سعدیہ کی جدائی نے ہاموس کا برا حال کردیا۔ وہ اپنے قبیلے کے اکابرین اور علما سے ملا۔ عالموں نے فتویٰ دیا کہ بہ حیثیت مسلمان ہاموس اپنی آدم زاد محبوبہ سے شادی کرسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ شرط بھی رکھ دی گئی کہ اس شادی کا علم کہ ایک آدم زادی نے ایک جن کی زوجیت قبول کرلی ہے، آدم زادوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ اس شرط کی دلیل اور سبب یہ تھا کہ جنات بہرحال آدمی سے کمتر مخلوق ہیں۔ اگر آدم زادوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ ایک جن نے ایک آدم زادی کو اپنی بیوی بنالیا ہے تو وہ جنات کے دشمن ہوجائیں گے۔ آدم زادے بہرحال اشرف المخلوقات ہیں اور جنات کو نقصان پہنچانے کے اہل ہیں۔

ہاموس نے اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہ شرط قبول کرلی اور اسی کے ساتھ صرف ایک بار شادی سے پہلے سعدیہ سے ملنے کی اجازت طلب کی تاکہ اس سے معلوم ہوسکے کہ آیا وہ بھی اس شرط کو قبول کرنے پر آمادہ ہے کہ نہیں!

سردار قبیلہ ملیقا نے ہاموس کو صرف ایک بار سعدیہ سے ملنے کی اجازت دے دی۔

ہاموس کے فراق میں سعدیہ کا بھی برا حال تھا۔ ہاموس اس سے ملا تو سعدیہ نے کہا کہ اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

ہاموس بولا کہ اس کی صرف ایک صورت ہے، تم مجھ سے شادی کرلو! پھر اس نے سعدیہ کو سب کچھ بتادیا۔ سعدیہ نے شرط قبول کرلی اور ہاموس سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی، مگر اس کی بھی ایک شرط تھی۔

"ہاموس! تم مجھے میرے ماں باپ کے گھر سے کہیں اور نہیں لے جاؤ گے۔ میں یہیں رہوں گی۔" سعدیہ نے کہا تھا۔

سعدیہ کی یہ شرط ہاموس نے مان لی اور پھر ایک جمعرات کو جنات کی کثیر تعداد کی موجودگی میں ہاموس اور سعدیہ کا نکاح ایک عالم جن علیا کیش نے پڑھایا۔ سردار قبیلہ ملیقا دلہن، یعنی سعدیہ بیگم کی طرف سے اس کا سرپرست ٹھہرایا گیا۔

ہاموس سے سعدیہ کی شادی کے بعد طرطبہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس نے ہاموس سے معافی مانگ لی اور پھر اپنے عمل سے ہاموس کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اس نے وہ بات عام کردی جو صرف ہاموس اور اس کے درمیان تھی۔ عالم جنات میں اس کا بڑا چرچا ہوا کہ ایک کافرہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس کی شرط اب بھی یہی تھی کہ وہ اسی وقت مسلمان ہوگی جب ہاموس اس سے شادی کرنے پر رضامند ہوجائے گا۔ طرطبہ بے حد حسین تھی۔ بہت سے کافر جن اس کے شیدائی تھے اور اسے اپنانا چاہتے تھے۔ یوں بھی وہ کافر قبیلے کے ایک سردار کی بیٹی تھی۔

ملیقا کا خیال یہ تھا کہ اگر طرطبہ مسلمان ہوگئی اور اس نے ہاموس سے شادی کرلی تو اس کا خوش گوار اثر مرتب ہوگا۔ اس طرح کافر جنات بھی اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے۔ یہی سوچ کر اس نے ایک روز ہاموس کو بلوایا اور بولا "اے ہاموس! تو طرطبہ سے شادی کرلے اس طرح تجھے بڑا ثواب ملے گا کہ تُو نے ایک کافرہ کو دین اسلام میں داخل کیا اور یوں دوسروں کے لیے بھی راہ کھل جائے گی۔ پھر کافروں کے فرقے سے جو ہماری دشمنی چلی آرہی ہے، وہ بھی شدید نہ رہے گی کہ خود ان کی بیٹی ہمارے گھر میں ہوگی۔"

اس پر ہاموس نے کہا "اے میرے سردار ملیقا! تُو جانتا ہے کہ میں پہلے ہی سے شادی شدہ ہوں اور ایک آدم زادی سے نکاح پڑھوا چکا ہوں۔"

"ایک سے زیادہ شادیاں کرنا سنت رسولؐ ہے۔ شرع میں اس پر کوئی پابندی نہیں بلکہ تُو طرطبہ سے شادی کرکے دہرے ثواب کا حق دار بن جائے گا اول تو تجھے اس کا ثواب ملے گا کہ تیری وجہ سے ایک کافرہ مسلمان ہوئی، دوم سنت پر عمل پیرا ہونے کا ثواب حاصل کرے گا۔ میں سردار قبیلہ ہونے کی حیثیت سے تجھے طرطبہ سے شادی کا حکم بھی دے سکتا تھا مگر ہمارا دین اس جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ شادی تیری اور طرطبہ کی باہمی رضامندی ہی سے ہونا چاہیے۔ میں تجھے تین دن کی مہلت دیتا ہوں، تو سوچ لے کہ اسی میں ہماری

بھلائی ہے اور دین کا بھی فائدہ ہے۔"

پھر ہاموس نے بڑی جرح کی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ ہاموس کے والدین اور عزیز اقارب کو جب ملیقا سے ہونے والی گفتگو کا علم ہوا تو وہ بھی ہاموس پر طرطبہ سے شادی کر لینے کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔

تین دن کی مہلت ختم ہونے والی تھی، مگر ہاموس اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ ہاموس کے گھر والے بھی اس پر خوش نہیں تھے کہ اس نے آدم زادوں سے رشتہ جوڑ لیا ہے اور جنات میں شادی نہیں کی۔ طرطبہ سے شادی کرنے کے بعد ان کی یہ آرزو پوری ہو سکتی تھی۔ ہاموس کی بہن اسنیٰ یعنی خود میں بھی دوسری شادی کے حق میں تھی۔ جب ہاموس خود کسی فیصلے تک نہ پہنچ سکا تو والدین نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ہاموس نے آج تک اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کی تھی اس کے والدین جو ظاہر ہے کہ میرے والدین بھی تھے، انہوں نے طرطبہ سے ہاموس کی دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا۔

میرے بھائی ہاموس کی بابت جنات میں عام خیال یہ تھا کہ اس نے ایک آدم زادی کو اپنے نکاح میں لا کر پوری نسل جنات کی توہین و تذلیل کی ہے۔ میرے والدین اس عام تاثر کو ہاموس کی دوسری شادی جنات ہی میں کر کے ختم کر دینا چاہتے تھے تاکہ عام جنات ہمارے گھرانے سے نفرت نہ کریں ہاموس کی پہلی شادی سے قبل ہمارا گھرانا بڑا معزز سمجھا جاتا تھا۔

ہاموس کو آخر کار طرطبہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہونا ہی پڑا۔ سعدیہ کی طرح طرطبہ بھی اس کے نکاح میں آ گئی۔ یوں کافروں سے مسلمانوں کا میل ملاپ شروع ہو گیا۔ طرطبہ شادی سے پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔

طرطبہ سے ہاموس کی شادی کو ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ ایک رات پُراسرار طور پر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس قتل پر بڑا ہنگامہ ہوا، مگر قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہ مل سکا۔ اس سے بھی بڑا ہنگامہ اس وقت بپا ہوا جب طرطبہ دین اسلام سے پھر گئی۔ وہ مرتد ہو گئی تھی اور اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے۔ مفتی علیا لیش نے طرطبہ کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم کی بجا آوری کے لیے مسلمانوں نے جب عملی قدم اٹھانا چاہا تو کافروں اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے بڑی تعداد میں جنات مارے گئے۔ کافر جنوں نے مسلمانوں کے خلاف یہ کہنا شروع کر دیا کہ طرطبہ نے نوعِ جنات کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے ہاموس سے شادی کی تھی۔ وہ حقیقتاً مسلمان نہیں ہوئی تھی جس روز ہاموس کا قتل ہوا طرطبہ اپنے باپ کے گھر گئی ہوئی تھی اس لیے یہ کہنا درست نہیں تھا کہ ہاموس کو خود اس نے قتل کیا تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہاموس کا قاتل، طرطبہ کے عاشقوں میں سے کوئی رہا ہو یا پھر کسی سازش کے تحت کافروں نے اسے ٹھکانے لگوا دیا ہو۔ بہرحال ابھی تک خود میں بھی پوری طرح اپنے بھائی کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی کہ ان سے انتقام لے سکوں۔ ہاں میری نظر میں چند مشتبہ جنات ضرور ہیں جن پر ہاموس کے قاتل ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔

جب سے کفار اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی ہے اس وقت سے اب تک طرطبہ سخت پہرے میں رہتی ہے۔ کافر جنات کی ایک کثیر تعداد اس کی حفاظت پر مامور ہے۔ مفتی علیا لیش کے فتوے کو انہوں نے اپنے لیے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہاموس کے قتل کے بعد تمہاری ماں سعدیہ بیگم بے سہارا رہ گئی۔ اس پر جو کچھ گزری وہ واقعات اس عورت کے ذریعے تمہارے علم میں آ چکے ہیں جس نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے اور جسے تم امی کہتے ہو۔

طارنوش! تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے ایک بار تم سے کہا تھا، میں تمہارے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہوں۔ اس کی بڑی وجہ میں نے یہ بتائی تھی کہ تمہیں کچھ ایسی قوتوں کی طرف سے بھی خطرہ پیش آ سکتا ہے جن سے ابھی تم ناواقف ہو۔ تو سنو کہ تمہارے متوقع دشمن وہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے تمہارے والد، یعنی میرے بھائی ہاموس کو قتل کر دیا تھا۔ یقیناً یہ بات ان کے علم میں بھی ہے کہ تمہارے والد نے ایک آدم زادی سے شادی کی تھی۔

سنو طارنوش! تمہارا وجود اللہ تعالیٰ کی دو مخلوقات کے ملاپ کا نتیجہ ہے یہی سبب ہے کہ تمہارے اندر انسانی صفات کے ساتھ ساتھ جناتی صفات بھی موجود ہیں جو خود بہ خود حرکت میں آ جاتی ہیں خصوصاً اس وقت جب تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ تم اسی لیے روئے زمین پر بسنے والے عام انسانوں سے قطعی مختلف ہو۔ اپنے والد کی طرف سے تمہیں ورثے میں جناتی صفات ملی ہیں اور والدہ کی طرف سے انسانی صفات! تم ان دونوں صفات کا مجموعہ ہو اسی لیے عام انسانوں سے افضل و برتر ہو۔ تم ابھی اپنے وجود میں پوشیدہ جناتی صفات کو اپنے ارادے کا پابند بنانے پر قادر نہیں ہو، لیکن جیسا کہ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ تمام تر قوتیں تمہارے ارادے کی پابند ہو جائیں گی۔ اس دن کا انتظار کرو کہ وہ دن ابھی نہیں آیا۔ آج میں تمہیں یہ بھی بتا دینا چاہتی ہوں کہ ان صفات کو اپنے ارادے کا پابند بنانے کے لیے تمہیں بڑی ریاضتوں سے گزرنا پڑے گا۔ یہ روحانی ریاضتیں آسان بہرحال نہیں ہیں یہ مشکل ضرور ہیں مگر ناممکن نہیں۔

میرا خیال ہے طارنوش کہ تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب تفصیل سے دے چکی ہوں تمہیں مجھ سے کوئی اور سوال تو نہیں کرنا؟"

**

اسنیٰ نے مجھ پر میرے وجود کے تقریباً تمام ہی اسرار کھول دیے تھے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا ہاں صرف ایک بات معلوم نہیں تھی جو خود یقینی طور پر اسنیٰ کے علم میں بھی نہیں تھی۔ اسنیٰ خاموش ہو گئی تو میں نے اس سے ایک ہی سوال کیا "میں اب صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے والد کو کس نے قتل کیا تھا؟ میں اپنے والد کے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہوں کہ انہیں بے گناہ مارا گیا۔"

"یقیناً میرا بھائی بے گناہ تھا!" اسنیٰ جذبات سے بوجھل آواز میں کہنے لگی "مگر طارنوش بیٹے! میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ابھی قاتل یا قاتلوں کا سراغ مجھے بھی نہیں ملا۔ یہ نہ بھولو کہ خود میں بھی تو انتقام کی آگ میں سلگ رہی ہوں۔ اس سلسلے میں جہاں تک تمہارے کسی عملی اقدام کا تعلق ہے تو ابھی تم اس کے اہل نہیں ہو۔ ہاں اس کے اہل بن سکتے ہو اور شاید مجھ سے زیادہ تم ہی اس کے اہل ثابت ہو گے کیونکہ جناتی صفات کے ساتھ تمہارے اندر انسانی صفات بھی ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہرحال اشرف المخلوقات بنایا ہے۔"

"تو پھر میں اس کا اہل کب تک بن سکوں گا؟" میں نے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔

"اس وقت جب تم اپنی جناتی صفات کو ہم جنات کی طرح اپنے ارادے کا پابند بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔" اسنیٰ نے جواب دیا۔

"اور اس کے لیے مجھے سخت روحانی ریاضتوں سے گزرنا ہو گا، یہی کہا تھا نا تم نے؟" میں نے کہا "میں ان ریاضتوں سے گزرنے پر تیار ہوں۔"

"ہاں میں نے یہی کہا تھا مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی تمہارے شعور کو مزید بلوغت کی ضرورت ہے جس میں ایک عرصہ لگے گا۔" وہ بولی، پھر اس نے کہا "آج میں خاصی دیر تمہارے پاس رہی، اب چلتی ہوں خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ مجھے اس پر ملال تھا کہ ابھی میں روحانی ریاضتوں کا اہل نہیں ہوا۔

اسنیٰ کی مخصوص خوشبو میرے کمرے سے غائب ہو گئی۔

اس رات میں دیر تک اپنے وجود کے اسرار پر غور کرتا رہا اسی کے ساتھ مجھے وہ تمام باتیں یاد آتی رہیں جو اسنیٰ سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں واقعی ایک حیرت انگیز وجود کا مالک تھا اور اس میں مزید جِلا کی گنجائش باقی تھی۔ میں اس دن کے بارے میں سوچ رہا تھا جب میری جناتی صفات میرے ارادے کی پابند ہو جائیں گی۔ پھر میں اپنے والد کے قاتلوں کا سراغ لگا کر ان سے انتقام لے سکوں گا۔ اسنیٰ نے بتایا تھا کہ اس کے لیے مجھے سخت روحانی ریاضتوں سے گزرنا پڑے گا، مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا اسنیٰ کی اس بات سے میرے دل کو بڑا سکون ملا تھا کہ میں اس سے بھی زیادہ اپنے والد کے انتقام لینے کا اہل ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ میرے اندر جناتی صفات کے ساتھ انسانی صفات بھی تھیں انہی باتوں کو سوچتے سوچتے جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میں بہت گہری نیند سویا ہوا تھا کہ کمرے کے دروازے پر زور زور کی دستکیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بھائی رحمت علی کو کھڑے دیکھا۔ میرے ذہن پر ابھی تک نیند کا غبار چھایا ہوا تھا اس لیے دروازہ کھولنے کے باوجود انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"اتنی دیر سے دروازے پر دستکیں دے رہا ہوں اور تم ہو کہ دروازہ ہی نہیں کھول رہے تھے۔ بھائی میرے اترولی چلنا ہے کہ نہیں؟" انہوں نے کہا۔

"اترولی!۔۔۔ مگر کس لیے؟" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم شاید ابھی تک سو رہے ہو! میں عطا اللہ خان کے کمرے میں ہوں، تم تیار ہو کر وہیں آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئے۔

اسی وقت مجھے گزشتہ شب کے تمام واقعات یاد آ گئے اور میں نے بہ آواز بلند بھائی رحمت اللہ سے کہا "معاف کیجئے گا میں واقعی نیند میں تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" بھائی رحمت علی نے چلتے چلتے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھ گیا تھا کہ تم سو رہے ہو۔"

دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کی درمیان بل کھاتی سڑک پر ہمارا یکہ آگے بڑھتا جا رہا تھا میرے علاوہ یکے میں تین افراد

اور تھے۔ میری ہی طرح ان کا تعلق بھی وطن پرست خفیہ تنظیم سے تھا۔ ان تینوں کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ مجھے ان کے متعلق صرف اتنا علم تھا کہ وہ وسط ہند کے مختلف شہروں سے علی گڑھ پہنچے تھے اور مجاہد اول کے حکم پر میرے ساتھ ایک اہم چھاپا مار کارروائی میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔

میں اتروئی جا کر محدود پیمانے پر چھاپا مار تربیت حاصل کر چکا تھا۔ یہ تربیت حاصل کیے بھی اب مجھے دو ماہ سے اوپر ہو رہے تھے۔ تربیت حاصل کرنے والوں کا یہ چھوٹا سا گروہ گیارہ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے تین ہم تھے یعنی میں، بھائی عطا اللہ خان اور بھائی رحمت علی۔ میں نے ایک ماہ کے دوران میں بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا تھا تربیت کے آخری مرحلے میں مجاہد اول بھی ایک شب اتروئی پہنچ گیا تھا اور ہم سب سے ملا تھا۔ ہمیں تربیت دینے والے سالار عبد الرحمان نے میری بہت تعریف کی تھی۔

اتروئی میں زیر تربیت گیارہ نوجوانوں میں سے مجھے سالار عبد الرحمان نے اول منتخب کیا تھا۔ میں اس عرصے مختلف قسم کے ہتھیار چلانا بھی سیکھ چکا تھا میرا نشانہ بڑا سچا تھا جس کا عملی مظاہرہ مجھے مجاہد اول کے سامنے بھی کرنا پڑا تھا۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے ہم سب نے شکاریوں کا بہروپ بھر لیا تھا۔

ایک ماہ کی اس تربیت کے بعد ہم تینوں اتروئی سے علی گڑھ لوٹ آئے تھے کیوں کہ اب مسلم اورینٹل کالج میں داخلے شروع ہو چکے تھے۔ کچھ تو میرے خالو خان بہادر بقا اللہ خان کی سفارش اور کچھ میری اہلیت کے سبب مجھے سیکنڈ ایئر میں داخلہ مل گیا۔ اس کے لیے مجھے سخت امتحان سے گزرنا پڑا تھا۔ سفارش کے باوجود امتحان لینے میں کوئی نرمی نہیں برتی گئی تھی۔ میں نے خط کے ذریعے ڈیڈی کو اپنے داخلے سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ وہ علی گڑھ آنے کی زحمت سے بچ جائیں۔

مجھے کالج جاتے ہوئے ابھی ایک ہی ماہ ہوا تھا کہ مجاہد اول کا پیغام ملا۔ اس نے مجھے فوری طور پر شمالی ہندوستان کے ایک پہاڑی قصبے میں پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ یہ قصبہ نینی تال سے پندرہ میل دور بلندی پر تھا۔ اس قصبے میں پہنچ کر مجھے ایک شخص وہاب سے ملنا تھا جو اس قصبے کی مشہور سیاسی شخصیت تھا۔ یہ علم نہیں تھا کہ مجاہد اول نے مجھے وہاں کیوں طلب کیا تھا! میں بہرحال علی گڑھ سے روانہ ہو گیا۔

میں اس قصبے میں پہنچ کر بس سے اترا ہی تھا کہ ایک شخص میرے قریب آ کر آہستہ سے بولا "جو سال بھی گزرتا ہے سروں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔"

"اور یہی سروں کے مینار ہماری منزل کا نشان ہیں" میں نے شناختی جملے کے جواب میں شناختی الفاظ دہرائے۔

"خوش آمدید!" یہ کہہ کر اس شخص نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا۔

"شکریہ! میں خود لے کر چلوں گا' زیادہ بھاری نہیں ہے!"

یہی شخص وہاب تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے ایک تانگے میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ قصبے کی وہ مضافاتی بستی جہاں ایک بڑے سے گھر کے ایک کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ اسی رات مجاہد اول مجھ سے ملا اور میری طلبی کا مقصد بیان کیا۔ اس کے چہرے پر بہ دستور سیاہ نقاب تھی۔ کمرے میں بتی بھی اس نے نہیں جلانے دی تھی۔

دوسرے دن ہی صبح فجر کے وقت اٹھ کر میں اس جگہ گیا جس کی نشان دہی مجاہد اول نے کی تھی۔ یہ ایک چٹان تھی جو اس گھر کی شمالی سمت میں کچھ فاصلے پر دور ہی نظر آتی تھی۔ گھر سے نکلتے ہی شمال کی سمت دیکھ کر مجھے چٹان نظر آ گئی تھی۔ مجھے مجاہد اول وہاں اپنا منتظر ملا۔ وہ چٹان کی اوٹ میں تھا اور میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے لبادے میں ملبوس تھا اور چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک تھیلا دیکھا اور سمجھ گیا کہ تھیلے میں کیا ہو گا!

مجاہد اول مجھ سے آگے آگے چل رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ راستہ ناہموار تھا تقریباً ایک گھنٹے تک ہم دونوں تیز قدمی کے ساتھ اس غیر آباد پہاڑی علاقے میں پیدل سفر کرتے رہے پھر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں وہ رک گیا۔

میں نے پہلی بار مجاہد اول سے براہ راست ڈائنامائٹ استعمال کرنے کے نئے طریقے سیکھے اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق غیر آباد پہاڑی علاقے میں ان طریقوں کو آزمایا بھی۔ پہلے ہی روز میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا تھا اور اس پر مجاہد اول کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔

"کمال ہے طارنوش کہ تم نے ایک ہی دن میں مجھ سے سب کچھ سیکھ لیا۔ تمہارے اندر سیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔" مجاہد اول نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا "میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تمہیں عملی تجربے کے لیے تیار ہونے میں کم از کم تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"یہ سب آپ کی توجہ اور محبت کا اثر ہے۔" میں نے انکسار کا اظہار کیا۔

اس مختصر سی تربیت کے بعد مجاہد اول نے اسی ملاقات میں مجھے اصل مہم سے آگاہ کیا تھا "طارنوش! تمہاری اس تربیت کا مقصد علی گڑھ کے ایک قصبے جلالی کے قریب ایک عمارت کو تباہ کرنا ہے۔ اس مہم کے سربراہ تم ہو گے طارنوش! یہ خیال رکھنا کہ عمارت کے گرد سخت پہرا ہو گا اور پہرا دینے والے مسلح ہوں گے۔ تمہیں پہلے ان سے نمٹنا ہو گا۔ ان کی تعداد چار ہو گی اور وہ عمارت کی چاروں سمتوں میں متعین ہوں گے اور مجاہدین کی تعداد بھی تم سمیت چار ہی ہو گی۔ تم ان چاروں پر بہ یک وقت حملہ آور ہو گے۔ تین سرفروش جو تمہارے ساتھ ہوں گے' تمہارے ہر حکم کی پابندی کریں گے اور تمہاری مدد کریں گے۔ یہ مہم سر کرنے کے لیے تم کیا طریقہ اختیار کرو گے' یہ تمہیں خود سوچنا ہے تم کیا حکمت عملی اختیار کرو گے اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ آج سے پورے ایک ہفتے کے بعد رات کو ٹھیک بارہ بجے وہ عمارت اڑ جانا چاہیے۔" اسی کے ساتھ مجاہد اول نے تاکید کی "تمہیں اس طرح وہ عمارت تباہ کرنا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی پوری طرح محفوظ رہیں! تمام کارروائی اس طرح عمل میں آنا چاہیے کہ تم اور تمہارے ساتھی کسی کی نظر میں نہ آ سکیں۔"

اس مخصوص عمارت کو کیوں تباہ کرنا تھا' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دشمن پر کب اور کس طرح ضرب لگانا ہے' یہ مجاہد اول کی ذمے داری تھی جو ہمارا سربراہ تھا۔ ہم تو اس کے معمولی سپاہی تھے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے والے!

"طارنوش! تم یہ نہیں معلوم کرو گے کہ اس عمارت کو ہم کیوں تباہ کرنے والے ہیں؟" مجاہد اول نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"اے مجاہد اول! ہتھیار کبھی سوال نہیں کرتے۔ انہیں اس سے بھی کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ نشانے پر کون ہے! ان کا کام تو انگلی کے اشارے پر حرکت کرنا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو طارنوش! تم واقعی قوم کا اسلحہ ہو مگر دل و دماغ کے بھی مالک ہو۔ تمہیں بہرحال یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم جو قدم اٹھا رہے ہو اس کا مقصد کیا ہے! اس سے صحیح نتائج حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ تو سنو!" مجاہد اول نے کچھ دیر رک کر کہا "انگریز حکومت نے ایک خاص مقصد کے تحت ہندوستان کے تقریباً ہر ضلع میں اسلحہ اور گولہ بارود کے ڈپوز قائم کرنا شروع کیے ہیں۔ اس کا آغاز اس نے اسی صوبے یعنی یوپی سے کیا ہے۔ یہ اسلحہ ڈپوز ہر ضلع کے کسی دور دراز اور غیر آباد علاقوں میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے یوپی کے ابھی صرف چار ہی اضلاع میں یہ خفیہ اسلحہ ڈپوز قائم ہو سکے ہیں۔ ہم اگلے ہفتے ان چاروں اسلحہ ڈپوز کو بہ یک وقت ایک ہی روز اڑا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری اس کارروائی کا مقصد یہ ہے کہ ان چاروں اسلحہ ڈپوز کی تباہی کے بعد حکومت اپنے اس منصوبے کو ترک کر دے۔ ان اسلحہ ڈپوز کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر غلام قوم کبھی اور کسی مرحلے پر اپنے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اسے بہ آسانی اسلحہ کے زور پر دبایا جا سکے۔ انہی چاروں اسلحہ ڈپوز میں سے ایک کو تباہ کرنے کی ذمہ داری میں نے تمہیں سونپی ہے۔ سنو طارنوش! اب تک سارے ہندوستان میں ہماری سرگرمیاں بہت محدود اور مختصر پیمانے پر تھیں۔ یہ سب ایک بڑے مشن کا حصہ تھا۔ ان چاروں اسلحہ ڈپوز کی تباہی کا مطلب انگریزوں کے خلاف ہماری طرف سے اعلان جنگ ہو گا۔ اس کے بعد توڑ پھوڑ' آتش زنی اور سبوتاژ کی دوسری کارروائیاں شروع کی جائیں گی۔ امن و امان تہ و بالا کر دیا جائے گا۔ شدھی کی تحریک چلانے والے ظالم ہندوؤں سے ہم بھیانک انتقام لیں گے جو زبردستی مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے اپنے منصوبوں پر عمل کرنے والے ہیں۔ انگریز جو مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے جو مخصوص نظام مرتب کیا ہے' ہم اس میں رخنے ڈال دیں گے۔ مجھے خوشی ہے طارنوش کہ ہمارے اس بڑے مشن کی افتتاحی مہم میں جو سرفروش حصہ لے رہے ہیں تم بھی انہی میں سے ایک ہو اور اس مہم کے ایک حصے کی سربراہی کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر مجاہد اول خاموش ہو گیا غالباً اسے اب مزید کچھ نہیں کہنا تھا۔

"میرے ساتھ اس اہم مہم میں جو تین تنظیمی ساتھی ہوں گے وہ کون ہیں؟" میں نے دریافت کیا "ان کے نام۔"

"ان کا تعلق وسط ہند کے تین شہروں سے ہیں۔" مجاہد اول نے میری بات کاٹ کر کہا "ان کے نام ٹیپو' حیدر علی اور سراج الدولہ ہوں گے اور تم شاہین اول کے نام سے اس مہم میں شرکت کرو گے۔ چار شاہین' چار ضلعوں میں بہ یک وقت کارروائی کریں گے' بقیہ سربراہوں کے نام بھی شاہین دوم' سوم اور چہارم ہوں گے۔ تم اپنا اصلی نام کسی تنظیمی ساتھی کو نہیں بتاؤ گے۔" پھر مجاہد اول نے مزید بتایا "تمہارے نام ہی کی طرح تمہارے دوسرے تنظیمی ساتھیوں کے اصل نام

بھی راز ہی میں رہیں گے۔ وہ تینوں جیسا کہ میں نے بتایا مختلف علاقوں سے علی گڑھ پہنچیں گے۔ تم میں سے کوئی کسی کا اصلی نام پتا معلوم نہیں کرے گا۔ تم سب صرف مسلمان ہو' ہم مسلمان ہیں اور ہمارے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ ہم ہندوستان کے باشندے ہیں اور مسلمان ہیں۔ سارا ہندوستان اس کے شہر گاؤں اور قصبے سب ہمارے ہیں!"

"لیکن اے مجاہد اول' اس رازداری کا سبب؟" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"سبب یہ ہے طارنوش کہ ہم ابتدائی مراحل میں ہیں اور ذرا سی بھی بے احتیاطی اور غفلت ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہرچند کہ ہم اپنے تنظیمی ساتھیوں پر مکمل اعتماد کرتے ہیں پھر بھی محتاط رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک بھی میر جعفر سب کے لیے ملک الموت بن سکتا ہے۔ تم سب میرے نزدیک خالص سونا ہو اور وقت کی بھٹی میں پک کر تمہیں کندن بننا ہے۔ تمہیں آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرتے ہوئے ایثار' تعاون' رفاقت اور دوستی کی حدیں طے کرنا ہیں اور اعتماد کی حد تک پہنچنا ہے۔"

"اے مجاہد اول! کیا اس طرح ایک دوسرے کے لیے ہمارے دلوں کو شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوں گے؟ اور یوں کیا بے اعتمادی کی فضا پیدا نہیں ہو جائے گی؟"

میرے دل میں جو خدشات پیدا ہوئے تھے انہیں جان کر مجاہد اول نے مجھے سمجھایا "شکوک و شبہات اور بے اعتمادی کی فضا خود غرضی اور شخصی مفادات سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ رازداری ہمارے اجتماعی تحفظ کے لیے لازمی ہے۔ یہ نہ بھولو کہ ہمارے دشمن لامحدود وسائل کے مالک ہیں ہم ایک ظالم و غاصب حکومت سے ٹکر لے رہے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم کے لیے نبرد آزما ہیں جس میں ملت فروش بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ذرا غور کرو کہ اس مہم کے دوران میں کسی بھی مرحلے پر تمہارا کوئی ساتھی پکڑا جائے تو وہ اگر چاہے بھی تو جان بچانے کی خاطر اپنے بقیہ ساتھیوں کی نشان دہی کا اہل نہیں ہو گا کیوں کہ تم میں سے کوئی نہ کسی کا اصل نام جانتا ہو گا' نہ اسے یہ معلوم ہو گا کہ کس کا تعلق کون سے شہر سے ہے!"

"اور فرض کریں' ہم چاروں ہی ایک ساتھ زیر حراست میں آ گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں۔" مجاہد اول نے جواب دیا "تم چاروں مل کر ایک فوج کے برابر ہو۔ تمہیں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی تاکید ہے' ساتھ ہی یہ ہدایت بھی ہے کہ جب کوئی مفر کی راہ نہ ہو اور آخری گولی رہ جائے تو اس گولی سے خود کو نشانہ بنا لیا جائے۔"

"اور اگر کوئی ان ہدایات پر عمل نہ کرے؟" میں نے پوچھا۔

"بولو کیا تم میری ہدایات پر عمل کرنے سے گریز کرو گے؟" مجاہد اول نے کہا۔

"اپنی حد تک میں یقین دلا سکتا ہوں کہ جو کچھ مجھ سے کہا گیا ہے اسی پر عمل کروں گا۔" میں پُرعزم لہجے میں بولا۔

"یہی یقین تمہارے باقی ساتھیوں نے بھی مجھے دلایا ہے۔" مجاہد اول نے بتایا "مگر سنو! ہم بلا سبب کیوں کسی کی نیت پر شبہ کریں! ہم نے جو تنظیم بنائی ہے ایسی تنظیموں میں صرف وہی لوگ شرکت کرتے ہیں جو جان پر کھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ غداری کے امکانات بہ مشکل ایک فیصد کے جا سکتے ہیں اسی ایک فیصد کے لیے یہ ساری احتیاط ہے ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی آستین کے سانپوں سے بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

"آپ کا فرمانا قطعی درست ہے۔" میں عقیدت کے ساتھ بولا۔

"تمہیں بہرحال اس عمارت کو تباہ کرنا ہے۔ ہاتھ سے بنا ہوا یہ نقشہ اپنے پاس رکھ لو۔" مجاہد اول نے اپنے تھیلے سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا "اس نقشے میں اس عمارت کا محل وقوع موجود ہے۔ تمہیں جلالی کی طرف جانے والی عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک گاؤں دھنساری کی طرف سے جلالی کی جانب بڑھنا ہو گا۔ راستے ہی میں یہ عمارت پڑے گی۔ تمہیں عمارت تباہ کرنے کے لیے کیا کیا سامان چاہیے' اس کی آج ہی فہرست بنا لو' مگر اس سے پہلے تمہیں اپنے منصوبے کی تمام جزئیات پر اچھی طرح غور کرنا ہو گا۔ اچھا اب رات کو ملاقات ہو گی ملاقات کہاں ہو گی؟ تمہیں شام کو معلوم ہو جائے گا۔"

مجاہد اول کے اشارے پر میں اٹھ کھڑا۔ ایک بار پھر وہ آگے آگے چلنے لگا۔ پھر جب دور سے قصبے کی آبادی نظر آنے لگی تو وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا تھا اور نہ ہی میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ سارا دن میں نے منصوبہ بناتے ہوئے گزارا۔

رات کو میں نے اپنے میزبان وہاب کی ہدایت کے مطابق کمرے کا دروازہ کھلا رکھا۔ وہ شام ہی کو بتا چکا تھا کہ مجاہد اول خود مجھ سے ملنے آئے گا۔ میں اسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ آ گیا تو میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ

کیا۔ اس نے میرا منصوبہ سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور منصوبے کو منظور کر لیا۔ میں نے ضروری سامان کی فہرست اسے دے دی۔ کمرے کے باہر برآمدے میں روشنی تھی۔ اس نے وہاں جا کر میری فراہم کردہ فہرست کا مطالعہ کیا تو پھر سامان کی خریداری کے لیے رقم میرے حوالے کر دی۔ یہ سامان مجھے علی گڑھ جا کر خریدنا تھا۔ اسی ملاقات میں مجاہد اول نے مجھے بتایا کہ جس روز عمارت تباہ کرنا ہے' اس سے ایک دن قبل بعد نماز عصر علی گڑھ شہر کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے میرے تینوں تنظیمی ساتھی پہنچ جائیں گے۔ ان کی پہچان اس نے یہ بتائی تھی کہ وہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ہوں گے اور کالی شیروانیاں ان کے جسموں پر ہوں گی۔

نینی تال کے اس پہاڑی قصبے سے میں دوسرے دن صبح ہی علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ دوسرے ہی روز علی گڑھ آ کر میں نے ضروری سامان خرید لیا تھا۔

مقررہ دن عصر کی نماز میں نے شہر کی جامع مسجد میں پڑھی اور نماز پڑھ کر صدر دروازے سے باہر نکلا۔ سامنے ہی کوتوالی نظر آ رہی تھی جلد ہی وہ تینوں مجھے نظر آ گئے۔ شناختی جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد میں ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ تینوں ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی دن صبح ہم چاروں ایک یکے میں بیٹھ کر جلالی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

ہمیں سفر کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں نظر آنے لگیں۔ مجاہد اول کی ہدایت کے مطابق ہم جلالی جانے والے عام راستے سے ہٹ کر چل رہے تھے۔ ہمارا سفر جاری رہا اور ہم دوپہر ہونے سے کچھ پہلے اس گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے' جس کا نام دھنساری تھا۔ کھیتوں کے سلسلے شروع ہو گئے تھے اور کسان کھیتوں میں کام کرتے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ کچھ دیر سستانے کے لیے نیپو نے ایک کھیت کے کنارے جھاڑی کے پاس یکے کو روک لیا اور ہم اتر کر پیپل کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے آ بیٹھے۔ نیپو نے اس سے پہلے گھوڑے کے سامنے بالٹی میں دانہ رکھ دیا تھا۔ وہ پنکھا بھی چلا رہا تھا۔

اس درخت کے نیچے ہمیں بیٹھے دیکھ کر آس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے کسان بھی آ گئے۔ یوں بھی دوپہر ہو رہی تھی اور کھانے کا وقت تھا۔ ہم کھانا اور پانی ساتھ لے کر چلے تھے۔ حیدر علی نے گھاس پر کپڑا بچھا کر دستر خوان کھول لیا تھا کچھ کسان بھی اسی پیڑ کے نیچے اپنا اپنا کھانا لے کر آ بیٹھے تھے۔

قریب ہی بیٹھے ہوئے دو کسانوں میں سے ایک نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟

"جلالی" جواب میں نے دیا۔

پھر پوچھا گیا کہ کہاں سے آ رہے ہو تو میں نے یہ بھی بتا دیا اور بولا "آئیں آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں۔"

وہ دونوں بھولے بھالے کسان اپنا اپنا کھانا لے کر ہمارے پاس آ گئے اور پھر اردگرد بیٹھے ہوئے دوسرے کسان بھی میرے کہنے پر ساتھ آ بیٹھے اور ہم سب مل کر کھانا کھانے لگے مجھے اس میں بڑا مزہ آیا۔ کسانوں نے زبردستی ہمیں مکھن چپڑی میٹھی روٹیوں سے میٹھے رسیلے آم کھلائے۔ قریب ہی رہٹ کا جلترنگ سنائی دے رہا تھا۔

آس پاس کا منظر مجھے بہت حسین معلوم ہو رہا تھا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی چہکار بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ نرم ہوا کھڑی فصلوں کے پودوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس تمام ماحول میں امن و سکون تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے کسان ہم سے شہر کی خبریں پوچھ رہے تھے۔ خلافت تحریک کی گونج اس گاؤں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ان بیچاروں تک خبریں بہت دیر میں پہنچتی تھیں۔ ان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ تحریک خلافت کے سارے اہم رہنما گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ ایک کسان خیر محمد خلافت کے بارے میں مسلسل مجھ سے سوالات کیے جا رہا تھا۔ اس غریب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ترک عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید اب محض نام کا خلیفہ رہ گیا تھا۔ اس کی باگیں اب انگریزوں نے تھام رکھی تھیں۔ وہ اب مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کی بجائے انگریزوں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت کو منتشر کر دیا تھا۔ خیر محمد کو تو بس یہ خبر تھی کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی' خلیفہ کی مدد کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور لوگوں کو اس جہاد میں شریک ہونے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اس جہاد میں کامیابی کے بعد مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ پھر ہندوستان میں ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی ہو گی۔

خیر محمد کا بیٹا کرم دین بھی اس کے ساتھ تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ ایک موقع پر وہ بول پڑا "بابو جی! انگریزن سے کئی سے حکومت لیو گے؟"

"ہم انگریزوں سے ان کے ہتھیار چھین کر انہیں ہندوستان سے نکال دیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"جانت ہو بابو فر ہم کا کریں گے؟" کرم دین کے اس طفلانہ انداز پر میں نے انکار میں سر ہلا دیا تو وہ راز افشا کرنے

والے انداز میں کہنے لگا "پھر میں تو بابو کا لالہ مرلی دھر سسرے کو ماروں گا جان سے!" کرم دین نے دانت کچکچا کر اپنے عزم کا اظہار کیا۔

میں بھی اور میرے ساتھی بھی اس نو عمر بچے کی بات سن کر چونک اٹھے۔

"بک بک نا کرا ے کرمو!۔ خاموس رہو!" خیر محمد نے بیٹے کو جھڑک دیا۔

"کیا بات ہے خیر محمد؟" سراج الدولہ نے پوچھا "یہ لالہ مرلی دھر کون ہے؟"

"کوو کا بلادی!" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

ہم لوگوں کے اصرار و استفسار پر بہ مشکل خیر محمد نے بتایا کہ لالہ مرلی دھر کون تھا اور اس کا بیٹا 'لالو' کو کیوں مار ڈالنا چاہتا تھا۔

لالہ مرلی دھر قصبہ جلالی کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ وہ خیر محمد کی بہن پر بری نظر رکھتا تھا۔ اس نے خیر محمد کو لالچ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی بہن کی شادی اس سے کردے تو تمام قرض معاف کردے گا۔ خیر محمد نے اس کی پیشکش ٹھکرا دی تھی کہ وہ مسلمان ہے اور ہرگز اپنی بہن کی شادی ایک ہندو بنیئے سے نہیں کرے گا۔ لالہ مرلی دھر نے اس کا حل خیر محمد کو یہ بتایا تھا کہ وہ اپنے تمام خاندان کے ساتھ شدھی ہو جائے۔ شدھی ان مسلمانوں کو کہا جاتا تھا جنہیں روپے پیسے کا لالچ دے کر یا پھر دھونس دھمکی سے ہندو بنا لیا جاتا تھا۔ سارے ہندوستان میں سوامی شردھانند کی چلائی ہوئی شدھی تحریک کے تحت مسلمانوں پر یہ ظلم شروع ہو گیا تھا۔ خیر محمد اس پر بھی آمادہ نہ ہوا تو لالہ مرلی دھر نے ایک اور راہ نکالی۔ وہ خیر محمد سے بولا کہ اگر تم شدھی نہیں ہوتے تو میں اس پر بھی راضی ہوں کہ صرف تمہاری بہن کو شدھی بنا کر اس سے شادی کر لوں کیوں کہ میں اپنا دھرم "مذہب" نہیں چھوڑ سکتا۔ خیر محمد یہ سن کر غصے میں آ گیا اور لالہ مرلی دھر سے کہا ہم مسلمان ہیں، جان دے سکتے ہیں یہ پاپ ہم نا کریں گے! پھر خاصی گرما گرمی کے بعد لالہ مرلی دھر، خیر محمد کو دھمکیاں دے کر چلا گیا تھا۔

چند ہی روز بعد لالہ مرلی دھر نے غنڈوں کے ذریعے خیر محمد کی بہن کو اغوا کرالیا۔ خیر محمد نے بڑی کوشش کی مگر اس کی بہن کا کہیں پتا نہ چلا۔ کئی روز کے بعد لالہ ہی کے ایک آدمی سے خیر محمد کو ایک اندوہناک خبر ملی۔ اس آدمی نے بتایا کہ غنڈے خیر محمد کی بہن کو اغوا کر کے جلالی میں لالہ مرلی دھر کی حویلی میں لے گئے تھے مگر اس سے پہلے کہ لالہ مرلی دھر اپنا دست ہوس دراز کرتا خیر محمد کی بہن نے حویلی کے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔

غریب خیر محمد کسان کی ساری دکھ بھری داستان سننے کے بعد میں نے اسے تسلی دی "تم پروانہ کرو! ہو سکتا ہے کہ … تمہاری مدد کر سکیں۔ لالہ کا پتا بتاؤ!"

خیر محمد اپنا انتقام خود لینا چاہتا تھا مگر میرے اصرار پر ا… پتا بتانا ہی پڑا۔ شام تک ہم نے وہیں آرام کیا اور پھر چ… پڑے۔

فضا میں خاصا حبس بڑھ گیا تھا اور آسمان پر اب … بادل گھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں بجلی … لگی اور بادل گرجنے لگے پھر نم آلود ٹھنڈی ہوا چلنے لگی … کے تیور دیکھ کر نیپو فکر مند ہو گیا۔

"شاہین! بارش آ گئی تو؟" نیپو مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہمارا سفر پھر بھی جاری رہے گا۔ یہ موسم ہمارا را… نہیں روک سکتا۔ ہمیں ہر حال میں وقت مقررہ سے پہلے … منزل تک پہنچنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں شاہین!" نیپو نے کہا "میرا مطلب محض یہ تھا کہ بارش کی وجہ سے ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔"

"ہماری منزل یہاں سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ انشاء اللہ وقت سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر دیر ہو… کا خدشہ ہوا تو ہم رفتار بڑھا دیں گے۔"

کچھ ہی دیر کے بعد آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں میں اضافہ ہو گیا اور رہ رہ کر بجلی کوندنے لگی۔ سورج بالکل چھپ گیا اور ہر طرف اندھیرا سا پھیل گیا۔ ہوا کے جھکڑوں میں بھی شدت آ گئی۔ پھر موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں اور چند لمحوں بعد ہی موسلادھار بارش ہونے لگی۔ گٹھڑیوں میں بندھے ہوئے تھیلوں کو میں نے ایک بار پھ… احتیاط سے لپیٹا اور ان پر ترپال ڈال دیا۔

خدا خدا کر کے ہم وقت سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے کیوں کہ ہمیں اطراف کا جائزہ بھی لینا تھا۔ وہ جگہ بہرحال ہمارے لیے بالکل نئی تھی۔ ہم سے کچھ … فاصلے پر وہ مطلوبہ عمارت تھی جسے تباہ کرنا تھا۔

اگرچہ بارش نے ہماری راہ میں کافی مشکلات پیدا کر دی تھیں مگر ہم ہمت نہیں ہارے تھے۔ کچی سڑک کو بارش نے کیچڑ اور گارے میں تبدیل کر دیا تھا اور آدھے کوس کا فاصلہ بہت تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ یکے کے پہیے کیچڑ میں پھنس جاتے تھے ہمیں یہ فاصلہ اسی سبب پیادہ ہی طے کرنا پڑا تھا۔ یکے کی رفتار بہت کم رہ گئی تھی۔ گھوڑا بھی تھک چکا تھا۔ جہاں بھی یکے کے پہیے کیچڑ میں دھنس جاتے، ہم زور لگا کر یکے کو آگے بڑھاتے۔ آدھے کوس سفر کرنے کے بعد یکے کو ہم نے پکی سڑک پر ڈال دیا تھا۔ ہم نے احتیاط کے پیش نظر یہ کچا راستہ اختیار کیا تھا جو کچا بھی تھا اور بارش کی وجہ سے دشوار گزار بھی ہو گیا تھا۔ اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی اور تلاشیاں لے رہی تھی۔ پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والا تھا اس لیے حکومت کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ وہ کب آئے گا! ظاہر ہے کہ ہم ممکنہ تلاشی سے بچنا چاہتے تھے ہمارے پاس جو سامان تھا اس کی موجودگی میں ہم بہ آسانی پولیس کی گرفت میں آ سکتے تھے۔

نیپو نے میرے کہنے پر اسلحہ ڈپو سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے یکا روک لیا تھا۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو اس اندھیرے میں شگاف پڑ جاتا۔ نقشے کے مطابق ہمیں اسی پیڑ کے نیچے ٹھہر کر اپنے ایک ساتھی کا انتظار کرنا تھا وہ یکا لے کر چلا جاتا اور پھر ہم اپنی کارروائی کا آغاز کرتے۔

ہمیں وہاں ٹھہرے ہوئے تقریباً نصف گھنٹا ہوا تھا کہ اندھیرے کی چادر میں ایک متحرک ہیولا سا نظر پڑا۔ ذرا ہی دیر کے بعد ایک نوجوان یکے کے قریب آ گیا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی اس نے کہا "رات کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو صبح ضرور ہوتی ہے۔"

یہ ہمارا ساتھی تھا ہم جس کے منتظر تھے۔ اس نے جو جملہ ادا کیا تھا اس سے ہم نے اسے شناخت کر لیا تھا۔

"تو پھر اے ساتھی یکا لے جاؤ! یہ تمہیں منزل پر پہنچا دے گا۔" میں نے جواباً اپنی شناخت کے الفاظ ادا کیے۔

اس نوجوان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور یکے پر چڑھنے لگا۔ ہم نے یکے میں رکھی ہوئی چاروں گٹھریاں اٹھا لیں۔ ان گٹھریوں میں کینوس کے بڑے بڑے تھیلے بندھے ہوئے تھے۔ آنے والے ساتھی کو یکا لے کر چلے جانا تھا۔ اس نوجوان کو کہاں جانا تھا؟ اس سے ہمیں کوئی غرض نہ تھی۔ ہمیں تو اپنی مہم سر کرنے کے بعد آگے بڑھ جانا تھا۔ مجاہد اول نے جاں نثاروں کے اس گروہ کو اس طرح منظم کیا تھا کہ ہر فرد کو صرف اتنی ہی بات کا علم ہوتا تھا جتنی [illegible] سے متعلق ہوتی تھی۔ ہر مہم میں ساتھی بدل جاتے تھے۔ یہ بات مجھے خود مجاہد اول ہی نے بتائی تھی۔

وہ نوجوان یکا لے کر چلا گیا تو ہم گٹھریاں اپنے سروں پر رکھ کر درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کچھ دیر اسی جھنڈ میں رہے ابھی ہمارے پاس خاصا وقت تھا۔

بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی اور ایسے میں کوئی بھی باہر نکلنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہی موسم جو دن کے وقت اور شام کو ہمارے لیے پریشان کن تھا اس وقت معاون ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سراج الدولہ کو مخاطب کیا "ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ ایسے میں پہرے داروں کو ٹھکانے لگانے کا خطرہ بھی مول لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس موسلا دھار بارش میں وہ پہرا دینے باہر نہیں نکلیں گے اور عمارت کے اندر ہی رہیں گے۔"

"اور عمارت کے ساتھ ہی وہ بھی جہنم رسید ہو جائیں گے۔" حیدر علی بولا۔

"انشاء اللہ!" میں نے کہا پھر نیپو سے بولا کہ وہ ڈائنامائٹ اور اوزاروں کو تھیلوں سے نکال لے۔ اس عمارت کو اڑانے کے لیے اس کی چاروں دیواروں میں ڈائنامائٹ لگانا ضروری تھا۔ اپنے ساتھیوں کو میں نے ہدایت دی کہ وہ سڑک پر نظر رکھیں اور کوئی شخص ادھر آتا دکھائی دے تو منہ سے الو کی آواز نکال کر خطرے کا اشارہ کریں تاکہ ہم اپنی حفاظت کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہم سب نے بھرے ہوئے لمبی نال والے جرمن ریوالور بھی اپنے لباس میں چھپا لیے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو یہ تاکید بھی کی تھی کہ اگر چاروں پہرے داروں میں سے کوئی بھی باہر آئے تو اسے فوراً گولی مار دیں۔

ہم سب ایک ایک کر کے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر عمارت کی طرف بڑھے۔ اسی وقت بارش ہلکی ہو… لگتا تھا کہ بارش جلد ہی رک جائے گی اور یہ ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ بارش رکنے کی صورت میں ظاہر ہے کہ پہرے دار اس عمارت سے باہر آ جاتے۔

اب تو ہم درختوں کے جھنڈ سے باہر آ ہی گئے تھے اس لیے جو بھی ہوتا وہ بھگتنا پڑتا۔ ہم چاروں عمارت کی چاروں سمتوں میں پھیل گئے۔ عمارت کے سامنے والے رخ پر کیوں کہ زیادہ خطرہ تھا میں اسی لیے اس سمت بڑھا۔ اسی طرف عمارت کا صدر دروازہ تھا جس سے نکل کر پہرے دار باہر آ سکتے تھے۔ اس مہم میں بنیادی کام میں نے اپنے ذمے رکھا تھا۔ مجھے ہی اس عمارت کو ڈائنامائٹ کرنے کے لیے سوراخ بنانے کی مناسب جگہیں منتخب کرنا تھیں اور یہ … ایک تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے عمارت کی چاروں سمتوں … صرف … کام کرنا تھا۔

سامنے کے رخ آکر میں نے چند سیڑھیوں کے بعد ایک برآمدہ دیکھا' پھر میری نگاہ صدر دروازے پر پڑی۔ اس کے لوہے کے حصے میں شیشے لگے ہوئے تھے جن میں بجلی کی روشنی نظر آرہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ معاً مجھے ایک خیال آیا اور پھر میں جلد ہی پیٹ کے بل رینگتا ہوا پہلے برآمدے میں پہنچا اس کے بعد دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے باہر سے دروازے کی بھاری کنڈی لگادی اب اس عمارت میں موجود پہریدار باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اس اطمینان کے بعد میں نے اپنا کام شروع کردیا۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک میں اپنا کام ختم کرچکا تھا۔ صدر دروازے کے قریب بھی میں نے ڈائنامائٹ رکھ دیے تھے۔ اب صرف اتنا کام باقی تھا کہ فیتے کے تاروں کی لمبائی اس طرح رکھی جائے کہ تمام ڈائنامائٹ ایک ساتھ پھٹیں اور یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا۔

تمام کام ختم کرنے کے بعد جب میں اپنے ساتھیوں کو لے کر قریبی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا تو بارش بالکل رک چکی تھی۔ ابھی ہم چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ عقب سے اس طرح کی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ہم سبھی چونک اٹھے۔ میں سمجھ گیا کہ عمارت میں موجود پہریدار اب باہر نکلنا چاہتے ہیں۔

"یہ آوازیں کیسی ہیں؟" سراج الدولہ نے مجھ سے پوچھا۔

"پہریدار اپنے مشترکہ حجرے سے باہر نکلنے کے لیے عمارت کا صدر دروازہ پیٹ رہے ہیں جسے میں باہر سے بند کر آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اور اگر وہ عمارت کے تباہ ہونے سے پہلے دروازہ توڑ کر باہر آگئے تو؟" ٹیپو فکرمند لہجے میں بولا۔

"حل تو میں دیکھ چکا ہوں کہ دروازہ بہت مضبوط ہے' آسانی سے نہیں ٹوٹنے کا' پھر بھی اگر ایسا ہوا تو وہ ہماری گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے انہیں زندہ چھوڑ دینا بہرحال ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

مجاہد اول کی ہدایت کے مطابق اپنا کام ختم کرکے ہم سب کو الگ الگ ہوکر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا تھا۔ مجھے علی گڑھ واپس پہنچنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد ہمیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جانا تھا' لیکن میں نے کچھ اور فیصلہ کیا تھا۔ مجھے دھنساری گاؤں کے کسان خیر محمد سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ میں اسی لیے یہاں سے

جلدی جانا چاہتا تھا۔ نقشے کے مطابق قصبہ جلالی وہاں سے صرف ڈھائی تین میل کے فاصلے پر تھا اور میں پیدل چل کر بہ آسانی یہ فاصلہ طے کرسکتا تھا۔ جلالی پہنچ کر میں لالہ سکھ دھر سے خیر محمد کی معصوم و بے گناہ بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لالہ سکھ دھر سے کس طرح اور کیا انتقام لوں گا۔

"مجھے اب تم لوگوں کی مدد کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "تم لوگ اب اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہوسکتے ہو۔"

"اور آپ؟" ٹیپو نے سوال کیا۔

"میں یہاں سے جلالی جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

میرے تینوں ساتھی بھی شاید میری ہی طرح سوچ رہے تھے۔ ان تینوں ہی کے منہ سے بیک وقت لالہ سکھ دھر کا نام نکلا۔

"ہاں' میں اسی کی خاطر جلالی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر ہم بھی آپ ہی کے ساتھ چلیں گے۔" ٹیپو نے کہا۔

"نہیں' تم لوگ میرے ساتھ نہ چلو۔" میں بولا "مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا قدم اٹھاؤں گا! اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کیا کیا خطرات درپیش ہوں ... [illegible]"

وہ لوگ نہیں مانے اور مجھے ان کی بات ماننا ہی پڑی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ میرا ساتھ دیں گے۔

"شاہین! لالہ سکھ دھر کا معاملہ نمٹنے کے بعد ہی ہم اپنی اپنی منزلوں کی طرف واپس جائیں گے' اس سے پہلے نہیں۔" ٹیپو نے اپنے ... [illegible]

اب میرے لیے بحث کی گنجائش نہیں تھی "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "معلوم نہیں کہ اس مہم کے بعد پھر کبھی ملاقات ہوسکے یا نہیں' مگر میں یہ مختصری رفاقت کبھی نہیں بھول سکوں گا۔" میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

عمارت کا صدر دروازہ دھڑ دھڑانے کی آوازوں میں اب شدت آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اب عمارت میں موجود افراد دروازے کو توڑ دینا چاہتے ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ وہ لوگ بھی کتنے بدنصیب ہیں! انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کچھ ہی دیر بعد ان کے جسم چیتھڑے بن کر فضا میں بکھر جائیں گے ہم اس طرح چوکنا بیٹھے ہوئے تھے کہ عمارت کا صدر دروازہ ہماری نظر میں رہے۔ خدانخواستہ اگر وہ پہریدار دروازہ توڑ کر باہر آجائیں تو ہم انہیں گولیوں سے چھلنی

کردیں۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں چھوٹی سی ٹارچ جلا کر وقت دیکھا۔ ابھی بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہم نے اس دوران میں تھوڑے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور اس میں کینوس کے تین تھیلے دبا دیے۔ ہمارے پاس اب صرف ایک تھیلا تھا جس میں ہم سب کا ضروری سامان اور کپڑے تھے۔ برے کا سوراخ کرنے والا حصہ نکال کر میں نے بھی ایک جھاڑی کے پیچھے مٹی میں دبادیا۔ سوراخ کرنے والا حصہ میں نے تھیلے میں ڈال دیا تھا۔ سن کی موٹی رسی کے تین لچھے بھی جو باقی بچے تھے میں نے رکھ لیے۔

بارہ بجنے میں اب صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ ڈائنامائٹ کا فیتہ تین منٹ کا تھا یعنی فلیتے کے آگ پکڑنے کے ٹھیک تین منٹ بعد ڈائنامائٹ پھٹ جاتے۔ یوں اب سات منٹ باقی تھے' مگر یہ سات منٹ مجھے صدیوں پر محیط معلوم ہوئے۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ میری نظریں عمارت کے صدر دروازے پر جمی ہوئی تھیں کہ کہیں دروازہ توڑ کر مسلح پہریدار باہر نہ آجائیں۔ ریوالور کا رخ اسی طرف تھا۔ میری ہدایت پر میرے ساتھیوں نے بھی ریوالور نکال کر اسی طرف تان لیے تھے کیوں کہ دروازہ توڑے جانے کی آوازوں میں اب بڑی شدت آگئی تھی۔ پہریداروں کو یقیناً خطرے کا احساس ہوگیا تھا ظاہر ہے کہ اس ویرانے میں رات کے وقت باہر سے دروازہ بند کرنے والا ان کا کوئی دوست نہیں ہوسکتا تھا۔ جیسے جیسے کامیابی کے لمحات قریب آتے جارہے تھے' میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسی وقت اس صوبے کے مزید تین مقامات پر میرے کچھ اور ساتھی بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوں گے۔ انہیں بھی میری ہی طرح کسی عمارت کے اڑنے کا انتظار ہوگا۔ میرے لیے تو خیر یہ پہلی مہم تھی مگر شاید ان کے لیے ایسا نہ ہو۔ وہ غالباً میری طرح مضطرب نہیں ہوں گے' کم از کم اتنے مضطرب نہیں ہوں گے جتنا میں تھا۔ میری کیفیت اس طالب علم کی سی تھی جس نے پہلی بار امتحان دیا ہو اور نتیجے کا منتظر ہو۔ یہ مہم چھاپا مار کارروائیوں کا نقطۂ آغاز تھی۔ میں اسی لیے ہر قیمت پر اس کی کامیابی کا متمنی تھا۔

• طویل لمحے آخر کار بیت ہی گئے۔ میں نے فلیتوں کو آگ لگادی اور پھر تیزی کے ساتھ اس جگہ سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ خاصے فاصلے پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا فلیتے تیزی کے ساتھ سلگ رہے تھے اب صرف دو منٹ کی بات اور رہ گئی تھی۔

"سب کچھ ٹھیک ہے نا شاہین؟" ٹیپو نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "ہاں" پھر میں عمارت کی طرف دیکھنے لگا میں نے گھڑی دیکھی' دس سیکنڈ باقی تھے۔ بے اعتمادی کا وہ بڑا جاں گسل وقت تھا۔ عمارت اب تاریکی کے سبب نظر نہیں آرہی تھی میں دل ہی دل میں لمحوں کا شمار کرنے لگا' ایک۔ دو۔ تین۔

"دس!" میں بلند آواز میں بولا' مگر سب کچھ جوں کا توں تھا۔ عمارت ابھی تک اڑی نہیں تھی۔ فضا میں اس وقت مجھے پُراسرار سی خاموشی محسوس ہوئی۔ قبرستان کا سا سکوت ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کیا سارے ڈائنامائٹ ناقص تھے؟

"کیا بات ہے شاہین؟" شاید سراج الدولہ نے مجھے مخاطب کیا تھا "کیا کوئی خرابی ہوگئی؟"

ابھی میں کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور پھر فضا مسلسل دھماکوں سے گونج اٹھی۔ یقیناً عمارت اڑ چکی تھی اور اب اس کے اندر موجود گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کے گلے لگ گئے میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"مبارک ہو شاہین!" ٹیپو کی آواز شدتِ جذبات سے مرتعش سی تھی۔ ہم سبھی جذبات سے مغلوب تھے۔

"تم سب کو بھی مبارک ہو۔" میں نے جواباً کہا اور پھر میں وہیں سجدے میں گر گیا میرے تینوں ساتھیوں نے بھی میری تقلید کی۔

"شاہین!" حیدر علی مجھ سے مخاطب ہوا۔ ہم سب سجدے سے اٹھ چکے تھے "کیا ہم آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گے؟"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا ساتھیو!" میں نے دکھ بھری آواز میں کہا "مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے عبرت ناک انجام کے بعد نہ معلوم کتنے لوگ اسی سوال کے جواب کی امید میں اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ہم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آزادی سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ آزادی کا سورج کب طلوع ہوگا' مگر یہ یقین لازماً ہے کہ میں اس اطمینان کے ساتھ مروں گا میری زندگی بامقصد گزری ہے۔"

کچھ ہی دیر کے بعد ہم چاروں جلالی کے قصبے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

●●●

رات کے دو بجنے والے تھے۔ میں' ٹیپو اور سراج الدولہ

لالہ مرلی دھر کی حویلی کی چھت پر تھے۔ سراج الدولہ اور نیپو تو میرے ساتھ تھے اور حیدر علی نیچے اس کمرے میں ایک مسہری کے نیچے چھپا ہوا تھا جس میں دو نوجوان لڑکیاں سو رہی تھیں۔

جس وقت ہم اس حویلی کے سامنے پہنچے تھے تو لالہ کی کوٹھی کی بیٹھک میں خلاف توقع روشنی ہو رہی تھی۔ حویلی کے باہر تانگے، یکے اور بگھیاں کھڑی ہوئی تھیں یہ صورت حال دیکھ کر ہم حویلی کے عقبی حصے کی طرف آ گئے تھے۔ خیر محمد سے میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ حویلی کا پتا اور محل وقوع پوچھا تھا ورنہ اسے تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

حویلی کے عقبی حصے ہی میں احاطے کے اندر چھوٹا سا ایک مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے ساتھ ہی ایک کنواں بھی تھا شاید یہ وہی کنواں تھا جس میں کود کر خیر محمد کی بہن نے خودکشی کی تھی۔ احاطے میں باغ پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک درخت پر چڑھ کر ہم رسی کے ذریعے باغ میں اتر گئے تھے۔ سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا تھا کہ وہاں سے فرار کی راہ پیدا کر لی تھی۔ ہم نے عقبی دروازے کی کنڈی کھول دی تھی ہماری واپسی اسی کے ذریعے ہونا تھی۔

کچھ وقفے کے بعد بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف ایک جانب باورچی خانے میں روشنی تھی جس کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لیے زینہ تھا۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ باورچی خانے میں ایک بوڑھا اور بڑھیا بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ باغ میں اترتے ہی ہم نے اپنے چہرے رومالوں کے پیچھے چھپا لیے تھے۔ صرف ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اپنے جوتے ہاتھ میں لے کر ہم آہستہ قدمی کے ساتھ باورچی خانے کے برابر موجود زینے سے چھت پر آ گئے تھے۔ چھت پر پہنچ کر میں نے روشن دانوں کے ذریعے کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں دو نوجوان لڑکیاں سو رہی تھیں میرا اندازہ تھا کہ وہ دونوں لالہ مرلی دھر ہی کی بیٹیاں تھیں۔ ایک اور کمرے میں ادھیڑ عمر عورت خوابیدہ تھی اس کے برابر والی مسہری خالی تھی۔ یہ لالہ مرلی دھر کا کمرا لگتا تھا ادھیڑ عمر عورت لالہ کی بیوی ہو سکتی تھی۔

میں نے اس جائزے سے اندازہ لگایا کہ مہمانوں کو رخصت کر کے لالہ مرلی دھر کمروں کو اندر سے بند کر لے گا۔ ہمارے لیے اس سے مشکلات ہو سکتی تھیں۔ میں نے اسی لیے حیدر علی کو نیچے بھیجا تھا کہ وہ کسی کمرے میں چھپ جائے۔

نیپو اور سراج الدولہ کو چھت کے دو مختلف گوشوں میں چوکنا بیٹھنے کی ہدایت کر کے میں اس روشن دان کی طرف بڑھا جس سے بیٹھک میں جھانک سکتا تھا۔ بیٹھک کا جائزہ لے کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ادھر پہلے توجہ دینا چاہیے تھی وہاں ایک اہم اجلاس ہو رہا تھا اس اجلاس میں جلالی کے سرکردہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہندو غنڈے اور ہندو کوتوال بھی شرکت کر رہا تھا۔ جو باتیں میں نے سنیں ان سے معلوم ہوا کہ وہ یہ اجلاس شدھی تحریک کے سربراہ سوامی شردھانند کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے منعقد ہو رہا تھا۔ سوامی شردھانند نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کے لیے پورے ہندوستان میں تحریک شروع کر دی تھی۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ جو مسلمان ہندو نہ بنائے جا سکیں انہیں قتل کر دیا جائے اس مذموم مقصد کی خاطر ہندو سرمایہ داروں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔ تحریک پر عمل کرنے کے لیے ہندو غنڈوں اور ہندو طلبہ کو ساتھ ملا لیا گیا تھا۔ جلالی میں اس تحریک کا سربراہ لالہ مرلی دھر تھا اور خازن بھی وہی تھا۔ لالہ کے سامنے میز پر نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان گڈیوں میں سے اس نے دو گڈیاں اٹھا کر ایک شخص کو دے دیں۔

"یہ رکھو!" لالہ مرلی دھر نے اس شخص سے کہا "باقی رقم کام پورا ہونے کے بعد ادا کی جائے گی۔ تم تیاری کرو شمبھو!"

وہ شخص شمبھو صورت ہی سے غنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے لالہ سے پوچھا "بندوقیں کب ملیں گی؟"

لالہ مرلی دھر کی بجائے شمبھو کی بات کا جواب ہندو کوتوال نے دیا "کل رات یہیں سے تمہیں اسلحہ مل جائے گا۔"

"تو پھر اب میں چلتا ہوں۔" شمبھو بولا اور اٹھ کھڑا ہوا "جے رام جی کی!"

"رام بھلی کرے۔" لالہ مرلی دھر نے کہا۔ شمبھو بیٹھک کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ چار اور افراد بھی اٹھ کر چلے گئے۔ بیٹھک میں اب لالہ سمیت صرف چھ افراد رہ گئے تھے۔ لالہ مرلی دھر نے کوتوال کو مخاطب کیا "شرما جی! اس دھرم سینا (مذہبی فوج) کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"پروا ہی نہ کریں لالہ جی! یہ تو میرا فرض ہے۔" کوتوال شرما نے یقین دلایا۔

لالہ مرلی دھر نے ایک گڈی اٹھا کر کوتوال کی طرف بڑھا دی "یہ تمہاری خدمت کا صلہ ہے۔"

کوتوال نے نوٹوں کی گڈی لے کر شکریہ ادا کیا اور کھڑا ہو گیا "ہر چیز آپ کو کل فراہم کر دی جائے گی۔"

"دھرم سیوکو!" لالہ مرلی دھر نے کوتوال شرما کے جاتے ہی باقی رہ جانے والے چار افراد سے کہا "ابھی دس ہزار روپیا اور چاہیے۔ آپ کتنا اور دے سکتے ہیں؟"

جواب میں وہ چاروں ہندو سیٹھ اپنی اپنی کاروباری مشکلات کا رونا رونے لگے۔ پھر انہوں نے دو دو ہزار روپے دینے کی ہامی بھر لی۔ مگر اس سے پہلے لالہ مرلی دھر ان کے کام کرانے کا وعدہ کر چکا تھا ان میں سے دو کو سرکاری ٹھیکے درکار تھے۔ ایک کو ریلوے میں اپنے مال کی سپلائی کا پرمٹ مطلوب تھا اور دوسرے کو قریبی جنگلوں میں لکڑی کاٹنے کی اجازت چاہیے تھی۔ سارے معاملات طے پا گئے تو وہ چاروں بھی چلے گئے۔ دو دو ہزار میں انہوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ پن (ثواب) منافع میں تھا۔

"ہری!۔۔۔ چنکو!" لالہ مرلی دھر نے اپنے ملازمین کو آواز دی اور کہا "بند کرو!" یہ کہہ کر اس نے بیٹھک کا دروازہ بند کر دیا، پھر نوٹوں کی گڈیاں سمیٹ کر وہاں سے دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔

میرے سینے میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ اس کمینے شخص نے سوامی شردھانند کی ہدایت پر مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے یا انہیں راستے سے ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں اس منصوبے کو ناکام بنا دینا چاہتا تھا۔ اب مجھے لالہ سے دہرا حساب چکانا تھا۔

"دلاری!۔۔۔ شیامو!" لالہ مرلی دھر کی آواز پھر سنائی دی۔

"جی مالک!" باورچی خانے سے آوازیں آئیں۔

"جاؤ، سو جاؤ!" لالہ نے انہیں حکم دیا۔

میں نے روشن دان سے برابر والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ مرلی دھر دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف چلا اور اس کمرے کی بتی بھی بجھا دی۔ اب مرلی دھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کونے میں رکھی ہوئی تجوری کھولی۔ کھٹکے سے اس کی بیوی جاگ گئی۔

"سو جاؤ نا اب!" لالہ کی بیوی نے نیند میں ڈوبی آواز نکالی اور کروٹ لے لی۔

"ابھی سوتا ہوں۔" لالہ بولا اور تجوری میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ کر اسے بند کرنے کے بعد اپنی مسہری پر آ کے لیٹ گیا۔

کچھ ہی دیر میں حویلی کے اندر سناٹا پھیل گیا۔ لالہ مرلی دھر کے خراٹے ضرور سنائی دے رہے تھے۔

اس وقت تک میں نے اپنی مہم کی کامیابی پر خوش ہونے کی وجہ سے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ جذباتی اشتعال میں اب تک جو ہوا تھا، سو ہوا تھا لالہ مرلی دھر کو کیا سزا دی جائے یہ میں نہیں سوچ سکا تھا۔ اس کی نوجوان بیٹیوں کو اغوا کر لینا چاہیے میں نے سوچا، مگر پریشانی یہ تھی کہ انہیں یہاں سے کیسے اور کہاں لے جایا جائے؟ میں سوچتا رہا اور میرے ذہن میں ایک خاکہ بنتا گیا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی لالہ مرلی دھر کو سوئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا چھت سے میں نے حویلی کے پورے احاطے کو دیکھا تھا۔ مندر کے مقابل دوسری سمت ملازمین کے کوارٹرز تھے۔

"سنو نیپو! تم ملازمین کے کوارٹرز کے دروازوں کو باہر سے بند کر دو۔ پھر تم فوراً زینے پر آؤ، ہم وہیں تمہارا انتظار کریں گے۔"

نیپو چلا گیا تو میں نے ٹارچ کی روشنی کے ذریعے لڑکیوں کے کمرے میں چھپے ہوئے حیدر علی کو اشارہ کیا۔ وہ اشارہ ملتے ہی تیزی کے ساتھ مسہری کے نیچے سے نکل آیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں سراج الدولہ کے ساتھ زینے پر آ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد نیپو اپنا کام کر کے وہاں پہنچ گیا۔

"اب کیا کرنا ہے شاہین؟" سراج الدولہ نے سوال کیا۔

"پہلے ہم دونوں لڑکیوں کو قابو میں کریں گے۔" میں نے بتایا "ذرا ٹھہرو!" میں نے باورچی خانے کے دروازے کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں اندر پہنچ گیا۔ سبزی کاٹنے کی چھریاں میں نے وہاں سے اٹھا لیں۔ میں گولی چلا کر سارے محلے کو ادھر متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک کونے میں مجھے لکڑیاں پھاڑنے کی کلہاڑی رکھی ہوئی مل گئی۔ وہیں فرش پر گنڈاسا بھی پڑا مل گیا۔ میں نے دونوں چیزوں کو اپنے قبضے میں کر لیا اور باورچی خانے سے نکل آیا۔

ایک چھری میں نے اپنے پاس رکھی، ایک سراج الدولہ کو دے دی۔ اس وقت تک حیدر علی بھی ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ اسے میں نے گنڈاسا تھما دیا اور کلہاڑی نیپو کو دے دی۔

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" نیپو نے سرگوشی کی "گولی چلانا

یہاں خطرناک ہوتا۔"

"میری جگہ تم ہوتے تو یقیناً تم بھی یہی سوچتے۔" میں آہستہ سے بولا "ذمے دار آدمی کو محتاط اور چوکنا ہونا چاہیے۔"

اب ہم اپنی کارروائی کے لیے تیار تھے۔

"سنو!" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "پہلے ہمیں لڑکیوں کو قابو میں کرنا ہے۔ بہت خاموشی اور ہوشیاری کے ساتھ کہ کوئی آواز نہ ہو۔ میں اور نیپو ایک لڑکی کو سنبھالیں گے۔ سراج الدولہ اور تم حیدر علی، دوسری لڑکی کو قابو میں کرو گے۔ پہلے چادروں سے لڑکیوں کے منہ بند کرنا ہیں تاکہ وہ چیخ نہ سکیں۔ یہ کام میں اور نیپو کریں گے تم حیدر علی اور سراج الدولہ اسی وقت ان کی ٹانگوں کو پکڑ لو گے تاکہ وہ ٹانگیں نہ چلا سکیں اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ چھری کی نوک پر ان سے ہر حکم منوایا جاسکے گا۔"

پھر ہم لڑکیوں کے کمرے میں پہنچ گئے جس کا دروازہ حیدر علی کھول آیا تھا۔ ہم چاروں ہی ایک ساتھ ان پر حملہ آور ہوئے تھے اور وہ لڑکیاں بے بس ہوگئی تھیں۔ پھر میں نے اور نیپو نے ان کے گلوں پر چھریاں رکھ دی تھیں۔ دہشت سے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی اور یہ چھری۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گردن پر چھری کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

اس کے بعد دونوں کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا اور ان کے ہاتھ باندھنا مشکل نہ ہوا۔ ان لڑکیوں کو لے کر ہم لالہ مرلی دھر کے کمرے میں پہنچے۔ لالہ اور لالائن کو قابو میں کرنا بھی دشوار ثابت نہ ہوا۔ لالائن کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے۔ لالہ مرلی دھر کے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے مگر منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا "کیا چاہتے ہو بالکو؟"

"ہم تم سے اس بے گناہ مسلمان لڑکی کا بدلہ لینے آئے ہیں لالہ جس نے تمہاری حویلی کے کنویں میں کود کو جان دے دی تھی۔" میں نے جواب میں کہا "سنو لالہ! میں دھنساری کے خیر محمد کی بہن کا ذکر کررہا ہوں جسے تم شدھی کرکے اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے!" میں لالہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا وہ گھبرا کر اپنی بیوی اور بیٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر اندھیرے میں تیر چلایا "بولو لالہ! پچھلے مہینے تم نے شبھو اور اس کے ساتھی غنڈوں سے خیر محمد کی بہن کو اغوا نہیں کرایا تھا؟"

"وہ۔۔۔ وہ کمینہ شبھو خود ہی اسے اٹھا کر لایا تھا۔" لالہ نے کہا۔

"اور اغوا کرکے تمہیں دے گیا تھا تاکہ تم اس سے اپنی ہوس پوری کرلو! مجھے بتاؤ اس کی لاش کہاں ہے؟" یہ کہہ کر میں نے نیپو کو مخاطب کیا "اس کی تجوری خالی کردو!"

"یہ۔۔۔ یہ تم لوگ کیا کررہے ہو؟۔۔۔ تجوری تو خالی ہے۔۔۔ اور چابی بھی کہیں میں رکھ کر بھول گیا ہوں۔" لالہ گھبرا کر بولا۔

"جھوٹ نہ بول لالہ!" میں نے چھری سے اس کا کرتا پھاڑ دیا۔ خون کی بوندیں کرتے پر چھلک آئیں۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں مائی باپ!" لالہ کپکپانے لگا۔

ایک مرتبہ پھر میرا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ اس کے کرتے کی آستین رنگین ہوگئی۔ اس کے جھوٹ بولنے پر میرا خون کھول رہا تھا "مرلی دھر! تو ذلیل بھی ہے اور جھوٹا بھی!" میں نے "نیپو! سرہانے گدے کے نیچے سے چابیاں نکال لو!" میں نے مسہری کے سرہانے کی طرف اشارہ کیا۔

مرلی دھر کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ نیپو نے چابیاں نکال لیں اور تجوری کی طرف بڑھ گیا۔ مرلی دھر اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لالہ!" میں نے اس کے پیٹ پر چھری رکھ "بول! قاتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

"ہم۔۔۔ میں نے رام قسم کسی کو قتل نہیں کیا۔" خوف سے کانپنے لگا۔

"پوری تجوری خالی کردو نیپو! اب اس دولت کو صحیح صرف کیا جائے گا۔" میں نے نیپو کو مخاطب کیا جو نوٹوں کینوس کے تھیلے میں بھر رہا تھا۔ میرے کہنے پر اس تجوری میں رکھے ہوئے ڈبے کھول کر زیورات بھی تھیلے الٹنا شروع کردیے۔ میں ایک بار پھر مرلی دھر کی طرف متوجہ ہوگیا "ہاں لالہ! تو نے ابھی بتایا نہیں کہ قاتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

"رام قسم میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس نے خود کنویں میں چھلانگ لگائی تھی۔" لالہ مرلی دھر خوف کے سبب بہ مشکل بول رہا تھا۔

"کیوں چھلانگ لگائی تھی اس نے کنویں میں؟ یہ بتا لالہ!" میں غصے سے چیخ اٹھا۔ میرا خون کھول رہا تھا اور جی رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے کردوں۔ میں نے اپنے غصے کو کرنے کے لیے اس کے کان کی لو کھینچی اور چھری سے ا کاٹ دیا۔

لالہ نے چیخ ماری اور خون کی بوندیں اس کے کرتے گرنے لگیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نیپو نے تجوری

کردی تھی۔ دونوں لڑکیوں کی حالت خراب تھی اور لالہ کی بیوی بے ہوش ہوکر فرش پر گرچکی تھی۔

"تیری وجہ سے وہ کنویں میں کودی تھی لالہ! ایسی کر تو اس کی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ سن اب ہم تجھے بھی اسی کنویں میں دھکا دیں گے جو اس باعصمت لڑکی کی قبر بن گیا تھا مگر نہیں پہلے تو یہ بتا کہ اس کی لاش کہاں ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"بے۔۔۔ اسے شبھو نے ٹھکانے لگایا تھا۔" مرلی دھر نے گھبرا کر بتادیا۔

"حیدر علی! اس ملعون بڈھے کا منہ بھی بند کردو!"

"تم۔۔۔ تم آخر چاہتے۔۔۔ کیا ہو؟" لالہ نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"تجھے اسی کنویں میں دھکا دینا چاہتے ہیں!" میں نے جواب دیا۔

"نہیں!" لالہ التجا آمیز انداز میں چیخا "تم یہ پاپ نہیں کرسکتے۔ تم مسلمان ہو، یہ پاپ مت کرو!"

"اور تو نے جو کچھ کیا تھا وہ پاپ نہیں تھا؟" میں دہاڑا "حیدر علی! منہ باندھ دو اس کتے کا!"

پھر لالہ مرلی دھر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ حیدر علی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اسے سزا دینے کا ایک نیا منصوبہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔

"چل لالہ!" میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ حیدر علی اور سراج الدولہ کو میں نے دونوں لڑکیوں اور ان کی ماں کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ میں اور نیپو، لالہ کو دھکے دیتے ہوئے کنویں کی طرف چل دیے۔ ایک دو مرتبہ لالہ نے رکنے کی کوشش کی تھی، مگر چھری کے چرکوں نے اس کے کس بل نکال دیے تھے "سن لالہ!" میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا "ہم تیری لڑکیوں کو ساتھ لے جائیں گے پھر تجھے معلوم ہوگا کہ خیر محمد کے دل پر کیا گزری ہوگی!" بارش اب بھی ہورہی تھی۔ میری بات سن کر لالہ رک گیا تھا "چلتا رہ!" میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا "رک مت!" کنویں کے قریب پہنچ کر لالہ مرلی دھر بری طرح مچلنے لگا۔

"زیادہ پریشان نہ ہو لالہ! ہم تجھے کنویں میں دھکا نہیں دیں گے، صرف کنویں میں اتار دیں گے تاکہ تو خوب اچھی طرح اس مظلوم لڑکی کی قبر کو دیکھ لے۔ چل! ڈول میں کھڑا ہوجا!" میں نے چرخے کا ڈول اس کے سامنے کردیا۔ آخر کار اسے ڈول کے اندر کھڑا ہونا ہی پڑا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ اوپر کردیے اور رسی کو اس کے سر سے اونچا لے جاکر اس کے ہاتھ رسی سے باندھ دیے۔ اسی حالت میں ہم نے لالہ کو کنویں میں اتار دیا۔ اس کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور وہ ڈول میں کھڑا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی۔ پانی لالہ مرلی دھر کے شانوں تک تھا۔ رسی کو میں نے مضبوطی کے ساتھ چرخی سے باندھ دیا پھر کنویں میں منہ ڈال کر بولا "لالہ! اب تو سوچتا رہ کہ اس لڑکی نے کنویں میں کیسے جان دی ہوگی!" پھر میں نیپو کو ساتھ لیے اندر حویلی کے اس کمرے میں آگیا جہاں سے لالہ کو لے گیا تھا۔

لالہ کی بیوی ہوش میں آچکی تھی۔ اس نے اور لڑکیوں نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جسم ہچکیوں سے لرز رہا تھا میں نے ان آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔ وہ آنکھیں سوال کررہی تھیں کہ لالہ مرلی دھر کہاں ہے؟

"لالہ مرلی دھر۔۔۔ تیرا پاپی شوہر زندہ ہے لالائن!" میں نے بتایا "وہ کنویں میں لٹکا ہوا ہے۔ تجھے وہ صبح صحیح سلامت مل جائے گا۔ اس نے جو گناہ کیا ہے، یہ سزا اس کے لیے بہت معمولی ہے، مگر سن لالائن! تیری یہ دونوں جوان بیٹیاں ہمارے ساتھ جائیں گی۔"

ماں اور بیٹیوں نے زور زور سے انکار میں سر ہلائے۔ ان کے بند منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں ابھریں۔ لالائن بستر سے فرش پر گھٹنوں کے بل گری اور اپنا سر میرے پیروں میں رکھنا چاہا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"لالائن! تو سوچ سکتی ہے کہ اس بے گناہ اور مظلوم لڑکی پر اور اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی جسے لالہ مرلی دھر نے، تیرے پتی نے شبھو سے اغوا کرایا تھا!" میں نے کہا۔ منہ بندھے ہونے کے باوجود ان ماں بیٹیوں کے حلق سے رحم طلب آوازیں ابھرتی رہیں اور جسم ہچکیوں سے لرزتے رہے "سمجھ گئی لالائن! اپنے پتی کو بتادینا کہ آئندہ وہ ایسا پاپ نہ کرے، چلو لڑکیو!"

دونوں لڑکیوں اور ان کی ماں نے نفی میں سر ہلائے اور باری باری رحم طلب نظروں سے ہم چاروں کو دیکھا۔ نیپو اپنا تھیلا اٹھا چکا تھا۔

"چلو!" میں نے زور سے کہا۔

لڑکیوں نے پھر انکار میں سر ہلائے۔ ان کی ماں نے فرش پر سر مارنا شروع کردیا۔

"کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے، سمجھے! ورنہ میں گولی ماردوں گا!" ایک بھاری اور سخت آواز ابھری۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا "اے زنانو! ہاتھ اٹھاؤ!" اس شخص

نے پھر کہا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی "سب ہاتھ اٹھادو!"

یہ افتاد اچانک اور غیر متوقع تھی۔ میرے لیے یہ لمحات انتہائی نازک تھے۔ اگر میں اپنے وجود میں چھپی ہوئی پُراسرار قوتوں کے سبب بچ بھی جاتا تو میرے تینوں ساتھیوں کا کیا ہوتا؟ وہ کس طرح ایک یقینی موت سے بچتے؟ اس مہم کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے ان کی حفاظت کی ذمے داری مجاہد اول نے مجھ پر ڈالی تھی۔ ہم میں سے کسی کو ریوالور نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔



اس شخص کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ شمبھو تھا۔ اس کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے جیسے اگر ہم نے اس کے کہنے پر ہاتھ نہ اٹھائے تو واقعی وہ گولی ماردے گا۔ مجھے ابھی تک اپنے وجود میں کوئی غیر معمولی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مجبوراً میں نے ہاتھ اٹھادیے اور میرے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"تو یہ بات تھی! تم شیر کی کچھار میں اس سے شکار چھیننے آئے تھے!" شمبھو نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ کھلی ہوئی تجوری سامنے ہی نظر آرہی تھی۔ وہ درشت آواز میں بولا۔ "بتاؤ مال کہاں ہے؟"

"اس تھیلے میں ہے۔" میں نے کینوس کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا جو نیپو نے ہاتھ اٹھانے سے پہلے فرش پر رکھ دیا تھا۔

"اے لونڈیو!" شمبھو نے سختی سے کہا۔ "اپنی جگہ کھڑی رہو ورنہ۔" شمبھو نے بندوق کی نال ان کی طرف کردی۔ دونوں لڑکیاں سہم کر رک گئیں جو شاید شمبھو کی طرف مدد کے لیے بڑھ رہی تھیں۔ وہ زور زور سے سرہلانے لگیں مگر شمبھو ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ شمبھو لڑکیوں کی طرف سے مطمئن ہو کر پھر ہماری جانب متوجہ ہوگیا اور بولا۔ "اگر میں کچھ دیر اور نہ آتا تو بیٹا ہاتھ ہی صاف کر گئے تھے اپنے باپ کے مال پر!" یہ کہتے ہی وہ زور سے ہنسا۔ "چلو لاؤ ادھر تھیلا!"

"لیکن۔ لیکن شمبھو! تجھے تو لالہ نے رقم دے دی تھی۔" میں نے کہا۔ "پھر تو یہاں کیوں آیا ہے؟" میں اسے باتوں میں لگا کر اس افتاد سے بچنے کی کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔

"شمبھو مال کے لیے آیا ہے اس مال کے لیے جو تم نے سمیٹ لیا ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"مگر تم تو لالہ مرلی دھر کے خاص آدمی ہو۔ تمہیں تو کل بندوقیں ملنے والی ہیں۔" میں پھر بولا۔

"میں کسی کا خاص آدمی نہیں ہوں بیٹا!" شمبھو کی آواز میں تمسخر تھا۔ "شمبھو صرف بدمعاش ہے چور ہے! شمبھو کو بس مال چاہیے۔"

"اور ان بندوقوں کا کیا ہوگا جو کل تمہیں ملیں گی؟ اس کام کا کیا بنے گا جو لالہ نے تمہیں بتایا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ زور سے ہنس پڑا پھر بولا۔ "لالہ نے کہا تھا یہ دھرم کی سیوا ہے دھرم کی سیوا! (دین کی خدمت) اپنا دھرم تو بس مایا ہے بیٹا مسلمانوں کو مار کر ہمیں شدھی بنا کر مجھے یہ مال تو نہیں مل سکتا تھا!"

"تو پھر۔ پھر۔"

"زیادہ باتیں مت بناؤ!" شمبھو نے میری بات زوردار آواز میں کاٹ دی۔ "تھیلا ادھر لاؤ!" یہ کہہ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے اشارے پر نیپو نے جھک کر تھیلا اٹھایا۔ دونوں لڑکیوں نے پھر اپنے سر کو زور زور سے ہلایا۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ان کی ماں فرش پر بیٹھی شمبھو کو اشارے سے کچھ بتانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"کیوں بار بار منڈیا ہلا رہی ہے!" شمبھو خفگی سے بولا۔ "میں یہاں کسی کی مدد کرنے یا فریاد سننے نہیں آیا" مجھی کہ نہیں!" شمبھو نے ایک قدم اور پیچھے ہٹایا "ادھر لاؤ! دروازے کے باہر!" یہ کہہ کر وہ ہمیں بندوق کی زد پر لیے اور پیچھے ہٹا۔ اب وہ دروازے کے باہر تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب شمبھو نے اپنا سر دروازے سے باہر نکالا "ٹھک" کی ایک زوردار آواز ہوئی۔ شمبھو کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ تینوں ماں بیٹیاں بے تحاشا چیخی تھیں مگر ان کی چیخیں حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ ہم چاروں نے غیر شعوری طور پر اپنے ہاتھ نیچے گرا کر ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ ہمارے علم میں نہیں تھا مگر جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہمارے منصوبے کے برعکس تھا اور ہمارے لیے خطرناک بھی!

پھر اس سے پہلے کہ ہم کوئی قدم اٹھاتے کمرے کے باہر سے آواز آئی۔ "جو سال بھی گزرتا ہے سروں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔"

"اور یہی سروں کے مینار ہماری منزل کا نشان ہیں۔" کسی نامعلوم شخص کے شناختی جملے کے جواب میں میں نے بھی شناختی الفاظ ادا کیے۔ یہ دونوں ہی جملے ہماری تنظیم کے شناختی کوڈ ورڈز تھے۔ یہ کوڈ ورڈز تبدیل بھی ہوتے رہتے تھے۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔ میرے تینوں ساتھیوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔

ہمارا نیا ساتھی اب دروازے میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور ہماری ہی طرح اس کا چہرہ بھی ایک نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے فرش پر پڑی ہوئی شمبھو کی بندوق اٹھائی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! ادھر آؤ۔" نو وارد کے کپڑے بارش میں تر تھے اور سر سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ شمبھو کے جسم کو پھلانگتے ہوئے میں نے اس پر نظر ڈالی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں بولا۔ "کہیں یہ مر تو نہیں گیا؟"

"زندہ بھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے!" آنے والے نے کہا۔ اس وقت ہم دوسرے کمرے کے وسط میں تھے۔ "سنو شاہین! باہر باغ کی سمت پچھلی طرف دروازے کے قریب دو تانگے کھڑے ہیں تم ان میں بیٹھ جاؤ وہ تمہیں جہاں بھی لے جائیں چلے جانا! جلدی کرو!"

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم یہاں ہیں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"وقت ضائع نہ کرو جلدی کرو!" ہمارے نئے ساتھی نے کہا۔ "تمہارے یہاں سے جانے کے پانچ منٹ بعد میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔ جلدی کرو!"

مزید کچھ کہے سنے بغیر میں کمرے میں واپس آگیا۔ "سراج الدولہ! ان تینوں کے پیر باندھ دو!" میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

اس عورت نے بڑی جدوجہد کی مگر بے سود ہی سراج الدولہ نے اس کے ہاتھ پیر ایک منٹ کے اندر باندھ دیے تھے۔

"نیپو! تھیلا اٹھاؤ ہم چل رہے ہیں۔ ہمارا نیا ساتھی ہمارے لیے تانگے لے آیا ہے۔" میں نے کہا نیپو نے تھیلا اٹھالیا۔ "حیدر علی! سراج الدولہ! لڑکیوں کو لے چلو!"

لڑکیوں اور ان کی ماں نے پھر مچلنا شروع کردیا۔ وہ یقیناً چیخ رہی ہوں گی۔ ان کے بندھے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں زور زور سے انکار میں سرہلا رہی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے چہرے کی جلد تنی ہوئی تھی آنکھوں میں التجا تھی رحم کی بھیک تھی۔ انہیں بہرحال یہ معلوم تھا کہ ان کو اغوا کرکے لے جایا جارہا ہے۔ ان کے ساتھ پھر کیا سلوک ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان کا تڑپنا مچلنا اور انکار کرنا فطری امر تھا۔

"لڑکیو!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "تم سے ہمیں کوئی دشمنی نہیں مگر تمہارے باپ نے ہماری ایک بہن کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا اور اسے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہم تمہیں اس لیے ساتھ لے جارہے ہیں کہ تمہارے ماں باپ کو بھی معلوم ہو کہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے والوں کے گھروں میں بھی آگ لگ سکتی ہے۔ ہاں میں تمہیں یہ یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ تم ہمارے پاس قطعی محفوظ رہو گی۔ ہم تمہارے باپ کی طرح ذلیل نہیں ہیں کہ تمہاری عزت لوٹ کر اپنا دامن گناہوں سے آلودہ کریں۔ انہیں لے چلو!" آخری الفاظ حیدر علی اور سراج الدولہ کی طرف دیکھ کر کہے۔ اس پر بھی لڑکیاں مچلیں تو میں سخت لہجے میں بولا۔ "لڑکیو! ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو! سنو! اب اگر یہ نہ مانیں تو انہیں زبردستی۔" میں نے دھمکی دینے کے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ لڑکیوں پر اس کا خاصا اثر ہوا۔ وہ سہمی ہوئی نظر آنے لگیں۔

احتیاطاً دونوں لڑکیوں کے پیر باندھ دیے گئے۔ یہ تجویز نیپو نے پیش کی تھی جسے میں نے قبول کرلیا تھا۔ پیر باندھنے کے بعد سراج الدولہ اور حیدر علی نے ایک ایک لڑکی کو اٹھالیا۔ اس عرصے میں ہمارا نیا ساتھی دروازے سے شمبھو کو ہٹا چکا تھا۔

"خدا حافظ ساتھی!" میں آخر میں کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔

"خدا حافظ!" نئے ساتھی نے کہا۔ "ہاں تم سب پیچھے ہی بیٹھنا۔" اس نے آخری ہدایت دی اور ہم کمرے سے باہر آگئے۔

بارش ابھی تک نہیں رکی تھی۔ سارا معاملہ بہ خیر و خوبی انجام پاگیا تھا۔ سب سے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ہمیں جلالی ہی میں جائے پناہ مل گئی تھی ایسی جائے پناہ جو ہماری ہی تنظیم کے افراد فراہم کر رہے تھے۔

میرے ذہن میں اس وقت کئی سوالات تھے اور سب سے پہلا سوال اپنے اندر پوشیدہ پراسرار قوتوں سے متعلق تھا۔ میری زندگی واضح طور پر خطرے میں پڑ گئی تھی مگر آج پہلی بار خودکار حفاظتی نظام حرکت میں نہیں آیا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کیا میری مددگار قوتیں عین اس وقت حرکت میں آتیں جب آخری لمحات قریب آجاتے؟ یہ تو انتہائی خطرے کی بات تھی زندگی داؤ پر لگانے والی بات! اپنے وجود سے قطع نظر جو اہم سوال میرے پیش نظر تھا وہ یہ

تھا کہ ہماری تنظیم کو کس طرح یہ معلوم ہو گیا کہ ہم اس وقت لالہ مرلی دھر کی حویلی میں ہیں؟ جب کہ تنظیم کے طریقۂ کار کے مطابق ہماری مہم خفیہ تھی۔ ہم چاروں افراد کے سوا کسی کو اس کا علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کسی طرح علم ہو بھی جاتا تو اصل منصوبے کے مطابق ہمیں اس وقت جلالی میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں تو اپنی مہم سر کر کے اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم لالہ مرلی دھر کی حویلی کے عقبی دروازے سے باہر آ چکے تھے وہاں ہمارے نئے ساتھی کے کہنے کے مطابق دو تانگے کھڑے تھے۔ تانگوں پر چادروں سے پردے باندھ دیے گئے تھے۔ میں اس وقت یہ سمجھ سکا کہ ہمارے نئے ساتھی نے ہمیں پیچھے بیٹھنے کی ہدایت کیوں کی تھی۔ اس طرح ہم محفوظ انداز میں جلالی کی سڑکوں سے گزر سکتے تھے۔ نیچو اور سراج الدولہ ایک لڑکی کو ساتھ لے کر پیچھے والے تانگے میں بیٹھے۔ میں اور حیدر علی دوسری لڑکی کے ساتھ آگے والے تانگے میں سوار ہوئے تھے۔ تانگے والوں نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی تانگے چل پڑے۔ تانگوں میں بیٹھنے سے قبل ہم نے دونوں لڑکیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ تانگے معمول کے مطابق رفتار سے بڑھتے رہے۔ بارش اب بھی جاری تھی اور پانی تانگے کی چھت سے ٹپک کر اندر آ رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہمارا یہ سفر ختم ہوا۔ تانگے ایک گلی میں رکے تھے۔ میں نے لڑکی کے پیروں کی رسی کھول دی۔ میں نے چادر ہٹائی تو سامنے ہی ایک ڈیوڑھی کا کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اسی وقت ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر تارچ کی روشنی پڑی۔ ہم تینوں تانگے سے اتر کر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ تارچ پھر بجھ گئی۔ دروازے کے آگے صحن تھا اور وہاں کہیں سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے اس شخص کو دیکھنا چاہا جس نے تارچ روشن کی تھی۔

"اندر چلے جاؤ!" مجاہد اوّل کی سرد اور سخت آواز ابھری۔

مجاہد اوّل کی آواز سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوف کی ایک لہر بھی میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کی آواز سے واضح طور پر برہمی و ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب سے پہلے اس سے میری جو ملاقاتیں ہوئی تھیں اس نے مجھ سے ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ جس وقت ہم تینوں آگے پیچھے صحن سے گزر رہے تھے دوسرا تانگا دروازے پر آ لگا۔ ہم بارش میں بھیگتے ہوئے دائیں جانب بڑھے جہاں ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کمرے کے سوا پورے مکان میں اندھیرا اور خاموشی تھی۔

ذرا ہی دیر کے بعد نیچو اور سراج الدولہ بھی آ گئے۔ نیچو کے کاندھے پر کینوس کا تھیلا تھا اور سراج الدولہ نے لڑکی کو اٹھا رکھا تھا۔ اگر اس نے بھی میری طرح لڑکی کے پیر کھول دیے ہوتے تو کم از کم اس مکان کے دروازے سے کمرے تک لڑکی کو لاد کر نہ لانا پڑتا۔ نیچو نے تھیلا ایک طرف رکھ دیا۔ سراج الدولہ نے اس عرصے میں لڑکی کو ایک مونڈھے پر بٹھا کر اس کی ٹانگیں کھول دیں۔ اس کمرے میں مختصر سا سامان تھا۔ کئی مونڈھے ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک سمت کونے میں میز پڑی ہوئی تھی جس پر لیمپ رکھا تھا۔ ایک کونے میں تپائی پر صراحی اور گلاس بھی موجود تھا۔ ہمارے چہرے اب بھی چھپے ہوئے تھے۔ حیدر علی نے چہرے پر بندھا ہوا رومال ہٹانا چاہا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک لیا۔ "ابھی نہیں ذرا صبر کرو!"

پھر میں نے اور نیچو نے لڑکیوں کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دیں۔ ان کے ہاتھ اور منہ بھی کھول دیے۔ حیرے کہنے پر نیچو نے تھیلے سے دو چادریں نکال کر انہیں دے دیں۔ ان کی ساریاں بھیگ جانے کی وجہ سے جسم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ دوسری چادروں سے ہم سب ساتھیوں نے سر اور منہ ہاتھ خشک کیے۔ لڑکیاں چادریں اوڑھ کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ ان کے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ سارے مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے ہمارے سوا وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کمرے سے نکل کر باہر کا جائزہ لوں مگر وہاں مجاہد اوّل کی موجودگی کے سبب میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہ لمحے میرے لیے خاصے پریشان کن تھے۔ اسلحہ ڈپو کی تباہی کے بعد میں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ منصوبے کے مطابق نہیں تھا۔ مجاہد اوّل کی واضح ہدایت یہ تھی کہ کسی بھی صورت میں اور کسی بھی مرحلے پر ہمیں اپنے منصوبے کے خلاف قدم نہیں اٹھانا ہے۔ میری پریشانی کی وجہ یہی تھی۔ اچانک کمرے کے باہر مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کسی کے قدموں کی ہلکی چاپ سنائی دے رہی تھی مگر وہ جو کوئی بھی تھا ہمارے کمرے کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔ پھر کچھ فاصلے پر چرچراہٹ سی ابھری۔ شاید یہ آواز کوئی دروازہ کھلنے کی تھی۔ سناٹے اور بارش کے مسلسل شور میں یہ آوازیں بڑی پراسرار محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟" ایک لڑکی نے سوال کیا جو بڑی بہن معلوم ہوتی تھی۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام شاہین ہے۔" میں نے بتایا "یہاں تمہیں لانے کی وجہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"ہمارے ساتھ تم کیا سلوک کرو گے؟" اس لڑکی نے پھر دریافت کیا۔

"وہی سلوک کریں گے جو کسی مہمان سے کیا جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یقین کرو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک ہرگز نہیں کریں گے جو تمہارے ہوس کار باپ نے اس معصوم لڑکی سے کیا تھا۔"

"وہ لڑکی کون تھی؟" اس نے پوچھا۔

"ایک مسلمان لڑکی تھی وہ!۔ کیا تمہیں نہیں معلوم؟ اس نے تمہاری ہی حویلی کے کنویں میں تو کود کر خودکشی کی تھی۔ تمہیں اور تمہاری ماں کو اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا؟"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں!۔ باپو ایسا پاپ ہرگز نہیں کر سکتے! تم جھوٹ بول رہے ہو؟"

"تم اپنے گھر واپس جاؤ تو اپنے باپو سے پوچھ لینا۔ اس کا جواب تمہیں وہی دے سکتا ہے۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"تو کیا۔ کیا تم ہمیں چھوڑ دو گے؟۔ ہمیں ہمارے گھر جانے دو گے؟" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔

"ابھی تک یہی ارادہ ہے ورنہ ہم بھی زبردستی تمہیں مسلمان بنا کر کسی بوڑھے کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دے سکتے تھے مگر ہمارے مذہب میں زبردستی کسی کو اس کے مذہب سے اپنے مذہب میں داخل کرنا گناہ ہے۔ میں اور میرے ساتھی لالہ مرلی دھر نہیں کہ تم اپنی عزت بچانے کے لیے خودکشی پر مجبور ہو جاؤ۔"

"تم۔" اس لڑکی نے کچھ کہنا چاہا۔ اسی وقت برآمدے میں تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی اور لڑکی چپ ہو گئی۔ ایک نوجوان جس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا کمرے میں آ گیا۔ ہم سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔

"شاہین!" اس نے دروازے کے قریب ہی رکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "میرے ساتھ آئیے!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں فوراً ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ میں مجاہد اوّل سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اسی نے بلوایا ہو گا۔ میں جس وقت کمرے سے نکلا وہ شخص اسی قطار میں بنے ہوئے آخری کمرے کے دروازے تک جا پہنچا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور اپنے پیچھے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے مجھے آتا دیکھا تو آخری کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کمرے میں پہنچ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں مجاہد اوّل ہو گا مگر وہاں اس اجنبی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ کمرے میں فرش پر چار بستر لگے ہوئے تھے۔

"ساتھی! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت اس کے سوا کچھ اور انتظام نہیں ہو سکا۔" نوجوان شخص نے مجھ سے کہا۔ "اس بکس میں چار جوڑے کپڑے موجود ہیں۔ آپ لوگ کپڑے بدل لیں۔ آپ لوگ خاصے بھیگ چکے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"مجاہد اوّل کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کپڑے تبدیل کر لیں۔" وہ بولا۔ "ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں ساتھی!" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے تیتو میر کہہ سکتے ہیں۔" اس نوجوان نے اپنا نام بتایا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی فرضی نام تھا۔

"ساتھی تیتو میر! مجھے مجاہد اوّل سے فوراً ملوا دو۔ میں انہیں اہم اور ضروری باتیں بتانا چاہتا ہوں۔" میں نے اصرار کیا۔

"میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ جلدی مجاہد اوّل سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔" تیتو میر کا ٹھنڈا مزاج مجھے مشتعل کر رہا تھا۔ "مجاہد اوّل خود بھی آپ سے جلد از جلد ملنے کے مشتاق ہیں۔ آپ لباس تو تبدیل کر لیجیے!"

"پہلے ان دونوں لڑکیوں کے لیے لباس کا بندوبست کر دیں۔ وہ بھی بھیگی ہوئی ہیں۔" میں بولا۔

"اس کا بندوبست ہو رہا ہے۔" تیتو میر نے بتایا۔ "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آپ اپنے ساتھ لڑکیوں کو بھی لے کر آ رہے ہیں تو ان کے لباس بھی تیار رکھتے اور بستر بھی! صرف چند منٹ میں ان لڑکیوں کے لیے لباس کا انتظام ہو جائے گا۔"

"اس ساتھی کا نام کیا ہے جس نے لالہ مرلی دھر کی حویلی میں ہماری مدد کی تھی؟" میں نے تیتو میر سے دریافت کیا۔

"معاف کیجیے کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ مجھے صرف آپ لوگوں کی میزبانی سونپی گئی ہے۔ کون ساتھی کیا کر رہا ہے مجھے خبر نہیں۔" تیتو میر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"مجھے تم یہ بتاؤ کہ مجاہد اوّل کہاں ہیں؟" میں جھلا گیا۔ "تم نہیں بتاؤ گے تو میں انہیں خود تلاش کر لوں گا۔"

"فضول باتوں میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں۔" تیتو میر نے پرسکون آواز میں مجھے مشورہ دیا۔

میں اب اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس سے کچھ معلوم کرنا ناممکن ہے۔ کچھ سوچ کر میں بولا۔ "ٹھیک ہے میں کپڑے بدل لیتا ہوں۔"

"اسی وقت چھت پر تین بار دھماکے ہوئے۔ تیتو میر نے مجھ سے کہا۔ "آپ لباس تبدیل کریں۔ شاید لڑکیوں کے لباس اور بستر آگئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اسے صحن عبور کرکے ڈیوڑھی کی طرف جاتے دیکھا۔

میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ یہ غالباً دو منزلہ مکان تھا اور اوپری منزل پر جانے والا زینہ شاید ڈیوڑھی ہی میں ہوگا۔ میں جلدی جلدی لباس تبدیل کرتے ہوئے سوچ رہا تھا اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ مجاہد اوّل اس وقت اوپری منزل ہی پر ہوگا۔ میں لباس تبدیل کرچکا تھا کہ تیتو میر کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا اور سر پر ایک موٹا سا ہولڈال تھا جس میں یقیناً بستر تھے۔

"لیجیے لڑکیوں کا بندوبست بھی ہوگیا۔" تیتو میر نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ خوامخواہ ان کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔" اسی دوران میں اس نے ہولڈال اور تھیلا فرش پر رکھ دیا تھا۔ "کیا آپ ان لڑکیوں کا لباس بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تیتو میر! تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں یہ سمجھا تھا کہ تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ میرے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرکے صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لڑکیوں کے سونے کا انتظام کہاں ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اور آپ کے ساتھی اسی کمرے میں آرام کریں گے۔" تیتو میر نے میرے سوال کی نوعیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

"یار! میں لڑکیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ انہیں اپنے ساتھ نہیں سلائیں گے۔" اس کے جواب میں پھر شرارت شامل ہوگئی تھی۔

"یار تم مجاہد ہو کہ توتا کہانی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا۔

"جناب! آپ ہمارے مہمان ہیں بلکہ مہمان عزیز! اس لیے آپ جو کہیں سر آنکھوں پر! بہرحال ان کے سونے سلانے کا انتظام ہمارا مسئلہ ہے۔ وہ آپ ایسے مہمانوں کی مہمان ہیں۔ ان کی خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے۔" تیتو میر خوشگوار لہجے میں بولا۔

"شکریہ ساتھی تیتو میر!" میں نے کہا۔ "میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے آرام اور دیکھ بھال کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ تنظیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور آپ کی وجہ سے وہ ہماری ذمے داری بن گئی ہیں۔" تیتو میر کے لہجے میں شوخی تھی۔ "ویسے آپ کی تسلی اور اطمینان کے لیے میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ برابر والے کمرے ہی میں ان کے سونے کا انتظام کیا گیا ہے۔ آیئے دیکھ لیجیے!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

برابر والا کمرا تقریباً اتنا ہی بڑا تھا البتہ اس میں ایک بڑی سی مسہری موجود تھی۔ مسہری پر کوئی گدا یا چادر نہیں تھی۔ میں نے موم بتی کی روشنی میں اس کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ موم بتی وہیں تھی جسے تیتو میر نے روشن کردیا تھا۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔

"جی ہاں! مسہری خاصی بڑی ہے۔ اس پر تین افراد بھی بہ آسانی سو سکتے ہیں۔" تیتو میر نے پھر خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

میرے ساتھی لباس تبدیل کرچکے تھے۔ لڑکیوں کو برابر والے کمرے میں سونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا مگر مصیبت یہ کھڑی ہوگئی کہ وہ دونوں ہی اپنے بھیگے ہوئے لباس تبدیل کرنے پر راضی نہیں تھیں۔ سب ہی ساتھی انہیں باری باری سمجھا چکے تھے کہ بھیگے کپڑوں میں سونے سے ان کی طبیعت خراب ہوجائے گی۔ مسلسل بارش کی وجہ سے خنکی میں اضافہ ہوگیا تھا اور وہ دونوں ہی بڑی نازک جسموں کی مالک تھیں۔ میں نے انہیں ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہم کہہ چکے ہیں کہ کپڑے نہیں بدلیں گے۔" بڑی بہن بولی۔ "سمجھے تم!"

"آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہو اس کی!" میں نے پوچھا۔

"بس مرضی ہماری!" وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

"ٹھیک ہے۔" تیتو میر نے مجھے آنکھ ماری۔ "شاہین! پھر تو مجبوراً خود ہمیں ہی ان کے لباس تبدیل کرنا پڑیں گے۔" یہ کہتے ہی اس نے بڑی بہن کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ۔۔۔ تم یہ کیا کر رہے ہو؟" بڑی بہن گھبرا کر بولی۔ اس کی آواز میں حیرت بھی تھی اور خوف بھی!

"تمہی بچی! میرے دوست کو تم دونوں کی اور خاص طور پر تمہاری بہت فکر ہے۔ ہم اسے پریشان نہیں دیکھ سکتے۔"

تیتو میر نے لڑکی سے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! تم اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لو!"

"تت۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم۔۔۔ تم ایسا نہیں کرسکتے!" اس کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی۔ "تم ہمیں لباس تبدیل کرنے پر کیوں مجبور کر رہے ہو؟"

"حیرت ہے کہ تم اتنی سی بات اب تک نہیں سمجھ سکیں!" تیتو میر بولا۔ "ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ تم اپنے والدین کے پاس ٹھیک ٹھاک حالت میں جاؤ۔ اگر تم نے لباس تبدیل نہ کیا تو بیمار پڑ جاؤ گی۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یار! تم سنتے کیوں نہیں! پکڑو اس کا دوسرا ہاتھ!"

میں بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا تو اس نے ٹیپو اور حیدر علی کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے انہیں آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ ان دونوں میں سے حیدر علی نے بڑھ کر بڑی بہن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ لڑکی نے بہت زور لگایا، کسمسائی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔!" وہ چیخی۔ "تم ایسا نہیں کرسکتے!" اس کی دوسری بہن سمٹ کر کونے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف تھا۔

"ایسا ضرور ہوگا لڑکی!" تیتو میر نے کہا۔ "تم نے خود ہی ہمیں اس پر مجبور کردیا ہے۔ یقین کرو کہ ہم اپنی آنکھیں بند کرلیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! تم اور ٹیپو دوسری کو پکڑ کر آنکھیں بند کرلو۔ ہم اس کے کپڑے تبدیل کراتے ہیں۔"

ہم دونوں دوسری لڑکی کی طرف بڑھنے لگے تو بڑی لڑکی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ "تم۔۔۔ کیا واقعی ہمارے کپڑے۔۔۔" شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے!

"جی ہاں! میں تمہارے کپڑے تبدیل کروں گا۔ ہم سب کی آنکھیں بند رہیں گی۔" یہ کہہ کر تیتو میر نے لڑکی کے شانے سے ساڑی کا پلو کھینچ لیا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ ایسا مت کرو!" لڑکی نے روہانسا ہو کر کہا۔

"تو پھر تم خود لباس تبدیل کرلو!" تیتو میر پرسکون آواز میں بولا۔

"ٹھیک۔۔۔ ٹھیک ہے۔" لڑکی جلدی سے کہنے لگی۔ "ہم بدل۔۔۔ بدل لیں گے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ "تم ہمارے دھرم کے دشمن ہو۔ تم۔۔۔ تم ہمارے جسموں کو نجس کرنا چاہتے ہو۔ یہ۔۔۔ یہ کپڑے پہننے سے ہمارے جسم نجس ہوجائیں گے۔"

"تو بعد میں گنگا جل سے اشنان کرلینا۔" تیتو میر نے مسکرا کر کہا۔

یوں ان دونوں بہنوں نے بہ مشکل لباس تبدیل کیے تھے۔ پھر تیتو میر ہمارے لیے گرم گرم چائے لے آیا تھا، ساتھ ہی دوا کی گولیاں بھی تھیں جن کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ ان سے جسم کا درد اور تھکن دور ہوجائے گی اور بخار آنے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔

لڑکیوں کو ان کے کمرے میں چائے دے دی گئی تھی اور باہر سے ان کا کمرا بند کردیا گیا تھا۔ ہم سب اپنے بستروں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"ساتھی تیتو میر!" میں نے کہا۔ "اب تو مجاہد اوّل سے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، میں ان سے فوراً ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"چائے پینے کے نصف گھنٹے کے بعد آپ ان سے مل سکیں گے۔" تیتو میر بولا پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ "پانچ بجنے والے ہیں، ساری رات ہی گزر گئی۔"

واقعی تمام رات گزر گئی تھی۔ ہم فرش پر بچھے ہوئے اپنے بستروں پر چائے پی کر دراز ہوگئے تھے۔ تیتو میر چائے کی پیالیاں سمیٹ کر جاچکا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں مجاہد اوّل کو بتانے جارہا ہوں "آپ نے چائے پی لی ہے اور ملاقات کے لیے تیار ہیں۔ کیا خبر مجاہد اوّل آدھے گھنٹے سے پہلے آپ کو بلوالیں!" تیتو میر بڑا زندہ دل اور خوش مزاج تھا۔ اس کی گفتگو نے ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے تناؤ کو ختم کردیا تھا۔ مجاہد اوّل نے واقعی ایک مناسب شخص کو میزبانی پر مقرر کیا تھا۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔ نیند کا غلبہ شدید تھا۔ تیتو میر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ سوجاتا ہوں "اگر مجھے مجاہد اوّل نے بلوایا تو تیتو میر خود جگالے گا" اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن پر نیند کا غلبہ ہوگیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے تینوں ساتھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں کھڑا ہوگیا اور پھر کمرے سے باہر آگیا۔ برابر کے کمرے کے دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ یہی وہ کمرا تھا جس میں لڑکیاں تھیں۔ دن کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مگر بادل اب بھی آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں دوسرے سرے تک چلا گیا۔ برابر برابر تین کمرے اور تھے مگر سب بند پڑے تھے اور دروازوں پر تالے نظر آرہے تھے۔ دوسرے کمرے کے ساتھ ہی باورچی خانہ

تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ رکھے گملوں میں پھول مہک رہے تھے۔ میں نے پہلو میں بھی دو کمرے بنے دیکھے۔ ان کی درمیان چھوٹا سا برآمدہ تھا۔

میں ابھی وہاں کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ تیتو میر ڈیوڑھی کی طرف سے صحن عبور کر کے قریب پہنچ گیا۔ "اٹھ گئے آپ!" وہ بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "مجاہد اول کہاں ہیں؟"

"منہ ہاتھ دھو لیں ناشتا کرنے کے بعد وہ آپ سے ملیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"رات کو تم نے ہمیں چائے کے ساتھ خواب آور گولیاں دی تھیں نا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"مجاہد اول کا کہنا تھا کہ آپ لوگوں کو آرام کی ضرورت ہے۔" تیتو میر نے کہا پھر بولا۔ "لڑکیاں اٹھ گئیں؟"

"معلوم نہیں۔ کیا انہیں بھی خواب آور..."

"جی ہاں! ہم میں سے کوئی بھی بغیر نقاب کے ان کے سامنے نہیں جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے رومال سے اپنا چہرہ چھپالیا، صرف آنکھیں کھلی رہنے دیں۔

ناشتا کرنے کے بعد ہم چاروں تیتو میر کے ساتھ مکان کی اوپری منزل پر گئے۔ اوپر کا حصہ بھی نیچے کی طرح سنسان تھا۔ شاید وہاں سفیدی اور مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ ایک طرف لمبی سی سیڑھی پڑی ہوئی تھی، ساتھ ہی بڑا سا ٹب رکھا تھا جس میں سفیدی کے لیے چونا گھلا ہوا تھا۔ طاق میں سفیدی کی کوچیاں گرنیاں اور تھاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف گلی کی دوسری جانب ایک مسجد تھی جس کے صحن میں نیم کا ایک گھنا پیڑ تھا۔ اس درخت نے گلی پر سایہ کر رکھا تھا۔

اوپری منزل ہی کی ایک اندھیری کوٹھری میں مجاہد اول سے ہماری ملاقات ہوئی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ ایک چھوٹے سے موکھے کی وجہ سے کمرے میں تھوڑی سی روشنی آرہی تھی۔ پہلے تو اندھیرے کی وجہ سے ہمیں کچھ نظر نہ آیا مگر کچھ ہی دیر میں آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔

ہم جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئے مجاہد اول نے تیتو میر سے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو بٹھاؤ!" تیتو میر نے ٹارچ کی روشنی میں ہمیں وہ چاروں مونڈھے دکھائے جو کچھ ہی فاصلے پر دکھائی دے رہے تھے۔

"اب تم جاسکتے ہو تیتو میر!" مجاہد اول کی بھاری، سخت اور کھردری آواز ابھری جس سے ہماری سماعتیں آشنا تھیں۔ "دونوں لڑکیوں کی نگرانی ضروری ہے۔ انہیں اس گھر کا نقشہ معلوم نہیں ہونا چاہیے!" مجاہد اول، تیتو میر کو ہدایات دے رہا تھا۔ "دن میں اگر انہیں کمرے سے باہر لاؤ تو ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہونی چاہئیں ورنہ تمہیں زیادہ دیر ان کی نگرانی نہیں کرنا پڑے گی، چاندنی بی آگئی ہی ہوگی۔"

مجاہد اول کی ہدایات کو سننے کے بعد تیتو میر وہاں سے چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ اب اس اندھیری کوٹھری میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

"شاہین! تم نے وہ عمارت تباہ کر دی؟" مجاہد اول نے مجھے مخاطب کیا۔ وہاں دوسرے ساتھیوں کی موجودگی کے سبب اس نے میرا فرضی نام ہی لیا تھا۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔ "ہماری مہم کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر کامیاب رہی۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا" مجاہد اول کی آواز ابھری۔ "مگر تم لوگ یہاں کیوں ہو؟ اس اسلحہ ڈپو کی تباہی کے بعد تمہیں جالی میں نہیں ہونا چاہیے تھا!" مجاہد اول کا لہجہ کرخت تھا۔

"جناب! اس کے ذمے دار میرے ساتھی نہیں میں ہوں۔" میں نے مجاہد اول کے رویے میں سختی دیکھ کر سارا الزام اپنے سر لے لیا۔

"ان پر بھی اس کی ذمے داری ہے! اس لیے کہ تم سب ایک دوسرے کے محافظ ہو۔ ایک سے کوئی کوتاہی ہو تو دوسرے کو اسے ٹوکنا چاہیے! مجھے بتاؤ کہ تم لوگ یہاں جالی میں کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہدایات دی گئی تھیں؟ تمہیں یاد ہیں وہ ہدایات؟" مجاہد اول بولا۔

"جی ہاں۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا۔ "بات یہ ہے کہ علی گڑھ سے آتے ہوئے دھشاری گاؤں۔" پھر میں نے خیر محمد سے ملاقات کا واقعہ سنا دیا۔

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ تمہارے ارادے نیک تھے مگر تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مجاہد اول نے کہا۔ "تم اس قوم کے سپاہی ہو، مجھے اور سپاہی کا کام صرف تعمیل حکم کرنا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی تھی اس لیے تمہیں معاف کیا جا رہا ہے لیکن یاد رکھو آئندہ تمہیں صرف ہدایات پر عمل کرنا ہوگا! اگر کسی بھی سبب اور کسی بھی مرحلے پر ان ہدایات کے خلاف کوئی قدم تم نے اٹھاؤ گے جو تمہیں دی

جائیں گی نہ کم نہ زیادہ!" مجاہد اول کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"بہت بہتر ہے جناب!" یہ کہتے ہوئے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ نیم نے اس موقع پر میرا ہاتھ دبا کر اپنے اطمینان کا یقین دلایا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم رات کو مجھ سے ملنے کے لیے بہت مضطرب تھے۔ کیا بات تھی؟" مجاہد اول نے سوال کیا۔ "تم مجھے کیا بتانا چاہتے تھے؟" پھر میں نے وہ ساری باتیں بتائیں جو رات کو لالہ مرلی دھر کی حویلی میں چھپ کر سنی تھیں۔ میں نے ایک ایک بات یاد کر کے بتائی تھی تاکہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔

"کیا وہاں مہیش نہیں تھا؟" مجاہد اول نے پوچھا۔

"اس وقت تو اس نام کا کوئی شخص میرے علم و اطلاع کے مطابق وہاں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے وہاں موجود ہو اور آکر چلا گیا ہو۔" میں نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "اے مجاہد اول! یہ مہیش کون ہے؟"

"جالی کا ایک متعصب ہندو ہے۔ بہت مال دار۔" مجاہد اول نے بتایا۔ "ہاں اب مجھے وہاں پیش آنے والے دوسرے واقعات سے آگاہ کرو۔"

میں نے لالہ مرلی دھر کی حویلی میں پیش آنے والے تمام واقعات بیان کر دیے۔ میں نے آخر میں کہا۔ "اس تھیلے میں لالہ مرلی دھر کی تجوری سے ملنے والی تمام رقوم اور زیورات موجود ہیں۔ یہ تنظیم کے لیے ہیں۔ وہ رقم جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام کی خاطر جمع کی تھی اب انہی کے خلاف استعمال ہوگی۔"

"شاید۔" مجاہد اول نے کہا۔ "تو تم مجھے یہی سب کچھ بتانے کے لیے بے چین تھے!"

"جی ہاں۔" میں بولا۔

"ہندوؤں کی اس سازش کی اطلاع مجھے بھی مل گئی تھی۔ میں اسی لیے یہاں آیا تھا۔" مجاہد اول کہنے لگا۔ "بہر حال تمہاری اس باغیانہ مہم جوئی کی وجہ سے ہمیں ان کے نئے منصوبے کا پتا چل گیا ہے۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ اس کے تدارک کی خاطر کیا کرنا چاہیے! مگر میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں! اگر تم سے آئندہ ایسی کوتاہی ہوئی تو تمہیں اس کی سخت سزا بھگتنا پڑے گی۔" مجاہد اول نے ایک بار پھر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ "کل رات اگر تمہارا ساتھی بروقت نہ پہنچتا تو سوچو کیا ہوتا؟"

میں اور میرے ساتھی کیا کہتے! ظاہر ہے کہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"پھر یہ بتاؤ کہ لالہ مرلی دھر کی حویلی سے نکل کر اس کی لڑکیوں کو لے کر تم کہاں جاتے؟"

مجاہد اول کے اس سوال کا جواب بھی ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ مسئلہ تو رات کو ہمارے ساتھی کے وہاں پہنچنے سے قبل تک میرے لیے پریشانی کا سبب رہا تھا۔

"یقیناً جذبات کی رو میں بہہ کر تم نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ تم نے جو کچھ کیا تھا جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔ یہ تمہاری بہت بڑی غلطی تھی شاہین! بہت بڑی بھول تھی!" یہ کہہ کر مجاہد اول چند ثانیے خاموش رہ کر پھر بولا۔ "تم یہ معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہو گے کہ ہمارا ایک سرفروش عین وقت پر تمہاری مدد کے لیے تانگہ لے کر کیسے پہنچ گیا؟ تو سنو! تم نے جس وقت اسلحہ کا ڈپو تباہ کیا تھا میں تم سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا۔ یہ ضروری تھا شاہین! اس لیے کہ یہ تمہاری پہلی مہم تھی اور ہماری طرف سے سیوتاژ کی پہلی کارروائی! میں اس مہم کو ہر قیمت پر کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر اس کے بعد تمہارا تعاقب کرنا مشکل نہ تھا۔ تمہاری مدد کرنا میری ذمے داری اور فرض تھا۔"

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں جناب!" میں نے کہا۔

"احمقانہ باتوں سے گریز کرو!" مجاہد اول بولا۔ "ہم میں سے کوئی بھی کسی پر احسان نہیں کر رہا۔ کوئی بھی کسی کا شکر گزار نہیں ہے سمجھے! ہم میں سے ہر شخص اپنا اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ ہم سب ایک جسم کی طرح ہیں اور تم سب میرے دست و بازو ہو!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، پھر وہ خود ہی کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "میں بہرحال تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس مہم کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔"

"بقیہ تین اضلاع سے کوئی خبر ملی؟" میں نے دریافت کیا۔

"ابھی تو نہیں لیکن امید ہے کہ شام تک ہر جگہ سے اطلاعات مل جائیں گی۔ توقع یہی ہے کہ ہر جگہ ہمیں کامیابی ہوگی۔" مجاہد اول نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"لالہ مرلی دھر کی حویلی سے کوئی اطلاع آئی؟"

"اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی ہے۔" مجاہد اول نے بتایا۔ "مزید کچھ علم نہیں ہو سکا۔ شام تک شاید اس سلسلے میں بھی کوئی نئی خبر مل جائے۔"

"ہمارے لیے اب کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ہم کب یہاں سے جائیں گے؟"

"ابھی تم سب انتظار کرو!" مجاہد اول نے کہا۔ "جلدی یہاں سے تمہارے محفوظ سفر کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

خوب سوچ سمجھ کر ایک بات کا جواب دو!" مجاہد اوّل کی بھاری آواز کوٹھری میں گونجی۔ "لالہ مرلی دھر کی حویلی میں تم نے کسی موقع پر کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ تم ان کے منصوبے سے واقف ہو گئے ہو؟"

"جی نہیں" تیتو بڑے وثوق سے بولا۔ "لالہ مرلی دھر سے گفتگو کے موقع پر میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا اور کوشش یہ کی تھی کہ وہ ہمارا مقصد محض یہ سمجھے کہ ہم اس سے خیر محمد کی بہن ہی کا بدلہ لینے آئے ہیں۔"

مجاہد اوّل سے ملاقات کرکے ہم سب نیچے آ گئے تھے۔

لڑکیوں کے کمرے کے باہر دروازے پر اب بھی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ تیتو میر ہمارے کمرے میں ایک بستر پر دراز تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے پوچھنے پر نیتو اسے رات کی مہم کی تفصیلات بتانے لگا۔ نیتو مزے لے لے کر یہ داستان بیان کر رہا تھا اور تیتو میر اتنی توجہ سے سب کچھ سن رہا تھا جیسے یہ مہم خود اسی نے سر کی ہو۔ نیتو ابھی خیر محمد سے ملاقات کا ذکر کر رہا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چل دیے؟" تیتو میر نے سوال کیا۔

"میں ذرا لڑکیوں سے مل لوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھہرو!" تیتو میر بولا۔ "میں ابھی آیا۔" اس نے نیتو سے کہا۔ "شاہین کے کمرے میں جانے کے بعد میں کنڈی لگا کر آتا ہوں۔"

میرے اس استفسار پر کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تیتو میر نے کہا کہ میں محض احتیاط کے پیش نظر ایسا کر رہا ہوں کیوں کہ مجاہد اوّل کا حکم ہے لڑکیوں کو گھر کا نقشہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایک ہی لڑکی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن وہاں دو دو ہیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ شوخ ہو گیا۔

میں لڑکیوں کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیے۔ میں موڑھے پر جا کر بیٹھ گیا اور پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کیا تم دونوں مجھ سے خفا ہو؟" وہ چپ رہیں۔ ظاہر ہے کہ ناراض ہی تھیں۔ میں نے مزید کہا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم دونوں یہاں قطعی محفوظ ہو۔ یہاں کوئی تمہاری عزت و آبرو لوٹنے والا نہیں ہے۔ ہم تمہیں جلد ہی واپس بھیج دیں گے۔ تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہمیں تمہاری باتوں پر یقین نہیں ہے، سمجھے!" بڑی لڑکی نے کہا۔ وہ بڑی بھولی سی حسین صورت کی مالک تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی ہرنی ایسی آنکھوں پر گھنی پلکوں کے لمبے لمبے سائے، ستواں ناک، پتلے پتلے سرخ اور رسیلے ہونٹ، کتابی چہرہ، دائیں رخسار پر بڑا سا سیاہ تل، لمبے سیاہ بالوں کی گھٹا کمر سے نیچے تک … ساڑی میں کسا ہوا گداز جسم لو، وہ مجھے بہت اچھی … تھی۔ کلونت کور سے حالانکہ اس کی کوئی مماثلت نہیں رکھتی … مگر جانے کیوں اس موقع پر مجھے وہ ظالم یاد آ گئی تھی۔ … سانپ کی طرح خوب صورت، کسی ہرنی کی طرح چوکنا … زخمی شیرنی کی طرح حملہ کرنے کے لیے بے چین نظر آ… تھی۔

"تمہیں اب تک تو ہماری نیکی اور شرافت پر یقین … چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر تم پر ہماری نیت خراب … ہوتی تو اب تک تمہاری آبرو برقرار نہ ہوتی۔"

"ہمارا خیال ہے کہ شاید ہم صرف اس وقت تک … محفوظ ہیں جب تک تم سب یہاں موجود ہو۔" بڑی لڑکی … بول رہی تھی۔ "تم سب شاید ایک دوسرے کے سامنے … زیادتی سے گریز کر رہے ہو۔ اگر تم میں سے کوئی ایک … یہاں اکیلا رہ جائے تو … تو پھر شاید اس کی نیت بدلتے … نہیں لگے گی۔"

"جب ایک مسلمان لڑکی بھرے گھر میں مرلی دھر کی … دست درازیوں سے بچنے کے لیے کنویں میں چھلانگ لگا … ہے اور جب مرلی دھر کو کسی کا خیال نہیں آیا تو ہم اگر … اندر سے تمہارے باپ ہی کی طرح من کے کالے ہیں … ہمیں ایسی کیا مجبوری ہو سکتی ہے کہ تمہیں …"

"یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ ہے۔" وہ بولی۔

"تمہارے جھوٹ بولنے یا انکار کرنے سے … نہیں بدل جائے گی۔ تم دونوں بہنوں اور تمہاری ماں کو … معصوم لڑکی پر ذرا رحم نہیں آیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو … وہ لڑکی مسلمان تھی۔ تم … تم شاید مسلمان لڑکیوں کی عز… عزت نہیں سمجھتیں۔" میری آواز تیز ہو گئی۔ "تمہارے … ظالم باپ نے ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کرایا، اسے اپنے … میں رکھا کہ زبردستی ہندو بنا لے اور اس طرح اس کی عز… داغدار کر دے!"

"یہ غلط ہے۔" اس مرتبہ چھوٹی لڑکی بولی۔ "ہمارے … سامنے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔"

"اگر یہ غلط ہے تو تم دونوں ہی کے سامنے تمہارے … نے یہ بات کیوں تسلیم کی تھی کہ شمبھو نے اس مسلمان … کو اغوا کیا تھا؟ اس نے کیوں مان لیا تھا کہ لڑکی نے کنویں … کود کر خودکشی کی تھی؟" میں نے کہا۔ "بولو! کیا یہ …

… بھی جھوٹ ہیں؟ سنو! وہ لڑکی تمہاری عمر کی تھی۔ وہ … تمہارے باپ کی بیٹیوں کی عمر کی تھی! تمہارے باپ کو اتنی … شرم نہیں آئی کہ وہ جس لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا … چاہتا ہے، وہ عمر میں اس کی بیٹیوں کی برابر ہے۔ دو جوان … بیٹیوں کے باپ کو کم از کم اتنی شرم تو کرنا چاہیے تھی!"

ان دونوں کی موجودگی میں ان کے باپ نے لڑکی کے … فرار اور خودکشی کو تسلیم کیا تھا، یہ ایک ایسی مضبوط دلیل … تھی کہ ان لڑکیوں کو ہار ماننا ہی پڑی۔

"ممکن ہے کہ تم سچ بول رہے ہو۔" بڑی لڑکی بولی۔ "مگر … کبھی ہوا ہمارے سامنے نہیں ہوا۔ ہم دونوں اپنی ماتا جی کے ساتھ اپنے چاچا کے پاس بنارس گئے ہوئے تھے۔ ہم … ایک ہی ہفتے پہلے بنارس سے آئے ہیں۔ ہمارے سامنے … ایسا ہوتا تو ہم خود اس لڑکی کو اتیاچار (ظلم) سے … بچاتے۔ مگر تم تو ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔" اس کی آواز … دکھ تھا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "ہم … بدلہ نہیں لیں گے۔ ہمارا مقصد صرف تمہارے ماں … باپ کو یہ احساس دلانا ہے کہ جس کی بیٹی اغوا کر لی جاتی ہے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے! اس کے گھر والوں پر کیا بیتتی ہے! ہم تمہیں اپنی نیکی، شرافت اور پارسائی کا یقین دلانا نہیں چاہتے۔ تم جو چاہو سمجھتی رہو، اس سے ہمارے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تم اپنے گھر پہنچ جاؤ تو پھر سوچنا کہ … ان لوگوں کے درمیان رہیں اور وہ کیسے تھے! پھر غور کرنا کہ … اتنی ہی پوتر (پاک) ہو کہ نہیں جتنی یہاں آنے سے پہلے … تھیں۔ لیکن اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اپنا نام بتا دو!"

"میرا نام رادھا ہے۔" بڑی لڑکی نے بتایا۔ "اور اس کا … ساوتری۔"

"اور میرا نام…"

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بڑی نے آنکھیں … چلا کر کہا۔ "تمہارا نام شاہین ہے مگر جانے کیوں مجھے یہ نام … نقلی سا لگتا ہے۔ اصل نام کیا ہے تمہارا؟"

"پوچھنے سے کیا فائدہ!" میں نے طویل سانس لیا۔ "… زندگی کے کسی موڑ پر اب شاید ہم نہ مل سکیں۔ بس اتنا یاد … رکھنا کہ کبھی کسی شاہین سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی جو … اپنے قول و فعل میں سچا تھا۔ تمہیں یہ ملاقات یاد دلاتی رہے … گی کہ مسلمان اتنے قابل نفرت نہیں ہوتے جتنا انہیں … تمہارا باپ یا دوسرے متعصب ہندو سمجھتے ہیں۔"

پھر میں اس کمرے سے باہر آ گیا۔ رادھا نے میرے دل پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے لیے میں اپنے دل میں ایسے جذبات محسوس کر رہا تھا جو کبھی کلونت کور کے لیے محسوس کیے تھے۔ ایک خلش سی میری روح میں اتر گئی تھی۔ ایک کانٹا سا میرے دل میں چبھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ رادھا کے دل میں میرے لیے کیا جذبات تھے! میں سوچنے لگا کہ میرا بھی کیا مقدر ہے! پہلے ایک سکھ دوشیزہ میرے حواس پر چھا گئی اور اب ایک ہندو لڑکی مجھے بھا گئی تھی۔ وہ دن رادھا سے ملاقات کے بعد مجھے سوگوار سا معلوم ہونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد چاند بی بی آ گئی اور وہ ان دونوں بہنوں کے پاس چلی گئی۔ چاند بی بی بھی ایک تاریخی نام تھا جو یقیناً فرضی ہی ہو سکتا تھا۔ چاند بی بی کی صورت شکل میں نہ دیکھ سکا۔ وہ سفید لمبا برقع پہن کر آئی تھی اور چہرے پر نقاب تھی۔ تیتو میر اسے سیدھا لڑکیوں کے کمرے میں لے گیا تھا۔ اسے بھی تیتو میر نے ہدایت کر دی تھی کہ لڑکیوں سے چہرہ چھپانا ہے۔

"آخر نقاب پر اتنا زور کیوں ہے؟" میں نے تیتو میر سے پوچھا تھا۔

"اس لیے کہ لڑکیوں کو بہرحال رہا کیا جانا ہے۔" تیتو میر جواباً بولا۔

بارش اب بھی پوری رفتار سے ہو رہی تھی۔ اس وقت میں اور میرے ساتھی پیپل کے ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے۔ ہمیں پھر ایک مہم درپیش تھی۔ اس مہم کا سربراہ ایک بار پھر مجھے ہی بنایا گیا۔ میرے تینوں ساتھی وہی تھے جو گزشتہ مہم میں میرے ساتھ تھے! اسی روز بعد نماز مغرب مجاہد اوّل نے ہمیں پھر اوپری منزل پر بلوایا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ جلالی میں پولیس نے بڑے پیمانے پر لوگوں کو زیر حراست لیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں سیاسی کارکنوں کے علاوہ تمام بدنام اور مشتبہ افراد بھی شامل ہیں۔ زیر حراست افراد میں نامی گرامی غنڈے، بدمعاش اور دس نمبری سبھی تھے۔ ان میں ہندو اور مسلمان کی تخصیص نہیں برتی گئی تھی۔ ان لوگوں سے جلالی کے قریب ایک عمارت کی تباہی کے بارے میں اور لالہ مرلی دھر کے گھر میں ڈکیتی کے متعلق پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ مرلی دھر کی بیٹیوں کے اغوا کو پولیس چھپا رہی تھی۔ ایسا شاید خود مرلی دھر ہی کے ایما پر کیا جا رہا تھا۔ وہ غالباً رسوائی سے بچنا چاہتا تھا۔ اس کی رپورٹ پر پولیس دھنساری کا رخ بھی کر چکی تھی۔ مشتبہ افراد میں مرلی دھر نے خیر محمد کا نام بھی لیا تھا اس لیے یہ امکان بھی تھا کہ خیر محمد کو بھی پکڑ لیا گیا ہو۔ ایک اہم اطلاع یہ بھی تھی کہ آس پاس کے علاقوں سے پندرہ بیس ہندو سیٹھ … کی حویلی میں

آگر نمبر ے تھے۔

"کیوں کہ تم لوگ یہاں موجود ہو اس لیے میری خواہش ہے کہ یہ کام بھی تم ہی چاروں کے سپرد کی جائے۔ جلالی کے کسی سرفروش کو میں اس مرحلے پر سامنے لانا نہیں چاہتا۔" جلید اقبال بولا۔ پھر اس کے متعلق تفصیل سے ہمیں آگاہ کیا۔

یہ کام ان بندوقوں پر قبضہ کرنے کے متعلق تھی جو کوتوال شیاما کالا مرلی دھر کو فراہم کرنے والا تھا۔ اسی کے ساتھ ہمیں مرلی دھر کو یہ یقین دلانا بھی تھا کہ اس کی حویلی میں ڈاکا ڈالنے والوں کا تعلق قصبہ جلالی سے نہیں تھا نہ اس کی بیٹیوں کے اغوا میں کوئی جلالی کا باشندہ ملوث ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں کوتوال سے بندوقیں چھیننے کے علاوہ ایک بار پھر مرلی دھر کی حویلی میں گھسنا تھا۔

"مگر جناب، مرلی دھر ہماری بات پر کیسے یقین کرے گا؟ وہ کس طرح یہ تسلیم کرے گا کہ ہم جلالی کے رہنے والے نہیں؟" میں نے جلید اقبال سے دریافت کیا۔

"تمہیں یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" جلید اقبال نے کہا۔ "مقصد صرف شبے میں مبتلا کرنا ہے۔ تمام حشیہ افراد اس وقت زیر حراست ہیں۔ اس کے باوجود ایسی وارداتوں کے بعد ان کا شک میں پڑ جانا یقینی ہے۔ وہ ایسی صورت میں یہی خیال کریں گے کہ ان وارداتوں کا تعلق جلالی سے باہر کے باشندوں سے ہے۔"

اور اب میں اپنے ساتھیوں کو لے کر اس مہم پر نکلا تھا۔ میں جنگل کے گھنے درخت پر اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا تھا۔ متصل درخت پر تیتو میر اپنے ایک ساتھی کو لیے چڑھا ہوا تھا۔ یہ دونوں درخت لالہ مرلی دھر کی کوٹھی کی طرف جانے والی سڑک پر تھے۔ تیتو میر کو اپنے ساتھی کے ہمراہ یہیں سے واپس ہو جانا تھا۔ ان کی واپسی کے لیے دو سائیکلیں وہاں موجود تھیں۔

اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہمیں ایک پیغام رساں کا انتظار تھا۔ نبو، حیدر علی اور سراج الدولہ انتہائی پر جوش تھے۔ وہ بے حد خوش تھے۔ جلید اقبال سے ملاقات کے بعد انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ مبارکباد دی تھی۔ انہیں اس بات پر مسرت تھی کہ جلید اقبال نے ان پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔

"انتظار ختم ٹم ٹم آ رہی ہے۔" اچانک ایک سائیکل سوار کا ہیولا ابھرا تھا اور وہ بلند آواز میں یہ الفاظ کہتا ہوا درخت کے نیچے سے گزر گیا تھا۔ پھر وہ چند لمحوں کے بعد ہی اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا۔

ہم اسی پیغام رساں کے منتظر تھے۔ تیزی کے درخت سے نیچے اترے۔ ہم نے ایک مضبوط اور رسے کا سرا پکڑ کر کھینچ لیا۔ یہ رسا اسی درخت کے بندھا ہوا تھا جس پر تیتو میر اپنے ساتھیوں سمیت تھا۔ رسے کا دوسرا سرا ہم نے کس کر جنگل کے دوسرے باندھ دیا۔ یہ رسا اب دونوں درختوں کے درمیان بچے کی بلندی تک بندھا ہوا تھا۔ اس کام سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دم سادھ کر جا بیٹھے بعد سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ابھری۔ چند کے بعد گھوڑا رسی سے الجھا اور اس کا توازن سکا۔ گھوڑا گر گیا۔ گاڑی بان بھی اسی کے ساتھ سڑک تھا۔ کوتوال شیاما گاڑی میں بیٹھا تھا وہ بھی لڑھک چاروں ساتھی کسی عقاب کی طرح گاڑی پر جھپٹے طرف سے تیتو میر بھی اپنے ساتھی کے ہمراہ گاڑی پکا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق تیتو میر اور ساتھی نے گاڑی بان کو اپنی گرفت میں لے لیا عرصے میں ہم نے گاڑی پر چڑھ کر حواس باختہ کوتوال بے بس کر دیا تھا۔ کوتوال اور گاڑی بان کو ہم نے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ ان دونوں کے منہ میں حلق تک کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اس دوران میں تیتو اپنے ساتھی کی مدد سے گاڑی میں موجود بندوقوں پر تھا۔ ٹم ٹم میں بکسوں کے اندر بندوقیں تھیں جنہیں نے کھول کر بندوقیں نکال لی تھیں۔ اسی کے ساتھ بھی ان کے بیچ رکھے تھے۔ کارتوس اور ان بندو انہوں نے موٹی موٹی چادروں میں لپیٹ کر اپنی سائیکل کے کیریئر پر باندھ لیا تھا۔

"ساتھی جلدی سے آؤ!" تیتو میر نے مجھے مخاطب کیا۔

"تم اٹھاؤ ابھی بندوقیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں مگر انشاءاللہ جلد ہی ہوں گی۔" تیتو بتایا۔ "اچھا!" پھر وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

میں نے کوتوال کی ٹم ٹم قبضے میں کر لی۔ میرے ساتھی ٹم ٹم کے اندر بیٹھ گئے تھے لیکن اس سے پہلے لباس تبدیل کر لیے تھے۔ ان لباسوں میں ہم درمیانی کے ہندو نظر آ رہے تھے۔ ٹم ٹم اب لالہ مرلی دھر کی حویلی کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ گھوڑا کچھ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کا پیر مڑ گیا تھا مگر بھی کسی نہ کسی طرح وہ گاڑی کو تھا۔

لالہ مرلی دھر تک رسائی مشکل نہ ہوا اس لیے

م بری برآمدے میں موجود تھا۔ کوتوال شیاما کی ٹم ٹم میں حویلی کے صدر دروازے کے سامنے جا کر کھڑی کر دی اور بری نے دروازہ کھول دیا تھا۔ بری نے مجھ سے سوال "پہلوال نہیں آیا آج؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ گاڑی بان کے بارے میں پوچھ رہا اس لیے برجستہ بولا۔ "اسے بخار آ گیا ہے۔ لالہ جی کو خبر کرو کہ شیاما جی نے مال بھجوایا ہے۔"

"کوتوال صاحب خود نہیں آئے؟" بری نے پھر سوال [illegible] ہو رہا تھا۔

"وہ بہت مصروف ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "سالے سلوں سے پوچھ تاچھ ہو رہی ہے۔ وہ مادر زی بے چین کو کر یاد آ گئی ہوگی۔" پھر میں ٹم ٹم سے اتر کر حویلی کی طرف کے ساتھ بڑھنے لگا۔ ہم تیز قدموں کے ساتھ برآمدے آگے تو میں بولا۔ "لالہ جی کو خبر کرو!"

بری اندر چلا گیا۔ گزشتہ روز اس حویلی میں مجھے صرف ملازمین نظر آئے تھے۔ لالہ مرلی دھر نے بھی دو ہی افراد کا ان سے گیٹ بند کرنے کو کہا تھا۔ ایک کا نام بری اور دوسرے کا چنکو مگر اس وقت دوسرا ملازم نظر نہیں رہا تھا۔ بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے میں لالہ مرلی دھر کے سامنے تھا۔ صوفے پر ایک جانب وجیہہ نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ کتاب کی وہ بس یونہی ورق گردانی کر رہا تھا۔ لالہ مرلی دھر کا چہرہ اس وقت ستا ہوا تھا۔ اس کی حرکت سے اضطراب و پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پرنام کیا اور بولا۔ "شیاما جی نے سامان بھیجا ہے۔"

"شیاما جی خود کیوں نہیں آئے؟" مرلی دھر نے کھوئی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ میں نے ایک بار پھر وہی کہانی سنا دی جو اس کے ملازم بری کو سنا چکا تھا۔ وہی "مسلوں" کی چالی والی کہانی جو اس عرصے میں بری باہر جا چکا تھا۔

"کوئی بات ہے؟" لالہ مرلی دھر نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے معنی خیز انداز میں صوفے پر بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا۔ لالہ میرا مقصد سمجھ گیا اور کہنے لگا۔ "بتاؤ! یہ میرا بھتیجا جوگیندر ہے۔ تم اس کے سامنے اپنی بات کر سکتے ہو۔"

"میرا نام ہردیال ہے۔" میں نے اپنا فرضی نام بتایا جو اس وقت سوچا تھا۔ "میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں اور یہاں سیٹھ میش جی کے بلاوے پر آیا ہوں۔"

"یہ بتاؤ کہ میش کے یہاں کتنے لوگ آ چکے ہیں؟" مرلی دھر نے معلوم کیا۔

"مجھ سمیت کوئی پینتیس ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "شیاما جی نے بندوقیں بھیجی ہیں۔"

"کہاں ہیں بندوقیں؟" مرلی دھر نے چونک کر کہا۔

"باہر ٹم ٹم کے اندر ہیں۔ میرا ساتھی بھی وہیں ہے۔ بکس بھاری ہیں، آپ انہیں اٹھوا لیجیے!"

"چنکو!" اس نے اپنے دوسرے ملازم کو آواز دی۔ وہ آیا تو مرلی دھر بولا۔ "جاؤ ٹم ٹم سے سامان اتروا لو!" ملازم چلا گیا تو مرلی دھر نے اپنے بھتیجے کو مخاطب کیا۔ "جوگیندر! سیتا سے کہو کہ چائے بنائے۔ یا پھر اس شیامو سے چائے بنوا لے اگر وہ بازار سے آ گیا ہو سوالے کرا!"

جوگیندر اٹھ کر دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کے پاس گیا اور آواز دی۔ "سیتا!"

"جی بھیا!" جواب میں ایک سریلی نسوانی آواز سنائی دی۔

"اگر رسوئیا بازار سے لوٹ آیا ہو تو اس سے چائے بنوا لو ورنہ پھر خود ہی بنا لو تین پیالیاں!" جوگیندر نے کہا۔

پھر میں نے لالہ مرلی دھر کو جلالی آنے کی تفصیل سے آگاہ کیا کہ کس طرح بنارس ہندو یونیورسٹی میں دھرم پر نچھاور ہو جانے کی تمنا کرنے والے طلبہ نے تنظیم بنائی ہے اور وہ مختلف علاقوں میں کام کر رہے ہیں۔ میرا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا اور اب میں اسے اپنے اور اپنے ساتھیوں کی ان فرضی مہموں کی کہانیاں سنا رہا تھا جو شدھی تحریک کے سلسلے میں انجام دی گئیں۔ میں نے اپنی بات کے آخر میں کہا۔ "ہندوستان ہمارا ہے لالہ جی! یہاں صرف ہم رہیں گے اور اپنے دھرم کا بول بالا کریں گے۔"

میں چپ ہوا تو لالہ مرلی دھر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے لگا۔ پھر مجھے اعتماد میں لینے کی خاطر اپنی بیٹیوں کے اغوا کا واقعہ بھی نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ رونے بھی لگا۔ میں نے اسے تسلی دی اور بولا کہ لالہ جی! پرواہ نہ کریں ہم اپنے بھارت ورش کی زمین ان مسلمانوں کے لیے تنگ کر دیں گے۔

"ہردیال جی!" اچانک لالہ مرلی دھر کے نوجوان بھتیجے نے مجھے مخاطب کیا۔ "یہ بتائیں کہ کیا مسلمان انسان نہیں ہوتے؟ کیا ان کے اور ہمارے خون کا رنگ الگ ہے؟"

"جوگیندر!" میرے کچھ بولنے سے پہلے لالہ مرلی دھر بول اٹھا۔ "تم چپ رہو!" اپنے بھتیجے کو ڈانٹ کر وہ مجھ سے بولا۔ "معاف کرنا ہردیال جی! یہ جوگیندر پاگل ہو گیا ہے۔ یہ

مسلمانوں کا بڑا ہمدرد بنتا ہے' ہندو مسلم ایکتا کی بات کرتا ہے۔ بتائیں کہ ہے نا یہ پاگل!"

اس دوران میں چائے آگئی۔ جوگیندر نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں پاگل نہیں ہوں چاچا جی! پاگل تو سوامی شردھانند' آپ اور ہردیال جی ایسے لوگ ہیں۔ اس دیش میں جب سکھ' پارسی' عیسائی' بودھ سب رہ سکتے ہیں تو مسلمان کیوں نہیں رہ سکتے؟"

"اس لیے کہ وہ ہماری بہو بیٹیوں کو بھی اغوا کر لیتے ہیں۔ ان پر بری نظر رکھتے ہیں' ان کی عزت لوٹ لیتے ہیں؟" لالہ مرلی دھر کڑوی آواز میں بولا۔

"اور اگر ہم مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھوالیں' ان کی عزت لوٹنا چاہیں تو کیا آپ مسلمانوں کو بھی یہ حق دیں گے کہ وہ ہندوؤں سے ہندوستان میں رہنے کا حق چھین لیں؟"

"خاموش ہو جا جوگیندر!" مرلی دھر گرجا۔ "تجھے شرم آنا چاہیے اپنے چاچا کے سامنے باتیں کرتے ہوئے۔"

"مجھے شرم تو اس دن بھی آئی تھی جب ایک بے گناہ مسلمان لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لیے کنوئیں میں ڈوب کر جان دے دی تھی۔" جوگیندر ترکی بہ ترکی بولا۔

لالہ مرلی دھر غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "نکل جا یہاں سے ابھی اور اسی وقت!" لالہ چیخا اور پھر آگے بڑھ کر جوگیندر کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ "چل نکل جا!"

شور و غل سن کر للائن اور ایک نوجوان حسین لڑکی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ للائن نے آتے ہی کہا۔ "لالہ جی! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تو اندر جا!" لالہ غصے سے بولا' مگر للائن جوگیندر کو اس سے چھڑا کر اندر لے گئی۔ اس کے بعد لالہ مرلی دھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہردیال جی! آپ خیال نہ کرنا' اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ "ارے یہ چنکو اب تک نہیں لوٹا!"

"میں جا کر دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں تم یہیں ٹھہرو!" لالہ مرلی دھر بولا اور پھر زور سے آواز دی۔ "ہری! ارے او ہری!"

"آیا سرکار!" ہری کی آواز سنائی دی اور پھر چند لمحوں بعد ہی وہ بیٹھک میں آگیا۔ "جی مالک"

"باہر جا کر دیکھ!" مرلی دھر نے اس سے کہا۔ "دیکھ یہ چنکو کہاں مر گیا! شرما جی کی ٹم ٹم سے بکسے اٹھانے گیا تھا۔"

مجھے معلوم تھا کہ چنکو کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ یقیناً وہ اس وقت ٹم ٹم میں بندھا پڑا ہوگا اور اب ہری بھی اسی انجام سے دوچار ہونے والا تھا۔ اس کے بعد ہماری اصل کا آغاز ہوتا۔ ہری چلا گیا تو لالہ مرلی دھر اس مہم کے باتیں کرنے لگا جس کے لیے مہیش نے مختلف علا ہندوؤں کو یہاں بلوایا تھا۔

"آج یہ طے ہوا ہے کہ کل صبح ہی ایک پارٹی د جائے گی۔ کل رات وہاں مسلمانوں کے خون سے جائے گی۔" لالہ مرلی دھر مجھے بتا رہا تھا۔ "مسلمان بتا دیں گے کہ ہندو بہو بیٹیوں کو اغوا کرنا کوئی معمولی ہے۔"

"اگر ایسا ہے لالہ جی تو یہ بندوقیں یہاں کیوں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"بندوقیں یہیں سے جائیں گی۔" لالہ

"ہردیال جی! ہم نہیں جانتے کہ میرا خون کتنا کھول رہا اس خیر محمد کا خون پی جاؤں گا۔"

"یہاں سے بندوقیں لے کر کون جائے گا؟" موقع دیکھ کر معلوم کیا۔

اپنے بھتیجے جوگیندر کی باتوں سے لالہ کچھ زیادہ گیا تھا اس لیے میری بات کو نظر انداز کرتے ہو ہانکنے لگا۔ "ان مسلوں نے بڑے کل پرزے نکال ان کی ہمت تو دیکھو ہردیال جی! یہ اب ہماری عزت کھیلنے لگے ہیں۔ دیکھو ڈھیل! پتہ معلوم میری بیٹیاں میں ہوں گی! میں دھضاری میں مسلمانوں کا ایک جلا دوں گا! ان کے ایک ایک بچے کو قتل کروا جائے عورتوں کی عزتیں ان کے سامنے لوٹی جائیں گی!"

"ایسا ہی ہوگا لالہ جی!" میں نے اس کی ہاں ملائی۔ "ہمیں اس وقت ذرا صبر سے کام لینا چا مجھے بتائیں کہ یہاں سے بندوقیں کون لے کر جائے

پھر مرلی دھر کھل ہی گیا۔ اس نے بتایا کہ میں بندوقیں لے کر دھضاری جاؤں گا۔ میرے ساتھ و بھی ہوں گے جو مہیش بھیجے گا۔ کوتوال شرما جی آج کسی وقت چار ہندو غنڈوں کو جو پولیس کی تحو میں چھوڑ دیں گے۔ کاغذات اور پولیس ریکارڈ کے غنڈے پولیس کی حراست میں ہوں گے۔ دھضا مسلمانوں پر حملے کی قیادت انہی چاروں ہندو غنڈو ہے۔ یہی غنڈے حملہ آور پارٹی کو لے کر دھضار گے کیوں کہ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف دھضاری کے باشندے ان غنڈوں کو پہچان بھی فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ پولیس ریکارڈ کے مطابق

پہلے ہی پولیس کی حراست میں ہوں گے۔ حملے کے بعد ہمارے جوان اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے اور یوں تفتیش کا دائرہ کبھی ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

مرلی دھر شیطان کی باتوں پر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ کوتوال شرما آج رات کس طرح ہندو غنڈوں کو رہا کر سکتا تھا؟ وہ تو خود بندھا پڑا تھا۔ صبح سے پہلے اس کی رہائی کا امکان نہیں تھا۔ اب ہمیں تیزی سے کام کرنا تھا۔ مہیش کے بھیجے ہوئے دونوں نوجوان کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے جنہیں لالہ مرلی دھر کے ساتھ دھضاری جانا تھا۔

"کیا ہو گیا آخر!" میں اچانک بول اٹھا۔ "چنکو کے ساتھ تو ہری بھی وہیں جا کر بیٹھ گیا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔"

مرلی دھر کو بھی اب شاید کسی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی بیٹھک سے اٹھ کر برآمدے تک آیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اور بارش میں بھیگتا ہوا حویلی کے پھاٹک کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سب کام ٹھیک تھا۔ چنکو اور ہری جکڑے پڑے تھے۔ ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں پھر الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

"کچھ گڑبڑ لگتی ہے لالہ جی!" میں نے لہجے میں پریشانی کا اظہار کیا۔ "آپ کے دونوں ملازم اور میرا ساتھی تینوں وہاں بندھے پڑے ہیں اور بندوقوں کے بکسے غائب ہیں۔"

"ہیں!" لالہ مرلی دھر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "ہائے رام! یہ کیا ہو گیا؟ اندر آجاؤ بیٹا' اندر آجاؤ!" یہ کہتا ہوا وہ دوڑ کر اندر چلا گیا۔ اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ میں بیٹھک میں پہنچا تو وہ دروازے سے دوسری طرف لپک رہا تھا۔ "دروازہ بند کر دو' جلدی!" اس نے رک کر مجھ سے کہا۔ خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جلدی سے دروازہ بند کر دو!" اس نے پھر گھبرا کر کہا۔ "اور۔۔۔ اور تم بھی اندر ہی آجاؤ!" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ مجھے دروازہ بند نہیں کرنا تھا۔ میرے تینوں ساتھی حویلی کا پھاٹک بند کر کے اندر آچکے تھے۔ انہوں نے رومالوں سے اپنے چہرے چھپا لیے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا اور تیزی سے برابر والے کمرے میں کھلنے والے دروازے میں آگیا۔

مرلی دھر باغ کی طرف کھلنے والے دروازے میں کھڑا چیخ رہا تھا۔ "شیامو! شیامو!"

اب میرے تینوں ساتھی بیٹھک میں آچکے تھے۔ میں نے انہیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور جی بچا کر لالہ مرلی دھر کے پاس پہنچ گیا۔ لالہ مرلی دھر کی آواز سے کچھ ایسی ہی گھبراہٹ اور خوف کا اظہار ہو رہا تھا کہ شیامو کے ساتھ ہی للائن' ملازمہ دلاری' لالہ کی حسین و نوجوان بھتیجی سیتا اور جوگیندر سبھی وہاں آگئے۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کچھ بتائیں تو!" لالہ مرلی دھر سے مختلف سوالات کیے گئے۔

"بتاتا ہوں۔" لالہ مرلی دھر اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "دیکھ شیامو! تو فوراً کوتوال شرما جی کے پاس جا۔ شرما جی سے کہنا کہ لالہ جی نے ابھی بلایا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ انہوں نے جو مال بھیجا تھا وہ کوئی اڑا لے گیا ہے۔ شیامو! تو پچھلے دروازے سے نکل جا' جلدی کر! شرما جی کو اپنے ساتھ ہی لانا۔ الو! دوڑتا ہوا جلدی جا!"

شیامو رسوئیا (باورچی) بھاگتا ہوا برآمدے سے باغ کی طرف گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ حویلی کے پچھلے دروازے سے نکل چکا تھا۔ لالہ مرلی دھر نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"چنکو اور ہری کہاں ہیں؟" جوگیندر نے اپنے چاچا لالہ سے پوچھا۔

"باہر۔۔۔ وہ باہر بندھے پڑے ہیں۔" لالہ مرلی دھر نے جواب دیا۔ "مجھ کو یہ ودی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ انہی کا کام جان پڑتا ہے۔" وہ بے حد خوف زدہ تھا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" جوگیندر نے بیٹھک کی طرف بڑھنا چاہا۔

للائن اور سیتا نے اسے پکڑ لیا۔ "نہیں نہیں!" للائن بولی۔ "تو یہیں ٹھہر بیٹا!"

"گھر میں اور کوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا!" لالہ مرلی دھر بولا' پھر باقی لوگوں سے کہا "تم سب اندر چلو' کمرے میں!" مرلی دھر کے کہنے پر سبھی اندر چلے گئے۔ "دروازہ بند کر لو اندر سے!" لالہ پر کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ طاری تھی۔ پھر اس نے خود بڑھ کر اندر کا دروازہ بند کر دیا اور بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ وہ لوگ کتنے خطرناک ہیں!"

میں نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ وہ کن لوگوں کی بات کر رہا ہے! اب حالات ہمارے قابو میں تھے۔ میں لالہ مرلی دھر کو باتوں میں لگائے ہوئے تھا کہ میرے تینوں ساتھی بیٹھک کے دروازے سے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ ان تینوں نے لالہ مرلی دھر کو قابو میں کر لیا تھا۔ لالہ ایک مرتبہ پھر ہماری گرفت میں تھا۔ وہ

شاید اپنی زندگی کے بدترین صدمے اور حیرت کے لمحات سے گزر رہا تھا اور گھگیا رہا تھا۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اندر والے کمرے میں بند افراد زور زور سے چیخ رہے تھے۔ دروازے کو اندر سے پیٹا جا رہا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اندر والے کمرے میں کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔ کھڑکیاں تھیں تو ان پر اتنی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں کہ اس کمرے سے ان لوگوں کے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لالہ مٹی دھر کو ہم ایک بار پھر کشاں کشاں اس کنویں کی طرف لے گئے جس میں اسے گزشتہ رات لٹکایا تھا۔ لالہ بری طرح بلک رہا تھا۔

"عورتوں کی طرح شور نہ مچاؤ!" میں نے اسے ڈانٹا پھر دھمکی دی۔ "مت بھولو کہ ہم تمہیں کنویں میں لٹکانے کے بجائے موت کے گھاٹ بھی اتار سکتے ہیں سمجھے!"

پھر لالہ مٹی دھر خاموش ہو گیا۔ دھمکی کا اس پر خاصا اثر ہوا تھا۔ آج رات بھی لالہ کو کنویں میں اترنا ہی پڑا تھا۔ اندر کمرے سے لالائن اور دوسرے لوگوں کی چیخ پکار کے ساتھ ہی اب بیٹھک کی طرف سے بھی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید بیٹھک کے بیٹھے ہوئے آدمی وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم سب حویلی کے عقبی دروازے سے نکلے اور دوڑتے چلے گئے۔ ہمارا رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں ہمیں ایک قتل ناٹا ملنا تھا۔ ادات کے دو بجے ہم پھر اسی مکان میں تھے۔ آج ہمارے سونے کا بندوبست اوپری منزل پر کیا گیا تھا۔ نچلی منزل میں اندھیرا تھا۔ میں نے تیتو میر سے دونوں لڑکیوں کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ مجاہد اوّل کے حکم پر انہیں کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔

"مجاہد اوّل سے کب ملاقات ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" تیتو میر نے جواب دیا۔ "آپ لوگوں کو کل صبح فجر کی اذان کے وقت روانہ ہو جانا ہے۔"

"میں انہیں اپنی مہم کی رپورٹ بھی تو دینا چاہتا تھا۔" میں بولا۔

"رپورٹ آپ مجھے دے دیں۔"

میں نے پھر تیتو میر کو لالہ مٹی کی حویلی میں پیش آنے والے تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ وضاحت کے لیے درمیان میں تیتو میر مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ جب میں تیتو میر کو پوری رپورٹ دے چکا تو وہ بولا۔ "واقعی شاہین! آپ انتہائی ذہین اور دلیر ہیں۔ اگر مجاہد اوّل کو آپ پر اتنا اعتماد ہے تو کچھ بے جا نہیں۔" اس کے لہجے سے رشک کا اظہار ہو رہا تھا۔ "کاش آپ کے ساتھ میں بھی ہوتا!"

"مجاہد اوّل تم پر بھی اعتماد کرتے ہیں۔" میں نے اس کی خوشنودی کے لیے کہا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہیں ہم تک پہنچانے کا فرض نہ سونپتے۔"

پھر ہم بستر پر دراز ہو گئے۔ میری آنکھوں میں نیند تھی۔ رادھا کو دیکھ کر میرے سارے غم ہرے ہو گئے تھے۔ کلونت کور مجھے بری طرح یاد آنے لگی تھی۔ کبھی میرے تصور میں کلونت ابھرتی اور کبھی اس کا چہرہ رادھا کے خدوخال میں تبدیل ہو جاتا۔ معلوم نہیں رادھا کہاں تھی؟ مجاہد اوّل نے اسے کہاں بھیج دیا تھا؟

رادھا سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی اسے اس کی بہن ساوتری کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے گا۔ میرا پروگرام تھا کہ میں آج ہی رات ان دونوں کو ان کے گھر پہنچا دوں مگر اب انہیں کہیں اور ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔ مجاہد اوّل سے میری ملاقات کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ مجاہد اوّل کو میں یہ بتا چکا تھا کہ دونوں بہنوں سے میں نے جلد ان کے گھر پہنچانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس پر مجاہد اوّل نے کہا تھا کہ تم نے ٹھیک کیا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ کیا مجاہد اوّل میرے وعدے کو پورا کرے گا؟ میرے ذہن نے اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیا۔

"تیتو میر!... تیتو میر!" میں نے آہستہ سے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید اسے نیند آگئی تھی۔ میں لالٹین کی لو نیچی کی اور واپس اپنے بستر پر آ بیٹھا۔

بارش کے یکساں اور بے کیف شور میں اچانک مجھے غیر معمولی آوازیں محسوس ہوئیں۔ نیچے کوئی دروازے کو طرح پیٹ رہا تھا۔ میں نے تیتو میر کو جگا دیا۔ وہ آنکھیں جھپکاتا ہوا اٹھا اور بولا "کیا بات ہے؟"

"نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

اسی وقت فضا کے دوش پر لہراتی ہوئی ایک بھاری کرخت آواز سنائی دی "پولیس!... پولیس!... دروازہ کھولو!"

"پولیس... یہ مصیبت یہاں کہاں سے آگئی!" ... بڑبڑایا۔

"میرا خیال ہے کہ پولیس نے یہاں چھاپا مارا ہے۔" تیتو میر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

نچو، حیدر علی اور سراج الدولہ کو بھی جگا دیا گیا۔ دروازے پر دستکیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ "تم لوگ یہیں ٹھہرو!" میں نے ان سے کہا اور تیزی سے زینہ اتر گیا۔ صدر دروازے کو اب توڑنے کی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ یہ اندازہ میں نے آوازوں سے لگایا۔ میں نے زینے کا دروازہ بند کیا اور پھر اوپر آ کر وہاں کے دروازے کی کنڈی بھی لگا دی۔

"یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟" میں نے تیتو میر سے پوچھا۔ تیتو میر نے مایوسی کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔

"اب کیا ہو گا؟" نچو بولا۔ اس کی آواز سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

پریشان تو ہم سب ہی تھے۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ اس مکان سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جسے پولیس نے مسدود کر دیا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ پولیس کی گرفت سے بچنے کی واحد صورت یہی ممکن تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں ناکامی ممکن نہیں تھی۔ بارش کے شور اور باہر ہونے والے ہنگامے کے سبب مجھے یقین تھا کہ ہم پولیس کے اوپر پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ سفیدی کا جو سامان اوپری منزل پر موجود تھا۔ اس کی مدد سے میں خود کو اور اپنے ساتھیوں کو پولیس کی گرفت سے بچا سکتا تھا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ نیچے دروازے پر پڑنے والی ضربوں میں بھی شدت آگئی تھی۔ گلی میں شور اور ہنگامہ بپا تھا۔ محلے کے لوگ بھی شور سن کر بارش کے باوجود اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کا چوبی صدر دروازہ کب تک ضربیں برداشت کر سکتا ہے؟

"جلدی کرو!" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "اپنے کپڑے اور سامان ایک تھیلے میں رکھو!"

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" تیتو میر نے سوال کیا۔

"نچو! جلدی کرو۔" میں نے تیتو میر کے سوال کو نظر انداز کر دیا، پھر سخت لہجے میں کہا۔ "یہ سستی یا کاہلی کا وقت نہیں ہے۔" میرے لہجے کی سختی سے میرے ساتھی مرعوب ہو گئے۔ وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میرے ذہن میں فرار کی کوئی ترکیب آگئی ہے۔ نچو، حیدر علی اور سراج الدولہ کپڑے سمیٹ کر جلدی جلدی تھیلے میں رکھنے لگے۔ میں اس عرصے میں تھیلے سے پٹ سن کی رسیوں کے لچھے نکال چکا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ مجاہد اوّل بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔" تیتو میر نے اپنا خیال پیش کیا۔ اسے شاید یہ امید تھی کہ اس موقع پر مجاہد اوّل کی طرف سے ہمیں کسی نہ کسی طرح مدد مل جائے گی۔ ممکن ہے اس کا خیال درست ہو مگر یہ محض خوش گمانی بھی ہو سکتی تھی۔

"ممکن ہے تمہارا کہنا صحیح ہو" میں بولا۔ "لیکن ہمیں اپنے طور پر بھی کوشش کرنا چاہیے۔ تم یہ رسی کھولو! ہم انشاء اللہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

تیتو میر کی مدد سے میں نے ایک لچھے کو کھول لیا، پھر رسی کو دوہرا کر کے اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گانٹھیں لگا دیں۔ اس وقت تک میرے بقیہ تینوں ساتھی کینوس کے تھیلے میں کپڑے اور دوسرا ضروری سامان بھر چکے تھے۔

"نچو! تم دوسرے لچھے کو کھول کر رسی میں اسی طرح گرہیں لگاؤ!" میں نے ہدایت دی۔

"آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" تیتو میر نے تجسس سے مجبور ہو کر دریافت کیا۔

"دیکھتے رہو۔" میں نے کہا، پھر رسی میں ایک اور گرہ لگا دی۔ "تم ذرا پچھلی طرف دیوار سے نیچے جھانک کر دیکھو۔" میں نے تیتو میر سے کہا اور مزید گرہیں لگانے لگا۔

تیتو میر نے سفیدی کے کام میں استعمال ہونے والی گھوڑی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ میں رسی میں گرہیں لگاتا رہا۔ نچو اور حیدر علی دوسری رسی میں میری ہی طرح گرہیں لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تیتو میر گھوڑی سے اتر کر جلدی جلدی میرے پاس آ کر بولا۔ "پولیس ادھر بھی موجود ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ انہوں نے ہمیں دونوں طرف سے گھیرا ہو گا۔" میری آواز پرسکون تھی۔ "میں صرف اپنے خیال کی تصدیق چاہتا تھا۔ خیر کوئی پروا کی بات نہیں۔ پولیس ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکے گی۔ پولیس جب یہاں پہنچے گی تو حیرت کے سوا اسے کچھ نہ مل سکے گا۔" اس کام میں ہمیں چار منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ دونوں رسیوں میں گرہیں لگ چکی تھیں۔ ہم ان کے ذریعے بلندی سے نیچے جا سکتے تھے۔ نیچے دروازے پر پڑنے والی ضربیں اب اور بھی تیز ہو گئی تھیں۔

"او کے پتو! کیا ہاتھوں میں دم نہیں ہے! جلدی کرو، توڑ دو اس دروازے کو!" ایک رعب دار آواز بلند ہوئی۔

میرے لیے نیچے سے آنے والی یہ رعب دار آواز آشنا تھی۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا! پہلے بھی یہ آواز سن چکا تھا۔ یہ آواز کوتوال شرما کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کوتوال کی آواز پھر سنائی دی۔ اب وہ مختلف سپاہیوں کے نام لے کر انہیں دیوار پھاند کر مکان میں داخل ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ یہ حکم ہم سب نے سنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نچو نے اوپری منزل کی ایک دیوار میں بنی ہوئی کھڑکی کھولی۔ یہ کھڑکی

دوسری طرف بیچ پر کھلتی تھی۔ نیو کھڑکی میں لیٹ کر چھجے پر پہنچا اور نیچے صحن کا جائزہ لینے لگا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے میں اس وقت عقبی دیوار سے لگی ہوئی سیڑھی اٹھا چکا تھا۔ لمبی سیڑھی کو میں نے آہستہ سے اس بلند و بالا درخت کے ایک گدے سے ٹکا دیا جو مسجد کے صحن میں اگا ہوا تھا۔ وہ گدا ہم سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر رہا ہوگا۔

"بہترین!" تیتو میر نے پرجوش آواز میں کہا اور میرے شانے پر شاباشی کے انداز میں تھپکی دی۔

نیو اسی وقت کھڑکی بند کر کے واپس آ گیا اور بتایا۔ "وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر آ گئے ہیں۔"

"پروا نہیں۔" میں اطمینان سے بولا۔ "شکر ہے کہ پہلے یہ بات ان کی عقل میں نہیں آئی۔" ہمارے فرار کی راہ ہموار ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "چلو جلدی کرو!" پھر میرے اشارے پر تینوں ساتھی آہستگی لیکن پھرتی کے ساتھ سیڑھی سے ہو کر نیم کے درخت پر پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ درخت پر پہنچتے ہی ڈال ڈال ہو کر آہستگی سے مسجد کی چھت پر پہنچ جائیں اور ہمارا انتظار کریں۔ نیچے ڈیوڑھی کا دروازہ کھل چکا تھا۔ گلی کا شور اب صحن، برآمدے اور ڈیوڑھی میں منتقل ہو چکا تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ پھر ڈیوڑھی میں زینے کے نیچے والے دروازے پر ضربیں لگنے کی آواز آنا شروع ہو گئی۔

"تم لوگ جو اوپر ہو، زینے کا دروازہ کھول کر نیچے آ جاؤ! تمہیں گھیرا جا چکا ہے۔" یہ آواز کوتوال شرما کی تھی جو صحن سے آ رہی تھی۔ اسے ہم چند گھنٹے پہلے باندھ کر ایک سڑک کے کنارے ڈال آئے تھے، پھر وہ کس طرح آزاد ہو گیا؟ اس سوال کا ممکنہ جواب یہ تھا کہ لالہ مرلی دھر کی حویلی میں پہنچنے والوں کو جب لالہ سے ہمارے بارے میں پتا چلا ہو گا تو کوتوال شرما کو تلاش کیا گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ کوتوالی سے تم تم لے کر لالہ کی حویلی ہی گیا تھا۔ اسی راستے میں اسے تلاش کیا گیا ہوگا۔

کوتوال کی بات سن کر ایک تلخ گھٹا ہوا قہقہہ میرے حلق سے ابھرا۔ "جلدی کرو تیتو میر!" میں نے کہا اور ایک رسی اسے تھما دی جسے دہرا کر کے ہم پہلے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گرہیں لگا چکے تھے۔ "یہ رسی۔ اس رسی کا ایک سرا تم درخت پر پہنچتے ہی گدے سے باندھ دینا!" میں نے اسے ہدایت دی۔

"کیوں؟" تیتو میر نے سوال کیا۔

اس بے وقت سوال پر میں جھنجلا سا گیا۔ "جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو، سمجھے!" میری آواز میں تلخی آ گئی۔ "میں اسی کے سہارے درخت پر پہنچوں گا۔"

"مگر وہ سیڑھی جو موجود ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں، چلے جاؤ اور وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" میں سختی سے بولا۔

"پہلے آپ جایئے!" تیتو میر نے کہا۔ "میں ان لوگوں سے یہیں نمٹ لوں گا۔"

"ان سے کوئی نہیں نمٹے گا!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "چلو جلدی آگے بڑھو!"

"مگر جناب، یہ کبھی نہیں ہو سکتا! میں آپ کو یہاں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا!" وہ اڑ گیا۔

"احمق! بے وقوف!" میں نے جھلا کر اس کی گدی پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے سیڑھی کی طرف دھکیلا۔ "دیر مت کرو ورنہ ہم سب پھنس جائیں گے۔ یہ حکم ہے سمجھے!"

"لیکن ــ"

"بک بک مت کرو!" میں غرایا۔ "رسی کو مضبوطی سے باندھنا!"

میری آواز میں اس قدر سختی تھی کہ اس کے بعد تیتو میر کو خاموش ہونا پڑا۔ وہ رسی کا ایک سرا ہاتھ میں لے کر سیڑھی کے ذریعے درخت تک پہنچ گیا اور پھر میری ہدایت کے مطابق رسی کو درخت کے گدے سے باندھ دیا۔ دوسرا سرا میں نے احتیاطاً برآمدے میں پڑی ہوئی پائی سے باندھ دیا کہ کہیں ہوا کے جھونکے سے رسی دیوار سے پھسل کر باہر نہ گر جائے۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے سیڑھی اٹھائی اور اسے عقبی دیوار سے ٹکا دیا۔ اس سے قبل میں نے سیڑھی کے آخری ڈنڈے کے درمیان میں دوسری رسی کا ایک سرا باندھ دیا تھا۔ سیڑھی کو دیوار سے ٹکا کر میں نے وہ رسی دیوار کے باہر لٹکا دی۔ اس کارروائی کا مقصد پولیس کو اس دھوکے میں مبتلا کرنا تھا کہ ہم نے فرار کے لیے سیڑھی اور اس سے بندھی ہوئی رسی کو استعمال کیا ہے۔ اس عرصے میں نیچے زینے کے دروازے پر ضربیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ جس وقت اس دروازے کے ٹوٹنے کی آواز آئی میں پائی سے رسی کھول کر دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ رسی میری کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ بارش کے سبب دیوار پر پھسلن سی تھی۔ مجھے بہت احتیاط سے کام لینا تھا کیوں کہ دیوار کمزور تھی۔ ذرا سے غلط وزن کی وجہ سے دیوار ٹوٹ بھی سکتی تھی جس سے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا۔ دیوار ٹوٹنے سے شور ہوتا اور پولیس ادھر متوجہ

ہو جاتی۔ پھر پولیس کے لیے ہمارا تعاقب کرنا اور پھر ہم پر ہاتھ ڈالنا آسان ہوتا۔ میں ظاہر ہے کہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔ میرا دل اسی لیے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پولیس والے اب زینے کے اوپر والے دروازے کو توڑ رہے تھے۔ میں نے رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور اوپر دہری رسی کے درمیان ایک گرہ پر پیر جما دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں رسی کے سہارے باہر جھول گیا۔ ذرا دیر کے بعد میں گرہوں پر پیر رکھتا ہوا درخت کے اس گدے تک پہنچ گیا جس پر تیتو میر میرا منتظر تھا۔ گدے سے رسی کھول کر میں نے اپنی کمر کے گرد لپیٹ لی اور

ٹیٹو میر نے بولا۔ "چلو!"

پھر ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے شاخوں اور گنبدوں کے سہارے مسجد کی چھت پر جا پہنچے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ نیچے کے لوہے کے دروازے پر ضربیں اب بھی لگ رہی تھیں مگر تشویش ناک لمحات گزر چکے تھے۔ ہم پولیس کا جال توڑ کر نکل آئے تھے۔ مسجد کی چھت سے ہم رسی کے سہارے مسجد کی پچھلی سمت میں اترے۔ اب ٹیٹو میر ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔

مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر ہم کوئی پندرہ منٹ بعد چھوٹے سے ایک مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ٹیٹو میر کی پہلی دستک ہی پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے اسے پہچان لیا اور کہا۔ "آؤ آؤ! اندر آجاؤ! ہم سب تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس کے چھاپے کی خبر تم تک پہنچ چکی ہے!" ٹیٹو میر دروازے میں داخل ہو کر بولا۔ اس کے پیچھے ہم چاروں بھی اندر پہنچ گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔

"پولیس نے جب وہاں چھاپا مارا تھا اس کے پانچ منٹ بعد ہی یہاں خبر آگئی تھی۔" اس شخص نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے ہمارے لیے یہ انتہائی پریشانی کا سبب تھی۔ مجاہد اول کا کہنا تھا کہ پولیس کے چھاپے کی صورت میں وہ مکان چوہے دان بن گیا ہوگا حیرت ہے کہ تم لوگ پھر بھی وہاں سے فرار ہو کر یہاں آگئے! یہ کس طرح ہوا؟ مجاہد اول نے تم لوگوں کی مدد کے لیے کچھ افراد کو روانہ کیا تھا۔"

"بس نکل ہی آئے وہاں سے کسی نہ کسی طرح!" ٹیٹو میر نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "مجاہد اول کہاں ہیں؟"

"اندر ہیں۔" جواب ملا۔ اس وقت ہم ایک کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہمارے میزبان ساتھی نے دروازے پر تین مرتبہ مخصوص انداز میں دستک دی پھر ذرا ٹھہر کر دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے ہم سے اندر آنے کو کہا۔ ہم آگے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں بہت مختصر سامان تھا۔ ایک طرف چند مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ کونے کی ایک طاق میں چراغ جل رہا تھا جس کی لو دھیمی تھی۔ دیوار کے ساتھ مونڈھوں کے سامنے ایک تخت نظر آرہا تھا جس پر سفید چادر بچھی تھی اور گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تخت کے پہلو میں اونچی پشت والا مونڈھا پڑا ہوا تھا۔ کمرا اس اعتبار سے خالی تھا کہ ہمارے داخل ہونے سے پہلے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"مجاہد اول کہاں ہیں؟" ٹیٹو میر نے پوچھا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ اندر ہیں۔"

"معلوم نہیں۔ مجھے یہی علم تھا کہ وہ اندر ہیں۔" جواب دیا گیا۔ "بہرحال آپ لوگ یہاں بیٹھیں انتظار کریں۔ میں آپ لوگوں کے لیے گرم گرم قہوہ لاتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ پھر اس کے قدموں کی آواز دور ہوتے ہوتے بارش کے شور میں مدغم ہو گئی۔

"یہ تجربہ بھی یاد رہے گا۔" ٹیپو بولا اور لمبا سانس لیا۔ "مگر شاہین!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "فرار کی راہ آپ کو خوب سوجھی۔"

میں "ہوں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ میرے ساتھی اس مکان سے فرار پر گفتگو کر رہے تھے مگر مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو اس وقت کئی پریشان کن سوالات گردش کر رہے تھے۔ یہ سوالات اسی وقت سے مجھے پریشان کیے ہوئے تھے جب پولیس کا چھاپا پڑا تھا۔ سب سے پہلا اہم سوال تو یہی تھا کہ آخر پولیس کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم اس مکان میں چھپے ہوئے ہیں؟ میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ پولیس سے مخبری کرنے والا ہم ہی میں سے کوئی ہو سکتا تھا۔ وہ کالی بھیڑ کون تھی؟ میں سوچنے لگا۔ ٹیٹو میر، چاندنی بی یا وہ جس نے کوتوال شہر سے بندوقیں چھیننے کی مہم میں ٹیٹو میر کا ساتھ دیا تھا؟ یا ان میں سے کوئی جو ہمیں لاذ مریاد مرکی حویلی پر پہلی یلغار کے دوران میں ملے تھے؟ ان میں سے کون پولیس کا مخبر تھا؟ ظاہر ہے مخبری کے بغیر پولیس کو الہام تو نہیں ہو سکتا تھا۔

انہی پریشان کن خیالات کے ساتھ میرے دل میں خوشی کا ایک چھوٹا سا چراغ بھی جل اٹھا تھا، ایسی خوشی جس نے میرے دل کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن کو بھی تازگی بخشی تھی۔ مایوس کن صورت حال کے باوجود میں اپنے ساتھیوں کو خطرے سے بچا کر لے آیا تھا۔ میرے نزدیک یہ کامیابی اسلحہ ڈپو کو اڑانے سے زیادہ اہم تھی کیوں کہ اس میں کسی پہلے سے طے شدہ منصوبے پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کامیابی صرف میرے مشاہدے اور بروقت فیصلوں کا حاصل تھی۔

میرے ساتھی اب بھی اسی فرار پر محو گفتگو تھے۔ میں نے ٹیٹو میر سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ پولیس کو اس مکان کا کس طرح سراغ مل گیا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ واقعی یہ حیران کن اور تشویش

ناک ہے۔" ٹیٹو میر بولا۔

اسی وقت ہمارا میزبان ایک ٹرے میں گرم گرم قہوے کے پیالے لے کر آگیا۔ قہوے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"اس وقت اس سے بہتر اور مناسب تواضع ممکن نہیں تھی۔" میں نے قہوے کا پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!" اس نے جواب دیا اور قدموں کے واپس چلا گیا۔

ہم نے ابھی قہوہ پی کر پیالے رکھے ہی تھے کہ کمرے کے ایک کونے میں بنے ہوئے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب اپنی جگہ چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی دروازے پر لگا ہوا قفل کھول رہا ہو۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کیا چکر ہے؟ دروازے کا قفل کھولنے والا کون ہو سکتا ہے؟

"مجاہد اول ہیں شاید!" ٹیٹو میر نے خیال ظاہر کیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ میری نظر اسی طرف تھی۔ یہ دروازہ مکان کی پچھلی سمت میں ایک گلی کے اندر کھلا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی مجاہد اول، دبلے پتلے سے ایک شخص کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ مجاہد اول سیاہ برساتی، سیاہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور چہرے پر بھی سیاہ نقاب حسب معمول تھی۔

مجاہد اول نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ چراغ کی زرد روشنی میں نقاب کے سوراخوں سے مجاہد اول کی آنکھوں میں اطمینان کی لہریں دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لیا، برساتی اتار کر دو تین مرتبہ جھٹکے دیے جس سے پانی فرش پر گرا۔ پھر مجاہد اول نے اونچی پشت والے مونڈھے پر بیٹھنے سے پہلے برساتی ایک کیل سے ٹانگ دی اور دبلے پتلے شخص سے مخاطب ہوا۔ "قاسم! تم بھی بیٹھ جاؤ۔" دبلا پتلا شخص قاسم ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا تو مجاہد اول ہماری طرف متوجہ ہوا۔ "تو تم لوگ وہاں سے نکل آئے!" اس کی آواز میں مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تمہارے وہاں پھنس جانے سے بہت پریشانی ہو گئی تھی۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ کوتوال شہر پاگل ہو رہا ہے۔ گلی محلے کی طرف متعین پولیس والوں کی کم بختی آگئی ہے میرا خیال ہے کہ تم اس طرف سے فرار نہیں ہوئے۔"

"آپ کا خیال درست ہے مجاہد اول!" میں نے کہا اور پھر فرار کی تفصیلات بیان کر دیں۔

"بہت خوب شاہین! تم جیسے ایک بیدار مغز نوجوان ہو۔" مجاہد اول نے تحسین آمیز لہجہ اختیار کر لیا، پھر بولا۔ "اگر ذہن کو فعال رکھا جائے اور اس سے کام بھی لیا جائے تو

بربادی کو امید اور بربادی کو کامیابی میں بدلا جا سکتا ہے۔"

میں نے اپنی تعریف پر مجاہد اول کا شکریہ ادا کیا پھر کہا۔ "مگر جناب! پولیس نے وہاں آخر کس کی مخبری پر چھاپا مارا تھا؟"

"یہ سوال خود میرے لیے بھی تشویش کا سبب ہے۔" مجاہد اول بولا پھر قاسم سے مخاطب ہوا۔ "تم بتاؤ قاسم! اس پر تم کوئی روشنی ڈال سکتے ہو؟"

"نہیں جناب!" قاسم نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اس کا جواب ہمیں کل دوپہر تک مل جائے گا شاہین!" مجاہد اول نے خاص طور پر مجھے مخاطب کیا کیوں کہ میں نے ہی سوال اٹھایا تھا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم پر جو اعتماد کیا گیا تھا، تم نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو تعریف پر خوش ہوتا مگر میرا ذہن تو اس وقت الجھا ہوا تھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اچانک مجاہد اول کی بھاری آواز سے سناٹا ختم ہو گیا وہ کہہ رہا تھا۔ "تم سب مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہو۔ یقین کرو کہ اس سے پہلے کہ کسی پولیس والے کا ہاتھ تم میں سے کسی پر بھی پڑتا، وہاں خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ کیوں قاسم! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جی نہیں جناب!" قاسم نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"ٹیٹو میر!" مجاہد اول نے کہا۔ "قاسم کے لیے قہوہ لے کر آؤ، مسلسل بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے سردی لگ رہی ہے۔" پھر ٹیٹو میر اٹھ کر چلا گیا۔ مجاہد اول کے ایما پر میں نے گزشتہ شب کی پہلی مہم کی تفصیلات بیان کیں جو کوتوال شہر سے بندوقیں چھیننے سے لے کر لاذ مریاد مرکی حویلی پر ہماری ہی کارروائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں قاسم کے لیے گرم قہوہ بھی آگیا۔

"ساتھیو مجاہدو! اب ہمیں ایک نئی مہم درپیش ہے۔ یہ مہم ہماری اب تک کی تمام مہموں سے زیادہ خطرناک ہوگی شاہین!" مجاہد اول نے بتایا۔ "تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایک مرتبہ پھر اس خطرناک مہم میں حصہ لے کر آتش سے گزرنا پڑے گا۔"

"ہم تیار ہیں جناب!" میں بولا اور میرے ساتھیوں نے بھی یہی الفاظ دہرائے۔

"یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم لوگوں کو بلاوجہ مشکلات میں ڈال دیتا ہوں بلکہ یہ کہ تم سے بہتر ہماری صفوں میں کوئی اور

تمیں ہے۔" مجاہد اوّل کی آواز گونجی۔ "بات صرف اتنی ہے کہ میں جلالی ہی کے کسی مجاہد سے کوئی کام لینا نہیں چاہتا۔" میں اس موقع پر کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر مجاہد اوّل بول اٹھا۔ "خاموش رہ کر میری بات توجہ سے سنو! میں تمہارے جذبات سے واقف ہوں۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ یہاں پر اپنی کارروائی کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہارے شہر میں اگر ضرورت پڑی تو شاید وہاں تیتو میر' قاسم یا کوئی اور سرفروش یہی فرائض انجام دے رہا ہوگا جو تم یہاں انجام دے رہے ہو۔"

"ہمارے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آسکتا کہ آپ ہمیں مشکلات میں ڈال رہے ہیں یا ہم سے بہتر ہمارے ساتھیوں میں کوئی اور نہیں۔" نیپو نے اس مرتبہ ہماری ترجمانی کی۔

"بہرحال۔" مجاہد اوّل بولا۔ "جو مہم تمہیں سونپی جارہی ہے بہت اہم اور اسی اعتبار سے خطرناک بھی ہے۔ اسلحہ ڈپو کی تحقیقات کے لیے علی گڑھ سے کلکٹر یہاں پہنچ چکا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام بھی آچکے ہیں۔ مزید جن تین ضلعوں میں ہمارے ساتھیوں نے جو کارروائیاں کی ہیں' ان کی کامیابی کی اطلاع بھی موصول ہوچکی ہے۔ ایک ہی رات اور ایک ہی وقت پر چار جگہ اسلحہ ڈپوز کی تباہی سے حکومت بوکھلا گئی ہے۔ دہلی میں اعلیٰ انگریز افسران کا اجلاس طلب کرلیا گیا ہے جس میں ان واقعات پر غور و خوض کے بعد کوئی لائحہ عمل یا نئی حکمت عملی ترتیب دی جائے گی۔ یہ اجلاس کل ہو رہا ہے فوری طور پر شملے سے انٹیلی جینس کے چار بڑے افسران چاروں ضلعوں میں بھیج دیے گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک بڑا افسر جلالی آیا ہے۔ کل رات تمہیں پولیس کے اعلیٰ افسران میں سے کم از کم دو افسروں پر حملہ کرنا ہے۔ یہ کام بہت خطرناک ہے۔ یوں سمجھو کہ تم موت کے منہ میں جارہے ہو!" آخری الفاظ ادا کرکے مجاہد اوّل نے قاسم کی طرف دیکھا "کیوں قاسم ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟"

"بالکل جناب!" قاسم نے تائید کی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

قاسم کون تھا؟ اس کی اہمیت کیا تھی؟ میں اس وقت اس سے واقف نہیں تھا' لیکن اسے جس انداز میں مجاہد اوّل مخاطب کر رہا تھا' اس سے مجھے محبت اور پسندیدگی کی بجائے غصے اور ناپسندیدگی کا تاثر مل رہا تھا۔ معلوم نہیں واقعی ایسا ہی تھا یا یہ صرف میرا وہم تھا۔

"قاسم! تم کل شام تک ضروری تفصیلات سے شاہین کو آگاہ کردو گے۔" مجاہد اوّل نے کہا۔ "ہماری یہ مہم خطرناک بھی ہے اور اہم بھی! آؤ ہم سب مل کر ایک ساتھ یہ عہد کریں کہ اس سلسلے میں مکمل رازداری سے کام لیں گے۔"

اس کے بعد ہم سب نے حلف اٹھایا۔ مجاہد اوّل نے الماری سے کلام پاک نکال کر تخت پر رکھ دیا تھا۔ پھر ہم سب نے کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا تھا۔ "ہم سب جو یہاں موجود ہیں' اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے' اللہ کی مدد اور بھروسے پر اس مہم میں حصہ لے رہے ہیں اور ہم اللہ ہی سے نصرت طلب کرتے ہیں۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم مکمل رازداری سے کام لیں گے۔ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے' ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے۔ نہ ہم غداری کریں گے نہ غداری کا خیال دل میں لائیں گے۔ اگر ہماری صفوں میں سے کسی نے تنظیم سے غداری کی' مخبری کی اور ہمارے مقاصد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو ہم اسے سخت ترین سزا دیں گے۔ ہم اس سے کوئی رعایت' کوئی نرمی نہیں کریں گے۔ ہم میں سے ہر شخص' غدار کو وہی سزا دے گا جس کا غدار مستحق ہوتا ہے یعنی سزائے موت! اس سے کم سزا غدار کو نہیں دی جائے گی۔ اے اللہ! ہم سب کو اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمیں بدعہدی سے بچا اور بدعہد پر اپنا قہر نازل کر!"

ہم مکمل رازداری کا عہد کرچکے تھے۔ مجاہد اوّل نے کلام پاک کو پھر الماری میں رکھ دیا۔

"اب ہم اطمینان سے اپنی نئی مہم کی طرف بڑھ سکیں گے۔" مجاہد اوّل نے کہا۔ ہم سب اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ قاسم ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ "قاسم!" مجاہد اوّل اس سے مخاطب ہوا۔ "کل شام تک تمہیں تمام معلومات فراہم کردینا ہیں۔" مجاہد اوّل نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاسکتے ہو۔"

اس وقت مجاہد اوّل' قاسم کے قریب ہی تھا۔ مجاہد اوّل کے ہاتھ میں رومال کے دو کونے مضبوطی سے لپٹے ہوئے تھے اور رومال' سانپ کی طرح ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب اور پراسرار سا لگ رہا تھا۔

"میں کل شام تک تمام باتیں بتادوں گا۔" قاسم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

قاسم دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ مجاہد اوّل کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا رومال کا سانپ اپنی کنڈلی کھول کر قاسم کی گردن کے گرد لپٹ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجاہد اوّل کے دونوں ہاتھ ریشمی رومال کو لپیٹتے ہوئے قاسم کی گدی پر جم گئے تھے۔ قاسم کی آنکھیں ابل پڑی تھیں اور ہچکیاں حلق سے نیچے ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔

سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہم کچھ سمجھ ہی نہ سکے تھے' لیکن صورت حال ایسی تھی کہ ہم سبھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ ہے ایک غدار کا انجام!" مجاہد اوّل سرد انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں موت کی سی ٹھنڈک تھی۔ ہم سب پر سکوت سا طاری تھا۔ مجاہد اوّل اپنے ہاتھوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہے تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ قاسم کے ہاتھ فضا میں ادھر سے ادھر حرکت کر رہے تھے یوں جیسے وہ کچھ پکڑنا چاہتے ہوں۔ اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ وہ اس بے مہر دنیا کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ اب سے پہلے کبھی یوں میں نے اپنے سامنے کسی شخص کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے یہ بڑا عجیب اور سنسنی خیز تجربہ تھا جسے شاید میں الفاظ میں بیان نہ کرسکوں۔ ہم سحر زدہ کیفیت میں سب کچھ دیکھتے رہے۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ قاسم کا بے جان جسم فرش پر گر چکا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ کر انتہائی بھیانک لگ رہا تھا۔

"تم یہی پوچھنا چاہتے تھے نا شاہین کہ پولیس نے کس کی مخبری پر چھاپا مارا تھا؟" مجاہد اوّل نے کہا۔ "جواب تمہارے سامنے ہے۔ یاد رکھو ہر غدار کا تمہارے ہاتھوں یہی انجام ہونا چاہیے۔ ہمیں ہر قدم پر ان غداروں سے جو کنا رہنا پڑے گا۔"

تیتو میر نے بعد میں مجھے بتایا کہ پہلے روز جن تانگوں کے ذریعے لالہ مرلی دھر کی حویلی سے فرار ہوئے تھے' ان میں سے ایک تانگا قاسم کا تھا اور وہی اپنا تانگا چلا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا سمٹ کر صبح کے اجالے میں سما چکا تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور یہ صبح بڑی سوگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اس احساس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قاسم کی لاش ایک بنڈل کی صورت میں تانگے کے پائدان پہ پڑی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔

"یہ زندہ بھی تھا تو ایک بے جان لاش ہی تھا' چلتی پھرتی لاش!" مجاہد اوّل نے ہم سے کہا تھا۔ "سارا ہندوستان ایسی چلتی پھرتی لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔"

اتنا مجھے بھی معلوم تھا کہ قاسم کی موت ہمارے لیے سود مند اور زندگی نقصان دہ تھی۔ اگر وہ زندہ بچ جاتا تو ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ویسے تو اب بھی وہ ہمارے لیے جانے کیا کیا خطرات پیدا کرچکا تھا ہمیں علم نہیں تھا۔ ہمیں تو بس یہ معلوم تھا کہ اس نے ہماری سرگرمیوں کی مخبری کی تھی۔ ہماری تنظیم اور اس کے ارکان میں سے قاسم کس کس سے اور کس حد تک واقف تھا' اس کا علم مجاہد اوّل کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ابھی خطرات کو اپنی طرف بڑھتے محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت میں اور نیپو' تانگے میں کوتوالی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نیپو تانگا چلا رہا تھا۔ میں اس کے برابر آگے ہی بیٹھا تھا۔ قاسم کی لاش تانگے کے پچھلے حصے میں تھی۔ کوتوالی سے ذرا آگے پہنچ کر ایک درخت کے نیچے نیپو نے تانگا روک لیا۔ سڑک پر ابھی تک آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ نیپو نے گھوڑے کے منہ سے دانے کا تھیلا باندھ دیا تانگے کو ہمیں قاسم کی لاش سمیت یہیں چھوڑ دینا تھا۔ یہ تانگا بھی مرنے والے کا ہی تھا۔ قاسم کی لاش پر ہم نے ایک چٹ لگادی تھی۔ اس چٹ پر لکھا ہوا تھا "وطن پرستوں کی طرف سے کوتوال شرما کے لیے ایک تحفہ"

کام ختم ہوتے ہی میں نے اپنے جسم پر چادر لپیٹتے ہوئے نیپو کو خدا حافظ کہا اور پھر سڑک عبور کرکے سامنے ہی ایک کچی گلی میں گھس گیا۔

ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ مجاہد اوّل نے مجھے اور نیپو کو اس کام کے لیے کیوں منتخب کیا تھا! ہمارے اندازے کے مطابق پولیس کو چند اجنبیوں کی تلاش تھی۔ لگتا یہی تھا کہ کوتوال شرما کو لالہ مرلی دھر کی بیٹیوں کے اغوا کے سلسلے میں ہماری تلاش تھی۔ اس تلاش کا کوئی تعلق اسلحہ ڈپو کی تباہی سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی ان حالات میں دو اجنبیوں کا' جلالی کے باشندے قاسم کے تانگے میں ایک لاش کے ساتھ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم نے بلا تامل یہ خطرناک ذمے داری قبول کرلی تھی کیوں کہ ہمیں یقین تھا کہ مجاہد اوّل نے بلا سبب ایسا نہیں کیا ہوگا۔ احتیاط کے طور پر ہمیں ایک نئی شناخت بھی دے دی گئی تھی۔ مجاہد اوّل نے ہم سے کہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر پوچھ گچھ ہو تو ہم یہی بتائیں کہ حسین نقوی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں' ان کے مہمان ہیں۔ نقوی صاحب کون تھے' ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہمیں ابھی یہ حوالہ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ہاں ہمیں یہ ضرور معلوم تھا کہ جلالی میں سادات کی اکثریت ہے اور نقوی صاحب بھی انہی میں سے ہوسکتے تھے۔

مختلف کچی پکی گلیوں میں سے گزرتا ہوا میں اپنی منزل کی

طرف بڑھ رہا تھا۔ صبح کا اجالا اب پہلے کی نسبت اور پھیل گیا تھا۔ زندگی اب انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی تھی۔ گھروں کے دروازے کھلنے لگے تھے اور چہل پہل بھی نظر آنے لگی تھی۔ مکانوں سے بچوں اور بڑوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دکانیں بھی کھل رہی تھیں اور ان تمام آوازوں میں ایک شور اور سکون تھا۔ ایک گلی سے گزرتے ہوئے مجھے ایک حلوے پراٹھے والے کے گرد لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اس نے انگیٹھی پر حلوے کا تھال جما رکھا تھا اور موڑھے پر پراٹھوں کی تھی رکھی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزر کر تیز تیز قدم اٹھاتا آگے سے مڑ کر ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی، مگر ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک آشنا آواز بھی سنی۔ مجھ سے وہ کہہ رہا تھا۔ "ہیرالال جی! اس طرح منہ چھپائے کہاں جا رہے ہو؟"

میری رگوں میں جیسے خون جمنے لگا۔ یہ آواز لالہ مکی دھر کے نوجوان بھتیجے جوگیندر کی تھی۔ یقیناً اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میرا تعارف اس سے اسی نام سے ہوا تھا۔ میں نے تو اپنا نام ہیرالال ہی بتایا تھا اور خود کو بنارس ہندو یونیورسٹی کا طالب علم ظاہر کیا تھا۔ پلٹ کر جوگیندر کو جواب دینے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا، مگر اسی عرصے میں اس پوری گلی کا میں نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا۔ یہ ایک پتلی گلی تھی جو چالیس پچاس گز کے بعد ایک چوڑی سڑک پر جا نکلی تھی۔ مجھے اس سڑک کو عبور کر کے ایک گلی میں داخل ہونا تھا اور پھر کئی گلیوں سے گزر کر اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے لیے دانستہ میں نے طویل راستہ اختیار کیا تھا۔ گلی میرے لیے جو بے دال بن گئی تھی جس میں مجھے جوگیندر نے گھیر لیا تھا۔ وہاں بھی خاصی رونق تھی۔ گلی میں کئی گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جن کے چبوتروں اور سیڑھیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ منہ ہاتھ دھو رہے تھے اور دانت مانجھ رہے تھے۔ قصبوں اور دیہات میں عموماً لوگ صبح دم گھروں کے باہر ہی ہوتے ہیں۔

"کی فرمایئے!" صورت حال کا جائزہ لے کر میں نے جوگیندر سے کہا۔ پھر میں نے اپنے لہجے میں حیرت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"آپ نے نہیں پہچانا ہیرالال جی تو کیا ہوا، میں تو آپ کو پہچان گیا ہوں!" جوگیندر کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"یقیناً آپ کو دھوکا ہوا ہے، میرا نام ہیرالال نہیں ہے۔" میں حتی الامکان پرسکون آواز میں بولا۔

"رات ہی کو تو چاچا مکی دھر کی حویلی میں ہماری ملاقات ہوئی ہے ہیرالال جی! آپ نے بتایا تھا کہ آپ سیٹھ مہیش جی کے مہمان ہیں!" جوگیندر میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ شاید اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اس گلی سے فرار نہیں ہو سکتا۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور ابھی تک اس نے لوگوں کو اپنی مدد کے لیے نہیں پکارا تھا۔ یہ امر میرے لیے تسلی بخش تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے جھٹلانا چاہا کہ اسے دھوکا ہوا ہے، مگر ظاہر ہے وہ کہاں ماننے والا تھا۔ "ابے تم جھوٹ بول رہے ہو!"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا نام ہیرالال نہیں ہے۔" اس مرتبہ میں کچھ گرم ہو گیا۔

"تمہارا نام جو بھی ہو، میں تمہیں نہیں بھول سکتا! تم نے میرے چاچا لالہ مکی دھر کو کنویں میں اتارا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہی نے رادھا اور ساوتری کو بھی اغوا کیا تھا۔ زیادہ بننے کی کوشش مت کرو! یہ نہ بھولو کہ میں اسی وقت تمہیں پکڑوا بھی سکتا ہوں ورنہ سیدھی طرح میرے ساتھ ساتھ چلو!" یہ کہتے ہی اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ "سنو! تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا! بولو، پکڑے ہو کہ نہیں؟" اس کے سوال کے جواب میں دھمکی بھی شامل تھی۔ میری کچھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں کروں تو کیا کروں! اس سے کس طرح جان چھڑاؤں؟ فرار ہونے کی کوشش کرتا تو وہ شور مچا کر مجھے پکڑوا سکتا تھا۔

"تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" اس سے یہ سوال میں نے محض وقت گزاری کے لیے کیا تھا۔

"اپنے گھر۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگ رہی تھی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اناج منڈی کے پاس۔" اس نے مجھے بتایا۔

"مگر تم مجھے اپنے گھر کیوں لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے پھر سوال کیا حالانکہ یہ سوال بے مقصد ہی تھا۔ "مجھے جلدی ایک جگہ پہنچنا ہے۔"

"بلاوجہ بحث نہ کرو شاہین!" اس نے مجھے تنظیم کے شناختی نام سے مخاطب کیا۔ یہ بات میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

"کیا؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ویسے بھی میں کل رات تمہاری اداکاری کا قائل ہو چکا ہوں۔" جوگیندر کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ "یقیناً تم اس وقت پنچ، تیتو میر، حیدر علی اور کیا نام ہے اس کا ہاں یاد آیا سراج الدولہ کے پاس جا رہے ہو گے!"

میں گم صم سا ہو کر رہ گیا۔ شدید حیرت نے میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید جوگیندر بھی ہماری ہی خفیہ تنظیم کا ایک کارکن ہے۔ وہ ہم ہی میں سے ہے، مگر میرے مشاہدے کے مطابق ایسا ممکن نہیں تھا۔ ابھی تک تنظیم کے جتنے افراد بھی میرے سامنے آئے تھے ان میں سے کوئی بھی ہندو نہیں تھا۔ پھر یہ کہ عموماً مجاہد اوّل ہم ساتھیوں کو مجاہدو اور اسلام کے سپاہیو کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ کبھی اس نے واضح طور پر یا اشارتاً کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ تنظیم میں کوئی ہندو شامل نہیں ہو سکتا۔ یہی سوچ کر میں نے چاہا تھا کہ جوگیندر سے تنظیم کا شناختی جملہ کہوں۔

میں اسی لیے جوگیندر نے میری کلائی پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔ "بولو شاہین، چل رہے ہو یا کرا دوں گرفتار؟ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے ایک بات اور بتا دوں کہ یہی سوں کے مینار ہمارے لیے منزل کا نشان ہیں۔"

جوگیندر کے ادا کیے ہوئے آخری الفاظ میرے لیے حیرت انگیز صدمے کا سبب تھے۔ وہ یقیناً بہت کچھ جانتا تھا۔ اس وقت جوگیندر سے بگڑنا یا اس کی بات نہ ماننا تنظیم کے لیے نقصان دہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے انداز سے یہ بات ظاہر تھی کہ اگر میں نے اس کا کہا نہ مانا تو وہ مجھے گرفتار کرا دے گا۔ اس کے کہے ہوئے آخری الفاظ سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ ہماری تنظیم کا رکن نہیں ہے۔ میں نے اچھا ہی کیا تھا کہ شناختی جملہ نہیں کہا تھا ورنہ جواباً وہ یہی الفاظ دہراتا اور میں دھوکا کھا جاتا۔ اگر وہ واقعی ہماری تنظیم کا رکن ہوتا تو وہی بلوچی کہاوت دہراتا جو یہ تھی کہ جو سال بھی گزرتا ہے، سوں کے مینار بناتا ہوا گزرتا ہے۔ اسے جوابی شناختی جملہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے ان تمام باتوں پر غور کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "چلو!" اس نے میری کلائی چھوڑ دی، مگر میری طرف سے وہ چوکنا ہی تھا۔ میں بہرحال گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میری طرف سے اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ وہ بہرحال میرا دشمن نہیں تھا۔

☆☆☆

جلالی کے محلہ نصیر میں سید حیدر عباس صاحب کے گھر پر اسی روز شام کے وقت قصبے کے سرکردہ ہندو اور مسلمان لیڈروں اور اہم شخصیات کا اجتماع ہو رہا تھا۔ اس میں مجاہد اوّل کی سفارش پر مسلم کانفرنس کے ایک مندوب کی حیثیت سے میں بھی شریک تھا۔ یہ کانفرنس انہی دنوں دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ وہاں پہنچنے والوں میں پہلا شخص میں ہی تھا۔ بطور احتیاط میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی کلائی میں پٹی باندھ لی تھی۔

حیدر عباس صاحب نے میرا بڑا پرجوش استقبال کیا تھا اور پھر دیوان خانے میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ فرش پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میرے بعد وہاں پہنچنے والا جوگیندر تھا۔ اس کی بہن سیتا بھی اس کے ساتھ تھی۔ حیدر عباس صاحب نے بڑھ کر ان دونوں کا بڑی محبت سے استقبال کیا۔

"ارے ہماری بٹیا سیتا بھی آئی ہے!" حیدر عباس صاحب نے کہا۔

"سلام چاچا!" سیتا نے جھک کر ادب سے انہیں سلام کیا۔

حیدر صاحب نے سیتا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیں اور گھر کے اندر لے گئے۔ "ارے خوش ہو!" میں نے حیدر صاحب کی آواز سنی۔ "یہ سیتا بٹیا آئی ہے۔" یہ تعلقات صدیوں کے ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ تھے جنہیں بعض سیاست دانوں نے مصلحتوں اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

جوگیندر اس اجلاس میں اپنے باپ موہن لال کی جگہ شرکت کر رہا تھا۔ موہن لال ان دنوں کلکتے گیا ہوا تھا۔ ہر چند کہ موہن لال، لالہ مکی دھر کا سگا بھائی تھا مگر اپنے خیالات و نظریات میں مکی دھر سے بالکل مختلف تھا۔ دونوں بھائیوں میں اسی وجہ سے اختلاف تھا۔

حقیقتاً یہ اجلاس جوگیندر ہی کی اطلاع کی بنا پر ہو رہا تھا۔ اس نے آج صبح مجھے اپنے گھر لے جا کر جو کچھ بتایا تھا اس کے بعد یہ اجلاس ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا "جلالی میں ابھی مذہبی جنون زیادہ نہیں بڑھا ہے۔ لوگوں کے درمیان ابھی پرانے تعلقات کمزور نہیں پڑے ہیں۔ سیٹھ مہیش ایسے لوگوں کو وہ یقیناً یہاں ہندو مسلم فساد برپا نہیں کرنے دیں گے۔ یہاں کے رہنے والے کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ لوگ مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کا خون بہائیں، ان کے گھروں کو نذر آتش کر دیں، معصوم بچوں کو نیزوں پر چڑھائیں اور عورتوں کو بے حرمت کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں پہلے ہی اس خطرے سے آگاہ کر دیا جائے۔"

شدھی تحریک کے رد عمل میں کچھ عرصے قبل آگرہ اور کتار پور میں ایسے ہی اندوہناک ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔ جوگیندر نے انہی کی تصویر کھینچی تھی۔

میرے سیدھے ہاتھ کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی دیکھ کر جوگیندر ہنسا تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہین کو اب نہیں پہچانا جاسکے گا۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔ جواباً میں نے محبت سے اس کی کمر تھپک دی۔ پھر وہ بولا۔ "تم نے اچھا کیا۔ کوتوال شرما تمہاری گرفتاری کے لیے بولایا ہوا کتا بن گیا ہے۔ جہاں بھی اسے تمہارے ملنے کا شک شبہ ہوتا ہے' چڑھ دوڑتا ہے۔ ویسے دوست' تمہارا چہرہ بہت دھوکے باز ہے! کوئی بھی تمہیں دیکھ کر یہ شبہ نہیں کرسکتا کہ تم اتنی خطرناک شخصیت کے مالک ہوگے۔" ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ وہ اب مجھ سے جلالی کے قریب ایک عمارت کی تباہی اور دھماکوں کا ذکر کر رہا تھا۔ پھر ہم زیادہ باتیں نہیں کرسکے۔ لوگوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ سب سے آخر میں آنے والا پنڈت گردھاری لل تھا۔ جوگیندر ہر آنے والے کے بارے میں مجھے بتا رہا تھا۔ اس نے پنڈت جی کی آمد پر میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "یہ بہت بدبودار شخص ہے۔"

پنڈت گردھاری لل عجیب کینڈے اور نرالی شان کا آدمی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں' باہر کو ابلی ہوئی سی بڑی بڑی آنکھیں' گنجے سر پر لہراتی ہوئی چوٹی' سفید ململ کا کرتہ' سفید دھوتی اور آواز میں گرج' یہ تھا پنڈت گردھاری لل! حیدر صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے پنڈت جی کا استقبال کیا تھا۔

پنڈت جی نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔ "اور میر صاحب' آج ہم غلاموں کو کیسے یاد کرلیا؟"

"ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پنڈت جی!" حیدر صاحب انکسار سے بولے۔

"دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے میر صاحب!" پنڈت گردھاری لل نے کہا۔ "اور ہمیں تو تم لوگ آٹھ سو برس سے جلاتے آرہے ہو!" پنڈت جی کے لہجے سے واقعی جلے ہوئے دودھ کی بو آرہی تھی۔

اس مرتبہ جواب میں حیدر صاحب کچھ نہ بولے۔ پنڈت گردھاری لل' ملکھان سنگھ کے پاس بیٹھ چکا تھا۔ اس کے بعد دروازے بند کردیے گئے۔ شاید اب کسی کو نہیں آنا تھا۔ حیدر صاحب' میرے' اور جوگیندر سمیت اس اجتماع میں گیارہ افراد شریک تھے۔ ان میں جوگیندر سمیت چھ ہندو تھے۔ یہ دور تھا جب ہندوؤں کے ایک مخصوص ٹولے کو چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ برطانوی حکومت کے اشارے پر بعض متعصب عناصر اس اتحاد کو ختم کرانے کے لیے الزامات اور جھوٹ کے سہارے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے اتحادی پھیلا رہے تھے' اس کے باوجود ہندو مسلمان اکثر ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوجاتے تھے۔ خلافت حالانکہ پورے طور پر صرف مسلمانوں کا مسئلہ تھا ہندو بھی اس تحریک میں جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ ہندو لیڈر گاندھی جی بھی اکثر تحریک خلافت کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کانگریس سے تعاون و اشتراک کا مظاہرہ کرتے رہتے۔ مولانا جوہر کانگریس کے جلسوں میں تقریریں بھی کرتے۔ دوسری طرف گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی کے پروگرام دیا تھا' مسلمان اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ وہ سال تھا جسے گاندھی جی نے سوراج کا سال قرار دیا تھا اور سارے ہندوستان کو یہ نوید دی تھی کہ اس سال کے آخر تک ہندوستان کو سوراج مل جائے گا۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے کانگریس کو ہدایت کی تھی کہ سال تک تین ماہ کے عرصے میں ایک کروڑ روپے جمع کیے جائیں' کانگریس کے ایک کروڑ ممبر بنائے جائیں اور بیس لاکھ چرخے چلانے کا انتظام کیا جائے۔ اسی کے ساتھ گاندھی جی کی طرف سے ترک موالات کی مہم بھی جاری تھی۔ ہندوستان کے مسلمان تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی طرف سے چلائی جانے والی ان تمام مہمات میں جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔

اجلاس باقاعدگی سے شروع ہوچکا تھا۔ حیدر صاحب صدر مجلس تھے۔ انہوں نے اس اجتماع کی غرض و غایت بیان کرنے سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط بنانے اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی' پھر کہا "بھائیو! آج میں نے آپ کو ایک اہم معاملے پر غور کرنے کے لیے زحمت دی ہے۔" لوگ ہمہ تن گوش ہوگئے "یہ ہم سب کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ ہندوؤں کا بھی' مسلمانوں کا بھی! جلالی میں رہنے والے ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ۔۔۔"

"بس کرو میر صاحب!" پنڈت گردھاری لل نے حیدر صاحب کی بات کاٹ دی۔ "اب ہم ان چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آئیں گے۔" محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص گردھاری لل کی طرف متوجہ تھا۔ جوگیندر نے میرا ہاتھ دبایا۔ گردھاری کے جملے میں جو تلخی تھی' لہجے کی رعونت دو آتشہ ہوگئی تھی۔

"پنڈت جی!" حیدر صاحب بولے۔ "آپ یہ انگارے کیوں چبا رہے ہیں! پہلے میری پوری بات تو سن لیجے۔"

"یہ انگارے چبانے کی بات نہیں ہے میر صاحب!" پنڈت کے لہجے میں تلخی اور بڑھ گئی۔ "کان کھول کر سن لو' جلالی کا کوئی ہندو' تحریک خلافت کا ساتھ نہیں دے گا!"

"سارے ہندوؤں کو بدنام نہ کرو پنڈت جی!" جوگیندر بول اٹھا۔

پنڈت گردھاری لل نے اپنی بڑی بڑی گول آنکھوں سے جوگیندر کو گھورا۔ "تو چپ رہ موہن لال کے پوت!"

"جوگیندر نے ٹھیک کہا ہے۔" ملکھان سنگھ نے کہا۔ "ہاں میر صاحب! آگے کیا کہہ رہے تھے؟"

"نہیں ملکھان سنگھ جی!" اس مرتبہ سیٹھ رگھو ویر نے مداخلت کی۔ "پہلے پنڈت جی کو اپنی بات پوری کرلینے دو۔ ہاں پنڈت جی!"

"میں پہلے ایک بات آپ حضرات پر واضح کردوں۔" حیدر صاحب نے کہا۔ "میں نے آپ حضرات کو تحریک خلافت میں شرکت کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ اگر اس محفل کا کوئی تعلق بھی تحریک خلافت سے ہوتا تو میں پنڈت جی اور رگھو ویر کو ہرگز یہاں مدعو نہ کرتا۔ یہاں موجود تمام ہی افراد جانتے ہیں کہ تحریک خلافت کے سلسلے میں ان دونوں حضرات کو کبھی زحمت نہیں دی گئی۔" حیدر صاحب نے قدرے توقف کیا۔ ان کے چہرے پر ناگواری تھی۔ "میں نے آپ لوگوں کو صرف اور صرف جلالی کے ایک مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"میر صاحب!" پنڈت گردھاری لل ترخ کر بولا۔ "تم لوگ آٹھ سو برس سے ہمیں اسی طرح الو بنا رہے ہو۔ مختلف حیلے بہانوں سے تم نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اب تم لوگ پھر نیا جال پھیلا رہے ہو! مولانا جوہر نے گاندھی ایسے شخص کو الو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ وہ خلافت کی ڈگڈگی بجائے جا رہے ہیں۔"

"پنڈت جی!" ملکھان سنگھ نے بلند آواز میں تنبیہہ کی۔ "زبان سنبھال کے بات کرو! مولانا جوہر کے بارے میں تمہیں ایسے الفاظ نہیں کہنا چاہئیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" سیٹھ رگھو ویر درمیان میں بول اٹھا۔

"کیوں بات نہ کریں جی!" پنڈت گردھاری لل نے قہر آلود انداز میں ملکھان سنگھ کو گھور کر دیکھا۔ "ملکھان سنگھ جی! یہ لوگ سر پہ چڑھ رہیں گے ایک دن! تم ان لوگوں کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ بڑے پاپی ہیں۔"

"پنڈت جی!" اس مرتبہ ڈاکٹر بشن چند بولا۔ "بڑے شرم کی بات ہے۔ کم از کم اتنا ہی خیال کرلیجے کہ آپ یہاں مہمان ہیں۔"

"تم لوگوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔" گردھاری لل نے کہا۔ "پانئیر اخبار پڑھا کرو ڈاکٹر! مالویہ' سپرو اور سوامی آسنگر کی باتوں کو غور سے سنا کرو! سنو ڈاکٹر کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں! پھر تم کو معلوم ہوگا کہ ہمارے خلاف یہ مسلمان سازشیں کر رہے ہیں! یہ لوگ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے ہماری مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ افغانستان کا حکمراں سردار امان اللہ ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے تاکہ ایک بار پھر ہندوستان میں مسلمانوں کا راج قائم ہوجائے۔ معلوم ہے پھر کیا ہوگا ڈاکٹر' اگر راج پاٹ مسلمانوں کو مل گیا؟ پھر یہی محمد علی جوہر تمہاری گردن کاٹے گا۔"

اب مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔ "پنڈت جی!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "آپ نے مولانا جوہر پر جو الزامات لگائے ہیں' مولانا اپنی گرفتاری سے پہلے ان کے جواب دے چکے ہیں پانئیر اخبار کی بات نہ کریں! وہ انگریزوں کا کاسہ لیس ہے۔ اگر ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو' ایک کروڑ افغانیوں اور سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں سے اتنا ڈرتے ہیں تو پھر ہندوؤں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں پنڈت جی! آپ نے جو باتیں کی ہیں' انگریزوں کے پٹھو ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

میں کچھ اور بھی کہتا کہ پنڈت گردھاری لل بول اٹھا۔ "یہ کون ہے میر صاحب؟" اس کا لہجہ تلخ تھا۔ "کل کے اس چھوکرے سے تم میرا اپمان (توہین) کرا رہے ہو! یہ ہمارے نیتاؤں (رہنماؤں) کو انگریزوں کا پٹھو کہتا ہے۔ ارے تو کیا جھوٹ صرف ہندو کہتے ہیں اور سچ بولنے والے بس مسلمان ہی ہیں!"

حیدر صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ "یہ دہلی کی مسلم کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شریک تھے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "شاکر بیٹے! تم خاموش رہو۔" انہوں نے مجھے میرے ایک نئے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔ انہیں میرا یہی نام بتایا گیا تھا۔

"سنا ڈاکٹر صاحب!" سیٹھ رگھو ویر نے کہا۔ "پنڈت جی کی بات دھیان سے سنو!" رگھو ویر ایسا شخص معلوم ہوتا تھا جو لوگوں کو آپس میں لڑانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

"ہمیں اگر اس دیش میں رہنا ہے تو پھر مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے جال سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہ لوگ ہمارے

ہی ہاتھوں ہمارا گلا کٹوانا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں تو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں رگھوویر!" ڈاکٹر بشن چند بولا۔ "آج تم جو کچھ ہو' ایک مسلمان ہی کی وجہ سے ہو۔ کیا تمہیں یہ خیال بھی نہیں؟"

"یہ میرے دھرم اور میری قوم کا معاملہ ہے ڈاکٹر صاحب!" رگھوویر نے کہا۔ "میاں جی نے مجھ پر احسان کیا ہے میری قوم پر نہیں۔"

شاید بات اور بھی بڑھ جاتی کیوں کہ ڈاکٹر بشن چند نے رگھوویر پر مزید نکتہ چینی کی تھی مگر حیدر صاحب نے بات کو بڑھنے نہ دیا۔ انہوں نے ڈاکٹر بشن چند کو سمجھایا۔ "چھوڑیے ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھے! رگھوویر ٹھیک ہی کہتا ہے۔ وہ بات لالہ جی اور رگھوویر کے درمیان ہے۔ ویسے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ رگھوویر اور پنڈت جی آج اتنے برہم کیوں ہیں! بہرحال میں اب بھی ان دونوں کو اپنا دوست ہی کہتا ہوں۔ آپ لوگ شاید میری بات سن لیتے تو اتنی تلخی نہ ہوتی۔"

"میر صاحب! اس سینے میں آگ بھڑک رہی ہے۔" پنڈت نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"اور میں نے آپ لوگوں کو جلال میں اسی خون کی ہولی سے بچانے کے لیے بلایا ہے جسے بھڑکانے کی سازش ہو رہی ہے۔" حیدر صاحب موقع دیکھ کر فوراً بولے۔ "میں نے اس لیے آپ لوگوں کو بلایا ہے کہ جلال کو خون خرابے سے بچانے کی مشترکہ طور پر کوشش کی جائے جس کی تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ سیٹھ کیشن کے یہاں جو مسلمان ٹھہرائے گئے ہیں ان کا مقصد کیا ہے؟"

"تو آپ کہنے میں نئی بات!" پنڈت گردھاری تلخ انداز میں سوال کرنے لگے۔ "تو تم نے مسلمانوں کے بچاؤ کے لیے ہمیں بلایا ہے۔"

"میں نے اس پورے قصبے کو بچانے کے لیے آپ سب کو بلایا ہے۔" حیدر صاحب نے مضبوط لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

پنڈت پھر کچھ زہر اگلنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر بشن چند نے اسے ٹوک دیا۔ "ذرا چپ بھی بیٹھیے پنڈت جی! دوسروں کو بھی تو کچھ کہنے دیجیے! ہاں حیدر صاحب! کیا بات ہے؟ کیا سازش ہو رہی ہے؟ تاکہ ہم اس کا توڑ سوچ سکیں!"

"مجھے آج ایک پرچہ ملا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسی طرح کے پرچے پنڈت جی' موہن لال' بھگوان داس اور ٹھکری کے پاس بھیجے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر حیدر صاحب چپ ہو گئے اور جیب سے ایک پرچہ نکال کر بولے۔ "جو[...] بیٹے! پڑھ کر سب کو سنا دو۔"

جوگیندر نے حیدر صاحب کے ہاتھ سے پرچہ [...] اسی کے ساتھ اپنی جیب سے بھی ویسا ہی پرچہ نکالا [...] اس نے حیدر صاحب کے پرچے پر ڈالی پھر اپنا پرچہ [...] کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گھر پر جو پرچہ آیا ہے [...] ہے۔"

پھر جوگیندر نے وہ پرچہ پڑھ کر سنایا۔ پرچہ دل[...] کی طرف سے تھا۔ جس میں انہوں نے سیٹھ کیشن کے [...] مختلف علاقوں سے آنے والوں کا مقصد بیان کیا تھا۔ [...] میں یہ بھی لکھا تھا کہ سیٹھ کیشن کالا سنگھ اور وہ [...] ہندوؤں کے علاوہ گوکل شرما کی مدد سے جلال کے حفاظتی انتظامات میں شدھی تحریک کے بہانے مسلمانوں [کے] قتل عام کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ ان لوگوں کو [...] علاقوں سے بلایا ہے۔ پرچے میں یہ اطلاع بھی دی گئی [...] گوکل شرما نے ان لوگوں کو بندوقیں فراہم کی ہیں [...] دل پرستوں نے چھین لیا تھا۔ ساتھ ہی پرچے [...] خطرات کا بھی مختصراً ذکر کیا گیا تھا جو اس کے نتیجے [...] ہو سکتے تھے۔ اپیل کی گئی تھی کہ جن لوگوں کے نام [...] لکھے گئے ہیں وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے جلال [...] والے ہنگاموں اور متوقع خون خرابے سے بچانے کی [...] کریں۔

پرچہ پڑھے جانے کے بعد ایک اور ہنگامہ اٹھ کھڑا [...] اس ہنگامے کی وجہ پنڈت گردھاری لال ہی تھا۔ [...] ہنگامے کو ہوا دے رہا تھا۔ پنڈت کا کہنا تھا کہ ہندو [...] رہے ہیں' اس میں حق بجانب ہیں۔ مسلمانوں نے [...] کے خلاف زہر اگلتے ہوئے لالہ سکھ دھرمی [...] اغوا کا واقعہ نمک مرچ لگا کر سنایا۔

اس مرحلے پر جوگیندر نے مداخلت کی۔ اس [...] بتایا "پنڈت جی! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ [...] اور ساوتری اپنے گھر واپس پہنچ چکی ہیں۔ پھر آپ [...] اغوا پر اتنے کیوں بھڑک رہے ہیں! ابھی یہ بھی [...] سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ آپ کو [illegible] کے [...] کے اغوا کی شاید خبر نہ ہے۔ میں بتاؤں کہ اس غریب کسان کی بہن کو لالہ سکھ دھرم نے اغوا کرایا تھا پھر اس [...] حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ آپ کو تو یہ بھی معلوم ہو گا پنڈت جی کہ اس دیوی نے خود کو لالہ سکھ دھرم کی [...] سے بچانے کے لیے کنوئیں میں کود کر آتم ہتیا (خود کشی) [...]

[...] اور ایک غنڈے شبھو نے اس کی لاش کو ٹھکانے لگایا [...] جوگیندر بولتا ہی چلا گیا۔ درمیان میں پنڈت جی اور [...]ویر نے اسے روکنا بھی چاہا مگر وہ اپنی بات پوری کر کے ہی [...] ہوا۔ آخر میں وہ بولا تھا۔ "مجھے بتائیں پنڈت جی! اگر [...]ھا اور ساوتری کا اغوا کیا جانا بڑی بات ہے تو پھر غریب [...] کی بہن کو اغوا کیا جانا بھی بڑی بات ہے کہ نہیں؟ میں سمجھتا [...] ہوں پنڈت جی کہ رادھا اور ساوتری اب بھی اتنی ہی [...]پاک) ہیں جتنی اس وقت تھیں جب انہیں اغوا کیا گیا [...]"

"تم... تو جوگیندر!" پنڈت جی کو غصہ آ گیا۔ "تم بے[...]ت ہو گیا ہے۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"آپ کا وچار (خیال) شاید ٹھیک ہے پنڈت جی!" [...]یندر بولا۔ "کیوں کہ میں اپنے چاچا کو پاپی ہونے کے باوجود [...]ن بھی پاپی (اتیاچاری) نہیں کہہ سکتا' صرف اس کا مان (ادب) [...] کہ وہ ہندو ہیں اور میرے چاچا ہیں۔" جوگیندر کی آواز دکھ [...]جھل ہوتی گئی۔

"تو جوگیندر' تیری بہن سیتا اور تیرا باپ موہن لال [...] دھرم کے باغی ہو۔" پنڈت جی پھر جوگیندر پر برس پڑا۔ "تو [...] نشٹ ہے۔ ادھرمی (لامذہب) ہے تو تو پھر تو ایسی [...] نہیں کرے گا تو کون کرے گا! تیرا اور تیرے گھر والوں [...] دھرم نشٹ (ختم) ہو چکا ہے۔"

کچھ دیر ایسی ہی تند و تیز باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں حیدر [...]احب نے غصے سے کہا۔ "پنڈت جی! ہمیں بھی کچھ دور[...] ہمیں اب کر چکے تو بھی کٹ گئی ہے۔ ہمیں آپ [illegible] [...] خیال کریں' ہم آپ کے حصے میں نہیں [illegible] ہیں۔"

[...] اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ "میں اب بھی آپ [...] کی اپیل کروں گا کہ اس آگ کو بھڑکانے کی بجائے اسے [...] کی کوشش کریں۔ یہ آگ بھڑک اٹھی تو پھر آپ کے [...]ر بھی نہ بچ سکیں گے۔"

"اپنے گھروں کی فکر کرو تم میر صاحب!" پنڈت [...]دھاری لال چیختی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم لوگوں نے جو [...] ہے وہ کاٹنا ہی پڑے گا! کچھ لو میر صاحب! اچھی طرح کر [...] ہمارے اور تمہارے راستے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ ذرا [...] کہ جب تم ہندوؤں کو اپنے دین دھرم کے پرچار (تبلیغ) [...] بہانے مسلمان بناتے تھے تو اس پر ہمیں کوئی دکھ نہیں [...] تھا۔ اب مسلمانوں کو شدھی بنانے سے کیوں دکھ ہے [...]" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی رگھوویر [...] اٹھ گیا۔ ڈاکٹر بشن چند اور کرپال سنگھ نے ان دونوں کو سمجھا بجھا کر روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں رکے۔

میں سوچ رہا تھا کہ مذہبی تعصبوں پر فرقوں کا جو لاوا بھڑکانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں ان کا انجام کیا ہو گا؟ جب یہ فرقے آندھی اور طوفان بن جائیں گی تو میں اور جوگیندر ایسے لوگ انہیں کس طرح روک سکیں گے؟ کب تک اس طوفان کے آگے بند باندھتے رہیں گے؟ مگر مجھے لالہ سکھ دھرم' پنڈت گردھاری لال اور ایسے ہی دوسرے متعصب لوگوں کے مقابلے میں جوگیندر' کرپال سنگھ اور ڈاکٹر بشن چند ایسے لوگوں سے امید تھی کہ جب تک یہ لوگ زندہ ہیں ہندوستان کو مذہبی جنون کی قربان گاہ نہیں بنایا جا سکے گا۔ یہ لوگ عقل چاہے اور انسانیت پر یقین رکھتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں سے انسانیت کا بھرم قائم تھا۔ وہ دونوں چلے گئے تو باقی افراد نے متوقع خطرے کا تدارک کرنے کے لیے غور و فکر شروع کر دیا۔ سب نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ جلال اور اس کے گرد و نواح میں اس آگ کو پھیلنے سے روکنے کے لیے جو بھی ممکن ہوا کریں گے۔

جب میں جوگیندر کے ساتھ وہاں سے نکلا تو وہ بولا۔ "دیکھا تم نے کہ فرقوں کا زہر کتنا پھیل چکا ہے! اس زہر نے ذہنوں کو کتنا متاثر کر دیا ہے!"

کچھ دیر تک ہم ہندوستان کی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ چلتے وقت جوگیندر نے مجھے یاد دلایا کہ "تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"ہاں بھئی یاد ہے!" میں مسکرا کر بولا۔ "میں آج رات نو بجے لاج منڈی کے صدر دروازے پر پہنچ جاؤں گا۔"

☆☆☆☆

اس زمانے میں ہندو مسلم کشیدگی کا بیان کرتے ہوئے میں یہ تو بھول ہی گیا کہ جس روز جوگیندر مجھے اپنے گھر لے گیا تھا کیا ہوا تھا! یہ تو میں بیان ہی کر چکا ہوں کہ اس وقت کی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا تھا کہ جوگیندر کے ساتھ چلا جاؤں۔ اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا تو میرے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

جوگیندر کے گھر کا دروازہ اس کی بہن سیتا نے کھولا تھا۔ گھر میں صرف وہی تھی۔ جوگیندر نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہچانتی ہو انہیں؟"

"جمال بھیا!" سیتا حیرت سے بولی۔

دونوں بہن بھائیوں کا رویہ میرے ساتھ حاکمانہ نہیں' دوستانہ تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ محض اپنے گھر لے کر آنے کی وجہ سے جوگیندر نے مجھ پر سختی کی تھی۔ اس طرح

وہ مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اور جوگیندر بیٹھک میں تھے اور سیتا ہمارے لیے ناشتے کا بندوبست کر رہی تھی۔ میں نے منع بھی کیا مگر جوگیندر نہیں مانا۔ "میں جانتا ہوں ابھی تم نے ناشتا نہیں کیا۔" کچھ توقف کے بعد جوگیندر نے پھر کہا۔ "معلوم ہے گزشتہ رات تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

میں جواب میں کچھ نہ بولا۔ جوگیندر کے انداز گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دل میری طرف سے صاف ہے مگر میں محتاط اور چوکنا تھا۔ اس احتیاط کا سبب وہ حالات تھے جن سے میں گزر رہا تھا۔ ان حالات میں کسی پر اعتماد کرنا میرے لیے شدید خطرے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ جوگیندر بہرحال لالہ مرلی دھر کا بھتیجا تھا۔ رادھا اور ساوتری جنہیں میں نے اغوا کیا تھا اس کی چچا زاد تھیں۔ حالات و واقعات کا تقاضا تو یہی تھا کہ جوگیندر مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔

میرے چہرے سے جوگیندر نے شاید میری بے چینی کا سراغ لگایا اور بولا۔ "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی تک تم خود کو خطرے میں محسوس کر رہے ہو۔ یقین کرو کہ تم خطرے میں نہیں ہو۔ میں تمہیں گرفتار نہیں کراؤں گا۔ اس بات پر تمہیں اس وقت یقین آئے گا جب تم یہاں سے اٹھو گے۔" ذرا توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ "مجھے دراصل تم سے ایک کام ہے۔"

"تو بتاؤ تو سہی کہ وہ کام ہے کیا؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اس کام کے متعلق میں تمہیں اپنی بہن سیتا ہی کے سامنے بتاؤں گا۔ فی الحال تم اپنے ذہن سے ہر خطرے کو جھٹک کر میری بات سنو!"

ظاہر ہے کہ خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے کہا "ہاں کہو میں تمہاری بات توجہ سے سن رہا ہوں۔"

"جب تم حویلی سے چلے آئے تو سیٹھ مہیش کے بھیجے ہوئے آدمی وہاں پہنچ گئے۔" جوگیندر بتانے لگا۔ "انہی کی وجہ سے ہمیں رہائی ملی۔ چاچا جی کو بھی کنویں سے انہوں نے ہی باہر نکالا تھا۔ اس کے بعد کوتوالی میں اس واقعے کی خبر کی گئی اور پھر کوتوال شرما کو تلاش کر لیا گیا۔"

جوگیندر مجھے بتا رہا تھا کہ اس واقعے کے تقریباً ایک ہی گھنٹے بعد رادھا اور ساوتری واپس حویلی پہنچ گئی تھیں۔ کوتوال شرما بھی اس وقت تک حویلی آ چکا تھا۔ اس نے رادھا اور ساوتری کے بیانات لیے، ان سے سوالات کیے اور فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔ "کوئی دو گھنٹے کے بعد کوتوال حویلی آ کر رادھا اور ساوتری کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں بھی ان دونوں کے ساتھ گیا تھا۔ ان دونوں سے کوتوال اس مکان کی شناخت کرانا چاہتا تھا جہاں اغوا کے بعد انہیں رکھا گیا تھا۔ مکان تو وہ نہیں پہچان سکیں البتہ اس کمرے کی شناخت کر لیا جہاں ان دونوں کو پہلی رات ٹھہرایا گیا تھا۔"

میں نے جوگیندر کی پوری بات سن کر بڑے اطمینان سے کہا۔ "میں سمجھ نہیں سکا کہ تم نے مجھے یہ ساری روداد کیوں سنائی ہے! نہ میں ہردیال ہوں اور نہ شاہین! میرا نام تو ... ہے اور میں حسین نقوی صاحب کا مہمان ہوں۔"

"شاید تم اسی لیے میرے ساتھ خاموشی کے ساتھ آئے کہ میں تمہیں پکڑوا نہ دوں!" جوگیندر بولا "مجھے ... ہے کہ تم ایسے لوگوں کے لیے ناموں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ویسے شاہین صاحب یا ہردیال جی یا مقیم صاحب! ... نے ان تینوں شخصیتوں کو زخم کے اس واضح نشان سے ... ہے جو تمہاری سیدھی کلائی کے پنچے پر ہے۔ بچپن کی چوٹ کا شاید یہ نشان ہے۔ رادھا اور ساوتری نے اپنی ... سناتے ہوئے وہ نام بتائے تھے جن سے تم ایک دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے۔ یہ سارے ہی نام پہلی بار سن کر میں ... گیا تھا کہ فرضی ہیں۔ یہ سب نام آزادی کے ان مجاہدین کے ہیں جنہوں نے انگریزوں سے ٹکر لی تھی۔ انہی دونوں ... مجھے معلوم ہوا تھا کہ جس کو شاہین کہہ کر پکارا جا رہا تھا اس کی دائیں کلائی کے پنچے پر زخم کا ایسا سا واضح نشان ہے۔ اس ... بعد ہی میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہو گیا کہ ہردیال ... شاہین ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔" جوگیندر نے میری ... مسکرا کر دیکھا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "اب کلائی چھپانے سے کیا فائدہ! میں نے ابھی تک کوتوال شرما یا کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اس راز سے سیتا اور میرے سوا کوئی واقف نہیں ہے۔ جوگیندر ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں بہنوں ... بھی بتایا تھا، ہم آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کے مخصوص جملے ادا کرتے ہیں۔ یہ اندازہ انہوں نے اس ... لگایا تھا جب انہیں اغوا کیا گیا تھا۔ شبو پر حملہ کرنے والے ... نے کوئی جملہ کہا تھا مگر وہ انہیں یاد نہیں رہا تھا البتہ جو جملہ میں نے دیا تھا ان کے ذہن میں رہ گیا تھا۔ "اب کہو کیا اب بھی تم تمام باتوں کی تردید کرتے رہو گے؟" جوگیندر آخر ... بولا۔

انکار کی اب گنجائش نہیں رہ گئی تھی اس لیے میں

نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے۔"

"تمہارا دل شاید ابھی تک پوری طرح میری طرف سے صاف نہیں ہے۔ تم میری طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔" جوگیندر بولا۔

اس وقت سیتا ناشتا لے کر آ گئی اور ہم سب نے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ ان کے رویے اور حسن سلوک سے میرے دل میں پیدا ہونے والے خدشات بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے۔ جوگیندر نے مجھے بتایا کہ رادھا تمہاری شرافت اور اخلاق کا اعتراف کر رہی تھی۔ اس پر اسے چاچا مرلی دھر اور چاچی کی ڈانٹ بھی سننا پڑی تھی۔

اب یہ بات کھل ہی گئی تھی کہ رادھا اور ساوتری کو اغوا میں نے ہی کیا تھا تو اس اغوا کا سبب بیان کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ میں اسی لیے انہیں بتانے لگا۔ "رادھا اور ساوتری کو اغوا کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے باپ لالہ مرلی دھر کو یہ احساس ہو سکے، کسی کی بہن یا بیٹی کو اغوا کرانے سے والدین اور گھر والوں کے دل پر کیا گزرتی ہے! اور یہ کہ اغوا کرانا یا کرنا کس قدر ذلیل حرکت ہے! ہماری نیت صاف تھی اسی لیے ہم نے لالہ مرلی دھر کی طرح ان دونوں کی آبرو سے کھیلنا نہیں چاہا تھا، ان کی پاک دامنی پر اپنی ہوس کا داغ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔" یہ کہنے کے بعد میں اصل مقصد پر آ گیا۔ "تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یہ تو ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے، پہلے اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں!" سیتا نے کہا۔

"تم سیتا ہو اور یہ تمہارا بھائی جوگیندر ہے۔ تم موہن لال جی کی اولاد ہو اور لالہ مرلی دھر تمہارا چچا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کچھ بتانے کو رہ جاتا ہے!" میں بولا۔

"مگر ہم سیتا اور جوگیندر کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔ جس طرح تم ہردیال، شاہین اور مقیم کے علاوہ بھی کچھ اور ہو۔" جوگیندر نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔

"ہاں ہم کچھ اور بھی ہیں۔" اس مرتبہ سیتا بولی۔ "میرا بھائی جوگیندر مانا کہ مرلی دھر کا بھتیجا ہے، مگر اسی نے اپنے چاچا کے پاپ کی معافی دھنساری جا کر خیر محمد سے مانگی تھی اور اسے اس کی بہن کے کنویں میں ڈوب کر جان دینے کی بھی اطلاع دی تھی۔"

یہ بات میرے لیے واقعی حیران کن تھی۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "مگر خیر محمد کو اس معافی سے کیا ملا؟ اس کی بہن تو اسے نہیں مل سکی!"

"انسان کے جذبات کو سود و زیاں کی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔" جوگیندر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "یہ تم نے نقصان فائدے کی کیا بات کی! اگر تم نفع نقصان ہی کی بات کر رہے تو پھر یہ بتاؤ کہ اس سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ "مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی کہ تم ایسی کوئی بات کہو گے! میں اگر تم سے یہ پوچھوں کہ رادھا اور ساوتری کے اغوا سے کیا خیر محمد کو اس کی بہن واپس مل گئی؟ تو بولو تم اس سوال کا کیا جواب دو گے؟"

اس بات کا اب مجھے بھی احساس ہو گیا تھا کہ میری بات سے جوگیندر کو دکھ پہنچا ہے اسی لیے میں نے کہا "معاف کرنا جوگیندر، میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔"

"صدیوں سے جو لوگ اس دیش میں پیار و محبت سے رہ رہے ہیں، میری کوشش بھی یہی تھی کہ ان کے درمیان نفرتوں کی فصل نہ بوئی جائے۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سامنے اپنا نفع یا نقصان نہیں تھا۔ میں نے تو نیکی اور بھلائی کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔" جوگیندر کی آواز سے اس کے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں دوست!" یہ کہہ کر میں نے اسے گلے لگا لیا۔ "معاف کر دو مجھے میرے دوست!"

جوگیندر نے دوستانہ انداز میں میرے شانے پر تھپکی دی، پھر بولا۔ "مجھے تمہاری دوستی ہی کی ضرورت ہے۔ بولو دوستی نبھاؤ گے؟"

"یقیناً!" میری آواز میں عزم تھا۔ "میں دوستی نبھاؤں گا مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھے معاف کر دیا یا نہیں؟"

"معاف کر دیا نا دوست! بھگوان کی سوگند (قسم) اللہ کی قسم اور انسان کی قسم" اس کے لہجے میں بڑا کھرا پن اور سچائی تھی۔ دوستی، خلوص، محبت اور اعتماد کی نرم و گرم فضا ہمارے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ ہم تینوں اسی رشتے میں بندھ گئے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور خوابوں میں شریک ہوں۔ پھر ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں اور ان کا مقصد ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننا تھا۔

"ہم دونوں بہن بھائی کا خیال ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھارنا چاہتا ہے۔ تم نیک مقاصد کے حصول کی کوشش میں برائیوں کے خلاف برسرپیکار ہو۔ بتاؤ کیا ہمارا خیال صحیح ہے؟" جوگیندر بولا۔

"بڑی حد تک صحیح ہے۔" میں نے تصدیق کی۔

"ہم دونوں کافی عرصے سے ایسے ہی ساتھیوں کی تلاش کر رہے تھے۔" سیتا نے کہا۔ "مگر ہم اپنی جدوجہد کا رخ انگریزوں کے خلاف رکھنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو خالی ہاتھ ہیں۔ ہم کیسے ایسی جدوجہد کا آغاز کرسکتے ہیں!" میں بولا۔ میں ابھی پہلے ہی مرحلے پر انہیں سب کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا مقصد ان پر بے اعتمادی نہیں بلکہ محض احتیاط کے پیش نظر ایسا کررہا تھا۔

"یہ ہم بعد میں سوچیں گے۔" جوگیندر نے کہا پھر وہ کھل گیا۔ "فی الحال میں کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کررہا ہوں۔ ہمارے دیش کی اسی فی صد سے زیادہ آبادی دیہات میں ہے اور ہم وہیں سے اپنی جدوجہد کا آغاز کررہے ہیں۔"

"اور یہ بھی تو بتاؤ نا بھیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی ہیں اور ہمارے اس نیک مقصد میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔" سیتا بول اٹھی۔ "صدیوں سے زمینداری اور جاگیرداری کے جبر میں گرفتار لوگ یہ بھی بھول چکے ہیں کہ وہ انسان ہیں۔ بھوک، غربت اور جہالت اپنی تقدیر سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ بڑے دکھ کی بات ہے!"

"تو پھر؟" میں بولا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی مجھ سے کیا چاہتے ہیں!

"میرا کہنا یہ ہے کہ انقلاب دیہات سے نہیں شہروں سے پھوٹتا ہے۔" سیتا نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"لیکن تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" یہ سوال میری زبان پر آہی گیا۔

"تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے متعلق ہم نے بہت گفتگو کی ہے۔" سیتا نے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا خیال یہ تھا کہ اگر ہم اور تم مل جل کر کام کریں تو بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ ہم تمہاری تلاش ہی میں تھے اور خوش قسمتی سے آج بھیا کو تم مل ہی گئے۔"

میں نے انہیں بتایا کہ صرف میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، مجھے اس سلسلے میں اپنے قائد سے بات کرنا پڑے گی۔ جوگیندر اور سیتا کو میں نے یہ بھی بتادیا کہ میرا یا میرے ساتھیوں کا جلالی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کہتے ہوئے میرا ذہن ان کی تجویز ماننے پر آمادہ تھا۔ میرے خیال میں یہ ایک بہتر تجویز تھی۔ ان لوگوں کی مدد سے ہماری اطلاعات کے ذرائع وسیع ہوسکتے تھے۔ یہ لوگ ہندو ہونے کے سبب ہندو حلقوں کی فکر اور مسلمانوں کے خلاف بنائی جانے والی سازشوں سے ہمیں آگاہ کرسکتے تھے۔ ان لوگوں کے تعاون سے ہماری جدوجہد ایک بڑے دائرے میں داخل ہوسکتی تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم اب بھی میری طرف سے مطمئن نہیں ہوئے۔" جوگیندر نے کہا۔ "ایک طرح سے یہ غلط بھی نہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو کسی پر بھی جلد اعتماد نہیں کرنا چاہیے مگر آج رات ہی میں تمہیں اپنی نیک نیتی اور خلوص و وفاداری کا ثبوت فراہم کردوں گا! وہ ثبوت ایسا ہوگا کہ اسے میرے خلاف بھی استعمال کرسکو گے۔"

میں جوگیندر کے رویے اور اس کے انداز گفتگو سے متاثر ہوکر بولا۔ "نہیں میرے دوست! مجھے تم پر بھروسا ہے کسی ثبوت کی مجھے ضرورت نہیں۔" میں نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ میں نے ان دونوں بہن بھائی پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ان کے دلوں میں مجھے کوئی کھوٹ محسوس نہیں ہورہا تھا۔

"میں خود کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ثبوت پیش کروں گا۔" جوگیندر نے کہا۔ "مگر آج رات مجھے ایک اور کام ہے۔ سیٹھ مینش نے جلالی کے گرد و نواح میں جو دیہات ہیں ان میں مسلمانوں کو شدھی کرنے اور ان کے قتل عام کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ منصوبہ تمہاری رات کی کارروائی کے باوجود بدستور برقرار ہے۔ اگر ایسا ہوگیا، اگر وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہوگیا تو بہت برا ہوگا دوست! سارے علاقے میں ہندو مسلم فسادوں کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ میں اپنے طور پر آج یہ کوشش کروں گا کہ جلالی کے سرکردہ افراد سے مل کر انہیں اس تباہی کا احساس دلاؤں اور اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ نکال لوں۔ میرے لیے کافی خطرات ہیں۔ متعصب ہندو طبقہ مجھے، میرے پتا جی کو اور سیتا کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ لوگ انتہا پسند ہیں۔ یہ ہمیں کمیونسٹ، دھرم سے غدار اور مسلمانوں کا چمچہ کہتے ہیں۔"

"ویسے میرے خیال میں جوگیندر تمہارا طریقہ کار مناسب نہیں ہے۔ تمہیں تو انتہا پسند ہندو طبقے کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔" میں بولا۔ "میرے نزدیک یہ بہت ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح تم بہت آسانی کے ساتھ ان کے مذموم عزائم سے بروقت آگاہ رہو گے اور ان کا توڑ کرسکو گے۔"

"ان دونوں ہی بہن بھائی نے میری یہ تجویز پسند کی مگر سوچنا یہ تھا کہ ایسا کس طرح ہوگا؟" دفعتاً جوگیندر نے مجھ سے کہا۔ "سمجھ میں آگئی ترکیب!" پھر وہ مجھے تفصیل بتاتا رہا۔ اس میں ناکامی کے امکانات کم تھے۔

"تو پھر آج رات نو بجے اناج منڈی کے صدر دروازے

پر مل رہے ہو نا؟" سیتا نے یاد دہانی کرائی۔

"بالکل مل رہا ہوں۔" میں نے ان دونوں کو یقین دلایا۔

وہاں سے جب میں روانہ ہوا تو عجیب سے احساسات تھے۔ میں الجھن میں گرفتار تھا۔ جوگیندر سے اشتراک کا فیصلہ میرا تھا۔ اس سے میں نے جو وعدہ کرلیا تھا، ہر قیمت پر اسے پورا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی وجہ سے مجاہد اول کو اس سلسلے میں کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہاں میں اسے سیٹھ مینش کے منصوبے کے بارے میں ضرور بتاتا۔ میں اس سے یہ بہانہ کرسکتا تھا کہ جب میں قاسم کی لاش کو تانگے میں چھوڑ کر ہندوؤں کے ایک محلے سے گزر رہا تھا تو کچھ ہندوؤں کو منصوبے کے متعلق باتیں کرتے سنا تھا۔

پھر میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کے بعد مجاہد اول نے سید حیدر عباس کے گھر اجتماع کا بندوبست کیا تھا۔ مجاہد اول ہی نے وطن پرستوں کی طرف سے سرکردہ افراد کو خطوط بھجوائے تھے جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے۔

☆☆☆☆☆

جوگیندر کے رخصت ہوتے ہی میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ عقب سے مجھے حیدر صاحب کی آواز سنائی دی۔ "شاکر میاں! شاکر بیٹے!" میں پلٹ کر ان کی طرف بڑھا۔ ان کا سانس قابو میں نہیں تھا۔ غالباً وہ بہت تیز تیز چل کر میرے قریب پہنچے تھے۔ ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی۔

"بیٹے! تمہارے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔" حیدر صاحب اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ میں نے ان کی حالت ہی سے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر نہیں دیں گے۔ "تمہیں واپس ٹھکانے پر نہیں جانا!" انہوں نے تیزی سے بتایا۔ "اس مسجد میں چلے جاؤ۔ عصر کی نماز تک تمہیں وہیں ٹھہرنا ہے۔" انہوں نے ایک قریبی مسجد کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں، بات کیا ہے؟ کیا ہوا؟" میں نے ان سے دریافت کیا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں، صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہارا وہاں واپس جانا خطرے سے خالی نہیں۔" حیدر صاحب نے جواب دیا۔ "تم مسجد میں چلے جاؤ! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔" انہوں نے مجھے دعا دی اور واپس چلے گئے۔ انداز ایسا ہی تھا کہ وہ زیادہ دیر میرے قریب نہیں رکنا چاہتے تھے۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ دیکھ لیے جائیں! یوں بھی وہ ممکنہ خطرے میں گھر جاتے۔ خطرے کی نوعیت سے تو میں واقف نہ تھا، ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ میرے

ارد گرد خطرہ منڈلا رہا ہے۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں مسجد کی طرف بڑھا۔ موذن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مسجد میں قدم رکھتے ہی صحن کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی آیا ہوا شخص نظر نہ آیا۔ وضو کرنے کے بعد میں مسجد کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد نمازی آنے لگے۔ جماعت کھڑی ہونے سے پہلے وہ آپس میں سرگوشیاں کررہے تھے۔ ان کا موضوع گفتگو جلالی کے قریب تباہ ہونے والی ایک سرکاری عمارت تھی۔ عمارت کے تباہ ہونے سے پے در پے جو دھماکے ہوئے تھے، وہ میلوں تک سنے گئے تھے۔ قاسم کے قتل پر بھی تبصرے ہورہے تھے۔ اس تانگے والے کے قتل کو ہندوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ مجھے یہ سن کر ظاہر ہے حیرت ہی ہوئی۔ انہی کے ساتھ وطن پرستوں کے تذکرے بھی ہورہے تھے۔ لالہ سکھ دھر کی بیٹیوں کے اغوا کے ساتھ رضاکاری کے خیر محمد کی بہن کے حوالے بھی دیے جارہے تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سن رہا تھا۔ ان باتوں میں ایک گتھی سی بھی تھی جو سیٹھ مینش کے گھر آنے والے مہمانوں کی آمد، ان کے عزائم اور اسی ضمن میں طرح طرح کی افواہوں سے پیدا ہوئی تھی۔ لوگ مشتعل بھی تھے، غصے میں بھی لگتے تھے اور پریشان بھی نظر آرہے تھے۔ میری نظریں ہر آنے والے کا جائزہ لے رہی تھیں کہ شاید کوئی شخص میرے لیے پیغام لایا ہو۔ پیغام لانے والا میرے لیے قطعی اجنبی بھی ہوسکتا تھا۔ پھر جماعت کھڑی ہوگئی۔ نماز پڑھ کر دعا مانگنے کے بعد لوگ ایک ایک کرکے مسجد سے جانے لگے۔

پھر میرا انتظار ختم ہوگیا۔ نیپو ایک شخص کے ساتھ صحن مسجد سے اندر آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں میری طرف بڑھے تو میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے بعد ہم خاموشی کے ساتھ مسجد سے نکلے۔ باہر ایک بگھی کھڑی تھی۔ پہلے نیپو بگھی میں بیٹھا، پھر میں اور آخر میں وہ اجنبی سوار ہوا اور بگھی چل پڑی۔ ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں بھی بہ طور احتیاط ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ چند ہی منٹ بعد بگھی رک گئی۔ وہ ایک بڑی سی حویلی تھی جس کے اندر پہنچ کر بگھی رکی تھی۔

اس اجنبی نے ہمیں حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیا اور کہنے لگا۔ "مرغوب کے دوست میرے لیے بیٹوں ہی کی طرح ہیں۔"

میں نے نیپو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بتایا۔ "بھئی یہ مرغوب کے والد ہیں مسعود صاحب!"

"اچھا اچھا!" میں نے جلدی سے گردن ہلائی۔ "بڑی

خوشی ہوئی آپ سے مل کر!" مجھے اس وقت تک قطعی علم نہیں تھا کہ مرغوب کون ہے!

نیپو اس اجنبی سے مخاطب ہوا تھا۔ "مرغوب آپ کی جتنی تعریفیں کرتا تھا' میں نے اس سے بڑھ کر ہی آپ کو پایا۔ اگر عبدالرحمٰن اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا تو ہم ہرگز آپ کو زحمت نہ دیتے۔ بس کل صبح ہی ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس زحمت کے لیے بہرحال ہم معذرت خواہ ہیں۔"

"ارے نہیں بیٹا فرہاد!" سعود صاحب بولے۔ "یہ بھلا زحمت کی کیا بات ہے! تم مرغوب کے دوست ہو۔ جیسے مرغوب میرے لیے ہے ویسے تم ہو۔ کیوں عقیل میاں!" انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرا نیا نام عقیل ہے اور نیپو' فرہاد بن چکا ہے۔ جوگیندر نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہمارے لیے واقعی ناموں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسی جلالی میں اب تک میں کئی نام اختیار کرچکا تھا۔ مقصد اس کا محض اپنی اصل شناخت کو پردے میں رکھنا تھا جس سے مجاہد اوّل کے سوا جلالی میں کوئی اور واقف نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجاہد اوّل ابھی تک جلالی میں موجود تھا یا جاچکا تھا۔

"یہ سب آپ کی محبت ہے۔" میں نے سعود صاحب سے کہا۔ "میں تو اس کے حق ہی میں نہیں تھا کہ آپ کو تکلیف دی جائے مگر فرہاد نہیں مانا۔ یہ ضد ہوگیا کہ اب جلالی آئے ہیں تو عبدالرحمٰن سے مل کر جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ پھر رہنے کی کوئی جگہ تو چاہیے تھی۔" مجھے عبدالرحمٰن کے متعلق بھی کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہے! میں نے تو نیپو کا جملہ سن کر یہ بات کہہ دی تھی۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میری بات مناسب تھی بھی کہ نہیں!

مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ سعود صاحب کچھ بے چین سے تھے۔ چند مزید باتیں کرکے وہ چلنے لگے۔ "اچھا بیٹا فرہاد! میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ جلالی میں ان دنوں ہندو مسلم کشیدگی بڑھ رہی ہے' اسی سلسلے میں ایک میٹنگ ہے۔ تم دونوں یہاں آرام سے رہو۔ میں ملازمین سے کہہ جاؤں گا۔ وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔"

"تم نے یہ کہاں لاکر پھنسادیا؟" سعود صاحب کے جاتے ہی میں نے نیپو سے کہا۔

"میں نے جو کچھ کیا ہے' مجاہد اوّل کی ہدایت ہی پر کیا ہے۔" نیپو نے جواب دیا۔ "جلالی کے حالات اچانک ہی ہمارے لیے خراب ہوگئے ہیں۔"

"اتنے مختصر عرصے میں؟" میں نے حیرت کے ساتھ کہا۔ "حیدر صاحب کے یہاں اجلاس میں ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ تو نہیں ہوئے!"

"اچانک حالات نے ایسی کروٹ لی ہے کہ مجاہد اوّل کا سارا لائحہ عمل درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے۔" نیپو نے بتایا۔

"مگر مجھے تو یہاں بھی کچھ اچھے آثار نظر نہیں آرہے۔" میں نے نیپو کی طرف جھک کر بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ سعود صاحب کون ہیں؟ مرغوب' فرہاد' عقیل اور عبدالرحمٰن کون ہیں؟ میں نے سعود صاحب سے جو باتیں کی تھیں' ٹھیک بھی تھیں یا نہیں؟"

"مرغوب' انہی سعود صاحب کا بیٹا ہے جو علی گڑھ میں پڑھتا ہے۔ آج کل وہ دہلی گیا ہوا ہے۔ مجاہد اوّل اسے جانتے ہیں۔ مرغوب' عبدالرحمٰن کا بھی دوست ہے۔ وہ بھی علی گڑھ ہی میں پڑھ رہا ہے۔ فرہاد اور عقیل کی حیثیت سے ہم بھی وہیں علی گڑھ میں پڑھتے ہیں۔ یوں سمجھو' ہم دونوں گویا مرغوب اور عبدالرحمٰن کے دوست ہیں۔ ہم عبدالرحمٰن سے ملنے یہاں آئے تھے مگر آج اسے پولیس نے گرفتار کرلیا۔ ان دنوں وہ علی گڑھ سے جلالی آیا ہوا تھا۔ ہمیں اسی لیے سعود صاحب کے یہاں ٹھہرنا پڑا کیوں کہ عبدالرحمٰن کے گھر میں کوئی مرد نہیں۔"

"آخر اتنے ہیر پھیر کی ضرورت کیا تھی! ہم سیدھے مرغوب ہی کے گھر کیوں نہیں آگئے؟" میں بولا۔

"حقیقت کا رنگ گہرا کرنے کی غرض سے۔" نیپو نے جواب دیا۔ "ہم دونوں اس وقت دہلی سے آرہے ہیں۔ ہم یہاں ایک عمارت میں دھماکے ہونے اور اڑ جانے کی خبر سن کر یہاں آئے ہیں۔ مرغوب سے ہماری ملاقات دہلی ہی میں ہوئی تھی۔ یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ مرغوب ہمارا گہرا دوست ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے نیپو' مگر مجھے یہاں حالات بہتر دکھائی نہیں دے رہے۔ لگتا ہے کہ ہم کسی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔" میں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"محسوس تو مجھے بھی یہی ہورہا ہے۔" نیپو بولا۔ "سعود صاحب کا رویہ بڑا پُراسرار ہے۔ وہ کچھ پریشان اور تذبذب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ہماری طرف سے مطمئن نہ ہوں یا انہیں کسی طرح ہم پر شک ہوگیا ہو مگر مجاہد اوّل کی یہی ہدایت تھی کہ ہم سعود صاحب ہی کے یہاں ٹھہریں۔"

"میرا مطلب یہ نہیں کہ تم نے غلطی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں بہرحال ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ مجاہد اوّل سے بھی اندازوں کی غلطی ہوسکتی ہے۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کچھ سامان بھی ہے یا نہیں؟" میرے اس سوال کا جواب نیپو نے انکار میں دیا تو میں بولا۔ "یہ بات بھی تو سعود صاحب کو شک میں ڈال سکتی ہے کہ دہلی سے جلالی آنے والے دو نوجوانوں کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ نہیں نیپو' مجھے یقین ہے کہ انہیں ہم پر شبہ ہوگیا ہے۔ جلالی کے بچے بچے کی زبان پر ان چار اجنبیوں کا تذکرہ ہے جن کی پولیس کو تلاش ہے اور جو وطن پرست نامی ایک تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"پھر ان حالات میں کیا قدم اٹھایا جائے؟" نیپو نے مجھ سے سوال کیا۔

"فی الحال تو صرف محتاط اور پوری طرح چوکنا رہو!" میں نے جواب دیا' پھر پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ مجاہد اوّل کو اچانک حالات بگڑنے کا احساس کس طرح ہوا؟"

جواب میں نیپو نے مجھے کئی پریشان کن خبریں سنائیں۔ تیتو میر کو پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ وہ دوسرا تانگے والا قمر بھی پکڑا گیا تھا جو قاسم ہی کے ساتھ ہمیں لالہ ملی دھر کی حویلی سے ایک ٹھکانے تک لے کر آیا تھا۔ وہ مکان رؤف صاحب کا تھا جہاں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ رؤف صاحب کے بیٹے کا نام ہی عبدالرحمٰن تھا جسے پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے روک لیا تھا۔ گرفتاری تو رؤف صاحب ہی کی ہونا تھی مگر وہ ان دنوں اپنی "زمینوں" پر گئے ہوئے تھے۔ ان کی گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ رادھا اور ساوتری کو اغوا کرکے انہی کے مکان میں رکھا گیا تھا۔ ایک تشویش ناک خبر یہ بھی تھی کہ قاسم کی لاش پر ہم نے جو پرچہ چھوڑا تھا اسے پولیس نے چھپالیا تھا اور یہ افواہ پھیلادی تھی کہ قاسم کو ہندوؤں نے قتل کیا ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو مشتعل کرنا تھا کہ ہندو مسلم فساد کی راہ ہموار ہوسکے اور اس بہانے مسلمانوں کا قتل عام کیا جاسکے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ علی گڑھ سے پولیس کی بھاری جمعیت جلالی طلب کرلی گئی تھی۔ فوج کا ایک دستہ بھی جلالی پہنچ گیا تھا۔ جلالی کی ناکا بندی کردی گئی تھی۔ جلالی سے جانے والی ہر گاڑی' مسافروں اور سواریوں کو چیک کیا جارہا تھا۔ یہ بات عام تھی کہ پولیس چار اجنبیوں کی تلاش میں ہے جو جلالی کے باشندے نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ چاروں' میں' نیپو' حیدر علی اور سراج الدولہ ہی تھے۔ آخری خبر یہ تھی کہ اب وہ مکان بھی ہمارے لیے خطرناک ہی سمجھا گیا تھا جہاں ہم رؤف صاحب کے گھر سے فرار ہوکر پہنچے تھے۔ اندازہ یہی تھا کہ قمر تانگے والے اور تیتو میر کی گرفتاری' مقتول قاسم ہی کی نشان دہی پر ہوئی تھی۔ قاسم اس مکان سے بھی واقف تھا جہاں ہم نے فرار ہوکر پناہ لی تھی۔ بہ طور احتیاط اسی لیے وہ مکان بھی خالی کردیا گیا تھا۔ حیدر علی اور سراج الدولہ کو جلالی کی حدود سے بہ حفاظت باہر نکال دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہوچکے تھے۔

"اور ہم دونوں کو آج رات جلالی سے فرار ہوجانا ہے۔" نیپو نے بتایا۔ "یہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہے' اس کا فیصلہ تم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس وقت تک ہمیں یہیں سعود صاحب کے یہاں رہنا ہے۔" نیپو نے ان الفاظ کے ساتھ ہی اپنی بات ختم کردی۔

"اس کا مطلب تو یہ نکلا کہ مجاہد اوّل یہاں نہیں ہیں؟" میں نے ساری بات سن کر کہا۔

"تم نے یہ مطلب کیسے نکال لیا؟" نیپو مجھ سے قدرے بے تکلف ہوچکا تھا اور مجھے "آپ" کہنا چھوڑ دیا تھا۔

"اس طرح کہ اب جلالی میں ان سے ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "اگر وہ یہاں ہوتے تو ان سے ہماری ملاقات یقینی تھی۔ ایسی صورت میں یہاں سے فرار ہونے کے لیے ہمیں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کو نہ کہا گیا ہوتا۔ یوں سمجھو کہ اب ہم اپنے ہر عمل کے خود مختار ہیں۔ ہمیں خود اپنی حفاظت کرنا ہے اور پناہ بھی تلاش کرنا ہے۔ ان کی طرف سے ہمارے لیے یہ آخری بندوبست تھا۔"

"ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ہی ہو۔" نیپو بے یقینی کے سے انداز میں بولا۔

"ایسا ہی ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "اور اب ہماری ذمے داری بڑھ گئی ہے۔"

جواب میں نیپو کچھ نہ بولا اور خاموشی چھاگئی۔ مجھے سعود صاحب کا رویہ کسی بھی طرح اطمینان بخش نہیں لگ رہا تھا۔ میں ان کی طرف سے کھٹک گیا تھا۔ مجھے خطرات اپنے اردگرد محسوس ہورہے تھے۔ اچانک دور کہیں سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ابھری۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہی بگھی کہیں جارہی تھی جس میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے تھے۔ میں کھڑکی سے پلٹا ہی تھا کہ ایک ملازم چائے لے کر آگیا۔ چائے کی ٹرے اس نے میز پر رکھ دی اور کمرے سے باہر کرسی پر جا بیٹھا۔

میں کمرے سے نکل کر ملازم کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "سعود صاحب کہیں گئے ہیں؟" ملازم نے اقرار میں سر ہلایا تو

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "وہ کہاں گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم صاحب!" ملازم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کب تک آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔ اس کا جواب بھی لاعلمی میں ملا تو میں نے ایک چال چلی اور ملازم سے بولا۔ "ہم سے تو وہ کہہ رہے تھے ڈاکٹر کے پاس دوا لینے جا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ واپسی آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہو جائے گی۔"

"جی۔۔۔ جی ہاں صاحب! وہ۔۔۔ وہ دوا ہی لینے گئے ہیں۔" ملازم گڑبڑا کر بولا۔ "میں بھول ہی گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے نا جی!"

"بیگم صاحبہ کی بھی طبیعت خراب ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔ "مگر وہ تو اپنی طبیعت خراب بتا رہے تھے!"

"وہ۔۔۔ وہ جی۔ ان کی بھی طبیعت خراب ہے۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے، تم ایسا کرو کہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آؤ!"

ملازم میری بات سن کر وہاں سے فوراً دوڑ لیا۔ وہ یقیناً میرے مزید سوالات سے گھبرا رہا ہوگا۔

میں تیزی سے کمرے میں آیا اور نیپو کو مخاطب کیا۔ "فوراً یہاں سے نکل چلو! ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا ہے۔ خطرے کی تصدیق ہو گئی ہے۔"

نیپو موقع محل کی نزاکت دیکھ کر فوراً میرے ساتھ چل دیا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے ملازم اور میرے درمیان کمرے کے دروازے پر ہونے والی گفتگو سن لی ہو۔ ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پھاٹک سے گزر گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کسی نے ہمیں وہاں سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھاٹک سے نکلتے ہی ہم اور تیزی سے چلنے لگے۔ حویلی کی چار دیواری کا موڑ گھوم کر ہم ایک نیم پختہ گلی میں پہنچ گئے۔ گلی میں کوئی نہ تھا اس لیے ہم دوڑتے ہوئے اس سے گزر کر ایک اور تنگ گلی میں مڑ گئے۔ شام اب رات سے گلے مل رہی تھی۔

"اب کدھر چلنا ہے؟" نیپو نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے خود علم نہیں کہ کہاں جانا چاہیے۔ میرے ذہن میں حیدر صاحب کا نام آیا مگر اسے میں نے رد کر دیا کیوں کہ وہ تو مجھے خود ہی ڈرے سے نظر آئے تھے۔ جب انہوں نے مجھے پیغام دیا تھا تو یوں لگا تھا جیسے جلد از جلد مجھ سے جان چھڑا لینا چاہتے ہوں۔ "بس فی الحال چلے چلو!" میں نے نیپو کے سوال کا جواب دیا۔ میرے ذہن میں اچانک جوگیندر کا خیال آیا۔ میرے دل و دماغ نے اسی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہمیں وہاں پناہ مل سکتی تھی۔ پھر میں نے راستہ بدل دیا۔ اتنے عرصے جلالی میں رہ کر میں نے وہاں کے گلی کوچے اور راستے اچھی طرح اپنے ذہن میں محفوظ کر لیے تھے۔ چند قدم چلتے ہی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں جوگیندر کے گھر پہنچ چکے تھے۔ دونوں بہن بھائی ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پوری روداد سن کر جوگیندر بولا۔ "تمہارا فیصلہ درست ہے۔ ویسے مجھے اس پر خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ تم نے مجھے اپنا قابل اعتماد دوست سمجھ لیا ہے۔"

میں نیپو کا تعارف بھی اپنے ساتھی کی حیثیت سے کرا چکا تھا۔ جوگیندر، نیپو کو نام کی حد تک پہلے سے جانتا تھا۔

"مگر آپ کے دو ساتھی اور بھی تو تھے، وہ کہاں ہیں؟" سیتا نے پوچھا۔

"وہ دونوں جلالی سے جا چکے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "اگر میں نے جوگیندر سے آج ملنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو ہم دونوں بھی یہاں نہ ہوتے۔"

"تم یہیں ٹھہرو! میں معلوم کر کے آتا ہوں کہ سعود صاحب کے یہاں کیا ہوا تھا۔" جوگیندر نے کہا۔ "نیپو! تم میرے ساتھ چلو!"

"اور میں؟۔۔۔ میں۔"

"تم یہیں ٹھہرو گے۔" جوگیندر میری بات کاٹ کر بولا۔ "سیتا بڑی خوبصورت اور دلچسپ گفتگو کرتی ہے، تمہیں کوفت نہیں ہوگی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ "سیتا اکیلی یہاں رہے گی اور۔"

"اکیلی!۔ اکیلی کہاں رہے گی سیتا! تم جو ہو گے یہاں!" جوگیندر ہنسا۔ "ویسے مجھے تم پر اعتماد ہے اور اپنی بہن پر بھی بھروسا ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم لڑکیوں سے اتنے ڈرتے ہو تو پھر تم نے رادھا اور ساوتری کو کیسے اغوا کیا ہوگا!" سیتا نے شوخ لہجے میں کہا۔

"رادھا اور ساوتری نے جس انداز میں تمہارا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد کون کافر تم پر اعتماد نہیں کرے گا!" جوگیندر نے لفظ کافر پر زور دیا۔

پھر جوگیندر مجھے اور سیتا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ نیپو اس کے ساتھ تھا۔ اس نے جانے سے قبل نیپو کو اپنا ایک جوڑا پہنا دیا تھا جس سے نیپو ہندو معلوم ہو رہا تھا۔

سیتا واقعی بہت عمدہ گفتگو کرتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں بلا جھجک میں اس سے بات کرنے لگا۔ سیتا کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کی باتوں سے خوشبو سی آتی تھی۔ وہ بڑی کومل اور نازک سی لڑکی لگتی تھی مگر اس کے سینے میں شیر کا دل تھا۔ ہم باتیں کرتے رہے اور ہمارے درمیان حجابات کے پردے اٹھتے گئے۔ کئی بار میں نے اس کا لمس محسوس کیا اور میرا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ اس کے دراز گیسو بھی کئی بار میرے چہرے سے ٹکرائے اور میں نے خود کو کالی گھٹاؤں کے درمیان پرواز کرتا محسوس کیا۔ سیتا ایک ایسے نشے کی مانند تھی جو بہت آہستہ آہستہ چڑھتا ہے اور پھر حواس پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ پہلی بار اسے دیکھ کر میرا دل اس طرح قطعی نہیں دھڑکا تھا جس طرح کلونت کور کے لیے دھڑکنے لگا تھا۔ دوسری بار وہ مجھے قبول صورت اور اس ملاقات میں حسین معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کی رعنائیاں رفتہ رفتہ مجھ پر عیاں ہو رہی تھیں۔ کلونت کور محض دل کا معاملہ تھی مگر سیتا نے تو ذہنی سطح پر بھی مجھے متاثر کیا تھا بلکہ وہ تو ذہن ہی کے راستے میرے دل میں اتری تھی۔ رادھا نے تو بس کچھ دیر کلونت کور کی یاد کا جادو جگایا تھا مگر سیتا کا اپنا الگ ہی جادو تھا۔ وہ بے مثل تھی۔ اب وہ مجھے اپنا ایک البم دکھا رہی تھی۔

"یہ دیکھو!" اس نے مجھے اپنی ایک تصویر دکھائی۔ "یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے۔ میری ایک سہیلی نے یہ تصویر کھینچی تھی۔" اس تصویر میں سیتا ایک درخت کی ٹہنی پکڑے ہوئے کھڑی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے ساری اس کے شانوں، پیٹ اور سینے سے بالکل چپکی ہوئی تھی۔ درختوں کے پس منظر میں وہ خود بھی گلاب کی طرح لگ رہی تھی۔ میں اس تصویر کو دیکھتا رہا کہ صاحب تصویر کو یوں ابھی براہ راست دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے حسن کا نشہ میری رگ رگ میں اترتا جا رہا تھا۔

"کیوں، کہاں کھو گئے؟" سیتا کی آواز مجھے جیسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"خوابوں میں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "مجھے بنا رہے ہو؟"

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس وقت تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟ بتاؤ نا کہ کیا سوچ رہے تھے؟"

"برا مان جاؤ گی۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی حسین آنکھوں سے مجھے دیکھا، رخساروں پر بجلی سی سرخی دوڑ گئی اور آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم! میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مان سکتی۔" اس کے لہجے میں لرزش تھی اور یہ لرزش مجھے اچھی لگی تھی۔ اس کے گرم گرم سانس میری پیشانی کو بوسہ دے رہے تھے۔

میں خاموش رہا۔

"بولو نا شاہین! تم خاموش کیوں ہو گئے؟ سچ سچ بتاؤ تم کیا کہنے والے تھے۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"وہ بات کہنے کی میرے اندر ہمت نہیں ہے سیتا!۔ ہم دونوں دو کناروں پر کھڑے ہیں اور۔ کنارے کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ درمیان میں فاصلہ بھی بہت ہے، اتنا فاصلہ کہ سرگوشیاں سنائی نہیں دیں گی اور میں۔ میں تم سے جو بات کہنا چاہتا ہوں، وہ سرگوشی ہی میں کی جا سکتی ہے۔"

"شاہین جی! کچھ باتیں ان کہی اچھی لگتی ہیں، پھر بھی آدمی انہیں سننا چاہتا ہے اور۔ اور میری بھی یہی خواہش ہے۔"

"تو تم سمجھ گئیں کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں!" میں نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" اس نے خمار آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔

ہم دونوں بہت دیر تک اسی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ پھر وہ یوں ایک دم چونک کر الگ ہو گئی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھی ہو۔ میں بولا۔ "کیوں، کیا ناراض ہو گئیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا کر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور خواب آلود سی آواز میں کہا۔ "تم۔ تم میرے بھگوان ہو۔ میرے رام ہو! سیتا بھلا اپنے رام سے ناراض ہو سکتی ہے! کوئی پجارن اپنے بھگوان سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی!"

"میری دیوی! مجھے اتنا بڑا درجہ نہ دو!" میں نے یہ کہتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا۔

وہ عجب سرور، عجب نشہ تھا جس میں ہم دونوں ہی ڈوبے جا رہے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھتا میں نے خود کو سنبھال لیا۔

"سیتا! مجھے۔ تم مجھے برا نہ سمجھنا! معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے!" میں آہستہ سے بولا۔

اس نے اپنی لرزتی ہوئی مخروطی انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ "نہیں!۔ اگر تم برے ہو میرے رام تو پھر سیتا بھی بری ہے۔"

"نہیں سیتا! تم ۔۔ تم تو بہت اچھی ہو۔" شدّت جذبات سے میری آواز بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ "تم نے مجھے ۔۔ مجھے نہال کر دیا ہے۔"

"میرے دیوتا ۔۔ دیوتا!" اس کے ہونٹ لرزے اور اس مرتبہ وہ خود میرے قریب تر ہو گئی۔ "اب تم بچھڑ جاؤ گے اور میں برہا کی آگ میں جلتی رہوں گی۔"

"میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ مجھ سے الگ ہو گئی اور مجھے وہ تصویر البم سے نکال کر دے دی جو دکھائی تھی۔ "یہ تصویر تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔"

میں نے تصویر کو ہونٹوں سے لگا لیا، پھر شکریہ ادا کر کے تصویر جیب میں رکھ لی جسے اس نے ایک کاغذ میں لپیٹ دیا تھا۔ "پانی پلاؤ گی؟" میں بولا۔ وہ پانی لے آئی تو میں نے کہا۔ "پہلے تم پانی پیو!" اس نے میرے کہنے سے تھوڑا سا پانی پی لیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے گلاس لیا اور ٹھیک اسی جگہ اپنے ہونٹ رکھ دیے جہاں سے اس نے پانی پیا تھا۔ پانی پینے کے بعد گلاس کو میں نے میز پر رکھ دیا اور اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے پر جھک آیا۔

"اب نہ جانے ہم کب ملیں گے! اور ۔۔ اور مل بھی سکیں گے یا نہیں!" وہ بولی اور اس کا چہرہ مزید قریب آ گیا۔

"میں پھر تم سے ملنے آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے یہی امید ہے۔" اس کی انگلیاں میرے ہونٹوں پر لرز رہی تھیں۔ "اس ملاقات کی یاد کے طور پر!" اس نے اپنے ہونٹ میری پیشانی پر رکھ دیے۔ میرے جسم میں کپکپاہٹ سی اتر گئی۔ شاید ہم دونوں کے اس اضطراب کا سبب یہ تھا کہ ہمیں پھر کبھی ملاقات کا یقین نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے ہم نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی محبت کے کئی مراحل طے کر لیے تھے۔

"میں ہمیشہ انتظار کروں گی۔" سیتا خوابیدہ سی آواز میں بولی۔

"اور ۔۔ اور میں بھی!" میں نے کہا اور پھر ہم نے اپنے پیمانِ وفا پر اپنے گرم سانسوں اور کانپتے ہونٹوں کی مہر ثبت کر دی۔

ہم دونوں اسی لذت، سرور اور کیف کے عالم میں تھے کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے بدن میں کوئی تیز برقی رو سی دوڑ گئی ہے۔ اسی وقت سیتا ایک جھٹکے سے دور جا گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے سیتا کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میں اپنی نامانوس کیفیت و اذیت کے باوجود آگے بڑھ کر سیتا کو اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ میرے جسم کو بھی زبردست جھٹکا لگا اور میں چکرا کر فرش پر گرا۔

"شاہین!" سیتا مجھے گرتے دیکھ کر چیخ اٹھی اور فرش سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے آخری بار اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ زرد سا پڑ گیا تھا۔ پھر میرے جسم کو پے در پے جھٹکے لگنے لگے۔ اس سے مجھے بے پناہ اذیت اور کرب محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جھٹکے کھا کھا کر میرے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی، میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلا جا رہا تھا، دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے والی تھیں اور دل کو جیسے کوئی مٹھی میں لے کر زور سے بھینچ رہا تھا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور پھر میرا سانس رکنے لگا۔ میرے بدن کو پھر ایک شدید جھٹکا لگا اور میرے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔

"میرے دیوتا!" کسی نے مجھے پکارا تھا مگر میں کچھ دیکھنے کا اہل نہیں رہا تھا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ سانس پھر رکتا ہوا لگا تو میں نے سوچا کہ شاید میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ کسی نادیدہ قوت نے ایک بار پھر میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر بھینچا، مگر اب مجھ میں چیخنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ مجھ پر جاں کنی کا سا عالم طاری تھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ شدید کرب و اذیت کے باوجود میں کلمہ پڑھنے لگا، اس یقین کے ساتھ کہ اب میرا آخری وقت ہے۔ میرا سانس رک رک کر چل رہا تھا اور دماغ پر اندھیرے کی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ کلمے کے الفاظ بھی اب میرے ذہن سے محو ہوتے جا رہے تھے۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ جن پراسرار دشمنوں نے میرے باپ ہاموس کو قتل کر دیا تھا، وہ اب مجھ تک پہنچ چکے ہیں اور مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اسنی مجھے پہلے ہی ان کی طرف سے خبردار کر چکی تھی۔



ان لمحوں کی اذیت شاید وہ لوگ محسوس کر سکیں جنہوں نے موت سے پنجہ کشی کی ہو۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے مجھ پر جاں کنی کی سی کیفیت طاری تھی، مجھے یقین تھا کہ میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اپنے اردگرد خوشبو محسوس کی تو خاصی دیر تک مجھے اپنے ہونے کا گمان تک نہ ہوا۔

"میں سوچتا ہوں اس لیے ہوں۔" میرے ذہن میں کسی فلسفی کے الفاظ گونجے۔

میں بھی تو سوچ ہی رہا تھا!

اپنے ہونے کے احساس نے میرے خوابیدہ احساس کو جھنجوڑ دیا۔ گزرا ہوا کرب ناک واقعہ مجھے یاد آنے لگا۔ جن پُراسرار دشمنوں نے میرے باپ ہاموس کو قتل کر دیا تھا، وہ مجھ تک پہنچ چکے تھے اور مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان قاتلوں کی جھلک میں نہیں دیکھ سکا تھا کیوں کہ وہ نادیدہ تھے۔ میں نے انہیں صرف محسوس کیا تھا۔ اسنی نے مجھے بتایا تھا کہ جو نیک ہوتے ہیں، ان کی خوشبو ہوتی ہے اور ہم میں سے جو بد ہوتے ہیں، ان کے قریب آنے سے بدبو محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں نے اسی سے انہیں پہچانا تھا۔

بے ہوشی سے ہوش کی طرف یہ سفر صرف چند لمحوں کا تھا۔ یہی لمحے مجھے موت کی دہلیز سے زندگی کی سرحد تک کھینچ لائے۔ میں اندھیروں سے اُجالوں میں آ گیا۔ اپنے قریب میں نے جو مانوس خوشبو محسوس کی تھی، اسے میں نے اپنے انفاس میں اُتار لیا۔ وہی خوشبو تو میرے لیے زندگی کی خوش خبری بن کر آئی تھی۔

کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ "طارنوش! ۔۔ طارنوش بیٹے!" اس آواز میں التجا بھی تھی اور دکھ بھی، غم انگیز دیوانگی بھی تھی اور دبی دبی سسکیاں بھی تھیں۔ میں، وہ بھرائی ہوئی سی آواز سن رہا تھا۔ "میری جان، ہوش میں آؤ! سنو بیٹے! تمہاری اسنی تمہیں پکار رہی ہے۔ خدا کے لیے ہوش میں آؤ! خدانخواستہ تمہیں ۔۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ۔۔ تو پھر اسنی بھی نہ جی سکے گی۔ آنکھیں کھولو بیٹے!"

اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی لمحے مجھے اپنی پیشانی پر اس خوشبو کے بوسے کا احساس ہوا۔ یہ میرا انعام تھا۔ ایسی تازگی، ایسی فرحت، زندگی سے بھرپور۔ ایسی حرارت اور محبت اس سے پہلے کبھی میں نے محسوس نہیں کی تھی۔

پھر وہ جلد آنے کے لیے کہہ کر چلی گئی۔ کچھ دیر مجھے نقاہت سی رہی۔ میں فرش سے نہیں اٹھا اور لیٹے لیٹے ہی سیتا کی طرف کروٹ لی۔ میں نے اسے انگڑائی لے کر اُٹھتے دیکھا۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سے اٹھی ہو۔ اس کی نظریں میری طرف نہیں تھیں۔

"سیتا!" میں نے اسے پکارا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر وہ لپک کر قریب آ گئی۔ "کیا ہوا تھا؟ ۔۔ ہمیں کیا ہو گیا تھا شاہین؟" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا۔

"معلوم نہیں۔" یہ کہہ کر میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ "شاید ہم دونوں بہت دور نکل گئے تھے۔" میں نے دانستہ بات کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔

لمحے بھر کو اس کے حسین چہرے پر حیا کی سرخی نظر آئی۔ "ہاں شاید ۔۔ مگر مجھے کچھ یاد سا آ رہا ہے۔" وہ اپنی پیشانی رگڑنے لگی۔ "میں اور تم ۔۔ ہم دونوں فرش پر ۔۔ یہاں ہم کیوں ۔۔ کیوں لیٹ گئے تھے؟" وہ میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"شاید ہمیں نیند آ گئی تھی۔ ہم سو گئے تھے۔" بڑی حد تک اب میری نقاہت ختم ہو چکی تھی۔ "تم ایسا کرو کہ چائے بنا لاؤ! ۔۔ جوگیندرا اور نیپو کو اب تک لوٹ آنا چاہیے تھا۔ ہے نا؟" میں نے اس کے ذہن کو ایک اور طرف لگا دیا۔

"بھیا کی طرف سے فکر نہ کرو۔ وہ آ جائیں گے۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"اپنے لیے بھی۔" وہ اٹھنے لگی تو میں بولا۔

سیتا چائے بنانے چلی گئی اور اسی وقت اسنی لوٹ آئی۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کے ذہن سے وہ واقعہ محو کر دیا ہے۔"

"مگر مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔" میری آواز بہت دھیمی تھی۔ "مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے وہی تھے نا جنہوں نے ۔۔"

"ہاں وہی ہو سکتے ہیں مگر جب میں تم تک پہنچی وہ فرار ہو چکے تھے۔ میں انہی کی تلاش میں گئی تھی۔ مجھے اسی وقت خطرے کا احساس ہو گیا تھا جب میں نے خاشع کو دیکھا تھا۔ وہ دوغلا، جنات کے اس قبیلے سے ہے جنہیں ہم منافق کہتے ہیں۔ خود کو وہ مسلمان کہتا ہے مگر حقیقتاً مسلمان نہیں ہے۔ خاشع میرے پاس سردار ملیقا کا پیغام لے کر آیا تھا کہ میں سردار سے مل لوں۔ میں تمہاری طرف سے غافل نہیں تھی۔ تمہاری سرگرمیوں کا مجھے علم تھا۔ آج خاشع کی غیر متوقع آمد نے مجھے چونکا دیا۔ میری نظر میں وہ بھی مشتبہ رہا ہے۔ میں اسی لیے سردار ملیقا سے مل کر تمہارے پاس فوراً پہنچی اور وہ اثرات زائل کر دیے جو تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ نہیں طارنوش! اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھو! پہلے مجھے تمہاری حفاظت کا بندوبست کرنا ہے۔ میں پھر آؤں گی۔"

اسنی کی مخصوص خوشبو معدوم ہو گئی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ پوچھ سکا تھا۔ حفاظت کے

بندوبست کا مطلب یہی ممکن تھا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ مجھ پر دوبارہ بھی قاتلانہ حملہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں گھبرایا نہیں۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ بزدل سامنے نہیں آ رہے تھے اور اسی ان کی تلاش میں تھی۔ چھپ کر وار کرنے والے بزدل ہی تو ہوتے ہیں! چاہے ان کا تعلق عالم جنات سے ہو یا وہ انسانوں میں سے ہوں۔ میرے جسم کی کھوئی ہوئی توانائی اب پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ سیتا چائے بنا کر لے آئی پھر جب ہم چائے کے آخری گھونٹ لے رہے تھے تو نیپو اور جوگیندر بھی لوٹ آئے۔

”تو یہ عیش ہو رہے ہیں!“ جوگیندر ہنس کر بولا۔ ”اکیلے اکیلے چائے پی جا رہی ہے۔“

”تم لوگوں کے لیے چائے بناؤں بھیا؟“ سیتا نے پوچھا۔

جوگیندر اور نیپو دونوں ہی نے انکار کر دیا۔

”کیا رہا؟“ میں نے نیپو اور جوگیندر کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”تمہارا شک بالکل درست نکلا۔ سعود صاحب کوتوالی ہی گئے تھے۔“ جوگیندر بتانے لگا۔ ”کوتوال شرما انہی کے ساتھ ان کی حویلی پہنچا تھا اور اپنا سر پیٹ کے رہ گیا تھا۔“

”اب کیا ارادے ہیں؟“ میں مسکرا کر بولا۔

”نیک ارادے ہیں!“

”یعنی؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

جوگیندر نے جلالی سے اسی رات ہم دونوں ساتھیوں کے فرار کا جو منصوبہ بنایا تھا، میں اس سے مطمئن تو نہیں تھا مگر ان حالات میں کچھ اور ممکن بھی کب تھا! پولیس، جلالی کی ناکہ بندی کیے ہوئے تھی۔ فرار کا انحصار پولیس کی حماقت اور ہماری ذہانت پر تھا۔

○☆☆☆○

نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی کہ میں اور نیپو انہی پولیس والوں میں شامل ہو گئے جو گشت پر تھے۔ ہم دونوں کے جسموں پر پولیس کی وردیاں تھیں۔ ان وردیوں کے حصول کی خاطر ہمیں دو پولیس والوں کو تختۂ مشق بنانا پڑا تھا۔ انہیں ہم نے بے ہوشی کی حالت میں منہ میں کپڑا ٹھونس کے امرودوں کے ایک باغ میں ڈال دیا تھا جو چھوٹے بمبے (چھوٹی نہر) کے قریب تھا۔ وہ دونوں اسی طرف گشت پر تھے۔ ان کی سائیکلیں بھی اب ہمارے قبضے میں تھیں، نیز دوسرا سامان بھی! اس سامان میں ہمارے لیے ”قیمتی شے“ ایک ٹارچ تھی۔ بارش کے موسم میں سائیکل پر سفر ٹارچ کے بغیر ذرا مشکل ہو جاتا۔ پولیس کی حماقت آخر رنگ لائی۔ ہمارے جسموں پر وردیاں دیکھ کر کسی نے پوچھ گچھ ضروری نہیں سمجھی۔ ہم دونوں ہی سائیکلوں پر سوار تھے۔ ٹارچوں کی روشنی کئی جگہ ہم پر پڑی مگر ہمیں روکا نہیں گیا، انہوں نے یہی سمجھا کہ ہم بھی انہی کی طرح گشت پر ہیں۔ ہم پولیس کا گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

”شاہین! ہم ٹھیک سمت میں تو جا رہے ہیں نا؟“ جلالی سے کافی دور نکل آنے کے بعد نیپو نے سوال کیا۔

”لگتا تو یہی ہے، آگے اللہ مالک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سڑک پلیٹی ہی کی طرف جا رہی ہے۔ پلیٹی پہنچ گئے تو سمجھو آدھا راستہ طے ہو گیا۔“

جلالی اور علی گڑھ کے درمیان ایک جگہ کا نام پلیٹی تھا۔ اس جگہ علی گڑھ اور جلالی کے درمیان آنے جانے والے کچھ دیر ستا لیتے تھے۔ اسے پلیٹی کا اڈا کہا جاتا تھا۔ جلالی سے یہاں تک کچی سڑک تھی پھر پکی سڑک شروع ہو جاتی تھی۔ بارش کی وجہ سے پلیٹی تک کا راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ جگہ جگہ کچی سڑک دلدل کا نمونہ بنی ہوئی تھی پھر بھی ہم جیسے تیسے اس اڈے تک پہنچ ہی گئے۔ اڈا سنسان پڑا تھا۔ ابھی صبح ہونے میں خاصی دیر تھی۔

اڈے سے نکل کر ہم نے پولیس کی وردیوں سے جان چھڑائی۔ وردیوں کے نیچے ہمارے جسموں پر دوسرا لباس موجود تھا۔ وردیوں کو ہم نے سڑک کے کنارے دفنا دیا تھا۔ اپنے پیچھے ہم کوئی سراغ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو ہم نے ایک قریبی گاؤں کا رخ اختیار کیا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر دونوں سائیکلوں اور پولیس والوں سے حاصل ہونے والے سامان کو بھی ہم نے ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے لیے ہمیں پانی سے بھرا ہوا ایک بڑا سا گڑھا مل گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کا سفر ہم نے پیدل کیا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد ہم پھر اس پکی سڑک تک پہنچ گئے جو علی گڑھ کی طرف جا رہی تھی۔ سڑک پر آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جلالی کی طرف سے ایک یکا آتا نظر پڑا۔ اس میں صرف دو سواریاں تھیں۔ ہم نے اسے روک لیا۔ وہ علی گڑھ ہی جا رہا تھا۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد اچل تالاب کے اڈے پر میں اور نیپو جدا ہو گئے۔ رخصت ہونے سے پہلے وہ مجھ سے گلے ملا تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں نمی بھی دیکھی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ”ساتھی! کیا خبر اب ہم کبھی مل بھی سکیں یا نہیں، بھول میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا!“

”پاگل!“ یہ کہہ کر میں نے اسے پھر ایک بار گلے لگا لیا تھا۔

نیپو بھیڑ میں گم ہو گیا تو میں نے دودھ پور کی راہ لی۔ نیپو کو کہاں جانا تھا، نہ اس نے بتایا تھا نہ میں نے پوچھا تھا۔ جذبات کی رو میں آ کر تنظیم سے متعلق ارکان کبھی غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دیتے تھے۔ ہم سب ہی تنظیم کے اصول و ضوابط کا پورا خیال رکھتے۔ مجاہد اول کی ہدایات ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہتی تھیں۔

●●●✱✱●●●

میں کوٹھی پر پہنچا تو خالہ مجھے دیکھ کر لپٹ ہی گئیں۔ ”طارنوش! تو خیریت سے تو ہے نا بیٹے؟“ ان کی آواز بوجھل تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

مجھے علم تھا کہ خالہ سعیدہ مجھ سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتی ہیں مگر اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو میرے لیے خلاف توقع تھے۔ ”خیریت ہے خالہ مگر آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟ بیٹھیں، کیا بات ہے؟“ میں نے انہیں سہارا دے کر چوکی پر بٹھا دیا۔ ان کا جسم کانپ رہا تھا۔

”تیرے خالو کل ہی دہلی سے آئے تھے۔“ خالہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ ”انہیں کسی نے بتایا تھا کہ تو جلالی میں ہے اور پولیس تجھے تلاش کر رہی ہے۔“

”پولیس کو میری تلاش کیوں ہونے لگی خالہ؟ کسی نے ایسے ہی خالو سے بے پر کی اڑا دی ہو گی۔“ میں دانستہ انجان بن کر بولا۔ ”آپ یقین کریں کہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ پولیس مجھے تلاش کرتی پھرتی۔ میں جلالی گیا ضرور تھا مگر صرف گھومنے کے لیے۔ خالو جان کہاں ہیں؟“

”وہ تیری ہی طرف سے فکر مند ہیں اور اسی چکر میں کہیں گئے ہیں۔“ خالہ نے جواب دیا۔

خالہ کو مطمئن کر کے اور نہا کر کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تک بھائی عطا اللہ خان اور بھائی رحمت علی کالج سے واپس نہیں آئے تھے۔ میری خالہ زاد شگفتہ بھی گرلز کالج گئی ہوئی تھی۔ ملازمین کے علاوہ گھر میں صرف خالہ تھیں۔

بستر پر دراز ہو کر میں نے آنکھیں بند کر لیں تو سیتا کا چہرہ تصور میں آ گیا۔ چند ہی گھنٹوں کی رفاقت میں وہ میرے لیے حسین خواب بن گئی تھی پھر مجھے پُراسرار اسی کا خیال آیا۔ وہ میری حفاظت کا بندوبست کرنے گئی تھی اور اب تک نہیں لوٹی تھی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔ بہت دن بعد مجھے گھر کا سکون ملا تھا۔ میں سارے دن سوتا رہا۔ مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک ملازم نے جگایا اور بتایا کہ میرے خالو خان بہادر ثناء اللہ خان بلا رہے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں تھے۔

ابھی ملازم میرے کمرے سے گیا ہی تھا کہ بھائی عطا اللہ خاں یعنی میری خالہ کے بیٹے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ ”طارنوش! ابا جان سے دب کر بات نہ کرنا۔ میں تم سے صرف یہی کہنے آیا تھا، باقی باتیں تم سے رات کو ہوں گی۔“ بھائی عطا اللہ خاں میرے قریب بستر پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سے قدرے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ یقیناً ان کے علم میں بھی تمام باتیں آ چکی تھیں۔ ”اکثر وہ خان بہادری کے زعم میں یہ بھول جاتے ہیں کہ انگریز کبھی ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔“

میں نے ان سے بھائی رحمت علی یعنی اپنے ماموں زاد کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا، وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔

منہ ہاتھ دھو کر میں خالو جان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ میرے سلام کا جواب دے کر انہوں نے حقے کے لمبے لمبے کش لیے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”تو آ گئے آپ؟ کہاں کہاں گھومے پھرے؟“

میں ان کے قریب ہی ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ ”صرف جلالی گیا تھا۔“ میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

”جلالی! کس لیے گئے تھے تم وہاں؟“ ان کا لہجہ بدل گیا۔ انداز جواب طلبی کا تھا۔

”میں نے سنا تھا کہ جلالی کے قریب ہی کوئی بڑی سرکاری عمارت دھماکوں سے اڑ گئی ہے، وہی دیکھنے گیا تھا۔“

”اس عمارت کو دیکھنے گئے تھے یا جلالی میں لوٹ مار کرنے اور نوعمر کی لڑکیوں کو اغوا کرنے؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خالو جان؟“ اس کے سوا میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اتنے باخبر ہوں گے۔

”آپ نے ایک وطن پرست تنظیم بھی بنائی ہے! بہت خوب!“ ان کی آواز میں چبھن تھی۔

”آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے خالو جان!“ بھائی عطا اللہ خان کی ہدایت کے باوجود میں اب تک ان سے حفظ مراتب کے تحت گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بہرحال میرے بزرگ تھے۔ اپنے نانا جان کے سلسلے میں خود سری کا نتیجہ میں دیکھ چکا تھا۔ بعد میں مجھے پچھتانا پڑا تھا۔

”جھوٹ مت بولو!“ میری بات سن کر خالو جان نے مجھے

ڈانٹ دیا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں خالو جان کہ آپ کو غلط معلوم ہوا ہے۔ مجھے بتایئے کہ آپ تک یہ اطلاعات کس نے پہنچائی ہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' مجھے بلا سبب حکومت نے خان بہادر کا اعزاز دیا ہے!"

"مجھے تو بس یہ معلوم ہے خالو جان کہ انگریز اپنے وفاداروں ہی کو اعزازات اور خطابات سے نوازتے ہیں۔"

"بکواس!" وہ غصّے میں آ گئے۔ "مت بھولو کہ تم اس شخص سے گفتگو کر رہے ہو جسے خالو جان کہتے ہو۔ وطن پرستی کے نام پر تمہیں لوٹ مار کرتے اور لڑکیوں کو اغوا کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

"آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں خالو جان! مجھے بتایئے نا کہ آپ کو یہ باتیں کس سے معلوم ہوئی ہیں؟"

"بتا دوں گا۔" وہ کچھ نرم پڑ گئے۔ "پہلے تم یہ بتاؤ کہ میں نے جو کچھ کہا ہے' وہ سچ ہے؟"

"آپ نے جو کچھ کہا' سچ بھی ہے اور غلط بھی! انگریز حکومت اور ہندوؤں کے نقطہ نظر سے اسے سچ کہا جا سکتا ہے اور غلط اس بنا پر کہ حقیقت سے آپ ناواقف ہیں۔"

"الفاظ کے گورکھ دھندوں سے تمہارے جرائم پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھ پر اغوا اور لوٹ مار کے الزامات عائد نہ کیجیے! اگر میں مجرم ہوں خالو جان تو پھر ماضی میں وہ سارے لوگ مجرم کہلائیں گے جنہوں نے بدیسی غاصب حکمرانوں سے ٹکر لی' جو وطن کی خاطر قربان ہو گئے۔" میری آواز پُرجوش ہو گئی۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا تم نے مرلی دھر کی بیٹیوں کو اغوا نہیں کیا؟ اس کی تجوری خالی نہیں کی؟"

"جوان لڑکیوں کو اغوا کرنے کا مقصد انہیں بے آبرو کرنا ہوتا ہے اور ڈکیتی کا مقصد حرام کی دولت کو اپنے تصرف میں لانا ہوتا ہے۔ میں اپنے خدا سے شرمندہ نہیں خالو جان! مجھ سے یہ گناہ سرزد نہیں ہوئے۔"

"ہر مجرم کے پاس اپنے جرم کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرور ہوتی ہے مگر جرم ہر حال میں جرم ہے۔ قانون کی نظر میں کسی کی لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جانا اور کسی کی تجوری' طاقت کے بل پر خالی کر دینا' اغوا اور لوٹ مار ہی کے زمرے میں آتا ہے۔" خالو جان کے لہجے کی تلخی اب خاصی کم ہو گئی تھی۔

"میں کسی ایسے قانون کو نہیں مانتا جو مولانا حسرت اور مولانا محمد علی جوہر کی جدوجہد کو جرم اور انگریز حکومت کے ظلم کو جائز قرار دیتا ہو!"

"تم اچھی بحث کر لیتے ہو طارنوش! مگر تم نے جو کچھ کیا ہے' اس سے دکھ پہنچا ہے مجھے۔"

"لالہ مرلی دھر کے جرائم ایسے تھے کہ اسے اس سے کہیں زیادہ سخت سزا ملنی چاہیے تھی جو ملی! اس نے دھنساری کے ایک کسان خیر محمد کی بہن کو اغوا کیا تھا۔ میں نے مرلی دھر کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیا۔ میں نے میں یہ بھی کہا۔ "اور وہ دولت جو لوٹی گئی' مرلی دھر نے کے ہندو سیٹھوں سے بٹوری تھی۔ اس نے جلالی کے ہندوؤں سے مل کر مسلمانوں کو قتل کرنے اور شدھی منصوبہ تشکیل دیا تھا۔ وہ دولت اسی لیے جمع کی گئی تھی اسی سبب اس کی تجوری خالی کر دی گئی۔ اب وہ دولت سے بہتر کام پر صرف ہوگی۔ یقین کریں خالو جان کہ میں اس میں سے ایک پائی نہیں لی۔"

"تم کچھ بھی کہو طارنوش مگر مجھے تمہاری یہ روش نہیں ہے۔ تمہیں خبر نہیں کہ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ جلالی میں ہو اور پولیس تمہاری تلاش میں ہے' تو میری حالت ہوئی! تمہاری خالہ کا کیا حال ہوا! تمہیں اندازہ ہے وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہیں!"

"لیکن آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ پولیس میری تلاش میں ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔"

"تمہاری سیدھی کلائی کے پہنچے پر زخم کا یہ بڑا سا نشان پہلے ہی روز مجھے نظر آ گیا تھا۔" انہوں نے میرے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس شخص نے مجھے اطلاع دی تھی کہ تم نے جلالی میں حیدر عباس کے گھر کانفرنس کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی' اسی نے جلالی میں پیش آنے والے واقعات سے بھی آگاہ کیا تھا بتایا تھا' پولیس ایک ایسے نوجوان کی تلاش میں ہے جس کے سیدھے ہاتھ کی کلائی کے پہنچے پر زخم کا نمایاں نشان ہے۔ مجھے عطا اللہ سے جب یہ معلوم ہوا کہ تم اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کہیں سیر و تفریح کے لیے گئے ہو تو میں سمجھ گیا جلالی ہی گئے ہو گے۔ کلائی کے پہنچے پر زخم کا نشان تمہاری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ شاہین کا فرضی نام تم ہی نے اپنایا ہے اور پولیس کو دراصل تمہاری تلاش ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا' میں اب تمہاری یہ فضول حرکتیں آئندہ برداشت نہیں کروں گا' سمجھ گئے!"

"لیکن خالو جان! کیا آپ کی مشورہ مولانا جوہر او

مہاتما گاندھی جی کو نہیں دے سکتے؟" میرا لہجہ مؤدبانہ ہی تھا۔

"زبان نہ چلاؤ! بس کہہ دیا میں نے کہ آئندہ تم ان فضولیات میں حصہ نہیں لو گے! چلے ہیں بڑے وطن پرست بننے! جاؤ!" وہ پھر حقّے کے کش لینے لگے مگر اب ان کی تیوریوں پر بل نہیں تھے اور چہرہ بھی پُرسکون تھا۔ وہ شاید میری وضاحت سے مطمئن ہو گئے تھے۔ میں کمرے سے نکل آیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اسی روز ٹہلنے کی غرض سے بھائی عطا اللہ اور بھائی رحمت علی کے ساتھ میں کوٹھی سے نکلا۔ ٹہلنا تو خیر بہانہ تھا مگر اصل بات کچھ اور تھی۔ وہ دونوں یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ خالو جان سے میری گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا! اس کے علاوہ انہیں یہ فکر بھی تھی کہ پولیس کس طرح میری طرف سے مشتبہ ہو گئی؟ بھائی ہونے کے علاوہ وہ میرے تنظیمی ساتھی بھی تھے۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ میں مجاہد اوّل کے حکم پر کہیں گیا ہوں مگر یہ خبر نہیں تھی کہاں گیا ہوں! جو باتیں انہیں خالو جان کے توسط سے یا خالہ جان سے معلوم ہوئی تھیں' وہی ان کی معلومات کا ذریعہ بنی تھیں۔

مختصراً میں نے انہیں صرف وہی واقعات بتائے جو کسی حد تک پہلے ہی ان کے علم میں آ چکے تھے۔

"پولیس کو کسی نوجوان شاہین کی تلاش ہے' میری نہیں!" میں نے ہنس کر کہا۔ "رہی پہنچے پر زخم کے نشان کی بات تو ایسے نشانات نہ جانے کتنے لوگوں کے جسموں پر ہوں گے۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ نوجوان جسے جلالی میں دیکھا گیا تھا' ہندوستان کی بائیس کروڑ آبادی میں کہاں گم ہو گیا' کسے معلوم!" میرے انداز گفتگو سے وہ دونوں ہی مطمئن ہو گئے۔ انہیں میں نے خالو جان سے ہونے والی گفتگو بھی اختصار کے ساتھ بتا دی تھی۔

"حیرت ہے طارنوش کہ ابا جان کو تم نے رام کر لیا ورنہ ہم تو بہت پریشان تھے۔" بھائی عطا اللہ بولے پھر انہوں نے ایک بند لفافہ جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "تمہارے لیے اس میں مجاہد اوّل کا کوئی پیغام لگتا ہے۔ سبز رنگ کا یہ لفافہ عموماً وہی استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے ان سے وہ لفافہ لے کر جیب میں رکھ لیا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ "آپ تک یہ لفافہ کس طرح پہنچا؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہم دونوں کالج سے لوٹ کر آ رہے تھے تو راستے میں ایک بچہ یہ لفافہ پکڑا کر چلا گیا۔ مخصوص لفافہ اور تمہارا نام دیکھ کر اسے میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ دوپہر کو تم سو رہے تھے پھر سو کر اٹھے تو ابا جان نے تمہیں طلب کر لیا اور اب موقع ملا کہ میں تم تک یہ لفافہ پہنچا دوں۔" بھائی عطا اللہ نے وضاحت کی۔

اس لفافے میں کوئی فوری نوعیت کا پیغام بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچا ضرور مگر کچھ کہا نہیں' نہ وہ لفافہ کھول کر سرِراہ پڑھا۔

"طارنوش! میں نے موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بندوبست کر دیا ہے کہ کالج سے تمہاری غیر حاضری ثابت نہ کی جا سکے۔" بھائی رحمت علی نے بتایا۔

"آپ نے ٹھیک ہی کیا مگر غیر حاضریاں تو اب آئندہ بھی ہوتی رہیں گی" میں نے کہا۔ "چلیں اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم کوٹھی واپس آ گئے اور میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی جیب سے لفافہ نکال لیا۔ لفافہ چاک کر کے میں نے پرچہ نکالا۔ وہ مختصر سا پیغام تھا۔ "کمپنی باغ میں رات کو دس بجے ملو!" اس فقرے کے نیچے ہاتھ سے بنائے ہوئے مختصر نقشے میں اس جگہ کی نشان دہی کی گئی تھی جہاں مجھے مجاہد اوّل سے ملنا تھا۔

اس وقت آٹھ بجنے والے تھے اور ابھی دس بجنے میں دیر تھی اس لیے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پیغام فوری نوعیت کا ثابت نہیں ہوا تھا۔ دودھ پورے سائیکل کے ذریعے کمپنی باغ تک کا راستہ آدھے پون گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا پھر بھی میں نو بجے کے قریب کوٹھی سے نکل گیا۔ جلدی نکلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کمپنی باغ میں نے اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے باغ کا وہ حصہ بھی تلاش کرنا تھا جہاں نقشے کے مطابق پیڑوں کا جھنڈ تھا اور اسی کے پیچھے چھوٹا سا سبزہ زار تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو باغ کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سائیکل اندر لے گیا۔ دائیں جانب باغ کے عقبی حصے میں مجھے پیڑوں کا جھنڈ تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ باغ کے گرداگرد رہائشی علاقہ تھا۔ اس وقت بھی لوگ باغ میں تھے مگر تعداد خاصی کم تھی۔

میری توقع کے مطابق وہ سبزہ زار نیم تاریک ہی تھا۔ میں نے سائیکل کو تالا لگا کر ایک پیڑ کے سہارے کھڑا کر دیا اور قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ مجاہد اوّل کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مقررہ وقت پر وہ پہنچ گیا۔ وہاں دور تک میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

"ادھر آ جاؤ!" وہ یہ کہتا ہوا میرے عقب سے گزرا تھا اور میں نے اس کی بھاری آواز پہچان لی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سبزہ زار کے اس گوشے کی طرف بڑھ رہا تھا جو

تقریباً تاریک تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

اس تاریک گوشے میں بیٹھ جانے کے بعد مجاہد اوّل نے جلالی سے بہ حفاظت نکل آنے پر مجھے شاباش دی' سعود صاحب کی حویلی سے فرار کے فیصلے کو سراہا اور موقع محل کے مطابق فیصلے کرنے کی تعریف کی پھر وہ کہنے لگا۔ "جوگیندر' ٹیپو اور تم نے سیٹھ مہیش' پنڈت گردھاری مل نیز دیگر متعصب اور باأثر ہندوؤں کو ہراساں کرنے کے لیے کل رات جو کچھ کیا' وہ مناسب نہیں تھا۔ وہ تمھاری ہی تجویز تھی؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ہم نے فرار ہونے سے قبل ان باأثر متعصب ہندوؤں کو اغوا کرلیا تھا جو جلالی اور اس کے گردونواح میں فسادات کی آگ بھڑکانے کی تیاریاں کررہے تھے۔ اس سلسلے میں جوگیندر اور اس کے ساتھیوں نے ہماری مدد کی تھی۔ انہیں ہم نے دھمکی دی تھی کہ اگر جلالی' دھنساری یا اردگرد کے کسی بھی گاؤں میں فساد ہوا تو ان سب کو قتل کردیا جائے گا۔ دھمکی دینے کے بعد انہیں ضربیں پہنچا کر بے ہوش کردیا گیا تھا پھر ان کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا ہم نے انہیں اناج منڈی کے صدر دروازے کے سامنے ڈال دیا تھا۔ یہ معلوم ہو کہ اس جگہ غلہ وغیرہ پڑا ہے' ایک ترپال بھی انہیں اُڑھا دیا تھا۔ اس کارروائی کے کچھ ہی دیر کے بعد میں اور ٹیپو' جوگیندر کے گھر سے روانہ ہوگئے تھے۔

مجاہد اوّل کو اس واقعے کی اطلاع دینے والا تنظیم ہی کا کوئی رکن ہو سکتا تھا۔

میرا جواب اثبات میں سن کر مجاہد اوّل نے برہمی کا اظہار کیا۔ "آیندہ کے لیے ایک بات ذہن نشین کرلو کہ تم اپنی سرگرمیاں صرف اپنی مہم تک محدود رکھو گے! تمہیں اس کا اندازہ تو ہو گا ہی کہ تم نے لالہ مرلی دھر کے خلاف اپنے طور پر قدم اٹھا کر تنظیم کو کتنے خطرے میں ڈال دیا تھا!"

"تیتو میر اور دوسرے تانگے والے کا کیا ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"دونوں کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے۔ واردات کے وقت اور سارے دن تیتو میر کی موجودگی دوسری جگہ ثابت ہو گئی۔ دوسرے تانگے والے قمر اور قاسم کے درمیان پرانی دشمنی تھی۔ یہ موقف اختیار کیا گیا کہ قاسم نے قمر کا نام دشمنی کی وجہ سے لیا تھا۔" مجاہد اوّل نے بتایا۔ "تمھاری کوشش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جلالی پر سے بلا ٹل گئی ہے جس کی تیاری سیٹھ مہیش نے کی تھی۔" یہ تمام باتیں میرے لیے

اطمینان بخش تھیں۔ "اور اب ۔۔۔ اب کچھ دن تمہیں کوئی مہم سپرد نہیں کی جائے گی۔ اگر ضرورت تمہیں کسی دوردراز علاقے میں بھیجا جائے گا۔ اس ہے کہ پولیس کو جس شاہین کی تلاش ہے' وہ کم از کم کے علاقے میں کہیں سرگرم نظر نہ آئے۔ وضاحت اس لیے کی ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میں بتانے کے لیے تمہیں بلایا تھا۔ دوسری بات تمہیں کہ ذہنی طور پر کسی طویل سفر کے لیے تیار رہنا۔ ممکن تمہیں ملتان یا کلکتہ بھیجنا پڑے۔ ان دونوں ہی شہروں تشویش ناک خبریں ملی ہیں مگر ابھی کوئی جلدی نہیں پوچھنا تھا کہ کیا اس طرح تمھاری تعلیم کا نقصان گا؟"

"نہیں جناب!" میں نے جواب دیا۔ "اگر درپیش ہوا تو میں کالج سے چھٹی لے لوں گا۔ تعلیم یقیناً ضروری ہے مگر نصابی تعلیم میری نزدیک ایک ہے۔ آپ کی طرف سے جب بھی مجھے کوئی ایسا فوراً اس کی تعمیل کروں گا۔"

"تمھاری بابت اس کا اندازہ مجھے بھی ہو چکا تک کہ علم کو تم نصابی کتابوں تک محدود نہیں سمجھتے اس وقت تم سے یہی گفتگو کرنا تھی۔ اچھا خدا حافظ"

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ کوٹھی پہنچ کر میں ا میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجھے اسنی کی مخصوص خوش ہوئی۔

"طارنوش! تمھاری حفاظت کا بندوبست ہو گی اسنی کی پراسرار سرگوشی سنائی دی۔ "کمرے کا درو کے میں بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ "مجھے اپنی زندگی کی میں اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتا ہوں"

"اس کا جواب میں تمہیں پہلے بھی دے چکی ابھی تم اس کے اہل نہیں ہوئے۔"

"اور تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ روحانی ریاضتوں میں اس کا اہل بن سکتا ہوں۔"

"بچوں کی طرح ضد نہ کرو طارنوش' تم اب چکے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تمھارے دشمن کتنے ان سے انتقام لینا تو بہت دور کی بات ہے میرے ان کی تلاش ہی تمھارے لیے ممکن نہیں۔ فی الحال کے نادیدہ حملوں سے بچے رہو یہی بہت بڑی کامیابی" اسنی نے مجھے سورۂ جن کی چند آیات کا ورد کرتے تاکید کی۔ یہ آیات میں نے ذہن نشین کرلیں۔

"ہر علم کے حصول کی ایک عمر ہوتی ہے۔" اسنی کی رگوشی ابھری۔ "سنو طارنوش! ذہنی بلوغت اور جسمانی غت میں فرق ہوتا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ میں نے تم سے ی بلوغت کا ذکر بھی کیا تھا۔ جب میں نے یہ محسوس کرلیا کہ نی طور پر بھی تم بالغ ہو تو تمہیں وہ روحانی ریاضتیں تعلیم کر جائیں گی۔ اُداس ہونے کی ضرورت نہیں میرے بچے! ں تمھارے جذبات سمجھتی ہوں۔ تمھارا اور میرا دکھ ایک ہے۔ تم سے تمھارے باپ اور مجھ سے میرا بھائی بچھڑ گیا ے۔ صبر کرو' اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اسنی کی رگوشی معدوم ہوتی چلی گئی۔

اسنی کی خوشبو رخصت ہوئی تو میں سورۂ جن کی ان ات کے مفہوم پر غور کرنے لگا جن کے ورد کی اس نے اکید کی تھی۔

❁❁❁✱✱❁❁❁

کالج میں ان دنوں توسیع کا کام زوروشور سے جاری تھا۔ ے معلوم ہوا کہ اس کا آغاز بہت پہلے نواب محسن الملک ہی کے زمانے سے ہو چکا تھا۔ سرسید کی وفات کے بعد محسن ملک' حیدرآباد دکن سے علی گڑھ آگئے تھے اور نواب وقار ملک بھی انہی کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں ہی سرسید کی زندگی ں اور انہی کے ایما پر حیدرآباد گئے تھے۔ ریاست حیدرآباد کن میں محسن الملک' مدارالمہام سالار جنگ اوّل کے زمانے ں گئے تھے اور پھر سالار جنگ دوم کے زمانے میں وہ مشیر اس کے عہدے پر فائز تھے۔ سرسید ہی کے ایک اور رفیق ی نذیر احمد نے بھی سرکارِ دکن کی ملازمت قبول کرلی تھی' ر وہ اپنے مزاج کی تیزی کے سبب محسن الملک سے پہلے ہی رسید کی زندگی میں علی گڑھ آگئے تھے۔ سرکارِ دکن میں ان ی ملازمت کا بندوبست سرسید کے ایما پر محسن الملک ہی نے یا تھا۔

کالج کی توسیع کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز ہوں نے ہی کیا پھر وقار الملک (مولوی مشتاق حسین) نے ر ان کے بعد آنے والوں نے بھی اس مہم کو جاری رکھا۔ ن الملک اورینٹل کالج کو مسلم یونی ورسٹی بنانا چاہتے تھے ر اب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔ علی گڑھ کالج کا ک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس پر مجھے بھی خوشی ے علی گڑھ آکر مجھے پہلی بار علی گڑھ تحریک کی اہمیت کا ساس ہوا تھا۔ یہ جان کر بھی مجھے بے پناہ مسرت ہوئی تھی ے میرے پہلے سیاسی آئیڈیل مولانا محمد علی جوہر نے بھی اسی ت سے بی اے کیا تھا۔ جہاں اب میں زیر تعلیم تھا۔ مشہور و

معروف ادیب سجاد حیدر یلدرم بھی مولانا جوہر ہی کے ساتھیوں میں سے تھے' میری مراد علی گڑھ کے ساتھیوں سے ہے۔

اب میں کالج کے معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مجاہد اوّل نے اب تک مجھے کوئی مہم نہیں سونپی تھی۔ مطالعے کے علاوہ میرا زیادہ تر وقت کالج کے دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ انہی دوستوں میں سے ایک کریم الدین تھا۔ اس کا تعلق اڑیسہ سے تھا۔ ہم دونوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ بھی انگریزوں کے سخت خلاف تھا۔ دوسرا سبب سیاست سے اس کی دلچسپی تھی۔ کریم الدین کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ ایک روز میں اور کریم الدین کالج کے نو تعمیر حصے کی سیر کررہے تھے۔ ہمارا موضوع گفتگو وہی تھا جو عموماً ہوتا تھا۔ کریم الدین کو فیکر اینڈ فیکس جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ عموماً وہ اپنی گفتگو میں ہندسے ضرور استعمال کرتا تھا۔ وہ دھواں دھار بول رہا تھا۔ بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاشیاں زیر بحث تھیں کیوں کہ انگریز لٹیروں نے پہلے بنگال ہی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔

کریم الدین کہہ رہا تھا۔ "بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاشیوں کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا۔" اپنی عادت کے مطابق وہ فوراً بہ طور ثبوت کہنے لگا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ بنگالی عوام پر قرضوں کا بوجھ سات لاکھ پونڈ اسٹرلنگ سے تیس لاکھ اسٹرلنگ تک پہنچا دیا گیا تھا اور یہ عرصہ صرف سینتیس سال' یعنی سترہ سو بانوے سے اٹھارہ سو انتیس تک کا تھا۔"

میں اس کی حوصلہ افزائی کے لیے بولا۔ "یقیناً برادر عزیز' یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔"

میری حوصلہ افزائی پر اسے اور جوش آگیا۔ "ان لٹیروں نے سترہ سو اکہتر سے اٹھارہ سو سینتیس تک کے عرصے میں بتیس لاکھ پونڈ اسٹرلنگ ہندوستان سے برطانیہ منتقل کیے حتیٰ کہ جب کمپنی کے تجارتی حقوق اٹھارہ سو ... میں معطل ہوئے تو اسے ہندوستان میں اپنے سرمائے پر ساڑھے دس فی صد سود کی ادائیگی سے نوازا گیا۔ برطانوی حکومت نے پچیس ہزار جاگیریں ضبط کرلیں اور ان سب کے عوض مسلمان بنگالی کو کیا ملا' صرف تین پیسے روزانہ!"

"جانِ عزیز! اگر تحریک آزادیٔ ہند ناکام نہ ہوتی تو سارا قرض اُتر جاتا۔ میرے خیال میں اس تحریک کا خاتمہ' غلط منصوبہ بندی اور عدم اتحاد کی وجہ سے ناکامی کی صورت میں نمودار ہوا اور بعد میں اسی کی سزا مسلمان قوم کو بھگتنا پڑی۔"

کریم الدین پھر اپنے موقف کی تائید میں بولا۔

"ہندوستان بھر کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بنگال کا مسلمان بھی اس سے متاثر ہوا۔ اڑیسہ کے مسلمانوں نے اپنے کمشنر کے ذریعے ایک یادداشت ملکہ وکٹوریہ کو بھیجی تھی۔ اسے پڑھ کر دل کٹنے لگتا ہے۔" اس کے بعد جیسے کریم الدین کہیں کھو گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ خواب کے عالم میں یا کسی سحر زدہ شخص کی طرح بول رہا ہو۔ ۱۸۵۷ء میں جب تحریک آزادیٔ ہند کا خاتمہ ہوا اور اقتدار براہ راست برطانیہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اڑیسہ کے مظلوم مسلمانوں نے اسی کے کچھ عرصے بعد یہ یادداشت ملکہ وکٹوریہ کو بھجوائی تھی جس کے الفاظ کریم الدین کے زخمی دل سے میری سماعت میں منتقل ہو رہے تھے۔ یہ آواز کریم الدین کی نہیں بلکہ ان تمام مظلوموں کی آواز تھی جنہیں انگریز لٹیروں نے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا تھا۔ کریم الدین اس یادداشت کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ "ہم مسلمان وہ مچھلی ہیں جو پانی سے باہر ہو اور مزید یہ کہ ہم لوگ اس زمین کے دور دراز کونوں تک جا سکتے ہیں، ہمالہ کی فلک بوس برف سے ڈھکی چوٹیوں پر چڑھ سکتے ہیں۔ سائبیریا کے بے آباد علاقے میں گردش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم لوگوں کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ اس طرح سفر کرنے سے ہمیں ایک سرکاری نوکری مل سکتی ہے جو محض دس شلنگ بچنے کی ضمانت دیتی ہو۔ ہمارے پاس ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ ہم چلتے ہوئے سمندر میں کود جائیں اور ڈوب مریں یا پھر اڑیسہ کی پہاڑیوں میں کہیں گم ہو جائیں۔" یادداشت کے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے کریم الدین کی آواز بھرا گئی۔ اس روز ہم دیر تک نوحہ کرتے رہے۔

میرے حلقۂ احباب میں کریم الدین کے علاوہ میرا ایک دوست مظہر علی بھی تھا۔ اس کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ مظہر علی مجھ سے سینئر تھا۔ وہ علی گڑھ سے قانون کی سند لینے آیا تھا۔ کچھ عرصے وہ کلکتے میں بھی رہا تھا جہاں اس کے والد کا کاروبار تھا۔ اس کی سیاسی وابستگی مسلم لیگ سے تھی اور قائداعظم کے مداحوں میں تھا۔ مظہر علی ہی نے مجھے مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاسوں کا آنکھوں دیکھا حال سنایا جس نے مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں معلومات میں اضافہ کیا۔ اسی کے ساتھ قائداعظم کی پرکشش شخصیت سے میری دلچسپی بڑھی۔ مظہر علی نے مجھے رفتہ رفتہ قائداعظم محمد علی جناح کا مداح بنا لیا۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، اس وقت تک جناح صاحب کو "قائداعظم" کا لقب نہیں ملا تھا۔ یہ بہت بعد کی یعنی ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ "الامان" دہلی کے مدیر مولانا مظہر الدین نے جناح صاحب کے لیے "قائداعظم" کا لقب تجویز کیا پھر پاکستان کے قیام سے صرف دو [...] مجلس قانون ساز نے یہ قرارداد منظور کی کہ جناح صا[...] تمام دستاویزات اور قانونی کاغذات میں "قائد اعظ[...] جائے۔ جناح صاحب سے لگاؤ کا سبب علی گڑھ تحری[...] تھی۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ وجود میں آئی [...] ہندوستانی سیاست کے سارے رخ اب میری نظر میں [...] تھے۔ علی گڑھ تحریک ہر سطح پر مسلمانوں کے حقوق کی [...] تھی اور اب یہ جنگ ایک بے تیغ سپاہی (محمد علی جنا[...] رہا تھا۔ اس سپاہی کا نعرہ وہی تھا جو سرسید کا نعرہ تھا [...] اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔

خلافت تحریک بھی مسلمانوں پر ظلم کے خلاف [...] آواز تھی۔ مولانا جوہر کا منشا یہ تھا کہ اس معرکے میں [...] ان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائیں او[...] بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے تھے [...] جوہر اور جناح صاحب کا مقصد ایک ہی تھا یعنی مسل[...] بقا، مگر راستے مختلف تھے۔ سازشی ہندو سیاست کو جسے [...] سید نے اور پھر جناح صاحب نے محسوس کر لیا، ا[...] جوہر نے سات سال بعد (۱۹۲۹ء) محسوس کیا اور وہ [...] سے الگ ہو گئے۔

انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ ہندو بھی تھے اور [...] بھی مگر پہلا نشانہ مسلمان بنے کیوں کہ انہوں نے [...] ہی سے حکومت چھینی تھی۔ کانگریس اور خلافت تحریک [...] لیگ اور علی گڑھ تحریک، سب ہی انگریزوں کے خلاف [...] اس کے علاوہ زیر زمین وطن پرست تنظیم بھی انگریز[...] خلاف مسلح جدوجہد میں مصروف تھی۔ اب میرے [...] مولانا جوہر اور مجاہد اوّل کے ساتھ ساتھ جناح صاح[...] تھے۔ یہ تینوں میرے نزدیک ایک ہی منزل کے مسافر [...] میں نے ان خیالات کا اظہار نہ اپنے خالہ زاد عطا ا[...] سے کیا، نہ ماموں زاد رحمت علی سے اس موضوع پر گفت[...] مظہر علی سے جب میری ملاقات ہوئی تو جناح صاحب [...] پہلے (۱۹۳۴ء) مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو چکے تھے [...] مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے۔

❂❂❂✱✱❂❂❂

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ میں ایک روز سیتا کو خط [...] تھا۔ سیتا کی تصویر میرے سامنے تھی۔ یہ وہی تصویر [...] اس نے مجھے البم سے نکال کر دی تھی۔ جلالی سے آ[...] بعد سیتا اور جوگیندر سے میری خط و کتابت جاری تھی [...] ان دونوں بہن بھائی کو نہیں بھول سکا تھا اور پھر سیتا کیسے بھول جاتا جو میری خاطر مسلمان ہونے تک پہ راضی تھی۔ اس نے مجھے خط میں لکھا تھا۔ "شاہین جی! میرا دھرم تو آپ ہیں۔ آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ ہمارے بیچ مذہب کی دیوار ہے تو جب آپ کہیں گے، میں یہ دیوار گرا دوں گی۔ میں سیتا ہوں تو آپ کی ہوں اور آپ کا دھرم اپنا کر کسی اور نام سے جانی پہچانی جاؤں گی تو بھی آپ ہی کے چرنوں کی دھول رہوں گی۔" پھر اس نے ہجر کی لمبی راتوں کا احوال لکھا تھا اور پوچھا تھا، کب ملیں گے؟

تنظیم کے سخت اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ابھی تک میں نے سیتا پر اپنی اصل شخصیت ظاہر نہیں کی تھی کہ کیا خبر مجاہد اوّل کو یہ بات پسند نہ آئے۔ سیتا سے ملنے کو بہت جی تڑپتا تھا مگر میں جلالی کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ ہرچند کہ جلالی کی مہم کو خاصا عرصہ گزر چکا تھا مگر مجاہد اوّل نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہا تھا کہ اب شاہین کی حیثیت سے مجھے کم از کم ملک کے کسی شمالی علاقے میں نظر نہیں آنا چاہیے۔ یوں بھی جلالی کی پولیس کو میری تلاش تھی۔ اگر معاملہ صرف ذاتی ہوتا تو شاید میں اپنے دل کا کہا مان لیتا اور جلالی جا کر سیتا سے مل لیتا مگر اس معاملے کا تعلق تنظیم سے بھی تھا۔ انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جلالی سے چلتے وقت میں نے سیتا کا پتا تو لے لیا تھا مگر اپنا پتا اسے نہیں دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ علی گڑھ جا کر پتا بھیج دوں گا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جب کریم الدین سے میری گاڑھی چھننے لگی تو "شاہین معرفت کریم الدین" خط و کتابت شروع ہو گئی۔ کریم الدین کی معرفت مجھے سیتا اور جوگیندر کے خطوط مل جاتے تھے۔ کریم الدین کو میں نے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اسے میں نے بتا دیا تھا کہ ایک ہندو دوشیزہ سے میرا عشق چل رہا ہے اور میں کوٹھی کے پتے پر اس سے خط و کتابت کرنا نہیں چاہتا۔ بہ طور احتیاط میں نے یہ فرضی نام اختیار کیا ہے۔ کریم الدین نے بھی... سیتا یا جوگیندر کا خط اسی سبب مجھے کسی اور کی موجودگی میں نہیں دیا۔

میں اس شام سیتا کے حسین خیالوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب میری خالہ زاد شگفتہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور کب میری کرسی کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں چونکا اس وقت جب شگفتہ نے مجھے مخاطب کیا۔

میں اس وقت سیتا سے "ہم کلام" تھا اور جب کوئی اپنے محبوب سے ہم کلام ہو تو پھر محبوب کے سوا اسے کوئی نظر نہیں آتا۔ میں اس خط کے الفاظ کو ذریعہ بنا کر اپنی سیتا سے کہہ رہا تھا۔ "جاناں، اداس کیوں ہو، ہجر کی یہ لمبی رات بہت جلد صبح وصال بن جائے گی اور..."

"اچھا تو جناب کسی کو لو لیٹر لکھا جا رہا ہے۔" خلاف توقع شگفتہ کی آواز سن کر میں تقریباً اچھل پڑا اور غیر ارادی طور پر سیتا کی تصویر اور خط پر کتاب رکھ دی۔ "اب کیا فائدہ، ہم نے تو خط پڑھ بھی لیا!" وہ بولی۔ "ابھی ہم امی جان کو جا کر بتاتے ہیں۔"

"اے لڑکی! یہ کیا بدتمیزی ہے! کسی کا خط پڑھ لینا غیر اخلاقی حرکت ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ میں کسی کو لو لیٹر نہیں لکھ رہا تھا، ایک افسانہ لکھ رہا تھا جس میں ہیرو اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے۔ یہ خط اسی افسانے کا حصہ ہے۔" میں نے حواس بجا ہونے پر بات بنائی۔

مگر شگفتہ بھی آفت کی پڑیا تھی، ہنس کر کہنے لگی۔ "تو یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ جناب طارنوش اس ملک کے عظیم افسانہ نگار بھی ہیں۔"

"بکو مت اور فوراً یہاں سے رفوچکر ہو جاؤ۔ مجھے افسانہ مکمل کرنے دو!"

"میرا خیال ہے کہ اس افسانے کا عنوان وہ تصویر ہے جو حضور نے افسانے کے ساتھ ساتھ کتاب کے نیچے چھپا دی ہے۔ تصویر دکھا دیں شرافت سے ورنہ سارا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ بلیں دکھا رہے ہیں تصویر کہ بتا دوں امی جان کو سب کچھ!"

"پاگل لڑکی! یہ تصویر میری نہیں میرے ایک ہندو دوست کی ہے۔ یہ لڑکی اس کی منگیتر ہے۔"

"اگر آپ افسانہ نگار نہیں بھی ہیں تو مستقبل میں اس کے بڑے روشن امکانات ہیں۔ گھڑی بھر میں وہ افسانہ تراشتے ہیں کہ سننے والا اگر کاٹھ کا الو ہے تو فی الفور افسانے کو حقیقت سمجھ لے۔ ویسے آپ کے اس افسانے پر مجھے کامل یقین ہے۔ دراصل آپ کے دوست کو یہ خطرہ ہو گا کہ کہیں اس کے پاس کوئی یہ تصویر دیکھ نہ لے اسی لیے اس نے اپنی منگیتر کی تصویر آپ کے پاس رکھوا دی ہو گی۔ یہی بات ہے نا؟" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے جان چھڑاؤں؟ مجبوراً مجھے سیتا کی تصویر اسے دکھانا ہی پڑی۔

"یہ ہوئی نا بات!" اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اب سچ سچ ایک بات اور بتا دیں! ایمان سے کسی سے نہیں کہوں گی، پکا وعدہ!"

"بکو!"

"ہم فرمایا کرتے ہیں، بکتے نہیں ہیں۔" وہ ایک ادا سے

بولی اور اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ آج میں نے پہلی بار اسے نظر بھر کے دیکھا تھا۔

"اچھا فرمادیں۔ ارشاد!" میں نے بھی اسے گھسنا شروع کردیا۔

"جی! بندی یہ فرماتی ہے کہ حضور جو افسانہ خونِ دل سے رقم کر رہے ہیں کیا اس کا امکان ہے کہ یہ افسانہ مکمل ہوجائے؟"

"جب افسانہ شروع ہوگیا ہے تو ایک نہ ایک روز مکمل بھی ہو ہی جائے گا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ سیتا کی تصویر اور خط وہ دیکھ چکی تھی اور اتنی بھولی بہرحال نہیں تھی کہ میری باتوں میں آجاتی۔

"نیک خواہشات کے ساتھ ری ٹرن!" اس نے تصویر واپس کردی۔

"اپنا پکا وعدہ یاد رکھنا!"

"ہاں ہاں یاد رکھیں گے۔ یہ افسانہ جب تک خود ہی اشاعت پذیر نہیں ہوجائے گا کسی کے علم میں نہیں آئے گا تاکہ کوئی سرقہ نہ کرلے۔ ارے میں وہ بات تو اس افسانے کے چکر میں بھول ہی گئی جو کہنے آئی تھی۔ امی جان آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنا دھنک رنگ دوپٹا شانوں پر سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔

شگفتہ کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ آیندہ سیتا کو خط لکھتے ہوئے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا کروں گا۔ بقیہ خط رات کو لکھنے کا فیصلہ کرکے میں خالہ جان سے ملنے ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ "جی خالہ جان؟" میں ان کے قریب چوکی پر ہی بیٹھ گیا۔

"طارنوش بیٹے! تم میری مرحومہ بہن کی واحد نشانی ہو۔ رات کو مجھے ایک خیال آیا تھا۔ آج صبح میں تمہارے خالو جان سے بھی اس سلسلے میں بات کرچکی ہوں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ میں پہلے دہلی جاکر بھائی ڈیسوزا اور ابا حضور سے بات کروں، اس کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کریں گے مگر میں۔ بیٹے میں پہلے تمہاری مرضی جاننا چاہتی ہوں۔ تمہاری مرضی کے بغیر میں بات آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔" خالہ بڑی محبت سے بولیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آخر ایسی کیا بات ہے جس کے لیے خالہ جان اتنی تمہید باندھ رہی ہیں! "بتائیں تو خالہ جان کیا بات ہے؟" میرے دل میں ایک اندیشہ سا پیدا ہوا پھر خالہ جان نے جو کچھ کہا اس سے میرے اندیشے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ شگفتہ سے میری شادی کرنا چاہتی تھیں اور اسی سلسلے میں میری مرضی معلوم کر رہی تھیں۔

"ابھی۔ خالہ جان، ابھی تو میں ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہوں۔ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔" میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

"ابھی نہ سہی پھر سہی مگر اتنا تو بتا دو بیٹے کہ تمہیں یہ رشتہ قبول تو ہے نا؟"

"میں ابھی کچھ۔ کچھ نہیں کہہ سکتا خالہ جان!" میں فوری طور پر انکار کرکے ان کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ "میں سوچ کر بتاؤں گا۔ فی الحال آپ۔ آپ دہلی نہ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ کچھ بجھ سی گئیں۔ "جب سوچ لو تو بتا دینا۔"

میں ان کے کمرے سے چلا آیا اور قدرت کی اس ستم ظریفی پر غور کرنے لگا۔ وہ لڑکی جو نادانستگی میں میرے عشق کی رازدار بن گئی تھی، اسی سے میری شادی کی بات ہو رہی تھی! میرے لیے یہ صورتحال خاصی پریشان کن تھی۔

رات کو میں نے سیتا اور جوگیندر کو خط لکھے۔ جوگیندر مجھے جب بھی خط لکھتا تھا، اس میں یہی استفسار ہوتا تھا کہ مجاہد اول سے میری ملاقات ہوئی یا نہیں؟ میں نے جلالی کے دوران قیام میں جوگیندر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تنظیم کے ساتھ اس کا یا اس کے ساتھیوں کا اشتراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مجاہد اول اس کی اجازت نہ دے دے، میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

جلالی سے علی گڑھ آنے کے بعد مجاہد اول سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ یہ بات کرسکوں۔ اس کا ایک سبب مجاہد اول کی برہمی بھی تھی۔ جلالی سے روانگی کے وقت میں نے جوگیندر سے اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے جن متعصب اور بااثر ہندوؤں کو اغوا کیا تھا، ان کے اغوا کیے جانے پر ہی مجاہد اول نے میری سرزنش کی تھی۔ اس موقع پر جوگیندر سے اشتراک کی بات مناسب نہ ہوتی پھر اس کے بعد مجاہد اول کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا! جوگیندر کو میں نے ایک خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مجاہد اول سے فی الحال میرے رابطے کی کوئی صورت نہیں لیکن اب جب بھی ملاقات ہوگی، میں اس سے ضرور بات کرلوں گا۔ جوگیندر کے حالیہ خط میں بھی یہی ذکر تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ کوئی نئی مہم درپیش ہو تو میں اسے اور سیتا کو ضرور مطلع کروں۔ وہ دونوں ہی کسی ایسی مہم میں میرا ساتھ دینے کے آرزو مند تھے۔ خود میری خواہش یہی تھی کہ سیتا

ملاقات کا کوئی بہانہ بنے۔

اسی دوران میں امتحانات شروع ہوگئے اور میں ان کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا ارادہ دہلی جانے کا تھا۔ خالہ جان کو ابھی تک میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، نہ ہی خود انہوں نے کوئی بات کی تھی۔ وہ شاید میرے امتحانات ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔

❁❁❁✻✻❁❁❁

اس روز میں آخری پیپر دے کر لوٹ رہا تھا کہ ایک اجنبی سائیکل سوار مجھے سبز لفافہ دے کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ طویل عرصے کے بعد مجاہد اول نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ میں سبز رنگ کے اس مخصوص لفافے کو پہچان گیا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت میں یہی سمجھا کہ مجاہد اول علی گڑھ آچکا ہے اور شاید آج ہی اس سے میری ملاقات ہوجائے مگر کوٹھی پہنچ کر جب میں نے اس کا پیغام پڑھا تو میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ علی گڑھ میں نہیں تھا۔ پیغام یہ تھا۔ "آج سے تین روز بعد دہلی میں بعد نماز مغرب مزار سرمد کے سامنے پہنچ جاؤ۔"

یہ پیغام پڑھ کر مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ اس سے پہلے کبھی مجاہد اول کسی ایسے مقام پر نہیں ملا تھا جہاں دوسرے لوگوں کی آمدورفت بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ اپنا چہرہ نقاب کے پیچھے کس طرح چھپا سکتا تھا! دہلی میں ملاقات کا مطلب یہی تھا کہ اسے اندازہ تھا کہ میں امتحانات کے بعد دہلی ہی جاؤں گا۔ بھائی رحمت علی بھی امتحانات سے فارغ ہوچکے تھے۔ ان کا ارادہ بھی دہلی جانے کا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ ساتھ ہی چلیں گے۔

اگلے ہی روز میں نے دہلی جانے کا پروگرام بنا لیا اور بھائی رحمت علی کو بھی اس سے آگاہ کردیا۔ خالہ جان کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ سے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ خود ہی میرے کمرے میں آگئی تھیں۔ اس وقت میں اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ میرے اور ان کے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

"خالہ جان! معاف کیجیے گا، امتحانات کی تیاری میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ آپ نے مجھ سے کوئی بات کہی تھی اور مجھے اس کا جواب بھی دینا تھا۔ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کرسکا۔ آپ۔ آپ مطمئن رہیں، اب جو چھٹیوں کے بعد میں آؤں گا۔"

"طارنوش بیٹے!" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو یا پھر یہ سوچ رہے ہو کہ تمہارے جواب سے مجھے تکلیف نہ پہنچے تو بیٹے ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں، مجھ سے صاف کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے۔"

"یہ بات نہیں خالہ جان! دراصل میں نے شگفتہ کے بارے میں کبھی اس طرح سوچا نہیں۔ میں آپ سے اسی لیے مزید کچھ وقت چاہتا تھا۔" میں نظریں جھکا کر بولا۔

"مجھے تمہاری بات سے انکار نہیں، قریبی رشتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، تم چھٹیاں گزار کر آجاؤ۔ ہاں تم سے یہ بات ضرور کہنا تھی کہ میرے لیے جیسی شگفتہ اور عطا اللہ ویسے تم۔ میں نے نہ کبھی ان دونوں پر اپنی مرضی مسلط کی نہ تمہارے معاملے میں ایسا چاہتی ہوں۔ تمہارا بھائی عطا اللہ بھی ابھی تک تمہاری ہی طرح شادی کرنے پر رضامند نہیں۔ اسے بھی میں نے مجبور نہیں کیا۔ میری جو خواہش تھی وہ میں نے تمہیں بتادی، آگے تم جانو۔ یقین کرو میں اس وقت تک بات آگے نہیں بڑھاؤں گی جب تک تم ہاں نہیں کردو گے البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ کوئی فیصلہ کرنے میں بہت زیادہ دیر نہ لگا دینا۔"

میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور پھر وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔ اس وقت میں نے اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کیا اور سوچا، کاش میں انہیں یہ خوشی دے سکتا اور سیتا درمیان میں نہ آئی ہوتی۔ میری ماں زندہ نہ سہی خالہ تو تھیں! میں اکثر ان کے چہرے میں اپنی ماں کا چہرہ تلاش کیا کرتا تھا۔

اس رات میں دیر تک اپنی ماں ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور اسی تعلق سے مجھے اپنے مقتول باپ ہاموس اور اسنی کا خیال آیا۔ میں نے کافی عرصے سے اسنی کی پُراسرار سرگوشیاں نہیں سنی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میرے باپ کے قاتل اور میرے دشمن، اسنی کو بھی تو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں ایسے ہی خیالات آرہے تھے کہ اچانک مجھے اپنے قریب اسنی کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔

"طارنوش!" اسنی کی پراسرار سرگوشی ابھری۔ "اب تم میری طرف سے بھی فکرمند رہنے لگے! میں تم سے زیادہ دور نہیں تھی۔ سنو! تمہارے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے غلط ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی حفاظت کرنے کی اہل ہوں۔ میرا بھائی اور تمہارا باپ اس لیے مارا گیا کہ وہ دشمنوں کی طرف سے غافل تھا مگر میں چوکنا ہوں۔ انشاءاللہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔"

"اتنے دن سے تم میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو اکثر تمہارے پاس ہی رہتی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"لیکن مجھے تمہاری خوشبو تو محسوس نہیں ہوتی۔" میں بولا۔

"میری خوشبو تمہیں اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب میں تمہارے بالکل قریب آجاتی ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔

"بہت دن سے میرے ذہن میں ایک بات اٹکی ہوئی تھی کہ کبھی اسنٰی سے پوچھوں گا۔ اس نے ایک منافق خاشع پر شک کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب مجھ پر میرے پُراسرار دشمنوں نے پہلی بار قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ میں اسنٰی سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اگر اسے خاشع پر شبہہ تھا تو اس نے خاشع کے ذریعے دشمنوں کا سُراغ لگانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یا کوشش کی تھی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ پھر اس سے پہلے کہ میں اسنٰی سے کچھ دریافت کر سکتا' اس نے میرے خیالات پڑھ لیے۔ مجھے اس کی سرگوشی سنائی دی۔ "خاشع کا مطلب عاجزی کرنے والا اور چاپلوس ہے۔ اس سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل ہے پھر بھی میں نے کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی اور عالم جنات میں ایک خاشع ہی کیا' اب تو منافقوں کی خاصی تعداد ہو چکی ہے۔ وہ بس نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ خیر چھوڑو یہ ایک الگ قصہ ہے' آدم زادوں میں بھی تو منافقوں کی کمی نہیں۔ میں تمہیں ان سے بچے رہنے کی تاکید کرتی ہوں۔ ہاں مجھے اس پر خوشی ہے کہ میں نے تمہیں سورۂ جن کی جن آیات کا ورد کرتے رہنے کے لیے کہا تھا' تم اس پر عمل کر رہے ہو۔ میری طرف سے آیندہ فکر مند نہ ہونا! جب میں ضرورت محسوس کروں گی یا تمہیں جب میری ضرورت محسوس ہو گی' تم مجھے اپنے قریب پاؤ گے۔ اب آیات کا ورد کر کے سو جاؤ' خدا حافظ!"

اسنٰی چلی گئی اور پھر میں اس طرف سے مطمئن ہو کر کچھ ہی دیر بعد نیند کی مہربان آغوش میں پہنچ گیا۔

دوسرے دن میں' بھائی رحمت علی کے ساتھ دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

دہلی پہنچ کر بھائی رحمت علی نے تو حویلی کی راہ لی اور میں تانگے سے اپنے گھر کے سامنے اُتر گیا۔ شام کا وقت تھا اور ڈیڈی اپنے دفتر سے آچکے تھے۔ میری آمد سے سارے گھر میں جیسے عید سی ہو گئی۔ ممی اور ڈیڈی دونوں ہی بہت خوش تھے۔

پھر جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو ممی میری طرف دیکھ کر ڈیڈی سے کہنے لگیں۔ "تم دیکھ رہے ہو ڈیسوزا' میرا بیٹا کتنا دبلا ہو گیا ہے' میں کہہ رہی تھی نا تم سے کہ یہ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتا ہو گا۔"

"کوئی دبلا وبلا نہیں ہوا۔ ہر ماں کو اپنا بیٹا تمہاری طرح دبلا نظر آتا ہے۔" ڈیڈی مسکرا کر بولے پھر مجھ سے کہنے لگے۔ "کیوں بھئی طارنوش' دبلے ہو گئے ہو تم؟"

"ہاں یہ تو ضرور تمہیں بتائے گا۔" ممی مجھ سے پہلے بول اٹھیں۔ "تمہیں تو بس میری بات سے اختلاف کا کوئی موقع ملنا چاہیے۔"

"دیکھو بھئی ایلین' آج میں ہرگز تم سے لڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں' آج میرا بیٹا بہت دنوں بعد گھر آیا ہے۔"

"میں لڑتی ہوں تم سے یا۔۔۔"

"تم بالکل نہیں لڑتیں' میں لڑتا ہوں تم سے! بس خوش!"

ڈیڈی کی بات پر ممی نے بُرا سا منہ بنایا اور ڈیڈی مجھے مسکراتا دیکھ کر ہنس پڑے۔ "اب یہ بڑا ہو گیا ہے۔ سمجھیں!" ڈیڈی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اکیلے میں لڑ لیا کرو!" کہہ کر پھر ڈیڈی ہنسنے لگے۔

کھانا کھانے کے بعد میں نانا جان کی حویلی کی طرف نکل گیا۔ ڈیڈی ہی نے مجھ سے وہاں جانے کو کہا تھا کہ اپنے نانا جان کو سلام کر آؤ! وہ نہ بھی کہتے تو میں وہاں جاتا۔ نانا جان ان دنوں کچھ علیل تھے۔ اس کا علم مجھے علی گڑھ ہی میں ہو چکا تھا۔ بھائی رحمت علی نے نانا جان کی علالت کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ حویلی پہنچ کر سب سے پہلے میں نانا جان ہی سے ملا۔ وہ واقعی بیمار نظر آ رہے تھے۔ میں نے مزاج پرسی کی اور بیماری کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے۔ "بڑھاپا خود ایک بیماری ہے طارنوش بیٹے! گھٹنوں میں درد رہنے لگا اور بہ ظاہر کوئی خاص بات نہیں۔ تم سناؤ تمہارے خالو جان اور خالہ جان کیسے ہیں؟"

"خیریت سے ہیں۔" میں نے بتایا اور پھر مزید کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اٹھ آیا۔

پھر میں گھر کے تمام ہی افراد سے ملا۔ عظمت علی تو میرا پیچھا چھوڑنے ہی کو تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس وعدے پر میری جان چھوڑی کہ کل صبح اس کے ساتھ شطرنج کی کم از کم تین بازیاں لگیں گی۔ زاہدہ اور رابعہ دونوں نے مجھے خلوت کے اشارے کیے مگر میں ایسا بن گیا جیسے ان کا اشارہ سمجھا ہی نہیں۔ دونوں میں سے میں کسی کے کمرے میں

نہیں گیا۔ وہ دونوں ہی مجھے نانی اماں کے پاس مل گئیں تھیں اور وہیں میں نے ان کی خیر خیریت پوچھ لی تھی۔ لگتا تھا وہ ابھی مجھے بھلا نہیں سکی تھیں۔

دوسرے دن صبح جب میں حویلی پہنچا تو رابعہ کو مجھ سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع مل گیا' کہنے لگی۔ "طارنوش! تم ہو بہت سنگ دل!"

"مگر یہ تو بڑے راز کی بات تھی چندا' تمہیں کیسے معلوم ہو گئی؟"

"تم مجھے یوں چٹکیوں میں نہیں اُڑا سکتے' سمجھے! کل تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلے؟ میں نے تمہیں اشارہ بھی کیا تھا!"

"اس لیے مائی ڈیئر کزن کہ میں تم سے ڈرتا ہوں۔ اب کچھ آیا عقل شریف میں! اچھا ذرا سا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو جاؤ' بھائی رحمت علی ادھر آ رہے ہیں۔" وہ مجھ پر لدتے لدتے چونک کر پیچھے ہٹ گئی اور میں ہنس پڑا۔ وہ اس وقت مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"دیکھا ڈر گئیں نا!" میں بولا۔ "جس کے دل میں چور ہوتا ہے' اسی طرح ڈر جاتا ہے۔"

اس کا منہ بن گیا اور میں یہی چاہتا بھی تھا۔ اسی وقت عظمت علی شطرنج کی بساط اور مہرے لے کر آ گیا۔ میں نشست گاہ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر وہ اپنے کمرے سے بساط اور مہرے لانے گیا' ادھر رابعہ نشست گاہ میں آ گئی تھی۔

"ہاں بھئی رابعہ' اب تم تو دو گیارہ ہو جاؤ! آج بہت دن بعد طارنوش کو شکست دینے کا موقع ملا ہے۔" عظمت علی نے بساط بچھاتے ہوئے کہا۔

رابعہ پہلے ہی میری باتوں سے خفا ہو گئی تھی' بولی۔ "جی' جا رہی ہوں! میرے پاس فضول وقت نہیں ہے ضائع کرنے کو!" اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہنا چاہتی ہو' اچھا پھر سمجھوں گی تم سے! عظمت علی مہرے لگانے میں مگن تھا۔

دہلی پہنچ کر دوسرا پورا دن حویلی ہی میں گزرا مگر میں رابعہ کے ہتھے نہیں چڑھا۔ تیسرے دن میں خود اس کے کمرے میں چلا گیا اور اسے سنجیدگی سے سمجھایا کہ جو بات ختم ہو چکی سو ہو چکی' اب دبی ہوئی چنگاریاں کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔

"تم نے ختم کی ہو گی بات' میں نے نہیں!" وہ پھر اپنی پہلی روش پر آ گئی۔

کافی دیر اسے سمجھانے بجھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اُداس ہو گئی اور میں یہ موقع غنیمت جان کر اس کے کمرے سے نکل آیا۔

آج مجھے دہلی آئے تیسرا دن تھا اور آج ہی مغرب کے بعد مزار سرمد کے سامنے مجاہد اوّل سے ملنا تھا۔ میں اسی لیے حویلی سے دوپہر کے بعد ہی لوٹ آیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر میں شاہی دروازے سے نکل رہا تھا تو میری نظریں سرمدؒ کے مزار ہی کی طرف تھیں۔

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر مقررہ جگہ تک پہنچ گیا۔ وہاں ٹہلتے ہوئے مجھے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ عقب سے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں چونک اُٹھا پھر میں نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ٹیپو!"

"شاہین!" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا پھر بولا۔ "آؤ چلیں!"

"مگر کہاں؟۔۔۔ میں تو یہاں۔۔۔" میری آواز دھیمی ہو گئی۔ "مجاہد اوّل کا انتظار۔۔۔"

"انہی کے حکم پر میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔

میں نے طویل سانس لیا اور مجھے جو حیرانی علی گڑھ میں ہوئی تھی' ختم ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن جہاں ان سے تمہاری ملاقات ممکن ہے' وہاں تک میں تمہیں ضرور پہنچا دوں گا۔"

میں ٹیپو کے ساتھ چل دیا۔ وہ سارا ہی علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ بازار ضیا محل سے گزر کر وہ چتلی قبر کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں چتلی صاحب کا مزار ہے' وہاں سے وہ دائیں جانب کو مڑا پھر کئی گلیوں سے گزر کر ایک تنگ سی گلی میں ٹھہر گیا۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک گھر کے دروازے پر رُک کر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" ٹیپو نے شہید سلطان ٹیپو کا مشہور قول دھیمی آواز میں دہرایا۔

"آج بارش نہیں ہو گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی بھاری دروازہ کھل گیا۔

اندر نیم تاریکی تھی۔ ٹیپو میرا ہاتھ تھامے اندر پہنچ گیا اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ٹیپو اور دروا

کھولنے والے شخص نے جو الفاظ ادا کیے تھے' وہ شناختی رہے ہوں گے یعنی نئے کوڈ ورڈز!

مجھے جلالی کی یاد آ گئی۔ وہاں بھی کچھ ایسی ہی فضا تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچ گئے۔ دائیں بائیں میں نے دو کمروں کے دروازے دیکھے۔ دائیں جانب والے دروازے میں نیپو اور دروازہ کھولنے والا مجھے ساتھ لیے داخل ہوئے۔ وہ بڑا سا چوکور کمرا تھا۔ ایک جانب دیوار سے لگے دو بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے جن پر گدّے اور چاندنیاں بچھی تھیں' دیوار سے لگے دو تین گاؤ تکیے رکھے تھے ایک تخت کے سامنے تین چار مونڈھے پڑے تھے۔ ان میں پشت والا ایک مونڈھا بھی تھا' ساتھ ہی ایک میز رکھی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کمرے کا جائزہ لے لیا۔ ایک طاقچے میں چمنی والا لیمپ روشن تھا۔

"بیٹھو شاہین!" نیپو نے ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

میں دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا تو نیپو نے دروازہ کھولنے والے سے میرا تعارف کرایا۔ نیپو نے مجھے اس کا نام بخت خان بتایا جو ظاہر ہے کہ فرضی ہی ہو گا۔ ویسے یہ نام اس شخص پر کھپتا تھا۔ چھوٹی سی خوبصورت داڑھی اس کے چہرے پر تھی اور بڑی بڑی روشن آنکھیں اس کی ذہانت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں' قد لمبا اور جسم گٹھیلا تھا' سر پر بڑے بڑے بال تھے جو شانوں تک آ رہے تھے۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑا تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی ساتھی!" میں نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا۔

"اور مجھے بھی!" اس کی آنکھیں مسکرائیں۔

"کیا مجاہد اوّل بھی یہاں موجود ہیں؟" میں نے نیپو کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میرے سوال کا جواب نیپو کے بجائے بخت خان نے دیا۔ "وہ بس آتے ہی ہوں گے۔ اس لیے میں اجازت چاہتا ہوں۔"

"بخت خان چلا گیا تو اس کمرے میں صرف میں اور نیپو رہ گئے۔

"تم یہاں کب آئے نیپو؟" میں نے پوچھا۔

"کل ہی پہنچا ہوں۔" وہ بولا۔

"مجاہد اوّل سے تمہاری ملاقات ہوئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں مگر شاید ملاقات ہو جائے اس لیے کہ تم بھی آ گئے ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ مجاہد اوّل ہی کے حکم پر تم مزار مرشد پہ مجھے لینے پہنچے تھے؟"

"غلط نہیں کہا تھا۔ مجاہد اوّل کا حکم مجھے بخت خان کے ذریعے ملا تھا۔"

میری اور نیپو کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ دور سے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں ہی چپ ہو گئے پھر چند لمحے بعد میں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ میں نے سوچا کہ شاید مجاہد اوّل آ گیا ہے۔ ذرا دیر گزری تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔ یقیناً کوئی اس راہداری سے گزرا تھا جو کمرے کے پہلو میں تھی۔

آہٹیں رک گئیں تو نیپو اور میں دوبارہ باتیں کرنے لگے۔ میں بولا۔ "تم شاید اسی گھر میں ٹھہرے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور حیدر علی بھی یہیں ہے۔"

"حیدر علی!۔ مگر مجھے تو وہ نظر نہیں آیا۔ اور کیا سراج الدولہ بھی ہے؟" میں نے جلالی کی مہم میں شریک اپنے ایک اور ساتھی کے متعلق سوال کیا۔

"نہیں' وہ نہیں ہے۔" نیپو نے بتایا۔ حیدر علی مجھ سے پہلے یہاں موجود تھا اور تم؟۔ میرا مطلب ہے کہیں اور قیام ہے تمہارا؟ کیوں کہ تمہارے ساتھ کوئی سامان۔"

"ہاں میں اور جگہ ٹھہرا ہوں۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا پھر حیدر علی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ قدموں کی چاپ راہداری میں پھر سنائی دی۔

"یہ گھر خاصا بڑا ہے۔ اس کمرے کو تو تم ایک طرح کی نشست گاہ سمجھو' اندر اور بھی کئی کمرے ہیں۔ انہی میں سے ایک کمرے میں ہم دونوں یعنی میں اور حیدر علی ہیں۔ جب میں تمہیں لینے گیا تھا تو حیدر علی کو اسی کمرے میں چھوڑ گیا تھا' وہ وہیں ہو گا۔"

نیپو کے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ بخت خان ایک سینی میں تین گلاس شربت لے کر آ گیا۔

"ارے ساتھی' اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے ایک گلاس اٹھا لیا۔

"ساتھیوں میں تکلف کیسا! ممکن ہے کہ کہیں اور یہ خدمت آپ کے سپرد ہو اور میں آپ کی جگہ ہوں۔" بخت خان مسکرا کر بولا۔

"کیا مجاہد اوّل آ گئے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

اس دوران میں نیپو نے بھی شربت کا گلاس سینی سے اٹھا لیا تھا۔

"جی ہاں' وہ تشریف لے آئے ہیں اور کچھ دیر بعد آپ کو طلب کریں گے۔" بخت خان نے جواب دیا اور پھر تیسرا شربت کا گلاس سینی میں رکھے وہاں سے چلا گیا۔ اپنی گفتگو سے وہ مجھے بڑا کھرا اور صاف گو شخص معلوم ہوا تھا۔ شربت کا تیسرا گلاس یا تو حیدر علی کے لیے تھا یا پھر مجاہد اوّل کے لیے۔ اگر خود بخت خان کو شربت پینا ہوتا تو گلاس کو سینی میں رکھ کر لانے کی ضرورت نہیں تھی یا اگر لایا ہی تھا تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر شربت پیتا۔

شربت بڑا خوش ذائقہ تھا' اس سے گلاب کی خوشبو آ رہی تھی۔ گرمی کے موسم میں اس سے عمدہ مدارت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ جلالی میں میزبانی کے فرائض تیتو میر نے ادا کیے تھے اور یہاں بخت خان تھا۔ بخت خان کے لب و لہجے سے مجھے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی میری طرح دلّی کا رہنے والا ہے۔ بہرحال وہ کہیں کا بھی رہا ہو مگر اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ لباس اور وضع سے بھی وہ کسی اچھے گھر کا لگتا تھا۔ اچھے گھر سے میری مراد کسی مہذب گھرانے سے ہے۔

جلد ہی بخت خان لوٹ آیا اور اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا پھر وہ نیپو سے مخاطب ہوا۔ "آپ بھی چلیے!"

نیپو کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میرے ساتھ اس کی طلبی بھی ہو گئی تھی۔ اس کمرے سے نکل کر راہداری سے گزرنے کے بعد ہم صحن میں پہنچے۔ بخت خان نے ہم دونوں کو رکنے کو کہا اور دائیں جانب ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

"بخت خان غالباً حیدر علی کو لانے گیا ہے۔ ہم دونوں اسی کمرے میں ہیں۔" نیپو نے آہستہ سے کہا۔

میں اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بخت خان نے کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ کھولا اور پھر اس کی دھیمی آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحے کے بعد مجھے حیدر علی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بخت خان کے ساتھ ہی ہماری طرف آ رہا تھا۔ گھر میں عجیب سی پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں بخت خان اور حیدر علی کے قدموں کی چاپ کا تسلسل غیر فطری سی فضا پیدا کر رہا تھا۔ نیم تاریکی میں حیدر علی نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا۔ قریب آ کر اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعض اوقات ایک دوسرے کا لمس وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جسے الفاظ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ شاید اسی لیے نہ وہ کچھ بولا نہ میں نے کچھ کہا۔ بخت خان کی رہنمائی میں ہم تینوں آگے بڑھ رہے تھے' نیپو' میں اور حیدر علی! وہ ایک دالان سا تھا' دائیں اور بائیں جانب دروازے نظر آ رہے تھے۔ سامنے بھی بڑا سا دروازہ تھا۔

بخت خان بائیں جانب نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم تینوں اس کی تقلید کر رہے تھے۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

"آ جاؤ!" اندر سے مجاہد اوّل کی بھاری آواز آئی۔

بخت خان کے ساتھ ہم نے بھی اس چھوٹے سے کمرے میں قدم رکھا جس میں برائے نام روشنی تھی۔ بہ مشکل مجھے دائیں بائیں دیوار کے قریب رکھے ہوئے مونڈھے نظر آئے۔ دو مونڈھے ایک طرف اور دو دوسری طرف رکھے تھے۔ سامنے پلنگ تھا اور قریب ہی طاقچے میں لیمپ جس کی لو انتہائی مدھم تھی۔ پلنگ کے پاس ہی پشت والے مونڈھے پر بیٹھا ہوا شخص مجاہد اوّل ہی ہو سکتا تھا۔ ہم چاروں کے علاوہ کمرے میں صرف وہی تھا۔ "بیٹھ جاؤ!" آداب و تسلیمات کے بعد ہمیں حکم ملا۔

ہم چاروں باری باری دائیں بائیں موجود مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ مجاہد اوّل نے بخت خان کے سوا باری باری ہم تینوں کی خیریت دریافت کی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہین! مجھے تمہاری ذہانت پر بھروسا ہے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ نیپو اور حیدر علی اتنے عرصے کے بعد تمہیں پھر کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"اس لیے اے مجاہد اوّل کہ ان دونوں سے میری ذہنی مطابقت ہے۔" میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"اور کوئی سبب؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"آپ مجھے پھر ایک بار اپنے اعتماد پر اترنے کا موقع فراہم کرنا چاہتے ہوں گے۔"

"تم نے درست سمجھا۔" وہ بولا اور پھر چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "اس مرتبہ جو مہم درپیش ہے اس کا نگراں بخت خان ہو گا۔ تمہیں یقیناً یاد ہو گا کہ میں نے خاصے عرصے پہلے تم سے کہا تھا کہ ممکن ہے تمہیں ملتان یا کلکتہ بھیجنا پڑے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے۔ بخت خان ایک بار پہلے بھی ملتان جا چکا ہے۔ تم چاروں ہی کو ملتان جانا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس مہم یا اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ کہوں' تمہیں کچھ کہنا تو نہیں؟"

"مجھے کچھ عرض نہیں کرنا مجاہد اوّل! میں ذہنی طور پر اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ صرف ایک درخواست کرنا تھی

جس کا موقع مجھے پہلے نہیں مل سکا مگر۔ "میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا' بخت خاں اور اپنے دوسرے دو ساتھیوں کے سامنے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اسی لیے بات پوری نہ کر سکا۔

میں چند ہی لمحوں کو خاموش ہوا تھا کہ مجاہد اوّل بول اُٹھا۔ "تم اپنے ساتھیوں پر اعتماد کر سکتے ہو شاہین! میرا قیاس ہے کہ تم شاید ان دونوں بہن بھائی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو جن سے پہلی مہم میں تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

مجھے مجاہد اوّل کی بات پر شدید حیرت ہوئی۔ واقعی وہ بہت باخبر رہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اقرار کر لیا۔ "جی ہاں!"

"اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ فی الحال تم لوگوں سے مجھے انتہائی اہم باتیں کرنا ہیں۔ پہلے میں تم لوگوں کو اس مہم کا پس منظر بتاؤں گا پھر مہم کے متعلق گفتگو کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا پھر کہنے لگا۔ "جیسا کہ تم سب ہی جانتے ہو کہ متعصب ہندو خصوصاً برہمن طبقہ ہندوستان کی سرزمین میں اپنے ناپاک عزائم کی سیاسی فصل بو رہا ہے مگر ہماری اصل جنگ کا رخ ابھی صرف انگریز غاصبوں کے خلاف ہے۔ یہ ہندو طبقہ تو محض موقع سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ موجودہ سیاسی صورتحال یہ ہے کہ کانگریس' خلافت تحریک اور مسلم لیگ نے کم از کم ایک مسئلے پر اتحاد کر لیا ہے اور وہ مسئلہ ہندو مسلم اتحاد ہے۔ یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ ہے۔ دانش مندانہ اس اعتبار سے کہ اس فیصلے سے ہمارے اصل دشمن انگریز پر ضرب پڑے گی۔ اس ملک کے رہنے والے اگر انگریز کے خلاف متحد ہو جائیں تو اس کے پیر بہت جلد اکھڑ جائیں گے مگر بدقسمتی کہہ لو یا تاریخی جبر کہ یہ اتحاد میری نظر میں دیرپا ثابت نہیں ہو گا۔ یہ اتحاد میرے نزدیک مصنوعی اتحاد ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اس وقت کانگریس کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' وہ مصلحتاً ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپ رہے ہیں۔ دل سے انہوں نے اس اتحاد کو قبول نہیں کیا۔ یقیناً تم سب بھی ان سیاسی حالات سے بے خبر نہیں ہو گے۔ بلا جھجک بتاؤ کہ کیا میرا تجزیہ غلط ہے؟"

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر اس خاموشی کو سب سے پہلے بخت خاں نے توڑا' وہ بولا۔ "ہرچند کہ سیاست ہمارا میدان نہیں اور ہم خود کو اس جنگ کا گمنام سپاہی تصور کرتے ہیں جو ہم لڑ رہے ہیں لیکن کچھ باتیں ہم بھی جانتے ہیں۔ ہماری یہ جنگ انگریز حکمرانوں کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اس سرزمین کے مستقبل کا تحفظ بھی ہے۔ یہی جنگ سیاسی سطح پر مسلمان سیاسی رہنما لڑ رہے ہیں۔ یعنی بالواسطہ ہم انہی کی راہ آسان کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کل کیا صورت پیش آئے گی' ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن موجودہ سیاسی صورت میں ہمیں اسی مصنوعی اتحاد کو تقویت دینا چاہیے۔ ہندو کانگریسی رہنماؤں کے متعلق یقیناً آپ کا تجزیہ درست ہے۔ رہے کانگریس میں شامل مسلمان رہنما یا خلافت تحریک تو یہ ایک الگ موضوع ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔"

مجھے بخت خاں کی بے لاگ بات پر قدرے حیرت ہوئی۔ اسی وقت مجاہد اوّل نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم کچھ کہنا چاہتے ہو شاہین؟"

"جی ہاں اے مجاہد اوّل! پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ بخت خاں کے خیالات سے مجھے پورا اتفاق ہے' دوم یہ کہ خلافت تحریک' مسلم لیگ اور دیگر چند مسلم رہنماؤں کی نیک نیتی پر مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی ذات پر ہے۔ دیگر مسلم رہنماؤں میں بہ طور مثال میں مولانا حسرت موہانی' مولوی اے کے فضل حق وغیرہ کے نام لے سکتا ہوں۔ ان ناموں کے علاوہ بھی اور بہت سے نام ہیں مثلاً مولانا ظفر علی خاں' شیخ غلام حسین ہدایت اللہ' سردار عبدالرب نشتر وغیرہ!" میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ بات کی۔

"مجھے خوشی ہوئی شاہین کہ تم موجودہ ہندوستانی سیاست اور مسلمان رہنماؤں سے پوری طرح باخبر ہو۔ تم نے جو چند نام لیے ان مسلمان سیاسی رہنماؤں کا تعلق ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہے۔ شمالی صوبے (یوپی) کے علاوہ پنجاب اور پھر سرحد سے بنگال تک جس میں سندھ کا علاقہ بھی شامل ہے' تمہارے احاطۂ فکر سے باہر نظر نہیں آتا مگر تم شاید ایک بات بھول گئے۔ وہ اہم بات یہ ہے کہ سیاست سے براہ راست ہماری تنظیم کا کوئی تعلق نہیں۔ تمہارے جذبات و خیالات یقیناً قابلِ قدر ہیں اور وہ تمام مسلمان رہنما بھی قابلِ عزت ہیں۔ جن کے تم نے نام لیے مگر ہم اپنی عملی جدوجہد کے لیے سیاسی تجزیے تو کر سکتے ہیں' سیاست سے وابستگی ہمارا منصب نہیں۔ بخت خاں نے بالکل ٹھیک کہا کہ ہم انہی سیاسی رہنماؤں کی راہ آسان کر رہے ہیں جو یہی جنگ سیاسی سطح پر لڑ رہے ہیں۔" مجاہد اوّل کی آواز میں بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ اس نے شاید یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں عملاً نہ سہی ذہنی طور پر سیاست سے خصوصاً تحریک خلافت اور مسلم لیگ سے وابستگی رکھتا ہوں۔ اس نے اسی لیے یہ بات دہرائی تھی کہ تنظیم کا سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ میں واقف تھا' میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم ہوں۔

بخت خاں اور مجھے بولنے کا موقع دینے کے بعد مجاہد اوّل نے ٹیپو اور حیدر علی سے دریافت کیا کہ انہیں تو کچھ نہیں کہنا؟ ان دونوں ہی نے مجاہد اوّل کے سیاسی تجزیے سے مکمل اتفاق کیا اور مزید کوئی بات نہیں کی۔ پھر مجاہد اوّل نے بولنا شروع کیا۔ مجھے اس کی آواز یوں محسوس ہوئی جیسے وہ خواب میں بول رہا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سنو! جب کوئی بلند و بالا عمارت تعمیر ہوتی ہے تو اس کی بنیادوں میں مضبوط پتھر رکھے جاتے ہیں کہ بنیاد کمزور نہ ہو۔ سو ہم سب ایسے ہی پتھروں کی طرح ہیں۔ وہ عظیم الشان اور بلند و بالا عمارت جو یقیناً مستقبل میں کبھی نہ کبھی ضرور تعمیر ہو گی' ہم۔ ہاں ہم ہی سب اس کی بنیاد کے پتھر ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دیکھنے والے صرف اس عمارت کو دیکھ سکیں گے اور بنیاد میں رکھے ہوئے پتھر انہیں نظر نہیں آئیں گے۔ وہ اس عمارت کے معماروں کو تو جان لیں گے اور نہیں جان سکیں گے تو ان پتھروں کو جو عمارت کی بنیاد بن گئے تھے۔ ہم نے یہ سودا جان بوجھ کر کیا ہے۔ کہو کیا یہ سودا مہنگا ہے؟ کیا ہم نے گھاٹے کا سودا کیا ہے؟ کیا ہم سودائی ہیں؟"

"نہیں!" ہم چاروں ہی کے منہ سے بہ یک وقت ایک ہی لفظ نکلا۔

"آفرین ہو تم پر کہ آنے والے زمانے تم ایسے گمنام سپاہیوں کی قبروں پر عقیدت کے پھول چڑھائیں گے۔ تم تاریخ کا حصہ نہ سہی وقت کا حصہ ضرور ہو اور وقت کبھی نہیں مرتا!"

مجاہد اوّل کے ان الفاظ کے بعد دیر تک سکوت چھایا رہا۔ ہم اس نیم تاریک کمرے میں ایک دوسرے کے سانسوں کی آواز سنتے رہے۔ مجاہد اوّل کے الفاظ نے میرے لہو کی گردش تیز کر دی تھی اور شاید یہی حال میرے ساتھیوں کا تھا۔ مجاہد اوّل بھی غالباً اسی کیفیت سے گزر رہا ہو گا۔ اس کی خاموشی بے معنی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم سب ہی اس کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔ مجھے یاد تھا کہ اس نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ایک مہم کا ذکر کیا تھا اور ہم چاروں ساتھیوں کو وہ اسی مہم پر ملتان بھیجنا چاہتا تھا۔ سیاسی تجزیہ اسی مہم کی تمہید تھی۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ موجودہ سیاسی صورت حال میں ہندو مسلم اتحاد ایک دانش مندانہ فیصلہ ہے۔" مجاہد اوّل نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اس فیصلے سے ہمارے اصل دشمن انگریز پر ضرب پڑے گی تو ان عیاروں نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے اور اب وہ سارے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات کرانا چاہتے ہیں۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق میرپور خاص سے حیدر آباد (سندھ) اور کراچی تک کا سارا علاقہ اس کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملتان اور اس کا نواحی علاقہ ان فسادات کا ابتدائی مرکز ہو گا۔ ادھر جنوبی ہند اور بنگال اور بہار بھی ان فسادات کی زد سے نہیں بچ سکیں گے۔ صوبہ بمبئی اور ہندوستان کا شمالی علاقہ پہلے ہی سے ان کی زد پر ہے۔ موجودہ سنگین صورت حال میں ہماری پوری تنظیم کو سرگرم عمل ہونا ہے۔ پورے ہندوستان میں ہمیں ہر محاذ پر عیار دشمن کے اس سازشی منصوبے کو ناکام بنانا ہے۔ ہمارے پاس افرادی قوت اتنی نہیں ہے کہ ہم ایک علاقے میں زیادہ افراد کو بھیج سکیں۔ اس کے باوجود ہم اگر چند علاقوں کو بھی متوقع فسادات کی اس بھڑکنے والی جہنمی آگ سے بچا لے گئے تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہو گی۔ تم چاروں کو میں نے ملتان بھیجنے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں خود بنگال جا رہا ہوں۔ تمہارے کچھ ساتھیوں کو میں جنوبی ہند بھیج چکا ہوں۔ وہ اب تک مدراس پہنچ چکے ہوں گے۔ ملتان میں تمہیں کہاں ٹھہرنا ہے؟ کس کس سے ملنا ہے؟ اور کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے؟ ان تمام تفصیلات کا علم تمہیں کل رات تک ہو جائے گا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' تم میں سے بخت خاں اس مہم کا سربراہ ہو گا۔ اسی کے توسط سے کل رات اسی وقت تک تمہیں بقیہ ہدایات مل جائیں گی۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل خاموش ہو گیا۔

"ملتان کے لیے دہلی سے ہماری روانگی کب ہو گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس کا علم بھی تمہیں کل ہی بخت خاں کے ذریعے ہو جائے گا۔" مجاہد اوّل نے جواب دیا۔

"اے مجاہد اوّل! آپ نے ہم تک جو مصدقہ اطلاعات پہنچائی ہیں' اگر یہ اطلاعات کانگریس کے غیر متعصب لیڈروں' خلافت تحریک اور مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں تک بھی پہنچ جائیں تو کیا وہ اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے اس آگ کو بھڑکنے سے نہیں روک سکتے؟" میں نے کہا۔

"یقیناً وہ ایسا کر سکتے ہیں مگر شاید تمہیں ابھی عوام کی نفسیات کا علم نہیں اور یہ علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ سیاسی رہنما کبھی عوام کی ناپسندیدگی کا خطرہ مول نہیں لیتے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اس وقت ان دونوں قوموں کے جو لیڈر ہیں' ان کے پیچھے عوام ہی کی طاقت ہے۔ اس اہم نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرو! ہندو عوام کی اکثریت ہندو لیڈروں کے ساتھ ہے' اسی طرح مسلمان عوام

فطری طور پر اپنے ہم مذہب سیاسی رہنماؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خلافت تحریک یا مسلم لیگ کی اصل روح مسلمان ہیں۔ اگر کانگریس خلافت تحریک کی حمایت کر رہی ہے تو یہ محض سیاسی مصلحت ہے' اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سے غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک تمہاری اس نیک خواہش کا تعلق ہے کہ انگریز حکمرانوں کی اس سازش سے سیاسی رہنماؤں کو بھی آگاہ کر دیا جائے تو یہ کام ہو چکا ہے۔ انہیں مطلع کر دیا گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں' مولانا حسرت موہانی' علی برادران یعنی مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے مسلم رہنما انگریزوں کی قید میں ہیں۔ کانگریس کے گاندھی جی اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح صاحب تک یہ اطلاعات پہنچا دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک کے جو رہنما ابھی تک گرفتاری سے بچے ہوئے ہیں' انہیں بھی خطرے سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔ مثال کے طور پر سرزمین سندھ کے بزرگ اور معمر رہنما مولانا تاج محمود امروٹی کو بھی یہ خبر پہنچا دی گئی ہے جو ابھی بحمد اللہ حیات ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے بارے میں تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ ریشمی رومال تحریک کے خاتمے کے بعد وہ اس وقت جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں؟" مجاہد اول سے یہ سن کر میرے دل کو ایک ڈھارس سی بندھی کہ سیاسی رہنماؤں کو متوقع ہندو مسلم فسادات سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔ "یاد رکھو کہ ہم اپنے مقاصد میں مخلص ہیں!" مجاہد اول کی آواز ذرا وقفے سے پھر بلند ہوئی۔ "ہمارا مقصد اس بھڑکنے والے الاؤ کو سرد کرنا ہے۔ ہم اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انا کے خول میں بند نہیں ہیں۔ ہم ہر وہ کوشش کر رہے ہیں اور کریں گے کہ بے گناہوں کا خون نہ بہے اور ظالم و عیار حکمراں اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ہم ہر امکانی کوشش کریں گے اور نتیجہ بلاشک اس کے ہاتھ میں ہے کہ جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا!"

"آپ کے علم میں یقیناً یہ بھی ہو گا اے مجاہد اول کہ اسی ملک میں کچھ ایسے سرپھرے بھی تو ہیں جو اعلیٰ انسانی اقدار اور انسان پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا وہ لوگ ہمارے لیے اس موقع پر سودمند ثابت نہیں ہوں گے؟" میں نے پھر ایک سوال کر دیا۔

"میں سمجھ گیا کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔" مجاہد اول نے کہا۔ "فرد اور جماعت دو الگ الگ چیزیں ہیں حالانکہ فرد سے ہی جماعت بنتی ہے۔ ہر افرادی گروہ میں سب پر ایک حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ان میں اچھے' کم اچھے' برے اور بہت برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو شاہین؟" مجاہد اول مجھے میرے تنظیمی نام ہی سے مخاطب کر رہا تھا۔ اتنی طویل گفتگو کے باوجود اس نے ایک بار بھی میرا تنظیمی نام لیتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"جی ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" میں بولا۔

"وہ دونوں بہن بھائی' سیتا اور جوگیندر' موہن لال کی اولاد ہیں۔ موہن لال جو عموماً کلکتے میں رہتا ہے۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ جلالی کی مہم میں موہن لال کی اولاد نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا' خود موہن لال کلکتے میں تمہارے کئی تنظیمی ساتھیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر چکا ہے۔ وہ یقیناً ایک محب وطن شخص ہے' محب وطن بھی اور انگریز دشمن بھی! موہن لال اور اس کی اولاد کا نظریہ کچھ بھی ہو' ہمیں اس سے سروکار نہیں لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ خود وہ اور اس کی اولاد غیر متعصب ہیں۔ میں پھر وہی بات کہوں گا کہ فرد اور جماعت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ موہن لال' جوگیندر اور سیتا پر تو اعتماد کیا جا سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ ان کے گروہ کا ہر شخص یا ان کے سے نظریات رکھنے والا ہر فرد ہمارا دوست ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لینا چاہیے۔ مجھے علم ہے کہ گزشتہ دنوں ان دونوں سے تمہاری خط و کتابت بھی رہی ہے اور اس پر خوشی بھی ہے کہ تم نے تنظیم کے قوانین کا احترام کرتے ہوئے اپنی اصل شخصیت بھی ظاہر نہیں ہونے دی۔ انہیں ابھی مزید آزمائشوں سے گزرنے دو! تمہارے لیے غالباً اتنا اشارہ کافی ہے۔"

اس لیے مجاہد اول سے مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ وہ حیرت ناک حد تک باخبر آدمی تھا۔ وہ بات جو میرے' سیتا اور جوگیندر نیز میرے دوست کریم الدین کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھی' اسے معلوم ہو گئی تھی۔ جب وہ یہ انکشاف کر رہا تھا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں وہ بھی تو پُراسرار قوتوں کا مالک نہیں؟! ایک ایسا شخص جو ہندوستان گیر ایک زیرِ زمین تنظیم کا سربراہ تھا اور جس کے متعلق کچھ خبر نہیں ہوتی تھی کہ کب وہ اتنے بڑے ملک میں کہاں ہو گا؟! اپنی تنظیم کے ایک رکن کے بارے میں کس طرح اتنا باخبر ہو سکتا ہے' خطرناک اور حیرت ناک حد تک باخبر!

مجاہد اول نے جس مرحلے پر اپنی بات ختم کی تھی' وہ میرے لیے سہارا بن گئی۔ اس نے یہ الفاظ کہہ کر سیتا اور جوگیندر پر اپنے اعتماد کا اظہار کر دیا تھا مگر انہیں فی الحال تنظیم کا رکن بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے لیے اس نے مزید آزمائشوں کی شرط رکھ دی تھی۔ دوم یہ کہ وہ جوگیندر اور سیتا کے ساتھیوں کو قبول کرنے پر راضی نہیں تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا "آزمائش کا وقت تو یہ بھی ہے۔ اگر آپ کو ان دونوں پر اعتماد ہے تو انہیں بھی ہمارے ساتھ ملتان جانے کی اجازت دے دیں۔ میں اور ٹیپو تو ان دونوں کے سامنے آ ہی چکے ہیں' حیدر علی سے بھی وہ واقف ہیں۔ صرف بخت خاں ان کے لیے نئے ہوں گے۔ اگر اس مہم میں وہ ہندو بھی ہمارے ساتھ ہوئے تو ممکن ہے کہ ہم اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب رہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس مہم کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کی فضا پیدا کر کے متوقع فساد کو روکنا ہے۔"

مجھے علم نہیں کہ میرے ان الفاظ کا ردِ عمل مجاہد اول پر کیا ہوا لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز سپاٹ تھی "تمہیں کل ہی اس کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ہم سب کو "خدا حافظ" کہہ دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے مزید کچھ کہنا سننا نہیں۔

ہم سب اس کمرے سے باہر نکل آئے۔ صحن میں آکر ٹیپو اور حیدر علی نے مجھ سے مزید کچھ دیر رکنے کو کہا اور بخت خاں بھی بولا کہ اب آپ کھانا کھا کر ہی جایئے گا۔ میں راضی ہو گیا۔ ٹیپو اور حیدر علی مجھے اس کمرے میں لے آئے جہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بخت خاں دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تھا۔ کمرے میں زیادہ گرمی نہیں تھی' چھت اونچی تھی اور کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ جس سے ہوا آ رہی تھی۔ ذرا فاصلے سے دو پلنگ بچھے ہوئے تھے جن کے درمیان میز تھی۔ بیٹھنے کے لیے مونڈھے بھی تھے۔ صراحی اور نقشین گلاس بھی ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ صراحی کے منہ پر ململ کا کپڑا بندھا تھا۔ دستی پنکھے بھی میز پر موجود تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کی الماری رکھی تھی۔ اسی کے قریب طاق میں لیمپ جل رہا تھا مگر اس کی لو مدھم تھی۔ ضرورت کی ہر چیز ہی مجھے وہاں نظر آ رہی تھی۔ "آؤ شاہین' یہاں بیٹھ جاؤ!" ٹیپو نے ایک پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔

حیدر علی ایک مونڈھا اٹھا کر قریب آ بیٹھا۔ ہم تینوں ایک عرصے کے بعد ملے تھے۔ کچھ دیر تو جلالی کی مہم پر باتیں ہوتی رہیں پھر جب ہم آیندہ مہم پر گفتگو کر رہے تھے تو بخت خاں بھی آ گیا۔ وہ کھانا ساتھ لے کر آیا تھا۔ ہم چاروں ساتھیوں نے ایک ہی پلیٹ میں ساتھ ہی کھانا کھایا اور اس دوران میں بھی ہماری گفتگو جاری رہی۔ "میں نے ان دونوں

بہن بھائی کو دیکھا تو نہیں ہے مگر مجاہد اول اور آپ کی گفتگو سے یہ اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں کہ وہ ہماری اس مہم میں کارآمد ثابت ہوں گے۔" بخت خاں نے اپنے خیال کا اظہار کیا پھر بولا "بہرحال اس کا فیصلہ تو مجاہد اول ہی کو کرنا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جائیں گے یا نہیں!"

"جی ہاں" میں نے کہا پھر پوچھا "کیا مجاہد اول بھی یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"جی نہیں" بخت خاں نے جواب دیا "انہیں تو گئے ہوئے بھی خاصی دیر ہو گئی۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے عقبی دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"یہ اچھا ہے کہ اس گھر میں عقبی دروازہ بھی ہے۔" ٹیپو مسکرا کر بولا پھر وہ بخت خاں کو بتانے لگا کہ جلالی کی مہم میں ہم کس طرح ایک ایسے مکان میں گھر گئے تھے جس کا عقبی دروازہ نہیں تھا۔ ٹیپو نے اس "چوہے دان" سے نکلنے کا واقعہ بھی بیان کیا۔

"چھوڑو ٹیپو' کوئی اور بات کرو!" میں نے کہا کیونکہ اس واقعے سے میری ستائش کا پہلو نکلتا تھا۔

اس پر بخت خاں نے بھی مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا "ہم ساتھیوں کے درمیان ایسے واقعات کا ذکر ہونا چاہیے! اس سے ایک دوسرے کی ذہنی تربیت ہوتی ہے۔"

اس روز ساتھ کھانا کھانے اور گفتگو کرنے کے بعد بخت خاں بھی میرے لیے اجنبی نہیں رہا۔ مجھے وہ شخص اچھا لگا تھا۔ ملتان کی مہم کے لیے اسے ہمارا نگراں بنا کر مجاہد اول نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا اہل معلوم ہوتا تھا۔ آیندہ روز مغرب کے بعد آنے کا وعدہ کر کے میں وہاں سے چلا آیا۔ ٹیپو مجھے چھوڑنے بازار ضیا گل تک آیا تھا پھر واپس چلا گیا تھا۔ بازار میں ابھی تک خاصی رونق تھی۔ حالانکہ رات کے نو بج رہے تھے۔ بازار سے نکل کر میں نے تانگا کیا اور قرول باغ کے لیے روانہ ہو گیا۔

راستے بھر میں' جوگیندر اور سیتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ دونوں جلالی میں تھے۔ انہیں ساتھ لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کو بھی دہلی بلانا پڑتا۔ اس میں کم از کم بھی ایک دن تو لگتا ہی۔ جلالی سے وہ علی گڑھ پہنچتے اور پھر وہاں سے دہلی آتے۔ آیندہ شب کوئی فیصلہ ہونے کے بعد انہیں میں تار دے کر دہلی بلا سکتا تھا۔ جامع مسجد کے علاقے میں کئی اقامتی ہوٹل تھے۔ وہ یہیں ٹھہرتے تو زیادہ مناسب تھا۔ میں تار میں کسی بھی ہوٹل کا نام لکھ سکتا تھا کہ وہ وہاں آکر ٹھہر

جائیں۔ اس طرح میری اصل شخصیت پردہ راز میں رہ سکتی تھی۔ میں ان سے ہوٹل میں جا کر مل لیتا اور پھر ہوٹل سے انہیں چنگلی قبر والے مکان میں بھی منتقل کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہوٹل ہی میں رہتے اور جب ہم ملتان کے لیے روانہ ہوتے تو انہیں ہوٹل سے اپنے ساتھ لے لیتے۔ جوگیندر کو میں نے ایک خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی مہم درپیش ہوئی اور ان دونوں بہن بھائی کو بھی ساتھ لے جا سکا تو بہ طور احتیاط ہردیال کے نام سے تار دوں گا اور تار میں لکھ دوں گا کہ انہیں کہاں اور کب پہنچنا ہے! وہ دونوں ایک عرصے سے میرے کسی ایسے ہی تار کے منتظر تھے اور اب تار دینے کا وقت آ گیا تھا۔

دوسرے دن صبح میں نے دہلی سے غائب ہونے کی راہ ہموار کرلی۔ ڈیڈی کو میں نے بتا دیا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں شملہ، نینی تال یا کسی اور پہاڑی مقام پر اپنے دوستوں کے ساتھ گزاروں گا۔ ڈیڈی نے مجھے اجازت دے دی تھی البتہ ممی یہ سن کر کچھ اداس سی ہو گئی تھیں۔ "اتنے دن بعد تو علی گڑھ سے تو آیا ہے اور اب پھر جا رہا ہے۔" انہوں نے کہا تھا۔

"ممی پلیز!" میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں "میں نے اپنے دوستوں سے وعدہ کرلیا ہے۔" بیٹوں کے لیے ماؤں کو منانا بہت آسان ہوتا ہے۔ سو ممی بھی مان گئیں اور میں گھر سے نکل کر اپنی ننھیال پہنچ گیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے ماموں زاد بھائی رحمت علی بھی کسی

"تفریحی مقام" پر جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ بھی میری ہی طرح تنظیم کے رکن تھے۔ گزشتہ رات کو میں مجاہد اول سے یہ سن ہی چکا تھا کہ پورے ملک میں تنظیم اپنے ارکان روانہ کررہی ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی علی گڑھ سے آئے تھے۔ معلوم نہیں کب اور کہاں انہیں اس عرصے میں مجاہد اول کی ہدایات ملی ہوں گی! علی گڑھ ہی میں یا دہلی پہنچ کر؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات تنظیم کے اصولوں کے خلاف تھی۔ وہ میرے ماموں زاد تھے' یہ ایک الگ بات تھی اور تنظیمی ساتھی بھی تھے۔ یہ بالکل دوسری بات تھی۔

اس وقت میں انہی کے کمرے میں تھا۔ میرے اور ان کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے دھیمی آواز میں مجھ سے صرف اتنا ہی پوچھا "تم کب سیر و تفریح کے لیے جا رہے ہو؟"

"ابھی کچھ طے نہیں لیکن جانا بہرحال ہے۔" مجھ سے وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بتا دیا یعنی میں بھی ا[...] کی طرح کہیں جا رہا ہوں۔ "گڈ!" وہ آہستہ سے بولے اور ا[...] کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔

اس سے زیادہ میرے اور ان کے درمیان تنظیم [...] متعلق اشاروں کنایوں میں بھی کوئی بات نہیں ہوئی پھر [...] دونوں دوسری باتیں کرنے لگے تھے۔ اسی عرصے میں عظ[...] علی بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا تھا۔ میں دراصل عظ[...] علی اور حویلی کے دوسرے باسیوں کو یہی بتانے آیا تھا کہ ا[...] کچھ علی گڑھ کے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کی غرض [...] جا رہا ہوں اور تو کسی نے کچھ نہیں کہا البتہ عظمت علی [...] "کمپل" ہونے لگا۔ ماموں زاد ہونے کے علاوہ وہ میرا دوس[...] بھی تو تھا۔

"یار' پہلے سے بتایا ہوتا تم نے! میں بھی چلا چل[...] تمہارے ساتھ! اب ابا جان سے اجازت ذرا مشکل سے [...] گی کیوں کہ بھائی جان بھی گھومنے پھرنے جا رہے ہیں پھر بھی [...] اگر کہو تو کوشش کرلیتا ہوں۔ بس ایک بار دوستوں کے سا[...] مسوری گیا تھا۔"

"ابھی کچھ خبر نہیں عظمت علی کہ کب اور کہاں جا[...] ہے!" میں نے اسے ٹالا "جب میرے علی گڑھ کے دوس[...] دہلی پہنچ جائیں گے تب ہی پروگرام بنے گا پھر یہ کہ تم ان س[...] کے لیے اجنبی ہوگے۔ تمہیں زیادہ مزہ نہیں آئے گا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" وہ بولا۔

پھر وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں بول اٹھا "تمہار[...] دوست فرید احمد کا کیا حال ہے؟" اس سوال سے میرا مقص[...] موضوع گفتگو بدلنا تھا اور میں کامیاب رہا۔

"ٹھیک ہوگا' بہت دن سے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ جس روز کلونت کور کا قت[...] ہوا اسی روز اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ تب ہی سے [...] کسی کام کا نہیں رہا۔ مہینوں اسپتال میں پڑا رہا پھر اسپتال سے نکلا تو ایک ٹانگ سے محروم ہو چکا تھا۔ بیساکھی [...] سہارے ایک ٹانگ سے چلتا ہے۔ کبھی کبھی رحم بھی آتا [...] اس پر! اس کے باپ نے اسے بہت تنگ کر رکھا ہے کہ کو[...] کام کر! میں ایک دفعہ ملنے گیا تھا تو کچھ مدد کر آیا تھا۔ وہ کہہ [...] تھا کہ اباجی ایک پیسا نہیں دیتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ کہا[...]"

"اچھا تو اب میں چلا' دیر ہو رہی ہے۔" میں اس [...] بات کاٹ کر بولا! کیوں کہ مجھے فرید احمد کے ذکر سے اتنی دلچ[...] نہیں تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا' یہ حقیقت ہے کہ [...]

[...] احمد کا حال سن کر خوشی ہوئی تھی۔ اسی ظالم کی وجہ سے تو [...] پہلی محبت کلونت کور قتل ہوئی تھی۔ اگر اسنی کی [...]رار سرگوشی مجھے مزید کوئی خطرناک قدم اٹھانے سے [...] نہ دیتی تو اس روز میں' فرید احمد کو زندہ نہ چھوڑتا۔

"ایسے کیسے چلے جاؤ گے مہاراج!" عظمت علی نے [...] ہندو غنڈے بھگو کی نقل اتاری جو سین کو شین بولتا [...] اس سے میرا ٹکراؤ جی بی روڈ کے ایک کوٹھے پر ہوا تھا۔ [...]ت علی اور فرید احمد ہی مجھے وہاں لے گئے تھے۔ میں ہنس [...] تو عظمت علی بولا "کیا خیال ہے طارنوش' چلیں آج رات [...]ور!"

"بکواس مت! اور یہ نہ بھولو کہ اب تم میرے ماموں زاد بھی [...] بڑے ماموں کو بھنک لگ گئی تو تمہاری چندیا پہ ایک [...] بھی نہیں چھوڑیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

حویلی سے لوٹتے ہوئے میں سوچ رہا تھا' یہ دنیا کتنی رنگ [...]رنگی ہے! ایک عظمت علی ہے کہ اسے کوئی پروا ہی نہیں' [...]وت وقت اس کے اور اس جیسے دوسرے بے خبروں کے [...] لیے سازش کا کیا جال بن رہی ہے اور ایک اس کا بڑا بھائی رحمت علی ہے جو غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگانے کہیں جا رہا ہے۔ شاید انہی تضادات کا نام زندگی ہے! میں نے سوچا اور طویل سانس لے کر اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

خود میری زندگی بھی تو تضادات ہی کا مجموعہ تھی۔ میرا تو وجود ہی متضاد تھا۔ مجھے دیکھ کر بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ میں آدم زاد ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔ کسے معلوم تھا کہ میرے وجود میں کیا کیا قیامتیں چھپی ہوئی ہیں! بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ میں بہ یک وقت انسانی اور غیر انسانی صفات کا مالک ہوں۔ مجھ پر تو خود ابھی میرے اسرار پوری طرح نہیں کھلے تھے۔ میرے باپ کی بہن اسنی اور خود میرے سوا کسے یہ معلوم تھا کہ دراصل میں کیا ہوں۔ میرے اندر کیا پیکار جاری ہے اور مجھے کس دکھ نے نڈھال کر رکھا ہے۔ بس اسنی ہی تو جانتی تھی۔ وہ پُراسرار اسنی جو اب میرے لیے پراسرار نہیں رہی تھی اور وہ جو بچپن سے اب تک قدم قدم پر میری رہنمائی کرتی رہی تھی۔ میں اپنے باپ ماموں کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اسنی کہتی تھی کہ ابھی میں ذہنی طور پر بالغ نہیں ہوا۔ یہی تو دکھ تھا میرا! اور اس دکھ کا مداوا اسنی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جس دکھ کا کوئی مداوا ممکن نہیں ہوتا [...]دمی اس سے فرار کی خاطر مختلف حیلے بہانے تراش لیتا ہے۔ غیر محسوس طور پر شاید میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔

زیر زمین ایک خفیہ تنظیم سے میری اس قدر وابستگی بھی غالباً اسی کا شاخسانہ تھی مگر اس وقت میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ میں تو ان دنوں تن من دھن سے انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھا اور میرے جذبات یہ تھے کہ اگر اس راہ میں میری جان بھی چلی جائے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اپنے وطن' اپنے لوگوں پر جان قربان کردوں گا۔ جان کا کیا ہے یہ تو جانی ہے! زندگی کا کوئی مقصد تو ہو۔ اس کے کوئی معنی تو ہوں! بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہے پھر انسان اور حیوان میں فرق کیا ہوا اور میں انسان بھی تو تھا۔ میری ماں تو ایک آدم زادی ہی تھی۔ سو اس نسبت سے مجھ پر بھی تو کچھ قرض تھا اور میں وہ قرض اتارنا چاہتا تھا۔ آدم زادوں کا قرض' اپنی زمین کا قرض' مادرِ وطن کا قرض! اسی قرض کی ادائیگی کے لیے میں اس رات بھی چنگلی قبر کے اس گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا جہاں گزشتہ شب مجاہد اول سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دروازہ پہلی دستک پر نہیں کھلا تھا۔ ذرا دیر کے بعد میں نے دوبارہ دستک دی تھی۔ جس وقت میں اس تنگ سی گلی میں داخل ہوا تھا تو گزشتہ روز کی طرح وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں آج مجھ سے نہیں پوچھا گیا تھا کہ کون ہے؟ اس کا سبب میں کیا سمجھا کہ شاید بخت خاں میرا ہی منتظر ہوگا۔ دوسری دستک پر دروازہ فوراً کھل گیا تھا اور مجھے شناختی الفاظ بھی ادا نہیں کرنا پڑے۔

عین اسی لمحے دو باتیں خلاف معمول ہوئیں۔ دروازہ کھلتے ہی اور میرے اندر قدم رکھتے ہی مجھے تاریک ڈیوڑھی سے اندر گھسیٹ لیا گیا تھا۔ مجھے گھسیٹنے والے وہ مضبوط ہاتھ کن لوگوں کے تھے۔ اندھیرے کے سبب میں نہیں دیکھ سکا لیکن یہ گرفت بہرحال دوستانہ نہیں تھی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ مجھے ایک دم انتہائی گرمی محسوس ہوئی اور میں پسینے میں ڈوب گیا۔ گھر کا دروازہ بند ہونے کی آواز بھی میں نے سنی۔

میں اس روح فرسا کیفیت سے گزر رہا تھا اور مجھے شدید گرمی کی وجہ سے اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ یوں جیسے میرے وجود کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا گیا ہو۔ اسی دوران میں مجھے اپنی گرفت میں لینے والے کشاں کشاں اس نیم تاریک راہداری سے صحن کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں روشنی نظر آ رہی تھی۔

"اسے اجالے میں لے آؤ!" صحن کی طرف سے ایک کرخت اجنبی آواز سنائی دی۔

یہی وہ لمحات تھے جب میں ایک اذیت ناک پُراسرار تجربے سے گزر کر اپنے حواس میں آ چکا تھا۔ میرا وجود نادیدہ بن چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں بازو چھڑا لیے اور جست بھر کر راہداری کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ اپنے پیچھے مجھے خوف زدہ سی آوازیں سنائی دی تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہی کرخت آواز صحن میں پھر گونجی۔

"وہ بھاگ گیا سر۔ فرار ہو گیا۔" جواب میں نیم تاریک راہداری سے آواز آئی۔ اسی کے ساتھ آگے پیچھے دوڑتے ہوئے تین سادہ لباس افراد میرے قریب ہی سے گزر کر صحن میں پہنچ گئے۔ وہ تینوں ہی حواس باختہ نظر آ رہے تھے۔

میں اس عرصے میں صورت حال کا اندازہ لگا چکا تھا۔ صحن میں بھاری بھرکم ایک شخص پشت والے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا لکڑی کا رول تھا اس مونڈھے کے قریب ہی دوسرے مونڈھے پر لیمپ رکھا تھا۔ سامنے ہی فرش پر حیدر علی بندھا پڑا تھا۔ وہ شخص بھی سادہ کپڑوں میں تھا۔

"الو کے پٹھو! وہ کیسے بھاگ سکتا ہے؟ کہاں فرار ہو سکتا ہے!" بھاری بھرکم شخص غصے میں اُٹھ کھڑا ہوا "تمہاری ہی حماقت سے اس کے دو ساتھی فرار ہو گئے! تلاش کرو اسے! وہ یہیں کہیں چھپ گیا ہو گا اگر وہ بھی نکل گیا تو تمہاری کھال گرادوں گا میں!" یہ کہتے ہوئے اس شخص نے اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر پستول نکال لیا اور غصے میں حیدر علی کے [illegible] ٹھوکر لگائی۔

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ ٹیپو اور بخت خاں، سادہ لباس پولیس والوں کی گرفت سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

"تمہارا باپ بھی اب مجھے تلاش نہیں کر سکتا، انگریز کے ٹکڑوں پر پلنے والے غلام!" میں نے زیرِ لب کہا اور آگے بڑھا۔

وہ تینوں اپنے افسر کے حکم پر پلٹے ہی تھے کہ ان میں سے ایک کی ٹانگ پکڑ کر میں نے گھسیٹ لی۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر رہا تھا کہ دوسرے کے پیٹ پر میری لات پڑی وہ "اوغ" کر کے بیٹھا ہی تھا کہ تیسرے شخص کی کنپٹی پر میرا فولادی گھونسا پڑا وہ لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اب اس بھاری بھرکم شخص کی باری تھی جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہا تھا۔

"وا... واقعی یہ... یہ مکان آ... آسیب زدہ لگ... لگتا ہے۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس بھاری بھرکم شخص کا جسم کانپنے لگا تھا جو چند لمحے پہلے "تارزن" بن رہا تھا۔ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسی وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔

میں نے اس کی کمر پر لات ماری اور وہ بھی زمی گیا۔ گرتے ہی خوف کی زیادتی کے سبب وہ شاید ہو گیا تھا۔ اس کے دو ماتحت جو پہلے ہی زمین پر گر انہوں نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے غالباً بے ہوش تھا، وہ جس کی کنپٹی پر میرا گھونسا پڑا تھا پیٹ پر ضرب کھا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے بھی اٹھنا نصیب میں نے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنا کر اسے بھی لمبا تھا۔ اوندھے منہ گرنے والے پہلے شخص کی طرف میں ہوا تو اس کے ہاتھ پیر بھی ڈھیلے ہو چکے تھے۔ دہشت سے وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

ان چاروں کی طرف سے مطمئن ہو کر کہ وہ ا کھو چکے ہیں، میں حیدر علی کی طرف پلٹا کہ اسے ر گرفت سے آزاد کر دوں۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا اور آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

میں حیدر علی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک جا مجھے خفیف سی آہٹ محسوس ہوئی پھر کسی کے دبے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھ کچھ اور لوگ بھی اس گھر میں تھے یا داخل ہو چکے قدموں کی آواز مجھے اس نیم تاریک دالان کی طرف دی تھی جس کی بائیں جانب ایک چھوٹے سے کمر مجاہد اوّل سے گزشتہ رات میری ملاقات ہوئی تھی۔ سے اس طرف دیکھنے لگا۔ میں نے دو ہیولوں کو نیم تار حرکت کرتے دیکھ لیا پھر وہ دونوں ہی چیتوں کی طرح بھر کے صحن میں آ گئے۔ ان دونوں کے چہروں پر نقابیں اور ہاتھوں میں پستول تھے۔ چہرے چھپے ہونے کے باو ان دونوں کو پہچان گیا۔ وہ بخت خاں اور ٹیپو تھے اور صحن میں بے سدھ پڑے ہوئے پولیس والوں رہے تھے۔

"ٹیپو! شاید شاہین ہمارے فرار کے بعد یہاں پہنچ اور اسی نے ان حرام زادوں کو... مگر حیدر علی... یہ تک بندھا..."

بخت خاں کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ مجھے ہلکی سی سردی محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میرا جسم واپس ملنے والا ہے۔ تیزی کے ساتھ میں نے صحن اور پھر نیم تاریک راہداری سے گزرتا ہوا کمرے

وازے تک پہنچ گیا۔ اس وقت تک شدید سردی سے میں نے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بہ مشکل دروازے کی ی کھول دی۔ اسی کے ساتھ چند ہی لمحوں میں میرا جسم ال پر آ گیا۔ خطرہ ٹل جانے کے بعد میرا جسم مجھے واپس گیا تھا پھر میں تیزی کے ساتھ پنجوں کے بل دوڑتا ہوا می سے نیم تاریک راہداری میں پہنچ گیا۔

"کون ہے؟" بخت خاں کی سرسراتی ہوئی آواز میں نے "جہاں ہو وہیں رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

یم تاریکی کے سبب وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کے ں کا رخ راہداری ہی کی طرف تھا۔ میں رک گیا اور اسی ساتھ نسبتاً بلند آواز میں بولا "میں شاہین ہوں۔ کیا ہوا خاں؟"

"دروازہ بند کر آؤ شاہین!" میری آواز سنتے ہی بخت تیزی سے بولا "ہم خطرے میں ہیں۔"

میں پلٹا اور دوڑتا ہوا صدر دروازے تک دوبارہ پہنچا۔ زہ اسی طرح بند تھا۔ میں نے دوبارہ کنڈی لگا دی۔ اس بھاگ دوڑ کا مقصد محض یہ تھا کہ میں تنظیمی ساتھیوں پر پُراسرار قوتیں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب میں واپس میں پہنچا تو حیدر علی رسیوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا بخت خاں اور ٹیپو بے ہوش پولیس والوں کو باندھ رہے

"ہوا کیا آخر؟" میں نے انجان بن کر حیدر علی کو مخاطب نڈھال سا اس مونڈھے پر بیٹھا تھا جس پر کچھ ہی دیر بھاری بھرکم پولیس افسر بیٹھا تھا۔

حیدر علی کی بجائے بخت خاں نے میرے سوال کا جواب ی الحال جلد از جلد یہاں سے ہمیں نکلنا ہے۔ باقی باتیں وں گی جب ہم دوسرے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائیں" پھر بخت خاں کے کہنے پر میں تو ٹیپو کا ہاتھ بٹانے لگا اور تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

چاروں بے ہوش پولیس والوں کو باندھنے میں زیادہ دیر لگی۔ اس عرصے میں حیدر علی بھی سنبھل چکا تھا۔ بخت نے اپنی مدد کے لیے ہم تینوں کو بھی بلا لیا۔

جب ہم چاروں ساتھی اس گھر کے عقبی دروازے سے گلی میں نکل آئے تو ہمارے پاس دو سوٹ کیس اور کے دو بڑے تھیلے تھے۔ بخت خاں نے اس گھر میں ضروری سامان نہیں چھوڑا تھا۔ میرے اور بخت خاں ہاتھ میں ایک ایک سوٹ کیس تھا۔ کینوس کے تھیلے ٹیپو حیدر علی نے اٹھا رکھے تھے۔ بخت خاں وہاں سے ہمیں ترکمان گیٹ کے ایک گھر میں لے آیا۔ گھر کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا جو اسی نے کھولا تھا۔ وہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں صرف تین کمرے تھے۔ جن میں سے ایک خاصا بڑا تھا۔ گھر کا دروازہ وہاں داخل ہوتے ہی بخت خاں نے اندر سے بند کر دیا تھا۔ بڑے کمرے کے آتش دان کے اوپر لیمپ جل رہا تھا۔ بخت خاں نے اس کی دھیمی لو کمرے میں آتے ہی بڑھا دی تھی۔ کمرے میں ایک طرف تخت پڑا تھا اور دوسری جانب ایک پلنگ۔

"بیٹھو ساتھیو!" بخت خاں نے تخت پر بیٹھتے ہوئے ہم تینوں ساتھیوں کو مخاطب کیا "اب ہم محفوظ ہیں۔" ہمارے ساتھ جو سامان تھا ہم نے وہیں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ہم بھی جوتے اُتار کر بخت خاں کے قریب تخت پر بیٹھ گئے۔ تخت پر غالیچہ بچھا ہوا تھا۔

"ہاں بھئی حیدر علی، پہلے تم بتاؤ کہ ہمارے فرار ہونے کے بعد کیا ہوا تھا؟" بخت خاں نے حیدر علی کو مخاطب کیا۔

"معاف کیجیے گا برادر بخت خاں، اگر ابتدا سے بات کریں تو زیادہ بہتر ہے تاکہ مجھے بھی معلوم ہو جائے، آپ اور ٹیپو کیوں اور کب وہاں سے فرار ہوئے نیز یہ کہ حیدر علی کیسے پھنس گیا؟" میں بول اُٹھا۔

بخت خاں نے چونک کر میری طرف دیکھا "شاہین! آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حیدر علی وہاں پھنس گیا تھا؟"

میں بخت خاں کے اس سوال پر مسکرایا اور بولا "آپ ہی کے جملے سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ ابھی تو آپ حیدر علی سے پوچھ رہے تھے کہ ہمارے فرار کے بعد..."

"ٹھیک ہے" یہ کہتے ہوئے بخت خاں نے ٹھنڈا سانس بھرا پھر کہنے لگا "میں بتاتا ہوں کیا ہوا تھا!" میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

"مجاہد اوّل کی طرف سے آج دوپہر ہی کو یہ ہدایت مل چکی تھی کہ ٹھکانا بدل دیا جائے کسی ایسے ہی موقع کے لیے یہ مکان پہلے ہی سے کرائے پر لے لیا گیا تھا۔" بخت خاں بتا رہا تھا "فوری طور پر ہم نے ٹھکانا بدلنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی شاہین کہ بعد مغرب آپ کو وہاں پہنچنا تھا۔ ہم نے سوچا یہ تھا کہ جب آپ آ جائیں گے تو وہاں سے اس گھر میں منتقل ہو جائیں گے اور یہی ہماری غلطی تھی۔ مجاہد اوّل کی ہدایت پر ہمیں فوراً عمل کرنا چاہیے تھا۔ رہا آپ کو یہاں لانے کا مسئلہ تو اس کی اور کئی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ بہرحال اب تو جو غلطی ہونی تھی سو ہو گئی۔ چنگی قبر والا مکان کس طرح

خفیہ پولیس والوں کی نظر میں آگیا‘ یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ کتے‘ حیدر علی کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ میں نے شناختی الفاظ سننے کے بعد حیدر علی ہی کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت میں غیر مسلح تھا۔ حیدر علی نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ دو افراد نے تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوکر اسے دبوچ لیا۔ اسی کے ساتھ باہر سے کسی کی کرخت آواز سنائی دی‘ پولیس! کوئی بھی بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ گولی ماردی جائے گی! میں سانس روکے قریب ہی کھڑا تھا۔ ایک بھاری بھرکم شخص کو میں نے پستول تانے ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ٹیپو کو تو کم از کم پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچالیتا جو اندر گھر کے ایک کمرے میں تھا۔ گھنٹا بھر پہلے حیدر علی کچھ ضروری خریداری کرنے جامع مسجد تک گیا تھا۔ ٹیپو اور میں اسی کی آمد کا انتظار کررہے تھے۔ اس کے آنے سے ذرا پہلے میں‘ ٹیپو سے یہی کہہ رہا تھا کہ اسے اتنی دیر نہیں لگانا تھی۔ مختصر یہ کہ ٹیپو کو ساتھ لے کر میں گھر کے عقبی دروازے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں سے فرار ہوکر میں‘ ٹیپو کے ساتھ اس مکان میں آیا یہاں سے ہم دونوں نے پستول لیے اور پھر دوبارہ چتلی قبر پہنچ گئے۔ واپسی میں ہم نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں نکلیں گے۔ ہم ہر قیمت پر حیدر علی کو ان کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے تھے‘ چاہے اس کے لیے ہمیں ان سب کو جہنم رسید ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ چتلی قبر پہنچ کر ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ گھر کا صدر دروازہ اور عقبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ مجھے اور ٹیپو کو گھر کے اندر پہنچنے کے لیے چھت پر چڑھنا پڑا پھر جب ہم دونوں چھت سے گھر میں اترے تو وہاں اور ہی منظر تھا۔ حیدر علی ہمیں بندھا ہوا ملا اور چاروں پولیس والے بے ہوش پڑے نظر آئے پھر ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا شاہین! آپ آگئے ظاہر ہے کہ آپ کو گھر کا صدر دروازہ کھلا ہوا ہی ملا ہوگا تب ہی تو آپ اندر آئے ہوں گے۔ میں نے اسی لیے آپ سے دروازہ بند کرنے کو کہا تھا۔ آپ دروازہ بند کرنے گئے اور ہم نے حیدر علی کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرکے ان چاروں بے ہوش پولیس والوں کو باندھنا شروع کردیا۔ ہم دونوں وہاں تھے نہیں‘ حیدر علی بندھا پڑا تھا اور آپ ہمارے بھی بعد وہاں پہنچے تھے۔ گھر کے دروازے اندر سے بند تھے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ وہ چاروں پولیس والے کس طرح بے ہوش ہوگئے؟“ اپنی بات مکمل کرکے بخت خاں سوالیہ نظروں سے حیدر علی کی طرف دیکھنے لگا۔

اب حیدر علی نے بولنا شروع کیا ”میں سخت ... کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ اول تو مجھے خریداری میں اتنی دیر نہیں لگانا تھی۔ دوم چوکنا ... تھا کہ کہیں کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔“

”تم نے دونوں باتیں بالکل درست کہی ہیں“ بخت خاں بولا ”یقیناً تمہیں اتنی بڑی حماقت کا ثبو... چاہیے تھا۔ صرف تمہاری اس حماقت کی وجہ ... کی زندگی خطرے میں پڑگئی تھی۔ یہ الفاظ میں ا... نگراں کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں جو مجاہد اول ... سپرد کی ہے۔ اس سنگین غلطیوں پر میں تمہیں ا... خارج کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہوں مگر میں تمہیں ... ہوں۔ اس کی ایک وجہ خود میری بھی حماقت ہے ... اول کی آخری ہدایات ملتے ہی ٹھکانا بدل دینا ... جتنے قصوروار تم ہو اتنا ہی میں بھی ہوں۔ بس ا... کیا کہہ رہے تھے۔“ میں نے بڑی بڑی روشن آ... بخت خاں کی طرف دیکھا۔ وہ بلا کا صاف گو تھا۔

حیدر علی نے اظہارِ معذرت کے بعد کہا ... دونوں فرار ہوگئے تو پولیس افسر نے مجھے بند ... ڈال دیا۔ اس کا ارادہ مجھ پر تشدد کرنے کا تھا ... کھول دوں۔ اس نے مجھے ڈرانا دھمکانا شروع ... اچانک صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ پولیس ا... مجھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگوں نے وہاں ... کہاں پناہ لی ہوگی؟ دستک سن کر اس نے اپنے ... کو ہدایت دی کہ آنے والا جو کوئی بھی ہو ا... جائے۔ اس کا خیال یہ تھا کہ دستک دینے والا ... ساتھی ہوسکتا ہے۔ وہ تینوں تیزی کے ساتھ ... وہاں سے چلے گئے پھر میں نے دروازہ کھلنے اور ... آواز سنی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے معلوم تھا ... شاہین کو آنا تھا۔ ذرا دیر کے بعد راہداری کی طر... زدہ سی آوازیں سنائی دیں۔“ پھر حیدر علی نے ... بیان کردیا جو اس نے بہ قید ہوش و حواس دیکھ... کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ان تینوں ہی ... شدید حیرت کا اظہار ہورہا تھا۔

”کیا وہ مکان واقعی آسیب زدہ تھا؟“ خاموشی کو میری ہی آواز نے توڑا۔

”ان حالات میں تو ایسا ہی لگتا ہے۔ بہر... کی شہرت یہی تھی اسی لیے خالی پڑا تھا اور یہ ... اسے کرائے پر حاصل کرلیا تھا۔“ بخت خاں نے بتایا پھر کہنے لگا ”اگر واقعی اس گھر میں آسیب یا جنات رہتے ہیں تو وہ نیک ہی رہے ہوں گے۔ ہمیں بہرحال انہوں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ ایک ہفتے سے زیادہ مجھے اس گھر میں رہتے ہوگیا تھا۔“ میں نے بڑی خوب صورتی سے بات کا رخ تبدیل کردیا تھا۔ ”آپ جب پہنچے تو کیا دروازہ کھلا ہوا ملا تھا؟“ بخت خاں نے مجھ سے پوچھا۔

”جی ہاں‘ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔“ میں نے اپنی پردہ پوشی کی خاطر کہا ”مجھے فوراً ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا اسی لیے دوڑتا ہوا اندر پہنچا تھا اور پھر ـــ“

”حیدر علی نے بتایا ہے کہ آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے بھی دروازے پر دستک سنائی دی تھی پھر اس نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز بھی سنی تھی۔ اسی کے بعد وہ پُراسرار واقعہ پیش آیا تھا جو اس نے بیان کیا ہے۔ تینوں پولیس والوں نے اپنے افسر کو جس کے فرار ہوجانے کی خبر دی تھی‘ یقیناً وہ کوئی پُراسرار وجود ہی رہا ہوگا۔“ بخت خاں اپنی دانست میں اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا رہا تھا ”میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا تھا کہ جنات انسانی قالب بھی اختیار کرلیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔“

پھر میں نے ہی گفتگو کا رخ حالیہ مہم کی طرف موڑ دیا۔ بخت خاں سے مجھے معلوم ہوا کہ مجاہد اول دہلی سے جاچکا ہے۔ دوپہر کے بعد وہ بخت خاں کو آخری ہدایات پہنچا کر بنگال روانہ ہوگیا تھا۔ ہم چاروں کو ایک ہفتے کے اندر اندر دہلی سے ملتان روانہ ہوجانا تھا۔ جوگیندر اور سیتا کو بھی اس نے ملتان ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور یہی اطلاع میرے لیے بہت اہم تھی۔ مہم کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے بخت خاں کا ہر حکم ماننا اب ہم تینوں کا فرض تھا۔

”شاہین! آپ یہ بتائیں کہ جوگیندر اور سیتا یہاں کب تک پہنچ سکتے ہیں؟“ بخت خاں نے مجھ سے سوال کیا۔

”اگر انہیں آج ہی رات تار دے دیا جائے تو وہ کل تک یہاں پہنچ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پرسوں ملتان روانہ ہوسکتے ہیں۔“ بخت خاں کا انداز خود کلامی کا سا تھا ”مگر حیدر علی کو آج ہی رات یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے کیوں کہ یہ پولیس کی نظروں میں آچکا ہے۔ کیا خیال ہے شاہین؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے تائید کی پھر مشورہ دیا ”آپ اور ٹیپو بھی احتیاطاً آج ہی رات کم از کم دہلی سے نکل جائیں تو بہتر ہے۔“

”آپ ... وہ دونوں بہن بھائی؟ آپ تینوں ـــ“

”... یہاں سے پرسوں کسی وقت چل دیں گے۔“ میں نے بخت خاں کی بات کاٹ کر تجویز پیش کی ”اس طرح اس غلطی کا ازالہ ہوجائے گا جو نادانستگی میں آپ سے سرزد ہوچکی ہے۔ مجاہد اول کی یہ ہدایت کہ ٹھکانا بدل دیا جائے‘ ظاہر ہے بلا سبب نہیں ہوسکتی۔ اس کا سبب یہی ممکن ہے کہ وہ مکان کسی بھی وجہ سے پولیس کی نظر میں آگیا ہوگا۔ اس کی ایک وجہ اس مکان کی یہ شہرت بھی ہوسکتی ہے کہ آسیب زدہ ہے۔ کسی ایسے مکان میں کچھ لوگوں کی بود و باش پولیس کو اس طرف متوجہ کرسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اور ٹیپو بھی پولیس کی نظر میں آچکے ہوں۔“

”ہم دونوں آج دوپہر کے بعد اس مکان سے نہیں نکلے۔“ بخت خاں نے بتایا ”مگر شاہین‘ آپ کا یہ تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ پولیس اس مکان کے آسیب زدہ ہونے ہی کی بنا پر ادھر متوجہ ہوسکتی ہے۔“

”اور ایسا آج ہی ہوا ہے۔“ میں نے مزید کہا ”اگر اسے پہلے سے اس مکان میں کسی کے بود و باش کی اطلاع ہوتی تو گزشتہ رات بھی وہاں چھاپا پڑسکتا تھا۔“

”آپ کا یہ قیاس بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہم تینوں ہی آج رات دہلی سے نکل جائیں۔“ بخت خاں بولا۔

پھر مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ بخت خاں‘ ٹیپو اور حیدر علی کے ساتھ لاہور میں رک کر میرے وہاں پہنچنے کا انتظار کرے گا۔ اس کے بعد ہی ہم سب یک جا ہوکر لاہور سے ملتان جائیں گے۔ لاہور میں بخت خاں مجھے کس وقت کہاں ملے گا‘ یہ اس نے مجھے اچھی طرح سمجھادیا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں رکا کیوں کہ مجھے فوری طور پر جوگیندر کو تار دینا تھا کہ وہ سیتا کو ساتھ لے کر فوراً دہلی پہنچ جائے۔

○☆○

”میں تمہاری کنیز ہوں اور ـــ اور تم طارنوش ـــ تم میرے آقا ہو!“ سیتا بڑبڑا رہی تھی۔ اس کی خواب ناک سی آواز مجھے اپنی روح میں اترتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر میرے شانے سے لگا ہوا تھا۔ اس کے لمس نے مجھ سے ہجر کا سارا احوال کہہ دیا تھا۔ وہ کس آگ میں جلی اور کس حال میں رہی‘ مجھ پر اس پر کیا بیتی‘ زبان سے اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا‘ کہا تھا تو صرف اتنا کہ وہ میری کنیز ہے اور میں اس کا آقا ہوں۔

سیتا نے آج ہی مجھ سے یہ نیا رشتہ قائم کیا تھا اور یہ میرے نزدیک اس کی بہت بڑی قربانی تھی۔ وہ سیتا سے "کنیز" بن گئی تھی۔ اس نے اپنی محبت پر سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ وہ میری خاطر سب کو چھوڑ آئی تھی' بچپن کی یادوں کو اور اپنے ماضی کو!

یہ خود اسی کی خواہش تھی جس کا اظہار گزشتہ رات اس نے میری موجودگی میں اپنے بھائی جوگیندر سے کیا تھا۔

"اگر تم مسلمان ہونا چاہتی ہو تو کم از کم مجھے کوئی اعتراض نہیں اور جہاں تک پتا جی کا معاملہ ہے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" جوگیندر نے بلا جھجک کہہ دیا۔

وہ دونوں بہن بھائی کل شام دہلی پہنچ کر جامع مسجد کے اسی اقامتی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ جس کا نام میں نے تار میں لکھا تھا۔ صبح ہوتے ہی انہیں میرا تار مل گیا تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ جالائی سے چل دیے تھے۔ میں مغرب کے وقت اس ہوٹل میں پہنچا تھا۔ مجھے ان کے پاس بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سیتا نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔

"بھیا! میں بھی اپنے پتا جی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے کہ میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔" سیتا نے اپنے بھائی کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

اسی کے نتیجے میں آج ہی صبح میں سیتا کو ساتھ لے کر جامع مسجد کے پیش امام صاحب کے پاس ان کے حجرے میں گیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کے پیش امام صاحب ہی نے سیتا کو کلمہ پڑھوایا تھا اور پھر وہ مسلمان ہو گئی تھی۔ اسی موقع پر سیتا نے کہا تھا کہ میں اب اپنا نام کنیز رکھنا چاہتی ہوں۔

"بیٹی! تم اپنا پورا نام کنیز فاطمہ رکھو تو زیادہ بہتر ہے۔" پیش امام صاحب نے نرمی سے کہا۔

"بہتر ہے۔" سیتا سر جھکا کر بولی۔

"امام صاحب! آپ سے ایک درخواست ہے۔" میں نے کہا "یہ آپ کو بتا ہی چکی ہیں کہ انہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔ دل سے انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھا ہے اور زبان سے اس کا اقرار کیا ہے مگر خوفِ فسادِ خلق کے سبب میری یہ گزارش ہے کہ اس بات کی شہرت نہ ہو۔ ہماری خواہش' درخواست اور گزارش یہ ہے کہ دہلی میں یہ شہرت نہ ہو کہ ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ شرپسند لوگ اس نیک عمل کو بہانہ بنا کر کوئی ہنگامہ بپا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے بہتر آپ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔"

"مجھے تم سے یہ باتیں سن کر خوشی ہوئی نوجوان!" امام صاحب بولے "تم یقیناً کوئی عام قسم کے جذباتی نوجوان نہیں ہو۔ مطمئن رہو' اس واقعے کی شہرت نہیں ہوگی۔" میں نے اور سیتا نے امام صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر ہم دونوں ہوٹل میں واپس آ گئے جہاں جوگیندر ہمارا منتظر تھا۔

"نیا دھرم مبارک ہو سیتا!" بھائی نے بہن کو مبارک دی۔

"سیتا نہیں کنیز کہو بھیا! اب میرا نام کنیز ہے۔" سیتا نے اپنے بھائی کو ٹوک دیا تھا۔

"ارے پگلی' تو سیتا رہے یا کنیز بن جائے' رہے گی تو بھیا کی بہن ہی!" جوگیندر نے ہنس کر کہا تھا "دیکھ ہم سے دین دھرم کا جھگڑا نہیں چلے گا۔ ہم اور لوگ ہیں۔"

اس پر میں نے جوگیندر کو سینے سے لگا لیا تھا "تم بہت کینے ہو میرے دوست' میری جان۔" میں بولا۔

"اور تم بھی کچھ کم کینے نہیں نکلے طارنوش کہ میری بہن کو مسلمان بنا لیا۔" جوگیندر نے بھی میری محبت اور گرمجوشی کا جواب دیا پھر کہنے لگا "اچھا میں ذرا ریلوے اسٹیشن کا چکر لگا کے آتا ہوں معلوم تو کر لیں نا کہ لاہور کے لیے ٹرین یہاں سے کب روانہ ہوگی!"

اس کے بعد جوگیندر چلا گیا تھا اور اب۔۔۔ اب میں اور سیتا' ہوٹل کے کمرے میں اکیلے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی "داسی کنیز ہی کو تو کہتے ہیں نا!"

"نہیں تم۔۔۔ تم کنیز نہیں ملکہ ہو میری ملکہ!" میں بھی جذباتی ہو گیا اور جذبات کی زبان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

"اگر۔۔۔ اگر میں ملکہ ہوں تو۔۔۔ تو پھر تم میرے بادشاہ ہو۔" اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور ان آنکھوں میں بڑی وسعت تھی۔ وہ اس وقت کسی اور ہی عالم سے گزر رہی تھی۔ ایک ایسا عالم کہ جس کے بعد کوئی عالم نہیں ہوتا۔

میں نے اس کی پیشانی پر جھولتی ہوئی ایک آوارہ لٹ سے کھیلتے ہوئے کہا "ملکہ کے غلام بھی تو ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے لیکن تم۔۔۔ تم تو میرے بادشاہ ہو آقا ہو۔"

پھر کچھ کہنے اور سننے کی منزل بھی گزر گئی۔ سب کچھ کہنا سننا ہی کب ہے! بن کہے بھی تو بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے اور سننے والا تو وہی سنتا ہے جو سننا چاہتا ہے! لمبی جدائی کے بعد ہم دونوں ایک عرصے کے بعد وصل کی راحتوں میں گم تھے۔ ہم اسی وقت چونکے جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"شاید جوگیندر لوٹ آیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور وہ اپنے آپ کو سمیٹنے لگی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول

دیا۔ آنے والا جوگیندر ہی تھا۔ دہلی سے وہ ہماری لاہور روانگی کے لیے ٹرین کا وقت معلوم کر آیا تھا۔



داتا کی نگری لاہور آ کر مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ دہلی اور لاہور مجھے جڑواں شہر لگے تھے۔ یہاں کے رستے' گلیاں اور خوشبو بالکل وہی تھی جو دہلی کی تھی۔ ہر شہر کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سو دہلی اور لاہور کی خوشبو میں مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ عارضی طور پر ہم ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے تھے۔ سیتا' میں اور جوگیندر ہم تینوں ہی طویل سفر کے بعد خاصے تھک گئے تھے۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی جب ہم لاہور پہنچے۔ دن بھر ہم نے آرام کیا تھا اور شام کو ٹہلنے نکلے تھے۔ سیتا اور جوگیندر تو کچھ دیر چہل قدمی کے بعد ہوٹل واپس چلے گئے تھے اور میں داتا دربار کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

سیتا اب مسلمان ہو چکی تھی مگر اسے میں نے کنیز کہہ کر ابھی تک مخاطب نہیں کیا تھا۔ کنیز کی بجائے میں اس کا کوئی اور ایسا نام رکھنا چاہتا تھا جو اس پر سجے جو اس کی شخصیت کے حسن کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔ وہ ایک جذباتی لمحہ تھا جب سیتا نے اپنے لیے یہ نام پسند کیا۔ میں اس کے جذبات کو مجروح کرنا کیسے قبول کر لیتا' سو چپ رہا پھر یہ کہ میں اپنے جذبات سے قطع نظر جس مقصد سے ان دونوں بہن بھائی کو ملتان لے جا رہا تھا وہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوتا کہ انہیں ہندو ہی ظاہر کیا جاتا۔ سیتا کا ذکر تو الگ۔ جوگیندر ہی کون سا ہندو تھا! اگر وہ مخصوص معنوں میں ہندو ہوتا تو اپنی بہن کو مسلمان ہو جانے کی اجازت کیسے دے دیتا۔

جوگیندر اور سیتا دونوں ہی کی سمجھ یہ بات آ گئی تھی کہ فی الحال سیتا کو سیتا ہی کہا جائے۔ مجاہد اوّل کے سامنے بھی میں نے ان دونوں کو ملتان کی مہم میں ساتھ لے جانے کا یہی جواز دیا تھا کہ وہ ہندو ہیں' چاہے نام ہی کے ہندو سہی! ملتان کے انتہاپسند ہندو حلقوں میں بہ حیثیت ہندو وہ دونوں بہن بھائی ہمارے لیے کام کر سکتے تھے۔ یہ منافقت نہیں وقت کی ضرورت تھی لوہے سے ہی تو لوہا کاٹا جاتا ہے۔

لاہور آنے کے بعد ہماری اگلی منزل ملتان تھی۔ بخت خاں اور میرے دونوں ساتھی نیم اور حیدر علی کو لاہور ہی میں رک کر میرا انتظار کرنا تھا۔ دہلی میں ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔ ان تینوں سے رابطے کی صورت داتا دربار تھی اور اس وقت میں وہیں جا رہا تھا۔ بخت خاں نے دہلی میں مجھ سے کہا تھا کہ میں لاہور پہنچ کر روزانہ داتا دربار میں مغرب کی نماز کے بعد حاضری دیا کروں گا۔ تم جب بھی لاہور پہنچو' اس وقت مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ لاہور میں داتا صاحب کے مزار مبارک تک پہنچنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

میرے دل میں خود بھی داتا صاحب کے دربار میں حاضری کی خواہش تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ داتا صاحب ایسے بزرگوں کے قدموں کی برکت سے ہندوستان کی سرزمین پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی کتاب "کشف المحجوب" میں نے فارسی زبان ہی میں پڑھی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں عربی اور فارسی زبانوں کا علم حاصل کر رہا تھا۔ حضرت بابا فرید (داتا صاحب) کے بارے میں میری معلومات کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ حضرت خواجہ غریب نواز (معین الدین چشتی) کے ایما پر ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ پہلے انہوں نے کچھ عرصے مدینۃ الاولیاء یعنی شہر ملتان میں قیام کیا اور پھر اپنے مرشد (خواجہ غریب نواز) کے حکم پر شہر لاہور کو رونق بخشی۔ یہیں ان کی وفات ہوئی۔ داتا صاحب نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

داتا صاحب نے پہلے ملتان اور پھر لاہور میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں انہی دونوں شہروں کی طرف آیا تھا۔ اس دربار میں حاضری کی خواہش کا سبب یہ تھا کہ میں صاحبِ دربار کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ جانتا تھا۔ لاعلمی میں بھی بڑا سکون ہے لیکن علم یعنی جاننا اس سے افضل ہے۔ سو یہی علم مجھے اس دربار کی طرف لے جا رہا تھا جہاں بخت خاں سے میری ملاقات ہونا تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے صدر دروازے ہی کے آس پاس مل جائے گا۔

میں اس وقت وہاں پہنچا جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ درگاہ ہی سے ملحق ایک مسجد تھی۔ میں نے وہاں مغرب کی نماز پڑھی پھر داتا صاحب کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھ کر میں باہر آ گیا۔ وہاں عجب سماں تھا۔ داتا صاحب کا لنگر جاری تھا اور ہر طرف سے "اللہ۔۔۔ اللہ" کی صدائیں آ رہی تھیں۔ لا الہ الا اللہ کی ضرب مجھے اپنے دل پر پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ لا الہ کہنے کے بعد الا اللہ کے ساتھ خصوصاً الا کے پہلے دو حروف یعنی "ال" کے ساتھ ہی آوازیں بلند ہوتی جاتی تھیں۔ حلقہ بنا کر کلمہ طیبہ کا ورد صوفیائے کرام کی تعلیم کا ایک حصہ تھا۔ میں انہی صداؤں کے حصار میں باہر آیا تھا اور مجھ پر ایک کیفیت سی طاری تھی۔ شاید یہ سبب ہوا کوئی اور کہ بخت خاں مجھے پہلی کوشش میں نظر نہیں آ سکا۔ اس

سے قطع نظر وہاں ہجوم بھی خاصا تھا۔ مرادیں پانے والے دھمال ڈال رہے تھے' چمٹے بج رہے تھے' فضا گلابوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی' لنگر جاری تھا اور میری نگاہیں بخت خاں کو تلاش کررہی تھی۔ اس نے یہیں تو مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

صدر دروازے کے آس پاس ہی میں چکراتا پھر رہا تھا جب مجھے وہاں خاصی دیر ہوگئی تو میں اُلجھنے لگا۔ بخت خاں وعدہ خلافی نہیں کرسکتا تھا پھر وہ کیوں نہیں آیا؟ بار بار میرے ذہن میں یہی سوال گردش کررہا تھا اس کے علاوہ مجھے جوگیندر اور سیتا کا خیال بھی آرہا تھا کہ اگر مجھے واپسی میں مزید کچھ دیر ہوگئی تو وہ دونوں میری طرف سے فکرمند ہوجائیں گے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ بخت خاں' نپو اور حیدر علی اسی رات دہلی سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے جس رات ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ دوسرے ہی دن صبح میں نے ترکمان گیٹ کا پھیرا لگا کر یہ دیکھ لیا تھا کہ رات کو ہم چاروں ساتھی جس مکان میں تھے اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بخت خاں یقیناً اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر وہاں سے رات ہی کو جاچکا تھا۔ ورنہ صبح مکان کے دروازے پر مجھے تالا پڑا نظر نہ آتا۔ مجھ سے پہلے بخت خاں نے دہلی چھوڑ دیا تھا تو وہ لاہور کیوں نہیں پہنچ سکا؟ کہیں دہلی سے نکل کر راستے میں تو اس پر کوئی اُفتاد نہیں پڑگئی؟

میرے ذہن میں سوالات گردش کرتے رہے پھر آخرکار میں نے یہ سوچ کر واپسی کا فیصلہ کیا کہ کل دوبارہ اسی وقت یہاں آؤں گا۔ اس کے سوا میرے پاس اور چارہ کار بھی کیا تھا۔ ہجوم سے نکل کر میں اس طرف بڑھا جہاں تانگے سے اُترا تھا۔ وہاں سے میں ہوٹل واپسی کے لیے تانگا لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ عقب سے کسی نے اپنا بھاری ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور جیسے پتھر کا ہوگیا۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

مجھ سے کہا گیا "تمہیں بخت خاں کی تلاش ہے نا! اور ہمیں تمہاری تلاش تھی۔" یہ الفاظ سخت لہجے میں ادا کرنے والے کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ میرے گرد حلقہ بنا چکے تھے۔



✱

اُن کے تیور ایسے تھے جیسے میں اپنی مرضی سے نہ چلا تو مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے چند لمحے سوچ کر ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ مجھے صرف بخت خاں اور اپنے دونوں ساتھیوں کی فکر تھی کہ کہیں وہ ان کے ہتھے نہ چڑھ جائیں!

چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک موٹر کھڑی تھی۔ مجھے اس میں بٹھایا گیا۔ میرے دائیں بائیں دو افراد بیٹھ گئے۔ ایک ڈرائیور کے قریب اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"شور مچانے یا کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" ڈرائیونگ سیٹ سے ایک آواز اُبھری اور میں چونک اُٹھا۔ یہ آواز نسوانی تھی اور لہجہ غیر ملکی تھا۔ "اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو!" ڈرائیونگ سیٹ سے حکم دیا گیا۔

"یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے' اس کی ضرورت نہیں۔" میں پہلی بار بولا۔

"خاموش بیٹھو!" نسوانی آواز سُنائی دی۔ لہجہ تحکمانہ سا تھا۔

"ٹھیک ہے" میں نے طویل سانس لیا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اسی کے ساتھ موٹر چل پڑی۔

سفر کتنی دیر جاری رہا' مجھے اس کا کوئی خاص اندازہ نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ میرا بازو پکڑ کر کار سے اُتار لیا گیا۔ میری آنکھوں سے ابھی تک پٹی نہیں کھولی گئی تھی۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے یا اگر تھے تو خاموش تھے۔ ایک شخص میرا بازو تھامے چلتا رہا' پھر شاید اسی نے کچھ دور چل کر مجھے بتایا کہ آگے سیڑھیاں ہیں۔ میں سنبھل کر سیڑھیوں پر چڑھا۔ وہ چند ہی سیڑھیاں ہوں گی "اب سیدھے چلتے رہو! آگے فرش ہموار ہے۔" مجھ سے کہا گیا۔

وہ شاید کوئی کمرا تھا جس کا دروازہ کھولا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں ایک کرسی پر بٹھایا اور پھر میں نے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی۔

"اب تم چاہو تو اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول سکتے ہو۔" آشنا نسوانی آواز اُبھری۔

میں نے پٹی کھولنے میں دیر نہیں کی۔ میرے سامنے ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہ ایک لمبی سی میز تھی جس پر ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ الیکٹرک لیمپ کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس لیمپ کے سوا وہاں کوئی اور بلب روشن نہیں تھا اور لیمپ کی روشنی کا دائرہ بھی محدود تھا۔ مجھے میز کے

ایک سرے پر بٹھایا گیا تھا' دوسرے سرے پر میرے اندازے کے مطابق وہی بیٹھی تھی جو موٹر چلا کر مجھے یہاں تک لائی تھی۔ اس کا چہرا مجھے نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ میز کے دائیں بائیں کرسیوں پر دو دو افراد اور بیٹھے تھے۔ ان سبھی کے چہرے مجھے واضح نظر نہیں آرہے تھے۔

"بخت خاں اور تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" نسوانی آواز نے سوال کیا۔

"کون بخت خاں؟ میں تو اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" میں نے صاف انکار کردیا۔

"پھر تم کس کی تلاش میں داتا دربار گئے تھے؟"

"میں تو وہاں فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ مجھے تو کسی کی تلاش نہیں تھی۔"

"جھوٹ مت بولو طارزوش!" نسوانی آواز کی نرمی غائب ہوگئی "ہمیں سب کچھ معلوم ہے کہ تم دہلی سے یہاں کیوں آئے ہو!"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے اس لیے سیتا اور جوگیندر کا خیال آیا۔ اگر وہ لوگ واقعی سب کچھ جانتے تھے تو سیتا اور جوگیندر بھی ان کی نظر میں آچکے ہوں گے۔ بخت خاں مجھے داتا دربار میں کیوں نہیں ملا تھا' میں اب سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ سے بخت خاں اور میرے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے' اس کا مطلب یہی تھا کہ بخت خاں ان کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ یقیناً اسے خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ یہ سوچ کر میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا مگر سیتا اور جوگیندر کی طرف سے مجھے اب بھی فکر تھی۔

"چپ کیوں ہو! جواب دو کہ تم داتا دربار کیوں گئے تھے؟" سوال پھر کیا گیا۔

"میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔" میں سنبھل کر بولا۔ اب میں نے بڑی حد تک اپنے حواس پر قابو پالیا تھا۔

"میرا خیال ہے مس کیتھی' یہ اس طرح کچھ نہیں بتائے گا۔" ایک بھاری آواز اُبھری۔ یہ شخص میز کی دائیں جانب بیٹھا تھا "ہمیں اس کی زبان کھلوانے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔" اس کی آواز میں دھمکی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" نسوانی آواز نے اتفاق کیا۔ اسی کو کیتھی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ کیتھی نے میز کی بائیں جانب بیٹھے ہوئے دونوں افراد کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی کرسیوں سے اٹھے اور پھر میری کرسی کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ اسی کے ساتھ بھاری آواز والے نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔ میں نے اسے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھا۔ جیب سے اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک اُسترا تھا میرے قریب آکر اس نے اُسترا کھول لیا۔ اُسترے کا پھل روشنی میں چمک رہا تھا۔ کرسی کے پیچھے موجود افراد نے میرے دونوں بازو جکڑ لیے۔

"تم لوگ کیا کررہے ہو؟" حیرت اور غصے کے سبب میں تقریباً چیخ اُٹھا۔ مجھے ان سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تشدد پر اُتر آئیں گے۔

بھاری آواز والے نے میری آنکھوں کے سامنے اُسترے کا پھل گھمایا' پھر بولا "اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس اُسترے سے تمہارے جسم کی بوٹیاں نہ اُتاروں تو مس کیتھی جو کچھ معلوم کرنا چاہتی ہیں انہیں بتادو!" اس کی آواز سے درندگی جھلک رہی تھی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم اس کا مشورہ مان ہی لو تو بہتر ہے طارزوش!" کیتھی نے مجھے مخاطب کیا۔

"اگر تم لوگ مجھے جانتے ہو تو پھر مجھ پر تشدد نہیں کرسکتے۔ ابت بھولو کہ تمہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"کس کے سامنے؟" کیتھی نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو مس کیتھی! تم خود اچھی طرح جانتی ہو کہ کس کو جواب دہ ہو!" میں نڈر ہوکر بولا "وہ مونچھوں والا کہاں گیا جو مجھے داتا دربار میں ملا تھا؟ وہی جس نے مجھے تمہاری موٹر میں بٹھایا تھا!" کیتھی سے میں اسی شخص کے بارے میں پوچھ رہا تھا جس نے داتا دربار میں میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اور جس کا چہرہ میرے لیے آشنا تھا۔ اسے میں نے دہلی میں کئی بار اپنے ڈیڈی کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ڈیڈی کا کوئی ماتحت تھا۔ وہ ڈیڈی کے سامنے مؤدب رہتا تھا اور انہیں "سر" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ جس روز میں دہلی سے روانہ ہونے والا تھا' اس سے ایک دن پہلے بھی رات کو وہ ڈیڈی سے ملنے آیا تھا۔ میں جب میٹرک میں تھا تو بھی وہ ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ مجھے اس پر شبہ تھا کہ وہی شخص ڈیڈی کو میری سرگرمیوں سے آگاہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی ہی تھی اور مولانا محمد علی جوہر کے جلسوں میں شرکت کرنے لگا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ڈیڈی کا تعلق کسی اعلیٰ سرکاری عہدے سے ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب کلکتے میں مولانا ابوالکلام آزاد پر مقدمہ چلا تھا اور

ڈیڈی کھلتے گئے تھے۔ اس سے پہلے ڈیڈی کی زبان سے غصے میں ایک اور بات بھی نکل گئی تھی کہ مولانا جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلنے والا ہے اور پھر یہ بات درست ثابت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی معمولی سرکاری افسر کے علم میں نہیں ہوسکتی تھی کہ مولانا جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔ یہ بات اسی طرف اشارہ کرتی تھی کہ ڈیڈی حکومت کے کسی اہم عہدے پر فائز ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ جو مجھے تشدد کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان کا تعلق میرے ڈیڈی کے محکمے ہی سے تھا۔ اس خیال کا سبب وہی مونچھوں والا تھا جو نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا اور میں جس کے بارے میں کیتھی سے پوچھ رہا تھا۔

"مونچھوں والا کون؟ ہمارے ساتھ تو کوئی مونچھوں والا نہیں تھا۔" کیتھی صاف مکر گئی۔ پھر اس نے وہاں موجود دوسرے افراد کو مخاطب کیا "تمہارے ساتھ کیا کوئی مونچھوں والا بھی تھا؟" کیتھی کے سوال کا جواب ان لوگوں نے حسب توقع ہی دیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی ہی کا اظہار کیا تھا۔

"اس طرح تم لوگ شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوجاؤ گے!" میری آواز میں سختی آگئی۔

"تو کس غلط فہمی میں مبتلا ہے!" بھاری آواز والے نے میز پر اُسترا رکھ کر میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور ایک جھٹکے سے میرا سر اوپر اُٹھایا "اگر تو نے زبان نہ کھولی تو مار مار کے تیری کھال میں بھُس بھردوں گا میں!" اسی کے ساتھ اس نے میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔

میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ میں نے اپنے خون کا ذائقہ اپنی زبان پر محسوس کیا۔ بھاری آواز والے نے میرے سر کے بال چھوڑ کر دوبارہ میز سے اُسترا اٹھالیا۔

"ٹھہرو!" کیتھی بول اُٹھی "اسے ایک موقع دے دو!"

میں نے غصے میں آکر کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر نہ اُٹھ سکا۔ دو توی الجثہ افراد نے مجھے بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ میرے بازو انہوں نے اس طرح موڑ رکھے تھے کہ اُٹھنے کی کوشش مجھے مہنگی پڑی۔ میں تھوڑا سا اُٹھتے ہی پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اُٹھنے سے میرے بازوؤں پر شدید دباؤ پڑا تھا۔

"فضول کوشش مت کرو طارنوش!" کیتھی مجھ سے مخاطب ہوئی "تم سے جو کچھ پوچھا جارہا ہے، اگر تم نے بتادیا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

"مگر تم نے مجھے پکڑا ہی کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ تم اور تمہارے ساتھی، حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔" کیتھی نے جواب دیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں!"

"کیا ان دونوں سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں جو تمہارے ہی ساتھ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں؟" کیتھی نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس سوال کی روشنی میں میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہی سیتا اور جوگیندر بھی ان کی نظر میں آچکے ہیں۔ بخت خان اور اپنے دونوں تبتی ساتھیوں سے تو میں لاعلمی کا اظہار کرسکتا تھا مگر سیتا اور جوگیندر کا معاملہ مختلف تھا۔ میں ان کے بارے میں کہہ سکتا تھا کہ وہ میرے دوست ہیں۔ میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر فوری طور پر میں نے اس کا اقرار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

"تم لوگ یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو کہ ان دونوں سے میرا کوئی تعلق ہے یا نہیں!" میری آواز میں غصہ تھا۔

"ہم کون ہوتے ہیں! کیا تمہیں پھر بتانا پڑے گا!" بھاری آواز والے نے میری ٹھوڑی اوپر اُٹھاتے ہوئے درشت انداز میں کہا۔

"حد سے تجاوز نہ کرو ورنہ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا! تمہیں یقیناً اس کی اجازت نہیں دی گئی ہوگی کہ مجھ پر تشدد کرو!"

"صرف تشدد!" بھاری آواز والا کریہہ انداز میں ہنسا "ہمیں تو اس کی اجازت بھی ہے کہ حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث افراد کو گولی ماردیں۔ سمجھا تو!" اس نے یہ کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ میرے دائیں کان کی لو چٹکی میں پکڑی اور پھر تیز اُسترا حرکت میں آگیا۔

میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے میرے کان کی لو کاٹ دی تھی۔ اس نے اتنی تیزی دکھائی تھی کہ میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

"میں اسی طرح تیرے جسم کی کھال اس اُسترے سے اُتار سکتا ہوں! تیرے جسم کو چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں تبدیل کرسکتا ہوں! اب تجھے یقین آیا؟" اس کی آواز میں بلا کی وحشت و درندگی تھی۔

میرے دائیں کان کے نچلے حصے میں آگ سی بھرگئی اور خون کے قطرے شانے پر ٹپکنے لگے۔ میں نے سوچا شاید مجھے واقعی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ میرے ڈیڈی کے ایما پر نہیں ہوسکتا۔ وہ اتنے ظالم کیسے ہوسکتے ہیں کہ جسے انہوں نے

اپنی اولاد کی طرح پالا ہے، اس کا اپنے ماتحتوں کے ہاتھوں یہ حشر کرائیں! یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ غیر معمولی حالات کے باوجود میں اب تک اس لیے مطمئن تھا کہ وہ پوچھ گچھ کے دوران میں حد سے تجاوز نہیں کریں گے مگر اب حد گزر چکی تھی۔ بھاری آواز والے نے مجھے جو دھمکی دی تھی اس پر عمل شروع کردیا تھا۔

"مِس کیتھی کے سوالوں کا جواب دینے پر آمادہ ہے یا میں تیرا پورا کان ہی اُڑا دوں؟" اس نے تیز اور چمکدار پھل والا اُسترا آگے بڑھایا۔

اسی لمحے میرے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی اور اس کی شدت سے میرا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ میرے وجود میں پوشیدہ پُراسرار قوتیں بیدار ہونے لگیں، مجھ پر جناتی صفات غالب آتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی کان کی تکلیف غائب ہوگئی۔ وقتی طور پر جو خوف مجھے محسوس ہوا تھا وہ بھی قطعی ختم ہوگیا۔

میں نے کسی تکلیف یا دباؤ کے بغیر اپنے بازوؤں کو حرکت دی۔ دوسرے ہی لمحے میرے بازو سخت گرفت سے آزاد ہوچکے تھے۔ میں اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ پہلا وار میں نے بھاری آواز والے کی کلائی پر کیا۔ اس کی کلائی میری آہنی گرفت میں آگئی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور اُسترا میز پر گرا۔ بھاری آواز والے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے اُسترا اٹھالیا۔

"اسے پکڑو۔ پکڑو اسے!" کیتھی تقریباً چیخ اُٹھی۔

میں تیزی سے مڑا۔ وہ دونوں جو میرے بازو جکڑے ہوئے تھے، فرش سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے بھاری آواز والے کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اٹھ کر سیدھے کھڑے ہوتے، میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ان دونوں پر جارہا۔ میں نے اپنے دونوں بازوؤں میں ان کی گردنیں دبالیں۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ پھر ان کے جسم ڈھیلے ہونے میں دیر نہیں لگی۔

"نہیں! گولی نہ چلانا!" میں نے کیتھی کی آواز سنی۔

میں پلٹا تو اس شخص کو پستول ہاتھ میں لیے دیکھا جو بھاری آواز والے کے برابر بیٹھا تھا۔ کیتھی اس کے قریب ہی میز پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی تھی۔

"اپنے دونوں ہاتھ اُٹھالو ورنہ مس کیتھی کے حکم کے باوجود گولی ماردوں گا!" پستول والے نے مجھے حکم دیا۔ کیتھی ان سب کی انچارج معلوم ہوتی تھی۔

ہوا کے تند و تیز جھونکے کی طرح دوسرے ہی لمحے میں پستول والے تک پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گولی چلاتا، میں نے اس کا پستول چھین لیا۔ اسی کے ساتھ میرے پیر کی ٹھوکر اس کی پنڈلی پر پڑی۔ وہ جھکا تو میری کلائی کی ضرب اپنی ٹھوڑی پر کھاکے چیختا ہوا زمین پر گرگیا۔

میرے ایک ہاتھ میں اُسترا اور دوسرے میں پستول تھا۔ پستول کو میں نے پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کیتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا حسین و خوب صورت چہرہ حیرت کی زیادتی کے سبب وحشت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب تھا۔

"مِس کیتھی! اس اُسترے سے پہلے تمہاری ناک کاٹوں یا اس کتے کے نرخرے پر اُسترے کی تیز دھار آزماؤں جو اپنی کلائی ٹوٹنے کے بعد ادھر بے ہوش پڑا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اُسترے کو میں اس کے چہرے کے گرد گردش دینے لگا۔

"نن۔۔۔ نہیں!" کیتھی اپنے دونوں ہاتھ اُٹھاکر چیخی۔

اچانک مجھے اسنی کی پُراسرار مخصوص خوشبو محسوس ہوئی اور پھر میں نے اس کی سرگوشی سنی "طارنوش! خطرہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ!" اسی وقت مجھے اپنے دائیں کان کے نچلے حصے میں ٹھنڈک سی لگی۔ اسنی کی سرگوشی پھر ابھری "میں نے تمہارے کان کی کٹی ہوئی لو جوڑ دی ہے جاؤ! اس عمارت سے جلد از جلد نکل جاؤ!" پھر اسنی کی خوشبو معدوم ہوگئی۔

اپنے ہاتھ سے اُسترا ایک طرف پھینک کر غیر ارادی طور پر میں نے دائیں کان کی لو کو چھو کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے کان کی لو کاٹی ہی نہیں گئی تھی۔ اسنی نے غلط نہیں کہا تھا۔ جسم کا کوئی کٹا ہوا حصہ دوبارہ اسی جگہ جوڑا جاسکتا ہے۔ یہ امر میرے لیے حیرت ناک ہی تھا۔

لمحہ حیرت سے نکل کر مجھے یاد آیا کہ اسنی نے میری طرف بڑھنے والے کسی خطرے کی نشان دہی بھی کی ہے اور وہاں سے فرار ہوجانے کی تاکید بھی! خطرے کی نوعیت سے اس نے مجھے آگاہ نہیں کیا تھا۔

کیتھی اب بھی وحشت زدہ سی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کمرے میں کیتھی کے سوا کوئی ہوش میں نہیں تھا۔ حواس باختہ ہونے کے باوجود کیتھی بھی میرے فرار کی راہ میں مزاحم ہوسکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اس کی گردن پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ حیران کن تیزی کے ساتھ اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی اسی کے ساتھ اس نے میز پر ایک طرف پڑا ہوا اپنا وینٹی بیگ بھی اٹھالیا تھا۔

اسی وقت میں نے قریب ہی کہیں گولی چلنے کی آواز

سُنی۔ پھر پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ لمحے بھر کو میرا دھیان بٹ گیا۔ میں نے کیتھی کو وینٹی بیگ کھولتے دیکھا۔ جب تک میں لپک کر اس کے قریب پہنچا' وہ اپنے وینٹی بیگ سے چھوٹا سا خطرناک پستول نکال چکی تھی۔

"کتیا کہیں کی!" میں نے اسے دبوچ لیا۔ یوں جیسے کوئی عقاب اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے۔

اس کے منہ سے ذرا سی چیخ نکلی اور پھر وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ جھٹکے کے سبب شاید اس کے جسم پر میری گرفت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی تھی اور وہ برداشت نہ کر سکی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے میرے قدموں کے پاس گر گیا تھا۔

یہ سوچ کر کہ وہ بہرحال ایک عورت ہے' میں نے آہستگی کے ساتھ فرش پر اسے ڈال دیا۔ دھماکے اب بھی سنائی دے رہے تھے۔

میں دروازے کی طرف جھپٹا۔ دروازہ مجھے کھلا ہوا نہیں ملا۔ اسے باہر سے کسی نے بند کر دیا تھا۔ میں نے پلٹ کر تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ دائیں جانب مجھے ایک دروازہ اور نظر آیا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا اس دروازے تک پہنچا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ دور سے مجھے دروازے میں پڑا ہوا چھوٹا سا تالا نظر نہیں آسکا تھا۔ اس کی وجہ کمرے میں ناکافی روشنی تھی۔ وہاں میز پر صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی روشنی محدود تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس تالے کی چابی انہی میں سے کسی کے پاس ہو سکتی تھی جو بے ہوش پڑے تھے۔ مگر میں نے چابی تلاش کرنے میں وقت ضائع کرنا بے سود سمجھا۔ میں اب ایک اور فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ یا تو میں بیرونی دروازہ توڑ دیتا یا اندرونی دروازے کا تالا توڑ کر دروازہ کھول لیتا۔ کمرے میں مجھے کوئی کھڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ روشن دان خاصی بلندی پر تھے۔ دروازے توڑنے کی نسبت مجھے اندرونی دروازے کا تالا توڑنا آسان معلوم ہوا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ اندرونی دروازہ ہی ہو سکتا تھا۔ بہ طور احتیاط اسے مقفل کر دیا گیا ہو گا۔ بیرونی دروازے کو بھی باہر سے بند کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مجھے وہاں پہنچا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا گیا ہو گا کیتھی تو میرے ساتھ ہی دا تا دربار سے آئی تھی مگر اس کمرے میں موجود دوسرے چار افراد ان میں سے نہیں تھے جو مجھے دا تا دربار میں ملے تھے یا کار میں ساتھ آئے تھے۔ وہ چاروں پہلے ہی سے اس کمرے میں موجود رہے ہوں گے یا پھر اس وقت یہاں آئے ہوں گے جب مجھے کار سے اُتار کر کمرے کی طرف لایا جا رہا تھا۔

میں نے محض نتائج تک پہنچنے اور ایک فیصلہ کرنے میں چند ہی لمحے صرف کیے تھے۔ مجھے اپنی قوت کا اندازہ تھا۔ میں نے تالے کے کڑے میں انگلی پھنسا کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ تالا میرے ہاتھ میں آگیا۔ اسے پھینک کر میں نے کنڈی کھول دی۔ میں نے جیسے ہی دروازے کے دونوں پٹ اندر کی طرف دھکیلے' عقب سے بیرونی دروازہ کھولے جانے کی آواز آئی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ اسنی نے جس خطرے کی پیش گوئی کی تھی شاید وہ میرے بہت قریب آچکا تھا۔ فرار ہونے میں غالباً میں نے دیر کر دی تھی۔ اندرونی دروازہ کھلتے ہی مجھے تاریکی نظر آئی تھی۔ ادھر گھپ اندھیرا تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کمرے کا حتمی دروازہ بہرحال نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہاں تاریکی نظر نہ آتی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ دروازہ کسی راہداری میں کھلتا ہو گا۔ یا تو وہ اس کمرے سے ملحق کوئی اسٹور وغیرہ تھا یا پھر کوئی اور کمرا۔ نہ اتنا وقت تھا نہ مہلت کہ میں اس کی تصدیق کر سکتا۔ ابھی میں یہ سوچ نہیں سکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ دروازہ کھول کر تین مسلح افراد اندر آگئے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"اگر تم نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا!" پستول والے نے مجھے مخاطب کیا۔ دروازہ کھلتے ہی شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

میں بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ایک پستول اور دو بندوقوں کی نالیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ بجلی رو سی اب بھی میرے سارے جسم میں گردش کر رہی تھی' بجلیاں سی اب تک میرے رگ و پے میں کوند رہی تھیں۔ شدید ترین خطرے کے باوجود میں اپنی جگہ سے حرکت کرنے ہی والا تھا کہ میں نے ان تینوں ہی کو یکے بعد دیگرے لہرا کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا' اسی کے ساتھ اسنی کی خوشبو مجھے محسوس ہوئی اور اس کی تیز سرگوشی سنائی دی "طارنوش! تیزی کے ساتھ یہاں سے بھاگ جاؤ! تمہاری تیز رفتاری کی وجہ سے ان کی نظریں تم پر نہیں ٹک سکیں گی جاؤ! بھاگو' تیز رفتاری سے بھاگو!"

فائرنگ کی آوازیں اب رُک گئی تھیں۔ یہ فائرنگ بھی میرے لیے ایک معما ہی تھی مگر یہ معمے حل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اسنی کی تاکید کے بعد ایک لمحے کو بھی میں مزید وہاں نہیں رُکا۔ کسی طوفانی جھکڑ کی طرح میں کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے نکل کر ایک راہداری میں پہنچ گیا۔ میں نے بس ایک نظر دو مسلح محافظوں کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ ان کی بندوقیں شانوں پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر اسی تیز رفتاری کے ساتھ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر میں ان کے قریب سے گزر گیا تھا۔ راہداری کے اختتام پر مجھے موڑ سیڑھیوں کے نیچے ایک طرف کھڑی نظر آئی تھی۔ جس میں بیٹھ کر میں دا تا دربار سے وہاں پہنچا تھا۔

جب میں ان دونوں مسلح محافظوں کے قریب سے گزرا تھا تو ان کے منہ سے حیرت زدہ سی آوازیں نکلی تھیں مگر میری تیز رفتاری میں فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ہوا کی تیز سنسناہٹ ہی کو اپنے برابر سے گزرتے محسوس کیا ہو گا۔ اس سے پہلے مجھے اپنی اس قدر تیز رفتاری کا علم نہیں تھا کہ مجھ پر نظریں نہ ٹھہر سکیں۔ اس کا تجربہ مجھے آج پہلی بار ہوا تھا۔ زن سے میں نے راہداری عبور کرلی۔ زقند بھر کے میں سیڑھیاں پار کر گیا۔ اب میں اس عمارت کے احاطے میں تھا۔ سامنے ہی مجھے کھلا ہوا پھاٹک نظر آرہا تھا اور پھاٹک کے دونوں طرف بھی دو مسلح محافظ نظر آرہے تھے۔ پھاٹک کے باہر پختہ سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ پھاٹک کے قریب کھڑے ہوئے ان دونوں مسلح محافظوں کی بھی پروا کیے بغیر میں اپنی تیز رفتاری برقرار رکھے ہوئے آگے بڑھا' مگر پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے کسی نے جیسے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا اور میرے قدم رک گئے۔ میری آنکھوں نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔

کئی مسلح محافظ میرے ننگلی ساتھی نیچو کو نرغے میں لیے پھاٹک سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ نیچو ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھا۔

وہ بس لمحے بھر کا روح فرسا نظارہ تھا۔ اسنی کی تاکید کو پس پشت ڈال کر میں ان محافظوں پر پل پڑا۔ مسلح محافظ اچانک غالباً سمجھ ہی نہ سکے کہ ان پر کیا افتاد ٹوٹ پڑی ہے! انہیں تو اسلحہ کے استعمال کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔ انہوں نے تو اپنے درمیان ایک غیر معمولی وجود کو حرکت کرتے دیکھا ہو گا۔ اتنی تیز حرکت جو ان کے وہم و گمان میں نہیں آسکتی تھی۔ کسی کے لات پڑی' کسی کے گھونسا' کسی کے پیچھے پر کہنی پڑی' کسی کو میرے سر کی ٹکر نے لہرا کر گرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے ایک محافظ سے اس کی بندوق چھین لی اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر گھمانا شروع کر دیا جو بھی اس کی زد میں آتا گیا' چیخ کر ڈھیر ہوتا گیا۔ نیچو بھی ہتھکڑیاں پہنے کے باوجود اس معرکے میں شامل ہو گیا۔

یہ ہنگامہ پھاٹک کے قریب ہی بپا ہوا تھا اس لیے وہ دونوں محافظ بھی لپیٹ میں آگئے جو پھاٹک کے پاس کھڑے تھے۔

چیخ پکار کی آوازیں یہ مشکل دو منٹ سنائی دی ہوں گی کیوں کہ اس کے بعد کم از کم احاطے میں کوئی چیخنے چلانے والا نہیں رہا تھا۔ سارے ہی محافظ بے ہوش ہو چکے تھے۔ عمارت کی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سُنائی دیں تو میں چونک اُٹھا۔

پھر نیچو "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا اور میں نے زبردستی اسے اپنی پشت پر لاد کر دوڑنا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا اور اس کی واحد ترکیب یہی تھی کہ میں نیچو کو اپنی کمر پر لاد لیتا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ میری تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کدھر جانا چاہیے تھا اور یہ کہ میں کس طرف جا رہا تھا۔ فی الحال تو میری پہلی ترجیح یہی تھی کہ وہاں سے دور نکل جاؤں۔ میں نے اس سلسلے میں نیچو کی خوف زدہ آوازوں کی پروا بھی نہیں کی تھی اور نہ یہ سوچا تھا کہ اس طرح نیچو پر میری ایک پُراسرار قوت کا راز کھل جائے گا۔ وہ لمحات ان باتوں کو سوچنے کے نہیں تھے۔ ذرا سی دیر میں خبر نہیں میں کہاں سے کہاں جا نکلا! مگر مجھے اتنا اندازہ بہرحال تھا کہ میں اس علاقے سے کافی دور نکل آیا ہوں۔

میری رفتار آہستہ ہوتی گئی اور پھر میں ایک نیم تاریک سے باغ میں گھس گیا جو قریب ہی سڑک کے کنارے نظر آرہا تھا۔ "نیچو! نیچو!" میں نے اپنے ساتھی کو آہستہ سے پکارا۔

"ہوں۔۔۔ ہوں!" مجھے اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے کوئی گہری نیند سے بیدار ہوتے وقت بولتا ہے۔

میں نے آہستگی کے ساتھ اسے اپنی کمر سے اُتارا۔ وہ بے سدھ سا ہو رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے کمر سے اُتارا وہ زمین پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت کسی ایسے شرابی کی سی تھی جو اپنے ظرف سے زیادہ پی گیا ہو۔

اسی وقت میرا دھیان ہتھکڑیوں کی طرف گیا۔ میرے جسم کی غیر معمولی قوت و طاقت ابھی تک برقرار تھی۔ میں نے باری باری دونوں ہتھکڑیاں توڑ دیں عام حالات میں وہ آہنی ہتھکڑیاں توڑنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں نے ان ہتھکڑیوں اور ان سے منسلک لوہے کی زنجیر کو قریب ہی مٹی میں دبا دیا۔ پھر میں دوبارہ نیچو کی طرف متوجہ ہوا۔ "نیچو!۔۔۔ نیچو۔۔۔ اُٹھو!" میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔

"ہاں۔ ہوں!۔۔۔ کیا۔۔۔ کک۔۔۔ کیا بات ہے؟" وہ ایک

دم اس طرح اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے سوتے سے اچانک اُٹھا ہو "ہم۔ ہم کہاں ہیں؟"

"ہوش میں آ گو یار! تم کہاں پہنچے ہوئے ہو؟" میں دھیرے سے ہنس کر بولا "کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے!"

"شا۔ شاہین! ہم۔ ہم خطرے سے نکل آئے نا؟" اسے گزرا ہوا واقعہ یقیناً یاد آ گیا تھا مگر۔ "مگر مجھے۔ مجھے کیا ہو گیا تھا!" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے جیسے ہی مجھے کمر پر لاد کر دوڑنا شروع کیا، میں کوشش کے باوجود اپنے ذہن پر غنودگی طاری ہونے سے نہ روک سکا۔ ابھی تم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا ہے تو میں اُٹھا ہوں۔ حیرت ہے کہ مجھے کیسے نیند آ گئی! وہ بھی ایسے عالم میں کہ ہم دونوں ہی شدید خطرے میں تھے۔" نیپو حیرت سے بتانے لگا۔

پھر نیپو نے شاید کچھ اور بھی کہا تھا مگر میں نہ سُن سکا۔ میں اسنی کی مخصوص خوشبو محسوس کر کے اس کی سرگوشی سننے لگا تھا "تمہارے ساتھی کے ذہن پر میں نے اس لیے غنودگی طاری کردی تھی کہ تمہاری پُراسرار قوتوں کا راز اس پر نہ کھل سکے۔"

اس حالت میں اگر یہ گر جاتا تو؟ میں نے یہ سوچا ضرور مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔

"میں اسے گرنے دیتی تو یہ گرتا نا!"

شکریہ، اسنی! ویسے میرا دھیان بھی تمہاری ہی طرف گیا تھا کہ تم ہی نے اسے سُلا دیا ہوگا۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا، اچانک میرے جسم کو تیز جھٹکا لگا اور پھر مجھ پر اتنی شدید نقاہت طاری ہوئی کہ میں بیٹھے بیٹھے ہی زمین پر لڑھک گیا۔

"کیا ہوا؟۔ کیا ہو گیا تمہیں شاہین؟" نیپو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ مجھے میرے تنظیمی نام ہی سے مخاطب کر رہا تھا کیوں کہ اسے میرا یہی نام معلوم تھا۔

مجھ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ کوشش کے باوجود اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"بولو شاہین، بولو!۔ بتاؤ نا کیا بات ہے؟ تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟" وہ مجھے جھنجوڑے ڈال رہا تھا اور ایسا مجھ سے محبت ہی کے سبب تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میری حالت اعتدال پر آ گئی۔ اس میں نصف منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ "یار! تم تو بہت ہی جی چھوڑ ہو۔" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے ہنس کر نیپو سے کہا "کچھ دیر لیٹ کر سستانے بھی نہیں دیتے! حالانکہ تمہیں اتنی دور سے کمر پر لاد کر یہاں تک لایا ہوں، تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بندہ تھک گیا ہوگا، گھڑی بھر کو لیٹ جانے دو۔ جھنجوڑ ڈالا بس!"

"تو منہ سے تو کچھ بولتے نا! میں نے تو تمہیں جھٹکا سا کھا کر ایک دم لیٹتے دیکھا تھا۔ میں سمجھا، خدانخواستہ تمہاری طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو، معاف کرنا۔"

"خیر اس بات کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھ گئے تھے؟ اور بخت خاں کہاں ہے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بخت خاں، حیدر علی اور ہمارے تین مقامی ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور میں۔ میں دانستہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی وجہ سے پکڑا گیا۔ صورت حال ایسی ہی تھی کہ اگر میں انہیں اُلجھا نہ لیتا تو۔ تو شاید وہ ہم سبھی کو گھیر لیتے اور کوئی بھی بچ کر نہ نکل پاتا۔ مجھے علم تھا کہ میں تھا زیادہ دیر ان کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا اور وہ مجھے گرفتار کرلیں گے۔ میں نے محض اس لیے انہیں اُلجھا لیا تھا کہ بخت خاں اور میرے دوسرے ساتھیوں کو فرار ہونے کی مہلت مل جائے۔" اپنے تنظیمی ساتھیوں کے لیے نیپو نے واقعی زبردست قربانی دی تھی۔ خود موت کے منہ میں جانا کھیل نہیں ہوتا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق بخت خاں اور دوسرے ساتھی فرار ہو کر کہاں گئے ہوں گے؟" میں نے سوال کیا "کیا یہاں بھی دہلی کی طرح بہ طور احتیاط دوسرا ٹھکانا؟"

"تم شاید کچھ غلط سمجھ رہے ہو شاہین!" نیپو میری بات کاٹ کر بولا "بخت خاں، ساتھیوں کو لے کر لوہاری گیٹ ہی گیا ہوگا۔ ہم وہیں ٹھہرے ہیں۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ پولیس نے ہمارے ٹھکانے پر چھاپا مارا ہوگا۔"

"تو پھر؟" نیپو کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی تجسس کے زیر اثر میں بول اُٹھا۔

"پولیس نے ہمارے ٹھکانے پر چھاپا نہیں مارا تھا بلکہ ہم نے خود سی آئی اے سینٹر پر چھاپا مارا تھا۔"

"مگر کس لیے؟" میں نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

"تمہیں رہا کرانے کے لیے۔" نیپو نے جواب دیا۔

پھر وہ معاملہ حل ہو گیا کہ جب میں سی آئی اے سینٹر کی عمارت کے اندر ایک کمرے میں تھا تو اچانک فائرنگ کی آوازیں کیوں سنائی دینے لگی تھیں! نیپو نے مجھ سے جو روداد بیان کی وہ مختصراً یہ تھی۔ ہوا یہ تھا کہ روزانہ کی طرح مغرب سے کچھ پہلے بخت خاں، لوہاری گیٹ سے داتا دربار کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ آج بھی اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ وقت مقررہ پر داتا دربار پہنچ جائے تاکہ میں لاہور آ گیا ہوں تو مجھے داتا دربار سے مایوس نہ لوٹنا پڑے۔ وہاں اس نے مونچھوں والے کو دیکھا جسے وہ پہچانتا تھا۔ بخت خاں کو علم تھا کہ مونچھوں والے کا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے! وہ اسی لیے مجھ سے نہیں ملا۔ بخت خاں اس مونچھوں والے کا نام بھی جانتا تھا۔ مونچھوں والے کا نام حسن علی تھا۔ حسن علی کے ساتھ اس کے محکمے کے دوسرے افراد بھی تھے۔ جو میری نگرانی کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بخت خاں میرے قریب نہیں آیا اور ہجوم سے نکل گیا۔ اگر وہ مجھ سے ملتا تو وہ بھی نظر میں آ جاتا۔ پھر جب مجھے وہاں سے کار میں بٹھا کر لے جایا گیا تو بخت خاں وہاں سے لوہاری گیٹ پہنچ گیا۔ مقامی تنظیمی ساتھیوں سے اسے سی آئی اے سینٹر کے بارے میں معلوم ہوا کہ کہاں واقع ہے! بخت خاں کو یقین تھا کہ مجھے وہیں لے جایا گیا ہوگا۔ اس نے مجھے ہر قیمت پر رہا کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے بخت خاں نے مقامی ساتھیوں کے مشورے سے سی آئی اے سینٹر پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لاہور میں سی آئی اے سینٹر کے محل وقوع سے کیوں کہ بخت خاں بذات خود واقف نہیں تھا اس لیے اسے مقامی ساتھیوں پر انحصار کرنا پڑا۔ اس کے منصوبے میں پولیس سے ٹکراؤ شامل نہیں تھا لیکن اس نے یہ امکان بھی نظرانداز نہیں کیا تھا پھر وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سی آئی اے سینٹر کی عمارت میں داخل نہیں ہو سکا۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ایک مقامی ساتھی کو گولی لگنے سے یہ صورت حال پیش آئی۔ نماز بخشوانے گئے اور روزے گلے پڑ گئے والی مثل صادق آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے راہ فرار کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اس مسلح مقابلے میں بخت خاں کے ساتھ نیپو اور حیدر علی کے علاوہ صرف تین مقامی ساتھی تھے۔ جن میں سے ایک شدید زخمی ہو چکا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ پولیس کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہونے لگا جب وہ سی آئی اے سینٹر کی عمارت سے باہر آ چکے تھے۔ اس موقع پر نیپو کی قربانی کام آئی۔ بخت خاں، زخمی مقامی ساتھی اور اپنے بقیہ ساتھیوں کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، نیپو پکڑا گیا۔

نیپو سے یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود چند باتیں اب بھی ایسی تھیں جن کی وجہ سے میرا ذہن پریشان تھا۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ مونچھوں والا جس کا نام مجھے پہلی بار معلوم ہوا تھا، وہ دہلی سے لاہور کب اور کیوں پہنچا؟ دوسرے یہ کہ کیا وہ میری ہی طرح بخت خاں کو بھی پہچانتا تھا؟ پھر یہ کہ اسے کس طرح معلوم ہوا کہ میں بخت خاں کی تلاش میں داتا دربار پہنچا تھا؟

ان تمام سوالوں سے قطع نظر میری نظر میں سیتا اور جوگیندر کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ سی آئی اے سینٹر میں مجھ سے جو پوچھ گچھ کی گئی تھی اور کینتھی نے جو کچھ کہا تھا، اس سے یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ سیتا اور جوگیندر بھی ان لوگوں کی نظر میں آ چکے تھے۔ یا تو ان دونوں کو بھی گرفتار کیا جا چکا تھا یا اگر ابھی یہ قدم نہیں اُٹھایا گیا تھا تو میرے فرار کے بعد یقیناً ان پر ہاتھ ڈال دیا جاتا۔ اس سلسلے میں نیپو سے حقیقت حال جان کر ہی میں کوئی قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بہرحال ہم سبھی ساتھیوں کے لیے خطرناک کہے جا سکتے تھے، خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ رہا ہو!

اس وقت میری نظر میں اوّلیں ترجیح سیتا اور جوگیندر کی تھی۔ اس امکان کو میں نے نظرانداز نہیں کیا تھا کہ ان دونوں کو مجھ سے پوچھ گچھ کے بعد پکڑا جاتا۔ اس کی واحد صورت یہی تھی کہ میں پہلے نیپو کو ساتھ لے جا کر لوہاری گیٹ والا ٹھکانا دیکھتا، اس کے بعد سیتا اور جوگیندر کو وہاں لے آتا۔

پھر میں نے نیپو کو اپنے ارادے سے باخبر کردیا۔ اس نے میری رائے سے اتفاق کیا اور بولا "ہاں یہ بہت ضروری ہے شاہین! ہمیں پہلے لوہاری گیٹ پہنچنا چاہیے تاکہ بخت خاں کو کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے کہ ہم دونوں اب زیر حراست نہیں ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں بخت خاں سی آئی اے سینٹر پر دوبارہ نہ چڑھ دوڑے!"

نیپو کی روداد تو میں نے سن لی تھی مگر اسے ابھی تک اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اگر میں اسے یہ بتا دیتا کہ سیتا اور جوگیندر خطرے میں ہیں یا پولیس کی نظر میں آ چکے ہیں تو ممکن ہے اس کا مشورہ مختلف ہوتا۔ ابھی مجھے اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی کہ اس سے تفصیلی گفتگو ہو سکتی۔

ہم دونوں اس باغ سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد ہمیں ایک تانگا مل گیا۔ نیپو بھی میری طرح پہلی بار ہی لاہور آیا تھا۔ اسے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس وقت لاہور کے کس علاقے میں تھے۔ ہمارے لیے اس

سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ تانگے والے نے ہمیں لوہاری پہنچا دیا۔ وہاں سے نیپو کو راستہ معلوم تھا۔

میں اور نیپو دونوں ہی چوکنا اور محتاط تھے کہ کہیں ہمارے پیچھے کوئی "پخ" نہ لگ جائے! ہم دونوں ہی کو بہرحال بچایا جا چکا تھا۔ پولیس ہمارا تعاقب کرتی ہوئی اس ٹھکانے تک پہنچ سکتی تھی۔ باغ ہی سے نکلتے ہوئے نیپو کو پہلی بار ہتھکڑیوں کا خیال آیا تھا۔ اس پر نیپو نے شدید حیرت کا اظہار کیا تھا اس کے ہاتھوں سے وہ آہنی زیور کب اور کیسے غائب ہو گیا! بات تھی بھی حیرت کی مگر میں دانستہ انجان بن گیا۔ یہ بتا کر کہ ہتھکڑیاں میں نے توڑی تھیں میں مزید سوالات کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ وہ پوچھتا کہ کس طرح؟ تو میں اس سوال کا جواب نہ دے پاتا۔

نیپو مجھے ساتھ لیے ایک گلی میں داخل ہوا اور پھر ایک تین منزلہ مکان کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازے ہی کے قریب مجھے ایک زینہ نظر آیا جو غالباً اوپری منزلوں پر جانے کے لیے ہوگا۔

دروازے کے پیچھے قدموں کی چاپ آ کر رُک گئی اور پوچھا گیا "کون ہے؟"

"روشنی کے سفیر آئے ہیں۔" نیپو نے آہستہ سے کہا۔

"معاف کرو بابا!" اندر سے کہا گیا' اسی کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ سنے کوڈ ورڈز بخت خاں کے ذہن کے اختراع تھے۔ وہ شاعر بھی تھا۔

دروازہ کھولنے والا میرے لیے اجنبی ہی تھا۔ وہ یقیناً ہمارا کوئی مقامی ساتھی تھا۔ میں اور نیپو جب نئے ساتھی کی رہبری میں ایک کمرے تک پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھ کر چونک اُٹھا۔ وہ کمرا اس وقت کوئی اسلحہ خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ بندوقیں' پستول' دستی بم وہاں مجھے سبھی ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں اس وقت بخت خاں اور حیدر علی کے علاوہ مجھے آٹھ دس نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ ان میں مجھے کوئی زخمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

بخت خاں اور وہاں موجود سبھی ساتھی مجھے اور نیپو کو دیکھ کر لمحے بھر کو حیران سے رہ گئے جیسے انہیں اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"آپ... آپ دونوں..." بخت خاں ہکلا کر رہ گیا۔

"ہاں ہم دونوں!" میں مسکرا کر بولا۔ پھر ایک لمحہ بھی مزید ضائع کیے بغیر میں نے بخت خاں کو سیتا اور جوگیندر کے بارے میں بتا دیا کہ وہ خطرے میں ہیں۔ اسی کے ساتھ میں بولا "کرا نہیں لے کر وہاں آتا ہوں۔"

"نہیں!" بخت خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا "شاہین! انہیں لینے نہیں جائیں گے۔ اس ہوٹل کا نام بتا دیجیے جہاں آپ تینوں ٹھہرے تھے۔"

"مگر... مگر" میں نے کہنا چاہا کہ اس کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا "آپ یہ نہ بھولیں شاہین کہ میں اس مہم کا نگراں ہوں۔ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ ہمیں! کس وقت کیا قدم اُٹھانا چاہیے۔ یہ ذمے داری میری ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں قدرے تلخی آ گئی۔

مجھے اس وقت بخت خاں کی صاف گوئی ناگوار سی محسوس ہوئی مگر اس کا فیصلہ درست ہی تھا۔ موجودہ حالات میں میرے لیے اس محفوظ پناہ گاہ سے باہر نکلنا زیادہ خطرناک تھا۔ سیتا سے اپنی جذباتی وابستگی کے بارے میں اسے میں نے بتایا بھی کیا! معاملات عشق سے بھلا تنظیم یا اس کے ارکان کا کیا تعلق! یہ میرا ذاتی معاملہ تھا کہ میں ہر طرح کا خطرہ مول لے کر اپنی محبوبہ اور اپنے دوست کو وہاں سے نکال لانا چاہتا تھا۔ پہلے لاہوری گیٹ آنا بھی میری مجبوری تھی ساتھیوں کو اپنے متعلق لاعلمی میں رکھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ اب میں یہاں آ گیا تھا تو مجھے بہرحال بخت خاں کا حکم ماننا ہی تھا۔

بخت خاں کو میں نے ہوٹل کا نام بتایا اور کمرا نمبر بتایا۔ اس نے چار مقامی ساتھیوں کے سپرد یہ کام کیا۔

"اگر تم لوگ کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو تو بلا دریغ اسلحہ استعمال کر سکتے ہو۔ ان دونوں کو بہرحال بہ حفاظت یہاں لے کر آنا ہے۔" بخت خاں نے جانے والوں کو ہدایت دی "تم میں سے صرف ایک اس ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر دستک دے گا۔ دوسرا دور رہ کر اس کی نگرانی کرے گا۔ تیسرا ساتھی ہوٹل کے دروازے پر رہے گا اور چوتھا اس تانگے میں بیٹھا رہے گا جو تم لوگ اپنے ساتھ یہاں سے لے جاؤ گے۔ تانگا چھوڑنا نہیں ہے۔ کسی بڑی گڑبڑ کی صورت میں یعنی اگر اسلحہ استعمال کرنے کی نوبت آ جائے اور معاملہ ہاتھ سے باہر ہونے کا خطرہ ہو تو تین ساتھی وہیں رُکیں' ایک تانگے میں ہو وہ فوری طور پر یہاں پہنچ کر اطلاع دے۔ ہم یہاں تیار رہیں گے۔ کوئی گڑبڑ یا ٹکراؤ نہ ہونے کی صورت میں بھی انتہائی محتاط رہنا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ صرف ایک ساتھی تانگے میں بیٹھ کر آئے گا' بقیہ دوسرے تانگے میں نگرانی کریں گے۔ یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ انہیں سیدھا یہاں لے کر نہیں آنا' جب تک یقین نہ ہو جائے کہ آگے

کوئی اجنبی یا مشتبہ چھو نہیں ہے تم اس مکان کا رُخ نہیں کرو گے۔" صرف اتنا جاننے کے بعد کہ سیتا اور جوگیندر خطرے میں ہیں۔ بخت خاں نے جو ہدایات دی تھیں اُن سے ذہانت اور دوراندیشی کا پتا چلتا تھا۔

وہ چاروں فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔ ان چاروں ہی کے پاس پستول اور ان کی فاضل گولیاں تھیں۔ اس کے علاوہ کراری دار چاقو بھی تھے۔ یہ اسلحہ انہوں نے میرے ہی سامنے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپایا تھا۔ وہ سبھی صحت مند اور تندرست و توانا تھے۔ وہ چلے گئے تو بخت خاں مجھے اور نیپو کو ساتھ لے کر ایک اور کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں چارپائیاں بھی تھیں اور مونڈھے بھی پڑے تھے۔ چاروں ساتھیوں کی روانگی سے قبل میں نے جوگیندر اور سیتا کا حلیہ بھی انہیں بتا دیا' اس کے علاوہ اصل اور فرضی نام بھی۔

نیپو کا اندیشہ غلط نہیں نکلا تھا۔ اگر ہم دونوں کو لوہاری گیٹ پہنچنے میں مزید کچھ دیر ہو جاتی تو بخت خاں وہاں نہ ملتا۔ وہ سی آئی اے سینٹر پر ایک منظم حملے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اسے اتنی دیر صرف اسلحہ کی فراہمی میں ہوئی تھی۔ اسلحہ کا بندوبست مقامی ساتھیوں نے کیا تھا۔

ہرچند کہ میرا دھیان سیتا اور جوگیندر ہی میں پڑا ہوا تھا مگر بخت خاں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ان دونوں کی طرف سے انتہائی فکرمند ہوں۔ یہ بتانے کے بعد کہ اس کا ارادہ کیا قدم اُٹھانے کا تھا' بخت خاں اب مجھ سے پوچھ رہا تھا "شاہین! پہلے آپ یہ بتائیں کہ سیتا اور جوگیندر خطرے میں ہیں' اس کا علم آپ کو کیسے ہوا؟"

"وہ لوگ جب مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو انہوں نے خود ان دونوں کا ذکر کیا تھا۔" میں نے جواب دیا' پھر بہت محتاط انداز میں صرف اتنا بتایا کہ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والے صرف دو تھے۔ ایک کیپٹن اور دوسرا اس کا ساتھی۔ میں دانستہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا تاکہ میری پُراسرار قوتوں پر پردہ پڑا رہے۔ "میں ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا اور وہ مجھے ذرا دھمکا رہے تھے کہ اپنے ساتھیوں کی نشان دہی کر دوں اسی..."

"تم پر یقیناً تشدد بھی کیا گیا ہے۔" میری بات کاٹ کر بخت خاں بول اُٹھا "تمہاری قمیص پر یہ دھبے خون ہی کے معلوم ہو رہے ہیں۔ کہیں تم زخمی تو نہیں ہو؟" یہ کہتے ہوئے بخت خاں کی نظریں میرے دائیں شانے پر تھیں۔ اُسترے سے جب میرے دائیں کان کی لو کاٹی گئی تھی تو خون کے

قطرے ٹپک کر شانے پر گرے تھے۔ بخت خاں کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی تشویش کے زیر اثر وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اس کا احساس بھی اسے خود ہی ہو گیا تھا۔ میں نے جب اسے یہ بتایا کہ زخمی نہیں ہوں تو وہ کہنے لگا "معاف کیجیے گا شاہین' میں آپ سے روا روی میں بے تکلفی..."

"یہ بے تکلفی مجھے اچھی لگی بھائی بخت خاں!" میں نے مسکرا کر کہا "اس طرح مجھے بھی آپ سے بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کا موقع مل جائے گا۔"

بخت خاں ہنس دیا اور بولا "میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔" پھر وہ سنجیدہ ہو گیا "ہاں یہ بتاؤ کہ تم وہاں سے فرار کس طرح ہو گئے اور نیپو تمہیں کہاں مل گیا؟ میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ تم دونوں ایک ساتھ یہاں پہنچو گے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم دونوں کو چھڑانے کے لیے چاہے سی آئی اے سینٹر کو دستی بموں ہی سے کیوں نہ اُڑانا پڑے' تم لوگوں کو وہاں سے ہر قیمت پر نکال کر لے آؤں گا۔"

"بس ان کی حماقت سے میں نے فائدہ اُٹھا لیا۔" میں نے بات بنائی "غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انہوں نے نرمی کا اظہار کرنے اور اس بہانے میری زبان کھلوانے کے لیے مجھے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ انہیں شاید یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ میں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ پستول نکال لیا جو کیپٹن کے ایک ماتحت کے ہاتھ سے چھینا تھا "جس شخص نے مجھے رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا' یہ اسی کا پستول ہے۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہو رہا تھا' میں نے اس کی جیب سے پستول نکال لیا۔ پھر اس انگریز عورت اور اس کے ساتھی کو قابو میں کرنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس وقت وہاں سے فرار ہو رہا تھا تو راہداری میں کوئی محافظ نہیں تھا۔ جب میں احاطے میں پہنچا تو نیپو کو دیکھا۔" پھر میں نے بہت اختصار کے ساتھ بقیہ روداد بیان کر دی۔ اس کا گواہ کیوں کہ نیپو بھی تھا اس لیے مزید دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ ہاں اس واقعے کو غیر معمولی انداز میں بیان کرنے سے گریز کیا حالانکہ وہ واقعہ غیر معمولی ہی تھا۔ میں یہ بات بھی گول کر گیا تھا کہ نیپو کو ہتھکڑیاں پہنے ہوئے دیکھا تھا۔

بخت خاں کوئی بچہ تو تھا نہیں کہ آسانی سے بہل جاتا' پھر یہ کہ نیپو بھی موجود تھا۔ بخت خاں کے ایما پر نیپو نے من و عن

وہ باتیں بتائیں جن سے میں نے گریز کیا تھا۔ نیپو نے آخر میں کہا "شاہین کی جگہ مجھے کوئی بجلی سی کوندتی معلوم ہو رہی تھی۔ یقین کریں بخت خاں' ان کے نرغے سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ شاہین نے تو انہیں اسلحہ تک استعمال کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اگر میں خود وہاں موجود نہ ہوتا اور مجھ سے کوئی یہ واقعہ بیان کرتا کہ اتنے مسلح محافظوں کے درمیان سے تن تنہا ایک شخص بچ کر نکل آیا تو ہرگز مجھے یقین نہ آتا۔ اور تو اور انہوں نے وہاں سے فرار ہوتے وقت مجھے اپنی پشت پر لاد لیا تھا' پھر اتنی تیز رفتاری سے دوڑنا شروع کیا تھا کہ میرے منہ سے ۔۔۔ شاید میں خوف زدہ ہو گیا تھا اور میرے منہ سے خوف ہی کے سبب ۔۔۔"

"بس کرو نا یار' مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہو!" میں دانستہ بول اٹھا کہ کہیں وہ خراٹوں کا قصہ نہ سنانے لگے "دراصل مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ تمہیں نیند سی آ رہی ہے یا تم بہت نڈھال ہو۔ میں نے اسی لیے یہ مناسب سمجھا کہ تمہیں کمر پر لاد لوں۔"

"اور واقعی میں سو گیا تھا۔" نیپو نے بخت خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا؟ تم سو گئے تھے؟ مگر کیوں؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" بخت خاں نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھے خود نہیں معلوم کہ کیسے نیند آ گئی تھی!" نیپو نے جواب دیا "میں تو اس وقت جاگا تھا جب شاہین نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ وہ ایک نیم تاریک سائبان تھا۔"

"حیرت انگیز واقعہ سنایا ہے تم نے۔" بخت خاں نے کہا' پھر میری طرف مڑا "تم تو بڑی قیامت شے نکلے جان عزیز! جو کچھ سنا ہے میں نے اس پر واقعی یقین سا نہیں آ رہا ہے۔ یعنی تم مسلح ساتھیوں کے باوجود وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا اور تم نہ صرف خود بچ کر نکل آئے بلکہ نیپو کو بھی نکال لائے۔ یہ تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ مجھے تو اب یہ محسوس ہو رہا ہے' تمہیں اس مہم کا نگراں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی کمال وال نہیں ہے' نہ میں کوئی قیامت شے وغیرہ ہوں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے یہی سب کچھ کرتا جو میں نے کیا۔ اب مجھے بھی تو کچھ پوچھنے دیں! اس مونچھوں والے حسن علی کو صرف تم ہی جانتے ہو بھائی بخت خاں یا وہ بھی تمہیں پہچانتا ہے؟"

"مجھے یقین ہے کہ حسن علی مجھے نہیں جانتا ہوگا۔ کیوں' تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ جب اس خبیث نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا تو کہا تھا' تمہیں بخت خاں کی تلاش تھی نا۔ اور ہمیں تمہاری تلاش تھی۔"

یہ سن کر بخت خاں ایک دم چونک اٹھا "یہ کہا تھا حسن علی نے! حیرت ہے پہلی بات تو یہ کہ اسے کس طرح معلوم ہوا کہ تم مجھے تلاش کر رہے ہو' دوم یہ کہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا چلا؟"

"میں یہ سن کے تو میں چکرا گیا تھا۔ مجھے تمہاری طرف سے فکر ہو گئی تھی کہ کہیں تم تو ان کے چنگل میں نہیں پھنس گئے!" یہ کہہ کر مصلحتاً میں نے ایک بار پھر اپنی اصل شخصیت چھپانے کی خاطر جھوٹ بولا "میرے لیے بھی وہ بالکل اجنبی تھا۔ مجھے تو نیپو سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تم اسے جانتے ہو اور یہ کہ اس کا نام حسن علی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے میرے بارے میں کس طرح اندازہ لگا لیا کہ تم سے میرا کوئی تعلق ہے یا میں بھی تنظیم کا رکن ہوں!"

"اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا گم ہے لیکن کم از کم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں شاہین کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ حسن علی کو میرا نام معلوم ہونا' یہ خبر ہونا کہ تمہیں میری تلاش ہے۔ یہ پتا ہونا کہ تم کسی ایسی زیر زمین تنظیم سے متعلق ہو جو حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہے جیسا کہ تم نے خود بتایا بھی کہ انہوں نے یہی الزام لگا کر یا مفروضہ قائم کر کے بقیہ ساتھیوں کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ کی اور تمہاری زبان کھلوانا چاہتے تھے۔ یہ تمام باتیں خالی از علت نہیں ہیں۔ اس امکان پر بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ شاید ہمارے درمیان کوئی کالی بھیڑ موجود ہو۔" یہ کہہ کر بخت خاں نے سختی سے جبڑے بھینچ لیے۔

"میرا خیال ہے بخت خاں کہ تم غلط خطوط پر سوچ رہے ہو۔" میں نے کہا "معاف کرنا جان عزیز' اس نہج پر سوچنا میرے نزدیک خود اپنے وجود پر شک کرنے کے مترادف ہے۔ مجھے تمہاری اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے مگر اس کا مطلب بہرحال یہ نہیں' ہم اپنے ساتھیوں پر شبہ کرنے لگیں۔ ممکن ہے ہم اگر پیش آنے والے واقعات کا ازسرنو تجزیہ کریں تو کوئی اور ہی بات سامنے آ جائے۔"

چند لمحے خاموش رہ کر بخت خاں کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی "تم ٹھیک ہی کہتے ہو شاہین! ہمیں ازسرنو اس معاملے پر غور کرنا پڑے گا' مگر میں نے جس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے اسے بھی ہم قطعی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ایسا ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے ورنہ وہ حرام زادے

کوئی پہنچے ہوئے بزرگ نہیں ہیں کہ وہ تمہیں بھی پہچان گئے کہ تم انگریز حکومت کے دشمن ہو اور انہیں میرا نام بھی معلوم ہو گیا۔ میر جعفر و میر صادق ہر جگہ ہوتے ہیں۔ فرض کرو ہر جگہ نہیں ہوتے تو دھونس' دھمکی اور جان کا خوف انہیں غداری پر مجبور کر دیتا ہے۔" پھر اچانک بخت خاں نے سوال کیا "سیتا اور جوگیندر کے بارے میں تم کس حد تک پُریقین ہو کہ دھمکی' لالچ یا تشدد انہیں زبان کھولنے یا مخبری پر مجبور نہیں کر سکتا؟"

بخت خاں کی یہ بات مجھے کچھ بُری سی لگی کہ وہ جو مفروضہ قائم کر چکا تھا۔ اسی پر اڑا ہوا تھا۔ سیتا یا جوگیندر پر تو اسے ایسا شبہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود میں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور بولا "جس حد تک مجھے خود پر یقین ہے بخت خاں' میں ان دونوں بہن بھائی پر بھی یقین کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ شاید تمہارے ذہن سے ایک اور بات نکل گئی کہ خود مجاہد اوّل نے ان پر تمہاری موجودگی میں اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا ورنہ وہ اس مہم میں ہمارے ساتھ نہ ہوتے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ کسی بھی الجھے ہوئے مسئلے کو ہر رُخ سے سوچنا سمجھنا چاہیے۔ حسن علی کو تم نے دہلی میں دیکھا تھا اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس کا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہے!۔۔ ٹھیک ہے نا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے بخت خاں کو دیکھا۔

"تم اپنی بات پوری کرو۔" وہ بولا۔

"حسن علی' کا یہاں نظر آنا کیا معنی رکھتا ہے! اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا حالانکہ اس کی وجہ کسی حد تک میرے علم میں تھی۔ یقیناً میرے ڈیڈی کو مجھ پر شک ہو گیا تھا کہ میں کسی پہاڑی تفریحی مقام پر نہیں کہیں اور ہی جا رہا ہوں۔ انہی کے ایما پر حسن علی دہلی سے میرا تعاقب کرتا ہوا لاہور پہنچا ہوگا۔ یہاں آ کر ظاہر ہی اس نے اپنے محکمے والوں سے رابطہ قائم کیا ہوگا اور بات بڑھ گئی ہوگی۔ ایک انگریز عورت کیتھی کا اس معاملے میں سامنے آنا اس طرف اشارہ کر رہا تھا کہ حکومت دشمن افراد کے سلسلے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جا رہی تھی۔ خواہ ایسا کوئی فرد جس پر یہ شبہ ہو' کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو! اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ لوگ مجھ پر تشدد نہ کرتے۔ کیتھی بھی کسی بڑے عہدے ہی پر فائز تھی۔ شاید اس نے اسی لیے میرے ڈیڈی کی پروا بھی نہیں کی یا پھر حسن علی نے کسی مصلحت کے پیش نظر یہاں والوں کے سامنے یہ بتایا ہی نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں! ممکن ہے وہ اس معاملے میں میرے ڈیڈی کا نام ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو اور اس نے اپنے محکمے والوں کو صرف یہ بتایا ہو کہ میرا تعلق حکومت دشمن عناصر سے معلوم ہوتا ہے وغیرہ۔

میری بات پر بخت خاں نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کہنے لگا "ظاہر ہے حسن علی کی یہاں موجودگی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا ہی! تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہو' وہ بتاؤ۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ دہلی میں چتلی قبر والے جس مکان پر چھاپا پڑا تھا' وہ مکان تم ہی نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔"

"ہاں پھر؟" بخت خاں کی چوڑی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"مالک مکان کو تم نے اپنا نام بخت خاں ہی بتایا تھا نا؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں۔ مگر۔ شاہین! تم شاید صحیح نتیجے پر پہنچ رہے ہو۔ میں بھی ابھی یہی سوچ رہا تھا۔ جب تم نے اس آسیب زدہ مکان کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یہ کہ وہاں سے ہمارے فرار کے بعد مالک مکان سے پوچھ گچھ کی گئی ہوگی اور اسی سے پولیس کو یہ نام معلوم ہو سکتا ہے۔ اس حد تک تو چلو بات سمجھ میں آ جاتی ہے مگر حسن علی کا تم سے یہ کہنا کہ تمہیں بخت خاں کی تلاش ہے یہ بات بہرحال چند ہی افراد کے علم میں تھی۔ ہم چاروں ساتھیوں کے سوا کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ لاہور پہنچ کر تمہیں مجھ سے کب اور کہاں ملنا ہے! میں نے تو اس سلسلے میں اتنی احتیاط برتی تھی کہ مقامی ساتھیوں سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں کو میں نے آج ہی اس وقت تمہارے بارے میں بتایا تھا جب داتا دربار سے لوٹا تھا اور سی آئی اے سینٹر پر حملہ کیا تھا۔"

"پھر تو بس ہم چاروں ساتھی ہی رہ جاتے ہیں۔" نیپو نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

"چار کیوں' چھے افراد کہو!" میں بولا "اس بات کا علم ان دونوں بہن بھائی کو بھی تھا مگر جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں یا بخت خاں کیا کسی کو یہ بات بتا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اب رہ جاتے ہیں نیپو اور حیدر علی! جہاں تک نیپو کا سوال ہے بخت خاں' تو کیا ایسا کوئی شخص جو اپنے ساتھیوں کو فرار کا موقع فراہم کرنے کے لیے خود پھنسنا قبول کر لے' ایسے شخص کی وفاداری پر شبہ کیا جا سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہرگز نہیں۔ حیدر علی بھی جلالی کی مہم میں میرے ساتھ رہا ہے' پھر یہ کہ تم

نے بھی اتنے عرصے میں اس کے متعلق یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ وہ بھی تنظیم کے ساتھ ہماری ہی طرح وفادار و مخلص ہے۔ وہ دونوں بہن بھائی دہلی پہنچنے کے بعد لاہور تک میرے ساتھ رہے ہیں۔ انھیں مورد الزام ٹھہرانا یا کسی طرح ان پر شک کرنا بھی ظلم ہے۔ صرف ایک امکان ہو سکتا ہے کہ حسن علی نے اندھیرے میں تیر چلایا ہو۔ یہ تیر اتفاق سے صحیح نشانے پر بیٹھ گیا ہم اسی لیے اُلجھ رہے ہیں۔"

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔" بجت خان نے اظہار خیال کیا "ویسے تمہاری بات دل کو لگتی ضرور ہے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ کسی بھی طرح تم حسن علی کی نظر میں آچکے تھے تو یہ اُلجھی ہوئی گتھی سلجھ جاتی ہے۔ اس بات کو یوں با آسانی سمجھا جاسکتا ہے ہم صرف مفروضوں پر بات آگے بڑھا رہے ہیں کہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے یہی ایک طریقہ ہے۔ بالفرض دہلی میں تم حسن علی کی نظر میں آگئے۔ اسی دوران میں چٹکی قبر والے مکان کے مالک سے پوچھ گچھ ہوئی اور میرا نام سامنے آیا۔ حسن علی نے اس کے بعد دہلی سے لاہور تک تمہارا تعاقب کیا۔ تم اور تمہارے دونوں ساتھی جس ہوٹل میں ٹھہرے' ظاہر ہے کہ وہ ہوٹل بھی اس نے دیکھ لیا۔ مغرب سے کچھ پہلے تم داتا دربار تک پہنچنے کے لیے ہوٹل سے نکلے۔ تمہارا تعاقب بدستور جاری رہا پھر جب نماز پڑھ کر تم باہر صدر دروازے کے آس پاس دیر تک چکر لگاتے رہے تو اس سے حسن علی نے یہی نتیجہ نکالا کہ تمھیں میری تلاش بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے اسی لیے جب تم مایوس ہو کر واپس آرہے تھے تو ایک ایسی بات کہی کہ تم بوکھلا جاؤ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ تم بڑی آسانی سے اس کے ہتھے چڑھ گئے ورنہ مزاحمت بھی کرسکتے تھے۔"

"ہاں اس وقت واقعی میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔" میں نے دانستہ غلط بیانی کی اور اس غلط بیانی کا مقصد بھی اپنی اصل شخصیت چھپانا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں بدحواسی کی وجہ سے ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ اس کی اصل وجہ میری یہ غلط فہمی تھی کہ وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

"اب صرف یہی ایک سوال رہ جاتا ہے کہ تم اس ملعون کی نظر میں کیسے آگئے؟" بجت خاں نے کہا۔

اور مجھے اس سوال کا جواب معلوم تھا اس "ملعون" کی نظر میں تو میں ایک عرصے سے تھا۔ مگر بجت خاں کو میں نے یہ جواب نہیں دیا اور لاعلمی ہی کا اظہار کیا۔

"ایک مرتبہ دہلی ہی میں حسن علی میرے ہاتھوں سے مارا جاتا۔" بجت خاں بتانے لگا۔ پھر اس نے ایک ایسی بات کہی کہ اگر بجت خاں کی جگہ کوئی اور ہوتا یا تنظیم سے تعلق نہ ہوتا تو میں اندر ہی اندر غصے میں تلملا کر نہ رہ جاتا۔ بجت خاں نے کہا تھا "حسن علی تو محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ میں اس کمینے اور ضمیر فروش ڈیسوزا کو جہنم رسید کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ جس کے اشارے پر حسن علی جیسی نہ جانے کتنی کٹھ پتلیاں ناچتی ہیں۔" پھر یہ کہہ کر بجت خاں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا "مجاہد اوّل نے ہمیں اس کی اجازت نہیں دی حالانکہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے سراغ لگایا تھا کہ انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر کون ہے! ہم لوگ خاصے عرصے سے یہ سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ راز اس وقت کھلا تھا جب ڈیسوزا دہلی سے کلکتے گیا۔ اطلاعات کے مطابق وہاں اس نے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف ثبوت پیش کیے تھے۔ مولانا پر کلکتے میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔"

خود میرے لیے بھی یہ انکشاف ہی تھا کہ ڈیڈی ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے۔ مجھے کچھ اندازہ تو تھا کہ ان کا تعلق حکومت کے کس محکمے سے ہو سکتا ہے لیکن یقینی طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس عہدے پر فائز ہیں۔ بجت خاں نے جو بات بطور ثبوت بیان کی تھی خود میں بھی اس کا گواہ تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ اچانک کس لیے کلکتے گئے ہوں گے مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس وقت تو مجھے غصے کے ساتھ اپنی بے بسی پر رونا بھی آرہا تھا۔ ایک شخص میرے ڈیڈی کو کمینہ اور ضمیر فروش کہہ رہا تھا اور میں سر جھکائے خاموشی سے سن رہا تھا۔ کبھی کبھی آدمی کتنا مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے!

اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے موضوع بدلنے کی خاطر بجت خاں سے کہا "اب تک ان لوگوں کو آنا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی ہے۔ بیتا اور جوگیندر کی طرف سے اب مجھے تشویش ہونے لگی ہے۔"

"ہاں انھیں اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔" بجت خاں جواباً بولا "مگر کوئی تشویش کی بات نہیں۔ اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہوتی تو اب تک اطلاع مل چکی ہوتی۔ ان لوگوں کے دیر سے آنے کی وجہ کچھ اور ہی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کسی سوچ میں پڑ گیا' پھر آپ ہی آپ بول اٹھا "اگر کچھ ہوا بھی ہے تو وہ ہمارے ساتھیوں کے قابو سے باہر نہیں ہوا۔"

پھر بجت خاں نے جو کچھ کہا تھا کچھ دیر کے بعد وہی درست ثابت ہوئی۔ بیتا اور جوگیندر کو گرفتار تو نہیں کیا گیا تھا مگر وہ زیر نگرانی ضرور تھے۔ وہ سادہ لباس پولیس والے ہمارے ساتھیوں کی نظر میں آگئے تھے۔ انھی سے احتیاط کے ساتھ نمٹنے میں اتنی دیر ہوئی تھی۔ بجت خاں سے بیتا اور جوگیندر کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں نے ان کا آپس میں تعارف کرایا۔ غائبانہ وہ ایک دوسرے سے واقف ہی تھے۔ پھر یہ کہ اپنوں کو اپنے یوں بھی بہت جلد پہچان لیتے ہیں۔ میں نے ان کے تپاک میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی محسوس کی اور مطمئن ہو گیا۔

بیتا اور جوگیندر کی آمد کے بعد اس مکان میں جمع کیا جانے والا اسلحہ مختلف ٹھکانوں پر پہنچانے کا بندوبست کیا گیا۔ لاہور میں تنظیم خاصی طاقت ور اور فعال معلوم ہوتی تھی۔

اب اس جگہ ہم چھے ساتھیوں کے علاوہ صرف دو مقامی کارکن رہ گئے تھے۔ بجت خاں پہلے بھی پنجاب آچکا تھا اس لیے لاہور' ملتان اور دیگر کئی شہروں کے مقامی کارکنوں سے اس کی شناسائی تھی۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے بجت خاں بھی وہیں کا رہنے والا ہو حالانکہ دہلی میں مجھے وہ دہلی والا ہی لگا تھا۔ وہ روانی سے پنجابی بول رہا تھا۔

اسی دوران میں مجھے بجت خاں سے اس مقامی ساتھی کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا تھا جس کے گولی لگی تھی۔ اسے ایک محفوظ ٹھکانے پر منتقل کروا دیا گیا تھا۔ وہاں اسے طبی امداد دی گئی تھی۔ گولی اس کی ران میں لگی تھی جس سے ران کی ہڈی کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی گولی نکال دی گئی تھی۔

میرا سامان بھی بیتا اور جوگیندر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ہم تینوں کی سکونت کا انتظام ایک ہی کمرے میں کیا گیا تھا۔ بجت خاں' نیچو اور حیدر علی کا کمرا ہمارے برابر والا تھا۔ دو مقامی ساتھی صدر دروازے کے قریب ایک کمرے میں ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔ ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد بجت خاں کے ایما پر ہال کمرے میں ہماری میٹنگ شروع ہوگئی۔ ہمیں اب آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ موجودہ غیر متوقع صورت حال میں یہ بہت ضروری تھا۔ بیتا' جوگیندر' نیچو اور خود میں لاہور پولیس کی نظر میں آچکے تھے۔ میں نے ہی اس طرف بجت خاں کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

"ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم آج ہی رات لاہور سے نکل جائیں۔" بجت خاں نے بات شروع کی "صورت حال یہاں بھی ویسی ہی ہو گئی ہے جو دہلی سے ہماری روانگی کے وقت تھی۔"

"اور دوسری صورت؟" میں نے سوال کیا۔

"دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ ہم چند روز یہیں روپوش رہ کر گزار دیں۔" بجت خاں نے جواب دیا "دونوں ہی صورتوں میں مثبت اور منفی پہلو موجود ہیں۔ یہاں سے فوری طور پر نکل جانے کا فائدہ یہ ہے کہ ہم خطرے کی حدود سے دور ہو جائیں گے۔ خرابی اس میں یہ ہے کہ اس وقت پولیس نے لاہور کی ناکا بندی کروی ہوگی۔ پولیس کا خیال بس یہی ہوگا کہ ہم آج رات لاہور سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم نے یہاں چند روز روپوش رہنے کا فیصلہ کرلیا تو اس سے ایک طرف تو ہمیں ملتان پہنچنے میں دیر ہو جائے گی' دوسری جانب ہم بہرحال خطرے ہی میں رہیں گے۔ مثبت پہلو اس میں یہ ہے کہ یہاں چند روز روپوشی کی صورت میں ہمیں فوری طور پر کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ ہماری روپوشی لاہور پولیس کو تذبذب میں مبتلا کردے گی۔ پولیس کوئی فیصلہ نہیں کرسکے گی کہ ہم فرار ہو چکے ہیں یا لاہور ہی میں موجود ہیں۔" اپنی بات پوری کرکے بجت خاں نے مجھے مشورہ طلب نظروں سے دیکھا۔

"ایک درمیانی راہ بھی ہو سکتی ہے۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا "مجاہد اوّل نے ہمیں دہلی سے ملتان روانگی کے لیے ایک ہفتہ دیا تھا مگر مصلحت وقت کے پیش نظر ہم وہاں سے جلدی چل دیے۔ ایسی صورت میں ہم اگر مزید دو ایک روز لاہور میں رُک جاتے ہیں تو اس سے ملتان پہنچنے میں دیر نہیں ہوگی۔ چند روز یہاں رُکنے کی بجائے کل ہی یا پھر زیادہ سے زیادہ پرسوں ہم لاہور سے چل دیں۔ اس سے ہمارے دونوں ہی مقصد حل ہو جائیں گے۔ فوری طور پر ہم ایک متوقع خطرے سے بھی بچ جائیں گے اور ہمیں ملتان پہنچنے میں زیادہ دیر بھی نہیں ہوگی۔"

میری تجویز سے سبھی ساتھیوں نے اتفاق کیا۔ مہم کا نگراں ہونے کی حیثیت سے فیصلہ بجت خاں ہی کو کرنا تھا۔ وہ بھی مجھ سے متفق تھا۔

"مگر ہم یہاں سے براہ راست ملتان نہیں جائیں گے۔" بجت خاں نے کہا "ہم ایک روز لائیلپور (فیصل آباد) میں ٹھہر کر یہ جائزہ لیں گے کہ کہیں ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جارہا! اس کے بعد ہم ملتان کا رُخ کریں گے۔ ہم کل ہی کسی وقت لاہور سے چل دیں گے۔"

O☆O

شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی مسجد کے سامنے سے

گزرتے ہوئے ہم سب شاہ یوسف گردیز کے مزارِ مبارک کی طرف بڑھ رہے تھے کہ راستے میں ہم نے درس کا ایک "حلقہ" دیکھا اور ہمارے قدم جیسے خود بہ خود رک گئے۔ حلقے کے درمیان میں نورانی صورت والے ایک بزرگ بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے مریدوں سے مخاطب تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "اپنے دل میں خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آنے دے اور جو اپنے دل کو آلائش دنیا سے پاک و صاف رکھے اسے صوفی کہتے ہیں۔ اسی کی جمع صوفیا ہے اور یہ عربی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی پشم پوش یعنی بالوں کا کپڑا پہننے والے کے ہیں اس لیے "صوف" بال کو کہتے ہیں۔ صوفی ہی کے ایک معنی مخلص کے بھی ہیں۔ سو دین میں اخلاص بنیادی شرط ہے۔"

"ٹیلو شاہ صاحب" کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس چلیں، شام ہو رہی ہے اور احمد حسین ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔" بخت خاں نے ہمیں مخاطب کیا۔ ہم سب شاہ یوسف گردیز کے مزار کی طرف بڑھنے لگے جو اس شہر کا سب سے قدیم مزار تھا۔

"یہاں کتنا سکون، کتنی راحت ہے شاہین!" سیتا جو میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی آہستہ سے بولی۔

میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا "یہ اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ کچھ لوگوں کو یہاں صرف ویران مقابر نظر آتے ہیں مگر صرف انہیں کہ جن کے اندر کی آنکھ بند ہوتی ہے۔ یہاں صدیوں کی تاریخ دفن ہے اور یہ زندہ تاریخ صرف انہی سے کلام کرتی ہے جو اس کے اہل ہوں۔"

ہم لائل پور (فیصل آباد) میں ایک دن گزار کر مدینۃ الاولیاء ملتان پہنچ چکے تھے۔ ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔ ہم بہ آسانی لاہور سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ملتان میں ہم تحریکِ خلافت کے ایک سرگرم کارکن احمد حسین کے یہاں ٹھہرے تھے۔ تحریکِ خلافت کا رکن ہونے کے ساتھ ساتھ احمد حسین ہماری خفیہ تنظیم کا رکن بھی تھا۔ احمد حسین کی شخصیت اسی لیے پردہ راز میں نہیں رہ سکی تھی کہ وہ ملتان کی نمایاں شخصیات میں سے تھا۔ ہاں یہ بات ضرور راز میں تھی کہ دراصل وہ ملتان میں مجاہدِ اوّل کے احکام کا پابند تھا اور اس کی تمام تر دلچسپیاں وطن پرست خفیہ تنظیم سے تھیں۔ میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ تنظیم کے کسی رکن کی اصل شخصیت مجھ پر ظاہر ہوئی تھی۔ ملتان آئے ہوئے ہمیں یہ پہلا ہی دن تھا۔ سیتا اور جوگیندر کے ایما پر بخت خاں ہم سب ساتھیوں کو بزرگانِ دین کی زیارت گاہوں کی طرف لے کر چلا تھا۔ بزرگانِ دین کے مزارات سے ان دونوں کی یہ محبت اور دلچسپی کم از کم میرے لیے تو حیران کن نہیں تھی البتہ بخت خاں اور دوسرے ساتھیوں کو اس پر حیرت ضرور تھی۔ خود بھی ان مزارات کی زیارت کے متمنی تھے اور مجھے بھی یہاں آنے کا اشتیاق تھا۔ بخت خاں اسی لیے راضی ہو گیا تھا۔ یوں بھی ہمیں ملتان میں سرگرمِ عمل ہونا تھا اور اس شہر سے آگہی ہمارے لیے ضروری تھی۔ بخت خاں ہر وقت تو ہماری رہنمائی کے لیے ساتھ نہ تھا۔

یہ شہر ملتان، سندھ اور پنجاب کا تہذیبی سنگم تھا۔ اس میں اور اس کے گرد و نواح میں متعدد صوفیائے کرام کے مقابر اور مزارات تھے۔ اردو زبان کی لسانی تشکیل میں بھی اس شہر کا اہم حصہ تھا۔ تہذیبِ انسانی کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک شہر یہ بھی تھا جہاں ہم آئے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کے سبب دہلی کی طرح یہ شہر بھی بسا اور اُجڑا۔ راوی، چناب اور جہلم کی مواج لہروں میں گھرا ہوا یہ زرخیز علاقہ بعد میں ملتان شہر اور اس کا گرد و نواح کہلایا۔

سکندرِ اعظم سے تقریباً ہزار بارہ سو سال قبل اس زرخیز علاقے کا نام "موبی استھان" تھا اور یہی "ملی استھان" بھی کہلاتا تھا۔ اس سے بھی پہلے یہ "ویلی استھان" تھا اور پھر "ہمساویلی استھا" کہلاتا تھا۔ یہ دونوں نام ہندو مت کی قدیم مذہبی کتاب "رگ وید" کے پہلے حصے میں ملتے ہیں۔ گیت بھجن ایک سو چھتیسواں ہے جس میں یہ نام آئے ہیں "رگ وید" میں اس شہر کے آس پاس کے علاقوں کا ذکر ہے۔ میں نے "رگ وید" ہی میں سندھ ندی (دریائے سندھ) کا ذکر بھی پڑھا تھا۔ دریائے سندھ کی تعریف "رگ وید" کے ایک گیت میں یوں کی گئی ہے "چمکنے والی، درخشاں، عالی شان، نہ ختم ہونے والی ہے۔ سب ندیوں سے زیادہ اس میں پانی ہے خوب صورت ابلق گھوڑے کی طرح حسین ہے۔"

عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے علم نے دنیا کے کسی علاقے کی تاریخ سے ناآشنا نہ رہنے دیا۔ ملتان کے متعلق بھی یہاں آنے سے پہلے مجھے بہت کچھ معلوم تھا جو مختصراً میں بیان کر رہا ہوں۔ سکندرِ اعظم کے بعد اس علاقے کو ملطیہ کہا جانے لگا اور پھر ملتان۔"

"ملتان" عربی لفظ ہے اور اس کے معنی "دو نیزوں کے برابر" ہیں۔ اس علاقے کو یہ نام محمد بن قاسم نے دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک حوض میں محمد بن قاسم کو ایک پوشیدہ خزانہ ملا تھا۔ یہ حوض دو نیزوں کے برابر لمبا، اسی قدر چوڑا اور اتنا ہی گہرا تھا۔ پھر یہی "ملتان" بعد میں ملتان ہو گیا۔

سندھ اور ملتان کے قدیم باشندے محمد بن قاسم کے حملے سے قبل ہندو مت کے پیروکار تھے۔ اسلام یہاں بھی صوفیائے کرام کے قدموں کی برکت سے پھیلا۔ ان میں بابا فرید گنج شکرؒ شیخ رکن عالمؒ شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ اور ان کے صاحب زادے صدر الدین عارفؒ بھی شامل ہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ یہ صوفی تھے اور شاعر بھی! انہوں نے سرائیکی کے علاوہ اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ یہ چشتیہ سلسلے سے تھے اس لیے "سماع" ان کے نزدیک جائز تھا۔ اس علاقے کی قدیم روایات اور محل و وقوع کے سبب سماع یعنی قوالی نے "دھمال" کی شکل اختیار کر لی۔

میں نے اس روز موسیٰ پاک شہیدؒ کے مزار مبارک پر بھی فاتحہ پڑھی۔ مزار کے برابر اندرون پاک دروازہ مسجد نوحیہ تھی۔

شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کا مقبرہ مجھے فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوا۔ میں نے اس مقبرے کے بارے میں پڑھا تھا کہ شیخؒ نے اپنی زندگی ہی میں یہ مقبرہ خود بنوایا تھا۔ بعد میں یہیں ان کی تدفین ہوئی۔ یہ نقش بندی سلسلے سے تھے تصوف کا یہ سلسلہ "سماع" کا قائل نہیں۔ شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ شاعر بھی تھے۔ ان کا فارسی دیوان میں نے پڑھا تھا۔ شیخ کے صاحب زادے صدر الدین عارفؒ کا مزار اپنے والد محترم کے پہلو میں ہے۔ یہ "سماع" کے قائل تھے۔

یہ شہر کیوں کہ صوفیائے کرامؒ مبلغین اور شعراء کا شہر تھا۔ یہاں بزرگانِ دین آتے رہے اسی لیے یہ ہمیشہ علمی و ادبی مرکز بنا رہا۔ انہی بزرگانِ دین کے طفیل وہ فنون بھی یہاں متعارف ہوئے جنہوں نے یہاں کی معاشرت پر گہرا اثر چھوڑا۔ انہی بزرگوں نے فنِ تعمیر، کاشی گری، نقاشی، خطاطی، کوزہ گری، قالین بافی جیسے مفید فنون بھی یہاں کے باشندوں کو سکھائے۔ اس کے علاوہ شہ سواری، پہلوانی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی کی عملی تعلیم بھی دی۔

میں نے یہاں کے باشندوں کو راست باز، صاف دل، صلح پسند، محنتی، ذہین اور اپنے عقائد میں پختہ پایا۔ ان کا فطری مزاج یہی تھا، مگر انگریز نے اپنی شاطرانہ و عیارانہ چالوں سے سارے ہندوستان کی طرح یہاں بھی نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے تھے۔

اسی شہر کے تعلق سے ایک اور دلچسپ ذکر "بیرون حرم" اور "اندرون حرم" کا ہے۔ میں نے ایسی تخصیص کسی اور شہر میں نہیں پائی۔ "بیرونِ حرم" شہر کا وہ حصہ کہلاتا تھا جہاں شہر کی آبادی میں طوائفوں کی سکونت ممنوع تھی۔ حرم دراصل عربی لفظ ہے اور اس احاطے کو کہا جاتا ہے جو خانہ کعبہ کے گرداگرد ہے۔ جب یہ لفظ سفر کرتا ہوا فارس یعنی ایران پہنچا تو اس کے معنی بدل گئے (حرمت کی رعایت سے) فارسی زبان میں "حرم" مکان کے اندر رہنے والی اس منکوحہ عورت، کنیز، باندی یا لونڈی کو کہتے ہیں جو اپنے شوہر یا آقا کی خدمت گزار ہو اور اس کے صرف میں آ چکی ہو۔ ایران ہی کے زیرِ اثر عربوں نے بھی حرم بنائے۔ یہی لفظ ایران سے ہندوستان پہنچا تو تاریخی تناظر، تغیرِ وقت اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر اس کے معنی مزید بدل گئے (کنیزوں، باندیوں اور لونڈیوں کی رعایت سے) ہندوستان میں طوائفوں، داشتاؤں وغیرہ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا یعنی ان کے رہنے کی جگہ! انہی وجوہ کی بنا پر طوائفوں کے علاقے کو ملتان میں "اندرون حرم" کا نام دیا گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک مکرم لفظ تاریخ کے سفر میں کیا سے کیا بن گیا۔ بخت خاں نے اس روز ہمیں تقریباً سارا شہر ہی گھما دیا تاکہ آئندہ ہمیں اس کی زیادہ شناسائی نہ رہے۔ مغرب کے وقت ہم واپس احمد حسین کے گھر پہنچے۔

ملتان سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی، گہری ہریالی جس سے آنکھوں میں ٹھنڈک سی اُترتی محسوس ہوتی تھی اور ذہن میں طمانیت کا احساس بیدار ہو جاتا تھا۔ فضا میں ہر وقت بھینی بھینی اور میٹھی مہک گھلی رہتی۔ سخت گرمی کے باوجود خوش نما اور رنگ برنگے پرندوں کی چہکار، سائے کی فرحت لگی۔ ملتان کے بارے میں، میں نے "گرد، گرما، گدا و گورستان" والا مشہور مصرع سنا تھا کہ ملتان کے یہی چار تحفے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مجھے امیر خسروؒ کا ایک شعر بھی یاد تھا جس میں انہوں نے ملتان کو جنتِ نظیر کہا تھا۔ امیر خسرو بھی اس شہر قدیم میں آ کر رہ چکے تھے۔

یہاں کی زمین سونا اگلتی تھی، مگر غریب کاشتکاروں کے لیے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں صرف بھوک اُگتی تھی۔ دھرتی کا سینہ چیر کر اس سے فصلیں حاصل کرنے والے صرف افلاس و غربت کے کھلیان جمع کرتے تھے۔ ان کے لیے دق، سل اور دمے کی بیماریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سود در سود کی لعنتیں اس زرخیز علاقے کے کسانوں کے لیے انگریز کا سب سے بڑا تحفہ تھیں جو ۱۸۵۵ء کے ایکٹ نمبر اٹھائیس کی عطا تھیں۔

سود در سود کی یہ لعنت مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ختم کردی گئی تھی مگر انگریز حکمرانوں نے اسے دوبارہ رائج کردیا تھا۔ انگریز نے ہندو ساہوکاروں کو خوش کرنے اور مسلمانوں کو اقتصادی طور پر کمزور کرنے کے لیے' خاص طور پر مسلمان زمینداروں کی بیخ کنی کی خاطر سود در سود کی لعنت کو قانونی تحفظ فراہم کیا تھا۔ اسی سبب اس قانون کے بعد یہ صورت ہوگئی کہ چند سو روپوں کے عوض ہندو مہاجن' بنیے اور ساہوکار لاکھوں روپے کی ڈگریاں عدالت سے کرانے لگے۔ علی گڑھ کے ایک رئیس پر چند سو روپے کے عوض کئی لاکھ کی ڈگری ہوئی اور اس کی تمام جائیداد نیلام ہوگئی۔ کلکتہ ہائی کورٹ سے ایک ہندو مہاجن نے تین سو پچاس روپے کے قرضے کے عوض سوا سات لاکھ روپے کی ڈگری کرائی۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے چار سو روپے کے قرضے پر ایک مہاجن کے حق میں سترہ لاکھ روپے کی ڈگری جاری کی۔ یہ اسی طرح کی بات تھی جیسے زبردست مارے اور رونے نہ دے! یہی صورت حال ملتان میں بھی تھی۔ یہاں بھی ہندو ساہوکاروں نے سود در سود کا چکر چلا کر مسلمانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی ہی زمین پر مزدوروں کی طرح کام کرتے اور غلاموں کی طرح مہاجنوں اور ساہوکاروں کو خراج دیتے۔ انگریزوں نے ان بنیوں' ساہوکاروں اور مہاجنوں کو ایک قانون بنا کر وحشیانہ لوٹ کھسوٹ کی اجازت دے دی تھی۔

یہی وہ اسباب تھے کہ قدرت کے تراشیدہ اس خطہ بے مثل کو چند خون خوار انسانوں نے اکثریت کے لیے جہنم بنا دیا تھا۔ جب ہم ملتان پہنچے تو یہ شہر نفرت اور کشیدگی کی گرفت میں تھا۔ ہمارے ساتھی احمد حسین نے اس رات ہمیں بتایا کہ ملتان کے حالات جان بوجھ کر بے حد خراب کردیے گئے تھے۔ ہندو زمیندار اور انگریز انتظامیہ دانستہ حالات خراب کرکے ہندو مسلم تصادم کی راہ ہموار کررہی تھی۔

"مجھے امید نہیں کہ آپ کچھ کرسکیں گے۔" احمد حسین نے بخت خاں کو مخاطب کیا "آپ لوگ بہت دیر میں یہاں پہنچے۔ کسی وقت بھی لاوا پھوٹ سکتا ہے' کسی بھی وقت آگ بھڑک سکتی ہے' ایسی آگ' جو سب کچھ جلا ڈالے!"

"یہاں کے مقامی رہنما' میرا مطلب ہے کہ تحریک خلافت اور کانگریس کے مقامی رہنما کیوں خاموش ہیں؟ کیا وہ آنے والے طوفان کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں؟ انہیں احساس نہیں کہ کیا ہونے والا ہے!" جوگیندر نے سوال کیا۔

"بات یہ ہے کہ یہاں معاملات نے بالکل ہی مختلف رنگ اختیار کرلیا ہے۔" احمد حسین نے جواب دیا "بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ان معاملات کو دانستہ مختلف رنگ دے دیا گیا ہے۔ سارا معاملہ ایک ہندو ساہوکار اور اس کے چار مقروض کاشتکاروں کے درمیان تنازعے سے شروع ہوا۔ ایسے تنازعے عام ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جھگڑا اس نوعیت کا اٹھتا ہی رہتا ہے۔ بدقسمتی یہ کہ وہ ہندو ساہوکار کانگریسی ہے اور چاروں کاشتکار تحریک خلافت سے وابستہ ہیں۔ وہ چاروں ہی تحریک خلافت کے سرگرم و پُرجوش کارکن ہیں۔ جب یہ جھگڑا شروع ہوا تو تحریک خلافت کے مقامی رہنماؤں نے اس ساہوکار سے مل کر اسے سمجھانا چاہا کہ یہ جھگڑا نہ اٹھائے۔ تحریک خلافت کے رہنماؤں نے اپنے طور پر یہ بات کی تھی۔ ان غریب کاشتکاروں نے اس سلسلے میں تحریک کو بیچ میں لانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی مگر۔۔۔" احمد حسین خاموش ہوگیا۔

"مگر کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"مگر۔۔۔" احمد حسین نے جوگیندر کی طرف دیکھا' پھر معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "مگر معاف کیجیے گا جوگیندر بابو' یہاں معاملے کو دوسرا رنگ دے دیا گیا۔ اس ساہوکار نے پہلے دن تو وعدہ کرلیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور انگریز انتظامیہ کو اس معاملے میں مداخلت نہیں کرنے دے گا لیکن اگلے ہی روز ان چاروں کو گرفتار کرادیا۔ خلافت کے لیڈروں نے پھر اس سے بات کی تو اس نے انہیں دھتکار دیا۔ پھر یہ لیڈر' دوسرے کانگریسی ہندو لیڈروں کے پاس گئے مگر وہ بھی سب کے سب ساہوکار ہی ہیں۔ وہ اس معاملے میں کوئی تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اسے ہندو مسلم تفرقے کا رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ تحریک خلافت سے کانگریس کے تعاون کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کانگریسی ہندو' مسلمانوں کے حق میں اپنے قانونی حقوق سے بھی دستبردار ہوجائیں۔"

"یہ طبقاتی تحفظ کا معاملہ ہے میرے دوست!" جوگیندر نے کہا "مسلمان کاشتکاروں کی جگہ اگر ہندو کاشتکار بھی ہوتے تو بھی ان ساہوکاروں کا یہی رویہ ہوتا۔ ساہوکار کی نہ کوئی سیاسی جماعت ہوتی ہے' نہ کوئی دین دھرم! ساہوکار بس ساہوکار ہوتا ہے۔ یہ دنیا بنیادی طور پر صرف دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ظالم اور مظلوم کے طبقوں میں!"

"اور اب کیا صورت حال ہے؟" بخت خاں نے دریافت کیا۔

"اب بدقسمتی یہ ہے کہ وہ چاروں کاشتکار تو رہا ہوگئے۔" احمد حسین بتانے لگا "ان چاروں کی رہائی کے بعد ایک ہندو زمیندار کے یہاں ڈاکا پڑا۔ زمینداروں اور ساہوکاروں نے اس پر ہنگامہ کھڑا کردیا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ ڈاکا مسلمانوں نے جوابی کارروائی کے طور پر مارا ہے۔ اب ان دنوں یہ زمیندار اور مہاجن افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ مسلمان بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ جمع کررہے ہیں۔ میں بہرحال پوری دیانت سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ افواہیں قطعی غلط ہیں البتہ یہ افواہیں پھیلا کر وہ خود اسلحہ جمع کررہے ہیں۔"

اس کے بعد یہ طے ہوا کہ میں' بخت خاں' جوگیندر اور سیتا ایک وفد کی شکل میں کانگریس کے مقامی لیڈروں سے ملیں گے۔

آیندہ روز ہم نے اسی پر عمل کیا۔ انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا' قومی اتحاد کی اہمیت سمجھائی اور پھر انہیں سمجھایا کہ وہ ملتان میں بھائی چارہ قائم کرنے کی خاطر اس شہر کو کشت و خون سے بچانے کے لیے مسلمانوں سے راضی نامہ کرلیں۔ یہ مہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے جلالی مہم سے قدرے مختلف تھی۔ اس میں طاقت کے استعمال کی بجائے ذہنی صلاحیتوں کی آزمائش تھی۔ کانگریسی لیڈروں نے ہمیں جواب دیا کہ اگر مسلمان اس پر تیار ہوجائیں تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

وہاں سے ہم خوشی خوشی مسلمان لیڈروں کے پاس آئے۔ ان سب کو احمد حسین نے پہلے ہی تحریک خلافت کے دفتر میں جمع کرلیا تھا۔ ان میں ملتان کے قریبی دیہی آبادیوں کے زمیندار اور بااثر افراد کے علاوہ شہر کے معزز افراد بھی تھے۔ ہم نے ان سبھی کو ہندو کانگریسی لیڈروں سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس پر انہوں نے بھی بہت مسرت کا اظہار کیا۔ طے یہ ہوا کہ اسی روز بعد مغرب دونوں طرف کے سرکردہ لیڈر مل بیٹھیں گے پھر مکمل صلح' ہم آہنگی اور بھائی چارے کا اعلان کردیں گے۔ اس ملاقات کے لیے انہوں نے مقام کا تعین ہندو رہنماؤں پر چھوڑ دیا۔

ہم ان کی رضامندی کے بعد جب ہندو لیڈروں کے پاس پہنچے تو وہاں ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ ہم نے اپنی دانست میں انہیں اتحاد کی خوش خبری سنائی تو انہوں نے کہا۔ تم لوگ خلافتیوں کے ایجنٹ ہو۔ ان کے لہجے میں رکھائی تھی "تم ہمیں بے وقوف بنانے آئے ہو۔" ایک لیڈر بولا "بس سیدھے یہاں سے چلے جاؤ! ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ آس پاس کے مسلمان باغی زمینداروں کے لیے ہتھیار لے کر آئے ہو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چاچا جی!" سیتا نے اس بوڑھے ہندو ساہوکار سے کہا۔ جس نے ہندو ساہوکاروں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہم پر اسلحہ لانے کا الزام لگایا تھا۔ اس کا نام رام مورتی تھا۔

"تم نہ بولو سیتا!" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "رام مورتی جی! آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے' بہکایا ہے!"

"بس میں نے کہہ دیا کہ چلے جاؤ! ہم سب جانتے ہیں' سب کچھ معلوم ہے ہمیں! تم لوگوں نے ہندوؤں کے خون سے ہولی کھیلنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہم تمہاری چال اچھی طرح سمجھ گئے ہیں! تم لوگ ہم کو دھوکا نہیں دے سکتے!" رام مورتی آپ ہی آپ غصے سے بل کھا رہا تھا۔

پھر میں نے' بخت خاں اور جوگیندر نے انہیں بہت سمجھایا مگر ان لوگوں کو نہ معلوم کس نے پٹی پڑھائی تھی کہ وہ ہماری کوئی بات سننے کے روادار ہی نہ تھے۔ وہ سب یہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ہتھیار لے کر آئے ہیں۔

اس پر جوگیندر جھلا کر بولا "تم سب انگریزوں کے پٹھو ہو! تم بلاوجہ افواہیں پھیلا کر یہاں والوں کو آگ اور خون میں نہلانا چاہتے ہو' لوگوں کے گھروں اور ان کی املاک کو نذرِ آتش کرکے نفرت کا الاؤ بھڑکانا چاہتے ہو!"

جوگیندر کی بات پر وہاں موجود ساہوکاروں نے اور بھی سخت رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں' ہندو مسلم اتحاد کی بجائے صرف ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے لیے کررہے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ جھک گئے یا انہوں نے ذرا سی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو ان کے مزارع شیر ہوجائیں گے اور انہوں نے جو رقوم قرض دی ہیں' ڈوب جائیں گی۔

"ہم کانگریس کی خاطر اپنے قانونی حق سے دستبردار نہیں ہوں گے!" رام مورتی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"یہ کون کہتا ہے!" بخت خاں نے کہا "ہماری تو آپ سے اتنی گزارش ہے کہ برسوں بعد جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا ہے اسے قائم رکھیں۔"

"اور پھر یہ مسلمان اپنے افغان مسلمان بھائیوں کی مدد سے اس ملک پر قبضہ کرلیں' کیوں!" رام مورتی نے زہر اگلا۔ پھر اس نے ریشمی رومال تحریک کا ذکر کیا۔ اس تحریک میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا اور اس کی ناکامی کو

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ ۱۹۱۴ء کی بات تھی یعنی صرف چھے سال پہلے کی بات! ۱۹۱۴ء میں ریشمی رومال تحریک شیخ الہند کی قیادت میں ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے شروع ہوئی اور یہ خفیہ تحریک ملتان ہی کے نواب کی غداری کے سبب دو سال بعد ہی ۱۹۱۶ء میں ناکام ہو گئی۔ ملتان کے اس نواب نے نہایت عیاری کے ساتھ ریشمی رومال تحریک کا بھانڈا پھوڑ کر انگریز کی نمک حلالی کا ثبوت دیا تھا۔ اس خفیہ تحریک کی ناکامی سے مسلمانوں کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا تھا اور جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پسنا پڑتا ہے' کچھ ہندوؤں کو بھی سزائیں بھگتنا پڑی تھیں۔ جہاں پورے ہندوستان میں پکڑ دھکڑ اور سزاؤں کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ وہاں پنجاب اور سندھ بھی اس کی لپیٹ میں آنے سے نہیں بچے تھے۔ سندھ ان دنوں الگ صوبہ نہیں تھا بلکہ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ بہت بعد میں سر عبداللہ ہارون کی کوششوں سے ۱۹۳۶ء میں یہ الگ صوبہ بنایا گیا تھا۔ سندھ کے جید رہنما مولانا عبید اللہ سندھی جو شیخ الہند کے شاگرد تھے۔ ریشمی رومال تحریک کے دوران میں مدرسہ پیر جھنڈو کے مہتمم تھے۔

یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی ہی کو آزادی کی اس تحریک کے سلسلے میں انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کی خاطر کابل بھیجا گیا تھا۔ رام مورتی وہی حوالہ دے رہا تھا۔ ہندو لیڈر آچاریہ کرپلانی کے نو مسلم بھائی شیخ عبدالرحیم کا تعلق حیدر آباد سے تھا' وہ بھی مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ افغانستان گئے تھے۔ اس تحریک کے سلسلے میں اندرون ملک جو بغاوت کے مراکز قائم کیے گئے تھے۔ ان میں سے دو سندھ میں تھے۔ سندھ اور بلوچستان کے لیے امروٹ ضلع سکھر میں مرکز تھا جس کے امیر مولانا تاج محمود امروٹی تھے۔ کراچی' لسبیلہ اور قلات کا مرکز کراچی میں تھا۔ جس کے امیر کھڈہ کراچی کے مولانا محمد صادق تھے۔ اسی تحریک کی ناکامی کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی کو جلاوطن کر دیا گیا تھا اور اب بھی وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جید عالم اور تحریک آزادی کے روح رواں مولانا تاج محمود امروٹی ابھی حیات تھے۔ اب وہ خلافت تحریک سے وابستہ تھے۔ اس بزرگ رہنما کی عمر ۸۷ سال تھی۔ جب ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو اس ضعیف العمر رہنما نے کلکتہ' بمبئی اور علی گڑھ تک سفر تحریک کی خاطر کیا۔ مولانا تاج محمود امروٹی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے رہنما ہی سندھ اور پنجاب کی آبرو تھے اور رام مورتی اپنا ہی راگ الاپے جا رہا تھا۔

رام مورتی اب بڑی نفرت و حقارت کے ساتھ کہہ رہا تھا "تم مسلے بڑے دغاباز ہو' بغل میں چھری رکھ کر منہ سے رام رام جپتے ہو۔"

ہم اس وقت ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ہم مشرق اور مغرب کے فاصلوں پر تھے۔ تنگ آ کر جوگیندر نے کہا "سنو رام مورتی! میں ہندو ہوں۔ میں نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میرا خاندان برہمن ہے۔ یہ میری بہن ہے سیتا! میں اس کی سوگند (قسم) کھاتا ہوں' اگر یہاں ملتان میں ایک بھی انسان کا خون بہا' خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور۔ اگر تمہاری اور انگریز کی ملی بھگت سے انسانی لہو کی ایک بوند بھی زمین پر گری تو میں۔ میں اپنے ہاتھوں سے تیری تکا بوٹی کردوں گا! یاد رکھنا رام مورتی ایک برہمن زادے نے اپنی بہن کی سوگند کھائی ہے۔" جوگیندر کا لہجہ اس وقت بڑا خوفناک اور سرد تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ رام مورتی کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا "سنا تم لوگوں نے!۔ سنا تم نے!" رام مورتی نے وہاں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا "یاد رکھنا اس نے کیا کہا ہے گواہ رہنا کہ۔ کہ اس نے کیا کہا ہے۔"

"ابے ان سے کیا کہہ رہا ہے!" جوگیندر واقعی بے حد برہم ہو گیا تھا "کہے تو لکھ کر دے دوں رام مورتی' ملیچھ (ناپاک) ذلیل!" وہ غصے سے کانپ رہا تھا "پھر سن لے کہ اگر اس شہر کی زمین پر انسانی خون کی ایک بوند بھی گری تو' تو زندہ نہیں رہے گا!" ہم سب نہایت شکستہ دل' افسردہ و ملول اور تھکے تھکے وہاں سے لوٹے۔ ہم پر شکست کا احساس غالب تھا۔ ہم نے خلافت کے لیڈروں اور مسلمان زمینداروں کو اپنی ناکامی سے آگاہ کیا اور احمد حسین کے گھر آ گئے۔

اُمید کی وہ کرن جو کانگریسی لیڈروں سے پہلی ملاقات میں پیدا ہوئی تھی' قتل ہو چکی تھی۔ اس کا تازہ تازہ خون شفق بن کر آسمان پر پھیل گیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور تاریکیاں پھیلتی' بڑھتی جا رہی تھیں۔ ذرا ہی دیر کے بعد قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر!۔ اللہ اکبر!"

"بے شک اللہ بڑا ہے۔" میں بڑبڑایا اور پھر ہم سبھی وضو کرنے کے لیے اُٹھ گئے۔ ہمارے ہی ساتھ سیتا بھی تھی جو مسلمان ہو چکی تھی۔ جوگیندر البتہ ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔

اس روز پہلی بار ساتھیوں پر یہ انکشاف ہوا کہ سیتا مسلمان ہو چکی ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے۔ اس کا اسلام قبول کر لینا ہندوؤں سے چھپانا مصلحت ہو سکتی تھی

لیکن اپنوں سے اسے راز میں رکھنا ضروری نہیں تھا۔ ہم سبھی ایک دوسرے کے رازدار اور محبتوں کے امین تھے۔ نیو' حیدر علی' میں سیتا اور بخت خاں ہم سب ایک ساتھ کھڑے تھے اور احمد حسین نماز پڑھا رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد دل کو سکون سا محسوس ہوا۔ دل پر مایوسی کی جو تاریکی تھی' چھٹ گئی۔ ابلیس کا مادہ ابلاس ہے جس کے معنی انتہائی تاریکی ہیں۔ پروردگار نے اسی لیے عزازیل کو ابلیس کہا کہ وہ دلوں کو تاریک کرتا ہے۔ دلوں کو مایوسیوں سے بھر دیتا ہے۔ ابلیس اندھیرے اور مایوسی کی علامت ہے۔ وہی دلوں میں وسوسے ڈال کر آدمی کو خدا کی رحمت سے مایوس کرتا ہے اور پھر کفر کے اندھیروں میں گھسیٹ لیتا ہے۔ نماز خدا کی رحمت پر یقین ہے۔ سو یقین کی یہی طاقت روشنی بن کر اندھیرے کو نگل جاتی ہے۔ نماز سے ابلیس دور بھاگتا ہے' یہ اسی لیے تو کہا گیا ہے۔ خدا نے جو مقسوم کر دیا تھا اسے تو کون ٹالتا' مگر یہ ضرور ہوا کہ اس وقت یقیناً بددلی اور مایوسی ختم ہو گئی اور یہ نماز ہی کی برکت تھی۔ ہم اس شکست سے اگر بددل ہو جاتے تو پھر گویا ہم اپنے مقصد سے مخلص نہیں تھے' ہم نے اپنی تنظیم کی روح کو نہیں سمجھا تھا۔ ہم مایوسیوں' ناکامیوں اور ناامیدی کے ماحول ہی میں تو مصروف جدوجہد تھے۔ ہم نے جو راہ اختیار کی تھی وہ انہی مایوسیوں اور رکاوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ ہم اس بات سے بھی واقف تھے کہ آخری فیصلہ کن جنگ میں شاید ہم نہیں ہوں گے۔ ہم تو ان مجاہدین کے لیے ہراول کا کام کر رہے تھے۔ جنہیں فتح یاب ہونا تھا جنہیں اس دیس کے دشمنوں کو فیصلہ کن شکست دینا تھی' جنہیں اس ملک میں غیر ملکی راج کی میت کو دفن کرنا تھا۔ جنہیں فرنگی اقتدار کی ارتھی کو چتا پر رکھ کر پھونکنا تھا۔

نماز پڑھنے کے کچھ ہی دیر کے بعد مجھے اسنی کی مخصوص خوشبو اپنے گرد چکراتی محسوس ہوئی۔ اس سے گفتگو کرنے یا کچھ کہنے کے لیے مجھے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ دلوں کے بھید جان لینے والی اسنی کچھ کہے بغیر بھی سب کچھ جان لیتی تھی۔ اس کی خوشبو سے ایک لطیف سا احساس میرے وجود میں کروٹیں لینے لگتا تھا۔ اس کا سبب یقیناً یہی رہا ہو گا کہ اس سے میرا رشتہ بہت قریب کا تھا۔ وہ میرے باپ ماموس کی بہن تھی۔ اس ناتے میں بھی تو اسی کی خوشبو' اسی کا رنگ' اسی کا آئینہ تھا' ایسا آئینہ جس میں وہ اپنے مرحوم بھائی کا عکس دیکھتی ہو گی۔ میرے گرد لوگوں کی موجودگی کبھی اس کی اور میری ملاقات یا گفتگو میں حارج نہیں ہوئی۔ جو کچھ میرے ذہن میں ہوتا وہ جان لیتی اور جو کچھ وہ کہتی میں سُن لیتا۔ یہ گفتگو باطن کی گفتگو ہوتی' ظاہر کی نہیں اور باطن ہی تو سب کچھ ہے ظاہر میں کیا رکھا ہے۔

"طارنوش!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہمت نہ ہارنا کہ تم خیر کی راہ پر ہو۔ اور سُنو کہ ضروری نہیں خیر ہی کو ہمیشہ شر کے مقابل فتح نصیب ہو۔ ہاں میں سمجھ رہی ہوں کہ تمہارے لیے یہ بات عجیب ہے۔ میرے بچے! فتح و شکست کا انحصار عمل اور ردعمل پر ہے۔ تمہاری یہ قوم جو اس خطہ زمین پر بستی ہے کہ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے' یہ اپنے اعمال ہی کی فصل کاٹ رہی ہے۔ تقدیر اعمال کی پابند ہے' کوئی جامد شے نہیں' سو اعمال ہی سے تقدیر کا تعین ہوتا ہے۔ وہ لوگ رب کعبہ کی قسم جھوٹے ہیں جو اپنی بے عملی کو تقدیر کا نوشتہ گردانتے ہیں۔ انفرادی خیر' اجتماعی خیر سے کم تر ہے۔ تو اگر اجتماع بے عمل ہے یا عمل کا رخ خیر کی طرف نہیں پھر بھلا انفرادی خیر اجتماع پر کس طرح غالب آ سکتی ہے! مگر کیوں کہ فرد ہی سے افراد' گروہ اور قبیلے وجود میں آتے ہیں اس لیے انفرادی خیر کی تلقین کی جاتی ہے اور میں تمہیں بھی یہی تلقین کرتی ہوں کہ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر نیکی اور بھلائی کے لیے جدوجہد کرتے رہو۔"

"اسنی! کیا تمہارے اس اشارے کو ہم اپنی شکست کی پیش گوئی خیال کریں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ابھی جو تلقین کی' تم اس سے انحراف کر رہے ہو طارنوش! اس کے باوجود میری محبت مجبور کر رہی ہے کہ تمہیں تمہارے سوال کا جواب دے دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ آنے والا وقت تمہارے سوال کا جواب ہے کہ تم اپنی مہم میں کامیاب رہو گے یا نہیں! میں نے آج محسوس کیا کہ تم کچھ پریشان ہو تو تمہیں سمجھانے چلی آئی۔ میں تمہیں کس طرح پریشان دیکھ سکتی ہوں۔"

پھر اسنی خاصی دیر تک میرے اندر چھپے ہوئے وطن پرست انقلابی کو جوش دلاتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے ملتان میں مجاہد اوّل کی کمی پوری کر دی ہو۔

اگلے روز ہم سب ساتھی ملتان کے گلی کوچوں میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں جو سنجیدہ اور نیک نام تھے۔ اس کے علاوہ ہم نے جگہ جگہ تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لب لباب یہی تھا کہ ملتان کے باشندے آپس میں بھائی چارہ قائم رکھیں۔ ہمارا پیغام محبت کا پیغام تھا۔ اس نیک کام میں ملتان کے چند نوجوان بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے' ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ عام آدمی جو

امن و سکون چاہتا ہے اس نے ہماری ان باتوں کو توجہ سے سُنا ان کی اہمیت کو جانا۔

حیدر علی اور ٹیپو کے بارے میں مجھے پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ وہ دونوں بہترین مقرر بھی تھے۔ مجاہد اوّل کو یقیناً یہ اندازہ رہا ہو گا کہ ملتان کی مہم میں یہ ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ پھر اگر آدمی تقریر کا فن نہ بھی جانتا ہو اور جو اس کے دل میں ہو' وہی زبان پر ہو تو بھی اس کی بات دلوں پر اثر کرتی ہے۔ بخت خاں کا معاملہ یہی تھا' اس کی تقریر بے لاگ اور دل کی آواز لگتی تھی۔ ہرچند کہ اس میں زیادہ جذبات سے کھیلنے یا انہیں اُبھارنے کا وصف نہیں تھا۔ جوگیندر اور سیتا تو پہلے ہی سے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے ایک عرصے فیلڈ ورک کیا تھا۔ سیتا کی تقریر بھی صنف نازک ہونے کے ناتے ہندو حلقوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور مسلمان بھی اسے ہندو سمجھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ وہ متعصب ہندوؤں کو انہی کے دھرم کے حوالے دے کر بڑی کھری کھری سناتی تھی اور پھر راہ راست پر آجانے کی تلقین کرتی تھی۔ ان تقریروں میں بخت خاں' میں' ٹیپو اور حیدر علی نیز سیتا اور جوگیندر دو مختلف انداز سے ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ جوگیندر اور سیتا بار بار بڑے اعتماد سے ایک ہی بات گھما پھرا کر مختلف انداز میں کہہ رہے تھے تاکہ لوگ ان کی باتوں کو ذہن نشین کرلیں۔

"دوستو۔۔۔ دوستو!" جوگیندر لوگوں کو مخاطب کرتا "ذرا سوچیں' غور کریں اس وقت ملتان میں ایسی فضا پیدا کردی گئی ہے جس کی بنا پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ افواہیں پھیلائی گئی ہیں کہ مسلمانوں نے ہتھیار جمع کرلیے ہیں' لڑنے کے لیے بڑے بڑے چھرے بنائے ہیں۔ ہم پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ہتھیار لائے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ دوستو! یاد رکھو تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں' یہ جھگڑا ساہوکاروں' مہاجنوں اور کسانوں کے درمیان ہے۔ سنو دوستو! آج میں فضا میں انسانی خون اور جلے ہوئے مکانوں کی بو سونگھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ اس خون میں کسی ساہوکار کا خون شامل نہیں ہے۔ جلے ہوئے مکانوں میں کوئی مکان کسی مہاجن کا نہیں ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ ان ساہوکاروں اور مہاجنوں نے اپنے اور کاشتکاروں کے جھگڑے کو ہندو اور مسلمان کے درمیان جھگڑے میں تبدیل کردیا ہے۔ انہوں نے آپ کو غلط بتایا ہے کہ آپ کے دھرم کو خطرہ ہے۔ یہ غلط ہے کہ ہندو اور مسلمان جب ایک دوسرے کو قتل کررہے ہوں گے تو وہ اپنے دھرم کے لیے جنگ کررہے ہوں گے۔ میں بتاتا ہوں کہ اس میں صرف کاشتکار' مزدور اور غریب کا خون بہے گا۔ قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں ہی مظلوم ہوں گے۔ ظالم اپنی حویلیوں میں قہقہے لگا رہے ہوں گے۔ کوئی ساہوکار یا مہاجن قتل نہیں ہو گا۔ یقین جانو تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں۔ تمہارا جھگڑا تو اس درندے سے ہے جو نہ کانگریسی ہے نہ خلافتی' نہ ہندو ہے نہ مسلمان' جو صرف ساہوکار اور مہاجن ہے۔ جو سود خور ہے۔ جو تمہارا خون چوستا ہے اور تمہارے ہاتھوں سے روٹی چھین لیتا ہے۔"

اور میں اپنی تقریر میں سیاسی حالات پر روشنی ڈال رہا تھا۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ ہم اتنی دور سے محض اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں پتا چلا تھا' یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی فضا تیار کی گئی ہے۔ میں نے بتایا کہ انگریز نے اپنے پٹھوؤں کے ساتھ مل کر پورے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے فرقہ ورانہ فسادات کی آگ بھڑکانے کی سازش تیار کی ہے کیوں کہ اسے ہندوستان کی ان دو قوموں کا اتحاد پسند نہیں۔ یہ اتحاد اس کے لیے خطرہ ہے اگر یہ اتحاد قائم رہا تو پھر وہ لوٹ مار نہیں کرسکے گا۔

دن بھر کی تگ و دو کے بعد ہم کچھ مطمئن تھے۔ لوگوں کی سمجھ میں ہماری باتیں آرہی تھیں' ان لوگوں کی سمجھ میں جو امن اور سکون چاہتے تھے۔ شام تک ملتان کے گلی کوچوں سے ہندو مسلم اتحاد کے نعرے اُبھر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ٹولیاں بنا کر گلی محلوں میں نعرے لگاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ بچے جو امن اور معصومیت کی علامت ہوتے ہیں! ہم اس وقت خلافت کے دفتر میں بیٹھے تھے اور لوگ ہم سے آکر مل رہے تھے۔ نوجوانوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ اسی دوران میں ہمیں اطلاع ملی کہ ہندو ساہوکاروں میں سخت خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ہرکارے آس پاس کی بستیوں میں دوڑا دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریز انتظامیہ کے اعلیٰ افسران سے بھی رابطے کیے جارہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ہم نے وہ فرقہ وارانہ کشیدگی جو گزشتہ روز محسوس کی تھی اس وقت محبت و یگانگت سے بدل گئی تھی۔ اس کا احساس احمد حسین نے دلایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کوئی ایک ماہ بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو نوجوان بھی تحریک کے دفتر میں آرہے ہیں۔

"بس دو تین دن ہمیں اور مل گئے تو ہم اس زہر کو جو یہاں گھول دیا گیا ہے ختم کردیں گے۔" بخت خاں نے کہا۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ انگریز اور اس کے پٹھو ہمیں اتنی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے کہ احمد حسین نے ہمیں جھنجوڑ کر بیدار کردیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج اور پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ ملتان اور اردگرد کی آبادیوں کے مسلمان زمینداروں کے مکانات کو گھیر لیا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس وقت رام مورتی کے گھر ہے بہتر ہے کہ تم سب یہاں سے فرار ہوجاؤ۔"

"مگر کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"احتیاطاً" اس نے جواب دیا "میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ گرفتار کرلیے جاؤ۔ تمہاری حفاظت میری ذمے داری ہے۔"

"مگر اس وقت ہم کہاں جائیں گے؟" بخت خاں بولا۔

"میں نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا ہے۔" احمد حسین نے کہا۔

پھر ہم سب احمد حسین کے گھر سے ایک نوجوان کی رہبری میں نکلے۔ ابھی ہم ایک گلی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ہم نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں نے گلی کے نکڑ سے پلٹ کر دیکھا۔ دور اندھیرے میں فوج اور پولیس کا ایک ایک دستہ احمد حسین کے مکان پر پہنچ چکا تھا۔ ہم تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ چند منٹ بعد ہم مختلف گلیوں اور کوچوں سے گزر کر ایک مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ اس مرتبہ ہم اپنے ایک تنظیمی ساتھی ہوشو شیدی کے مہمان تھے۔ ہوش محمد شیدی' سندھ کا ایک جاں باز مجاہد تھا۔ اسی کو ہوشو شیدی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس سرفروش نے سرزمین سندھ پر انگریز جنرل نیپئر سے ٹکرلی تھی۔ مکران کے اسی جواں مرد ہوشو شیدی کا نام ملتان کے اس تنظیمی ساتھی نے اپنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اصل نام کچھ اور ہی رہا ہو گا۔ بہت بعد میں اسی جنرل نیپئر کے نام پر کراچی کے ایک راستے کا نام "نیپئر روڈ" رکھا گیا۔

صبح ہمیں اطلاع ملی کہ انگریز فوج اور پولیس نے کئی مسلمان گھروں کی تلاشی لی ہے اور کئی افراد کو گرفتار کرلیا ہے۔ فوج اور پولیس ہتھیاروں کی تلاش میں تھی۔ جب مشتبہ افراد کے گھروں سے ہتھیار برآمد نہیں ہوئے تو خلافت کے دفتر کی تلاشی لی گئی۔ وہاں بھی ناکامی ہوئی تو فوج اور پولیس نے قریبی مسجد میں گھس کر تلاشی لی مگر کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ ایک مسلمان کے گھر کے کاٹھ کباڑ سے ایک زنگ آلود چھرا برآمد ہوا۔ کئی مسلمانوں کو پولیس نے گرفتار کرلیا۔ گرفتار شدگان میں علی حمزہ بھی شامل تھا۔ علی حمزہ کو مسجد سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی عمر ستر برس تھی اور اس کے جرائم میں ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ وہ شاعر بھی تھا۔ گوہر تخلص کرتا تھا۔ وہ ایسے شعر کہتا تھا جو مسلمانوں کے ماضی کو یاد دلاتے تھے۔

علی حمزہ مسلمانوں ہی میں نہیں ہندوؤں میں بھی بہت عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ علامہ اقبال کے مداحوں میں سے تھا اور اس کے اشعار میں اقبال کے شعروں کی گونج محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت تک علامہ اقبال نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا مگر بہ حیثیت شاعر مقبول و مشہور ہوچکے تھے۔ اقبال کے شعر بہ طور تحفہ ملتان آتے تھے۔ علامہ کی سکونت لاہور میں تھی جہاں سے ہم ملتان پہنچے تھے۔ علامہ سے ملنے کی میری بڑی خواہش تھی کیوں کہ ان کا فارسی کلام میری نظر سے گزر چکا تھا مگر لاہور کے دوران قیام میں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ میں اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ علی حمزہ کو اقبال کے اشعار کا حافظ سمجھا جاتا تھا۔ شاعر ہونے کے علاوہ علی حمزہ مذہبی رہنما بھی تھا اور ایک ایسا زمیندار بھی جو مسلمان کاشتکاروں کا رہنما کہلاتا تھا۔

مسجد کی بے حرمتی اور علی حمزہ کی گرفتاری کی خبر سے ملتان اور اس کے گردونواح میں اشتعال پھیل گیا تھا۔ خصوصاً کاشتکار بہت مشتعل تھے۔ ان کو مزید مشتعل کرنے کے لیے' ان کا مذاق اُڑانے کے لیے ملتان کے مہاجنوں نے اپنے کارندوں سے کام لیا۔

فوج اور پولیس بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کرکے خوش اور مطمئن تھی۔ انہوں نے ایک اسکول کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان کی حفاظت میں بیٹھا نئی چالیں چل رہا تھا۔ اس نے مہاجنوں کے ان کارندوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جو صبح ہی سے جتھوں کی صورت میں شہر کے گلی کوچوں اور آس پاس کے علاقوں میں دل آزار نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔

یہ سب کچھ تھا مگر ہماری گزشتہ دن بھر کی کارروائیوں اور تقریروں کا ابھی تک ملتان کے لوگوں پر اثر تھا۔ ہم سب تنظیمی ساتھی اور جوگیندر کے ساتھ ساتھ سیتا' سبھی پھر مصروف ہوگئے تھے۔ جوگیندر اور سیتا امن پسند اور سنجیدہ و معقولیت پسند ہندوؤں سے ملتے پھر رہے تھے۔ میں اور بخت خاں مسلمان زمینداروں اور کاشتکاروں کے رہنماؤں سے مل رہے تھے' انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کررہے تھے۔

ہماری ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں کی تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود امن اور سکون سے گزر گیا۔ ہم نے ہندو مہاجن اور انگریز گٹھ جوڑ کے خلاف پرامن محاذ بنالیا تھا۔

اگلے روز بھی ہماری یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ ہمیں ہوشو شیدی سے ایک تشویش ناک اطلاع ملی۔ اطلاع یہ تھی کہ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہماری ان کوششوں کی خبر ہوگئی ہے اور اس نے ہماری گرفتاری کے احکام جاری کردیئے ہیں۔ یہ احکام رام موہنی کی رپورٹ پر جاری کیے گئے تھے۔ جس میں اس نے جوگیندر کی جانب سے جان سے مار دینے کی دھمکی کا ذکر کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوشو شیدی کا نام بھی مشتبہ افراد میں آگیا تھا۔ اس کا گھر اب ہمارے لیے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہوشو نے ہمارے لیے ایک اور محفوظ پناہ گاہ کا بندوبست کردیا تھا۔ ہوشو کے گھر سے ہم وہاں منتقل ہوگئے۔

ہوشو واقعی ذہین شخص تھا۔ اس نے ہمارے لیے ایسی محفوظ جگہ کا بندوبست کیا تھا جہاں فوج اور پولیس کا دھیان بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ وہی اسکول تھا جسے عارضی طور پر فوج اور پولیس نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ہم اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے گھر منتقل ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کا یہ کوارٹر اسکول ہی کے احاطے میں ایک طرف بنا ہوا تھا۔ آمدورفت کے لیے اس کوارٹر میں ایک دروازہ ایسا بھی تھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا اور گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے اسکول کے احاطے سے گزرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احمد حسین اور ہوشو نے اس کوارٹر کے علاوہ بھی دو تین متبادل جگہیں بتائی تھیں۔ انہی میں سے ایک جگہ شیخ رکن عالم کے مقبرے کے شمال میں تھی۔ یہ ایک مسجد تھی جو اورنگ زیب عالمگیر نے اس شہر میں بنوائی تھی۔ ایک مسجد ہی سے علی حمزہ کی گرفتاری عمل میں آچکی تھی۔ انگریز مجسٹریٹ سے مسجد کے احترام کی توقع عبث ہی تھی۔ اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہوجاتا تو وہ فوجیوں کو مسجد میں داخل ہونے کا حکم دے دیتا اور ہماری گرفتاری سے قطع نظر مسجد کا تقدس خطرے میں پڑتا جو ہم نہیں چاہتے تھے۔ جو بھی متبادل جگہیں احمد حسین اور ہوشو شیدی نے ہمیں بتائیں' ان میں سے ہم نے اسی کوارٹر کو پسند کیا۔ بخت خاں نے بھی اسی کوارٹر کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ وہ بہرحال اس مہم کا نگراں تھا۔ یہ الگ بات کہ عملاً تمام ہی ساتھی ایک دوسرے سے برابری کی سطح پر تعاون کررہے تھے۔ ہمارے درمیان کوئی افضل و کمتر نہیں تھا۔ بخت خاں کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہمارا نگراں یا انچارج ہے اور ہم سب اس کا حکم ماننے کے پابند ہیں۔ اس کے باوجود نظم و ضبط وہی تھا جو ایک منظم گروہ کا ہونا چاہیے۔ میرے یا اس کے درمیان اب تک کوئی ایسا معاملہ درمیان میں نہیں آیا تھا کہ جس پر ہم دونوں کی آرا مختلف ہوں۔ بہ طور خاص میرے ساتھ اس کا رویہ ایسا تھا جیسے ہم کا نگراں وہ نہیں بلکہ میں ہوں۔ اس کوارٹر کی بابت بھی بخت خاں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوارٹر کیونکہ اسکول کے احاطے ہی میں ہے جسے انگریز فوج اور پولیس نے اپنا مستقر بنا رکھا ہے لہٰذا کسی کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ پولیس کو مطلوب افراد نے انہی کے قریب پناہ لی ہوگی۔ ہوشو نے بھی اسی لیے اس کوارٹر کا بندوبست کیا تھا۔ پھر یہ کہ ہیڈ ماسٹر سرکاری ملازم تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ حکومت کے مجرموں کو اپنے گھر میں پناہ دے گا۔ ویسے بھی وہ سرکاری حلقوں اور سرکار کے پٹھوؤں میں قابل اعتبار سمجھا جاتا تھا۔

اس کوارٹر میں منتقل ہونے کے بعد ہم ایک بار پھر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اس رات ہم نے دو بڑے بڑے پوسٹر اسکول کے احاطے کی دیوار اور بازار میں نمایاں جگہ چسپاں کیے۔ یہ پوسٹر وطن پرست انجمن کی جانب سے تھے جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس پر مبارکباد دی گئی تھی کہ انہوں نے مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں کی تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود امن و سکون قائم رکھ کر انگریز کی سازش ناکام بنادی اور ثابت کردیا کہ کوئی بھی ہندو مسلم اتحاد کو ختم نہیں کرسکتا۔

شہر میں ان پوسٹروں کی خوب شہرت ہوئی مگر اس پر جوابی کارروائی بھی خوب ہوئی۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں نے اسی دن محمد علی جوہر اور شوکت علی کے پتلے جلائے' خلافت تحریک کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگائے اور ہر وہ ترکیب آزمائی جس سے مسلمان مشتعل ہوسکتے تھے۔ دوسری طرف احمد حسین کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ شہر میں یہ اعلان کردیا گیا کہ آگرے سے آئے ہوئے پانچ نوجوانوں اور ایک لڑکی کو جو بھی پناہ دے گا اسے گرفتار کرلیا جائے گا اس کا تمام اثاثہ بہ حق سرکار ضبط کرلیا جائے گا۔ ہم نے ملتان میں اپنے متعلق یہی بتایا کہ ہمارا تعلق یوپی کے شہر آگرے سے ہے۔

ہم اب اپنی کوششوں کو قطعی اور فیصلہ کن رخ دینے

کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ان تین دنوں میں ہم نے اپنے نئے ساتھی ہوشو شیدی اور ایک دوسرے ساتھی کی مدد سے اردگرد کی آبادیوں کے کسانوں کو انگریزوں کے خلاف ایک منظم کارروائی کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔

اسی رات ہم اپنے منصوبے کو آخری شکل دے چکے تھے۔ رات کو بارہ بجے جب ملتان کے باشندے آرام کی نیند سو رہے تھے' فوج اور پولیس کے مستقر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی' ہم چار افراد ہیڈ ماسٹر کی آشیرواد (شاباشی) کے ساتھ باہر نکلے۔ جوگیندر اور سیتا کو ہم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد ہماری خفیہ پناہ گاہ کے دروازے پر کھڑا ہمیں اندھیرے میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں اور بخت خاں آگے تھے' نیپو اور حیدر علی ہمارے عقب میں تھے۔

اس رات پانچ سرکاری عمارتوں اور دفاتر کو نذر آتش کردیا گیا۔ تمام شہر میں جاگ ہوگئی۔ شور اور ہنگامہ مچ گیا۔ فوج اور پولیس کے دستے مختلف ٹکڑیوں میں ان مقامات پر پہنچ گئے جہاں یہ وارداتیں ہوئی تھیں۔ بہ یک وقت کئی جگہ آگ بھڑکنے کی وجہ سے آگ بجھانے والے عملے کو خاصی دقت پیش آرہی تھی۔

آتش زنی کے بعد ہم چاروں پھر اپنی کمیں گاہ پہنچے۔ اسکول کے احاطے میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف چند سنتری اسکول کے گیٹ پر پہرا دے رہے تھے۔ ہم نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ان پانچوں قیدیوں کو رہا کرایا جنہیں پوچھ گچھ کے لیے اسکول میں رکھا گیا تھا۔ ان قیدیوں میں احمد حسین بھی شامل تھا۔ ان پانچوں کی حالت بے حد خستہ تھی۔ ان کے جسموں کو گرم لوہے سے داغا گیا تھا۔ احمد حسین کی حالت سب سے زیادہ نازک تھی۔ اس کے سر کے بال جھلسے ہوئے تھے' سر اور ماتھے کی کھال جھلس کر سکڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ ان پانچوں کو ہم نے ایک تانگے کے ذریعے قریبی آبادی کی طرف روانہ کردیا۔

صبح بڑی چمکیلی اور روشن تھی۔ حالانکہ فضا میں اب بھی جلتی ہوئی عمارتوں کا دھواں موجود تھا۔ اس صبح ملتان کے باشندوں نے پھر شہر میں دو مقامات پر انجمن وطن پرست کے پوسٹر پڑھے۔ پھر ان پوسٹروں کا مضمون بہت جلد ہر شخص کی زبان پر آگیا حالانکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم پر ان پوسٹروں کو دیواروں سے اکھاڑ لیا گیا تھا۔ ان پوسٹروں کے ذریعے انجمن وطن پرست نے آتش زنی کی وارداتوں کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے دشمنوں کے خلاف اعلان جنگ بھی کیا تھا۔

میں اس وقت پوسٹ آفس کی سلگتی ہوئی عمارت کے پاس مجمع میں کھڑا تھا۔ میرے جسم پر اس وقت جو لباس تھا' اس سے میں ہندو معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ فوج اور پولیس لوگوں کو سلگتی ہوئی عمارت سے دور رکھے ہوئے تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب چند منٹ رہ گئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پیچھے ہٹ آیا۔ اب صرف پانچ منٹ باقی تھے۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک سمت سے لوگ بڑھے۔ وہ سب تحریک خلافت اور مولانا محمد علی جوہر کی حمایت میں نعرے لگارہے تھے۔ نعروں کی آوازیں سن کر جلتے ہوئے پوسٹ آفس کے سامنے جمع افراد چھٹنے لگے۔ پھر اسی طرح نعرے لگاتے ہوئے مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا "حملہ ہوگیا' حملہ ہوگیا!"

حملہ کہاں ہوا تھا' کس نے کیا تھا' اس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ پھر کیا تھا' بھگدڑ مچ گئی۔

پانچواں منٹ پورا ہوچکا تھا "وقت ہوگیا" میں نے آواز لگائی۔

اس بھگدڑ میں کسی کو احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کہ آواز لگانے والا میں تھا۔ ساتھ ہی میں نے چھوٹا سا پٹاخا سڑک پر پھینک دیا۔ وہ پٹاخا کسی کے جوتے کے نیچے آکر پھٹا۔ اس کے ساتھ ہی گلیوں سے کئی تھلے نکل کر پوسٹ آفس کے سامنے متعین فوجیوں اور پولیس والوں کے لگے۔ پھر پے در پے غلوں کے تین چار باڑھیں ماری گئیں۔ اسی وقت دوسری سمت سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے "حملہ ہوا ہے" آوازیں ابھریں۔

"کس طرف؟" کسی نے پوچھا۔

"ادھر" جواب آیا۔

"نہیں ادھر" کسی اور طرف سے آواز ابھری۔

فوج اور پولیس نے اپنی رائفلیں ادھر کردیں جدھر سے ان پر غلوں کی باڑھ پڑی تھی۔ لوگ پھر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ نعروں میں شدت آگئی۔ ہجوم اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتا ہوا ڈاک خانے کی سلگتی ہوئی عمارت کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اسی وقت دوسری سمت سے فوج اور پولیس پر غلوں کی باڑھ ماری گئی۔ ہوائی فائر کا حکم دیا گیا۔ ایک افراتفری مچ گئی۔ مجمع منتشر ہوگیا لیکن تھوڑی دور جاکر لوگ ٹھہر گئے۔

کسی نے انہیں سمجھایا تھا کہ موقع پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

نہیں ہے۔ اس لیے فوج اور پولیس مجمع پر فائرنگ نہیں کر سکتی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فوج اور پولیس کی بھاری جمعیت لے کر وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں نے اسے دیکھ کر پھر پُرجوش انداز میں ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائے۔

اب میں بھی اس مجمع میں شامل تھا بلکہ مجمع کی قیادت کر رہا تھا۔ میری ذمے داری یہ تھی کہ کم از کم ایک گھنٹے اور یہی ہنگامہ جاری رکھا جائے اور انتظامیہ کو یہ احساس دلایا جائے کہ اس وقت ملتان کا یہی مقام عوام کے اشتعال کا مرکز بنا ہوا ہے۔

ابھی اس ہنگامے کو صرف آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ ملتان کے تین مختلف علاقوں سے ایک دم سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف اُٹھتے نظر آئے "آگ، آگ!" اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ گویا اب میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ تین اور سرکاری دفاتر اور عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ پروگرام کے مطابق اب ہمیں وہاں سے منتشر ہو جانا تھا۔ مجمع سے اس مرتبہ کئی پتھر چلے، کئی پٹاخے چھوٹے۔ فوج اور پولیس نے جواب میں پھر ہوائی فائر کیے۔ اس کے بعد مجمع کو وہاں سے تتر بتر ہونا ہی تھا۔

اس دن شام تک شہر میں کئی جگہ چھاپے پڑے، کئی افراد گرفتار ہوئے مگر وہ لوگ جنھوں نے لوگوں کو جلوس کی شکل میں منظم کیا تھا، پولیس اور فوج کی پہلی ہوائی فائرنگ کے بعد ہی ملتان شہر سے فرار ہو چکے تھے۔ اب ان تک پہنچنا پولیس کے لیے کم از کم وقتی طور پر ممکن نہیں تھا۔ ان لوگوں میں ہوشو شیدی بھی شامل تھا۔

ملتان اور اس کے گرد و نواح میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہ بیشتر کاشتکار اور کھیت مزدور تھے۔ غربت و افلاس میں کفنائی ہوئی زندہ لاشیں تھیں۔ ہندو اگرچہ یہاں اقلیت میں تھے مگر مسلمانوں سے زیادہ بہتر حالت میں تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے یا پھر زمیندار، مہاجن، ساہوکار اور تاجر ہر شعبہ زندگی ان کے تابع تھا۔ اگر یہاں کے مسلمان اُٹھ کھڑے ہوتے اور ہندوؤں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیتے تو انھیں ہندوؤں کا صفایا کرنے میں دیر نہ لگتی۔ مگر ہندوؤں کو انگریز حکمرانوں کی حمایت اور تحفظ حاصل تھا۔ پھر تمام معیشت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے اپنی غربت اور پسماندگی، اپنی بے بسی اور کمزوری کا احساس کرتے ہوئے کبھی ہندوؤں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جسارت نہیں کی تھی۔ وہ خوف اور دہشت میں زندہ رہتے تھے۔ انھوں نے بھوک اور فاقہ کشی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس دن ہمارے پروگرام کے مطابق نواحی آبادیوں کے کاشتکاروں نے انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ انگریزوں سے ان کی یہ نفرت مذہبی بنیادوں پر تھی۔ وہ سب انگریز کے دشمن تھے کیوں کہ انگریز نے اس وقت کے سب سے مضبوط اور بڑے اسلامی ادارے یعنی خلافت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

اس دن کے مظاہرے کا سب سے خوش کن پہلو یہ تھا کہ میں نے تمام جوش و جذبے کے باوجود اس مجمع کو اپنے مقصد سے منحرف نہیں ہونے دیا تھا۔ مجمع نے اپنی تمام نفرت کا اظہار ہندو مسلم اتحاد کے دشمنوں کے خلاف کیا تھا حالانکہ گزشتہ دو روز کے دوران میں ہندو ساہوکاروں اور مہاجنوں کے کارندوں نے کئی مرتبہ جتھوں کی صورت میں گشت کرتے ہوئے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے تحریک خلافت اور اس کے لیڈروں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگائے تھے۔ اس دن ایک بھی نعرہ ہندوؤں کے خلاف نہیں لگایا گیا تھا۔ مجھے فخر تھا کہ اس دن میں نے اپنے منصوبے کے اس حصے کو نہایت کامیابی سے پورا کیا تھا۔ ہماری کامیابی کا انحصار اس بات پر تھا کہ جذبات کے ریلے کو ہندوؤں کی طرف نہ مُڑنے دیا۔

یہ پورا منصوبہ میرے ہی ذہن کی پیداوار تھا۔ عملاً اب بخت خاں خود بہ خود میرے زیرِ کمان آ گیا تھا۔ اس منصوبے کی منظوری کی حد تک تو وہ مہم کا نگراں ضرور رہا تھا۔ مگر منظوری کے بعد اس نے ایک عام تنظیمی رکن کی طرح خود ہی اپنے آپ کو میرے احکام کا پابند بنا لیا تھا۔ منصوبے کی نوعیت ایسی تھی کہ اس میں زیادہ افرادی قوت مطلوب تھی اس لیے جوگیندر تو جوگیندر، سیتا نے بھی عملی حصہ لیا تھا۔ وہ بخت خاں کے ساتھ ساتھ سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کرنے میں پیش پیش رہی تھی۔

بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ہم سب وقفے وقفے سے پھر ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے کوارٹر پہنچ چکے تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کو اپنی کارگزاریوں کی تفصیل سے آگاہ کر رہے تھے۔ سیتا مجھ سے ایک ایک تفصیل کرید کرید کر پوچھ رہی تھی کیوں کہ میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ کہ میں نے مجمع کو کیسے قابو میں رکھا اور کس طرح بے لگام نہیں ہونے دیا وغیرہ۔

"تم اگر عملی سیاست میں ہوتے تو ایک کامیاب لیڈر ہوتے۔" جوگیندر نے میری کارگزاری پر تبصرہ کیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا تھا۔ وہ بھی ایک انقلابی تھا۔ اس کا دل بھی آزادیٔ وطن کی خواہش سے الاؤ بنا ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چند ایسے سرفروش ملے تھے جو خود بھی گنگا پرشاد کی طرح آزادی کی خاطر جان سے گزرنے کو تیار تھے۔ شام تک ہمیں اپنی اس کامیابی کے نتائج کا علم ہو گیا۔ ستیش کی رپورٹ ان نتائج کی آئینہ دار تھی۔

ستیش ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کا شاگرد رہ چکا تھا اور ان دنوں ریلوے میں ملازم تھا۔ اس نے بتایا "سارا شہر ہندو مسلم اتحاد کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان گلے مل رہے ہیں۔ ہر طرف اعتماد اور محبت کی گرمی فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے پر بے اعتمادی اور خوف کا غبار دھل چکا ہے۔ ساہوکار اور مہاجن اس سے خوف زدہ ہیں۔ ان پر اس اتحاد کی دہشت بیٹھ گئی ہے۔ وہ فریادیں لے کر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس گئے ہیں۔ انھیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ خود انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، انگریز فوج اور پولیس کے ساتھ آنے والے انگریز افسران بوکھلا گئے ہیں۔" "یہ انگریز افسران لائیلپور (فیصل آباد) سے مزید پولیس والوں کو لے کر ملتان پہنچے تھے۔" ستیش نے ملتان کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے مزید بتایا "مگر ایک تشویش ناک بات یہ ہے کہ رائے بہادر دشتو کمار ملتان پہنچ چکا ہے اور خان بہادر حمید اللہ پہنچنے والا ہے۔"

میرے دریافت کرنے پر ستیش نے بتایا کہ یہ دونوں حضرات لیجسلیٹو کے رکن ہیں اور انگریز کے پٹھو ہیں۔ ان دونوں کا کام صرف یہی ہے کہ اس علاقے میں مستقل کشیدگی کی فضا قائم رکھی جائے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکیں۔ ان کی اس موقع پر ملتان میں آمد کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ حالات کو خراب کر دیا جائے۔

ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا "بہ ظاہر یہ دونوں افراد بے ضرر لگتے ہیں۔" گنگا پرشاد کہہ رہا تھا "دونوں ہی زبان کے بہت میٹھے ہیں لیکن ان کے من میں زہر ہی زہر بھرا ہوا ہے۔ یہ دونوں صرف انگریز کے ذہن سے سوچتے ہیں۔"

"تو کیا ان کی آمد سے واقعی پھر حالات بگڑ جانے کا خطرہ ہے؟" بخت خاں نے پوچھا۔

"ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔" گنگا پرشاد بولا "یہ

انگریز کے شکرے ہیں جنھیں وہ ہندوستانیوں کے شکار کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ یہ اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں اور پہلے اس کی آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں پھر انگریز آگے بڑھ کر مجروح کو شکار کر لیتا ہے۔"

تو کیا ان دونوں کی آمد سے ہماری تمام کوششیں خاک میں مل جائیں گی؟ کیا خلوص و محبت کی وہ لہر دم توڑ جائے گی جس میں اس وقت ملتان غسل کر رہا تھا اور اپنے وجود سے نفرتوں کا غبار دھو رہا تھا؟ کیا ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا؟ یہ اور ایسے ہی بے شمار تشویش ناک سوالات میرے ذہن میں کچوکے لگا رہے تھے۔

"یہ لوگ کس مقصد کے لیے آئے ہیں، ہمیں بہرحال اس کا علم ہونا ہی چاہیے تھا۔" جوگیندر ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ ہم لوگ اپنی کارگزاریوں پر خوش ہو رہے تھے مگر ان دو شیطانوں کی ملتان میں آمد نے ساری خوشی خاک میں ملا دی تھی۔

"دشتو کمار کہاں ٹھہرا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"رام مورتی کے یہاں، وہ دونوں گہرے دوست ہیں۔" ستیش نے میرے سوال کا جواب دیا "اور خان بہادر حمید اللہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ڈاک بنگلے میں ٹھہرتا ہے۔ یہاں آ کر یہ لوگ مقامی باشندوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ رائے بہادر دشتو کمار کسی مسلمان سے نہیں ملتا اور خان بہادر حمید اللہ کسی ہندو سے ملنے کا روادار نہیں۔ ایک ہندوؤں کا بہی خواہ بنتا ہے دوسرا مسلمانوں کا ہمدرد۔"

اس کے بعد ہم نے انجمن وطن پرست کی طرف سے دو خط لکھے اور ان کی دو دو نقلیں بنائیں، ایک خط خان بہادر حمید اللہ کو اور اسی عبارت کا دوسرا خط رائے بہادر دشتو کمار کے نام لکھا گیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ وہ ملتان کی فضا کو خراب نہ کریں، یہاں زہر نہ پھیلائیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر بھائیوں کی طرح رہنے دیں، مادرِ وطن کی کوکھ نہ اُجاڑیں، اپنے نطفے کو کسی انگریز ٹوڈی میں تلاش نہ کریں۔ ان کا باپ کوئی انگریز نہیں ہندوستانی تھا، ان کی ماں کوئی میم نہیں بلکہ اسی دھرتی کی تھی۔ ان کے نام ہم نے یہ خط نہایت سخت الفاظ میں لکھا تھا۔ دوسرا خط ملتان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام تھا۔ اس خط میں انھیں مبارکباد دی گئی تھی کہ انگریزوں کے پٹھوؤں کی تمام تر کوششوں کے باوجود انھوں نے بھائی چارہ برقرار رکھا تھا۔ انھیں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ انگریز اور ان کے کاسہ لیسوں سے خبردار رہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑانے کے لیے انتہائی پستیوں میں اُتر سکتے

ہیں' انتہائی شرم ناک اقدام کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ انگریز اور اس کے کتوں کی ہر سازش کو ناکام بنا دیں۔ ان خطوط کو ان کی منزل تک پہنچانے کی ذمے داری ستیش کو سونپی گئی۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب تک کی کوششوں سے جو نتائج حاصل کیے ہیں' انہیں ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

○☆○

"تت۔ تم کون ہو؟" خان بہادر حمید اللہ میرے سامنے مسہری پر بیٹھا تھا میرے ہاتھ میں سیاہ پستول تھا اور حمید اللہ پر خوف طاری تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا' بس تیکھے سے اسے گھورتا رہا۔

ستیش کی روانگی کے بعد ہم نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے مطابق جوگیندر کو اس وقت وہی کردار ادا کرنا تھا جو میں کر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میں بخت خاں کے ساتھ ڈاک بنگلے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد نے اس کا محل وقوع اور ڈاک بنگلے کا نقشہ سمجھا دیا تھا۔ یہ ڈاک بنگلہ آبادی سے ذرا ہٹ کر اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر ایک باغ میں بنا ہوا تھا۔ یہ باغ کسی زمانے میں حضوری باغ کہلاتا تھا (اب یہ اپنی حالت کھو چکا ہے) ہم جس وقت یہاں پہنچے تو خان بہادر حمید اللہ آ چکا تھا۔ ڈاک بنگلے میں خوب رونق تھی۔ میں موقع پا کر لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا ڈاک بنگلے کے اس کمرے میں پہنچ گیا تھا جو حمید اللہ بہ طور خواب گاہ استعمال کر رہا تھا۔ اس وقت حمید اللہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کی مسہری کے نیچے چھپ جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بخت خاں کو میں نے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ڈاک بنگلے کے آس پاس بھی کئی گھنے درخت تھے۔ بخت خاں کو انہی میں سے کسی درخت پر ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ کوئی خطرہ دیکھتا تو مجھے خبردار کر دیتا۔ اس کے لیے مختلف پرندوں اور جانوروں کی آوازیں موقع محل کی مناسبت سے طے کر لی گئی تھیں کہ اگر ایسا ہو تو فلاں پرندے کی آواز نکالنا اور یہ صورت حال ہو تو اس جانور کی آواز نکالنی ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے بخت خاں کی اس صلاحیت کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے منہ سے پرندوں اور جانوروں کی آوازیں یوں نکالتا تھا کہ ان پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ خود میں نے بھی ان آوازوں کی مشق کی تھی۔ جوگیندر نے بھی میری دیکھا دیکھی "شغل" اپنایا تھا۔ اس پر سیتا نے بڑی فقرے بازی کی تھی "ہاں بھیا الو بن کر دیکھو۔ سوری دکھاؤ! ہاں شاباش!" وہ یہ کہہ کر زور سے ہنس پڑتی۔ اور تو اور وہ مجھے بھی نہ بخشتی اور کہتی شاہین! تو تا چوری کھائے گا بول میاں مٹھو بنی جی بھیجو! پھر جب میں واقعی تو تا بن جاتا تو اس کی زندگی سے بھرپور ہنسی فضا کی تمام ترکشیدگی ختم کر دیتی۔ اس وقت یہی کھیل ہمارے کام آ رہا تھا۔ بخت خاں اگر کوئی خطرہ محسوس کرتا یا مجھے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو یہ آوازیں کام آتیں۔

مسہری کے نیچے چھپے ہوئے مجھے کئی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق خان بہادر حمید اللہ کی ملتان آمد کا مقصد صرف ہماری تلاش تھا۔ وہ ملتان میں اپنے زیر اثر افراد کی توسط سے یہ سراغ لگانا چاہتا تھا کہ یوپی سے آنے والے افراد کی پارٹی جن میں ایک لڑکی بھی شامل ہے کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟ انہیں کس نے پناہ دی ہے اور کس نے ان لوگوں کو ملتان بلایا ہے؟ اس نے اپنے اعتماد کے لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ جو کوئی مطلوبہ افراد کا پتا چلائے گا اسے وہ حکومت کی طرف سے دو ہزار روپے انعام دلوائے گا اور اس زمانے میں دو ہزار روپے بڑی رقم ہوتی تھی۔ پھر انہی ملاقاتوں کے دوران میں اسے انجمن وطن پرست کی طرف سے وہ خط بھی ملا جو ہم نے ستیش کو دیا تھا۔ اس خط پر بھی اس نے اپنے لوگوں سے بات کی تھی۔ حمید اللہ نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ آنے والے اجنبی ایک ایسی ہندو تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں جس کا مقصد ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو شدھی کرنا ہے۔ یہ تنظیم تحریک خلافت کی سخت دشمن ہے اور اس نے اپنے خطرناک آدمیوں کو اس لیے ملتان بھیجا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کو جو خلافت تحریک میں پیش پیش ہیں' نقصان پہنچائیں۔ حمید اللہ کی یہ باتیں سن کر میں دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔ اس کے بعد حمید اللہ اپنے معتمد لوگوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ درمیان میں وہ ان لوگوں کو یہ تاکید بھی کرتا رہا کہ وہ یوپی سے آنے والے اجنبیوں کا سراغ لگائیں کہ وہ ملتان میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

پھر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی حمید اللہ سے ملنے آیا۔ حمید اللہ اسے ساتھ لے کر اپنی خواب گاہ میں آ گیا اور دروازہ اندر سے بند کر کے رازدارانہ باتیں کرنے لگا۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ "وہ کام" رات کو ہو جائے گا۔ اسے چاہیے کہ صبح وہ اپنے لوگوں سے پروگرام کے دوسرے حصے پر شدت سے عمل کرائے۔ اس کام کے لیے مجسٹریٹ نے حمید اللہ کو کچھ رقم بھی دی تاکہ ایجنٹوں کو ان کے کام کا معاوضہ دیا جا سکے۔ پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معلوم کیا کہ ملتان آنے والے اجنبیوں کے متعلق کوئی رپورٹ ملی یا نہیں؟ حمید اللہ نے اس کا جواب نفی میں دیا' ساتھ ہی اس

نے انجمن وطن پرست کی طرف سے ملنے والا خط بھی مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا جو اسے ملا تھا۔ پھر اس خط پر دونوں میں تبادلہ خیال ہوا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ انجمن وطن پرست کے متعلق یوپی گورنمنٹ کی طرف سے ایک اطلاع آئی تھی۔ وہاں ایک موقع پر اس تنظیم کا نام سننے میں آیا ہے۔ مرکزی حکومت نے تمام صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی ہے کہ اگر اس انجمن یا تنظیم کی سرگرمیوں کی کہیں کوئی اطلاع ملے تو مرکز کو فوراً اس سے آگاہ کیا جائے۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم ہندوستان میں کہاں کہاں سرگرم عمل ہے۔ اس کے بعد ان دونوں میں کچھ اور رسمی باتیں ہوئیں۔ اسی عرصے میں ایک نام سن کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ وہ نام کیتھی کا تھا' وہی کیتھی جس سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ خان بہادر حمید اللہ جب کیتھی کا ذکر کر رہا تھا تو اس کی آواز میں عجیب سی للچائی ہوئی کیفیت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اپنے سامنے ہڈی پڑی دیکھ کر کتا اپنے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالتا ہے اور پھر اس کی رال بہنے لگتی ہے۔ خان بہادر حمید اللہ نے انگریزی مجسٹریٹ کو بتایا تھا کہ گزشتہ دنوں لاہور میں کیتھی نے بھی اسے "شرف ملاقات" بخشا تھا۔ مجسٹریٹ بھی اپنی ہم وطن سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ حمید اللہ کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ پھر اس ذکر کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور حمید اللہ وہاں سے چلے گئے۔

میں اس کے بعد کچھ نہ سن سکا۔ حمید اللہ اب باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس جگہ میں چھپا ہوا تھا وہاں تک لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مانند پہنچ رہی تھیں۔ سخت گرمی کی وجہ سے اور پسینے کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ میرا اور بخت خاں کا اندازہ تھا کہ شاید ہمیں اپنا اصل کام کرنے کا موقع رات کو بارہ بجے تک ملے گا۔ اس وقت تک ہمیں اپنی جگہ دم سادھے بیٹھا رہنا ہو گا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آخر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جس کام کی طرف اشارہ کیا تھا اس کی نوعیت کیا ہو گی۔ اس کام کا دوسرا حصہ کیا ہو سکتا ہے جسے انجام دینے کے لیے حمید اللہ کو رقم دی گئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ انگریز مجسٹریٹ نے کوئی گھناؤنا کام لینے ہی کے لیے حمید اللہ کو رقم دی تھی۔

جو کچھ ہونے والا تھا اسی رات ہونے والا تھا۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے ہمارے پاس وہی رات تھی' مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ ہمیں معلوم ہوتا کیا ہونے والا ہے۔ یہ معلوم کرنے کا میرے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ ذریعہ تھا حمید اللہ!

پھر میرے ذہن میں جوگیندر کا خیال آیا۔ اسے اس وقت رام مورتی کے یہاں ہونا چاہیے تھا۔ کسی طرح وشنو کمار تک پہنچ کر اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ اس وقت ملتان کیوں آیا ہے؟ گنگا پرشاد اور ستیش کا کہنا یہ تھا کہ ان دونوں لیجسلیٹو کے اراکین کا وہاں پہنچنا خالی از علت نہیں تھا۔ تو کیا جوگیندر کو بھی سازش کا کچھ علم ہو گیا ہو گا؟ میں سوچتا رہا۔

گھنٹے نے بارہ بجائے اور پھر لمحے "ٹک ٹک" کرتے ہوئے گزرتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے تو حمید اللہ خدا خدا کر کے واپس آیا۔ فضا میں الو کی چیخ گونجی۔ یہ اشارہ تھا امداد آنے کا۔ آواز کافی دور سے آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جوگیندر وہاں پہنچ چکا تھا۔ جواب میں بلی کی میاؤں کی صدا گونجی تھی۔ یہ قریب کی آواز تھی۔ یقیناً بخت خاں نے جوگیندر کو مطلع کیا تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ رہا تھا۔

جوگیندر یقیناً اپنا کام ختم کر کے واپس آ گیا تھا۔ میں اپنی جگہ چوکنا ہو گیا۔ حمید اللہ لباس تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ چکا تھا۔ میں انتہائی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ رینگ کر مسہری کے نیچے سے نکلا اور ایک دم کھڑے ہو کر حمید اللہ سے کہا "آواز نکالی تو گولی مار دوں گا' خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ!"

"تت۔ تم کون ہو؟" حمید اللہ نے ہکلاتے ہوئے کہا' ساتھ ہی وہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں اسے گھورتا رہا تو اس پر مزید خوف کا اثر ظاہر ہوا۔

"انجمن وطن پرست۔" میں نے آخر کار جواب دیا "تم ہماری ہی تلاش میں تھے نا؟"

"تم۔ مگر تم یہاں کس طرح۔ کیسے پہنچے۔" وہ پھر ہکلانے لگا شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے!

"میں یہاں اپنی مرضی سے پہنچا ہوں' مگر فی الحال تو تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینے ہیں! یہ بتاؤ کہ تمہیں ہماری تلاش کیوں ہے؟"

"حکومت۔ حکومت کا حکم ہے۔" حمید اللہ بولا۔

"تو تم حکومت کے وفادار ہو' انگریز کے غلام! تم اس ملک اور اس ملک کے باشندوں کے دشمن ہو' کیوں!" میں نے اس بار اپنا لہجہ سخت کر لیا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ایسا نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔"

"جھوٹ مت بولو خان بہادر! تم تو اس وقت بہادر کی

بجائے بھیگے ہوئے چوہے دکھائی دے رہے ہو!" میرے لہجے میں کاٹ تھی "مجھے اپنے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب چاہئیں! مجھے بہت کچھ معلوم ہے سمجھے! اگر تم نے میرے کسی سوال کا غلط جواب دیا تو میں تمہیں گولی مارنے سے دریغ نہیں کروں گا! تمہیں جہنم میں پہنچاتے ہوئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" میں نے پستول کو جنبش دی "میں اب تم سے چند سوال کروں گا' اس کے بعد تین تک گنوں گا۔ تم نے گنتی پوری ہونے تک میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا تو گولی ماردوں گا۔ تم نے غلط جواب دیا تو بھی میں یہی سمجھوں گا کہ تم مرنا چاہتے ہو۔ سمجھے! جواب دو کہ کیا تمہارے پاس انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آیا تھا؟" اس سوال سے میں اس کے جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً اقرار کرلیا تو میں نے دوسرا سوال کیا "اسے تم نے کام کے بارے میں کیا رپورٹ دی تھی؟" کیوں کہ اس نے فوراً اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا اس لیے میں نے گننا شروع کیا "ایک۔ دو"

"آج رات کام ہوجائے گا" وہ بول اٹھا "یہی رپورٹ دی تھی میں نے۔"

"فرقہ وارانہ فسادات کیسے شروع ہوں گے یہاں؟" میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا اور گنتی شروع کردی۔

اس کے حلق میں جیسے بلغم اٹک گیا "جج۔ جی فسادات ہندوؤں پر حملے سے" حمید اللہ نے جواب میں کہا۔

"اس کام کے لیے تم نے کن لوگوں کو خریدا ہے؟ جواب صحیح دینا!"

"میں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کسی کو نہیں خریدا۔"

"جھوٹ مت بولو حمید اللہ! تم آخر کیوں مرنا چاہتے ہو!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

حمید اللہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں کو چبانے لگا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

"یہ ایک مجرم کا چہرہ ہے' ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ!" میں نے ریوالور کی نال اس کے چہرے کی طرف اٹھائی "اگر تم جھوٹے نہیں ہو تو بتاؤ اس سفید کتے نے تمہیں کس لیے رقم دی تھی؟ میں ابھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہمیں انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں کے بارے میں اور یہاں ہونے والی سازشوں کے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ پھر بھی تم جھوٹ بولنے کی کوشش کررہے ہو! مجھے حکم ہے کہ تمہیں قتل کردیا جائے لیکن مجھے یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ اگر تم تعاون کرو اور ٹھیک ٹھیک جواب دو تو تمہاری جان بخش دوں۔ بتاؤ تم نے کس کو اس کام پر مامور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس شہر میں ہندو مسلم فساد کرانے کے لیے تم نے اپنے جیسے ضمیر فروشوں ہی کو خریدا ہوگا۔" یہ کہتے ہی میں نے گنتی شروع کی۔

"بوٹا خاں کو" حمید اللہ کو جواب دینا ہی پڑا۔

اسی وقت باہر سے کتے کے پلے کی "ٹیاؤں ٹیاؤں" ابھری۔ یہ گویا خطرہ قریب آجانے کا اشارہ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ پولیس یا فوج سر پر آپہنچی ہے۔ میں یہ اشارہ پاکر چونک اٹھا۔ میں نے حمید اللہ کو مخاطب کیا "اب تم اس کونے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ' دائیں بائیں دیکھنے یا منہ سے کسی بھی قسم کی آواز نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حمید اللہ اٹھ کر کونے میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ "تم پانچ منٹ تک یہاں اسی طرح خاموشی سے کھڑے رہوگے' خواہ کچھ ہو آواز نہیں نکالوگے۔ اگر تم نے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی یا شور مچایا تو اوپر روشندان میں میرا ساتھی بیٹھا ہے' اس کے پستول کی گولی تمہیں جہنم کی سیر کرادے گی۔" میں نے اسے دھمکی دی اور بیٹھک کے کمرے سے نکل آیا' پھر دوسرے کمرے میں داخل ہوکر باغ میں کھلنے والے دروازے کے پاس آگیا۔

دوسری طرف کئی افراد کے قدموں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر آگیا اور تیزی سے لپک کر سامنے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے آواز آئی "ادھر آجاؤ" یہ آواز بخت خاں کی تھی۔

"جوگیندر کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہاں سے جلدی چلو!" میرے سوال کو بخت خاں نے نظر انداز کردیا تھا۔

درختوں اور پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ڈاک بنگلے کی دیوار تک پہنچ گئے' پھر ایک درخت پر چڑھنے کے بعد موٹی سی ایک شاخ سے اچھل کر دیوار کے پار زمین پر چھلانگ لگادی۔ اسی وقت ڈاک بنگلے کی طرف سے شور اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں۔

"جوگیندر کہاں ہے؟" میں نے پھر بخت خاں سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے کوارٹر پر پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ گنگا پرشاد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"تو سیتا اور حیدر علی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ دونوں گنگا پرشاد ہی کے کوارٹر میں تھے۔ ٹیپو اور ستیش' جوگیندر کے ساتھ رام مورتی کی کوٹھی پر گئے تھے۔ جس طرح بخت خاں میرے ساتھ تھا اسی طرح جوگیندر کے ساتھ میں نے ٹیپو کو کردیا تھا۔ ستیش نے خود اس معرکے میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔ میں نے اسے بھی جوگیندر ہی کے ساتھ کردیا تھا۔ زیادہ بھیڑ بھڑکا نہ ہو' اس خیال سے حیدر علی اور سیتا کو ہم نے کوارٹر ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ گنگا پرشاد نے اپنے بیوی بچوں کو اپنی سسرال بھیج دیا تھا۔ اس سے پہلے ہی جب ہم ہوشیدی کے گھر سے کوارٹر میں منتقل ہوئے تھے۔ گنگا پرشاد کے بیوی بچے وہاں سے جاچکے تھے۔ بخت خاں کی اطلاع کے مطابق ماسٹر گنگا پرشاد پکڑا گیا تھا۔ اس کا مطلب میرے نزدیک یہی تھا کہ سیتا اور حیدر علی بھی گرفتار کرلیے گئے ہوں گے' میں اسی لیے گھبرا گیا تھا۔ بخت خاں نے جب میرے سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ سیتا اور حیدر علی محفوظ ہیں تو میری جان میں جان آئی۔

ہوا یہ تھا کہ ستیش' رام مورتی کی کوٹھی کے باہر ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ جوگیندر اور ٹیپو کوٹھی کے عقبی حصے میں داخل ہوگئے تھے۔ ستیش نے وہاں رام مورتی کی کوٹھی میں داخل ہوتے پولیس کے ایک دستے کو دیکھا' پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس نے ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کو پولیس کی حراست میں رام مورتی کی کوٹھی سے جاتے دیکھا۔ گنگا پرشاد کو کب رام مورتی کی کوٹھی میں بلایا گیا تھا۔ ستیش کو علم نہیں تھا۔ ستیش کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا کہ گنگا پرشاد کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ پیڑ سے اتر کر سیدھا دوڑتا ہوا ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے کوارٹر پہنچا۔ حیدر علی اور سیتا وہاں موجود تھے۔ خطرے کی بو سونگھ کر بہ طور احتیاط اس نے حیدر علی اور سیتا کو ایک ہی جگہ رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ حیدر علی کو اس نے اپنے ایک دوست کے گھر چھپا دیا اور سیتا کو اپنے گھر لے گیا۔ اس کا مکان ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ سیتا کو اپنے کوارٹر میں چھوڑ کر ستیش نے بخت خاں کو خطرے سے مطلع کیا۔ میں نے جوگیندر سمجھا تھا وہ ستیش تھا۔ بخت خاں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد ستیش اب پھر رام مورتی کی کوٹھی کی طرف گیا تھا کہ ٹیپو اور جوگیندر کو بھی نئی افتاد سے مطلع کرسکے۔ سیتا ہی نے ستیش کو الو کی آواز کا اشارہ بتایا تھا۔

بخت خاں سے سب کچھ جاننے کے بعد میں فکرمند ہوگیا۔ ملتان میں ایک بار پھر ہم بے ٹھکانا ہوگئے تھے۔

"تو پھر اب ہم کہاں جارہے ہیں بخت خاں؟" میں نے دریافت کیا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

"ہم ستیش کے گھر ہی چل رہے ہیں۔" بخت خاں نے جواب دیا "اس نے مجھے پتا سمجھادیا ہے' بالکل آسان ہے وہ بھی اپنے کوارٹر میں اکیلا ہی رہتا ہے۔" یہ کہہ کر بخت خاں نے مجھے بھی ستیش کے کوارٹر کا محل وقوع بتایا۔

"تم رام مورتی کی کوٹھی چلے جاؤ بخت خاں! وہاں معاملات کو دیکھو۔ میں ستیش کے گھر جاتا ہوں اور سیتا سے ملتا ہوں۔ ادھر سے مطمئن ہوکر وہاں سیتا کے لیے کوئی خطرہ نہیں' میں بھی رام مورتی ہی کی کوٹھی پہنچتا ہوں۔ مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگے گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں اور بخت خاں علیحدہ ہوگئے۔ اچانک حالات نے جو نئی کروٹ لی تھی اس سے میرا ذہن پریشان ہوگیا تھا۔ مختلف اندیشوں اور خطرات نے مجھے گھیر لیا تھا۔ ان میں سب سے بدترین اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ہم نے ستیش پر اعتماد کرکے غلطی تو نہیں کی؟ اس معاملے میں جو بات اس کی مخالفت میں تھی وہی اس کے حق میں بھی تھی۔ اگر وہ ہمارا مخالف تھا تو اس نے عین اس وقت ہمیں کیوں خبردار کیا تھا جب پولیس حرکت میں آچکی تھی؟ یہ بات اس کے حق میں تھی کہ وہ ہمارا مخالف نہیں تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ڈاک بنگلے محض یہ دیکھنے آیا ہو کہ ہم پھنس چکے ہیں یا نہیں۔

بہرحال میں چوکنا تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ الگ تھلگ بنے ہوئے اس واحد کوارٹر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ جہاں ستیش کی اطلاع کے مطابق اس وقت سیتا کو موجود ہونا تھا۔ سبز گھاس سے بھرے ہوئے اس میدان میں' میں پیٹ کے بل کھسکتا ہوا اس کوارٹر کا چکر لگا چکا تھا۔ ماحول پرسکون تھا خطرے کے احساس نے میری ساری حسیں بیدار کردی تھیں۔ مطمئن ہونے کے بعد بھی میں نے بہ طور احتیاط کوارٹر کی دیوار کے قریب پہنچ کر منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے اس اشارے کا جواب کوئل ہی کی آواز میں مل گیا۔ اندر سیتا موجود تھی۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ستیش کے بارے میں میرے اندیشے غلط تھے۔ میں چوکنے انداز میں چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور آہستہ سے دستک دی "سیتا!" میں نے دروازے کے قریب منہ لے جاکر سرگوشی کی۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی سیتا ہی تھی۔ ایک کمرے کے اس کوارٹر میں لالٹین بڑے اداس انداز میں پیلی پیلی زرد روشنی بکھیر رہی تھی۔

"شاہین!" سیتا یہ کہتے ہوئے میرے سینے سے لگ گئی۔

اس وقت وہ بری طرح کپکپا رہی تھی "جیجا کہاں ہیں؟"

"سیتا — میری سیتا! حوصلے سے کام لو تم ایک وطن پرست لڑکی ہو۔"

سیتا سے مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا جو بخت خاں سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ ستیش ایک وفادار اور مخلص وطن پرست تھا۔ پھر بھی اس وقت کوئی مزید خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر رام مورتی کی کوٹھی پہنچنا تھا۔ وہاں کے حالات پتا کرنے تھے اور جوگیندر کا سراغ لگانا تھا کہ اس پر اور نیمو پر کیا گزری؟ اس وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا جب میں نے سوچا کہ جلدی میں ایک ضروری بات کیوں بھول گیا؟ مجھے بخت خاں سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ وہ فوراً ستیش سے رابطہ قائم کر کے اسے یہ معلوم کرنے بھیج دے کہ ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کے بارے میں پولیس کو کس نے اطلاع دی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے مجھے ایک مرتبہ پھر خطرے کا احساس ہوا۔ گنگا پرشاد کے بارے میں پولیس کو جس نے بھی اطلاع دی ہو گی وہ ستیش کو بھی جانتا ہو گا۔ اس وقت میں اور سیتا' ستیش ہی کے کوارٹر میں تھے۔ ستیش کی تلاش میں پولیس یہاں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

"سیتا جلدی کرو' یہاں سے فوراً نکل چلو۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ اب میں یہاں اس پنجرے میں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔

ہم وہاں سے نکل آئے مگر سوال یہ تھا کہ ہم رات کہاں گزاریں؟ سیتا کو کہاں چھوڑا جائے؟ بخت خاں اور جوگیندر کے پاس بھی پہنچنا ضروری تھا۔ پھر یہ مسئلہ بھی تھا کہ رات کے وقت میرا اور سیتا کا سڑکوں پر نکلنا بھی ہمیں مشتبہ بنا سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ یہ بات اچانک ہی میرے ذہن میں آئی تھی۔

سیتا کو ساتھ لیے ہوئے میں پھر ڈاک بنگلے پر پہنچ گیا جو آبادی سے الگ تھلگ واقع تھا۔ ڈاک بنگلے کی اطراف باغ تھا' آس پاس کوئی اور عمارت بھی نہیں تھی۔ ہم اندھیرے میں تیز قدمی سے چلتے ہوئے ڈاک بنگلے کے احاطے کی عقبی دیوار سے قریب ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اب تک پورے باغ کو چھان چکی ہو گی اور میری تلاش سے مایوس ہو کر وہاں سے جا چکی ہو گی۔ یہ بہرحال ایک قیاس ہی تھا۔ میں راستے ہی میں سیتا کو بتا چکا تھا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

اس مرتبہ میں نے پھر اسی درخت کو دیوار پھلانگنے کا ذریعہ بنایا جس کے سہارے ہم پہلے بھی فرار ہو چکے تھے۔ دیوار پر جھکے ہوئے گدے میں رسی ڈال کر اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرہیں لگانے کے بعد میں نے سیتا کو درخت پر چڑھایا پھر خود چڑھا اور رسی کھول کر سیتا کے ساتھ احاطے کے اندر کود گیا۔

ڈاک بنگلا تاریک پڑا تھا۔ شاید خان بہادر حمید اللہ کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد حمید اللہ کا وہاں رکنا بعید از فہم ہی تھا۔ میں دل ہی دل میں ان لوگوں کی کم ہمتی پر ہنسا لیکن اس وقت ان کی یہی کم ہمتی ہمارے لیے پناہ کا سبب بننے والی تھی۔

ڈاک بنگلے کے ملازمین کے کوارٹر اصل عمارت سے تھوڑے فاصلے پر احاطے کی اس دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے جو دوسری طرف تھی۔

سیتا کو درختوں کے ایک جھنڈ میں چھوڑ کر میں نے دونوں پہلوؤں سے اس طرف کا جائزہ لیا جہاں ملازمین کے کوارٹر تھے۔ وہاں اب بھی دو ملازم کھڑے ہوئے ان واقعات پر گفتگو کر رہے تھے جو کوئی پون گھنٹے قبل وہاں پیش آئے تھے۔ ان کی باتوں سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہو گئی کہ حمید اللہ وہاں سے جا چکا ہے اور ڈاک بنگلا بالکل خالی ہے۔ پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے۔

میں واپس جا کر سیتا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ایک بڑا سا گملا برآمدے کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ میں نے سیتا کو کاندھوں پر سوار کیا اور اس گملے پر چڑھ گیا۔ پھر سیتا کو برآمدے کی چھت پر چڑھا دیا۔ جہاں سے وہ کمروں کی چھتوں پر آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔

"اچھا سیتا" میں نے آہستہ سے کہا "رات ختم ہونے سے پہلے ہی میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ برآمدے کی چھت پر سینے کے بل لیٹی ہوئی تھی "میں تمہارا انتظار کروں گی۔" اس نے ہاتھ لٹکایا اور میں نے اس کی انگلیوں کو چوم لیا۔

"جوگیندر بھی میرے ساتھ ہو گا۔" میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو کھینچ کر اپنے لبوں سے لگا لیا اور کہا "میں تمہیں جانتی ہوں میرے دیوتا!" اس کی آنکھوں کی نمی میری انگلیوں کو بھگو گئی۔ اس کے لہجے کی لرزش میرے دل میں کانٹا بن کر اتر گئی "میں تم پر بوجھ بن گئی ہوں۔"

"نہیں۔ تمہاری تربیت ہو رہی ہے اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

جس وقت میں وہاں سے چلا۔ دور اسٹیشن پر سے لائن پار میں نے آگ کے شعلوں کو آسمان کی طرف لپکتے دیکھا۔ بہت دور میدان میں جیسے کسی نے الاؤ سا بھڑکا دیا تھا۔ میں بہت تیزی سے رام مورتی کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میری اور میرے ساتھیوں کی کوشش تھی کہ ملتان کو اس آگ میں بھسم ہونے سے بچایا جائے جو انگریز اور اس کے پٹھو بھڑکانے پر تلے ہوئے تھے۔ میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس رات میں نے کہیں دور سے ایسا شور بھی اٹھتے سنا جیسے بہت بڑا مجمع نعرے لگا رہا ہو۔

رام مورتی کی کوٹھی میں بلب روشن تھے۔ وہاں ایک عجیب سی پراسرار سرگرمی کا احساس ہوتا تھا۔ دو افراد برآمدے میں کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اندر کمروں میں بھی کچھ افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ گیٹ پر مسلح پولیس والے موجود تھے۔ میں نے ایک گھنے درخت کی آڑ لے رکھی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بخت خاں اور ستیش اس وقت کہاں ہوں گے۔ ویسے کوٹھی کی اس سمت جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ یقیناً نہیں تھے کیوں کہ میں دو مرتبہ کوئل کی آواز نکال چکا تھا۔ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ آس پاس کے درختوں تک ضرور پہنچ سکتی تھی۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ فضا میں دور سے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں نعروں کی تھیں اور دور آسمان پر سرخی موجود تھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا انگارا اپنی سرخ سرخ روشنی بکھیر رہا ہو۔

ایک لمبا چکر کاٹ کر میں کوٹھی کی دوسری سمت پہنچا۔ یہاں درخت زیادہ بھی تھے اور گھنے بھی۔ چھپنے کے لیے اس سے بہتر مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ یہاں سے کوٹھی کا بڑا حصہ نظر آتا تھا۔ میں ادھر پہنچا ہی تھا کہ میں نے مخصوص اشارہ سنا۔ چند لمحوں بعد ہی میں اس درخت پر موجود تھا جہاں بخت خاں نے ڈیرا جما رکھا تھا۔

"ستیش کہاں ہے؟" میں نے بخت خاں سے پوچھا۔

"یہاں آ کر میں نے اسے بھیج دیا تھا۔ شاید میں نے اسے وہاں بھیج کر غلطی کی ہے۔" بخت خاں بولا۔

"کہاں بھیجا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسے میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ پولیس' ماسٹر گنگا پرشاد تک کس طرح پہنچی اور یہ بھی معلوم کرانے کے لیے کہ کیا جوگیندر بھی پولیس کے ہاتھ لگے ہیں۔" بخت خاں نے میرے سوال کا جواب دیا "میرا مطلب یہ ہے کہ کہیں جوگیندر اور نیمو بھی تو یہاں پولیس کی نظر میں نہیں آ گئے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ ویسے کیا جوگیندر اور نیمو کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکا؟ ان دونوں کو تو یہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں ہونا تو چاہیے تھا اور وہ یہاں ہیں بھی شاید۔" بخت خاں کے لہجے سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا "یقینی طور پر بہرحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ستیش کے جاتے ہی میں نے یہ سوچ کر شاید جوگیندر اور نیمو کوٹھی کے عقبی حصے میں ہوں میں ادھر گیا تھا وہاں مجھے اپنے اشارے کا جواب مل گیا تھا۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

"دراصل طے یہی ہوا تھا کہ وہ دونوں کوٹھی کی اسی سمت ستیش سے آ کر ملیں گے۔" بخت خاں نے جواب دیا "میں اسی لیے یہاں سے نہیں ہٹا۔"

"ٹھیک ہے' تم یہیں رہو میں پیچھے جاتا ہوں۔ ویسے ستیش کب تک واپس آئے گا؟"

"اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔" بخت خاں نے بتایا۔

پھر بخت خاں کو میں نے سیتا کے بارے میں بتایا اور اسے اپنے ان خدشات سے بھی آگاہ کیا جن کی بنا پر میں نے یہ اقدام کیا تھا۔

کوٹھی کی عقبی سمت جانے کے لیے میں درخت سے اترنے ہی والا تھا کہ پانچ چھ افراد بہت تیز تیز چلتے اور باتیں کرتے ہوئے کوٹھی کی سمت بڑھتے نظر آئے۔ وہ بہت مشتعل دکھائی دے رہے تھے۔ خاصی دور ہونے کے باوجود ان کی تیز آوازیں' رات کے سناٹے کی وجہ سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کی باتوں کے چند الفاظ میں نے بھی سن لیے "مندر — آگ — مندر آگ —"

"اف میرے خدا!" میں بڑبڑایا "تو کیا وہ کامیاب ہو گئے۔ بخت خاں ہماری تمام تگ و دو شاید بے سود ثابت ہوئی۔"

"کیوں' کیا ہوا؟" بخت خاں یقیناً اس نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا جس پر میں پہنچ گیا تھا ورنہ وہ سوال نہ کرتا۔

"کسی مندر کو آگ لگوا دی گئی ہے۔ اس کے بعد یہاں کیا کچھ ہو گا۔ اس کا اندازہ تم لگا ہی سکتے ہو۔ اچھا تم ٹھہرو میں پیچھے چلا۔"

کوٹھی کے عقبی حصے میں آ کر بھی میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ درخت دیوار سے خاصا دور تھا لیکن اس کا ایک مضبوط گدا دیوار تک گیا تھا اور اس کی شاخیں اندر احاطے

میں سایہ کیے ہوئے تھیں۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دیوار کی طرف جانے والے گدے پر جس حد تک جاسکتا تھا چلا گیا۔

عقبی حصے میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی شے حرکت نہیں کررہی تھی۔ میں نے کوئل کی آواز نکالی۔ اس اشارے کا جواب فوراً ہی دائیں طرف کے گوشے سے آیا جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں گھنی جھاڑیاں ہیں یا پودے لگے ہوئے ہیں۔

پھر میں نے اسی طرف ہلکی سی سرسراہٹ محسوس کی جیسے کوئی جھاڑیوں سے گزر کر آگے بڑھ رہا ہو۔ پھر میں نے ایک سائے کو درخت کی سمت آتے دیکھا۔ وہ سایہ درخت کے پاس آکر دیوار کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔

"جوگیندر" میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"شاہین! تم جاؤ۔" جوگیندر کی ہلکی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وقت بہت کم ہے۔" میں پھر بولا "میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"تم جاؤ!" اس کی آواز آئی "ستیش کے پاس ملنا! ٹیپو میرے ساتھ ہی رہے گا۔"

کچھ ہی دیر میں دوبارہ میں اس پیڑ پر پہنچ گیا جس پر بخت خاں چڑھا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھے ایک اور خیال آیا کہ ابھی تو بوٹا خاں کا پتا چلانا ہے جسے خاں بہادر حمید اللہ نے ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑکانے کا کام سونپا تھا۔ ستیش واپس آگیا تھا اور اس کی فراہم کردہ اطلاعات بہت خوف ناک تھیں۔ کوئی ایک گھنٹے قبل ملتان کی ایک نواحی آبادی سے پانچ مسلمان کسانوں کے قتل کی خبر ملتان پہنچی تھی۔ اس خبر کے ساتھ خون میں بھیگی ہوئی دو قمیصیں بھی ملتان میں کسانوں کے ایک مسلمان زمیندار کے پاس پہنچی تھیں۔ دوسری طرف ملتان میں ایک قدیم خستہ حال مندر کو نذرِ آتش کروا گیا تھا۔ وہ سرخی جو میں نے دیکھی تھی اسی آگ کی تھی اور ہوا کے ساتھ آنے والی شور کی آواز مسلمان دیہی باشندوں کے نعروں کی تھی۔

"یہ کیسے وحشی درندے ہیں۔ جنہوں نے انسانوں کی شکل اختیار کرلی ہے!" میں نے تاسف سے ہاتھ ملے "اور ہاں یہ پتا چلا کہ ماسٹر گنگا پرشاد کے بارے میں پولیس سے کس نے مخبری کی تھی؟"

"میرے ایک دوست نما دشمن نے۔" ستیش نے بڑے دکھ سے کہا "مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آپ نے سیتا دیوی کو میرے کوارٹر سے کہیں اور منتقل کردیا ہے۔ وہاں گیا تھا، سیتا دیوی موجود نہیں تھیں تو مجھے حیرت بھی اور پریشانی بھی۔ بخت خاں نے بتایا تو میری جان میں جان آئی۔"

"اب تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے ستیش؟" میں نے اس سے سوال کیا "تم یہاں رہتے ہو اور اس مزاج کو ہم سے بہتر سمجھتے ہو۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا۔" ستیش نے بے بسی کا اظہار کردیا۔

"یہ بوٹا خاں کون ہے جانتے ہو؟" میں نے دریافت کیا "کیا وہ شہر ہی میں رہتا ہے؟ یا کسی نواحی آبادی کا بندہ ہے؟ میرے خیال میں اسے گمنام نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے وہ گمنام بندہ نہیں ہے" ستیش بتانے لگا "بوٹا خاں ملتان شہر کا مشہور و معروف بدمعاش ہے کیوں، کوئی خاص بات؟"

"جو کچھ ہونے والا ہے اس میں بوٹا خاں کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں مل سکے گا؟" میں نے کہا۔

"بوٹا خاں کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں لیکن وہ عموماً اندرون حرم ہی کے علاقے میں ملتا ہے۔" ستیش نے جواب دیا پھر پوچھنے لگا "کیا ہونے والا ہے؟"

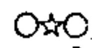
"وہی سب کچھ جس کے خلاف ہم جدوجہد کررہے ہیں۔"

میری بات پوری ہوئی کہ بخت خاں نے "شش" کرکے ہمیں چپ ہوجانے کا اشارہ کیا۔

رام مورتی کے یہاں جو لوگ جمع تھے وہ گویا اب رخصت ہورہے تھے۔ لوگ رخصت ہوتے گئے اور رات کا سناٹا مزید گہرا ہوگیا۔ رام مورتی اور رائے بہادر وشنو کمار لوگوں کو رخصت کرکے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کوٹھی کی تیز بتیاں ایک ایک کرکے بجھ گئیں۔ اب صرف کم روشنی کے چند بلب ایک سوگوار سا تاثر پیدا کررہے تھے۔

وقت گزر رہا تھا اور جوگیندر اب تک ہمارے پاس نہیں پہنچا تھا۔ وہ کیوں رکا ہوا ہے؟ آخر کیا کرنا چاہتا ہے؟ میرے خیالات ایک مرتبہ پھر جوگیندر کی ذات پر مرکوز ہوگئے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد کوٹھی کے ایک کمرے میں روشنی ہوئی۔ اس کے چند منٹ بعد جوگیندر اور ٹیپو، دونوں ہی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم سب تیزی کے ساتھ وہاں سے لپک لیے۔ اب ہم جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے۔



ہماری ملتان کی مہم قطعی ناکام رہی۔ ٹھیک اس وقت جب ہم کامیابی کے قریب تھے۔ انگریز نے اپنے شاطرانہ ذہن سے وہ چال چلی جو ہر فراست اور فرزانگی کو جنون اور دیوانگی میں بدل سکتی تھی۔ ہم نے اپنی کوششوں سے ملتان کے باشندوں میں محبت، اخوت اور بھائی چارے کے جو جذبات بیدار کیے تھے وہ انگریز کی ایک غیر انسانی، وحشیانہ اور مکروہ چال سے نفرتوں اور عداوتوں میں تبدیل ہوکر رہ گئے تھے۔

وہ رات اور اس کے بعد تین دن ہم نے ستیش کے اسی دوست کے گھر گزارے تھے جہاں حیدر علی کو اس نے چھپایا تھا۔ ستیش کا یہ دوست بھی ریلوے میں ملازم تھا اور مسلمان تھا۔ میں اور جوگیندر اسی رات سیتا کو ڈاک بنگلے سے لے آئے تھے۔ میں نے جوگیندر سے کہا تھا کہ ہمیں آخری کوشش کرلینا چاہیے تو وہ بولا تھا "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے جو کچھ کیا تھا وہ تباہ ہوچکا ہے۔" پھر بھی میں نہ مانا۔ میں نے علی حمزہ کے بھائی سے ملاقات کی تھی اور پھر اسی کے توسط سے بااثر مسلمان زمینداروں سے ملا تھا۔ لیکن میں انہیں نہیں سمجھا سکا تھا۔ پانچ دیہی باشندوں کے قتل کی خبر کوئی معمولی نہ تھی۔ انہیں ملتان کے قریب ہی ایک گاؤں میں قتل کیا گیا تھا۔ افواہ یہ تھی کہ انہیں ہندوؤں نے مارا تھا اور پھر اس گاؤں کے باشندوں نے دو خون آلود قمیصیں ملتان بھیجی تھیں۔ یہ قمیصیں بھیجنا ایک پیغام تھا۔ ان قمیصوں میں جو خون جذب ہوا تھا وہ اپنا خراج مانگ رہا تھا۔ دیہی باشندوں کے جذبات کیا تھے۔ اب ملتان شہر کے مسلمان پر فرض تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ ہندوؤں سے لیں۔

میں نے آخری مرتبہ انہیں سمجھایا کہ یہ سب انگریز کی چال ہے۔ دیہی باشندوں کو انگریزوں نے قتل کیا ہوگا اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے خون آلود قمیص یہاں بھجوائی ہوں گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ انگریز نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑوانے کے لیے کیا ترکیبیں کی ہیں۔ کیا اسکیم بنائی ہے مگر میری ان گزارشات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تو جیسے اندھوں، گونگوں اور بہروں سے مغز ماری کررہا تھا۔

جوگیندر سے گفتگو کرنے کے بعد انگریز کی ساری اسکیم میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے جو کچھ رام مورتی کے یہاں سنا تھا، اس کے بعد ہی اس نے وہاں ٹھہر کر اپنی قسم پوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے رائے بہادر وشنو کمار کو بتایا تھا کہ قریبی گاؤں میں پانچ مسلمانوں کو قتل کرکے ان کی قمیصیں ملتان بھجوادی گئی ہیں، اسی کے ساتھ ملتان کے ایک قدیم مندر کو نذرِ آتش کرنے کے انتظامات کردیے گئے ہیں۔ پھر کسی شخص نے آکر وشنو کو اطلاع دی تھی جس کے بعد وشنو کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے واپس آکر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو سرگوشی میں کچھ بتایا تھا اور پھر ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کو اندر طلب کیا گیا تھا جو وشنو سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ گنگا پرشاد سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور وشنو ہمارے ہی متعلق گفتگو کرتے رہے تھے۔ گنگا پرشاد کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ وہ اسکول کے طلبہ کے ذریعے یہ معلوم کرے کہ ہم لوگ کہاں مقیم ہیں۔ گنگا پرشاد پُرجوش انداز میں ان دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پھر اچانک ہی وشنو اس پر گرم ہوگیا۔ اس نے گنگا پرشاد کو بتایا کہ وہ نہ صرف حکومت کو دھوکا دے رہا ہے بلکہ اپنے ہم مذہبوں سے بھی غداری کررہا ہے کیوں کہ یوپی سے آنے والے اسی کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ گنگا پرشاد نے اس کی تردید کی تو اس شخص کو پیش کیا گیا جس نے مخبری کی تھی۔ پھر چند منٹ بعد ہی گنگا پرشاد کو وہاں سے گرفتار کرکے لے جایا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ گنگا پرشاد کی موجودگی ہی میں اس کے گھر پر چھاپا مارا جائے اور یوپی سے پنجاب آنے والوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے ساتھ موجود ایک فوجی افسر کو ہدایت کی کہ وہ بھی جائے اور ہیڈ ماسٹر کے کوارٹر کا محاصرہ کرلے تاکہ ملزمان فرار نہ ہوسکیں۔

جوگیندر جانتا تھا کہ گنگا پرشاد کے کوارٹر میں حیدر علی اور سیتا موجود ہیں۔ مگر اس وقت وہ ایسی جگہ چھپا ہوا تھا جہاں سے اس کا نکلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی بہن کے لیے پریشان تھا مگر اس نے یہی سوچا کہ اسے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ آزاد رہا تو سیتا کی رہائی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا ہے۔ کوشش کرسکتا ہے، اگر گرفتار ہوگیا تو کچھ بھی نہ کرسکے گا۔ وہ اسی لیے وہیں چھپا رہا۔ اسے وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں مل سکا اور جب اسے یہ موقع ملا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی گئی کہ گنگا پرشاد کے گھر سے کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی۔ مجسٹریٹ اپنے سر کے بال نوچتا رہا اور گالیاں بکتا رہا۔ جوگیندر کو سیتا اور حیدر علی کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو اس نے ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لیا۔ ملتان میں ہندو مسلم فسادات کے لیے

تمام انتظامات مکمل ہوگئے تھے۔ انسانی خون بہہ چکا تھا۔ پانچ مسلمان دیکی باشندے مارے جاچکے تھے اس کے بعد جوگیندر نے اپنی قسم پوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ بھیانک چیخ جو ہم نے درخت پر بیٹھے ہوئے سُنی تھی رام مورتی کی آخری چیخ تھی۔ جوگیندر نے اسے بیدار کرکے گولی ماری تھی۔

پھر ہم وہاں سے چل دیے تھے اور سیتا کو لے کر ستیش کے دوست کے یہاں جاکر پناہ لی تھی۔ اسی کے بعد ایک مرتبہ پھر مسلمان زمینداروں کو معقولیت پسندی اور عقل و دانش کا راستہ دکھانے میں ناکام ہوکر مایوس و دل گرفتہ واپس آئے تھے۔ انگریز ہمیں شکست دے چکا تھا۔

اس رات ہم پر ایک اور حقیقت بھی منکشف ہوئی تھی۔ ملتان میں فضا حقیقی کشیدہ تھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی مگر انگریز فوج اور پولیس کہیں بھی گشت پر نظر نہیں آئی حالانکہ گزشتہ شب ہی کئی سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی گئی تھی۔ دن میں بھی یہ عمل دہرایا گیا تھا۔ یہ ایسے حالات تھے جن میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو حرکت میں ہونا چاہیے تھا مگر یوں لگتا تھا کہ حکومت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

صبح ستیش کا دوست غلام نبی خبر لایا کہ ملتان سے گزرنے والی ایک ٹرین ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے دیر تک روکی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ' فوج اور پولیس کے دستوں کے ساتھ ملتان سے نکل گیا۔

تمام رات جلتے ہوئے مندر سے آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ تمام شب ملتان اور اس کے گرد اگرد آبادیوں سے مسلمانوں کے نعروں کی آوازیں سُنائی دیتی رہیں صبح یہ خبر عام ہوچکی تھی کہ فوج اور پولیس ملتان سے غائب ہوچکی ہے۔

اور پھر مندر سے بھڑکتے شعلے ملتان کے لیے چتا میں تبدیل ہوگئے۔ نعروں کی آوازیں' چیخوں' کراہوں' بین اور نوحوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اگلے دو روز تک ملتان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی۔ ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا بدترین ہندو مسلم فساد تھا۔

پھر یوں ہوا کہ انگریز کی قانون پسندی بیدار ہوگئی۔ وہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو ملتان کو جہنم بناکر رات کے اندھیرے میں فوج اور پولیس کو لے کر فرار ہوگیا تھا۔ ایک سو پچاس انگریز فوجیوں کا ایک دستہ لے کر ملتان میں آدھمکا۔ متحارب ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشین گن سے زبردست فائرنگ کرائی گئی۔ یہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ چند منٹوں میں کئی سو افراد ہلاک اور اس سے دگنی تعداد میں زخمی ہوگئے۔ ان متحارب گروہوں کو چاروں طرف سے گھیر کر مارا گیا تھا۔ فوجیوں اور پولیس والوں کو حکم تھا' وہ گولی اس طرح چلائیں کہ کم سے کم گولیاں ضائع ہوں اور زیادہ سے زیادہ انسان شکار کیے جائیں۔

ہم بھی یہ وحشیانہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم اس میدان جنگ سے تھوڑے ہی فاصلے پہ محفوظ مقام پر تھے۔ لوگ جان بچانے کے لیے دیوانہ وار چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ انگریز فوجی اور پولیس والے ان بھاگتے ہوئے لوگوں کا تعاقب کررہے تھے بھاگنے والوں کو پناہ دینے کے لیے گھروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ ہم نے ایک سرکاری دفتر کے برآمدے میں پناہ لے لی تھی کہ چند افراد بھاگتے ہوئے اس دفتر کے احاطے میں داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ شکاری کتوں کے مانند اپنے شکار کے تعاقب میں تھے۔ بخت خاں ان میں سے ایک پر عقاب کی طرح جھپٹا۔ دوسرے شکاری کتے پر میں نے زقند لگائی' تیسرے کی رائفل پر حیدر علی نے ہاتھ ڈالا اور چوتھے پر نیپو نے جست بھری۔ ہم نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گھیر کر ہلاک کردیا اور ان کی لاشیں ایسی جگہ پھینک دیں جہاں آسانی سے ان پر کسی کی نظر نہ پڑسکے۔ ان ملکی قاتلوں کو جہنم کی طرف دھکیلنے میں پہلے سے طے شدہ کسی منصوبے کا دخل نہیں تھا۔ سب کچھ بس اچانک ہی ہوگیا تھا۔ شاید اس وقت ہم سبھی ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے ہماری برین ویوز مل گئی تھیں۔ پہل بخت خان نے کی تھی اور پھر ہم سب ایک دم حرکت میں آگئے تھے۔ ہم سبھی تربیت یافتہ تھے۔ ہمارے لیے ان شکاری کتوں کو ٹھکانے لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ جوگیندر اس وقت ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ایسے مواقع پر ہم اسے اپنے ساتھ رکھنے سے گریز کرتے تھے کیوں کہ اس نے چھاپا مار جنگ کی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ اسے ہم ستیش کے دوست غلام نبی کے گھر سیتا کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ ہم چاروں ساتھی محض تماشائی نہیں تھے۔ اپنی جانیں خطرے میں ڈالنے کی وجہ یہ تھی کہ ممکن ہے ہم کسی بھی مظلوم کے کام آسکیں۔

ملتان میں ہونے والے اس ہندو مسلم فساد نے اس خطے میں فسادات کی ابتدا کردی۔ یہ آگ پنجاب سے سندھ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھی اور پھر اس نے پورے سندھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کراچی سے حیدر آباد اور پھر میر پور خاص تک انگریز وحشت و بربریت کا تماشا دکھانے لگا۔ مجاہد اوّل کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ تقریباً سارا ہی ہندوستان انگریز کی سازشوں کا شکار ہونے لگا۔ اس کا نقطہ آغاز ملتان ہی تھا۔ یہاں اپنے کامیاب تجربے کے بعد انگریز نے خطہ سندھ کو بھی نہیں بخشا۔ مگر اس وقت ہمیں اس کی سنگینی کا اتنا بھرپور احساس نہیں ہوا جتنا بعد میں ہوا۔ ملتان میں ہونے والے ان فسادات نے ہندو مسلم اتحاد کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی گونج لیجسلیٹو کے اگلے اجلاس میں بھی سُنائی دی جہاں بعض ہندو اراکین نے کھل کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا۔ انہوں نے تحریک خلافت اور مسلم لیگ کو بہ طور خاص اپنے تعصب کا نشانہ بنایا۔

میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ جلیانوالہ باغ سے بھی زیادہ شرم ناک تھا جو ملتان میں پیش آیا مگر اس سے شرم ناک بات شاید یہ ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابوں میں جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں' یہ واقعہ اوّل تو موجود ہی نہیں اور اگر کہیں اس کا ذکر ہوتا ہے تو نہایت سرسری انداز میں۔

ادھر ملتان میں تو یہ ہوا ادھر جنوبی ہند سے بھی تشویش ناک خبریں ملنے لگیں۔ وہاں ہنگاموں کا مرکز ملاپورم تھا جہاں تقریباً ڈھائی ہزار مسلمان گرفتار ہوئے اور وہ واقعہ پیش آیا جو انگریزوں کے شرم ناک عہد حکومت کا انتہائی بھیانک مرقع ہے۔ ان گرفتار شدگان میں ہمارے کئی تنظیمی ساتھی بھی تھے جو مجاہد اوّل کے حکم پر جنوبی ہند گئے تھے مگر ان باتوں کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دہلی میں مجاہد اوّل نے مجھ سے میرے ماموں زاد بھائی رحمت علی کی تعزیت کی تھی۔ اسی وقت مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ بھائی رحمت علی' مجاہد اوّل کے حکم پر کہاں گئے تھے! وہ ملاپورم کے معرکے ہی میں شہید ہوئے تھے۔

اس واقعے کی تفصیل یہ تھی کہ ملاپورم سے ایک سو گرفتار شدگان کو پدانور لے جانا تھا۔ ٹرین میں ان کے لیے کسی بوگی کا انتظام نہ ہوسکا تو ریلوے کے انگریز حکام نے مال گاڑی کا ایک ڈبا فراہم کردیا۔ یہ ڈبا دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس کی اونچائی صرف چھ فٹ تھی۔ اس مختصر سے ڈبے میں ایک سو قیدیوں کو اس طرح ٹھونسا گیا جیسے بوری میں اناج بھرتے ہیں۔ وہ گاڑی جس میں ڈبا لگایا گیا' شام سوا سات بجے ملاپورم سے روانہ ہوئی۔ مختصر سے اس ڈبے میں ان بد قسمتوں کے لیے سانس لینا دشوار ہوگیا۔ حبس اتنا شدید تھا کہ ان میں سے کئی بے ہوش ہوگئے۔ جو ہوش میں تھے چیختے رہے۔ ساڑھے دس بجے جب یہ ٹرین اولاوک کوٹ کے

اسٹیشن پر رکی تو قیدیوں نے شور مچایا اور ڈبے کے دروازے کو پیٹنے لگے۔ دروازہ پیٹنے والے وہ لوگ تھے جو دروازے کے قریب تھے۔ وہ سبھی قیدی پانی کے لیے شور مچا رہے تھے' ہوا کے لیے چیخ رہے تھے' مگر کرنل صفری پر خدا کی لعنت ہو کہ جو ان قیدیوں کو لے جارہا تھا' صرف یہی جواب دیا کہ پانی نہیں مل سکتا۔ ٹرین پھر چل پڑی۔ رات کو ساڑھے بارہ بجے جب یہ ٹرین پدانور پہنچی تو زندہ افراد بے ہوش تھے۔ چون افراد مرچکے تھے۔ انہی میں بھائی رحمت علی بھی تھے۔ وہ بھائی رحمت علی ہی تھے جن کے توسط سے میں زیرِ زمین خفیہ تنظیم وطن پرست کا رکن بنا تھا۔ اللہ ان پر اپنی رحمت کرے۔ (آمین)

میرے نزدیک وہ واقعہ بلیک ہول سے زیادہ ہیبت ناک تھا جس میں بھائی رحمت علی کی شہادت ہوئی تھی۔ ان سو افراد میں صرف دو ہندو تھے جو ہلاک ہوئے۔

لیجسلیٹو میں جب مسلمان ممبروں نے یہ واقعہ پیش کیا تو ان غیر سرکاری اراکین نے جو ایک معاہدے کے تحت غیر سرکاری مسلم اراکین کے ساتھ ووٹ دیا کرتے تھے' اس معاملے میں مسلم اراکین کا ساتھ نہیں دیا۔ خود خان بہادر حمید اللہ اس روز ایوان میں حاضر نہ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری ہوتی گئی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد جسے انگریز اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔

کبھی کبھی قدرت بھی انسان سے اس کے ظلم کا کیسا بدلہ لیتی ہے۔ ایسا ہی انتقام قدرت نے انگریزوں سے بھی لیا۔ ٹرین میں مسلمانوں کی ہلاکت کے اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد کئی انگریز فوجی بھی ایسے ہی واقعے سے دوچار ہوئے۔ کراچی سے انگریز فوجی دہلی جارہے تھے کہ راستے میں ٹرین کے پنکھے خراب ہوگئے۔ حبس اور گرمی سے باون انگریز فوجی ہلاک ہوگئے۔ قدرت نے انصاف کردیا' مگر انسان کا انصاف؟ اس کی مثال ملتان میں سیکڑوں افراد کی اندوہ ناک ہلاکت ہے۔ انگریز نے اہل ملتان کو ہلاک کرنے والے اپنے ہم وطن فوجی افسروں کو تحفظ دیا لیکن انگریز فوجیوں کی ہلاکت پر اتنا شور ہوا کہ سیکریٹری آف اسٹیٹس کو مستعفی ہونا پڑا۔ یہ وہی چار انگریز فوجی تھے جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

بہرحال انگریزوں کے مظالم اور شقی القلبی کے مظاہرے دیکھنے کے بعد ہم ملتان سے فرار ہونے والے تھے کہ ہوشو شیدی کے ذریعے ہمیں مجاہد اوّل کا پیغام ملا۔ بخت خان کو اور مجھے ملتان سے کراچی پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ جوگیندر اور سیتا کے بارے میں بھی یہی ہدایت تھی۔ حیدر علی اور نیپو

کو ملتان سے فی الحال اپنے اپنے شہروں تک پہنچنے کی اجازت مل گئی تھی، مگر وہ دونوں ہی ہم سے بچھڑ جانے پر ملول تھے۔ پیغام کے مطابق مجاہد اوّل بنگال سے سندھ پہنچ رہا تھا۔ اسے ہم سے کراچی میں ملنا تھا۔

جب ہم ملتان سے فرار ہوئے تو ہمارے ساتھ ستیش بھی تھا۔ ملتان میں اب اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ہاں میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ ملتان میں فائرنگ سے ہلاک ہونے والے جن لوگوں کو شناخت کیا گیا تھا، ان میں ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد بھی تھا۔ انگریزوں نے اسے عدالت میں پیش کرنے کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے گولی ماردی ہوگی۔ جو سرکاری بیان جاری ہوا اس میں کہا گیا کہ ہنگاموں کے دوران میں جو چار فوجی اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے انہیں بلوائیوں نے ماردیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوائی آمادہ بغاوت تھے۔ انتظامیہ کے لیے اسی سبب ضروری کارروائی ناگزیر ہوگئی تاکہ شہریوں کے جان ومال کا تحفظ کیا جاسکے۔

ملتان میں جو کچھ ہوا اس پر پورے ہندوستان میں ہاہاکار مچی۔ ان دنوں کیوں کہ پریس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ ایسے افراد کا جو انگریز کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہا کرتے تھے لہٰذا اس واقعے کو صحیح سیاق وسباق کے ساتھ اخبارات میں جگہ نہیں ملی۔ واقعات کو غلط رنگ دیا گیا۔ کہا گیا کہ ملتان میں کئی مندروں کو نذر آتش کردیا گیا، کئی ہندوؤں کو مارا گیا اور کئی کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا، مگر کسی نے یہ نہ پوچھا کہ جن دنوں میں یہ واقعات ہوئے انگریز انتظامیہ کہاں سوئی ہوئی تھی؟ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حالات نازک ہیں، فوج اور پولیس سمیت کیوں ملتان سے چلا گیا تھا؟ حقیقت صرف یہ تھی کہ ان دنوں میں صرف ایک پرانا مندر جلایا گیا تھا اور یہ مندر وہی تھا جس میں خود انگریز نے آگ لگوائی تھی۔ ملتان میں کسی بھی ہندو کو مسلمان نہیں بنایا گیا تھا اور اگر ایسا تھا بھی تو انگریز فوج کی وحشیانہ کارروائی کے بعد انہیں پھر اپنا دھرم اختیار کرنے سے کون روک سکتا تھا؟ مگر یہ وہ سوالات تھے جو مسلمانوں کی زبان پر تھے، ان باتوں کو اخبارات میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ تمام ہندو پریس اور انگریزوں کے پروردہ اخبارات بس ایک ہی راگ الاپ رہے تھے کہ ملتان کے مسلمانوں نے ہندوؤں پر بڑا ظلم کیا ہے، تحریک خلافت کے زیر اثر ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں نے اعلان جہاد کردیا ہے۔

ستیش کو میں نے بھائی عطا اللہ خاں کے نام ایک خط دے کر علی گڑھ بھیج دیا تھا کہ ستیش کی ہر ممکن مدد کریں۔ اس کے سوا میں ستیش کے لیے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

○☆○

کراچی پہنچ کر ہم نے اپنے ایک تنظیمی ساتھی کے بڑے سے گھر میں قیام کیا۔ اس گھر کی اونچی اونچی کھپریلوں کی چھتیں تھیں۔ مردانہ حصہ قطعی الگ تھا۔ اس گھرانے کی خواتین پردہ کرتی تھیں۔ یہ گھر سولجر بازار میں تھا۔ مجاہد اول کی طرف سے ہمیں یہیں قیام کا حکم ملا تھا۔ گھر ہی کی حدود میں دو بڑے بڑے لان تھے جن کے کنارے کنارے اونچے درخت لگے ہوئے تھے۔ سب سے عمدہ بات یہ تھی کہ اس بڑے گھر میں آمدورفت کے لیے بھی دو بڑے پھاٹک تھے یعنی فرار کی راہ موجود تھی۔ گھر کے کمرے اتنے بڑے بڑے تھے کہ بہ یک وقت ایک کمرے میں دس پندرہ آدمی تو بستر بچھا کر آرام سے سوسکتے تھے۔ کچھ کمرے نسبتاً چھوٹے بھی تھے۔ گھر کے مردانہ اور زنانہ حصے کے درمیان جو دروازے تھے اگر انہیں بند کردیا جاتا تو مردانہ حصہ بالکل الگ ہوجاتا تھا۔ یہاں آکر مجھے سکون سا محسوس ہوا۔ ملتان کی نسبت یہاں کا موسم بھی سمندر سے قربت کے سبب معتدل تھا۔

گھر میں زیادہ افراد بھی نہیں تھے۔ ایک بڑے میاں لان میں چارپائی بچھائے درخت کے نیچے حقہ گڑگڑا رہے تھے اور اونگھا کرتے تھے۔ ان کے قریب ایک کرسی پڑی رہتی تھی کہ کوئی آجائے تو اس کرسی پر بیٹھ جائے، مگر جب سے میں یہاں آیا تھا کسی کو اس کرسی پر بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ جس چارپائی پر بڑے میاں لیٹتے بیٹھتے رہتے تھے اس پر کچھ بچھا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں نے بڑے میاں کو کلمہ شہادت کی انگلی سے ہوا میں کچھ لکھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر جھریوں کا جال تھا، رنگ گورا اور قد لمبا تھا۔ کلین شیو تھے، سر پر انگریزی بال تھے۔ اس زمانے میں انگریزی بال کٹوانا مسلمان گھرانوں میں عموماً معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اپنی وضع قطع سے بڑے میاں خاصے ماڈرن لگتے تھے، اس کے علاوہ پڑھے لکھے بھی لگتے تھے۔ اپنی گردن وہ بالکل کسی گدھ کی طرح شانوں سے باہر نکالنے اور پھر دوبارہ شانوں کے درمیان غائب کرنے میں عجب مہارت رکھتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کی طرف دیکھ کر مجھے یوں لگتا جیسے ان کا سر شانوں پر دھرا ہو۔ بہرحال بڑے میاں عجیب سی پُراسرار شخصیت تھے۔ میری نظر کبھی ان کی طرف اٹھ جاتی اور نظریں مل جاتیں تو ان کی باچھیں کھنچ کر دونوں کانوں تک پہنچنے لگتیں۔ ہمہ وقت ان

کے گرد میں نے کتابیں دیکھیں، موٹی موٹی کتابیں۔ اکثر وہ مطالعے میں غرق رہتے تھے اور یہی ان سے میری دلچسپی کا سبب تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ کرسی جو خالی پڑی رہتی ہے، میں اس پر جا کے بیٹھ جایا کروں اور اس بہانے دیکھ تو لوں قریب جا کر کہ بڑے میاں آخر کیا پڑھتے رہتے ہیں، مگر بخت خاں نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔ اس نے مجھے کام سے کام رکھنے کی تاکید کی۔ اسی کے ساتھ بخت خاں نے یہ بھی بتایا کہ وہ بڑے میاں ہمارے میزبان تنظیمی ساتھی کے والد بزرگوار ہیں۔ ہم پر بھی ان کا ادب لازم ہے وغیرہ۔

ہمارے میزبان تنظیمی ساتھی نے اپنا نام صلاح الدین ایوبی بتایا تھا۔ ہم اسے صرف ایوبی کہتے تھے اور یہ اس کا تنظیمی نام ہی لگتا تھا۔ اصل نام میں نے پوچھا نہ بخت خاں نے۔ رہے جوگیندر اور سیتا تو وہ دونوں ہی بہت دل گرفتہ وافسردہ تھے اور اس کا سبب ملتان کی مہم میں ناکامی تھی۔ ناکامی کا اثر مجھ پر اور بخت خاں پر بھی تھا مگر ہم نے اسے دانستہ اپنے ذہنوں سے جھٹک دیا تھا۔ بخت خاں کا کہنا یہ تھا کہ اگر آدمی ماضی ہی کو روتا رہے تو مستقبل کے لیے کچھ نہیں کرسکتا اور میں بخت خاں کے اس خیال سے متفق تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ ہمیں جو کام سونپا گیا تھا ہم اس میں ناکام رہے تھے۔

پنجاب کے بعد اب ہم وادی مہران میں تھے۔ ہمارے لیے ہدایات نہیں تھیں، سوائے اس پیغام کے کہ ہم لوگ بس گھر تک محدود رہیں۔ یہ پیغام ہمیں ایوبی کی معرفت ملا تھا۔ میں نے اس عرصے میں ایک کام کیا۔ ملتان میں پیش آنے والے واقعات کو میں نے قلم بند کرلیا اور ایک ایک تفصیل اس رپورٹ میں لکھی۔ تین روز کے بعد مجاہد اوّل رات کے وقت اپنی مخصوص ہیئت میں ہمارے سامنے موجود تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جوگیندر اور سیتا کے سامنے آیا تھا۔

اس ملاقات میں میرے لیے پہلی خوش خبری یہ تھی کہ مجاہد اوّل نے سیتا اور جوگیندر کو تنظیم کی رکنیت دے دی تھی۔ سیتا سے وفاداری کا عہد قرآن پر ہاتھ رکھوا کر لیا گیا کیوں کہ وہ مسلمان ہوچکی تھی۔ جوگیندر نے انسان کی قسم کھائی تھی۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ مجاہد اوّل نے ان دونوں کو کراچی کیوں بلوایا تھا۔ پھر مجاہد اوّل نے ایک اور انکشاف کیا "جوگیندر! تمہارے چاچی موہن لال نے بھی انسان ہی کی قسم کھائی تھی۔ تمہیں یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ تمہارے چاچی بھی تنظیم میں شمولیت اختیار کرچکے ہیں، میں کلکتے ہی سے آرہا ہوں" پھر مجاہد اوّل نے ملتان مہم کی رپورٹ طلب کی۔

بخت خاں کیوں کہ ملتان مہم کا نگراں تھا اس لیے مختصراً اسی نے ملتان میں پیش آنے والے واقعات بیان کیے۔ بخت خاں کے خاموش ہوتے ہی میں نے اپنی تحریری رپورٹ مجاہد اول کو پیش کردی۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ سے کتنی بڑی حماقت سرزد ہورہی ہے۔

"شاہین" مجاہد اول نے مجھے مخاطب کیا "تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے زندگی کی جو راہ اپنائی ہے' وہ ایسی ہے جس میں ہر اگلا لمحہ موت کی نوید لے کر آسکتا ہے۔ اس زندگی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ نہ وقت کا بھروسا کرو' نہ کسی کی ذات پر' حتیٰ کہ اپنی ذات پر بھی نہیں۔ ٹھیک ہے تم نے یہ رپورٹ نیک نیتی کے ساتھ تنظیم کے لیے لکھی ہے مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تمہیں اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد ہے۔ تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ اس مکان میں تم بالکل محفوظ ہو۔ پولیس یا سرکاری کارندے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے' مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کا مظاہرہ تم ملتان میں ہیڈ ماسٹر گنگا پرشاد کی گرفتاری' اس کے گھر پر چھاپے اور سیٹھ کے وہاں سے فرار ہونے کی شکل میں دیکھ سکتے ہو۔ کبھی اس بات پر یقین نہ کرو کہ تم محفوظ ہو۔ سن لو کہ ہندوستان میں تمہارے لیے کوئی جائے اماں نہیں۔ کسی بھی لمحے پولیس یا سی آئی ڈی تم تک پہنچ سکتی ہے۔ لاہور میں تم نے یہ تجربہ بھی کرلیا ہے' بتاؤ ایسا ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں" میں نے کہا "ایسا ہی ہے۔"

"تو بتاؤ اگر پولیس یہاں پہنچ جائے تو کیا یہ رپورٹ تمہارے خلاف استعمال نہیں کرسکتی؟ کیا تم ایسی صورت میں خود اپنے خلاف پولیس کو تمام ثبوت مہیا کرنے کا وسیلہ نہیں بن جاؤ گے؟" مجاہد اول چند لمحے خاموش ہوگیا۔ اس نے باری باری ہم سب کو گھورا۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا جس میں ہم اپنے دلوں کی دھڑکنیں صاف سن سکتے تھے "بولو شاہین' جواب دو!"

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا' سوائے اس کے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلوں "آپ درست کہہ رہے ہیں۔"

"اسے کہتے ہیں حالات کی طرف سے چشم پوشی' خوش فہمی اور غفلت!" مجاہد اول کی آواز سے غصے کا اظہار ہورہا تھا۔ "اس ذرا سی غفلت سے تم سب کسی مصیبت میں گرفتار ہوسکتے تھے' تنظیم کے تاروپود بکھر سکتے تھے" مجاہد اول کی شعلہ بار آنکھیں نقاب کے اندر سے انگارے برسا رہی تھیں "بتاؤ' کیا میں نے جھوٹ کہا ہے؟"

"جی نہیں" میری آواز بہت دھیمی تھی۔ مجاہد اول نے جو کچھ کہا تھا' ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی یقین نہیں تھا کہ ہم وہاں محفوظ تھے۔ بڑے میاں کا کردار اس احساس کا سبب تھا۔

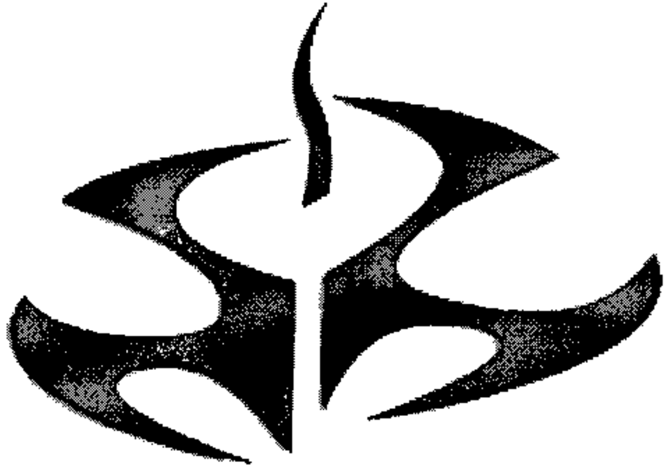
"بہرحال" مجاہد اول نے رپورٹ کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا "تم نے اس رپورٹ میں اپنے تمام ساتھیوں اور مددگاروں کے نام استعمال کیے ہیں۔ اس طرح تم نے سب لوگوں کے ساتھ دشمنی کی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی تنظیم کے ساتھ جس کے لیے تم نے اپنی جان تک داؤ پر لگادی ہے۔ یہ سب کچھ تم نے نادانستگی میں کیا ہے اس کے باوجود تم ناقابل معافی ہو کہ عملاً تم ہی اس مہم میں اپنے دستے کے سربراہ تھے" پھر وہ بخت خاں کی طرف مڑا "کیا یہ بات درست نہیں ہے بخت خاں؟ مہم کا نگراں ہونے کے باوجود کیا شاہین ہی نے تمہارے دستے کی کمان نہیں کی؟"

"صلاحیت تو اپنے آپ کو منوا ہی لیتی ہے اے مجاہد اول" بخت خاں نے اپنی روایتی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا "میرے نزدیک شاہین کا قصور ایسا نہیں کہ اسے معاف نہ کیا جاسکے۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں' کسی مہم کی رپورٹ لکھنا کبھی کبھار ضروری بھی ہوجاتا ہے اے مجاہد اول! اور آپ مجھ سے بہتر یہ بات جانتے ہیں۔"

"میں کیا جانتا ہوں اور کیا نہیں' اس سے قطع نظر تمہاری بات ایک حد تک درست ہے بخت خاں! ہماری جیسی تنظیموں کے اراکین کو کبھی کبھار اس قسم کی رپورٹیں لکھنی پڑتی ہیں مگر انتہائی مجبوری کے عالم میں اور اس وقت جب کہ انہیں یہ رپورٹیں کہیں دور اور فوراً ہی کسی کو بھیجنی ہوتی ہیں۔ رپورٹ لکھنے کے بعد وہ اسے اپنے پاس نہیں رکھتے' فوراً اسے روانہ کردیتے ہیں کیوں کہ ایسی تنظیمیں ایسے رابطے اختیار کرتی ہیں جو انتہائی محفوظ ہوتے ہیں۔ پھر ایسی رپورٹوں میں افراد اور مقامات کے نام بھی فرضی لکھے جاتے ہیں۔ تنظیم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کون سا سرفروش کس جگہ کام کررہا ہے اور اسے کیا ذمے داری سونپی گئی ہے۔ اس کے ساتھیوں میں کون کون شامل ہیں۔"



پہلا حصہ اختتام کو پہنچا
اس سلسلے کے بقیہ واقعات دوسرے حصہ میں ملاحظہ کریں جو اس کے ساتھ ہی شائع کیا گیا ہے۔

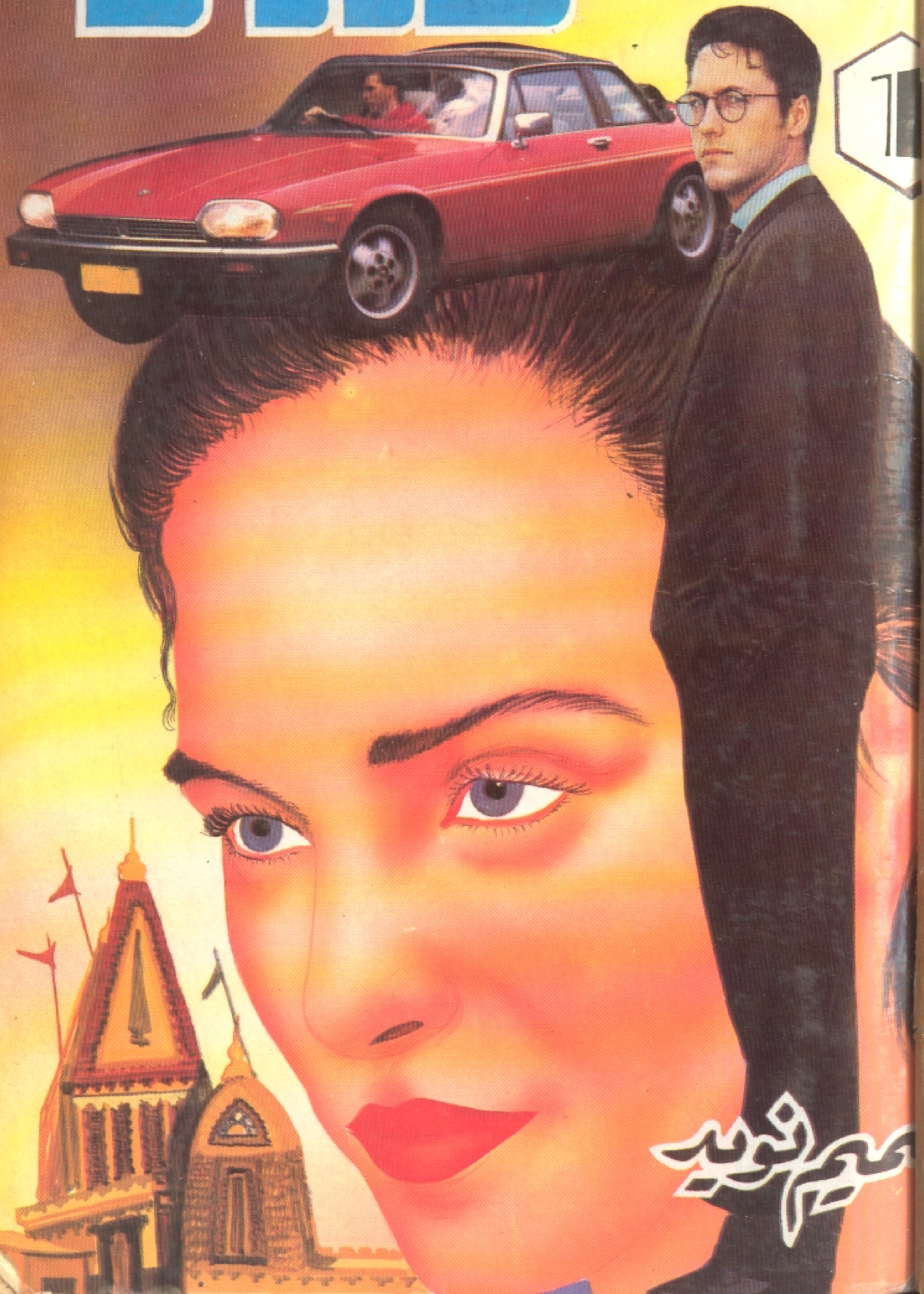


Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

طارنوش

قت پر حیران و پریشان رہنے والا "طارنوش"
ایک حفاظتی خوشبو حصار میں لئے رہتی تھی۔



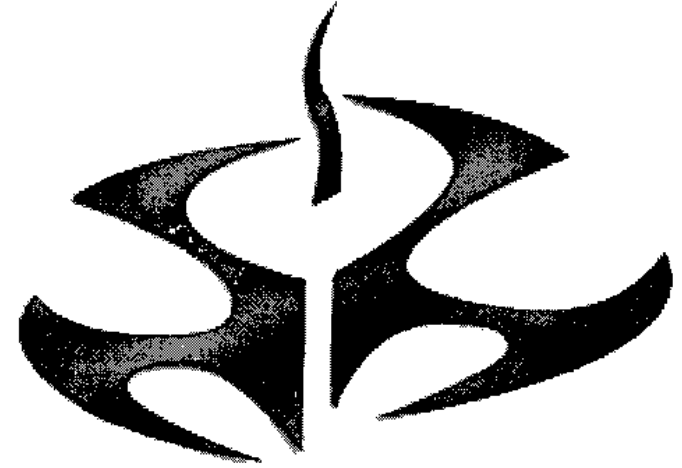
ایک پراسرار وجود کی تہلکہ خیز سرگزشت
ایک بے مثال خودنوشت

طارنوش

حصہ دوم

شمیم نوید

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون:7248599-7229762



مجاہد اوّل ذرا توقف کے بعد میری طرف رخ کر کے پھر بولا "یہ سب تمہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ تم ایک مہم سے لوٹ رہے تھے۔ اگر تم گرفتار بھی ہو جاتے تو بخت خاں سے یہ معلومات تنظیم کو مل جاتیں۔ کیوں؟"

"جی ہاں!" میں نے اقرار کیا اور جوگیندر کی طرف دیکھا' پھر بخت خاں اور بیتا کی طرف۔ ان سب کی آنکھوں میں سہم اور اضطراب تھا۔

"تم سب ایک بات یاد رکھو۔ تم اپنے حافظے پر اعتماد کرنا چھوڑ دو۔ اس بات سے نہ ڈرو کہ تم کوئی اہم بات بھول جاؤ گے۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں رپورٹ میں تحریر کرو' ذہنی رپورٹ میں لکھوا دو اور رپورٹ لکھنے کے بعد فوراً ہی اسے تنظیم کی طرف روانہ کر دو۔ متحرک آدمی کم خطرے میں ہوتا ہے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے شاہین!" مجاہد اوّل خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے بیتا سے کہا "جاؤ بیٹیا! ایک بالٹی لے آؤ۔"

بالٹی آئی تو مجاہد اوّل نے رپورٹ میری طرف پھینکتے ہوئے کہا کہ اسے جلا دو! میں نے رپورٹ کے کاغذات بالٹی میں ڈالے اور ماچس سے آگ لگا دی۔

"اب تمہیں جو کچھ مزید بتانا ہے' زبانی بتاؤ!" مجاہد اوّل مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے تمام باتیں دہرانا شروع کیں' رپورٹ بالٹی میں جلتی رہی۔

رپورٹ سننے کے بعد مجاہد اوّل نے کہا "تمہیں اس غلطی کی سزا بھگتنا ہوگی" اس کا لہجہ بہت سرد تھا "آج سے اگلے احکام تک تم کسی بھی دستے کے سربراہ نہیں ہو گے۔ اب جوگیندر اس دستے کی قیادت کرے گا۔ بخت خاں نے خود اقرار کر لیا ہے کہ وہ مشن کی مہم پر دراصل تمہارے ہی مشوروں پر عمل کرتا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ عملاً تمہارے حق میں دستبردار ہو گیا تھا۔ بولو تم جوگیندر کے تحت کام کرو گے؟ بولو منظور ہے تمہیں؟"

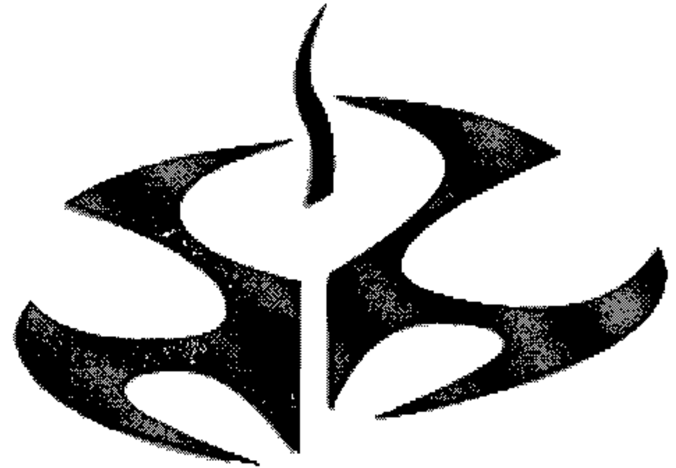
"اے مجاہد اوّل! میں نے اس وطن کے لیے جان دینے کا عہد کیا ہے' تنظیم سے وفاداری کا عہد کیا ہے' مجھے کسی دستے کا سربراہ بننے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں ایک عام رکن کی حیثیت سے بھی کام کر لوں گا۔"

"مگر جناب..." جوگیندر نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں جوگیندر! تم شاہین کے دوست ہو تو تنظیم کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ بولو تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"جی نہیں" جوگیندر نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

پُراسرار' ہیبت ناک' جناتی ناول



ایم۔اے راحت

گل قریشی پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

"سنو! اب انگریز حکومت کا سارا زور سندھ پر ہے۔ وہ یہاں وہی کھیل کھیلنا چاہتی ہے جو ملتان میں کھیل چکی ہے۔ اب تمہیں سندھ میں کام کرنا ہے۔ جلد ہی تمہیں اس سلسلے میں ضروری ہدایات مل جائیں گی۔ ملتان سے تمہیں اس لیے یہاں بلوایا گیا ہے" مجاہد اوّل اب ایک نئی مہم کے بارے میں ہمیں سمجھا رہا تھا "یہ مہم صرف کسی ایک شہر تک محدود نہیں ہوگی۔ اس میں افراد کم سے کم ہوں گے اور سنو! اگر کبھی تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ اور وہ تم سے تنظیم کے متعلق سوالات کرے، تو تمہیں ہر سوال کا جواب نفی میں دینا ہے۔ تم ہر بات سے انکار کرتے چلے جانا۔ انکار میں تمہاری بچت ہے۔ انکار ہی میں تنظیم کا بھلا ہے۔ انکار ہی میں تمہاری فتح ہے۔ تمہارا انکار ہی اس ملک کے لیے سب سے زیادہ مفید ہے۔ انکار ہی کرتے رہنا' خواہ تمہیں کتنے ہی تشدد سے گزرنا پڑے۔ خواہ تم خود کو موت کے کنارے ہی کیوں نہ محسوس کرو۔ یاد رکھو جب تک تم انکار کرتے رہو گے تمہاری جان بچی رہے گی۔ جس لمحے تم نے اقرار کیا' اسی وقت سے تمہاری زندگی کے آخری لمحوں کی گنتی شروع ہو جائے گی" مجاہد اوّل نے ایک نظر ہم چاروں پر ڈالی۔ کمرے میں سناٹا پھیل گیا تھا "بولو میری بات سمجھ میں آگئی؟"

"جی ہاں" ہم چاروں نے سحرزدہ انداز میں بہ یک وقت کہا۔

"شاہین!" مجاہد اوّل کی آواز گونجی "اب تم یہاں نہیں رہو گے" یہ کہہ کر اس نے اپنے لباس سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا "اب تم اس پتے پر منتقل ہو جاؤ گے۔ وہاں تمہیں تین دن رہنا ہے۔ اس عرصے میں تم نہ کسی سے ملو گے' نہ کہیں باہر جاؤ گے۔" میں نے کارڈ کو ایک نظر دیکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ کارڈ پر رتن تالاب کے علاقے میں کسی عمارت کا نام اور فلیٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔ "میں خود تمہیں وہاں اتاروں گا" مجاہد اوّل نے کہا۔ اس کے بعد وہ بخت خان سے مخاطب ہوا "تمہیں' جوگیندر اور کنیز فاطمہ کو فی الحال یہیں رہنا ہے۔ اب ضرورت نہیں رہی کہ اسے سیتا کہا جائے یہ اب فاطمہ ہے' صرف فاطمہ ـــ اس تنظیم کی پہلی مجاہدہ!" مجاہد اوّل کی آواز میں سیتا یا فاطمہ کے لیے پدرانہ شفقت تھی۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ صرف لفظ "فاطمہ" اس پر بھلا لگ رہا تھا "کنیز" نے اس لفظ کے حسن اور معصومیت کو مجروح کر دیا تھا۔ سو میں نے سیتا کو فاطمہ کی حیثیت سے قبول کیا اور وہ ـــ وہ تو مجھے بہت پہلے قبول کر چکی تھی "اچھا فاطمہ' شاہین اور بخت خان! تم دوسرے کمرے میں جاؤ' مجھے جوگیندر کو کچھ ہدایات دینا ہیں۔"

ہم لوگ اٹھ کر برابر والے کمرے میں آگئے۔ فاطمہ نے مجھے اور میں نے فاطمہ کو دیکھا۔ بچھڑنے کی گھڑی پھر آگئی تھی۔ مجاہد اوّل مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ مجاہد اوّل کوئی نصف گھنٹے تک جوگیندر سے گفتگو کرتا رہا اور اس عرصے میں فاطمہ کی اور میری آنکھیں بھی ایک دوسرے سے گفتگو کرتی رہیں۔



رتن تالاب کے اس فلیٹ میں تین دن بند رہنا ایک طرح سے میری سزا تھی۔ سولجر بازار میں ایولی کے گھر سے نکلتے وقت مجاہد اوّل نے ایک بار پھر سختی سے کہا تھا کہ مجھے تین دن تک اس فلیٹ سے قطعی نہیں نکلنا ہے۔ "خواہ پولیس آ جائے یا زلزلہ' آگ لگ جائے یا کوئی اور آفت آ جائے' تین دن قید تنہائی تمہاری سزا ہے۔"

مجاہد اوّل ایک موٹر میں سولجر بازار آیا تھا۔ جسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ واپسی میں اس کے ساتھ میں بھی تھا۔ اس نے مجھے کار کی پچھلی نشست پر بٹھایا تھا اور پھر رتن تالاب کے علاقے میں ایک عمارت کے سامنے اس نے موٹر روک لی تھی۔ یہ وہی عمارت تھی جس کا نام کارڈ پر لکھا تھا۔

میں نے فلیٹ میں آکر اس کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ باورچی خانے میں اتنا سامان تھا کہ اگر مجھے وہاں ایک مہینے بھی رہنا پڑتا تو کھانے کے لیے باہر نہ جانا پڑتا۔ یہ فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں مسہری پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں فرش پر قالین بچھا تھا۔ وہاں دو الماریاں موجود تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اور چند کرسیاں دیوار کے سہارے رکھی تھیں۔

ایک کمرے کے آگے بالکونی بنی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں اسی سمت سڑک کی جانب کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ فلیٹ کا جائزہ لے کر میں نے اطمینان سے کپڑے بدلے اور مسہری پر لیٹ گیا۔ میرا ذہن اس وقت دہلی میں تھا جہاں میری ممی تھیں اور جہاں ایک پاگل سی لڑکی رہا کرتی تھی جس نے مجھ سے عشق کرنے کے جرم میں خودکشی کر لی تھی' جہاں میری پہلی محبت قتل کر دی گئی تھی بلونت کور! پھر ڈیڈی کی طرف میرے ذہن کی رو منتقل ہو گئی اور میں سوچنے لگا' میرے اور ڈیڈی کے درمیان اس قدر اختلاف بھی قدرت کا تماشا ہے۔ وہ انگریز کے نوکر تھے اور انگریز کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مجھے اس بات پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی کہ میری پرورش ان ہاتھوں میں ہوئی تھی جو انگریز کو سیلوٹ کرتے تھے۔ ایک سوال میرے ذہن میں اکثر پیدا ہوتا تھا اور کبھی میں اس کا جواب نہ دے پاتا تھا کہ اگر کبھی اس تنظیم کی خاطر' اس ملک کے کاز کی خاطر میں نے خود کو ڈیڈی سے مقابل پایا تو میرا کیا رویہ ہوگا؟ مگر آج میں اس بارے میں اپنا فیصلہ دے سکتا تھا۔ یقیناً اگر کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنی تنظیم اور اپنے وطن کو ترجیح دوں گا۔ رام مورتی' حمید اللہ اور میرے ڈیڈی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ سب میری مخالفت میں صف آرا تھے۔ یہ سب ان لوگوں میں شامل تھے جن سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں سو گیا۔ میں نے رات بھر بہت پریشان خواب دیکھے۔ کبھی دیکھا کہ میری لاش کفنائی ہوئی رکھی ہے اور ممی بین کر رہی ہیں مگر کسی کمرے سے ڈیڈی کے قہقہے ابھر رہے ہیں' کبھی میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں موجود ہوں' میز کے ساتھ ایک کرسی پر صدرِ عدالت کے مانند بیٹھا ہوں۔ جوگیندر' ڈیڈی کے خلاف فرد جرم پڑھ رہا ہے اور میں ان کی موت کا حکم صادر کر رہا ہوں۔

دروازے پر زوردار دستک سن کر میں بیدار ہو گیا۔ کون ہو سکتا ہے؟ کون آ سکتا ہے؟ میرے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دودھ والے کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا اور میں نے دیگچی میں دودھ لے لیا۔

جبری تنہائی میں وقت کس قدر سست روی سے گزرتا ہے' یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس آزار سے گزرے ہوں۔ میں نے الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں سے دل بہلانا چاہا مگر وہ سب کتابیں میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ تمام کتابیں سائنس کے مختلف موضوعات سے متعلق تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ تمام کتابیں وہاں جان بوجھ کر رکھی گئی ہوں تاکہ میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان پیدا نہ کر سکوں۔

تمام دن اسی کوفت میں اور جھلاتے ہوئے گزر گیا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔ اس فلیٹ میں میری دوسری رات تھی۔ ابھی مجھے وہاں ایک اور دن گزارنا تھا' ایک اور شب بسر کرنا تھی۔ بیکار ہونے کی وجہ سے مجھ پر تھکن کا احساس غالب تھا۔ ایک کاہلی تھی کہ میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ ذہن ہر وقت سویا سویا رہتا تھا۔ اس رات مجھے بڑی دیر میں نیند آئی۔



دروازہ بہت زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ "کون ہے؟" میں نے آواز دی۔

"دروازہ کھولو!" ایک سخت آواز سنائی دی۔ "پولیس۔"

مجھے دروازہ کھولنا ہی تھا۔ وہ فلیٹ میرے لیے پنجرا ثابت ہوا تھا۔

دروازے پر دو مسلح پولیس والے اور ایک سادہ لباس والا موجود تھا۔ "مسٹر طارنوش!"

میں اپنا اصل نام سادہ لباس والے کی زبان سے سن کر اچھل پڑا' پھر اپنے حواس پر قابو پا کر بولا۔ "کیا بات ہے؟ آپ کس لیے آئے ہیں؟" پولیس کی اچانک آمد پر میں حیران رہ گیا تھا۔ میرا اصل نام تو اب تک میرے تنظیمی ساتھیوں تک کو معلوم نہیں تھا۔

"آپ کو ہیڈ کوارٹر چلنا ہے ہمارے ساتھ!" سادہ لباس والے نے کہا۔

مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ میں نے فلیٹ میں تالا ڈالا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ زینے اتر کر ہم نیچے آئے تو وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ میں دونوں مسلح پولیس والوں کے درمیان بیٹھا اور کار چل پڑی۔ پھر مجھے بے بس کر دیا گیا میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

میں کس چکر میں پھنس گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اگر اطمینان تھا تو صرف یہ کہ مجھے قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی تو یقیناً میری نگرانی بھی کی گئی ہوگی کہ میں مجاہد اوّل کی ہدایات سے روگردانی تو نہیں کر رہا ہوں!

لاہور میں جس طرح مجھے سی آئی اے سینٹر لے جایا گیا تھا' کراچی میں تقریباً میرے ساتھ وہی ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ جب میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو میں کسی عمارت کے تہ خانے میں تھا۔ کوئی دس فٹ کے فاصلے پر ایک میز کے پیچھے تین افراد بیٹھے تھے۔ مجھے ان سے دور ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ سادہ لباس والا ایک طرف ہاتھ باندھے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ہر طرف ستون ہی ستون تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کسی بلند و بالا عمارت کا تہ خانہ تھا۔ میرے منہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی سامنے میز کے ساتھ ہی رکھی تھی اور اس کا رخ میرے چہرے کی جانب تھا۔ میز کے دونوں طرف دو مسلح سپاہی موجود تھے۔ ان کی رائفلیں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

چند لمحے بعد تہ خانے میں قدموں کی آواز ابھری۔ میں

نے دائیں جانب دیکھا ادھر سے ایک اور باوردی سپاہی مستعد انداز میں میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔ اس نے یہ فائل سادہ لباس والے کو دی اور واپس چلا گیا۔ سادہ لباس والے نے چند قدم بڑھا کر یہ فائل درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص کو دے دی۔ فائل پر سرخ حروف میں "خفیہ" کا لفظ چمکتا نظر آیا تھا۔

خمیدہ ناک اور گھنی بھنوؤں والے نے فائل کا معائنہ کیا۔ اس کا انداز ایسے گدھ کا تھا جو کسی مردہ لاش کو نوچنے سے پہلے اس کا معائنہ کرتا ہے۔ خمیدہ ناک والے نے سر اٹھا کر مجھے مخاطب کیا۔ "طارنوش! اب اپنے سارے پتے کھول دو۔"

"کون سے پتے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب تک تمہاری کیا مصروفیات رہی ہیں۔"

"پھر تو تمہیں مایوس ہونا چاہیے کہ میں تمہارے مطلب کا آدمی نہیں ہوں۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔

اس کی تیز آنکھیں جیسے میرے دماغ میں گھسی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں سنگدلانہ کیفیت تھی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے وہ شخص یاد آ گیا جس نے لاہور کے پی آئی اے سینٹر میں میرے کان کی لو استرے سے اڑا دی تھی۔ خمیدہ ناک والا اس سے زیادہ خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔

"طارنوش!" اس کی باریک آواز چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ "میں جھوٹ بولنے والے کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سادہ لباس والے سے بولا۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو!"

سادہ لباس والے نے میرے ہاتھ کرسی کی پشت کے ساتھ موڑ کر رسی سے باندھ دیے۔ اس وقت خمیدہ ناک والا میرے نزدیک آ چکا تھا۔

"کالا مرلی دھر، رادھا، ساوتری، سید حیدر عباس، مسعود، پنڈت گردھاری لال، شمبھو، قاسم، رام مورتی، خان بہادر حمید اللہ، رائے بہادر وشنو کمار، گنگا پرشاد، احمد حسین۔" خمیدہ ناک والا ایک ایک نام کو واضح الفاظ میں دہراتا رہا۔ "ان میں سے کسی نام کا کوئی شخص تمہارے ذہن میں ابھرتا ہے؟"

میں نے آنکھیں جھپکائیں۔

"دہلی سے علی گڑھ، علی گڑھ سے اترولی، علی گڑھ ہی سے جلالی، پھر علی گڑھ۔ اس کے بعد دوبارہ دہلی۔ وہاں سے لاہور گاہور سے براستہ لائل پور، ملتان اور پھر ملتان سے کراچی!" اس نے کہا۔ "کچھ یاد آیا؟"

میرا سانس رک گیا اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ان لوگوں کو سب کچھ معلوم تھا۔ انکار بے سود ہے۔ مجھے ممی یاد آئیں، ڈیڈی یاد آئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریز سے ڈیڈی کی وفاداری یاد آئی۔ ایک نفرت سی میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ یہ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہوا۔

"کچھ یاد آیا؟ بولو!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو!"

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میرے پانچ تک گنتی گننے کے ساتھ ہی یہ دونوں سپاہی گولی چلا دیں گے۔" اس نے کہا۔

میں نے میز کی دونوں جانب کھڑے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا جنہوں نے نشانے ٹھیک کر لیے تھے۔

"احمق! پاگل میں کچھ نہیں جانتا۔ تم مجھے مارنا ہی چاہ رہے ہو تو بہانے کیوں تراش رہے ہو۔" میں چیخ کر بولا۔ میں اس گومگو کی صورت حال کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔" اس نے گنتی شروع کی۔

کیا میں پانچ تک کی گنتی تک ثابت قدم رہ سکوں گا؟ شاید نہیں۔ میں نے سوچا۔ خان بہادر حمید اللہ بھی جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس وقت میرے تمام حواس جیسے سُن ہو گئے تھے۔ مگر اس نے تین کے بعد کچھ نہیں کہا۔ ایک طویل وقفے کے بعد خمیدہ ناک میرے چہرے پر جھک آئی۔ اس کی سکڑی ہوئی گھنی بھنوؤں کے نیچے الو جیسی زرد زرد آنکھیں میری آنکھوں پر جم گئیں۔ "سنو طارنوش! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری موت کو آسان بنا دوں۔ ہمیں تمہاری تمام سرگرمیوں کا علم ہے۔ وہ فائل دیکھ رہے ہو اس میں دہلی، علی گڑھ اور جلالی سے لے کر لاہور اور ملتان تک کی تمام رپورٹیں ہیں۔ میں خاص طور پر شملے سے آیا ہوں۔ تمہیں علم نہیں شاید کہ ہم تم تک تمہارے ڈیڈی کی بدولت پہنچے ہیں۔ تم سچ سچ سب قبول دو۔ تمہاری ڈیڈی نے حکومت سے تمہاری بخشش کرا لی ہے۔ تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ تم سرکاری گواہ بنا لیے جاؤ گے۔ ورنہ۔۔۔؟"

"ورنہ کیا ہو گا؟" میں بول اٹھا۔

"ورنہ ہمیں حقیقت اگلوانے کے سیکڑوں طریقے آتے ہیں۔" وہ پیچھے ہٹ گیا۔ "تمہارے ڈیڈی نے وائسرائے سے مل کر تمہاری زندگی کی بھیک مانگ لی ہے، مگر یہ بھیک صرف اسی صورت میں ملے گی کہ تم رضاکارانہ طور پر سب کچھ مان لو، اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لو۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"حکومت کا ایک اسلحہ ڈپو اڑا دینا، حکومت کے وفاداروں کو قتل کرنا، لاہور کے پی آئی اے سینٹر پر حملہ کرانا، حکومت کے ایک غدار کو چھڑا لے جانا اور ملتان میں حکومت کے خلاف ہنگامے کرانا، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا، کیا تم انہیں جرائم نہیں سمجھتے؟"

زندگی، زندگی! خوبصورت دنیا، خوبصورت و معصوم فاطمہ! فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں میرے تصور پر محیط ہو گئیں۔ مجھے اس کے ہونٹوں کا لمس یاد آیا۔ مجھے اپنی ممی کا چہرہ یاد آیا۔ یہ سب کچھ خوبصورت ہے۔ یہی زندگی ہے۔

"اپنے ڈیڈی کی شفقت یاد کرو، اپنی ممی کو یاد کرو!" اس کی آواز ابھری۔

"ممی۔ ماں۔ نہیں! یہ دھرتی میری ماں ہے۔ میں مادر وطن کا سپاہی ہوں۔ مجھے اپنے بے شمار عہد یاد آئے جو میں نے ارض وطن سے کیے تھے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا، میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مجاہد اول کی ہدایت یاد آئی۔ اگر کبھی پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ تو کسی بات کا اقرار نہ کرنا، ہر بات کو جھٹلانا، ہر بات سے انکار کرنا، اسی میں تمہاری جیت ہے اسی میں تمہارے بچنے کا امکان ہے۔ یہ الفاظ یاد آتے ہی میں نے اپنے اندر ایک اعتماد سا محسوس کیا۔ یہ لوگ معلومات حاصل کیے بغیر مجھے نہیں مار سکتے۔

"تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔" اس زرد رو نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری لاش پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ہماری رپورٹ یہ ہو گی کہ تم قانون سے فرار ہونے کی کوشش میں مارے گئے ہو۔"

"تم مجھ سے جھوٹی باتوں کا اعتراف کیوں کرانا چاہتے ہو؟" میں بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں، ان معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تم کن باتوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو!"

"چلو ہم یہ بات مان لیتے ہیں۔ تم اسی لیے ان سب باتوں کو جھٹلا رہے ہو کہ تمہیں زندگی عزیز ہے۔ یہ زندگی تمہیں ان جرائم کا اعتراف کرنے کی صورت میں بھی مل سکتی ہے۔ سیکریٹری آف اسٹیٹس کا خط پڑھو!" اس نے میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے فائل کھول کر کاغذات الٹ پلٹ کیے اور پھر ایک کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنا شروع کی۔ اس خط کا لب لباب یہ تھا۔

ہز میجسٹی کی حکومت مسٹر ڈیسوزا کو یہ یقین دلاتی ہے کہ اگر ان کے بیٹے طارنوش نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا جن کی نوعیت انتہائی گھناؤنی ہے تو مسٹر ڈیسوزا کی خدمات کے صلے میں حکومت ان کے بیٹے سے رحم کا سلوک کرے گی اور ان کے بیٹے کو حکومت کے باغیوں کے خلاف سرکاری گواہ بنا کر اس کی جان بخش دے گی۔

خط ختم ہو چکا تھا۔ "سنا تم نے۔" شکرے نما شخص نے میرے پاس آ کر کہا۔ "جرائم کا اعتراف کر دو یا اپنے بقول غلط باتوں کا، دونوں صورتوں میں تم زندہ رہو گے۔ صرف اعتراف کر لو اور زندہ رہو۔" وہ پیچھے ہٹا۔ "ہم نے تمہاری جانب سے اعترافی بیان تیار کر لیا ہے۔" اس نے مڑ کر سادہ لباس والے سے کہا۔ "اقرار نامہ لاؤ۔"

سادہ لباس والا میز کی طرف بڑھا۔ کرخت چہرے والے نے سادہ لباس والے کو ایک اور فائل اٹھا کر دی۔ اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا اور اسے فائل پر رکھ کر میرے سامنے کر دیا۔

"پڑھ لو۔" شکرے نما انسان کی آواز ابھری۔

میں نے وہ بیان پڑھا۔ مختصر سے مضمون میں یہ ان تمام واقعات کا اعتراف تھا، جن میں، میں شریک تھا۔ یہ مضمون میری زندگی کا پروانہ تھا، میری زندگی کا پیغام تھا، اس زندگی کا پیغام جو میر جعفر اور میر صادق کو ملی تھی۔ تاریخ میرا نام بھی انہی لوگوں کی فہرست میں رقم کرے گی۔ انکار کرتے رہو، اعتراف ہرگز نہ کرو، خواہ تم خود کو موت کی دہلیز پر کیوں نہ محسوس کرو! مجاہد اول کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ یہ بھی زندگی کا پیغام تھا، آبرومندانہ زندگی کا پیغام!

"اے خدا! مجھے حوصلہ عطا فرما!" میں نے دل ہی دل میں اپنے رب سے دعا کی، پھر بولا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔"

"کیا حماقت کر رہے ہو!" سادہ لباس والے نے سرگوشی کی۔

"بکواس مت کرو!" میں زور سے چیخا۔ "میں دستخط نہیں کروں گا۔"

شکرے جیسا شخص میز پر اپنی کرسی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "آخری موقع دے رہا ہوں۔ میرے گنتی گننے سے قبل اقرار کر لو۔" خاموشی چھا گئی۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

میں خوف زدہ نہیں تھا مگر ٹھنڈا ٹھنڈا پسینا میرے جسم

سے چھوٹ رہا تھا۔ میں اس کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "گنتی گنو' الو کے پٹھو! گنتی گنو! میں اقرار نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم' نہیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں جو کچھ تم نے اس بیان میں لکھا ہے۔ گنتی گنو!" میں پوری قوت سے دہاڑا۔ اور گنتی شروع ہو گئی۔

"ایک!" اس نے کہا۔ ساتھ ہی دونوں سپاہیوں نے رائفلوں کے بٹ کاندھوں سے جما کر نال کے ساتھ اپنی آنکھیں لگا دیں۔ "اوہو' تمہارا تو چہرہ پسینے میں بھیگ گیا!"

"گنتی گنو! جلدی سے یہ سب ختم کر دو اور گولی چلا دو۔" میں دیوانوں کی طرح چیخا۔

"دو!" اس کی سرد آواز ابھری۔ "حماقت نہ کرو اگر یہ سب کچھ جھوٹ ہے تو بھی تم کیوں اپنی جان گنواتے ہو؟"

"گنتی گنو!" میں پھر بولا۔ اب میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ میں اپنے وطن پر قربان ہو کر سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

"تین!" وہی سرد آواز ابھری۔ "کوئی ذہین آدمی یوں خودکشی نہیں کرتا۔"

"تم ذلیل' کتے! میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ختم کرو۔ گولی چلاؤ!" میں نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"چار!" ہر قسم کے جذبات سے عاری اس کی سرد آواز ابھری۔ "اس کے بعد میں جو ہندسہ کہوں گا اس کے ساتھ ہی گولیاں چلیں گی پھر میں تمہیں کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکوں گا۔"

"تیرے مشورے کی ایسی تیسی!" میں پاگلوں کی طرح چیخا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "چلاؤ گولی!" دونوں سپاہیوں نے زور سے ایڑیاں بجائیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز پہلے سنوں گا یا پہلے میرے گولی لگے گی؟ میں ان گولیوں کا منتظر تھا جو مجھے چھید کر اس دنیا سے میرا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے والی تھیں۔ اس وقت کسی کا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں تھا' نہ ممی کا' نہ ڈیڈی کا نہ اسنی کا نہ فاطمہ کا خیال! میرا ذہن اس وقت قطعی خالی تھا۔





"آخری بار اس دنیا کو دیکھ لو طارنوش کہ یہ دنیا بہت حسین اور خوب صورت ہے۔" شکرے نما شخص کی آواز ایک بار پھر سنائی دی "اب میں آخری ہندسہ کہنے والا ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ تم خودکشی کرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں یہ موقع۔۔۔" اس کی بات پوری نہ ہو سکی اور میز پر جو بلب جل رہا تھا' بجھ گیا۔

اسی لمحے میں نے ایک دھماکا سنا اور پھر ہر طرف سناٹا پھیل گیا' تاریکی اور سناٹا! اس کے بعد بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں۔ معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا تھا۔ اسی تاریکی میں کوئی میری طرف دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کرسی کی پشت سے میرے ہاتھ کھول دیے۔ میں کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ جیسے میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرا ذہن اردگرد پھیلے ہوئے اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اسی فلیٹ میں پایا جہاں سے مجھے لے جایا گیا تھا۔ میں مسہری پر دراز تھا اور مسہری کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر جوگیندر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر چند لمحوں کو حیرت ہوئی اور پھر میرا ذہن کڑیاں جوڑنے لگا۔

سی آئی اے والے مجھے اس فلیٹ سے اٹھا کر لے گئے تھے اور پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ عین اس وقت میرے تنظیمی ساتھیوں نے مجھے بچا لیا۔ فوری طور پر میں اس کے سوا کچھ نہ سمجھ سکا لیکن میری دانست میں دوبارہ مجھے اسی فلیٹ میں لے آنا غلطی تھی۔ وہ فلیٹ سی آئی اے والوں کی نظر میں آچکا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے یہی بات میری زبان پر آئی۔ میں نے آخر میں کہا "یہاں سے جلد از جلد کہیں چلو جوگیندر! ورنہ میرے ساتھ تم بھی خطرے میں پڑ جاؤ گے!" یہ کہتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

خلاف توقع جوگیندر کے چہرے پر مجھے اطمینان و سکون نظر آیا۔ وہ بولا "لیٹے رہو یار!۔۔۔ اور یہ بتاؤ کہ سر پر زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ اندھیرے میں بخت خاں سے غلطی ہو گئی۔ وہ اس پر پشیمان ہے۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا "تو کیا میرے سر پر کوئی بھاری چیز مارنے والا بخت خاں تھا؟"

"ہاں" جوگیندر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ مجاہد اول کا حکم یہی تھا۔" اس نے بتایا' پھر کہنے لگا "میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"لیکن تم پہلے میری بات تو سن لو کہ یہاں خطرہ۔۔۔"

"معلوم ہے مجھے۔" اس نے میری بات کاٹ دی پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا "اب کوئی خطرہ وطرہ نہیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جوگیندر کے اطمینان اور مسکرانے پر مجھے حیرت تھی۔ یا تو اسے حقائق کا علم نہیں تھا یا پھر وہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا شکار تھا لیکن حقیقت کچھ اور ہی نکلی جس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب وہ چائے بنا کر لے آیا۔

مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے اس نے مبارکباد دی "مبارک ہو شاہین کہ تم ایک ایسے امتحان میں کامیاب ہو گئے جس میں بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیسا امتحان؟"

"چائے تو پیو ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے چائے کی چسکی لی۔

پھر مجھے جوگیندر سے جو کچھ معلوم ہوا وہ میرے لیے انتہائی حیران کن تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجاہد اول کے ایما پر میرا ایسا کڑا امتحان لیا جائے گا۔ ہر امتحان میں کامیابی کسی ترقی کی دلیل ہوتی ہے اور اب وطن پرست تنظیم میں مجھے بھی ترقی مل چکی تھی۔ تنظیم کے جن افراد نے میرا یہ امتحان لیا تھا' انہوں نے گویا مجھے سو میں سے سو نمبر دیے تھے۔ مجاہد اول کے بعد تنظیم میں انہی تینوں کا درجہ تھا جنھوں نے سی آئی اے کے اعلیٰ افسران کا کردار ادا کیا تھا۔ انہیں اسی امتحان کی غرض سے مجاہد اول نے کراچی طلب کیا تھا۔ ان کا تعلق ملک کے مختلف گوشوں سے تھا۔ ان سبھی نے اتنی بھرپور اور مکمل اداکاری کی تھی کہ مجھے اس پر حقیقت کا گمان ہوا تھا۔ انہوں نے بالکل ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ جیسے واقعی مجھے گولی مارنے والے ہوں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ اب انہی تینوں میں سے چوتھا میں تھا' یعنی مجاہد اول کے بعد تنظیم میں چوتھا درجہ مجھے حاصل ہو گیا تھا۔ اب مجھے وقت اور حالات کے مطابق خود ہر فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔ اس کے لیے مجھے مجاہد اول سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

میرے ہی امتحان کے ساتھ ساتھ جوگیندر' بخت خاں' فاطمہ اور ایوبی کا بھی امتحان لیا گیا تھا۔ ابتدا میں انہیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ میں سی آئی اے کی قید میں ہوں اور میری زندگی خطرے میں ہے۔ اس مقام کے سوا مجاہد اول نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا جہاں مجھ سے "پوچھ گچھ" کی جا رہی تھی۔ ہاں اس نے مجھے بے ہوش کرنے کی ہدایت ضرور دی تھی۔ ذرا غور کرنے پر اس ہدایت کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ اس وقت میری ذہنی حالت حقیقتاً ایسی تھی کہ مجھ سے کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت سرزد ہو سکتی تھی۔

مجھے سی آئی اے والوں کی فرضی قید سے چھڑانے کا منصوبہ جوگیندر نے بنایا تھا۔ بخت خاں' فاطمہ اور ایوبی نے اس کی معاونت کی تھی۔ میرے فلیٹ کے تالے کی چابی انہیں میری جیب ہی میں مل گئی تھی۔ فلیٹ کا پتا انہیں مجاہد اول ہی سے معلوم ہوا تھا۔ میری بے ہوشی کے دوران ہی میں مجاہد اول وہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کا تعلق تنظیم ہی سے تھا۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ دی تھی کہ سر پر معمولی چوٹ آئی ہے۔ پھر وہ مجھے ایک انجکشن دے کر مجاہد اول کے حکم پر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اسی کے بعد مجاہد اول نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہم سب کا امتحان لیا گیا تھا اور ہم سبھی اس میں کامیاب رہے تھے۔

بخت خاں' فاطمہ اور ایوبی کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا کہ انہیں سولجر بازار چھوڑ دے گا۔ جوگیندر کو وہ میری تیمارداری اور حقیقت حال سے آگاہ کرنے کی غرض سے وہیں چھوڑ گیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجاہد اول نے مجھے جو تین دن قید تنہائی کی سزا دی تھی' وہ اپنی جگہ برقرار تھی۔ ابھی مجھے کل کا دن بھی اسی فلیٹ میں گزارنا تھا۔ ویسے موجودہ حالات کے پیش نظر عملاً اب یہ قید تنہائی نہیں رہی تھی کیوں کہ جوگیندر بھی وہاں میری تیمارداری کے لیے موجود تھا۔ محبت میں آدمی خودغرض بھی ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے مجھے فاطمہ کا خیال آ رہا تھا جو کبھی سیتا ہوا کرتی تھی اور جو جوگیندر کی بہن تھی۔ مجاہد اول کے ایما پر اب ہم سب اسے صرف فاطمہ کہنے لگے تھے۔ اس علاقے میں کوئی ایسی مصلحت ہمارے سامنے نہیں تھی کہ اسے سیتا کہا جاتا' ملتان کی بات اور تھی۔ وہاں اسے ہندو ہی ظاہر کرنا ضروری تھا تاکہ ہندوؤں کو اعتماد میں لیا جا سکے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر جوگیندر کے بجائے اس کی بہن فاطمہ میری تیماردار ہوتی تو کتنا اچھا تھا! اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ آئندہ روز میری یہی خواہش حقیقت بن جائے گی' فاطمہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر صبح ہی صبح وہاں پہنچ جائے گی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ بخت خاں بھی اس

کے ساتھ آیا تھا جس نے مجھے مجاہد اول کا ایک پیغام دیا۔ بند سبز لفافہ بخت خاں نے میرے حوالے کر دیا تھا۔ یہ لفافہ گزشتہ شب بہ وقت رخصت اسے مجاہد اول نے دیا تھا کہ آئندہ روز صبح مجھے پہنچا دیا جائے۔ بخت خاں مجھے وہی لفافہ دینے آ رہا تھا کہ فاطمہ نے بھی اس کے ساتھ چلنے کو کہہ دیا۔

اس روز صبح ہم چاروں نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ ناشتا فاطمہ نے بنایا تھا۔ اسی دوران میں بخت خاں نے گزشتہ رات میرے سر پر ضرب لگانے کے سلسلے میں معذرت کی۔ اس نے کہا کہ دراصل اندھیرے کی وجہ سے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا۔

"گور شتن سو گز شتن" میں ہنس کر بولا "اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے ہوش بہ ہوتے اور بستر پر بیٹھے ہوئے فکر نہ چڑا تا۔"

"دیکھو اب تم اچھے بھلے ہو گئے ہو' یہ ڈراما نہیں چلے گا۔" جوگیندر مسکرا کر بولا "دوپہر کا کھانا تم پکاؤ گے۔"

"بھیا! یہ زیادتی نہیں چلے گی۔" فاطمہ بول اٹھی "ابھی شاہین کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"دیکھ مسکی' اگر تیرے کلیجے میں شاہین کے لیے زیادہ درد اٹھ رہا ہے تو پھر تو رک جا یہاں!" اس نے اپنی بہن سے کہا۔

•

"ہاں ہاں رک جاتی ہوں' تم بخت خاں کے ساتھ سولجر بازار سے" سیتا فوراً بولی۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" بخت خاں نے بھی ہنس کر تائید کی "آج فاطمہ کی پریڈ کنوائیے۔" پھر وہ دونوں ناشتا کر کے چلے گئے اور فاطمہ میرے پاس رہ گئی۔

میری زندگی کا وہ حسین ترین دن تھا۔ آج بھی اس دن کی یاد آتے ہی میرے ذہن میں چراغاں سا ہو جاتا ہے' لگتا ہے کہ فاطمہ سیاہ آسمان پر ستاروں کی محفل سج گئی ہو۔ بنات النعش گردوں آسمان کی وسعتوں میں آوارہ و عریاں ہو گئی ہوں۔ جب اکبر کے ستاروں نے چھپر کھٹ کے گرد لڑیاں پرو دی ہوں' زمین سے آسمان تک کہکشاں نے نور پھیلا دیا ہو' سدرہ سمٹ کر تجلۂ نور میں تبدیل ہو گئی ہو۔ اس روز میں نے اور فاطمہ نے کراچی کے خنک ماحول کی گرم گرم اور مشکی تنہائی میں خوب وقت گزارا۔ فاطمہ اس دن جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ بخت خاں اور جوگیندر وہاں سے گئے تو وہ انہیں جاتے دیکھتی رہی پھر دروازہ بند کر کے واپس آئی تو اس کی سانسیں بے ترتیب تھے۔ فرش پر اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں ڈولتی ہوئی آئی اور میری آغوش میں سمٹ گئی۔ میں اسے اپنے وجود کا حصہ بنا لینا چاہتا تھا تاکہ دوئی ختم ہو جائے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ستارے اتر آئے تھے' اس کے ہونٹوں پر وہ نمی پھوٹ آئی تھی جو گلاب کی پنکھڑی پر اوس کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سارا وجود بے ترتیب سانسوں کی وجہ سے متموج تھا۔ میرا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا تو اس نے ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ اپنی آنکھیں موند لیں اور اس کے لانبے لانبے بازو میری گردن کے گرد آ گئے۔

کیسی مٹھاس تھی' کیف و مستی کا کیسا عالم تھا' کیسا نشہ تھا' جسموں سے پھوٹتی وہ کیسی مہکار تھی۔ اس حسن اور اس واردات عشق کو لفظوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا' جذبے اپنے آپ میں ایک زبان ہوتے ہیں اور یہ احساس کی زبان ہوتی ہے۔ لفظ انہیں بیان کرتے ہوئے مضمحل اور بے جان ہو جاتے ہیں۔

فاطمہ کا یہ اضطراب اور بے چینی اس کے خوف کی علامت تھی۔ ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ نکلا ہوا آنے والا دن ہمارے لیے کیا پیغام لانے والا تھا۔ ہم سب تحت موت میں زندہ تھے اور اس لیے زندہ تھے کہ آنے والی نسلیں غلامی کے طوق سے آزاد ہو جائیں۔ ہمارے سامنے ایک بڑا اور نیک مقصد تھا۔ ہم سبھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہر گزرنے والا دن ہمیں قید و بند' صعوبتوں' اذیتوں' کالے پانی اور پھانسی سے قریب تر لے جا رہا ہے۔ ہم کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھے۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ اپنی ہر کارروائی سے اپنے لیے انگریزوں کے قانون کی گرفت کو زیادہ سخت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اپنے لیے مفر اور بچاؤ کی ہر راہ ہم مسدود کرتے جا رہے ہیں۔ میں نے فاطمہ کو آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا "ارے! یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے؟"

پھر وہ بلک ہی تو پڑی۔ "ہاں میرے دیوتا!" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "میں ڈرتی ہوں' آنے والے وقت سے ڈرتی ہوں! میں۔۔۔ میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔"

"پگلی!" میں نے کہا "ہمیں اس طرح ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوچو فاطمہ کہ ہم اس راہ میں مارے بھی گئے تو کیا ہوا! آنے والے زمانے میں کوئی بھی شاہین سے اس کی فاطمہ کو نہیں چھین سکے گا۔"

مگر آج میں سوچتا ہوں' اس وقت میں نے کتنی احمقانہ بات کہی تھی۔ وہ انسانی رشتے جنہیں مضبوط کرنے کے لیے اس دور میں ہر خطرے سے گزرنے کے لیے تیار رہتے تھے' وہ اقدار جن پر ہمیں یقین تھا' جو ہمارے لیے اس دور میں مشعل راہ تھیں' آزادی کے باوجود ہر گزرنے دن کے ساتھ غلامی کا دور ختم ہو جانے پر بھی کمزور سے کمزور تر ہوتی جائیں گی۔

اس روز دیر تک ہم اپنی جدوجہد کے حال اور مستقبل کے خطرات پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں کئی مرتبہ مدہوشی اور سرشاری کے جذبات بھی ہم پر غالب آئے اور ایسا اس وقت ہوا جب ہم تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری ناکامی یقینی ہے۔ پھر فاطمہ میرے شانے سے سر ٹکا دیتی اور سسکتے ہوئے سانسوں کے درمیان اس کی سرگوشی ابھرتی "پھر کیا ہوگا شاہین؟ اگر۔۔۔ تم اگر نہ رہے تو۔۔۔ تو میں کیا کروں گی؟"

"تم اسی راہ پر آگے بڑھتی رہو گی۔"

"تمہارے بغیر تو میں کوئی محفوظ ترین سفر بھی نہیں کر سکتی شاہین!" وہ بولی "تمہارے بغیر میرے لیے اس دنیا میں کچھ بھی تو نہیں رکھا۔" میں نے اس سے وعدہ لینا چاہا کہ وہ میرے بغیر بھی جدوجہد کی راہ ترک نہیں کرے گی تو اس نے خوب صورتی سے بات کو ٹال دیا۔ جذبات و ہیجان کے دوسرے لمحے میں جب میں نے پھر اس سے وعدہ کرنے کا اصرار کیا تو اس نے نقرئی گھنٹیاں بجاتے ہوئے کہا "میرے دیوتا! تم سمجھتے ہو گے کہ میں پاگل ہوں۔ میں بتاؤں' مجھے معلوم نہیں کیوں یقین سا ہے کہ میں ایک نہ ایک دن اپنے دیوتا پر اپنی جان نچھاور کر دوں گی اور اس اطمینان کے ساتھ مر جاؤں گی کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا ہے۔"

میں نے فاطمہ کے رخسار کو آہستہ سے تھپتھپایا "پگلی کہیں کی! ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

اس نے اپنے رخسار پر میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "شاہین! میں جو اتنی پاگل ہو جاتی ہوں' جانتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟" اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئیں "اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے اپنے انجام کی خبر ہے' جانتی ہوں میں کہ ان کی موت میرا مقدر ہے۔ ہم کبھی ان خوب صورت لمحوں کی انتہا کو نہیں چھو سکیں گے۔ یہ لمحے' یہ خوب صورت لمحے سلگتے ہوئے یونہی ہمیشہ تشنہ رہیں گے۔ ان لمحوں کی تکمیل کبھی نہیں ہوگی' مگر۔۔۔ میں۔۔۔ میں چاہتی ہوں۔۔۔" وہ میرے اور بھی قریب آ گئی "شاہین! میرے دیوتا! میں بکھر رہی ہوں' مجھے سمیٹ لو۔"

میٹھا میٹھا سا سرور آگیں درد میرے رگ و پے میں دوڑ گیا اور میں نے اسے سمیٹ لیا۔ اس لمحے مجھ میں اس قرب کا خیال تھا جو روح سے روح کو ملاتا ہے۔ میرے اندر ایک دشت آباد تھا جس پر کوئی محل کر رہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں شاہین کہ بس اس عالم میں مجھے موت آ جائے۔"

"تو تم وہ وعدہ نہیں کرو گی؟"

"ایک شرط پر کہ۔۔۔ کہ اگر میں تم پر نثار ہو گئی۔ اگر میں۔۔۔ میں تم سے پہلے مر گئی شاہین تو۔۔۔ تو تم کسی اور کو اپنا لینا۔ بولو شاہین' میری یہ شرط قبول ہے تمہیں؟" وہ میرے بازوؤں کے حلقے سے آزاد ہو گئی۔

"تم جانتی ہو فاطمہ کہ ہم۔۔۔ ہم اس وقت اتنے قریب ہو کر بھی ایک دوسرے سے اس قدر دور کیوں ہیں؟ جذبات کے تند و تیز دریا کے باوجود ہم دونوں' دو مخالف کناروں پر کیوں کھڑے ہیں؟ کون ہمیں اس دریا میں چھلانگ لگانے اور باہم ایک دوسرے میں جذب ہو جانے سے روک رہا ہے؟"

"میں جانتی ہوں شاہین!" فاطمہ نے کہا۔

"تمہارے بغیر میں اپنی زندگی کو نامکمل سمجھتا ہوں فاطمہ!" میں بولا "مجھے معلوم ہے کہ فاطمہ کا مکمل وجود میرے اور صرف میرے لیے ہے۔ اس وجود کے ہر انگ اور ہر رنگ کی ہر سرمستی صرف میرے لیے ہے میرا یہی یقین۔۔۔"

"اور میرے دیوتا!" فاطمہ نے میرے ہاتھ کی انگلیاں' اپنی انگلیوں میں پھنساتے ہوئے کہا "میں بھی یہی سمجھتی ہوں شاہین! ہمارا یہی یقین تو ہے جو ہمیں جذبات کے تند و تیز دریا میں بہا کر نہیں لے جاتا۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو شاید اب تک' اب تک ہم۔۔۔"

میں نے فاطمہ کو آگے کچھ نہ کہنے دیا اور اس یقین کے ساتھ کہ لذت وصل ہمارا مقدر نہیں ہے' اپنی روح کی تشنگی کو اور بڑھانے کے لیے اس کے لب و رخسار کی مدح کرنے لگا' یوں کہ کچھ اور کہنے کو نہ رہے' یہ کہتا وہ کہتا تھا کہ الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔ مایوسی کے اسی یقین کے بے تابانہ شدتوں کا جواب مجھے فاطمہ کی طرف سے بھی ملا۔

جسم و جاں کے تقاضے شدید تھے۔ اب مذاہب کا فرق بھی ہمارے درمیان سد راہ نہ تھا۔ ہم دونوں پوری شدتوں کے ساتھ ایک دوسرے کے طالب و مطلوب تھے مگر ایک مقدس عہد تھا جو ہمیں ان حدود میں داخل ہونے سے روک رہا تھا۔ یہ عہد تھا اس سرزمین سے جس کی آزادی کے لیے ہم سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ ہم نے اپنے لیے لذت وصل کو اس وقت تک کے لیے حرام کر رکھا تھا جب تک وطن آزادی سے ہم آغوش نہ ہو اور آزادی کی صبح بہت دور تھی۔

پھر بھی یہ مسرت کیا کم تھی کہ میں تھا' فاطمہ تھی اور

تنہائی تھی۔ بے پناہ مسرتوں کے ہجوم میں' مایوسیوں سے بوجھل آنکھوں میں نمی لیے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ مترنم ہنسی کے ساتھ وہ بلک اٹھی' جلترنگ جیسے رو دیا۔ میری آنکھوں میں بھی نمی تھی' میرے ہونٹوں پر بھی ہنسی تھی! غم آگیں مسرت سے چور اور نڈھال لمحے' جلترنگ کی غم زدہ دھن پر آہستہ آہستہ گزرتے رہے۔

○☆○

بخت خاں' مجاہد اوّل کا جو پیغام مجھے دے گیا تھا اس میں مجاہد اوّل نے لکھا تھا کہ وہ کراچی سے جا رہا ہے۔ اس کی اگلی منزل پنجاب کا ایک شہر راولپنڈی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ جب مجھے ضرورت محسوس ہوئی تمہیں پنجاب بلواؤں گا۔ سندھ میں اس نے مجھے اپنی نیابت سونپ دی تھی۔ دستے کا سالار بدستور جوگیندر ہی تھا مگر اب اسے میرے احکام کا پابند کردیا گیا تھا۔ میرے لیے اب یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سندھ کے ان شہروں کا خود بھی رخ کرتا جہاں انگریز فسادات کی آگ بھڑکانا چاہتا تھا۔ یہ میری مرضی پر منحصر تھا کہ جوگیندر' بخت خاں' فاطمہ اور ایوبی کے ساتھ کراچی سے نہیں جاتا یا نہ جاتا۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں رہی تھی۔ ہمارے ہندوستان میں تنظیم کے جو اہم ارکان تھے انہیں میری نئی حیثیت سے آگاہ کرنے کے لیے احکام جاری کردیے گئے۔ فہرست کو بھی میں نے بہت غور سے پڑھا۔ یہ فہرست کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں سرگرم ارکان پر مشتمل تھی جن سے میں جب چاہتا رابطہ قائم کرسکتا۔ مجھے یہ پوری فہرست ذہن نشین کرنے کے بعد ضائع کرنا تھی۔

اسی روز فاطمہ میرے لیے رات کا کھانا تیار کرنے کے بعد جوگیندر کے ساتھ [illegible] بازار چلی گئی تو میں اس فہرست میں درج نام پتے یاد کرنے لگا۔ جوگیندر شام کو پانچ بجے [illegible] آیا تھا۔ ہم دونوں نے شام کی چائے ساتھ ہی پی تھی۔ میں نے جوگیندر سے کہہ دیا تھا کہ [illegible] مجھے [illegible] ضرورت نہیں رہی۔

"مجاہد اوّل کی ہدایات کے مطابق ہمیں کل کسی وقت یہاں سے [illegible] کے لیے روانہ ہونا ہے۔" جوگیندر نے [illegible] تھا [illegible] کیا تم بھی [illegible] ساتھ چلو گے؟"

"اس کا جواب میں تم لوگوں کو کل صبح ہی دوں گا۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔" [illegible] بازار [illegible] ایوبی سے کہہ دیا کہ وہ [illegible] موجود رہے۔"

اس رات کو میں دیر تک اپنی شخصیت کے الجھے ہوئے دھاگے سلجھاتا رہا تھا۔ مجاہد اوّل کی نیابت نے میری ذمے داریوں میں خاصا اضافہ کردیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ بوجھ اٹھانا میرے بس میں ہے؟ دوسرا اہم سوال میرے لیے یہ تھا کہ اب بھی کیا میں فاطمہ سے اپنی اصل شخصیت چھپائے رہوں؟ فاطمہ نے اب تک اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو میرے عشق میں سراپا سپردگی تھی۔ اس نے تو مجھ سے اب تک میرا اصل نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ تو کیا میں یہ پردہ ابھی یونہی پڑا رہنے دوں؟ اسے یہ نہ بتاؤں کہ در اصل میں کون ہوں؟ کیا وہ یہ برداشت کرلے گی کہ جن کے عشق میں مبتلا ہے' اسے خود اپنی منزل کا علم نہیں؟ کیا فاطمہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں صرف آدم زاد نہیں بلکہ ... بھی ہوں' دہشت زدہ نہیں ہوجائے گی؟ پھر جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں اپنے باپ ہاموس کا انتقام لینا چاہتا ہوں تو اس پر کیا ردعمل ہوگا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات اس رات دیر تک میری نیند اڑاتے رہے۔ پھر میں نے اپنے گرد پُراسرار اسنی کی خوشبو محسوس کی تو چونک اٹھا۔ وہ میرے بے قرار دل کو قرار دینے آگئی تھی۔

"ابھی اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤ طارنوش!" اسنی کی آواز سنی "تم ٹھیک سوچ رہے ہو' وہ یہ سب برداشت نہیں کرسکے گی۔ پہلے ہی تم نے اسے اتنا اداس کر دیا ہے۔ میری جان' میرے چاند! میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ کامیابی یا ناکامی کی فکر چھوڑ دو! حرکت ہی زندگی ہے۔ نتیجہ اس ذات پر چھوڑ دو کہ جو ذات ہر ذات سے افضل ہے۔"

"اسنی! تم اگر مجھے یہ نہیں بتانا چاہتیں کہ ہماری جدوجہد کا انجام کیا ہوگا تو کم از کم اتنا تو بتادو کہ فاطمہ ہمیشہ کے لیے میری ہوسکے گی یا نہیں؟"

"وہ تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی اور سنو کہ میں تمہیں ایک بات اور تعلیم کرنا چاہتی ہوں' وہ جو تم جانتے! اس کے بعد تمہیں یہ کوئی اندازہ ہوجائے گا کہ تمہاری اسنی تمہیں کیا ہو سکتی ہے [illegible] کیا نہیں! سنو کہ غیب کا علم اللہ کی ذات کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ کل کیا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا اور جو یہ دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے' خواہ اس کا تعلق آدم زادوں سے ہو یا وہ میری طرح عالم جنات سے رکھتا ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ اللہ ہی کی مرضی اور منشا سے آدم زادوں اور جنات میں سے کچھ ایسے نیک بندے ہیں جن کو خود اللہ تعالیٰ نے کشف کے ذریعے یہ صلاحیت عطا کر رکھی ہے کہ وہ پیش گوئی کرسکیں ورنہ وہ اس کے بھی اہل نہ ہوتے۔ تم نے شاید قرآن حکیم کی سورۂ جن کا بہ غور مطالعہ نہیں کیا اور ان آیات کو بھی سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جن کا ورد کرتے رہتے ہو۔ قرآن کو رک رک کر غور سے پڑھو اور سمجھو' اس کتاب میں تمہیں اپنے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ ان عربی کی کتابوں کو بھی اپنے حافظے میں تازہ کرو جو تم پڑھ چکے ہو۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اسنی کی خوشبو معدوم ہوگئی۔

اسنی چلی گئی اور میں سورۂ جن پر غور و فکر کرنے لگا۔ اس سورت میں جنوں کے قرآن سن کر جانے اور عالم جنات میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بازار عکاظ تشریف لے جارہے تھے راستے میں نخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی' اس وقت جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزر رہا تھا تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا اس واقعے کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے۔

عربی زبان کی تعلیم حاصل کرکے مجھے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میں نے براہ راست عربی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور سب سے بڑی کتاب قرآن کو سمجھنے میں مجھے دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے عمدہ حافظہ ودیعت کیا تھا۔

سورۂ حجر' سورۂ صافات اور سورۂ ملک کی مختلف آیات میں بھی جنات کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالم بالا کی طرف پرواز کرسکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جاسکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو اور ملاء اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے سن گن لیں تو شہاب ثاقب انہیں مار بھگاتے ہیں۔

اسنی نے مجھے سورۂ جن کی جو آیتیں ورد کرتے رہنے کے لیے تعلیم کی تھیں۔ ان آیات کا مفہوم یہ تھا۔

اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرے داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہورہی ہے۔" اور یہ کہ "پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پالیتے تھے۔ مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔"

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ اسنی نے مجھے ورد کرنے کے لیے جو آیتیں بتائیں' ان کا مفہوم مندرجہ ذیل تھا۔

اور یہ کہ "ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہوگا۔"

"اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔ تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کرلیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔"

اس رات میرے حافظے میں دو واقعات اور تازہ ہوگئے۔ یہ دونوں واقعات میں نے عربی ہی کی کتابوں میں پڑھے تھے اور ان کا تعلق بھی جنات سے تھا۔ ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ حضورِ اکرمؐ کی بعثت کے وقت کسی جن نے جبل ابو قبیس پر چڑھ کر یہ آواز دی اور اشعار پڑھے۔

برا کرے اللہ تعالیٰ رائے کعب بن فہر کا
یہ لوگ کتنے سبک عقل ہیں
بنی کعب کا دین ان کے آباء کرام کے حمایت کرنے والوں کا دین ہے'
وہ اس دین میں ملامت کیے جاتے ہیں
تمہارا ساتھ جنات دیں گے جس وقت تم پر حکم کیا جائے
اور وہ مرد تمہارا ساتھ دیں گے جو تحمل و اطام کے ہیں
قریب ہے تو سواروں کو دیکھے گا کہ وہ خرام کریں گے
ایسی حالت میں کہ قوم کے بڑے شہروں میں قتل کریں گے
کیا تم لوگوں میں ایسا کوئی کریم ہے کہ اس کا نفس آزاد ہے
اور اس کے ماں باپ اور چچا شریف ہیں
وہ کریم ایسی ضرب لگانے والا ہو کہ وہ عذاب خوشی ہو تختی اور غم سے۔

یہ اشعار شہر مکہ میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ایک ایک مشرک کی زبان پر تھے۔ کفار ان کا مضمون سن کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں سے کہنے لگے' دیکھو تمہارے قتل اور شہر بدر ہونے کا حکم غیب سے ہوا ہے۔ اس پر مسلمانوں کو بہت رنج ہوا۔ اس سلسلے میں حضورؐ سے کہا گیا۔ آپؐ نے فرمایا' یہ شیطان مسعر تھا۔ اللہ تعالیٰ عنقریب اسے سزا دے گا۔

اس کے تیسرے ہی روز ایک زور آور جن مسلمان ہوگیا۔ اس کا نام سمحج تھا۔ حضورِ اکرمؐ نے اس کا نام تبدیل کرکے عبداللہ رکھا۔ عبداللہ نے مسعر کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے اجازت عطا فرمادی۔ پھر حضورؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا "مسعر آج قتل ہوجائے گا۔"

مسلمان بہت خوش ہوئے۔ اسی روز شام کے وقت پہاڑ سے ایک سخت آواز بلند ہوئی "ہم نے مسعر شیطان کو قتل کر ڈالا ہے۔ جبکہ اس نے سرکشی اور تکبر کیا۔ مسعر شیطان نے

حق کو سبک تھا اور امرِ مظہر کو نشت ٹھرایا۔ میں نے مشرکہ قتاع اس تلوار سے بنایا جو بنیادِ ہستی کو کھودنے والی اور قاطع ہے۔ اس شیطان کو میں نے اس لیے قتل کیا کہ اس نے ہمارے نبی مطہرؐ کو برا کہا۔"

دوسرا واقعہ جو مجھے یاد آیا وہ یہ تھا کہ جندلؓ بن نضلہ' حضورِ اکرمؐ کے پاس تشریف لائے۔ یہ واقعہ ان کے ایمان لانے کا ہے۔ انہوں نے حضورؐ سے کہا کہ میرا ایک دوست جنّات میں سے تھا' وہ یکایک میرے پاس آیا اور کہا "اٹھ تحقیق کہ دین کا سراج روشن ہوا ایسے پیغمبرؐ کے سبب جو صادق' مہذب اور امانت دار ہے۔ سو ایسی اونٹنی پر کوچ کر جو نجات دینے والی ہے اور خلقت میں مضبوط ہے' وہ نرم زمین اور سخت دونوں پر چلتی ہے۔" یہ اشعار سن کر میں نے پوچھا' کیا واقعہ ہے تو اس نے جواب دیا "قسم ہے زمین کو مسطح کرنے والے کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام روئے زمین پر مبعوث کیے گئے ہیں۔ محمدؐ نے مکہ مکرمہ میں نشوونما پائی ہے اور طیبہ کی طرف ہجرت کی ہے۔" یہ سنتے ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے روانہ ہوگیا۔ راستے میں یہ غیبی آواز میرے کان میں آئی "اے وہ شترسوار جو اپنی اونٹنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے جانے والا ہے' تحقیق تو نے ہدایت کی توفیق پائی۔"

سورۂ جن اور ان دونوں واقعات پر غوروفکر کرنے سے مجھ پر جو عقدہ کھلا وہ یہ تھا کہ حضورؐ سرورِ کائنات کی بعثت سے قبل جنّات آسمانوں کے راز زمین والوں پر ظاہر کردیتے تھے (آسمانوں سے یہاں مراد فاصلے ہیں) سو انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا کیوں کہ وہ کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی گھڑ کر بتادیتے تھے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ جنّات نے بھی حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ایمان لائے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ جانا کہ شیاطین' جنّات ہی میں سے ہوتے ہیں' ان سے الگ کوئی مخلوق نہیں اور یہ کہ عزازیل جو ابلیس کہلایا ان کافروں کا سربراہ ہے۔ مسعر جن کو حضورِ اکرمؐ نے شیطان کہا اور پھر وہ ایک جن ہی کے ہاتھوں حضورؐ کی پیش گوئی کے مطابق قتل ہوا' اس جن کے ہاتھوں جو ایمان لاچکا تھا۔

جندلؓ بن نضلہ کے ایمان لانے کے واقعے سے مجھ پر یہ کھلا کہ جنّات راہِ راست کی طرف انسانوں کی رہنمائی بھی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا من جانب اللہ ہی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اگر اللہ اپنے کسی نیک بندے کو چاہے تو کشف کے ذریعے پیش گوئی کا اہل بناسکتا ہے اور نہ چاہے تو بندہ درست پیش گوئی کرنے کا اہل نہیں ہوسکتا کیوں کہ عالم الغیب صرف خدا ہے جو بزرگ و برتر ذاتِ پاک ہے۔

اسنی سے میں نے جو سوال کیا تھا' مجھے اس کا جواب مل گیا تھا' بے شک قرآنِ حکیم انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دیتا ہے' شرط صرف اس کتاب کو سمجھنے کی ہے۔

وہ شب میرے لیے بڑی مبارک شب تھی کہ اس شب مجھ پر آگہی کے کچھ نئے در کھلے۔

بچپن سے اب تک کے مطالعے اور غوروفکر سے میں نے عالمِ ارواح اور عالمِ جنّات کی بابت جو کچھ جانا اور سمجھا تھا' مختصراً اسے یوں بیان کرسکتا ہوں کہ میری سرگزشت پڑھنے والا ہر شخص بہ آسانی ہر بات سمجھ سکے۔

قصہ یہ تھا کہ کائنات کے اس ٹکڑے پر جسے ہم زمین کہتے ہیں یہاں آدم علیہ السّلام سے پہلے جنّات آباد تھے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور جنّات ہی کو خلق کیا تھا جن کہ جس کی جمع جنّات ہے' ان میں اصلاحِ حال کی خاطر پیغمبر بھی اتارے جاتے رہے اور ان پر سرکشی کی وجہ سے عذاب بھی کیے جاتے رہے۔ پھر جب قادرِ مطلق نے آدم علیہ السّلام کو خلق کیا تو جنّات ہی کی نسل میں سے ایک جن عزازیل نے نافرمانی کی اور معتوب ہوا۔ وہ زمین کی خلافت کا دعویدار تھا۔ زمین کیوں کہ جنّات ہی کا گھر تھی اس لیے انہیں اس پر آدم علیہ السّلام اور ان کی نسل کا بسایا جانا اچھا نہ لگا۔ وہ جنّات جو صاحبِ ایمان تھے انہوں نے اللہ کے فیصلے کو قبول کرلیا اور وہ جو عزازیل کے بہکانے میں آگئے انہوں نے سرکشی اختیار کرلی اور آدم زادوں سے عداوت رکھنے لگے۔

تخلیقِ آدم کے بعد جنّات میں پیغمبر اتارے جانے بند کردیے گئے۔ نسلِ آدم میں جو پیغمبر آتے رہے' ان جنّات کو بھی انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا۔ سو یوں آدم زادوں ہی کی طرح جنّات میں بھی مختلف مذاہب عام ہوئے۔ کفروالحاد جنّات میں بھی اسی طرح در آیا جس طرح آدم زادوں میں پھولا پھلا۔

عیسیٰؑ کی بعثت سے پہلے جنّات آسمانوں پر آیا جایا کرتے تھے۔ فرشتوں سے بھی ان کا میل جول تھا۔ عیسیٰؑ کی بعثت پر جنّات کو پہلے آسمان سے اوپر جانے کی ممانعت کردی گئی۔ اس کے باوجود جنّات پہلے آسمان پر فرشتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لیتے تھے اور کاہنوں کو غیب کی باتیں بتادیا کرتے تھے۔ ان باتوں میں کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کردیتے تھے۔ حضور سرورِ عالم کی بعثت کے بعد جنّات کو آسمانوں پر جانے کی قطعی ممانعت ہوگئی۔ ان کے لیے یہ انتظام کردیا گیا کہ اگر کوئی جن آسمان پر جانے کی کوشش کرے تو اسے ستاروں کی آگ کے شعلوں سے بھگادیا جائے۔

میں نے سیرتِ حلبیہ میں پڑھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے کا ارادہ کیا تو آپؐ کی پیدائش سے پہلے کثرت کے ساتھ ستارے ٹوٹنے لگے۔ عرب اس حالت کو دیکھ کر گھبرائے اور ایک بڑے کاہن کے پاس گئے۔ یہ کاہن آنے والے واقعات کی پیش گوئی کیا کرتا تھا۔ کاہن نے کہا' اگر برج ٹوٹ رہے ہیں تو سمجھ لو دنیا کے خاتمے کا وقت آگیا ہے ورنہ دنیا میں کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آنے والا ہے۔ آنحضرت کی بعثت اس زمانے کا عظیم ترین واقعہ ہے۔

چونکہ عرب میں کہانت کا زور تھا اس لیے وحی الٰہی کو جنّات سے بچانے کے لیے آسمانوں پر ان کی آمد بند کردی گئی اور احتیاط کے طور پر یہ انتظام کردیا گیا کہ جنّات میں سے جو سرکش آسمانوں پر آنے یا آسمانوں کی بات سننے کی کوشش کرے اسے آگ کے شعلے مار مار کر بھگادیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے اس انتظام سے جہاں وحی الٰہی کی عصمت محفوظ ہوگئی۔ وہیں عرب سے کہانت کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

آنحضرتؐ سے کاہنوں کے متعلق ایک بار سوال کیا گیا تو فرمایا ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہؐ! یہ لوگ بعض وقت ایسی باتیں کرجاتے ہیں جو سچی ہوتی ہیں۔ ارشاد ہوا' جنّات کوئی کوئی بات فرشتوں سے سن کر کاہنوں کے کانوں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی طرف سے بھی ایسی باتیں غلط سلط کردیتے ہیں جو بالکل جھوٹی ہوتی ہیں۔

لغتِ عرب میں کاہن کا مطلب جادوگر' شگون لینے والا' جانوروں کی آواز سے غیب کی باتیں بتانے والا اور پیش گوئیاں کرنے والا ہے۔

بچپن سے اب تک اسنی بھی مجھ سے پیش گوئیاں کرتی رہی تھی مگر یہ پیش گوئیاں' کہانت کے باب میں نہیں آتی تھیں۔ ان میں مرضیِ الٰہی شامل تھی' ان کا مقصد مجھے نیک راہ پر لانا تھا' مجھ پر میرے اصل وجود کا انکشاف کرنا تھا' مجھے کفروالحاد کی طرف جانے سے روکنا تھا' مجھے یہ بتانا تھا کہ میرا وجود ایک جن اور ایک آدم زادی کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ اسی کے سبب عالمِ جنّات میں سے کچھ میرے دشمن ہیں وہی جو میرے ماں باپ کے دشمن تھے۔

ابھی میری جنگ عالمِ معلوم تک محدود تھی۔ میں شیطان صفت انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھا۔ عالمِ جنّات ابھی تک میرے لیے راز ہی تھا اور میں اس عالمِ نامعلوم کے متعلق قطعی بے خبر تھا کہ کب اور کیسے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوسکوں گا! اسنی کے خیال میں ابھی میں اس قابل نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فی الحال میری تمام تر توجہ زمین پر فتنہ و فساد بونے والے ایک شیطان کی طرف تھی اور یہ شیطانِ مجسم وہ انگریز تھا جو ارضِ ہند پر سازشوں کے جال بن رہا تھا' اپنوں ہی کے ہاتھوں اپنوں کے گلے کٹوا رہا تھا' صرف اس لیے کہ اس کے اقتدار کا سورج یونہی چمکتا رہے' وہ دونوں ہاتھوں سے ہندوستان کو لوٹتا رہے' ہندوستان کی دولت بٹور کر انگلستان لے جاتا رہے!

ہندوستان کے باسیوں کو آپس میں لڑوانے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے انگریز نے جو حکمتِ عملی اختیار کی تھی' وہ میرے خیال میں بہت خطرناک تھی۔ یہ حکمتِ عملی اس نے بہت سوچ سمجھ کر ترتیب دی تھی۔ اس نے ہندو ذہنیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مجاہدِ اول نے اس کا جو توڑ سوچا میرے نزدیک اسے محض تاریخی جبر کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس اتحاد کے بعد ہی ہماری جنگ کا اصل رخ انگریز کی طرف مڑ سکتا تھا۔

ملتان میں جو واقعات پیش آئے اور تمام تر کوششوں کے باوجود ہمیں جس طرح اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی' اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وادیِ سندھ میں بھی ہماری کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لالچی ہندو یہاں بھی ہمارے آڑے آتا۔ اس کے باوجود ہم برسرپیکار تھے۔ جنگ کا یہ رخ اپنے دفاع کا تھا۔ ہم اپنا دفاع کررہے تھے مگر میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ ہمیں اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ حملہ بھی کرنا چاہیے تھا' براہِ راست حملہ! اس طرح دشمن کی توجہ دو طرف بانٹی جاسکتی تھی۔ یوں دشمن اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہوجاتا۔

اس وقت میں سندھ میں تھا اور سندھ کے سیاسی حالات ہی میرے پیشِ نظر تھے۔ سندھ میں بھی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوچکی تھیں۔ انگریز ان تحریکوں کی پشت پناہی کررہا تھا۔ ان حالات و واقعات کے سبب سندھی مسلمانوں کے دل میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دونوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز الگ ہوگیا تھا۔ انہی دنوں پنجاب میں خاکسار اور احرار تحریکیں شروع ہوئیں۔ سندھ کے مسلمان بھی ان تحریکوں میں بڑے جوش و

خروش سے حصہ لے رہے تھے۔

اس دور میں مسلمانوں کے اخبارات 'الوحید' ستارہ سندھ اور سندھ زمیندار' مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح انداز میں ظاہر کر رہے تھے۔ یہ اخبارات سندھ میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کر رہے تھے۔ اس زمانے کے ہندو اخبارات ہندو' سنسار ساچار' ہندو گزٹ' سندھی اور بھارت اپنے قلم کا زور مسلم دشمنی پر صرف کر رہے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس زمانے میں سندھ الگ صوبہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہو رہا تھا۔ مسلمان ۱۹۰۸ء سے سندھ کو الگ صوبہ بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ شروع میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا لیکن بعد میں مخالفت شروع کر دی تھی۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال میں اس طرح اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ جاتا۔

۱۹۲۲ء کے بعد سندھ میں جو کچھ ہوا ضمناً اور اختصار کے ساتھ یہاں میں وہ بھی بیان کر دوں تو اس وقت جو صورتِ حال تھی اسے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ سندھ کے باب میں سب سے اہم واقعہ چودہ سال بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں ہوا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنایا گیا۔ اسی سال کے آخر میں الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ الیکشن کے لیے تین پارٹیاں بنیں۔ سر شاہنواز بھٹو اور ان کے دوستوں نے "یونائیٹڈ پارٹی"' سر غلام حسین نے "سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی" اور شیخ عبدالمجید سندھی نے "سندھ آزاد پارٹی" بنائی۔

۷ فروری ۱۹۳۷ء کو الیکشن ہوا اور یونائیٹڈ پارٹی نے ۲۴' پولیٹیکل پارٹی نے ۵ اور آزاد پارٹی نے ۳ نشستیں حاصل کیں۔ یونائیٹڈ پارٹی کے لیڈر سر شاہنواز بھٹو اور ڈپٹی لیڈر سر عبداللہ ہارون کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس پارٹی کے دوسرے ڈپٹی لیڈر خان بہادر اللہ بخش سومرو کامیاب ہو گئے۔ جمہوریت کے اصول کے مطابق گورنر کو لازم تھا کہ وہ خان بہادر اللہ بخش سومرو سے وزارت بنانے کے لیے کہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جمہوریت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سر غلام حسین کو وزارت بنانے کے لیے کہا گیا۔ گورنر کے اس اقدام نے سندھ میں خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی۔ اللہ بخش سومرو بڑے ذہین اور ہوشیار سیاست داں تھے۔ انہی کی سیاسی چالوں کے سبب آخر مارچ ۱۹۳۸ء میں سر غلام حسین کی وزارت ختم ہوئی اور اللہ بخش سومرو نے وزارت بنائی۔ اللہ بخش سومرو اتنے شاطر سیاست داں تھے

کہ سندھ کے دوسرے تمام سیاست داں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اللہ بخش سومرو کی سیاسی دانش مندی سے مرعوب تھے۔ آخر انہوں نے سومرو کا مقابلہ کرنے کے لیے سندھ میں مسلم لیگ کی شاخ بنانے کا فیصلہ کیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی بمبئی تشریف لے گئے اور قائدِ اعظم سے ملاقات کی۔ قائدِ اعظم سے وہ سندھ میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کرنے کی اجازت لے آئے۔ یوں مئی ۱۹۳۸ء میں سندھ پراونشل مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور پھر جلد ہی سندھ کے مختلف شہروں میں مسلم لیگ کی برانچیں قائم کر دی گئیں۔ سندھ میں مسلم لیگ کے جلسے ہونے لگے۔ اس کے لیے آغا غلام نبی اور شیخ عبدالمجید سندھی نے بہت کوششیں کیں۔ اکتوبر کی دس تاریخ سے بارہ تاریخ تک کراچی میں مسلم لیگ کی بہت بڑی کانفرنس ہوئی جو کراچی کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کانفرنس میں شیخ عبدالمجید سندھی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں واضح طور پر مطالبہ کیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی الگ حکومت بنائی جائے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں یہ قرارداد لاہور ریزولیشن سے ڈیڑھ سال پہلے پیش ہوئی اور اس میں پاکستان کے لیے واضح مطالبہ موجود تھا۔

۷ نومبر ۱۹۳۸ء کو سندھ مسلم لیگ کا باقاعدہ الیکشن ہوا اور سر عبداللہ ہارون اس کے باقاعدہ صدر ہوئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات بڑھتے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی بدنیتی کا اندازہ لگا کر اپنی تنظیم شروع کر دی۔ ہندو مسلم فسادات بھی ہونے لگے۔ ۱۹۳۹ء میں سب سے بڑا واقعہ ہوا۔ اس واقعے کا سبب سکھر کی مسجد منزل گاہ تھی۔ سول نافرمانی شروع ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان سندھ کے کونے کونے سے سکھر پہنچ گئے۔ انہوں نے منزل گاہ پر قبضہ کر لیا۔ حکومتِ وقت نے انہیں زبردستی وہاں سے ہٹا کر شہر سے کئی میل دور پھینکنا شروع کیا لیکن سکھر میں مسلمانوں کی آمد بدستور جاری تھی اسی لیے حکومت کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ نتیجے کے طور پر لاٹھی چارج ہوا اور آنسو گیس استعمال کی گئی جس سے متعدد مسلمان زخمی ہوئے۔ لیڈروں اور ہزاروں مسلمانوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ جیل جانے کے لیے اتنے لوگ تیار تھے کہ حکومت بوکھلا گئی۔ مسجد منزل گاہ پر ہندو اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کر رہے تھے' حکومت کو مسلمانوں کے سامنے جھکنا پڑا اور مسجد مسلمانوں کی تحویل میں دے دی گئی۔

مندرجہ بالا سیاسی پس منظر سے قطع نظر ۱۹۲۲ء میں سندھ کی صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ سندھ میں خلافت تحریک عروج پر تھی اور اس کا اثر شعر و ادب پر بھی پڑ رہا تھا۔ شعراء غازیوں کے حق میں شعر کہہ رہے تھے۔ ان کی شاعری سے انگریز کے لیے نفرت اور حقارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں مولانا تاج محمود امروٹی' حبیب اللہ خادم شکارپوری' محمد آدم' محمد ہاشم مخلص' نور محمد نظامانی اور حکیم فتح محمد سیوہانی قابلِ ذکر ہیں۔ گڑھی یاسین کے محمد آدم نے اپنے شعروں میں یونانیوں کے لیے یوں بددعا کی "اے خدا! ظالموں میں تباہی مچا دے' صلیبیوں کو سرنگوں کر' یونانیوں کو سمندر میں غرق کر دے اور ان پر قہر نازل فرما۔" (محمد آدم ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں وفات پائی) مولانا تاج محمود امروٹی غازیوں کی کامیابی کے لیے یہ دعا کر رہے تھے "میرے پروردگار! مصطفیٰ احرار کو کامل نصرت عطا فرما' غازیوں کی مدد کر کہ ان کی فتح و نصرت کی شہرت ہو جائے (مولانا کی وفات ۱۹۲۹ء میں ہوئی' سن پیدائش ۱۸۴۴ء ہے) شکارپور کے حبیب اللہ خادم کہہ رہے تھے۔ "اللہ تبارک تعالیٰ جلد ہی ہمیں کامیاب کرے گا اور ظالم انگریز حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دین ہمیشہ شاداب ہو اور اس کا پرچم دیکھ کر دشمنوں میں لرزش پیدا ہو جائے۔ صلیبی ہر جگہ سرنگوں رہیں۔"

میرپور خاص کے محمد ہاشم مخلص نے تو نظم و نثر کے ذریعے سارے سندھ میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ حریت کا جذبہ اس سندھی شاعر کی نس نس میں سمایا ہوا تھا۔ برطانوی سامراج کے خلاف کھلم کھلا نفرت کا اظہار مخلص کی شاعری کا نمایاں پہلو تھا۔ نور محمد نظامانی اپنی صحافیانہ صلاحیتیں آریہ سماجی ہندوؤں کی شرارتوں کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔

زمینداروں اور پیروں وڈیروں کے خلاف بھی کئی صحافی اور شاعر اپنے قلم کا زور صرف کر رہے تھے "توحید" میں خاص طور پر پیروں کے خلاف میں نے مضامین دیکھے۔ ان مضامین میں یہ ظاہر کیا جاتا کہ اکثر پیر جاہل اور مکار ہیں' یہ عوام کا خون چوستے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان مضامین میں یہ بھی بیان کیا جاتا کہ ان کی حرکتیں اور عوام کے توہمات اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں "الوحید" میں زمینداروں کے مظالم اور سرکار پرست ذہنیت کے متعلق مضامین چھپ رہے تھے۔

اخبار "مسلمان" پیروں' زمینداروں اور راشی ملازموں کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر انداز میں لکھ رہا تھا۔ ہاری تحریک بھی زوروں پر تھی۔ لکھنے والے ہاری کی بے بسی' ناداری' بے کسی اور زمینداروں کے ظلم کو اپنا موضوع بنا رہے تھے۔ ان میں حیدر بخش جتوئی' کشن چند بیوس اور محمد ہاشم مخلص نمایاں تھے۔

مجاہدِ اول نے مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے جس جدوجہد کا آغاز کیا' سندھ میں صوفی تحریک اس کے لیے بڑی معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ روحل فقیر کی درگاہ واقع کنڈڑی' سچل سرمست کی درگاہ واقع رانی پور' قادر بخش بیدل کی درگاہ واقع روہڑی' ان تمام ہی مقامات پر ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ میلے ہوتے تھے۔ متعدد ہندو' مسلمان بزرگوں کے مرید ہو رہے تھے۔ شاہ' سچل' بیدل' بیکس اور روحل فقیر کی شاعری ہندو مسلم ملاپ کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ سچل سرمست کی درگاہ کے سجادہ نشین سخی قبول محمد بڑی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ہندو بھی ان کے بڑے عقیدت مند تھے اور ان کے پاس کھنچ کر آتے تھے۔ غیر متعصب ہندوؤں نے بھی ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں طیب میں اکبر آشرم قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لایا جائے' نفاق دور کیا جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔

اس رات میں نے سندھ میں وطن پرست تنظیم کے لیے یہی لائحہ عمل طے کیا کہ اس کے ارکان صوفیاء کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ خود میں نے کراچی ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا' یہ سوچ کر کہ کیا خبر مجاہدِ اول کب مجھے پنجاب بلوا لے۔ فاطمہ کی وجہ سے مجھے یہ فیصلہ کرتے ہوئے کچھ دقت تو ہوئی کہ اس طرح وہ مجھ سے جدا ہو جاتی مگر میں ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دے رہا تھا۔ صبح جب میں بخت خان' جوگیندر' ایوبی اور فاطمہ سے سولجر بازار میں جا کر ملا تو میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ فاطمہ میرے اس فیصلے پر سب سے زیادہ حیران تھی کہ میں کراچی ہی میں رکوں گا جو چار رکنی دستہ اندرونِ سندھ روانہ ہو رہا تھا' اس کا سربراہ بدستور جوگیندر ہی تھا۔

کراچی سے انہیں پہلے میرپور خاص ہی جانا تھا اور وہاں پہنچ کر محمد ہاشم مخلص سے ملنا تھا۔ مخلص کا ... بھی ہماری وطن پرست خفیہ تنظیم ہی سے تھا۔ اس کا نام میں نے اس فہرست میں دیکھا تھا جو مجھے مجاہدِ اول نے فراہم کی تھی۔ وہ فہرست میں نے صبح ہوتے ہی نذرِ آتش کر دی تھی۔ میرپور خاص کے علاوہ سکھر اور حیدر آباد میں ہماری تنظیم کے جو اہم ارکان تھے' ان کے نام پتے بھی میں نے جوگیندر کو

بتادیے۔ اس چار رکنی دستے کو نیلے میرپور خاص، پھر سکھر اور حیدر آباد جانا تھا۔ خود مجاہد اوّل بھی اس سلسلے میں جوگیندر کو بریف کرچکا تھا کہ اسے اندرونِ سندھ کیا طریقۂ کار اختیار کرنا ہے نئی ہدایات اسے میری طرف سے مل گئی تھیں۔

اس وقت کیوں کہ میری حیثیت مجاہدِ اوّل کے نائب کی تھی اس لیے میرے چاروں ساتھی پوری توجہ اور انہماک سے میری ہدایات سن رہے تھے۔ میں نے آخر میں کہا "ایوبی کے سوا تم سبھی ملتان میں ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوچکے ہو۔ اس لیے مجھے توقع ہے کہ وہاں جو غلطیاں ہوئیں یہاں نہیں دہراؤ گے۔ اس کے علاوہ تمہیں فاطمہ کا بہ طور خاص خیال رکھنا ہے۔ ہماری تنظیم کی یہ پہلی مجاہدہ ہرچند کہ خود بھی انتہائی ذہین اور دلیر ہے، پھر بھی میری خواہش ہے کہ اسے معرکہ آرائی کے وقت کسی محفوظ مقام پر ہونا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں ایوبی سے مخاطب ہوا "تمہارے لیے اس نوعیت کی کوئی مہم یقیناً نئی ہوگی۔ اپنے طور پر تمہیں کوئی قدم نہیں اٹھانا! دستے کے سربراہ کا ہر حکم ماننا تم پر فرض ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا جناب!" ایوبی پُراعتماد آواز میں بولا "میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"میٹنگ ختم ہونے سے پہلے اگر تم میں سے کوئی بھی کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے۔" میں نے ان چاروں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ کسی نے کچھ نہیں پوچھا البتہ میں نے فاطمہ کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کسی سبب نہ کہہ پارہی ہو۔ فاطمہ کیا پوچھنا کیا کہنا چاہتی ہوگی، مجھے اس کا اندازہ تھا۔ یقیناً وہ یہ جاننا چاہتی ہوگی کہ میں اندرونِ سندھ سے ان لوگوں کی واپسی تک کراچی ہی میں رکوں گا یا یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا؟ مگر یہ سوال ذاتی نوعیت کا تھا۔ تنظیم سے یا موجودہ مہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اسی لیے خاموش رہی تھی۔ میں نے میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کردیا اور پھر اسی کے ساتھ زور سے ہنسا۔ وہ سبھی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری ذہنی صحت پر شبہ ہو۔ "یار، تم لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔" میں ہنستے ہوئے بولا "دراصل مجھے خود اپنے آپ پر ہنسی آرہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک میں تم لوگوں کو اچھا خاصا چغد نظر آرہا ہوں گا کیوں بھائی بخت خاں؟"

"خیر اس میں چغد نظر آنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہاں کچھ عجیب سا ضرور لگ رہا تھا جب تم ہدایات دے رہے تھے، لیکن شاہین! میٹنگ کے دوران میں یہ سب ضروری ہے۔ نظم و ضبط کے بغیر کوئی بھی تنظیم چلتی نہیں ہے۔ حفظِ مراتب کا بہرحال خیال رکھنا پڑتا ہے۔" بخت خاں نے کہا۔

"میں تو خیر اپنے احساس کی بات کررہا تھا۔ ویسے بھائی بخت خاں نے بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔ یہ نکتہ تعلیم کرنے کی خوشی میں ان پر لازم ہے کہ وہ ہم سب کو چائے پلوائیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بھائی بخت خاں چائے بہت عمدہ بناتے ہیں۔" میں مسکرایا۔

بخت خاں چائے بنانے کے لیے اٹھنے لگا تو حسبِ توقع فاطمہ نے اسے روک دیا "میں لاتی ہوں چائے بنا کر!" پھر چائے پینے کے دوران میں فاطمہ نے مجھ سے وہ سوال کرہی دیا جو ذاتی نوعیت کا تھا۔

"یہ سب راز کی باتیں ہیں خاتون! انہیں یوں برسرِعام آشکار نہیں کیا جاسکتا۔" میں ہنس کر بولا، پھر ذرا توقف کے بعد سنجیدگی سے اسے بتایا "ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیا خبر تم لوگوں کی واپسی تک میں یہیں رکوں اور کیا معلوم مجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑے! پھر ابھی تو یہ بھی طے نہیں کہ تم لوگ کراچی لوٹ کر آؤ گے یا وہیں سے تمہیں کہیں اور جانے کے احکام دینا پڑیں گے۔ ان ساری باتوں کا انحصار پیش آنے والے واقعات پر ہے جن کے متعلق قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

وہاں سے رخصت ہوتے وقت میرا جی تو بہت چاہ رہا تھا کہ دو چار گھڑی خلوت میں فاطمہ سے بات کرنے کا موقع مل جائے مگر اسے میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ان سب کو میں کھپرل والے اس بڑے گھر کے ایک کمرے میں چھوڑ کر باہر آگیا۔ سامنے ہی لان کے ایک گوشے میں درخت کے نیچے کھری چارپائی پر وہی بڑے میاں بیٹھے نظر آئے۔ جنہیں میں پُراسرار لکھ چکا ہوں۔ حسبِ معمول وہ چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چارپائی پر چاروں طرف کتابیں اور اخبار پھیلے ہوئے تھے۔ چارپائی کے قریب ہی خالی کرسی بھی موجود تھی۔

"فضلو! ابے او فضلو!" بڑے میاں نے حقے کا دم کھینچتے ہوئے ہانک لگائی "ابے حقہ ٹھنڈا ہوگیا ـــ کہاں مرگیا بدبخت!"

"آیا سید صاحب!" لان ہی کے ایک گوشے سے آواز ابھری۔

میں آگے قدم بڑھاتا ہوا پھاٹک کی طرف چلا۔ ابھی پھاٹک کے قریب پہنچا ہی تھا کہ سید صاحب کا ملازم فضلو پیچھے سے لپکتا ہوا آیا اور مجھے ایک سبز لفافہ تھما گیا۔

"کس نے دیا ہے یہ؟" میں نے چونک کر فضلو سے پوچھا۔

"سید صاحب نے" فضلو نے جواب دیا اور پلٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چلم تھی۔

میں نے دور کھری چارپائی پر بیٹھے ہوئے سید صاحب کو دیکھا۔ وہ اب چارپائی پر دراز ہوکر کسی اخبار کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ میلا سا ایک تکیہ انہوں نے سر کے نیچے لگا رکھا تھا۔ مجھ تک وہ لفافہ اپنے ملازم کے ہاتھوں پہنچوا کر وہ اس طرح لاتعلق ہوگئے تھے جیسے مجھے جانتے ہی نہ ہوں، میں نے وہ لفافہ اپنی جیب میں سرکایا اور پھاٹک سے نکل گیا۔ اس سبز لفافے پر "شاہین کے لیے" لکھا ہوا تھا۔ میں وہ تحریر پہچانتا تھا۔ وہ اندازِ تحریر مجاہدِ اوّل کا تھا۔ اس لفافے کی وجہ سے سید صاحب کی پُراسرار شخصیت بھی اب میرے لیے زیادہ پُراسرار نہیں رہی تھی، پھر بھی میں متجسّس تھا۔

اپنے فلیٹ میں واپس پہنچنے کے بعد میں نے وہ لفافہ کھولا۔ پیغام مجاہدِ اوّل ہی کا تھا۔ یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ سید صاحب کا تعلق بھی ہماری ہی تنظیم سے ہے مگر یہ علم نہیں تھا کہ ان کا نام گزشتہ فہرست میں کیوں نہیں تھا۔

وطن پرست تنظیم سے ایسے کچھ افراد بھی وابستہ ہیں جن کا تعلق براہِ راست میدانِ عمل سے نہیں، یہ انکشاف مجھ پر اسی روز ہوا۔ سید صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ مجاہدِ اوّل نے ان لوگوں کو "اہلِ فکر" کا نام دیا تھا۔ تنظیم کے لیے سوچنے والے یہ دماغ ہندوستان کے ہر خطے میں موجود تھے مگر ان کی تعداد خاصی کم تھی۔ خود مجاہدِ اوّل مختلف معاملات میں ان سے مشورے طلب کرتا رہتا تھا۔ اور اس کے نائب بھی ان افراد سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ یہ لوگ جنہیں مجاہدِ اوّل نے اہلِ فکر کہا تھا گویا تنظیم کا دماغ تھے۔ مجھے حکم ملا تھا کہ میں بھی سندھ میں سید صاحب سے رابطہ قائم رکھوں۔ اس روز تمام اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھاکے میں سوگیا اور پھر شام کو سولجر بازار کی طرف چل دیا۔

جب میں سولجر بازار کی اونچی چھتوں والے اس گھر میں داخل ہوا تو ایک پیڑ کے نیچے سید صاحب کو لان ہی کے مخصوص گوشے میں چارپائی پر پہلو کے بل دراز دیکھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چارپائی کے قریب پہنچا۔ سید صاحب محوِ خواب تھے اور ان کے سوا وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا کہ

انہیں جگاؤں۔ بایاں ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھے وہ بڑے آرام سے سو رہے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک سید صاحب اٹھے۔ چارپائی سے کچھ ہی فاصلے پر گھاس میں ایک لوٹا رکھا تھا۔ چارپائی سے اٹھ کر سید صاحب نے وہ لوٹا اٹھایا اور میرے سلام کا جواب دے کر بولے "میاں، میں ابھی آیا۔"

سید صاحب کی واپسی سے قبل ان کا ملازم چلم اتار کر لے گیا، پھر اس نے حقے کا پانی بدلا۔ سید صاحب ہاتھ منہ دھو کر آئے تو حقہ تیار تھا اور فضلو ایک ٹرے میں دو کپ چائے بھی چارپائی پر رکھ کر چلا گیا تھا۔

"لو میاں، چائے پیو!" سید صاحب نے چائے کی ایک پیالی ٹرے سے اٹھا کر مجھے تھمادی اور پھر خود بھی چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ اس دوران میں وہ حقے کے کش بھی لیتے جارہے تھے۔ اس وقت ان کے انداز و اطوار سے یوں معلوم ہورہا تھا جیسے ان کے اور میرے درمیان برسوں کی جان پہچان ہو۔ چائے کی پیالی سے لمبے لمبے گھونٹ بھر کے انہوں نے پیالی ٹرے میں رکھی اور پھر ٹرے اٹھا کر چارپائی کے نیچے ایک طرف رکھ دی۔ میں ابھی تک چائے پی رہا تھا اور وہ حقہ گڑگڑانے میں اتنے منہمک تھے جیسے اس عالمِ آب و گل میں وہ صرف حقہ پینے ہی آئے ہوں۔ پھر جب میں نے بھی چائے پی لی اور خالی پیالی نیچے ٹرے میں رکھ دی تو انہوں نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا اور نے ایک طرف کرکے اچانک مجھ سے مخاطب ہوئے "میاں! آج کے اخبارات دیکھے تم نے؟"

"جی" میں نے ان کے سرخ و سفید چہرے پر پھیلے ہوئے جھریوں کے جال کا جائزہ لیا۔

انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف چارپائی پر ٹیک دیے اور ان کی لمبی گردن شانوں کے درمیان جیسے غائب ہوگئی۔ "وہ چلم پھوڑ چلا گیا نا آخر!" یہ کہہ کر وہ آہستہ سے ہنسے۔

"چلم پھوڑ؟"

"ہاں وہی تمہارا لارڈ چیمسفورڈ اور کون! وائسرائے ہند! میں اسے چلم پھوڑ ہی کہتا ہوں۔ معلوم ہے تمہیں، اسے کیوں واپس بلالیا گیا ہندوستان سے؟"

"آپ فرمائیں، میں کیا عرض کرسکتا ہوں!"

"میاں، کیا کرو عرض بلکہ فرمایا کرو! اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔" وہ مسکرائے، پھر کہنے لگے "قصہ دراصل یہ

ہوا میاں کہ ہمارا چیمز چھوڑ زیادہ ہی بک بک کرنے لگا تھا۔ بھلا جا' وہ برطانیہ عظمٰی کے وزیراعظم لائیڈ جارج کو یہ مشورہ دینے لگا تھا کہ تحریکِ خلافت کا مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے۔ تمہی بتاؤ اب کہ وہ کہاں لائیڈ جارج مان لیتا چیلمسفورڈ کی بات!"

سید صاحب کسی تمہید کے بغیر شروع ہو گئے تھے۔ اخبارات میں نے بھی پڑھے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وائسرائے ہند لارڈ چیلمسفورڈ کی جگہ نیا وائسرائے لارڈ ریڈنگ ہندوستان پہنچ چکا تھا اور آئندہ روز ہندوستانی عوام سے خطاب کرنے والا تھا۔ وائسرائے کی اس تبدیلی کے اثرات ہندوستانی عوام پر کیا پڑنے والے تھے' سید صاحب وہی مجھ پر واضح کر رہے تھے۔ تبدیلی کا سبب تو انہوں نے بتا دیا تھا' اب مزید انکشافات کر رہے تھے۔

"میاں! لارڈ ریڈنگ یہودی ہے' سمجھے کچھ؟"

"میرے علم میں یہ بات نہیں تھی جناب!"

"یہ تو علم میں ہوگا تمہارے کہ وہ ... یعنی برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج مسلمانوں کا بدترین ... ہے۔"

"جی ہاں معلوم ہے۔"

"اور یہ جو اس نے نیا وائسرائے لارڈ ریڈنگ یہاں بھیجا ہے' یہ اس لطفہ' ناتحقیق سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔" پھر سید صاحب روانی سے بولنے لگے۔ میں ان کی باتیں پوری توجہ اور انہماک سے سن رہا تھا "لارڈ ریڈنگ کی ہندوستان آمد کا مقصد یہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف جو مجموعی سازش تیار کی ہے' ہندوستان میں اس پر شدت سے عمل کرایا جائے۔ نئے وائسرائے کا تقرر میڈی ٹرینین پالیسی کو کامیابی سے ہمکنار کرانا ہے تاکہ بحیرہ روم' نہر سوئز' بحیرہ احمر اور خلیج فارس پر اس کا مکمل کنٹرول ہو جائے اور اس کے جہاز' یعنی انگریزوں کے جہاز برطانیہ سے آسٹریلیا تک کسی روک ٹوک کے بغیر جا سکیں۔ اس مقصد کے لیے انگریزوں نے ان سمندروں کے ساتھ ساتھ واقع مسلمانوں کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے' ترکی کے حصے بخرے کر دیے ہیں۔ اب اس علاقے میں اسے آنکھیں دکھانے والی کوئی طاقت موجود نہیں۔ اس کامیابی کے بعد وہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہونے والی قوت کو کس طرح برداشت کر سکتے ہیں۔ لارڈ ریڈنگ کو دراصل اسی قوت کو توڑنے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ اس یہودی بچے کو بنیادی طور پر یہ فرض سونپا گیا ہے کہ وہ یہاں ہندو مسلم اتحاد ختم کروائے۔ اور تم دیکھ لینا میاں کہ وہ یہی کرے گا۔ کل

میرے پاس ... کمال ہو! ایسے ایسے جنتر دکھا دیتے ہو کہ ہم بڑھے بھی ... جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے سید صاحب اپنے مخصوص ... میں مسکرائے۔ "معلوم نہیں وہ کس جنتر اور کس ... بات کر رہے تھے! میں بہرحال درمیان میں کچھ نہیں بولا ... صاحب' پھر حقے کے کش لینے لگے۔ "یہ عیار اور مکار ... لارڈ ریڈنگ۔" وہ پھر بولنے لگے "کل بہ حیثیت وائسرائے ... اپنی پالیسی تقریر کرنے والا ہے۔ اس تقریر کی ایک ... تمہارے کچھ ساتھیوں نے مجاہدِ اول کو فراہم کی اور ... بھی بھیج دی ہے۔ یہ کمال تم لوگوں کا! ظاہر ہے کہ یہ ... دان پہلے خوب سوچ بچار کے بعد ترتیب دی گئی ہوگی ... مجھ تک یا مجاہدِ اول تک قبل از وقت نہ پہنچتی۔ ... ہوئے سید صاحب نے اپنے سرہانے پڑی ہوئی ایک ... میں سے سبز لفافہ نکالا اور پھر اسے کھول کر دو بڑے ... اسکیپ کاغذ میری طرف بڑھا دیے "یہ ہے وہ تقریر ... پڑھو گے تو پتا چلے گا کہ اس یہودی بچے نے کتنی چالا... مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے' اسی کے ساتھ ہند... اینگلو انڈینز کو کتنی خوب صورتی سے مسلمانوں کے ... بھڑکایا ہے! اس تقریر میں خاص طور پر ملتان میں ... والے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس ... لگایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور دوسری قو... افراد کو قتل کیا اور ان کی املاک کو لوٹا ہے۔ کتنی د... پرلطف بات ہے! تم تو میاں گواہ ہو اس کے! ہے نا؟"

وہ خاموش ہو کر حقہ پینے لگے تو میں اس تقری... کرنے لگا جو آئندہ روز وائسرائے کو کرنا تھی۔ ... صاحب نے جو کچھ کہا تھا بالکل درست تھا ... وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی اس تقریر کا مقصد ہندو ... اتحاد کو دھچکا پہنچانا تھا تاکہ وہ آپس میں دست و گر... اور اپنے اصل دشمن یعنی انگریز کی طرف متوجہ نہ ... میں نے وہ تقریر پڑھ کر انہیں واپس کر دی۔

"آپ کا فرمانا بالکل برحق ہے جناب! اس تقر... نتیجہ نکلتا ہے۔" میں بولا "مگر میں ایک بات عرض ... ہوں یا یوں کہنا بہتر ہے کہ سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"فرماؤ!" سید صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔

"ہم آخر کب تک ایک مصنوعی اتحاد کو قائم ... اپنی توانائیاں صرف کرتے رہیں گے؟ کوئی اور ... ہے کیا؟"

"مثلاً؟ فرماؤ برخوردار، تکلف!" سید صاحب کی لمبی

شانوں کے درمیان غائب ہو گئی تھی اور وہ حقہ پینا چھوڑ چکے تھے۔

"معاف کیجیے گا جناب! آپ کی گفتگو سے یہ تاثر ملا ہے کہ ہمیں یعنی وطن پرست تنظیم کے ارکان کو بہرصورت ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں ہماری تحریک کا مقصد اس سے کہیں مختلف ہے۔ ہماری تنظیم کا بنیادی مقصد تو انگریزوں کی سرکاری مشینری پر ضرب لگا کر اسے معطل کرنا ہے۔"

"ہاں میاں' تم نے ٹھیک کہا' یہی مقصد ہے ہمارا اور ہم اپنے نصب العین پر قائم ہیں۔ تمہیں شاید علم ہوگا اس کا کہ سیاسی سطح پر اس وقت جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہے' وہ محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس اتحاد کو آخرکار ایک روز ختم ہونا ہی ہے مگر یہ اتحاد جتنی زیادہ دیر قائم رہے اتنا ہی اچھا ہے کیوں کہ ہمارے پیش نظر جو مقصد ہے اس کے لیے بھی یہ عارضی اتحاد اہم ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کے لیے انگریز نے جو منصوبہ بنایا ہے اسے ناکام بنا دیں۔ یہ وہ قوت ہے جس سے انگریز ہراساں ہے اور جسے ختم کرنے کے لیے اس نے بڑی عیاری سے ایسا جال پھیلایا ہے جس میں اس خطے کے لوگوں کا پھنس جانا لازمی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ہم' لوگوں کو اس جال میں نہ پھنسنے دیں۔ ہماری یہ کوشش بھی ہمارے اصل مقصد کو تقویت فراہم کرے گی۔ یوں سمجھو میاں کہ انگریز جس بات کو اپنے لیے خطرناک سمجھ رہا ہے' وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔" سید صاحب کی دلیل میرے دل کو لگی تو ضرور مگر اب بھی میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد ناممکن سی بات تھی۔ پھر میں نے ان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ "میاں! جب تک یہاں ہو' آتے جاتے رہنا۔" سید صاحب بولے "تم اچھے لگے مجھے کہ تمہارے اندر اختلاف کا حوصلہ ہے۔ جی ہاں' جی بہتر ہے اور بجا فرمایا کہنے والے نوجوان مجھے پوچ لگتے ہیں۔" میں وہاں سے چلا آیا۔ اختلاف رائے کے باوجود مجھے سید صاحب کی شخصیت دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔

اگلے ہفتے مجھے اندرونِ سندھ سے خبریں ملنا شروع ہو گئیں کہ وہاں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے ہیں۔ اسی دوران میں' لاہور میں شہید گنج کا واقعہ ہوا۔ اس کا اثر بھی سندھ پر ہوا۔ پنجاب اور سرحد بھی فسادات کی لپیٹ میں آنے لگے' ہماری تنظیم جو اس طوفان کے آگے بند باندھنے کی کوشش کر رہی تھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میرے اندازے صدفی صد درست ثابت ہوئے۔ نیک خواہشات رکھنا ایک الگ مسئلہ ہے اور انہیں روبہ عمل لانا دوسرا مسئلہ! قوموں کی تقدیر خواہشات کی پابند نہیں ہوتی۔ خودکشی کرنے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے! اس وقت ہندوستان کے باسی خصوصاً ہندو اجتماعی خودکشی کر رہے تھے۔ تقریباً پورا سندھ فسادات کی زد میں آ چکا تھا۔

میرے خیال میں اب مجاہدِ اول کو اپنی جدوجہد کا رخ تبدیل کر دینا چاہیے تھا۔ اس عرصے میں سید صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ ان ملاقاتوں میں انہوں نے مجھ سے ایک بار بھی اپنے بیٹے ایوبی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے! حالانکہ انہیں تنظیم میں میری حیثیت کا علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت پورے سندھ میں تنظیم کے جتنے بھی ارکان سرگرم عمل تھے' ان سے میرا رابطہ قائم تھا۔ سید صاحب اپنے ہی کینڈے اور مزاج کے آدمی تھے۔

موجودہ حالات کے پیش نظر میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید مجاہدِ اول اب مجھے کراچی سے پنجاب بلوا لے گا اور یہاں میری جگہ کوئی اور لے لے گا۔ دو روز کے بعد ہی میری یہ توقع پوری ہو گئی۔ مجھے مجاہدِ اول کی نئی ہدایات مل گئیں۔

○☆○

اب ہم راولپنڈی میں تھے۔ ایوبی کو ہم نے کراچی ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ مجاہدِ اول کی ہدایت پر اپنے چاروں تنظیمی ساتھیوں کو میں نے کراچی واپس بلا لیا تھا۔ فاطمہ بھی انہی میں شامل تھی۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے سندھ میں خطرہ بڑھ گیا تھا۔ کراچی میں کیتھی کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی۔ یہ اطلاع بھی مجھے مجاہدِ اول ہی کی طرف سے ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک ریلوے اسٹیشن سے ٹرین روانہ نہیں ہو گئی۔ ہم سبھی چوکنا اور محتاط رہے۔ ہم چاروں یعنی میں' فاطمہ' جوگیندر اور بخت خاں تیسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ فاطمہ زنانہ ڈبے میں تھی۔ ہم تینوں کو ایک ہی ڈبے میں تھے لیکن ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ اس کے باوجود ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہمیں اپنے اردگرد کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا۔ میری بو سونگھتی ہوئی کیتھی کس طرح لاہور سے کراچی پہنچ گئی تھی۔ یہ

بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ کراچی میں اس کی آمد میرے نزدیک کسی اور سبب بھی ہوسکتی تھی مگر احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں کراچی چھوڑ دیتا میرے علاوہ جوگیندر اور فاطمہ کے لیے بھی سندھ سے نکل جانا فی الحال بہتر تھا۔ رہا بخت خاں تو وہ تن تنہا اس علاقے میں رہ کر کیا کرتا! یہاں کام کرنے کے لیے اور دوسرے لوگ موجود تھے۔

اس زمانے میں راولپنڈی چھوٹا سا ایک پُرسکون اور خوب صورت شہر تھا۔ وہاں ہمیں چنی ہٹیاں کے علاقے میں اپنے ایک تنظیمی ساتھی سے ملنے کے بعد کرائے پر ایک مکان حاصل کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

اب ہمیں وہاں مجاہد اوّل کی نئی ہدایات کا انتظار تھا۔ راولپنڈی پہنچ کر ہمیں کیا کرنا تھا کیا مہم ہمیں درپیش تھی، اس کا علم ہمیں اب تک نہیں ہوا تھا۔

اگلے دن ہی صبح جب دودھ والا دودھ دینے آیا تو اس نے فاطمہ کو ایک بند لفافہ دیا "بی بی جی! شاہین صاحب کے لیے ایک صاحب نے یہ چٹھی دی ہے۔"

"وہ صاحب کہاں ہیں؟" میں نے اپنا نام سنا تو لپک کر دروازے تک آگیا۔

دودھ والے نے پلٹ کر ایک سمت اشارہ کیا۔ گلی کے اختتام پر میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جارہا تھا۔ دودھ والا دودھ دے کر جاچکا تھا مگر میں اور فاطمہ ابھی تک دروازے ہی پر کھڑے تھے۔ وہ گلی خاصی لمبی تھی۔ ہمارے اور اس شخص کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اس شخص کے جسم پر مغربی لباس تھا، سر پر ہیٹ لگا تھا اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ! دیکھتے ہی دیکھتے وہ گلی سے نکلا اور پھر اس نے ہماری طرف پلٹ کر دیکھا۔ کافی فاصلے کی وجہ سے اب وہ ہیولا ہی رہ گیا تھا۔ رومال سے اس نے اپنے چہرے کے نچلے حصے کو چھپا رکھا تھا یوں جیسے کوئی چلتے چلتے بدبو سے بچنے کے لیے ناک اور منہ پر رومال رکھ لے۔ گلی میں کچھ گندگی بھی تھی اس لیے ایسا کرنا خلاف معمول نہیں لگ رہا تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوا، صرف چند لمحوں کے لیے پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر گویا ہمیں الوداعی سلام کیا اور پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ شخص مجاہد اوّل ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا تعاقب کروں اور اس کی شخصیت سے آگاہ ہوجاؤں مگر میں نے اس خواہش کو دبالیا۔ مجھے اس کی چال میں چند لمحوں کو شناسائی کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن ان چند لمحوں کے بعد اس کا اندازِ خرام میرے لیے پھر اجنبی ہوگیا تھا۔

سبز رنگ کے اس مخصوص لفافے میں مجاہد اوّل ہی کا پیغام تھا۔ رات عشاء کی نماز کے بعد اس نے گھر کے عقبی دروازے کو کھلا رکھنے کا حکم دیا تھا، اس کے ساتھ مختصراً دوسری ہدایات بھی تھیں جن کا تعلق اس کی شخصیت کی پردہ پوشی سے تھا۔

اس رات ہم نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ برابر والے کمرے میں ہمیں اس وقت مجاہد اوّل کی موجودگی کا احساس ہوا جب اس نے "ساتھیو!" کہہ کر متوجہ کیا۔ معلوم نہیں کب وہ دبے پاؤں عقبی دروازے سے داخل ہوکر برابر والے کمرے میں پہنچ گیا تھا! ہم سب کرسیوں پر ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے، میز پر لالٹین رکھی تھی۔ جس کی لو مدھم کردی گئی تھی۔ ہم مجاہد اوّل کی صرف آواز سن سکتے تھے۔

"سب سے پہلے تم لوگ ایک خوش خبری سن لو!" مجاہد اوّل کی آواز ہم نے سنی "تمہارے ساتھیوں نے گزشتہ دنوں مراد آباد میں اناج کی منڈی لٹوادی ہے۔ اس موقع پر یہ کارروائی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بنگال، آسام، بہار، سی پی اور اڑیسہ میں بھی انہی دنوں ایسے ہی واقعات ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے ایوانِ حکومت میں ان واقعات کے سبب زلزلہ آگیا ہے۔ انگریز حکومت اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام واقعات اس کے خلاف کسی منظم سازش کا نتیجہ ہیں اور ان کا ذمے دار کوئی منظم گروہ ہے۔ اکثر جگہوں پر ان واقعات میں ہماری تنظیم کا براہِ راست ہاتھ نہیں لیکن بہت سے شہروں میں ہمارے ہی مجاہدوں نے ایسی کارروائیاں کی ہیں۔ انہی میں سے ایک مراد آباد بھی ہے۔ اس کا ذکر بہ طور خاص میں اس لیے کررہا ہوں کہ مراد آباد میں جن جاں بازوں نے یہ کارنامہ انجام دیا، انہیں تم چاروں ہی جانتے ہو۔ یہ تمہارے ساتھی نیپو اور سراج الدولہ ہیں۔ ان کے گروپ ہی نے وہاں یہ کام دکھایا ہے۔ تفصیلات تمہیں ان سے کل خود ہی معلوم ہوجائیں گی۔"

"کیا وہ دونوں بھی یہاں راولپنڈی پہنچ چکے ہیں؟" بخت خاں نے پوچھا۔

"نہیں! مگر کل صبح تک پہنچ جائیں گے۔" مجاہد اوّل نے بتایا "اب تم لوگ اس مہم کی نوعیت کے بارے میں سنو جو تمہیں درپیش ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اس کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی "برطانوی دفتر خارجہ کا ایک اہم افسر بھی لارڈ ریڈنگ کے ساتھ ہندوستان آیا ہے۔ اس کا نام ولسن ہے۔ ولسن یہاں ایک اہم مشن پر بھیجا گیا ہے۔ فارن آفس اور ڈیفنس کے بعض افسروں اور کارندوں پر مشتمل ایک سیکشن اس کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس مشن کا تعلق برطانیہ کی میڈی ٹرینین پالیسی سے ہے۔ ابھی تک اس مشن کی اصل نوعیت کا علم نہیں ہوسکا ہے لیکن اس کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ کہ ولسن کی ہندوستان میں آمد کو بالکل خفیہ رکھا گیا ہے۔ یہ خطرناک شخص برطانوی فوج میں بھی رہ چکا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کا تعلق اسلحہ سازی سے ہے۔ ولسن شیطانی دماغ کا مالک ہے۔ اسی شیطانی دماغ کی بدولت وہ فوج سے دفتر خارجہ میں پہنچا ہے۔ ہندوستان میں اس کی آمد کو کسی خطرے کا پیش خیمہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک انگریز ایشیائی عوام کے خلاف اپنی ساری کارروائیوں کو ہندوستان ہی سے کنٹرول کرتا ہے۔ خصوصاً مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے خلاف اس کا فوجی مرکز ہندوستان ہی ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ ولسن یہاں ہندوستان میں کسی بھیانک منصوبے پر عمل درآمد کے لیے حکمت عملی تیار کررہا ہے۔ ہمیں اس شخص کو اغوا کرنا ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ انگریز کی سازش کیا ہے! ولسن وہ شخص ہے جس پر برطانیہ میں بیٹھے ہوئے بے رحم شاطروں کو بڑا اعتماد ہے۔ تم لوگوں کو یقیناً یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ولسن ان دنوں راولپنڈی میں ہے۔ وہ یہاں کیوں آیا اور کس لیے رکا ہوا ہے، اس بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہوسکا لیکن اس کی اگلی منزل کے متعلق اطلاع مل گئی ہے۔ وہ چند روز کے بعد یہاں سے سرحد کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔ اس شخص کا پہاڑوں کی طرف جانا بھی کسی خطرناک منصوبے کی نشان دہی کررہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سرحد روانگی سے قبل ہی اسے اغوا کرلیا جائے۔"

یہ اطلاع واقعی سنسنی خیز ہی تھی کہ ولسن اس وقت راولپنڈی میں تھا اور جلد ہی وہ یہاں سے صوبہ سرحد کا رخ کرنے والا تھا۔ میرا دل اس وقت تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ مجاہد اوّل ہم میں سے کسے اس مہم کی ذمے داری سپرد کرتا ہے۔

پھر خلاف توقع مجاہد اوّل نے ایک اور ہی ذکر چھیڑ دیا۔ یہ دوسری مہم ہندوستان گیر تھی۔ کچھ عرصے قبل پرنس آف ویلز ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے آنے والا تھا۔ یہ دورہ پہلے اس لیے منسوخ کردیا گیا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات بہتر نہیں تھے۔ اب یہاں لارڈ ریڈنگ کی آمد کے بعد گویا یہ فضا بہتر ہوگئی تھی۔ ہندو اور مسلمان آپس میں دست و

گریباں ہوچکے تھے۔ اب پرنس آف ویلز کے لیے یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ ہندوستان میں اس کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کیا جائے گا۔

"اس موضوع پر ہم سارے ہندوستان کو سراپا احتجاج بنادیں گے۔ انگریز شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس نے تمام اہم اور سرکردہ سیاسی لیڈروں کو پس زنداں ڈال دیا ہے تو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والا کوئی نہیں رہا۔" مجاہد اوّل کی آواز میں جوش تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیں پرنس آف ویلز کے متوقع دورے کی تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا۔ آخر میں وہ بولا "ولسن کے اغوا کے بعد تمہیں ملک کے مختلف حصوں میں سرگرم عمل ہونا ہے۔ بخت خاں! تم دہلی جاؤ گے۔ شاہین یہاں سے کلکتے کا رخ کرے گا مگر اس سے پہلے کچھ روز اسے دہلی میں رکنا ہے۔ کس لیے" یہ ہدایات مل جائیں گی۔ کل یہاں نیپو اور سراج الدولہ پہنچ جائیں گے۔ جوگیندر اور فاطمہ کو بھی یہاں سے کلکتے ہی جانا ہے۔ یہ دونوں شاہین سے پہلے وہاں پہنچیں گے۔ میں خود بمبئی جاؤں گا تاکہ وہاں پرنس آف ویلز کے شاندار استقبال کی تیاریاں مکمل کرسکوں۔ ہندوستان کی انگریز انتظامیہ کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ بمبئی، کلکتہ اور دہلی ہر جگہ اس موقع پر ہنگامے ہوں۔"

وقتی طور پر فاطمہ مجھ سے ایک بار پھر جدا ہونے والی تھی۔ جب مجاہد اوّل نے یہ کہا تھا کہ جوگیندر اور فاطمہ کلکتے جائیں گے تو بے اختیار ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ جلد یا بدیر خود میں بھی وہیں جانے والا تھا۔ اس سے کچھ روز پہلے مجھے دہلی میں بھی رکنا تھا۔ اس بات نے مجھے البتہ قدرے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے لاہور میں پیش آنے والے واقعات یاد آگئے تھے۔ بہرحال اس وقت میں نے اپنی اصل شخصیت کی پردہ پوشی کے سبب مجاہد اوّل سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

"جوگیندر!" مجاہد اوّل کی آواز سنائی دے رہی تھی "تم فاطمہ کو ساتھ لے کر کل ہی یہاں سے کلکتے کے لیے روانہ ہوجاؤ! وہاں پہنچ کر تمہیں کیا کرنا ہے، اس سلسلے میں کل صبح ہی تمہیں ہدایات مل جائیں گی۔"

ایک بار پھر فاطمہ کی اور میری نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔ مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجاہد اوّل اتنی جلدی انہیں کلکتے جانے کا حکم دے دے گا۔

"قسمت بہتر ہے اے مجاہد اوّل!" جوگیندر بولا "اس بہانے پتاجی سے بھی طویل عرصے کے بعد ہم دونوں بہن بھائیوں کی ملاقات ہوجائے گی۔"

"شاہین! تم ولسن کے اغوا کی مہم کا ابتدائی خاکہ تیار کرو۔ تمہیں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ یہ مہم ہر قیمت پر کامیاب ہو۔ اس خطرناک مہم کا سربراہ ٹیپو ہوگا۔ تم' بخت خاں اور سراج الدولہ اس کے ساتھ ہوگے۔ ٹیپو اور بخت خاں کے مشورے سے ترمیم و تبدیلی کے بعد حتمی حکمت عملی تیار کی جائے گی۔" پھر وہ اجلاس ختم ہوگیا۔ مجاہد اوّل نے "خدا حافظ" کہا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد ہم نے اس گھر کا عقبی دروازہ بند کرلیا۔

وہ شب' شب مختصر تھی اور میری تمنا تھی کہ دراز سے دراز تر ہوجائے۔ مجاہد اوّل چلا گیا تو میں نے اسی لیے فوراً فاطمہ سے چائے بنانے کی فرمائش کردی۔ دن کے وقت ہی ہم نے تمام ضروری سامان خرید لیا تھا۔ اس فرمائش کے پس پشت صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ فاطمہ زیادہ سے زیادہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ گھر میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں ان دونوں بہن بھائیوں نے اپنا ڈیرا جمالیا تھا' دوسرے میں بخت خاں اور میں نے اپنے اپنے بستر بچھا لیے تھے۔ اگر ہم سب فوری طور پر سونے کا پروگرام بنالیتے تو یوں فاطمہ میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی۔

میرا اندازہ تھا کہ جو کیفیت میری تھی وہی فاطمہ کی بھی ہوگی۔ یہ اندازہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب ہم چائے پی رہے تھے۔ فاطمہ کی نظریں بار بار میری ہی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ گم صم اور خاموش سی تھی۔

"کیا بات ہے ری مسلی' تو اتنی چپ چپ کیوں ہے؟" جوگیندر نے اپنی بہن کو مخاطب کیا۔ جب اسے اپنی بہن پر زیادہ لاڈ آتا تھا تو وہ اسے "مسلی" ہی کہتا تھا۔ اس نے فضا میں موجود اداسی کو یقیناً محسوس کرلیا تھا اور شاید اس فضا کو بدلنا چاہتا تھا۔

"تم بھی تو کچھ نہیں بول رہے بھیا!" فاطمہ اداس سے لہجے میں بولی۔

"میں تو تیری وجہ سے کچھ نہیں بول رہا تھا کہ تجھے بولنے کا موقع مل جائے۔" جوگیندر نے بات بنائی۔

"ہم سب ایک دوسرے کی عادت بنتے جارہے ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" بخت خاں بات کی تہ تک پہنچ کر صاف گوئی سے بولا۔

"اور میرا خیال یہ ہے بھائی بخت خاں کہ یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم سب انسان ہیں' ہمارے سینوں میں دل بھی ہیں اور دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھی ہے!" میں نے یہ الفاظ کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ سبھی زور سے ہنس پڑے اور میں نے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔

○☆○

فاطمہ اور جوگیندر جاچکے تھے اور میں خود کو خالی خالی محسوس کررہا تھا۔ ٹیپو اور سراج الدولہ کی آمد نے فضا کچھ بدل دی تھی۔ جلالی کی مہم کے بعد سراج الدولہ سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ جلالی کے دوران قیام میں بھی سراج الدولہ کے لب و لہجے سے میں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا تعلق پنجاب ہی کے کسی شہر سے ہے۔ وہ بڑا خوش مزاج زندہ دل شخص تھا۔ لطیفے تو بھی بلا کا تھا۔ اسے بے شمار یاد تھے۔ اداسی کی فضا میں اس کی آمد کو میں نے تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس کیا۔

وہ دن دو ساتھیوں کے جانے اور دو کے آجانے کی ہوا۔ رات کو مجھے ذرا مہلت ملی تو مجاہد اوّل کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ولسن کے اغوا کا منصوبہ اپنے ذہن میں ترتیب دیتا رہا۔ آج صبح ہی مجاہد اوّل کی طرف سے اس کوٹھی کا نقشہ بھی فراہم کردیا گیا تھا جہاں ولسن کو ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ کوٹھی شہری آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ وہ ایک سرکاری عمارت تھی اور عموماً انگریز حکام کی راولپنڈی آمدورفت کے لیے مخصوص تھی۔

اس وقت میں لالٹین کی روشنی میں کوٹھی کا نقشہ پھیلائے ہوئے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ بخت خاں کا بستر اسی کمرے میں تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ٹیپو اور سراج الدولہ والے کمرے میں سونے کے لیے جاچکے تھے۔

نقشے کے مطابق کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف دور تک ناہموار ڈھلان تھی۔ بیرونی حصے میں پھاٹک سے عمارت تک پختہ راستہ تھا جس کے دونوں طرف بڑے بڑے لان اور پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ پختہ راستہ اتنا چوڑا تھا کہ ایک کار بہ آسانی عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ راستے کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے درخت لگے ہوئے تھے۔ عمارت دو منزلہ تھی۔

خدا نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جو قومیں اپنے اندر سے بیدار ہوتی ہیں یہ بات ان کے لیے زیادہ درست ہے۔ اس دور میں تو سارا ہندوستان اور اس کے باسی غلامی کی سیاہ رات میں زندہ تھے۔ ہر

جھوٹے اور سچے چہروں کی پہچان کھو گئی تھی۔ ارض وطن کا دم گھٹ رہا تھا' فضا ایسی ہی دھواں دھواں تھی' لوگ تازہ ہوا کو ترس رہے تھے۔ ہم تاریک رات کے مسافر تھے اور اس رات کا سلسلہ دراز تھا۔ ہم اسی سیاہ رات کے سینے میں شگاف ڈالنا چاہتے تھے اور اس شہر خورشید تک پہنچنے کے آرزو مند تھے کہ جس کے دروازے ہمارے آئندہ میں کھل سکیں۔ وہ شہر خورشید جو اس سیاہ رات کی فصیلوں کے پیچھے تھا۔ ہمارے لیے شام و سحر کے سلسلے بے معنی تھے۔ ہم نے اپنی جاگتی آنکھوں کی کھڑکیاں کھلی رہنے دی تھیں کہ اسی زینے سے نئی صبح کے خورشید کو ہمارے دلوں میں اترنا تھا۔ اس نوعیت کی مہمیں ہم رات ہی کو سر کرتے تھے جو اس وقت ہمیں درپیش تھیں۔ سو اس رات بھی ایسا ہی تھا۔ مجاہد اوّل کی جانب سے ہدایات ملنے کے بعد یہ پانچویں رات تھی۔

ہم جس شخص کو اس رات اغوا کرنے والے تھے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے تحفظ کی خاطر سادہ لباس میں چار مسلح فوجی ہر وقت اس کوٹھی میں موجود رہتے تھے جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ چاروں ہی فوجی انگریز تھے۔ ان کے علاوہ اس کا باورچی بھی انگریز ہی تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو مصدقہ اطلاعات کے مطابق دن رات کسی بھی وقت وائسرائے اور کمانڈر انچیف سے مل سکتا تھا یا رابطہ قائم کرسکتا تھا۔

ہاں یہ وہی مختار انگریز ولسن تھا جو کسی خاص مشن پر وائسرائے کے ساتھ برطانیہ سے آیا تھا اور مجاہد اوّل نے ہمیں جس کے اغوا کا حکم دیا تھا۔ ہم اسی حکم کی تعمیل کرنے کے لیے نکلے تھے۔

ولسن کو اغوا کرنے کے لیے میں نے جو حکمت عملی ترتیب دی تھی' ٹیپو اور بخت خاں نے اسے کسی ترمیم و تبدیلی کے بغیر منظور کرلیا تھا۔ میں نے اس منصوبے میں سب سے زیادہ اہمیت موقع واردات سے تیزی کے ساتھ محفوظ فرار کو دی تھی۔ اس کوٹھی سے جہاں ولسن مقیم تھا' ہمیں چنی ہٹیاں تک پہنچنے کے لیے لازمی طور پر رات کے وقت ایسی سڑکوں سے گزرنا پڑتا جہاں پولیس گشت پر رہتی تھی۔ راولپنڈی میں بھی ہندوؤں کی خاصی آبادی تھی جن کے تحفظ کی خاطر ان دنوں پولیس رات کے وقت گشت پر رہتی تھی۔ انگریز انتظامیہ اپنے چہیتوں کی ہر طرح حفاظت کررہی تھی کہ کہیں مسلمان بھی انتقاماً ان محلوں پر چڑھائی نہ کردیں جہاں ہندو بہ کثرت آباد تھے۔ گزشتہ دنوں ملتان اور صوبہ

انہوں نے یہاں کے مسلمانوں پر بھی خاصا اثر مرتب کیا تھا۔ انگریز ہندو مسلم فساد تو چاہتا تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس فساد میں ہندو کو زیادہ نقصان ہو۔ اس کا اصل نشانہ مسلمان تھا۔ اس لیے راولپنڈی میں ہندوؤں کے محلوں کی حفاظت کا کام پولیس کے ذمے تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب متعصب ہندو' راولپنڈی میں آریہ سماج کا پرچار کررہے تھے جس کی بنیاد مسلمان دشمنی پر استوار تھی۔ "ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے" یہ نعرہ پہلی بار انہی آریہ سماجیوں نے اس شہر میں بلند کیا۔ راولپنڈی میں بڑی بڑی دکانیں' ملیں اور دوسرا منفعت بخش سارا کاروبار انہی آریہ سماجیوں کے ہاتھ میں تھا۔ راولپنڈی اور اس کے گردونواح میں انہوں نے اپنی الگ درس گاہیں بھی قائم کر رکھی تھیں جہاں طالب علموں کو مسلمان دشمنی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمان راولپنڈی شہر میں بھی ملتان ہی کی طرح اکثریت میں تھے اور ہندو اقلیت میں مگر عیار انگریز نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلمانوں کی معاشی حالت ابتر کردی تھی۔ اس دور میں راولپنڈی کا متعصب ہندو سرمایہ دار اتنا بااثر تھا کہ اس کے لمبے ہاتھ برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک تک پھیلے ہوئے تھے۔ انگریز نے اس شہر کے ہندو تاجروں کو ایسی مراعات دے رکھی تھیں کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں بھی پیش پیش تھے۔ ان حالات میں بھلا انگریز کب یہ پسند کرتا کہ راولپنڈی شہر کا ہندو تاجر' غریب و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں لٹ جائے۔ اسی سبب راولپنڈی کی پولیس راتوں کو بھی حرکت میں رہتی تھی۔

راولپنڈی شہر کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہم ولسن کو اغوا کرکے راولپنڈی شہر کی کسی مرکزی شاہراہ سے گزرے بغیر موقع واردات سے صرف چند منٹ کے اندر اندر تقریباً ایک فرلانگ دور پہنچ سکتے تھے۔ اگر کوئی مختصر ترین راستہ اختیار کرکے بھی اس مقام تک پہنچنا چاہتا تو اسے خاصا لمبا چکر کاٹنا پڑتا اور وقت بھی بہت لگتا۔

کوٹھی کے عقبی ڈھلان میں اتر کر چند قدم کے فاصلے پر کوٹھی سے قدرے بلندی پر ایک ہموار ٹیلا سا تھا۔ ہم نے اسی ہموار ٹیلے کو اپنے فرار کے سفر کی خاطر پلیٹ فارم منتخب کیا تھا۔ نشیب میں آخری حد کے کنارے کوٹھی ہم نے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ہمارے سفر کا اختتام تھا۔

سفر کے آغاز اور اختتام کے لیے ان دونوں مقامات کے انتخاب میں سروے آف انڈیا کے ایک سرویئر نے تھیوڈولائٹ سے علاقے کا جائزہ لینے کے بعد ہماری مدد کی تھی۔ یہ سرویئر ہمارے ایک ساتھی سراج الدولہ کا دوست تھا جو اپنے اندر ایک بے قرار انقلابی روح رکھتا تھا لیکن ہم نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے! اس سرویئر نے حساب کتاب لگا کر ہمیں بتایا تھا کہ ان دونوں مقامات کے مابین براہِ راست فاصلہ ایک فرلانگ سے بیس پچیس گز کم تھا۔

بلندی پر ہموار ٹیلا اور نشیب میں آخری کھنڈ کو پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ہم نے ٹیلے سے بلندی پر اور نیچے آخری کھنڈ میں دو بلند اور مضبوط درخت منتخب کیے تھے۔ یہ دونوں درخت رسی اور پلی کے نظام کے لیے دو ستونوں کا کام دینے والے تھے۔

کوٹھی کے آخری حصے میں کھنڈوں کا یہ سلسلہ غیر آباد اور سنسان تھا۔ اس حصے کی ڈھلان خطرناک طور پر نیم عمودی تھی جس پر اترنا چڑھنا خاصا مشکل تھا۔ ہماری بے ضرر سرگرمیوں کو دیکھنے والا اس علاقے میں کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی ہمیں دیکھ بھی لیتا تو ہمارے اصل مقصد کو سمجھ نہ پاتا۔

اپنی کارروائی کے پہلے مرحلے کا آغاز ہم نے سورج نکلتے ہی کر دیا تھا۔ یہ مرحلہ ہم نے نشیب سے شروع کیا تھا۔ ہم ایک مضبوط سُتلی کو نیچے نشیب سے لے کر چلے تھے اور کوٹھی کے نیچے کھنڈ تک لے آئے تھے۔ یہ خاصا وقت طلب کام تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس علاقے میں زیادہ درخت نہیں تھے۔ یہاں جھاڑیاں اور پتھر زیادہ تھے جن پر سے وہ سُتلی گزارنا ہمارے لیے دشوار نہ ہوا۔ سُتلی کو ہموار ٹیلے سے اوپر واقع درخت تک پہنچانے کا دوسرا مرحلہ ہم نے غروب آفتاب کے فوراً بعد ہی مکمل کر لیا تھا۔

رات جب خاصی بھیگ گئی، ہوا کچھ تیز چلنے لگی، لوگ گہری نیند کی آغوش میں سو گئے تو ہم پلی اور رسی کے نظام کی تکمیل میں لگ گئے۔ بلندی اور نشیب میں ستونوں کے طور پر منتخب کیے جانے والے درختوں میں دو بڑی بڑی پلیاں باندھ دی گئیں۔ ان پلیوں اور نشیب سے بلندی تک آنے والی مضبوط سُتلی کی مدد سے تقریباً پون انچ موٹا پٹ سن کا رسا دہرا کر کے دونوں پلیوں کے درمیان تان دیا گیا۔ یہ رسا ہم نے منہ اندھیرے ہی نشیب میں پہنچا دیا تھا۔ اتنا لمبا رسا بنانے میں ہم نے خاصی محنت سے کام لیا تھا۔ درمیان میں آنے والے جوڑوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ لوہے کے تار سے اچھی طرح جوڑ دیا گیا تھا، اس طرح کہ جوڑ پر اس کی سطح قطعی ہموار رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آدھا انچ موٹا رسا بھی دونوں درختوں کے درمیان تان دیا گیا تھا۔ پون انچ موٹے رسے پر اس متحرک پل کو پھسلنا تھا جس کے نیچے ہک میں ایک بڑا سا تھیلا لٹکایا جاتا تھا نصف انچ موٹے رسے کا مقصد پل کی حرکت کو کنٹرول کرنا تھا۔

اس مرحلے کی تکمیل میں ہمیں رات کا ڈیڑھ بج گیا اور ہمارے فرار کی راہ مکمل ہو گئی۔ اس کام کی تکمیل کے بعد ہم نے ٹارچوں سے سگنل دے کر تیاری اور اطمینان کا اظہار کر دیا۔ اس معلق پل کی تیاری میں ہمیں نشیب سے سراج الدولہ اور دوسرے دو مقامی سرفروشوں کی مدد بھی حاصل تھی کیوں کہ ان رسوں کو جن پر پل کو پھسلنا تھا، انتہائی سختی اور مضبوطی سے تاننا ضروری تھا تاکہ ان کے درمیان کم سے کم جھول رہے۔ اس کام کے لیے نشیب میں بنی ہوئی پن چکی کی قوت استعمال کی گئی تھی۔ جس پر ہم نے آج صبح ہی قبضہ کر لیا تھا پن چکی کا مالک ہمارے قبضے میں تھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ سراج الدولہ اپنے ساتھیوں سمیت نیچے تھا اور بخت خاں ہموار ٹیلے کے عقب میں واقع دوسرے بڑے ٹیلے پر اس درخت پر متعین تھا جو رسی اور پلیوں کے اس نظام کا بالائی ستون تھا۔ وہاں اس نظام کے تحفظ کی ذمے داری ایک مقامی جاں باز پر عائد تھی۔ ولسن کو اغوا کرنے کا کام مجھے اور ٹیپو کو انجام دینا تھا۔

اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے جب ہم اصل مہم سر کرنے کے لیے حرکت میں آئے۔ رسوں پر پھسلنے والی پلی کے ہک میں ایک اور پلی لٹکا دی گئی۔ یہ پلی آدھے انچ کے اس رسے سے بندھی ہوئی تھی جس سے متحرک پل کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ٹیپو اور میں اس چھوٹی پلی سے لٹکے ہوئے پٹ سن کے بورے میں داخل ہو گئے۔ اس بورے کے نچلے حصے میں چوکور تختے رکھ دیے گئے تھے جن پر ہم دونوں کھڑے تھے۔ بورے کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ اب ہم پل سے لٹکے ہوئے تھے۔ اس وقت بخت خاں نے ٹارچ کی روشنی سے نشیب میں اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے نیچے متحرک پلی کو کنٹرول کرنے والی رسی کو ڈھیل دی جانے لگی اسی کے ساتھ ہم اس بورے میں لٹکے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے پھسلنے لگے۔

"خدا حافظ شاہین!" بخت خاں کی دھیمی آواز مجھے سنائی دی۔

"خدا حافظ!" میرے اور ٹیپو کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

بڑی آہستگی اور روانی کے ساتھ ڈھیل دی جا رہی تھی۔

میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد ہم ہموار ٹیلے پر تھے۔ میں نے ٹارچ جلا کر نشیب کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھیل دینے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اب ہم ہموار ٹیلے پر معلق تھے۔ ہمارا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ بورا ٹیلے سے چند انچ اوپر تھا۔ متحرک پلی اب اس تیسری رسی سے بھی رکی ہوئی تھی۔ جو ہک میں لگی ہوئی چھوٹی سی پلی کے گرد گھوم کر پٹ سن کے بورے سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اس رسی کو جھٹکا دے کر بخت خاں کو اشارہ کیا۔ بخت خاں نے تیسری رسی کو ڈھیل دی اور بورا ٹیلے پر آ گیا۔ ذرا ہی دیر میں ہم اس بورے سے باہر آ گئے۔

میرے لیے یہ انتہائی سنسنی خیز تجربہ تھا۔ سوچنے اور کسی چیز پر عمل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اس وقت میرے احساسات قطعی مختلف تھے۔

اس ہموار ٹیلے سے اتر کر ہم کوٹھی کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس کوٹھی کا جو نقشہ ہمیں فراہم کیا گیا تھا ہم نے کئی مرتبہ غور سے دیکھا تھا۔ اس نقشے کو ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد ہم اس کوٹھی کے چپے چپے سے واقف ہو گئے تھے۔ پھر میں نے اور ٹیپو نے مسلسل دو راتیں جاگ کر اس کوٹھی میں موجود لوگوں کے معمولات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سادہ لباس میں چار مسلح فوجی محافظ ہر وقت اس کوٹھی میں موجود رہتے ہیں۔ ان میں دو محافظ آرام کرتے ہیں اور دو پہرا دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہر وقت کوٹھی کے گیٹ پر موجود رہتا ہے اور دوسرا محافظ کوٹھی کا چکر لگاتا رہتا ہے۔ ولسن کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ رات گئے تک کام کرتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ تھا کہ کوٹھی کی نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں جو غالباً ولسن کا اسٹڈی روم تھا، وہاں رات تین بجے تک روشنی رہتی تھی۔ یہاں ولسن کام کرتا ہو گا۔ ٹھیک تین بجے اس کمرے کی روشنیاں بجھ جاتی تھیں۔ پھر اس کمرے کے برابر والے کمرے میں چند منٹ کو تیز روشنی ہوتی۔ یہ کمرا شب خوابی کا تھا۔ چند منٹ اس کمرے میں روشنی ہوتی، پھر گل ہو جاتی اور ہلکی سی نیلی روشنی باقی رہ جاتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ولسن سوا تین بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ ٹھیک ڈھائی بجے کوٹھی کے عقبی حصے میں گشت کرنے والا محافظ گیٹ پر آتا اور گیٹ کے محافظ کے ساتھ بیٹھ کر تھرموس سے چائے نکال کے پیتا۔ یہاں دس پندرہ منٹ گزار کے وہ پھر پہرا دینے کے لیے عقبی حصے کی طرف نکل جاتا اور کہیں برآمدے میں کسی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا۔ باقی دو محافظ کوٹھی کی انیکسی میں سویا کرتے جہاں ولسن کا باورچی بھی رہا کرتا تھا۔

کوٹھی کی عقبی حصے میں بھی بڑا سا لان تھا۔ جس کے اردگرد گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی گزشتہ دو راتوں کے دوران ہی میں ہم نے ان گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک ایسی جگہ تلاش کر لی تھی جہاں سے چاروں ہاتھ پیروں پر جھک کر ہم لان میں داخل ہو سکتے تھے۔ لان کی سمت ولسن کی خواب گاہ کا دروازہ بھی کھلتا تھا اور اسٹڈی کا بھی۔

ٹھیک ڈھائی بجے جب میں نے عقبی حصے کے محافظ کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا تو ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا لیا۔ میں نے وہ کنکر زور سے کوٹھی کی عقب کی طرف اندازاً اس مقام کے پاس پھینکا جہاں ٹیپو موجود تھا۔ پھر میں... خود بھی لمبا چکر کاٹ کر اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے ہم نے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ٹیپو وہاں نہیں تھا۔ وہ احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ میں بھی کچھ ہی دیر بعد احاطے میں رینگ گیا مجھے معلوم تھا کہ ٹیپو اس وقت کوٹھی میں کس جگہ ہو گا۔

محافظ کو ابھی گیٹ کی طرف گئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے۔ ہمیں دس منٹ کے اندر کوٹھی کے کسی کمرے میں داخل ہو جانا تھا۔

میرے خیال میں نہ صرف ولسن بلکہ اس کے محافظ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ولسن کے تحفظ کی خاطر کیے جانے والے انتظامات محض حکومت کے اعلیٰ افسران کا خبطی پن ہے۔ انھیں یہ تاثر دینے میں غالباً خود ولسن کا ہاتھ بھی رہا ہو گا اور اسی کی اجازت سے روزانہ اس کے محافظ ایک مخصوص وقت پر ایک جگہ مل کر چائے پیتے ہوں گے۔ حد سے بڑھی ہوئی ان کی یہی خود اعتمادی ہمارے حق میں سودمند ثابت ہوئی۔

کسی پریشانی اور رکاوٹ کے بغیر میں جھاڑیوں کے درمیان سے رینگ کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل دوڑتا ہوا کوٹھی میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں ٹیپو میرا منتظر تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ٹیپو نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ خواب گاہ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ چند ہی لمحوں بعد ٹیپو آہستہ سے خواب گاہ کا دروازہ کھول کر اندر رینگ گیا۔ اسے ولسن کی مسہری کے نیچے چھپنا تھا۔ میں اسی دروازے کے سامنے برآمدے کے نیچے کیاری میں لگے ہوئے پودوں کے درمیان دم سادھ کر بیٹھ گیا۔

قطرہ قطرہ وقت کا دریا بہتا رہا۔ لمحے ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

عقبی حصے کا محافظ احاطے کا چکر لگا کر برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی کرسی ولسن کی اسٹڈی کی کھڑکی کے سامنے تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ محافظ دھیمی آواز میں کوئی محبت بھرا گیت گا رہا تھا۔ رات کی ان تنہائیوں میں اسے شاید ہندوستان سے ہزاروں میل دور انگلستان میں بیٹھی ہوئی اپنی محبوبہ یاد آرہی تھی۔

پھر میں نے اسی کھڑکی سے ولسن کی آواز سنی "جیکب!" اس نے محافظ کو مخاطب کیا "سب کچھ ٹھیک ہے؟"

"یس سر! حسب معمول" محافظ نے کرسی سے اٹھ کر جواب دیا۔

"گڈ نائٹ!" ولسن کی آواز ابھری۔

"گڈ نائٹ سر!" محافظ نے جواب میں کہا۔

ولسن نے کھڑکی بند کرلی۔ چند ہی لمحوں کے بعد اسٹڈی کی روشنیاں بجھ گئیں اور کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ محافظ اپنی کرسی ذرا پیچھے کھسکا کر ایک طرف قدم اٹھانے لگا۔ میں اپنی جگہ سمٹ کر اور ساکت ہو کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھا اور اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس نے اپنے شانے سے گن اتار کر ہاتھ میں لے لی تھی۔ وہ چلتا ہوا برآمدے کے آخری کونے تک گیا اور اسی انداز میں پھر واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گن اب اس نے اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ اسی عرصے میں ولسن کی خواب گاہ کی تیز روشنیاں بھی بجھ گئی تھیں اور ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی تھی۔ عقبی احاطہ اور برآمدہ اب مکمل تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔

لمحوں کی پیمائش بڑھتی رہی۔ میرا دل اب تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔ خواب گاہ سے اب ولسن کے خراٹوں کی مدھم آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ منصوبے کے آخری فیصلہ کن لمحات بہت قریب آگئے تھے۔ ٹیپو کو اب سوتے ہی میں ولسن کے ہوش و حواس گم کرنا تھے۔ اسے ولسن کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کرنا اور اس کے ہاتھ پیر باندھنا تھے۔ ایسا کرنے کے بعد اسے خواب گاہ کے دروازے سے مجھے اشارہ کرنا تھا اور مجھے کرسی پر بیٹھے ہوئے محافظ کا انتظام کرنا تھا۔

جیب سے میں نے غلیل اور لوہے کا کانٹے دار غلہ نکال لیا۔ اعصاب شکن لمحات گزرتے رہے۔ میرے دانت ایک دوسرے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے اپنے جبڑوں میں ہلکا ہلکا سا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ وقت تھا کہ جیسے گزر ہی نہیں رہا تھا۔ آخر ٹیپو نے خواب گاہ کے دروازے سے مجھے اشارہ کیا۔

میں بہ آہستگی کیاری سے رینگ کر باہر آیا۔ ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی جو اس ماحول میں واضح طور پر سنی جاسکتی تھی لیکن تیز ہوا نے سرسراہٹ کی اس آواز کو اپنی سائیں سائیں کا حصہ بنالیا تھا۔ محافظ اس وقت احاطے کی طرف منہ کیے کوئی گیت گنگنانے میں مصروف تھا۔ اسے یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ اگلے چند لمحوں میں اس کے ہونٹوں پر مچلتا ہوا وہ گیت بکھر جائے گا۔

میں گھٹنوں کے بل زمین پر کھڑا ہوا، پھر پوری قوت سے غلیل کی موٹی اور سخت ربر کھینچ لی۔ دوسرے ہی لمحے لوہے کا کانٹے دار غلہ پوری بے رحمی کے ساتھ محافظ کی کھوپڑی میں کنپٹی کے آس پاس کہیں بیٹھ گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ہی کرسی پر بے ہوش ہوگیا۔ پھر میں لپکتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس خیال سے کہ جلد ہی ہوش میں آکر وہ چیخنا شروع نہ کردے، میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنا بھی ضروری تھے۔ میں نے چند منٹوں میں یہ کام انجام دے دیا، پھر محافظ کو اس کرسی سے اٹھا کر برآمدے کے ساتھ ہی بنی ہوئی کیاری میں ڈال دیا۔ اس کی گن بھی میں نے کیاری ہی میں پھینک دی تھی۔ اس دوران میں ٹیپو، بے ہوش ولسن کو اپنے کاندھے پر لاد کر برآمدے میں آچکا تھا۔

"شاہین! تم اسے لے کر چلو۔" ٹیپو دھیمی آواز میں بولا "میں اسٹڈی کی تلاشی لیتا ہوں، شاید کچھ اہم کاغذات ہاتھ آجائیں۔"

مجھے ٹیپو کی یہ تجویز پسند آئی تھی۔ میں نے بے ہوش ولسن کو اپنے شانے پر منتقل کرتے ہوئے کہا "جلدی کرنا!" میری آواز بھی دھیمی ہی تھی۔

باڑھ کو پار کرنے کے لیے میں نے ولسن کے بے ہوش جسم کو زمین پر ڈال دیا اور پھر اسے باڑھ سے باہر کی طرف کھینچنے لگا۔ اسی وقت ایک زوردار تحکمانہ آواز سنائی دی، کوٹھی کی طرف سے آئی تھی۔

کسی نے انگریزی میں کہا تھا "کون ہے؟"

اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں جیسے بھونچال آگیا تھا۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ پھر میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ٹیپو کی چیخ بھی ابھری تھی۔ اس کے بعد پے در پے دو تین فائر ہوئے اور فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔

میں پریشان ہوگیا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، اس وقت سب سے اہم ذمے داری اس منصوبے کی تکمیل تھی۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ ولسن کے بے ہوش جسم کو رسی کے بل

بلے نشیب میں پہنچا دیا جائے۔ میں ولسن کو اپنے کاندھے پر ڈالے تقریباً بھاگتا ہوا ہموار ٹیلے تک پہنچا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سے نشیب اور بلندی پر سراج الدولہ اور بخت خاں کو خطرے کا سگنل دینے کے ساتھ ولسن کے اغوا میں کامیابی کا سگنل بھی دیا۔ ولسن کو میں نے بورے میں ڈالا اور اس مخصوص کارڈ پر جو ایک طرف سے سرخ اور دوسری طرف سے سفید تھا، کتھئی رنگ کی پینسل سے مختصر سا پیغام لکھا "خطرہ! ٹیپو کو فوراً واپس بھیجو!"

مخصوص رنگ کے کارڈ پر مخصوص رنگ کی پینسل سے لکھی ہوئی تحریر سراج الدولہ کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ میرا منصوبہ وہی تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہ کارڈ سیفٹی پن سے بورے میں لگا دیا۔ پھر بورے کو متحرک پلی میں لٹکا کر دہرے رسے میں سے ایک رسے پر ہک سے پھنسا دیا، اس کے بعد رسی کو جھٹکا دے کر بخت خاں کو اشارہ کیا کہ وہ یہ پلی اوپر کھینچ لے۔ میں نے اس چھوٹی پلی میں دوسرے کارڈ پر بخت خاں کے لیے یہ پیغام لکھ کر بھیج دیا تھا کہ وہ انتظار کرے متحرک پلی پھر اوپر آنے والی ہے۔

ذرا ہی دیر کے بعد نشیب سے متحرک پلی کو ڈھیل دی جانے لگی اور ولسن بورے میں بند نشیب کی طرف جانے لگا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس تمام کارروائی میں صدیاں گزر گئیں تھیں۔ اس عرصے میں چند منٹ کے لیے کوٹھی کے اندر پے در پے فائرنگ ہوئی تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ ٹیپو کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ آخری دم تک ولسن کے مسلح محافظوں کو وہیں الجھائے رکھے تاکہ مجھے ولسن کو نیچے لے جانے کا موقع مل جائے۔

کوٹھی کی طرف سے اب فائرنگ کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں البتہ وہاں سے انگریزی میں چیخ پکار ضرور سنائی دے رہی تھی۔ میں اب ہموار ٹیلے سے اتر کر پھر کوٹھی کی جانب تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔

باڑھ کے پاس میں اس مقام پر بھاگتا ہوا پہنچا جہاں سے مجھے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونا تھا۔

"طارنوش!" جھاڑیوں کی طرف سے مجھے آواز سنائی دی۔ یہ آواز میرے لیے حیرت و استعجاب کا سبب تھی۔ مجھے میرے اصلی نام سے پکارنے والا مجاہد اوّل ہی تھا۔ یہ آواز اسی کی تھی۔

"جی جناب!" میں جواباً بولا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم واپس آؤ گے۔" مجاہد اوّل جھاڑی سے نکل کر باہر آگیا "ٹیپو زخمی اور بے ہوش ہے ولسن کا کیا کیا؟"

مختصر الفاظ میں اور جلدی جلدی میں نے مجاہد اوّل کو سب کچھ بتا دیا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب تم ٹیپو کو لے کر جاؤ۔"

اسی وقت کوٹھی کی بیرونی سمت سے فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ اس مرتبہ فائرنگ بڑی شدید تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے مجاہد اوّل سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں، وہ تمہارے مقامی ساتھی ہی ہیں اور محافظوں کی توجہ گیٹ ہی کی طرف مرکوز رکھنا چاہتے ہیں۔" مجاہد اوّل نے تیزی سے کہا "اب تم جاؤ!" یہ کہہ کر مجاہد اوّل پھرتی سے باڑھ کے ساتھ ساتھ کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ سیاہ لباس کے سبب وہ اندھیرے ہی کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔

ٹیپو کو اپنے شانے پر ڈال کر میں تھوڑی دیر بعد ہی ہموار ٹیلے تک پہنچ گیا۔ کوٹھی کی طرف سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں پھر معدوم ہوگئی تھیں۔ ہموار ٹیلے پر پلی واپس آچکی تھی۔

اصل منصوبہ یہ تھا کہ ولسن کو اغوا کرکے مجھے اسی کے ساتھ نشیب میں جانا تھا۔ ٹیپو کو یہاں سے پیدل چتی بٹیاں کی طرف لوٹنا تھا۔ ولسن پہلے ہی نیچے جاچکا تھا۔ اس لیے مجھے ٹیپو کے ساتھ نیچے جانے میں کوئی قباحت نہیں رہی تھی۔

میں نے ٹیپو کے بے ہوش جسم کو اپنے شانے سے اتار کر بورے میں ڈالنے کے بعد نشیب اور بلندی کی مہم کی تکمیل کا اشارہ دیا۔ اس کے بعد خود مجھے بھی اسی بورے میں بیٹھنا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح بورے میں بیٹھنے کے لیے جب میں نے پیر اٹھایا تو وہ الجھ گیا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ مجھے یاد ہے کہ جس وقت میں بورے میں داخل ہونے کے لیے پیر اٹھا رہا تھا تو میرے ذہن میں لمحے بھر کو یہ خیال آیا تھا کہ کہیں میرا پیر ٹیپو کے زخمی اور بے ہوش جسم پر نہ پڑ جائے! وہی ایک ایسا غافل لمحہ تھا کہ میرا پیر بورے میں الجھ گیا۔

ادھر تو میرے جسم کا توازن بگڑا ادھر رسے کو نیچے سے ڈھیل دے دی گئی۔ اس سے پہلے ہی میں بورے کو ہک میں لٹکا چکا تھا۔ میرا پیر ابھی تک بورے میں پھنسا ہوا تھا۔ بورا نشیب کی طرف جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ پھر میرا جسم ہموار ٹیلے سے گھسٹتا ہوا اس مقام تک آگیا جس

کے بعد گہرا کھڈ تھا۔ چند لمحے میں نے خود کو فضا میں معلق محسوس کیا اور پھر میرے جسم کا بوجھ پڑا تو بورے میں الجھا ہوا پیر آزاد ہو گیا۔ میں نے فضا میں قلابازی سی کھائی۔ اب میرا جسم تیزی کے ساتھ گہرے کھڈ میں گر رہا تھا۔ اتنی بلندی سے گہرے کھڈ میں گرنے کے بعد میرے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی زندگی سے مایوس ہو جانے کے باوجود ابھی تک میرے حواس برقرار تھے۔

گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے ایک یقینی موت سے قریب تر کرتا جا رہا تھا کہ اچانک میرے جسم کو جھٹکے سے لگے اور پھر میں نے اپنے جسم کو انتہائی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ تیزی کے ساتھ نیچے گرتے گرتے میرا جسم سنبھل گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے اندر جناتی صفات بیدار ہو گئی ہیں' وہ جناتی صفات جو خود میرے ہی وجود کا حصہ ہیں اور جو مجھے اپنے باپ ہاموس کی طرف سے ورثے میں ملی ہیں۔

پہلے بھی میں اس پراسرار تجربے سے گزر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ مجھے یہ پراسرار تجربہ دہلی میں اس وقت ہوا تھا جب میں ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی سے نیچے گرا تھا۔ میرا جسم اب آہستہ آہستہ گہرے کھڈ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اپنے جسم کا وزن قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

میں اس جگہ سے خاصے فاصلے پر نشیب میں اترا جہاں سراج الدولہ اور دو مقامی ساتھی موجود تھے۔

کچھ دیر میں اسی جگہ اندھیرے کا حصہ بنا کھڑا رہا۔ میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ میرے جسم کو پھر شدید جھٹکے لگے اور میں زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کیفیت سے نکلنے میں مجھے آدھے منٹ سے زیادہ نہیں لگا ہو گا کہ میرے جسم کی توانائی لوٹ آئی۔

میرے کسی بھی ساتھی کو یہ علم نہیں تھا کہ مجھ پر کیا گزری ہے اور یہ کہ میں ایک یقینی موت سے بچ گیا ہوں۔ میرے وجود کی پراسراریت سے ان کا نا آشنا رہنا ہی میرے حق میں بہتر تھا اور اس کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ میں نے اسی پر عمل کیا۔

وقتی طور پر بخت خاں' سراج الدولہ اور میرے مقامی ساتھی میری طرف سے کچھ پریشان و فکر مند تو ضرور ہوتے۔ مگر میں نے جو قدم اٹھایا تھا اس کے بعد میری پراسرار شخصیت کا راز ان پر نہ کھلتا۔

میرا رخ اب نشیب میں کچھ فاصلے پر موجود اپنے ساتھیوں کی بجائے مخالف سمت میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھی منصوبے کے بالکل آخری مراحل بہ خوبی طے کرلیں گے۔ اس کے لیے انہیں میری مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل مہم بہرحال سر کرلی گئی تھی۔ ہم ولسن کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

بقیہ حصہ منصوبے کا یہ تھا کہ ولسن کو مجاہد اول کے حوالے کر دیا جاتا۔ آخری مراحل یہ تھے کہ وہاں سے ہر وہ شے ہٹا دینا تھی جس سے یہ سراغ لگایا جا سکتا تھا کہ ولسن کو کس طرح اغوا کیا گیا! سراج الدولہ اور اس کے مقامی ساتھی بلیوں پر بندھے ہوئے رسے کو نیچے کھینچ لیتے اس رسے کو وہیں زمین میں دفن کرنے کے لیے سر شام ہی سراج الدولہ اور اس کے دونوں ساتھیوں نے گہرا گڑھا کھود لیا تھا اس کے بعد درخت میں بندھی ہوئی پلی بھی کھول لی جاتی بلندی پر یہی کارروائی بخت خاں بھی مکمل کر لیتا اور پھر وہ سے سراج الدولہ کو روانگی کا اشارہ دیتا۔ سراج الدولہ کو بھی اس کا جواب ٹارچ کی روشنی سے دینا تھا۔

ان تمام کارروائیوں سے نمٹنے کے بعد سراج الدولہ کی یہ ذمے داری بھی تھی کہ وہ پن چکی کے مالک کو بھی کھول دیتا۔ کھولنے کے بعد اسے یہ دھمکی بھی دینا تھی کہ اس نے کسی سے کچھ کہا تو جان کی خیر نہیں ہو گی۔ اس کے بعد مقامی ساتھیوں کو جدا ہو جانا تھا۔ سراج الدولہ اور بخت خاں کو بھی بٹیاں والے مکان کا رخ کرنا تھا۔ خود میرا رخ بھی اب اسی طرف تھا۔

O☆O

اس کے بعد ٹیپو اور میں تقریباً ایک ماہ تک کے لیے گھر ہی میں محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ ہدایت ہمیں مجاہد اول کی طرف سے دی گئی تھی کیوں کہ راولپنڈی میں پولیس اور خفیہ کے کارکن ہماری تلاش میں تھے۔ راولپنڈی ہی میں علی حسن کو بھی دیکھا گیا تھا۔ محکمہ خفیہ کا یہ وہی مونچھوں والا تھا جو لاہور میں مجھے پھنسوا کر غائب ہو گیا تھا۔ یہ شخص میرے ڈیڈی کے ماتحتوں میں سے تھا۔ طارنوش کی حیثیت سے وہ مجھے پہچانتا تھا اور میرے لیے یہی سب سے بڑا خطرہ تھا۔ میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ علی حسن میرے ڈیڈی ہی کے ایما پر میری نگرانی کرتا ہوا لاہور تک آیا تھا لیکن اب وہ راولپنڈی میں کیوں نظر آ رہا تھا' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ لاہور سے فرار ہو کر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہلے لائلپور (فیصل آباد) گیا تھا' پھر وہاں سے ہم ملتان پہنچے تھے۔ ملتان کے بعد میں کچھ عرصے کراچی میں رہا تھا اور اب راولپنڈی میں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مجھے خاصا وقت لگا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سی آئی اے والے میری تلاش میں ہیں۔ میں لاہور میں ان کی قید سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ خاصے پولیس والے بھی میرے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا کہ وہ چپ ہو کر بیٹھ رہتے۔ جہاں جہاں میرا سراغ لگنے کے امکانات ہو سکتے تھے وہاں وہ ضرور مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ خفیہ کے بہرحال کچھ افراد ایسے

ضرور تھے جو طارنوش کی حیثیت سے مجھے شناخت کر سکتے تھے۔ انہی میں سے ایک یہ علی حسن بھی تھا۔ لاہور میں جن لوگوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی' وہ بھی مجھے پہچان سکتے تھے۔ کیتھی کون تھی اور خفیہ میں کس عہدے پر فائز تھی' یہ تو میرے علم میں نہیں تھا مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے ہی پر رہی ہو گی۔ اس نے اسی لیے تو سی آئی اے کے ڈائریکٹر ڈیسوزا کی بھی پروا نہیں کی تھی' وہ جنہیں میں اپنا ڈیڈی کہتا تھا اور جنہوں نے میری پرورش کی تھی۔ اطلاعات کے مطابق کیتھی کو کراچی میں بھی دیکھا گیا تھا۔ اسی اطلاع کے بعد میں چوکنا ہو گیا تھا اور پھر مجاہد اول نے مجھے راولپنڈی بلا لیا تھا۔ میں موجودہ حالات میں اسی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ جہاں بھی حکومت کے خلاف کوئی بڑا قدم اٹھایا جاتا تھا یا حکومت کے خلاف سرگرمیاں شروع ہو جاتی تھیں' خفیہ والے وہاں میری تلاش میں پہنچ جاتے ہوں گے۔ راولپنڈی میں ابھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ولسن کا اغوا کوئی معمولی نوعیت کا حامل بہرحال نہیں تھا۔ ان حالات میں مجاہد اول کا یہ فیصلہ قطعی درست تھا کہ میں فی الحال گھر سے نہ نکلوں" اس وقت تک جب تک کہ حالات معمول پر نہ آ جائیں۔ مصلحتاً اور بہ طور احتیاط ان دونوں ساتھیوں کو بھی وقتی طور پر وہاں سے ہٹا لیا گیا تھا جو پہلے اسی گھر میں میرے ساتھ تھے' یعنی سراج الدولہ اور بخت خاں! اب اس گھر میں صرف میں تھا اور ٹیپو!

ولسن کے اغوا والی رات کو میں نے گھر پہنچ کر بات بنا دی تھی۔ میں دانستہ دیر سے گھر پہنچا تھا۔ سراج الدولہ اور بخت خاں میری طرف سے فکر مند تھے۔ "میں ایک لمبا چکر کاٹ کر یہاں پہنچا ہوں اس لیے دیر ہو گئی۔" میں نے کہا تھا۔

"مگر تم ٹیپو ہی کے ساتھ بورے میں کیوں نہیں بیٹھ گئے تھے؟" بخت خاں نے سوال کیا تھا۔

"منصوبے کے مطابق ٹیپو کو پیدل یہاں پہنچنا تھا۔ وہ خلاف توقع زخمی ہو کر ہوش کھو بیٹھا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے نشیب میں پہنچا کر خود میں اس کی جگہ پیدل یہاں پہنچوں۔ تم لوگوں نے کیوں یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ میں بھی بورے میں بیٹھوں گا!"

"مگر محفوظ راستہ تو یہی تھا کہ آپ۔۔۔"

"خیر اب اس قصے کو چھوڑو!" میں نے سراج الدولہ کی بات کاٹ دی تھی اور پھر زخمی ٹیپو کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جسے ہوش آ رہا تھا۔

ولسن کے اغوا کا ردعمل راولپنڈی میں یہ ہوا کہ شہر میں موجود تمام ڈاکٹروں کے کلینک' ان کے گھروں اور کمپاؤنڈروں کے گھروں پر بھی پولیس نگرانی کرنے لگی۔ ریلوے اور راولپنڈی سے باہر جانے والے راستوں پر بھی پولیس کی کڑی نگرانی تھی۔ پولیس اور خفیہ کا خیال تھا کہ ولسن کو اغوا کرنے والوں میں سے کم از کم ایک شخص یقیناً زخمی ہوا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اپنے زخمی ساتھی کے علاج معالجے کی خاطر انہیں کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچنا ہی تھا۔ اس امکان کے پیش نظر کہ شاید وہ زخمی ہلاک ہو گیا ہو' قبرستان اور شمشان گھاٹ پر بھی پولیس کا پہرا تھا۔ کسی مردے کی تدفین سے قبل یا کسی ارتھی کو چتا پر پھونکنے سے پہلے پولیس کے کارندے لاش کا جائزہ لے کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔

یہ تمام باتیں ہمیں اس وقت معلوم ہوئیں جب دو تین روز کے بعد بخت خاں دوبارہ ہمارے پاس آ کر رہنے لگا۔ وہ مکان دو منزلہ تھا' نچلی منزل کے علاوہ اوپر بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ بخت خاں کی آمد کے بعد ٹیپو اور میں اوپری منزل پر منتقل ہو گئے۔ بخت خاں نیچے ہی ایک کمرے میں رہا۔

بیرونی دنیا سے اب ہمارے رابطے کا ذریعہ بخت خاں ہی تھا۔ احتیاطاً اس نے کھانے پینے کا اتنا سامان گھر میں جمع کر دیا تھا کہ اب ہم گھر سے نکلے بغیر بھی ایک ماہ تک بھوکے رہے بغیر اس گھر میں گزارہ کر سکتے تھے۔

پہلے دو دن ٹیپو کی حالت بہت خراب رہی۔ اس کا زخمی بازو بری طرح پھول گیا تھا۔ گھر میں اسپرٹ اور ٹنکچر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی سے میں زخم کی صفائی اور ڈریسنگ کر رہا تھا۔ تیسرے دن تنظیم سے وابستہ ایک ڈاکٹر لاہور سے ضروری دوائیں لے کر راولپنڈی پہنچا۔ وہ ایک ہفتے ہمارے ساتھ ہی مقیم رہا۔ اس کی پیشہ ورانہ توجہ اور مہارت سے ٹیپو کے بازو کا زخم جلد ہی ٹھیک ہونے لگا۔ وہ ڈاکٹر ایک ہفتے قیام کے بعد واپس چلا گیا۔ اس نے ہمیں ضروری دوائیں اور ان کے استعمال کا مکمل طریقہ سمجھا دیا تھا۔

ولسن کے بارے میں بخت خاں نے مجھے بتایا تھا کہ اغوا والی رات ہی اسے راولپنڈی سے مجاہد اول نے کہیں اور منتقل کر دیا تھا۔ مجھے نہ معلوم کیوں یہ یقین تھا کہ مجاہد اول'

ولسن پر تشدد کی انتہا کردے گا اور یہ بات اگلوا ہی لے گا کہ ہندوستان میں اس کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

اسی دوران میں دہلی سے ایک خبر ملی کہ وہاں حکیم اجمل خاں کی صدارت میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں پانچ سو علما کے فتوے چھپوا کر ملک بھر میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فتوے میں انگریزی فوج اور پولیس کی ملازمت مسلمانوں کے لیے حرام قرار دی گئی تھی۔ اس فتوے کو پہلے ہی حکومت ضبط کر چکی تھی۔ کانگریسی لیڈر گاندھی جی بھی جو ابھی تک تحریکِ خلافت کے کراچی ریزولیشن پر خاموش تھے' انہوں نے بھی اس کی حمایت کا اعلان کردیا۔ پھر بمبئی میں ہندوستان بھر کے رہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بھی کراچی ریزولیشن کی تمام باتوں کو دہرایا گیا۔

اب ایک طرح سے ہندوستان نے سیاسی طور پر انگریز حکومت کے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا۔ اس موقع پر ہندوستانیوں نے اس عزم کا اعادہ بھی کیا تھا کہ وہ پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کا مکمل بائیکاٹ کریں گے۔

مجھے علم تھا کہ مجاہدِ اوّل راولپنڈی سے بمبئی جاچکا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس نے بمبئی میں جمع ہونے والے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کی ہوں اور ان پر دباؤ ڈالا ہو کہ پرنس آف ویلز کے دورے کا سیاسی سطح پر بائیکاٹ کیا جائے۔

اطلاعات کے مطابق ملک بھر میں احتجاج' جلسے جلوس اور مظاہرے ابھی سے شروع ہوگئے تھے۔ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان صدائے احتجاج بنتا جارہا تھا۔ حکومت سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ وہ مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' شنکر آچاریہ' مولانا عبدالکلام آزاد' مولانا حسرت موہانی' مولانا ظفر علی خاں' مولانا نصیر احمد' پیر غلام مجدد' مولانا حسین احمد اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو رہا کرے۔ ان میں سے شنکر آچاریہ کو رہا کردیا گیا۔ مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا اس میں انگریزی حکومت نے قانون کے کئی تقاضے پورے نہیں کیے تھے۔ کئی طے شدہ عدالتی روایات سے انحراف کیا اور یہ ثابت کردیا کہ ہر دور میں اصل قانون صرف اور صرف طاقت ہے۔ طاقت کے سامنے انصاف' حق' اقدار اور روایات کچھ نہیں۔ آئین' قانون اور کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے بے معنی ہے۔ سچ صرف وہی ہے جو طاقت کے بل پر اقتدار میں آنے والے کے منہ سے نکلتا ہے' ہر مقدس قانون اس کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔

یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو یقین تھا کہ ہمیں جلد ہی کسی اہم مہم پر روانگی کی ہدایات ملیں گی۔ مجاہدِ اوّل نے راولپنڈی سے چلتے وقت ہدایت کی تھی کہ وہ ہمیں اس شہر سے نکلنے کی اسی وقت اجازت دے گا جب ولسن کے اغوا کا معاملہ ٹھنڈا پڑجائے گا۔ حالات کے پیشِ نظر پہلے احکام واپس لے لیے گئے تھے جن کی رو سے مجھے کلکتے جانا تھا۔ فاطمہ اور جوگیندر وہیں تھے۔

میرا خیال تھا کہ انگریز حکومت شاید ولسن کو صبر کر بیٹھی تھی۔ ٹیپو کے بازو کا زخم بھی مندمل ہوگیا تھا' لیکن یہ اندر ابھی کچا ہی تھا۔ وہ اپنے بازو کو پوری قوت سے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔

پھر ایک سہ پہر سراج الدولہ ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہمارے لیے مجاہدِ اوّل کا پیغام لے کر آیا تھا۔ ولسن کے اغوا کے بعد مجاہدِ اوّل کے حکم پر چوتھے روز وہ راولپنڈی سے چلا گیا تھا۔ اس سے تقریباً ایک ماہ بعد میری ملاقات ہورہی تھی۔

مجاہدِ اوّل کے نئے احکام کے مطابق مجھے اور بخت خاں کو دہلی پہنچنا تھا۔ ٹیپو اور سراج الدولہ کو اب کلکتے جانے کی ہدایت دی گئی تھی۔

تنظیم ان دنوں اپنے کارکن ہندوستان کے ان شہروں میں پھیلا رہی تھی جہاں دورۂ ہند کے موقع پر پرنس آف ویلز کو پہنچنا تھا۔ پھر ان سب لوگوں کو دہلی میں جمع ہونا تھا جہاں پرنس آف ویلز کے اعزاز میں ایک زبردست تقریب کا اہتمام کیا جانے والا تھا۔

حسبِ معمول بخت خاں اس وقت بھی گھر پر نہیں تھا۔ عموماً وہ گھر سے باہر ہی رہتا تھا تاکہ باہر کی خبریں مجھ تک پہنچ سکیں۔ علی حسن ابھی تک راولپنڈی ہی میں تھا' یہ خبر بھی مجھے بخت خاں ہی نے فراہم کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔

بخت خاں رات گئے واپس آیا۔ راولپنڈی میں وہ پہلے بھی رہ چکا تھا۔ یہاں اس کے خاصے دوست تھے۔ ان میں اینگلو انڈین بھی تھے' کچھ لڑکیاں بھی تھیں وہ لوگ مختلف سرکاری محکموں میں کام کرتے تھے۔ بخت خاں نے خاص طور پر راولپنڈی میں ان لوگوں سے دوستی اور بھی بڑھائی تھی جو محکمہ خارجہ' دفاع اور خفیہ کے محکموں سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھے۔ ان لوگوں سے اسے بعض بہت اہم معلومات حاصل ہوجاتی تھیں۔ بخت خاں ایک پروقار اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ دوست بنانے کی صلاحیت بھی انہی میں سے ایک تھی۔ لڑکیاں اس

سے بہت جلد مرعوب ہوجاتی تھیں اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں جادو ہی ایسا تھا۔ لڑکیوں سے وہ بڑی شاعرانہ گفتگو کرتا تھا کیوں کہ وہ خود بھی ایک اچھا شاعر تھا۔ میں نے اس کی کئی غزلیں سنی تھیں۔ وہ "بخت" ہی تخلص کرتا تھا اور اپنی غزل کے مقطع یعنی آخری شعر میں "بخت" کو اس طرح استعمال کرتا تھا جس طرح حکیم مومن خاں مومن دہلوی اپنے تخلص "مومن" کو مقطع میں استعمال کرتے تھے مثلاً

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بخت خاں کی غزل کا ایک مقطع مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے اسے اس مقطع پر بڑی داد دی تھی۔

بخت ہی اپنا سوگیا ورنہ
لوگ بیدار ہونے والے تھے

اس رات ہم دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ ہم سبھی اوپری منزل پر تھے۔ میرے ایما پر بخت خاں بھی اپنا بستر نیچے سے اٹھا لایا تھا۔ ہم چاروں ساتھی میں' ٹیپو' بخت خاں اور سراج الدولہ اس پر غور کررہے تھے کہ راولپنڈی سے کس طرح نکلا جائے؟ سراج الدولہ اور بخت خاں کے لیے تو میرے نزدیک وہاں سے نکلنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ میرا تھا اور کسی قدر ٹیپو کا بھی' اس لیے کہ وہ بھی لاہور میں گرفتار ہوچکا تھا۔ حکومت دشمن کی حیثیت سے اسے کم از کم خفیہ کے وہ افراد تو پہچان ہی سکتے تھے جنھوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ جب علی حسن دہلی سے راولپنڈی آسکتا تھا لاہور کے خفیہ والے بھی راولپنڈی پہنچ سکتے تھے۔

سراج الدولہ اس رات مجھے کچھ بجھا بجھا سا محسوس ہوا۔ اس کے مزاج میں جو شگفتگی تھی شاید سفر کی تکان کی سبب مفقود ہوگئی تھی۔ وہ بار بار جمائیاں لے رہا تھا اور کئی مرتبہ سونے کی خواہش کا اظہار بھی کرچکا تھا۔ ہم چاروں ایک ہی کمرے میں تھے اور اس رات ہم نے وہیں سونے کو ترجیح دی ورنہ نچلی منزل کے کمرے خالی تھے۔ سراج الدولہ یا ہم میں سے کوئی بھی وہاں سو سکتا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے ہم سب اپنے بستروں پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

رات کو تین بجے کے قریب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت سراج الدولہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور بخت خاں نے اس پر پستول تان رکھا تھا۔ بخت خاں ہی نے مجھے ٹہوکا دے کر اٹھایا تھا۔ پہلے پہل تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بخت خاں کیا کہہ رہا ہے' پھر جب اس کی بات میری سمجھ میں آئی تو میں نے تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر راہداری میں کھلنے والا دروازہ بند کردیا۔ بخت خاں مجھ سے دروازہ بند کرنے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس غدار سے پوچھو!" بخت خاں نے پستول کی نال سے سراج الدولہ کی طرف اشارہ کیا۔

"سراج الدولہ اور غدار!" میں حیرت سے بولا "کیا ستم ظریفی تھی کہ ہمارے اس ساتھی نے ایک ایسی شخصیت کا نام اختیار کیا تھا جس کے ساتھ غداری کا تصور تک گناہ تھا۔

بخت خاں نے مضبوط لہجے میں کہا "ہاں یہ غدار ہے اس سے پوچھو کہ اس نے ٹارچ کے ذریعے باہر کسے اشارہ کیا تھا؟"

"کیا؟" میں چونک اٹھا۔ میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔ میری سوالیہ نظریں سراج الدولہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"مم۔۔۔ میں۔۔۔ مجبور ہوگیا تھا شاہین!" سراج الدولہ نے رک رک کر بتایا "انہوں نے میری۔۔۔ میری بیوی' بہن اور ۔۔۔ اور میرے بچے کو یرغمال بنالیا ہے۔"

سراج الدولہ نے اقرار جرم کرلیا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ اس طرف بڑھا جہاں لالٹین رکھی تھی۔ میں اسے بجھا کر اندھیرا کردینا چاہتا تھا۔ اس طرف بڑھتے ہوئے میں نے بخت خاں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ خطرہ سر پر آگیا تھا۔ میں نے ایک دریچے سے چار پانچ سپاہیوں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس عرصے میں ٹیپو بھی جاگ گیا تھا اور متحیر انداز میں اس صورتِ حال کو دیکھ رہا تھا۔ "میں۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" سراج الدولہ نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کیا "انہوں نے میری بیوی' بچے اور بہن کو یرغمال بنا رکھا ہے۔" اس کا انداز رو دینے کا سا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو سراج الدولہ! مجھے پورا یقین ہے تمہاری بات پر کہ ایسا ہی ہے!" میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

اس گھر کا ایک عقبی دروازہ بھی تھا۔ اسی دروازے سے مجاہدِ اوّل ایک روز اس گھر میں آیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب ہم راولپنڈی آئے تھے اور مجاہدِ اوّل نے ہمیں ولسن کے اغوا کا حکم دیا تھا۔ یہ عقبی دروازہ نچلی منزل پر تھا اور ایک تنگ سی گلی میں کھلتا تھا۔

میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم نچلی منزل پر پہنچ کر عقبی دروازے سے فرار ہوسکتے ہیں یا نہیں' اوپر سے تنگ گلی میں

جھانک کر دیکھا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ادھر بھی پولیس کا ایک دستہ موجود تھا۔

اس وقت مجھے خود اپنے آپ کو داد دینے کا جی چاہا۔ میں نے بہ وقتِ ضرورت اس مکان سے فرار کا تیسرا راستہ بھی پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا اور جو سوچا تھا۔ اس کے لیے عملاً بھی تیاری کرلی تھی۔ اس مکان کے دائیں رخ پر نشیب تھا۔ کبھی وہاں کوئی تالاب وغیرہ رہا ہوگا جو سوکھ چکا تھا اور اب لوگ وہاں کوڑا کرکٹ ڈالتے رہتے تھے۔ کوڑے کرکٹ کے باوجود اب بھی خاصی گہرائی تھی۔ اس طرف صرف ایک کھڑکی تھی جو بند ہی رکھی جاتی تھی۔ کھڑکی بند رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ادھر سے ہوا کے ساتھ ساتھ بدبو بھی آتی تھی جو گلے سڑے کچرے سے پیدا ہوتی تھی۔ گندگی ہی کی وجہ سے مچھر بھی اس کھڑکی کے راستے کمرے میں آجاتے تھے۔ اس کھڑکی میں موجود درمیانی آہنی سلاخیں میں نے نکال دی تھیں۔ ان سلاخوں کے نکلنے کی وجہ سے اتنی جگہ ہوگئی تھی کہ ایک شخص سکڑ سمٹ کر دائیں بائیں موجود دوسری آہنی سلاخوں کے درمیان سے نکل سکتا تھا۔ انہی دائیں بائیں موجود بقیہ سلاخوں کے درمیان میں نے ایک مضبوط رسی کے دونوں سروں کو گرہ دے کر رکھ چھوڑا تھا۔ یہ کارروائی میں نے ان دنوں کی تھی جب پولیس اور خفیہ والے ولسن کے اغوا کے بعد پاگل کتوں کی طرح مجھے اور نیپو کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کھڑکی میں مضبوط رسی اتنی لمبی تھی کہ نیچے نشیب کی سطح تک جاتی تھی۔

میں تیزی سے اسی بند کھڑکی کی طرف بڑھا اور رسی کو نشیب میں پھینک دیا۔ اس سے پہلے میں کھڑکی کھول چکا تھا اور کمرے میں ہوا کے ساتھ بدبو بھر گئی تھی۔

"نیپو!" میں بولا "چلو اترو' جلدی کرو!" میں نے یہ کہتے ہوئے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ وہاں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

میرے کہنے پر نیپو نے جوتے پہنے' سرہانے سے اپنا پستول نکالا' وہ تھیلا اٹھایا جس میں فوری روانگی کے لیے ضروری سامان رہتا تھا اور کھڑکی کے پاس آگیا۔ "نیچے جاکر اپنے پستول میں گولیاں بھرلینا نیپو!" بخت خاں بولا "تمہارے پستول کی گولیاں اس وقت سراج الدولہ کی جیب میں ہیں۔" نیپو رسی کے سہارے نشیب میں پھسل گیا۔

پھر میں اپنے بستر کی طرف بڑھا اور بخت خاں سے دریافت کیا "میرے پستول میں بھی گولیاں ہیں یا نہیں؟"

"ہاں" بخت خاں نے جواب دیا "نیپو کے بعد یہ میرے بستر کی طرف آیا تھا کہ میں نے اسے نشانے پر لے لیا۔"

"یقین کرو تم لوگ کہ میں سچ کہہ رہا ہوں' میرے بیوی بچے اور ــــ"

"تم خاموش رہو!" میں نے سختی سے سراج الدولہ کی بات کاٹ دی پھر اپنا پستول اور تھیلا اٹھالیا۔

اصولاً مجھے سراج الدولہ کو فوراً گولی مار دینا چاہیے تھی۔ تنظیم کا اصول یہی تھا' مگر میں نے یہ سوچ کر کہ اسے کسی بھی وقت گولی ماری جاسکتی ہے' ایسا نہیں کیا اسے میں نے وقتی طور پر اس لیے زندہ رہنے دیا کہ اس سے معلوم ہوسکے' اس نے پولیس کو ہمارے اور تنظیم کے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے۔

سراج الدولہ کو میں نے اپنے پستول کی زد پر لیتے ہوئے بخت خاں سے کہا "اب تم نیچے جاؤ' تمہارے بعد سراج الدولہ آئے گا۔ تم پستول کی زد پر لے کر اس کے ہاتھ نیپو سے پشت پر بندھوا دینا اور منہ میں کپڑا تو اسی وقت ٹھونس دو اور اوپر سے ــــ"

"ساتھی! میں ــــ سچ۔" اس کی آواز جیسے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"میں تمہیں صفائی کا موقع ضرور دوں گا مگر اس وقت تم خاموش ہوجاؤ سراج الدولہ!" میں نے کہا۔

بخت خاں نے سراج الدولہ کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس کر اوپر سے بھی ایک بڑا رومال باندھ دیا' وہ ایسا بڑا رومال تھا جو عموماً بوڑھے یا ضعیف لوگ اپنے کاندھے پر ڈال لیتے ہیں پھر بخت خاں بھی اپنا تھیلا اور پستول لے کر رسی کے سہارے نیچے نشیب میں اتر گیا۔ اس کے بعد سراج الدولہ کو بھی نیچے اترنا ہی پڑا۔ میں کھڑکی میں جھک کر اسے پستول کی زد پر لیے ہوئے تھا نیچے سے یقیناً بخت خاں نے بھی اسے نشانے پر لے رکھا ہوگا۔

جب سراج الدولہ نصف رسی کا فاصلہ طے کرچکا تو میں تیزی سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں نے مٹی کے تیل کا کنستر اٹھایا اور اس کا ڈھکن کھول کر ہر طرف تیل چھڑک دیا۔ میرا تھیلا شانے سے لٹکا ہوا تھا اور اب میں فرار کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

اچانک میں نے پستول سے فائر کیا اور خود ہی زور سے چیخ ماری' پھر دوسرا' تیسرا اور چوتھا فائر کیا۔ ہر فائر کے ساتھ میں نے آوازیں بدل بدل کر "آزاد ہندوستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا' پھر ماچس کی تیلی جلا کر بستر پر پھینک دی۔ مٹی کے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑے اور دوسرے سامان نے فوراً ہی آگ پکڑلی۔ نچلی منزل کے دونوں دروازوں یعنی بیرونی اور عقبی

دروازوں پر ضربیں لگائی جارہی تھیں اور میں کھڑکی کی راہ سے رسی کے سہارے نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے رسی کے دونوں سروں پر لگی ہوئی گرہ کھولی اور رسی کو نیچے کھینچ لیا۔

اوپر مکان میں آگ خوب بھڑک رہی تھی۔ پولیس پارٹیاں مکان کے دونوں دروازوں کو توڑنے کی کوشش کررہی تھیں۔ ایک ہنگامہ جاری تھا۔ ہم چاروں نشیب میں خاصے دور نکل آئے تھے۔ اس جگہ تک مکان میں بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

میں نے مکان میں آگ لگانے کا فیصلہ اسی لیے کیا تھا کہ فوری طور پر پولیس ہمارے فرار کے بارے میں نہ سوچ سکے اور محض یہ اندازہ لگائے کہ ہم نے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بجائے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ محب وطن افراد کے ایسے اقدامات کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آگ بجھائے جانے کے بعد پولیس کو جب وہاں کوئی لاش نہیں ملے گی تو وہ سمجھ جائے گی کہ ہم اسے جل دے کر کھڑکی کے راستے فرار ہوگئے ہیں اس وقت تک ہم پولیس کی دسترس سے نکل کر بہت دور جاچکے ہوں گے۔ بخت خاں مصلحتاً چند روز کے لیے ہم سے الگ رہا تھا' ان دنوں جب نیپو علیل تھا۔ اس وقت بخت خاں نے جو مکان کرائے پر لیا تھا' اس کا قبضہ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ مکان کمپنی باغ کے سامنے تھا۔ ہم سب چٹی ہٹیاں کے مکان سے فرار ہوکر وہیں پہنچ گئے۔

○ ہمیں اس نئے مکان میں قیام کیے دوسرا دن تھا۔ اگلے روز میں نے وہاں سے کسی کو نکلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مکان میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ہمیں اسی لیے کھانے پینے کی کسی سامان کی فراہمی کی خاطر باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

سراج الدولہ کا مسئلہ اس دوران میں میرے ذہن پر بوجھ تھا۔ اس کی غداری میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ اسے اس غداری کی سزا دینا ہی تھی۔ سراج الدولہ کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا جو ابھی تک مجھے اس کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے سے روکے ہوئے تھا۔

مقررہ وقت پر مجھے اور بخت خاں کو دہلی پہنچنے کے لیے اگلے روز ہر صورت میں راولپنڈی سے نکل جانا تھا لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت سراج الدولہ تھا۔ دن بھر میں اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ ہر پہلو سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ سراج الدولہ نے تنظیم سے غداری کی ہے اس لیے اسے انتہائی سزا ملنا چاہیے انتہائی سزا یعنی موت!

سراج الدولہ بلاشبہ موت کی سزا کا مستحق تھا۔ اگر تنظیم سے اس کی غداری کو بھی درگزر کردیا جاتا تو وہ اس لیے بھی سزا کا مستحق تھا کہ اس نے ہم تینوں ساتھیوں کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اگر ہم اس کی بساط نہ الٹ دیتے تو خود اس کی تجویز کی ہوئی سزا کے مطابق موت کے دہانے پر پہنچ چکے ہوتے۔ ایک اعتبار سے اس نے ہم تینوں کو سزائے موت سنائی تھی۔

سراج الدولہ کا جرم بڑا سنگین تھا۔ اسے سنگین سزا ہی ملنا چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ رحم کا سلوک کرنا خود کو اور تنظیم کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اسے معاف کرنا اس مقصد سے غداری تھا جس کے لیے ہم نے اپنے سروں سے کفن باندھ رکھے تھے۔ سو اس رات جب بخت خاں باہر کی سن گن لے کر واپس آگیا تو عدالت سجی۔ اس کا مدعی بھی میں تھا اور منصف بھی میں۔ سراج الدولہ اپنی صفائی میں اس کے سوا کوئی اور دلیل پیش نہ کرسکا کہ پولیس نے اس کی بیوی' بہن اور بچے کو اغوا کرلیا تھا اور اسے مجبور کیا تھا کہ وہ تنظیم سے متعلق اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتادے۔

"یہ بتاؤ سراج الدولہ کہ پولیس تم تک کس طرح پہنچ گئی؟ پولیس کو کس طرح اس بات کا علم ہوا کہ تم کسی ایسی تنظیم کے رکن ہو جو انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل ہے؟ تم پولیس کے مخبر کیسے بنے؟" میں نے معلوم کیا۔

"ولسن کے اغوا کے بعد' ہدایات کے مطابق میں اگلے ہی روز یہاں سے اپنے شہر لائلپور (فیصل آباد) چلا گیا تھا۔ اپنے چچا کے بیٹے کو میں بڑا اچھا دوست سمجھتا تھا۔ وہ میرا ہم عمر ہے' بچپن سے میرے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے تنظیم سے اپنی وابستگی کے بارے میں بتادیا۔ یہی میری غلطی تھی۔ وہ بھی حب الوطنی کا زبردست دعویدار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی تنظیم میں شامل ہوجائے۔"

سراج الدولہ جس وقت یہ بتارہا تھا مجھے اپنے ماموں زاد بھائی رحمت علی اور بھائی عطا اللہ خاں یاد آرہے تھے میں بھی انہی دونوں کے توسط سے علی گڑھ میں اس تنظیم کا رکن بنا تھا مگر ان دونوں نے مجھ پر بڑی محنت کی تھی۔ تنظیم کی رکنیت سے پہلے یا اپنا راز افشا کرنے سے قبل انہوں نے مجھے اچھی طرح پرکھ لیا تھا اور ذہنی طور پر بالواسطہ تنظیم کے مقاصد کا ہمنوا بنالیا تھا۔

میں پوری توجہ سے سراج الدولہ کا بیان سن رہا تھا۔ اب وہ بتا رہا تھا "جب میں نے اس سے تنظیم میں شمولیت

کے لیے کہا تو اس نے ہامی بھری۔ یقین کریں کہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ پھر میں نے اسے تنظیم کی مختلف مہموں کے بارے میں بتایا۔ ولسن کے اغوا کی مہم بھی اسی میں شامل تھی۔ اس کے بعد وہ روزانہ مجھ سے تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل کرتا' تنظیم کے انداز کار کے متعلق پوچھتا' ساتھیوں کے بارے میں دریافت کرتا اور۔۔۔"

"اور تم اسے سب کچھ بتاتے رہتے!" میری آواز میں چبھن تھی۔

"نہیں!" وہ مضبوط آواز میں بولا "میں نے کبھی اسے ان سوالوں کے صحیح جواب نہیں دیئے۔ پھر ایک دن میرے ایک دوست قربان علی نے مجھے بتایا کہ میرا چچا زاد میرے خلاف پولیس کا مخبر بن گیا ہے۔ میرا دوست قربان علی خود بھی پولیس کے محکمے میں ملازم تھا۔ جیسے ہی مجھے قربان علی سے یہ خبر ملی میں نے لائلپور (فیصل آباد) سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا' لیکن اسی رات میرے گھر پر غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ میری بیوی' بہن اور بچے کو اغوا کرلیا گیا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے تھوڑی دیر بعد پولیس وہاں پہنچی۔ اس پولیس پارٹی کے ساتھ خفیہ کا ایک اعلیٰ افسر بھی تھا جو دہلی سے ولسن کے اغوا کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے وہاں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا مگر میں انکار کرتا رہا۔ پھر مجھے پولیس ایک جگہ لے گئی جہاں میری بیوی' بہن اور بچے کو رکھا گیا تھا۔ اس پولیس افسر نے میرے سامنے میری بیوی اور میری بہن کا لباس تار تار کرڈالا' انہیں عریاں کردیا' میرے بچے کو ٹانگوں کے بل لٹکا دیا۔ پھر اس نے کہا کہ تیری بیوی اور تیری بہن کل صبح اس حالت میں مل سکتی ہیں کہ اٹھنے کے قابل نہ ہوں۔ پولیس کے یہ سانڈ رات بھر تیری آنکھوں کے سامنے انہیں بھنبوڑتے رہیں گے۔ پھر بھی تو نے زبان نہ کھولی تو یہ تیرا بچہ جو میرے ہاتھوں میں ٹانگوں کے بل جھول رہا ہے' سامنے دیوار سے جا ٹکرائے گا۔ اس کا سر پاش پاش ہوجائے گا۔ پھر بھی تو کچھ نہیں بتائے گا تو ہم تیری ماں کو یہاں اٹھا لائیں گے اور پھر۔ پھر اس نے۔۔ اس پولیس افسر نے وہ زبان استعمال کی جو۔ وہ الفاظ میں۔۔ میں نہیں دہرا سکتا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ محض دھمکی نہیں دے رہا تھا۔" سراج الدولہ یہ کہتے ہوئے بلک اٹھا "بتاؤ ساتھی' میں کیا کرتا؟۔۔ میں کیا کرتا ساتھی؟" سراج الدولہ کی دردناک داستان سن کر میری رگوں میں جیسے خون کی گردش تھم سی گئی۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ کمرے میں تکلیف دہ سناٹا پھیلا ہوا تھا اور اس سناٹے کو سراج الدولہ کی ہچکیاں رہ رہ کر توڑ دیتی تھیں۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں ساتھی سچ! اس زمین کی قسم۔ اپنی ماں کی قسم! میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے چچا زاد کو نہ پہچانا' میں نے اسے تنظیم کے بارے میں بتایا مگر وہ بھی تنظیم کی بھلائی کے لیے ہی کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایسا ہوجائے گا۔" اس کی ہچکیاں اور بلند ہوگئیں۔ میں نے بخت خاں اور ٹیپو کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے وہی مجرم ہوں۔

"بخت خاں! تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا "تم نے ملزم کا بیان سن لیا ہے۔"

"شاہین! تم جو فیصلہ بھی کرو میں اس سے متفق ہوں۔" بخت خاں کی کمزور آواز ابھری۔

"اور ٹیپو' تمہاری کیا رائے ہے؟"

"فیصلہ کرو شاہین' میں تمہارے ساتھ ہوں۔" ٹیپو نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

بخت خاں اور ٹیپو نے فیصلے کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ میں سر جھکائے سوچتا رہا۔ میں نے اس تکلیف دہ صورت حال کو ختم کرنے کے لیے آخر فیصلہ سنا ہی دیا۔ فیصلے کے الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے کانوں میں تیز سیٹیاں سی گونج رہی تھیں۔ اس وقت مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔

"نہیں۔ نہیں!" سراج الدولہ کی آواز مجھے بہت دور سے آتی سنائی دی۔ میں جیسے وہاں موجود ہو کر بھی وہاں نہیں تھا۔

"بخت خاں! اس کا منہ بند کردو۔" میں نے دوسرا حکم دیا۔

بخت خاں تیزی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا اور پھر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

سراج الدولہ آخری وقت تک چیختا رہا کہ ابھی اسے اور کچھ کہنا ہے' مگر فیصلہ ہوچکا تھا کچھ کہنے سننے کا وقت گزر چکا تھا۔

ہر مجرم آخر وقت تک اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لیے اسی طرح چیختا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ اس طرح شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ زندگی سے اسے چند لمحوں کی مہلت اور مل جائے گی۔ وہ جنہیں سزائے موت دینے کے لیے پھانسی پر لٹکانے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ آخر وقت تک اسی طرح چیختے چلاتے رہتے ہیں اور اپنے بے قصور ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ میں نے سراج الدولہ کے لیے بھی پھانسی کا حکم دیا تھا۔

بخت خاں نے سراج الدولہ کے منہ میں رومال ٹھونس کر اوپر سے ایک کپڑا باندھ دیا' پھر اس نے ٹیپو کو اشارہ کیا۔ ٹیپو نے سراج الدولہ کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ میری نظر سراج الدولہ کی طرف اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور یہ آنسو جیسے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میرا فیصلہ غلط ہے۔

"میرا فیصلہ غلط نہیں ہے!" میں آپ ہی آپ بول اٹھا۔ میں شاید یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کررہا تھا حالانکہ کسی نے میرے فیصلے کو غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے مزید کہا "غدّاری کی یہی سزا ہے' سزائے موت! تنظیم کا یہی اصول ہے! اسے پھانسی دینے کا انتظام کرو!" یہ کہتے ہی میں اس کرسی سے اٹھ گیا جو عدالت کی کرسی کے طور پر استعمال کی گئی تھی۔ اچانک روشندان پر مخصوص دستک سنائی دی۔ ہم سب نے چونک کر اوپر دیکھا۔ پھر مجاہد اوّل کی کھرکھراتی آواز سنائی دی "تمہارا فیصلہ غلط ہے' دروازہ کھولو!"

میں نے پہلے بخت خاں کی طرف اور پھر سراج الدولہ کو دیکھا۔ موت کی پرچھائیوں کی جگہ اب مجھے سراج الدولہ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ ٹیپو دروازہ کھولنے جاچکا تھا۔ معلوم نہیں مجاہد اوّل کب راولپنڈی آگیا تھا۔ آخری اطلاعات ملنے تک وہ بمبئی ہی میں تھا۔

مجاہد اوّل اب کمرے میں آچکا تھا۔ طے شدہ اصول کے مطابق لالٹین کی لو دھیمی کرکے اسے کونے میں رکھ دیا گیا تھا۔

"شاہین! مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا ہے کہ تم لوگوں کو سزائے موت دینے کا بہت شوق ہوگیا ہے۔" مجاہد اوّل بولا "تمہیں شاہین' کسی بھی حالت میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اب میری غیر موجودگی میں تمہاری حیثیت کیا ہوجاتی ہے! تم میری نیابت کرتے ہو۔ سراج الدولہ کو سزا سناتے ہوئے تمہیں معاملے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرلینا چاہیے تھا۔ یہ ایک قیمتی زندگی کا مسئلہ تھا شاہین' تنظیم کے ایک سرفروش کی زندگی کا مسئلہ!"

"حالات ہی ایسے تھے جناب کہ مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔" میں نے کہا "اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہی میں نے سزائے موت کا فیصلہ سنایا تھا۔"

مجاہد اوّل کے ایما پر پھر عدالت بیٹھی۔ میں ایک مرتبہ پھر صدر عدالت کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجاہد اوّل نے کہا تھا کہ میں تنظیم کے ایک عام رکن کی حیثیت سے سراج الدولہ کی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس نے کئی دلیلیں پیش کیں۔ ان میں سے بیشتر دلیلیں خالص جذباتی اور انسانی رشتوں کے تقدس کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ اس کی آخری دلیل یہ تھی کہ قوانین انسان کے تحفظ کی خاطر بنائے جاتے ہیں۔ انسان کو قانون کا شکار بنانے کے لیے نہیں۔

میں نے نہایت مختصر بیان کے ساتھ یہ تمام دلیلیں رد کردیں۔ میں نے کہا "انسانی رشتوں اور جذباتیت سے قانون کو کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ قانون ایک خاص جرم کی خاص سزا مقرر کرتا ہے۔ انصاف انسانی رشتوں' ان کے تقدس' دوستی' محبت اور نفرت سے بلند ہوتا ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ان میں سے کسی کو بھی پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اضطراری اور اضطرابی حالت میں سرزد ہونے والے جرائم سے ان کی سنگینی تو کم ہوسکتی ہے جرم کی نوعیت نہیں بدلتی البتہ سزا میں تخفیف ممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ قوانین انسان کے تحفظ ہی کے لیے بنائے جاتے ہیں اور ہم نے بھی اپنی تنظیم کے تحفظ کی خاطر قوانین بنائے ہیں۔ یہ تنظیم ایسے محب وطن افراد پر مشتمل ہے جن کے سامنے انسان ہی کے بنائے ہوئے ہر معیار کے مطابق ایک اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ سراج الدولہ نے انہی محب وطن افراد کی ہلاکت کا سامان کیا تھا۔ ہم غیر معمولی حالات میں کام کررہے ہیں۔ ایک اعتبار سے ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ایسی صورت میں کسی بھی رکن کی معمولی سی لغزش یا کوتاہی کو جس سے تنظیم خطرے میں پڑسکتی ہو' معاف نہیں کیا جاسکتا! سراج الدولہ کو ایک موقع ملا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو تمام حالات سے آگاہ کردیتا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ سراج الدولہ اسی بنا پر غدّاروں کی فہرست میں شامل ہوتا ہے۔ میں سزائے موت بحال رکھنے کا فیصلہ کرتا ہوں اور میرے نزدیک یہ فیصلہ مبنی بر حق ہے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا کمرے میں سکوت طاری ہوگیا۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد شاید مجاہد اوّل کچھ کہے' میں نے پھر بولنا شروع کیا "اب ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ سراج الدولہ کو پھانسی کی سزا دینے کا انتظام کیا جائے!"

اس سے پہلے کہ میں کرسی سے اٹھتا' مجاہد اوّل کی مخصوص آواز ابھری "چند واقعات اور ایسے ہیں کہ انہیں عدالت کے سامنے پیش کرنا مناسب ہے۔ انسانی جان اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے اتنی آسانی کے ساتھ سولی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے خیال میں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہیں دیا گیا' اس سے پہلے ہی ملزم کی زبان بند کردی گئی' ملزم کی طرف سے میں وہ ثبوت پیش کرسکتا ہوں جو اسے بڑی حد تک بے گناہ ثابت کرتا ہے۔"

مجاہد اوّل کے ان الفاظ نے میرے دل کا بوجھ بڑھا دیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میرے حکم پر سراج الدولہ کی زبان بندی کی جا رہی تھی تو وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"میں عدالت سے سوال کرتا ہوں کہ ان حالات کے باوجود ملزم اگر کسی طرح تنظیم کو اپنے ساتھ پیش آنے والے سنگین واقعے سے آگاہ کر دیتا تو کیا وہ قابلِ معافی ہوتا؟" مجاہد اوّل نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں ملزم کے پاس یہ راستہ موجود تھا اور ایسی صورت میں وہ نرمی کا حق دار تھا۔" میں نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"تو حقیقت یہی ہے کہ ملزم پہلی فرصت میں تنظیم کے سربراہ کو ایک خط کے ذریعے اس سے آگاہ کر چکا تھا اور وہ خط عدالت میں پیش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے اپنے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں ہاتھ ڈال کر وہ خط میری میز پر رکھ دیا۔

کمرے میں کیوں کہ ناکافی روشنی تھی اس لیے میں نے خط اٹھا کر نہیں پڑھا اور بولا "عدالت کو یقین ہے کہ جو خط پیش کیا گیا ہے' اس میں وہی کچھ لکھا ہو گا جو عدالت کو بتایا گیا ہے۔"

پھر مجاہد اوّل نے بتایا "دہلی سے فیصل آباد آنے والے خفیہ کے اعلیٰ افسر نے سراج الدولہ کو دھمکیاں دینے کے بعد چھوڑ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ شام تک یہ فیصلہ کر لے' تنظیم کے بارے میں اسے جو کچھ معلوم ہے' بتاتا ہے یا نہیں! اسے یہ بھی دھمکی دی گئی تھی کہ پولیس اس دوران میں اس کی کڑی نگرانی کرتی رہے گی' فرار ہونے کا خیال اسے اپنے دل سے نکال دینا چاہیے۔ سو وہ گھر پہنچا۔ اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ بنایا اور اس منصوبے سے تنظیم کے سربراہ کو اس خط کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ جو عدالت کے روبرو پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ خط سراج الدولہ نے اسی پولیس والے کو دے دیا تھا جو اس کا دوست تھا اور جس نے اسے خطرے سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔ یہ شخص قربان علی ہماری تنظیم کا مخبر ہے اور وقتاً فوقتاً ہمیں خفیہ کے اقدامات سے آگاہ کرتا رہا ہے۔ قربان علی ہمارا مخبر ہونے کے سبب ان لوگوں میں سے ہے جو تنظیم کے سربراہ سے ہنگامی حالات میں رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تنظیم کے سربراہ سے کب' کہاں اور کس طرح رابطہ قائم ہو سکتا ہے! قربان علی کو وہ خط دینے کے بعد سراج الدولہ' پولیس والوں کو مختلف شہروں میں گھماتا پھرا تاکہ قربان علی اس دوران میں مجھ تک اس کا خط پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔ سراج الدولہ ہی کے منصوبے کے مطابق تنظیم کا سربراہ بمبئی سے راولپنڈی پہنچا۔ اس کے بعد سراج الدولہ بھی پولیس والوں کو لے کر یہاں آ گیا۔ پولیس تنظیم کے سربراہ پر ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی اور سراج الدولہ اسی بہانے اسے علی گڑھ' دہلی اور بمبئی لے گیا تھا اور پھر آخر میں اس نے کہا تھا کہ تنظیم کا سربراہ اگر ان تینوں شہروں میں نہیں تو پھر یقیناً راولپنڈی میں ہے۔ راولپنڈی میں اس کی آمد سے پہلے ہی تنظیم کا سربراہ واقعی یہاں پہنچ چکا تھا۔"

اس کے بعد مجاہد اوّل نے بتایا کہ اگر ہماری گرفتاری یقینی ہو جاتی تو ایک بھی پولیس والا وہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاتا۔ اس وقت برابر والے خالی مکان میں مجاہد اوّل کے ساتھ تنظیم کے مسلح سرفروشوں کا ایک دستہ موجود تھا۔ وہ سب کے سب ماہر نشانہ باز تھے اور ایسی پوزیشن میں تھے کہ اشارہ ملتے ہی فائرنگ کھول دیتے اور تمام پولیس والے ڈھیر ہو جاتے۔ مگر یہ قدم آخری مرحلے پر اٹھایا جاتا۔ مجاہد اوّل نے دن کے وقت ہی چنی بیٹیاں کے اس مکان کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا جہاں ہم مقیم تھے۔ نشیب کی طرف سے اس مکان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ رسی بھی اسے نظر آ گئی تھی۔ جو میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں باندھ رکھی تھی۔ اس نے صحیح قیاس کیا تھا کہ ہنگامی صورت حال میں ہم اسی راہ سے فرار ہوں گے اور پھر اسی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے جو اسی کے ایما پر بخت خاں نے کمپنی باغ کے سامنے کرائے پر حاصل کیا تھا کہ کبھی نعم البدل کے طور پر وہاں پناہ لی جا سکے۔ مجاہد اوّل نے ان حالات کو ایک خاص انداز میں اپنی انتہا تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا۔

آخر میں مجاہد اوّل نے کہا "باقی تمام باتوں سے قطع نظر میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم لوگوں نے سراج الدولہ کی تمام رفاقتوں اور ماضی میں تنظیم کے لیے اس کی خدمات کا لحاظ کیے بغیر جو حالات تمہارے علم میں تھے اس کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہی سزا تجویز کی جس کا وہ مستحق تھا۔ میں اس پر بھی خوش ہوں کہ ایک منصف کی حیثیت سے اس سلسلے میں شاہین نے میری ابتدائی دلیلوں کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔"

اس دوران میں میرے حکم پر سراج الدولہ کو آزاد کیا جا چکا تھا۔ میں کرسیٔ عدالت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہم تینوں سراج الدولہ سے باری باری گلے ملے۔ وہ ساتھی جو ہم سے بچھڑنے والا تھا' ہمیں واپس مل گیا تھا۔ میں نے سراج الدولہ سے معافی مانگی۔

سراج الدولہ نے مجھے سینے سے چمٹا لیا اور بولا "نہیں میرے دوست! معافی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو یہی فیصلہ کرتا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کیوں کہ اس نے انتہائی سنگین حالات میں بھی تنظیم سے وفاداری برقرار رکھی تھی۔

مسرت و خوشی کے جذبات سے ہم اس وقت اتنے مغلوب تھے کہ مجاہد اوّل کی وہاں موجودگی کو بھی ایک طرح سے فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس دوران میں مجاہد اوّل کی آواز ہمیں سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "بس بھئی!" اس کی آواز بھی جذبات سے بوجھل تھی "اب تم لوگوں کو راولپنڈی سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ سب سے پہلے شاہین اور بخت خاں کو جانا ہے تاکہ وہ وقتِ مقررہ پر دہلی پہنچ سکیں۔ شاہین! تمہیں اپنے ڈیڈی اور ممی سے ملنے کی اجازت ہے حالانکہ تمہیں وہاں بھیجنا خطرے سے خالی نہیں' مگر تمہاری امی ان دنوں سخت بیمار ہیں۔ پہلے بھی کلکتہ روانگی سے قبل میں اسی سبب تمہیں دہلی بھیجنا چاہتا تھا۔ پرنس آف ویلز کے دورے کے بعد تنظیم لائلپور (فیصل آباد) کی پولیس سے انتقام لے گی۔ اس سلسلے میں تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ نیچو اور سراج الدولہ فی الحال راولپنڈی ہی میں رہیں گے۔"

حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ راولپنڈی سے ہمارے فرار کی راہیں کم و بیش مسدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس کا سبب پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہمارا فرار ہو جانا تھا۔ اب ان کے ہاتھ سے سراج الدولہ بھی نکل گیا تھا۔ اس لیے وہ تلملائے ہوئے تھے۔ پولیس اور خفیہ نے راولپنڈی کی ناکا بندی اتنی سخت کر دی تھی کہ کسی ذی روح کا ان کی نظر میں آئے بغیر وہاں سے نکل جانا ناممکن تھا مگر مجاہد اوّل نے ہمارے فرار کا بندوبست کر دیا تھا۔

میں اور بخت خاں تھوڑی ہی دیر بعد چھپتے چھپاتے ریلوے کوارٹرز پہنچے اور ایک کوارٹر پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھول دیا گیا جیسے دروازے کھولنے والا ہماری ہی آمد کا منتظر تھا۔ وہ ریلوے انجن ڈرائیور تھا اور اگلے روز صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ایک ٹرین لے جانے والا تھا۔

"معلوم ہو گیا؟" بخت خاں نے اندر قدم رکھتے ہی اس سے دریافت کیا۔

"ہاں" ڈرائیور کے لہجے میں لرزش تھی۔ وہ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

"کیا بات ہے' تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو؟" بخت خاں نے پوچھا۔

اس نے پھر اسی انداز میں "ہاں" کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایسا کام کر رہا ہوں خیر!"

انجن ڈرائیور کی پریشانی بجا تھی۔ وہ راولپنڈی سے ایک خصوصی ٹرین لے کر جا رہا تھا جس میں کئی انگریزوں اور فوجی افسران کو سوار ہونا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا فرض شناس سا شخص دکھائی دیتا تھا۔ وہ بہت نروس قسم کا آدمی تھا۔ کسی بھی وقت اس کے اعصاب جواب دے سکتے تھے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "یہ تمہاری اور میری خوش قسمتی ہے کہ میرے دونوں ساتھی ایک ہی کوارٹر میں مقیم ہیں' تمہیں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔ میں نے رات ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ صبح انہیں لینے پہنچ جاؤں گا۔"

پھر اس نے بخت خاں کو کوارٹر کا پتا بتایا جس میں اس کے وہ دونوں ساتھی رہتے تھے جن کا کام انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنا تھا۔ اب بخت خاں اور میں اس کوارٹر کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا پتا انجن ڈرائیور نے بتایا تھا۔

"یہ شخص نروس قسم کا ہے۔" میں نے بخت خاں سے کہا "کسی وقت بھی بزدلی دکھا سکتا ہے۔"

"ہاں' نروس بھی ہے اور بزدل بھی۔" بخت خاں بولا "مگر اسی کے ساتھ یہ اس وقت تک قابلِ اعتماد بھی ہے جب تک اس پر کوئی افتاد نہ پڑے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ اسی شہر کا رہنے والا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں ہم اس کوارٹر پر دستک دے رہے تھے جو مطلوب تھا۔ وہاں وہ دونوں' انجن ڈرائیور ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور میں تیزی کے ساتھ پستول تان کر اندر پہنچ گیا۔

"خاموش رہنا!" میں نے سخت مگر دھیمی آواز میں کہا۔ اس وقت میرے اور بخت خاں کے چہروں پر سیاہ رومال بندھے ہوئے تھے صرف ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"منگلا! کون ہے؟" اندر سے اس کے دوسرے ساتھی کی آواز آئی۔

اسی کے ساتھ بخت خاں پستول ہاتھ میں لیے اندرونی کمرے کی طرف لپکا۔ تھوڑی سی دیر میں ہم انہیں بے بس کر چکے تھے۔ اس سے پہلے ہم نے ان کی وردیاں اتروا لی تھیں۔ ہم نے انہیں کس کر مضبوطی سے باندھا تھا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔

اب میں ان میں سے ایک کی وردی پہن رہا تھا۔ پندرہ

منٹ میں ہم تمام کاموں سے فارغ ہو کر پھر انجن ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ دوسری وردی بخت خاں کے جسم پر تھی۔

پورا پلان مجاہدِ اوّل نے پہلے سے طے کر لیا تھا۔ اس کام میں تعاون کے لیے انجن ڈرائیور کو خاصی رقم دی گئی تھی۔

ہم لوٹ کر انجن ڈرائیور کے کوارٹر میں پہنچے تو وہ ہمارا ہی منتظر تھا۔ اس نے پوچھا "سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟"

"ہاں" بخت خاں نے جواب دیا "جب تک کوئی ادھر نہیں جائے گا کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ ان دونوں پر کیا بیتی ہے!"

اس کے بعد ہم اسپیشل ٹرین روانہ ہونے سے پہلے انجن ڈرائیور کے ساتھ شیڈ میں پہنچ گئے۔ ڈرائیور ہی کے ساتھ ہم اس انجن میں داخل ہو گئے جو اسپیشل ٹرین میں لگا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے انجن میں داخل ہوتے ہی وہ دوسرا ڈرائیور جو انجن کو شیڈ سے پلیٹ فارم پر لایا تھا، انجن سے اتر گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والے کون ہیں، کون نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کہیں کسی گڑبڑ کا امکان معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح راولپنڈی سے ہم فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ ایک ریلوے اسٹیشن پر ہم نے اترنے سے پہلے طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹرین رکتے ہی انجن ڈرائیور کو باندھ دیا۔ ہم نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا اور پلیٹ فارم کی دوسری جانب اتر کر ایک طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر ہمیں وہاں سے دہلی پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اگلے تین ماہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔

بمبئی میں پرنس آف ویلز کے ساحل پر اترتے ہی احتجاجی ہنگامے شروع ہو گئے۔ اگرچہ کانگریس کی پوری کوشش یہ تھی کہ پرنس آف ویلز کے دورے کا بائیکاٹ کرتے ہوئے، احتجاج تشدد کی صورت اختیار نہ کرلے، لوگ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار صرف نعرے لگا کر کریں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایسا ہوتا بھی کیسے! وہاں مجاہدِ اوّل موجود تھا اور ہماری تنظیم کے کارکن اس موقع پر پوری طرح تیار تھے۔ مجاہدِ اوّل کی سخت ہدایت تھی کہ اس موقع پر ہنگامے اتنی شدت اور قوت کے ساتھ ہوں کہ پورے ہندوستان میں دھوم مچ جائے اور بمبئی کی طرح دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہو، دوسرے شہروں کو بھی شہ ملے۔

ہجوم کی نفسیات، وہ بھی ایسے ہجوم کی نفسیات بہت مختلف ہوتی ہے جو اپنی نفرت کے اظہار کی خاطر بطور احتجاج نعرے لگا رہا ہو۔ ظلم، جابر اور غاصب حکمرانوں سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے والا ایسا ہجوم ذرا سی بات پر بھڑک سکتا ہے۔ سو بمبئی میں وہی کچھ ہوا جو وطن پرست تنظیم چاہتی تھی۔ ایسا شدید ہنگامہ ہوا کہ گاندھی جی کو کہنا پڑا کہ میرے خوابوں کے شہر میں آگ لگ گئی۔

بسوں اور ٹراموں کو جلا دیا گیا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں۔ شراب خانوں پر پتھراؤ ہوا۔ جب بمبئی کی یہ خبریں پورے ہندوستان میں پھیلیں تو لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ہر جگہ مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان شہروں میں جہاں پرنس آف ویلز کو دورہ ہند میں جانا تھا، وہاں مظاہروں اور ہنگاموں کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہونے لگیں۔ انگریز حکومت بوکھلا اٹھی۔ رضا کار تنظیمیں خلافِ قانون قرار دے دی گئیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ اس کے باوجود طوفان تھا۔ پرنس آف ویلز کے دورے کا بائیکاٹ تشدد سے ہم آہنگ ہوتا رہا۔ پرنس آف ویلز کے دورۂ کلکتہ سے پورے ہندوستان میں گرفتار ہونے والوں کی تعداد پچیس ہزار سے تجاوز کر گئی۔ یہ اس وقت کی انگریز حکومت کے اعداد و شمار ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ ہر صوبے سے اتنی تعداد میں لوگ زیرِ حراست لیے گئے تھے۔

حکومت نے ان ہنگاموں کو روکنے کے لیے سیاسی سطح پر مذاکرات کیے جو ناکام رہے۔ یہ مذاکرات کلکتے میں ہوئے جہاں وائسرائے برطانیہ کے شہزادے کے دورے کے انتظامات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کا کہنا تھا کہ پرنس کی کلکتے آمد کے موقع پر ہنگامے نہ ہوں تو سیاسی بنیادوں پر گرفتار کیے جانے والے افراد کو رہا کر دیا جائے گا۔ ان گرفتار شدگان میں مولانا جوہر اور ان کے ساتھی شامل نہیں تھے۔ وائسرائے مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں کو رہا کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اسی سبب اس کی پیشکش مسترد کر دی گئی۔ سیاسی سطح سے مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں کی رہائی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ تحریر، تقریر، انجمن سازی اور صحافت کی آزادی بحال کی جائے۔ یہودی بچے لارڈ ریڈنگ نے یہ مطالبات نہیں مانے۔

سیاسی سطح پر کی جانے والی یہ تمام کوششیں بے ثابت ہوئیں۔ پرنس آف ویلز کلکتے پہنچا تو وہاں بھی ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا جو گیندر اور فاطمہ، دونوں بہن بھائی وہاں بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے مجاہدِ اوّل کے حکم پر پہلے ہی ہنگاموں کے لیے فضا تیار کر رکھی تھی۔ ان کے ساتھ بنگال بھر کے جیالے سرفروش تھے۔ اس موقع پر انگریز حکومت اور کانگریس، دونوں ہی فریق کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لارڈ ریڈنگ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ بنگال میں ہنگامے ضرور ہوں گے کیوں کہ ہنگامے کانگریس نہیں وہاں موجود دوسری زیرِ زمین انقلابی تحریکیں کریں گی۔ اس نے اسی لیے ایسی شرط رکھی تھی کہ سیاسی لیڈر اسے رد نہ کرنے پائیں۔ کانگریس بھی جانتی تھی کہ بنگال میں ہنگامے روکنا اس کے بس کی بات نہیں، سو وہ یہ وعدہ کرنے پر تیار نہ تھی۔

بعد میں کانگریس، کلکتے میں ان ہنگاموں کی کلغی اپنے سر پر سجاتی رہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہنگامے بنگال کی انہی زیرِ زمین تنظیموں اور وطن پرست تنظیم کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وطن پرست تنظیم کا رابطہ ان خفیہ تحریکوں سے قائم ہوا اور اس کا سہرا جوگیندر اور فاطمہ کے سر تھا۔ اس سے ہماری کارروائیوں کو ایک نئی جہت اور ایک نئی ہمت ملی۔ جلالی کی مہم میں جوگیندر نے میرے سامنے یہی تجویز رکھی تھی۔ میں نے دہلی میں مجاہدِ اوّل کے سامنے یہ تجویز پیش بھی کی تھی مگر اس وقت وہ دونوں بہن بھائی وطن پرست تنظیم کے رکن نہیں بنے تھے۔ مجاہدِ اوّل نے اسی لیے اس وقت یہ تجویز قبول نہیں کی تھی۔ کلکتے میں مجاہدِ اوّل کی اجازت سے جوگیندر اور فاطمہ نے اسی تجویز پر عمل کیا تھا۔

بنگال اس دور میں بھی ہر دور کی طرح ایک ایسا آتش فشاں تھا جو وقفے وقفے سے لاوا اگلتا رہتا تھا۔ جنگِ پلاسی سے اب تک وہ ہر دور میں غاصبوں کے خلاف مصروفِ پیکار رہا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے والی تنظیمیں قائم ہوئی تھیں۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کے انقلابیوں کے لیے امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں نے چندہ اکٹھا کر کے ایک جاپانی جہاز خریدا تھا اور امریکہ میں اسے اسلحہ سے لدوا کر ہندوستان کے لیے بک کر دیا تھا۔ یہ جہاز سنگاپور سے بہ خیریت گزر گیا تھا لیکن ہندوستان پہنچنے سے قبل انگریز حکومت کو اس کی سن گن مل گئی تھی۔ اسلحہ سے لدا ہوا یہ جہاز اس وقت انگریز بحریہ نے پکڑا جب وہ جزائر انڈیمان سے کلکتے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بنگال کے انقلابیوں کی جانب سے اسلحہ اسمگل کرنے کی یہ

کوشش تو ناکام ہو گئی لیکن یہیں سے بنگال میں زیرِ زمین تحریکوں کی داغ بیل پڑی۔ ان میں تشدد پسند اور دہشت پسند تحریکیں بھی شامل ہیں۔

پرنس آف ویلز جب کلکتے کا دورہ کر رہا تھا اور وہاں ہنگامے ہو رہے تھے تو میں دہلی میں تھا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ میں پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچا۔ دوسری مرتبہ تو پولیس نے میری گرفتاری کے لیے گھر پر بھی چھاپا مارا تھا۔ اس وقت میں بخت خاں سے ملنے گیا ہوا تھا۔ لاہور سے میرے متعلق دہلی یہ رپورٹ پہنچ چکی تھی کہ میں پولیس کو مطلوب ہوں۔ ڈیڈی ان دنوں دہلی میں نہیں تھے۔ وہ شملے اور دہلی کے درمیان شٹل کاک بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ انگریز انتظامیہ کا ایک اہم پرزہ تھے اور پرنس کے دورے کے انتظامات ان کے فرائض میں داخل تھے۔

میرے لیے یہ بہتر ہی ہوا تھا کہ ڈیڈی دہلی میں نہیں تھے ورنہ خدا جانے کیا ہنگامہ ہوتا! پولیس کو مطلوب ہونے کے سبب اب میں فی الحال علی گڑھ کا رخ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اپنی تعلیم، نصابی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ اس سے قطع نظر میں اگر پولیس کو مطلوب نہ بھی ہوتا تو اس وقت علی گڑھ نہ جا سکتا۔ میرے نزدیک اوّلیت تنظیم کو تھی اور اب میں تنظیم کا صرف معمولی کارکن نہیں بلکہ مجاہدِ اوّل کا نائب بھی تھا۔ مجھ پر بڑی ذمے داریاں تھیں۔

جس روز میری گرفتاری کے لیے گھر پر چھاپا پڑا، ممی سخت بیمار تھیں۔ بار بار ان پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ بے ہوش ہی تھیں۔ جب پولیس گھر پر پہنچی۔ یہ باتیں مجھے گھر کے ملازمین سے معلوم ہوئیں۔ ملازمین نے ممی کی علالت کے پیشِ نظر اس سلسلے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ممی کے دماغ میں رسولی ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ملازمین ہی سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈیڈی انہیں علاج کی غرض سے برطانیہ لے جانا چاہتے تھے مگر ڈیڈی کو اس کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ غلامی بھی کیسی مجبوری ہے کہ شریکِ حیات، زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی اور وہ شخص جو اس کا علاج کرا سکتا تھا اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میرا دل ممی کی حالت دیکھ کر بہت کٹتا مگر میں انہیں علاج کے لیے برطانیہ یا کسی اور ملک نہیں لے جا سکتا تھا۔ انگریز حکومت بھلا اپنے ایک غدار کو یوں کس طرح ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دیتی! وہ تو ہندوستان کے ایک شہر سے دوسرے

شہر جانے کے لیے مجھ پر پہرے بٹھادیتی تھی' میرے راستے میں جال بچھادیتی تھی!

اس سے علاوہ دوسری ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ شخص جس کی پوری زندگی انگریز کو سیلوٹ کرتے گزری تھی' وہ جو ڈائرکٹر انٹیلی جنس تھا' اسی کے گھر پر پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر ہی میں نے اپنی ننھیال کا رخ بھی نہیں کیا تھا کہ کہیں وہ لوگ میری وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوجائیں ورنہ میں اپنے مرحوم ماموں زاد اور تنظیمی ساتھی بھائی رحمت علی کی تعزیت کرنے وہاں ضرور جاتا۔ بھائی رحمت علی تنظیم ہی کے حکم پر جنوبی ہند گئے تھے جس طرح میں ملتان گیا تھا۔ وہیں وہ شہید کردیئے گئے تھے۔

تنظیم کا پروگرام یہ تھا کہ دہلی میں پرنس آف ویلز پر قاتلانہ حملہ کیا جائے' لیکن انتظامات اتنے سخت تھے کہ ہمیں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ہماری تنظیم پرنس آف ویلز پر قاتلانہ حملہ کرنے میں کامیاب ہوجاتی تو شاید ہندوستان کی آزادی کی راہ مختلف ہوتی۔

اسی دوران میں ڈیڈی دہلی آچکے تھی اور ان کی آمد سے ایک روز قبل میں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ آنے سے قبل انہوں نے ٹیلی گرام دیا تھا۔ ممی سے رخصت ہو کر اور انہیں یہ دلاسا دے کر کہ میں تعلیم کے حصول کی غرض سے اب علی گڑھ جارہا ہوں' میں نے عارضی طور پر بخت خاں کے ساتھ سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس نے کوچہ چیلان میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جو دہلی میں تنظیم کے ارکان کا مرکز بنا ہوا تھا۔

دہلی میں ہم پرنس آف ویلز پر قاتلانہ حملہ تو نہیں کرسکے مگر اس کی خدمت پر مامور ایک انگریز افسر کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس انگریز افسر کے اغوا سے ہم نے فائدہ بھی اٹھایا۔ اسی اغوا کی بنیاد پر ہم نے لائیلپور (فیصل آباد) میں سراج الدولہ کے اہل خاندان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا انتقام لینے کے متعلق فیصلہ کیا۔

ہم لوگ ٹھیک اسی دن لائیلپور (فیصل آباد) پہنچے تھے جس روز عام سول نافرمانی کا فیصلہ سیاسی سطح پر کیا گیا تھا۔ یہ کانفرنس بردولی میں ہوئی تھی۔ جس میں عام سول نافرمانی کا فیصلہ ہوا۔ کانفرنس نے بردولی کے محصول دہندوں سے اپیل کی تھی کہ وہ آیندہ ہدایات تک حکومت کو لگان اور دوسرے محاصل ادا نہ کریں اس اعلان کے ساتھ ہی گاندھی جی نے حکومت کو یہ الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر اب بھی حکومت ان کے مطالبات تسلیم کرلے تو وہ سول نافرمانی ملتوی کردیں گے۔

گاندھی جی کا یہ الٹی میٹم بڑا چھپا تھا جس میں حکومت سے براہ راست تصادم سے گریز کرنے کی خواہش پوشیدہ تھی۔

سہ پہر کو ہم لائیلپور (فیصل آباد) پہنچے تھے۔ دہلی ہی کے دوران قیام میں سراج الدولہ' راولپنڈی سے اور جوگیندر کلکتے سے دہلی پہنچ گیا تھا۔ فاطمہ کو وہ کلکتے ہی میں اپنے والد موہن لال کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ایسا اس نے مجاہد اول کے حکم پر کیا تھا۔ ورنہ فاطمہ اس کے ساتھ دہلی آنا چاہتی تھی۔ تیتومیر بھی مجاہد اول کے ایما پر ہمارے ساتھ تھا۔ یہ وہی جس سے میری ملاقات پہلی بار جلالی کی مہم کے دوران ہوئی تھی۔ ان ساتھیوں کے علاوہ بخت خاں بھی دہلی سے ہمارے ساتھ چلا تھا۔

اسٹیشن پر ہمارا استقبال سراج الدولہ کے دوست قربان علی نے کیا۔ راولپنڈی میں مجھے مجاہد اول سے معلوم ہوچکا تھا کہ قربان علی خفیہ پولیس کے محکمے میں ہمارے لیے مخبری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ قربان علی پر اس کے محکمے کے افسران کو شک ہوگیا تھا۔ اس لیے مجاہد اول کے حکم پر اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

لائیلپور (فیصل آباد) میں ہمیں ایک ایسے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی جہاں کوئی ہم پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ عارضی طور پر ہم قربان علی کے گھر ٹھہر گئے تھے۔ قربان علی' چونکہ گھنٹا گھر کے قریب بھوانہ بازار کے عقب میں رہتا تھا ہمارے نزدیک یہ محفوظ پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں نے بخت اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہم نے دلیرانہ فیصلہ کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا قطعی ارادہ کرلیا۔

ادھر سورج غروب ہوا' ادھر میں اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے گھر کی نشان دہی قربان علی نے کی تھی۔ اس پولیس افسر کے گھر میں کل تین افراد تھے' وہ اس کی بیوی اور اس کی جوان بیٹی! ان کے علاوہ ایک ملازم تھا جو باہر کا کام کرتا تھا۔

وہ پولیس افسر ہم سے بہت تپاک سے ملا۔ پھر ہم نے اس کے گھر پر قبضہ کرلیا' اس کے گھر والوں کو یرغمال بنا لیا۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا کہ خود مجھے بھی اس پر حیرت ہوئی۔

"اب تم اپنی کمر میں سخت درد کی وجہ سے چل بھی نہیں سکتے!" حالات پر قابو پانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"ہم۔ مگر کیوں؟" وہ گڑبڑا کر بولا "میں تو ٹھیک ہوں"

"تم سے جو کچھ کہا جارہا ہے وہی کرو!" میں نے سختی سے کہا "ہم سب سراج احمد کے دوست ہیں سمجھے!" سراج الدولہ کا اصل نام سراج احمد ہی تھا اور لائیلپور (فیصل آباد) آنے کے بعد خود اسی نے ہمیں اپنا اصل نام بتایا تھا۔ اب اس کا نام کم از کم ہمارے لیے راز نہیں رہ سکتا تھا۔

"سراج کون؟"

"وہ جس کی بیوی' بہن اور بچے کو پولیس کے غنڈوں سے اغوا کرایا گیا تھا۔"

پولیس افسر کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں "تو۔ تو تم کیا۔ کیا چاہتے ہو؟"

"انتقام!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "پولیس سے انتقام!"

مجاہد اول نے ہمیں یہی حکم دیا تھا اور ہم اسی لیے لائیلپور (فیصل آباد) آئے تھے۔ میں نے اس اعلیٰ پولیس افسر سے غلط نہیں کہا تھا۔

آدمی پورے طور پر نہ فرشتہ ہوتا ہے نہ شیطان! سو ہم بھی فرشتے نہیں تھے' ہاں آدمی سے انسان بننے کی کوشش میں ضرور تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ آدمی کو بھی انسان ہونا میسر نہیں۔ وہ پولیس افسر جو اس وقت ہماری گرفت میں تھا' اپنے اندر آدمی ہو یا انسان اس سے قطع نظر ہمارے لیے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ وہ بھی اسی جابرانہ نظام کا ایک حصہ تھا جس نے پوری ہندوستانی قوم کو مفلوج بنا رکھا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی سراج الدولہ پر فیصل آباد کی پولیس نے جو انسانیت سوز ظلم کیا تھا' ہم اسی ظلم کا جواب دینے آئے تھے۔ خاموشی سے ظلم برداشت کرلینا ہمارے نزدیک ظلم کا ساتھ دینے کے برابر تھا۔

میں نے جب اس اعلیٰ پولیس افسر کو فیصل آباد میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی آمد کا مقصد بتایا تو وہ گڑگڑانے لگا' اپنی صفائی پیش کرنے لگا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ ہم سے ہر ممکن تعاون کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

ہمارا مقصد محض یہ تھا کہ وہ پولیس افسر اپنی بیماری کا بہانہ کرکے اپنے گھر تک محدود ہوجائے اور ہمیں اس کی طرف سے کسی قسم کی کارروائی کا اندیشہ نہ رہے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا سابقہ کن لوگوں سے ہے! اسے ہم نے خود یہ بتادیا تھا کہ ہمارا تعلق وطن پرست تنظیم سے ہے۔ وہ ہماری تنظیم سے ناآشنا نہیں تھا۔ ہم نے پرنس آف ویلز کی خدمت پر مامور انگریز افسر کو اغوا کرکے اپنی تنظیم کی طرف سے وائسرائے کو یہ الٹی میٹم بھیجا تھا کہ سراج کے اہل خاندان کو رہا نہ کیا گیا تو ٹھیک اس روز جب پرنس آف ویلز دہلی میں اپنا دربار سجائے گا' اغوا کیے جانے والے انگریز افسر کی لاش کسی مقام پر لٹکی ہوئی پائی جائے گی اور اس دن جو بھی انگریز افسر کہیں دکھائی دیا' اسے گولی مار دی جائے گی' خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسی الٹی میٹم کے نتیجے میں سراج کے اہل خاندان کو رہائی ملی تھی۔

اس پولیس افسر کی بیوی اور نوجوان بیٹی کو ہم نے ایک کمرے میں بند کردیا تھا اور سراج پستول لیے ہوئے ان کے سر پر مسلط تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ اب وہ پولیس افسر اپنی بیوی اور بیٹی کی جان بچانے کی خاطر ہمارے حق میں کوئی غلط قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جو ملازم باہر کا کام کرتا تھا' اسے باہر سے باہر ہی ٹہلا دیا گیا تھا۔ جس وقت ہم نے اس پولیس افسر اور اس کے اہل خانہ کو یرغمال بنایا تھا' ملازم باہر گیا ہوا تھا ویسے بھی وہ رات کو چھٹی کرجاتا تھا۔ ہمارے کہنے پر پولیس افسر نے اسے ایک ماہ کی چھٹی دے دی تھی اور وہ غریب اس پر خوش ہوگیا تھا۔ اسے شبہ تک نہیں ہوا ہوگا کہ اس کا افسر کس حال میں ہے۔

فیصل آباد میں حکومت کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کے لیے ہم نے سراج اور اس کے اہل خاندان ہی کو بنیاد بنایا تھا۔ اس ہنگامے کی پوری منصوبہ بندی میں نے ہی کی تھی۔ اسی منصوبے کے مطابق کانگریس اور خلافت کے ایک مشترکہ جلسے میں سراج کی بیوی' بہن اور بچے کو اسٹیج پر لایا گیا۔ قربان علی اور تنظیم کے دوسرے ساتھیوں نے جن کا تعلق فیصل آباد ہی سے تھا' اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہماری ہی تنظیم کا ایک ساتھی جو خلافت تحریک کا رکن بھی تھا' اس نے بڑے دردانگیز پیرائے میں سراج کے اہل خانہ کو پیش آنے والے واقعات سے عوام کو آگاہ کیا۔ میں خود اس جلسے میں جوگیندر کے ساتھ موجود تھا۔ ہمارا ساتھی جب پیش آنے والے واقعات کا آخری حصہ بیان کررہا تھا تو اس وقت تک لوگ انتہائی مشتعل ہوچکے تھے۔ اسی کے نتیجے میں وہ حکومت وقت کے خلاف نعرے بلند کرنے لگے تھے۔

دوسرے دن صبح سارے فیصل آباد شہر کے بچے بچے کی زبان پر یہ واقعات تھے۔ برطانوی قومی پرچم کی طرح چونکہ گھنٹا گھر سے آٹھ راستے ادھر ادھر نکلتے ہیں۔ ان آٹھوں راستوں پر چلنے والے اس روز دن بھر انہی واقعات کو دہراتے رہے اور پھر شام کو ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ

سراج کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر بھوانہ بازار میں ہوا تھا۔ اس جلسے میں سراج کی بیوی نے روتے ہوئے ان واقعات کو خود اپنی زبانی بیان کیا۔ اس سے پولیس کے خلاف نفرت و اشتعال میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد لوگ چوک گھنٹا گھر کی طرف پولیس کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گئے۔ راستے میں انہیں جو پولیس والا بھی نظر آیا' اس پر انہوں نے آوازے کسے اور برا بھلا کہا۔

بھوانہ بازار میں ہونے والے اس احتجاجی جلسے کے بعد فیصل آباد کے مختلف علاقوں میں احتجاجی اجتماعات ہونے لگے۔ اشتعال رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ قربان علی جو پہلے خفیہ میں ملازم تھا اور پولیس کے محکمے میں رہ کر تنظیم کے لیے مخبری کے فرائض انجام دیتا تھا' استعفیٰ دینے کے بعد اب نمایاں طور پر ہر جگہ سرگرم دکھائی دیتا تھا۔ حکومت کے خلاف ہر احتجاجی جلسے میں وہ پیش پیش ہوتا تھا۔ میں نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ مجھے یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ اس نے میرا مشورہ قبول کرلیا مگر اس وقت تک دیر ہوچکی تھی۔ اسے گرفتار کرلیا گیا۔ اشتعال اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

جس روز قربان علی گرفتار ہوا سراج کا چچا زاد محمود ہماری گرفت میں آگیا۔ وہ بہت رویا گایا' بڑی منت سماجت کی اور یقین دلانے لگا کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا مگر زخمی سانپ کو زندہ چھوڑ دینا اپنی ہی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہماری نظر میں اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ اسی کے جرم کی پاداش میں تو سراج اور اس کے گھر والوں کو زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرنا پڑا تھا اور فیصل آباد کی پولیس وطن پرستوں' یعنی ہماری تلاش میں سرگرداں ہوگئی تھی۔ محمود نہ صرف برادر کشی کا مرتکب ہوا تھا بلکہ اس نے پولیس سے مخبری کرکے یہ ثابت کردیا تھا کہ اس کا ضمیر مرچکا ہے۔

"کسی مردہ ضمیر شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں!" میں نے گویا فیصلہ سنادیا۔

یہ سن کر محمود' سراج کے قدموں میں گرگیا۔ سراج کو وہ دوستی اور خاندان کے واسطے دے رہا تھا۔

"تو نہ میرا بھائی ہے اور نہ دوست!" سراج نفرت و حقارت سے بولا اور پھر میں محمود کو جو سزا سنا چکا تھا' وہ سزا اسے دے دی گئی۔ محمود کو اپنی جان سے گزرنا ہی پڑا کہ بے ضمیروں کی یہی سزا ہے۔

محمود کی لاش جب ایک درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی تو اسی کے ساتھ فیصل آباد پولیس کے نام ایک خط بھی تھا۔ جس میں وطن پرست تنظیم نے محمود کے قتل کی ذمے داری قبول کرلی تھی۔

شہر میں یہ خبر پھیلتے دیر نہ لگی کہ پولیس سے سراج کی مخبری کرنے والے کو سراج کے ساتھیوں نے قتل کردیا ہے۔ اس سے پہلے یہاں ایک انگریز افسر کے اغوا کی خبر بھی پھیل چکی تھی' جس کی جان بچانے کے لیے حکومت نے سراج کے اہل خانہ کو رہا کیا تھا۔

محمود کو قتل ہوئے ایک ہی روز گزرا تھا کہ ہمارے تنظیمی ساتھیوں نے فیصل آباد کے مختلف علاقوں سے بدمعاش صورت پولیس والوں کو بھی برآمد کرلیا جنہوں نے سراج کے گھر میں گھس کر عورتوں کو بے دردی سے پیٹا اور جنہیں خفیہ کے اعلیٰ افسر نے سانڈ کہا تھا۔

ان دونوں واقعات کے سبب فیصل آباد والوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ انتہائی پرجوش نظر آنے لگے۔ انہیں یہ خوشی تھی کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ظالموں کے جواب دے سکتے ہیں' ظالم و جابر حکومت سے پنجہ کرسکتے ہیں۔

ہمارے لیے اب فیصل آباد میں فضا ہموار ہوچکی تھی۔ میرا بنایا ہوا منصوبہ اب اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ انگریز کے ٹکڑوں پر پلنے والے پالتو کتوں سے انتقام لینے کا وقت قریب آچکا تھا۔ بارود کے ڈھیر میں چنگاری دکھانے کی دیر تھی اور اس کا موقع خود پولیس نے فراہم کردیا۔

اس رات فیصل آباد کی پولیس نے بڑے بڑے چھاپے مارے۔ وہ وطن پرست تنظیم کے کارکنوں کو گرفتار کرنا چاہتی تھی' خصوصاً ان کارکنوں کو جنہوں نے ایک مخبر کی لاش انہیں بہ طور تحفہ پیش کی تھی۔ اس میں کسی کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ جس پر ذرا سا بھی شبہ ہوا' اس کے گھر پر پولیس نے دھاوا بول دیا۔ پولیس ہم تک نہ پہنچ سکی۔ ہم تو پہلے ہی اس کا بندوبست کرچکے تھے۔ ہم نے ایک ایسے شخص کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہوا تھا کہ پولیس وہاں چھاپا مارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

صبح ہوئی تو سارا شہر صدائے احتجاج بنا ہوا تھا۔ ابتدا اسکولوں سے ہوئی۔ لڑکے اسکولوں سے باہر آگئے اور انہوں نے پتھراؤ شروع کردیا۔ پولیس حرکت میں آئی۔ اس نے اسکولوں کے بچوں پر لاٹھی چارج کردیا۔ اس میں پولیس نے متعدد لڑکوں کو پکڑ بھی لیا۔

دوسرے ہی روز پولیس کی پے در پے زیادتیوں کے

خلاف احتجاجی جلوس نکلا۔ کیوں کہ پرنس آف ویلز ابھی تک ہندوستان ہی میں تھا اس لیے حکومت کی طرف سے تمام صوبوں کی انتظامیہ کو سخت ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ وہ مظاہرین کا راستہ نہ روکے اور جلوسوں کو گزرنے دے۔ اس کا مقصد ممکنہ ٹکراؤ اور ہنگاموں کو روکنا تھا۔ کلکتے میں ہونے والے ہنگاموں کے بعد اگرچہ دوسرے مختلف شہروں میں بھی حکومت کے خلاف مظاہرے جاری تھے مگر وہ پرامن طور پر ختم ہوجاتے تھے۔ پولیس محض خاموش تماشائی کا کردار ادا کررہی تھی۔ انگریز کی یہ حکمت عملی کامیاب جارہی تھی لیکن ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ فیصل آباد میں ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا احتجاجی جلوس گھنٹا گھر پہنچا' پھر وہاں سے اس نے بھوانہ بازار کا رخ کیا اور سراج کے گھر تک پہنچ گیا۔ وہاں کئی جیالے نوجوانوں نے جلوس سے خطاب کیا۔ پولیس نے ابھی تک اسکول کے ان متعدد طلبہ کو رہا نہیں کیا تھا جنہیں گزشتہ روز لاٹھی چارج کرتے ہوئے پکڑا تھا۔ اطلاعات کے مطابق ان تمام طلبہ کو اسی تھانے میں رکھا گیا تھا جہاں سے سراج کے اہل خانہ کو چھڑانے کے لیے پولیس کا دستہ بھیجا گیا تھا۔ احتجاجی جلوس اب اسی تھانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ جلوس اب تک جہاں سے بھی گزرا تھا وہاں کوئی پولیس والا موجود نہیں تھا۔ پولیس کو ہدایت تھی کہ وہ تھانے کی چار دیواری تک محدود رہے اور جلوس خواہ کتنے ہی اشتعال انگیز نعرے کیوں نہ لگائے کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

جوگیندر اور تیتو میر اس احتجاجی جلوس کے درمیان میں تھے۔ میں اور بخت خاں جلوس کے پچھلے حصے میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جلوس پرزور نعرے لگاتا اور پولیس کو برا بھلا کہتا ہوا تھانے کے سامنے سے گزرتا رہا۔ آدھے سے زیادہ جلوس جب تھانے کے سامنے سے گزر گیا تو مجھے بے چینی ہونے لگی۔ اگر سارا جلوس اسی طرح تھانے کے سامنے سے گزر جاتا تو پھر ہمارا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔ میں نے اسی لیے فوری طور پر کارروائی کا فیصلہ کیا۔

ایسے مواقع پر عموماً لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی پہلا پتھر چلا دے۔ انہیں تو بس شہ ملنا چاہیے! سو میں نے پولیس کے خلاف تین چار پرزور نعرے لگائے۔ ہجوم نے ان نعروں کا جواب دیا اور پھر میں نے جھک کر پہلا پتھر اٹھا ہی لیا۔ بخت خاں نے بھی میری تقلید کی۔ میں نے پتھر پھینکا جو سیدھا ایک پولیس والے کو جا کر لگا۔ بخت خاں بھی مجھ سے پیچھے نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ جلوس میں شامل دوسرے افراد بھی پتھراؤ کرنے لگے۔ لوگوں کو شہ مل چکی تھی۔ اب انہیں کوئی بھی پتھراؤ کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

جو پولیس والے تھانے کے باہر متعین تھے' انہوں نے بدحواس ہوکر فائرنگ شروع کردی۔ انہیں یقیناً یہ خطرہ ہوگیا تھا کہ کہیں مشتعل ہجوم ان پر حملہ نہ کردے۔ مگر یہی ان کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی تمام جلوس تھانے کی طرف پلٹ پڑا۔ لوگ پولیس والوں سے بھڑ گئے۔ سپاہی فائرنگ کرتے ہوئے تھانے میں گھس گئے اور پھر دروازہ بند کرکے اندر بیٹھ گئے۔ انہیں تو پسپا ہونا ہی تھا کیوں کہ ان کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں۔

اس ہوائی فائرنگ کا مقصد لوگوں کو ڈرانا ہی تھا' مگر ڈرنے کی بجائے وہ اور شیر ہوگئے تھے۔ پولیس کی پسپائی کے دوران ہی میں ایک سپاہی ہجوم کے درمیان پھنس گیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں مشتعل ہجوم نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ اسی کے ساتھ فضا نعروں سے گونج اٹھی۔

اب ہجوم کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس کے باوجود لوگ تھانے کی طرف بڑھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں ایک بار پھر جوش دلانے اور راستہ دکھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے کچھ ہی فاصلے پر موجود بخت خاں کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر زوردار نعرہ لگا کر تھانے کی طرف بڑھا۔

"آؤ ساتھیو!" بخت خاں نے میری آواز میں آواز ملائی اور چلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

"آؤ!" کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

پھر ایک گروہ تھانے کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد گیٹ سے داخل ہوکر انسانی سیلاب احاطے میں پھیل گیا۔

یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ تھانے کی عمارت اب مشتعل ہجوم کے نرغے میں تھی۔ لوگوں کو اشتعال دلانے کے بعد انہیں قابو میں رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ بخت خاں' جوگیندر' تیتو میر اور میرے علاوہ اس ہجوم میں جتنے بھی تنظیمی ساتھی موجود تھے' ان سبھی پر ایک بڑی ذمے داری عائد تھی۔ یہ ذمے داری ان اسکول کے طلبہ کو صحیح سلامت تھانے سے نکالنے کی تھی جو پولیس کی حراست میں تھے کیوں کہ اب پروگرام کے مطابق تھانے کو آگ لگائی جانے والی تھی۔

میں نے مقامی تنظیمی ساتھیوں کو اپنی اردگرد جمع کرنے

کے لیے پہلے سے طے شدہ نعرہ لگایا۔ پھر جیسے ہی تھانے کو آگ لگائی گئی اور آگ سے بچنے کے لیے پولیس والے دروازے کھول کر باہر نکلے' ہم نے انہیں چھاپ لیا۔ حوالات کی چابیاں ملتے ہی ہم سب بھرا مار کر تھانے کی عمارت میں گھس گئے۔

ان طلبہ کی تعداد پندرہ سولہ کے قریب ہوگی۔ جنہیں ہم نے حوالات سے بہ حفاظت نکال کر تھانے کی عقبی چار دیواری سے فرار کرادیا۔ اس دوران میں مشتعل ہجوم' تھانے کی عمارت سے باہر آنے والے پولیس والوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرچکا تھا۔ لاشوں کے یہ ٹکڑے جلتی ہوئی آگ میں جھونک دیئے گئے تھے۔ اب وہ ہجوم اپنی مرضی کا مالک تھا اور اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ میں اور میرے تمام تنظیمی ساتھی کھسکتے ہوئے تھانے کے احاطے سے باہر آگئے۔ اب ہمیں اپنی محفوظ پناہ گاہ پر واپس پہنچنا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہم اس جلوس کے واقعات سراج الدولہ کو سنا رہے تھے۔ پولیس افسر' اس کی بیوی اور بیٹی سہمے ہوئے سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ انہیں شاید یہ خوف تھا کہ اب ان کی باری آنے والی ہے۔ پھر پولیس افسر نے اپنے اس خوف کا اظہار بھی کردیا۔

"تمہاری میزبانی اور مکمل تعاون کے سبب ہم تمہاری جاں بخشی کردیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

انگریز کے خلاف جدوجہد میں یہ پہلا موقع تھا کہ مشتعل ہجوم نے سرکار کے ٹکڑوں پر پلنے والوں سے ایسا بھیانک انتقام لیا تھا۔

فیصل آباد میں ہونے والے اس ہنگامے کی اصل وجوہ کا علم کسی سیاسی رہنما کو نہ ہوسکا۔ خود گاندھی جی نے اس واقعے پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ کانگریس سے اس کا کوئی تعلق نہیں' کانگریس کا کوئی لیڈر یا کارکن اس ہنگامے کی قیادت نہیں کررہا تھا۔ انہوں نے اس واقعے کو سول نافرمانی ملتوی کرنے کا جواز بنالیا جس کا اعلان کچھ ہی عرصے قبل انہوں نے بردولی میں کیا تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ابھی عوام نے ان کے عدم تشدد کے فلسفے کو دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ اس طرح گاندھی جی نے سول نافرمانی کے اعلان سے فیصلہ کن بغاوت کی سمت جو قدم اٹھایا تھا' واپس لے لیا۔ پیش قدمی کیے بغیر انہوں نے پسپائی اختیار کرلی۔ لوگوں کے دلوں میں جو لاوا کروٹیں لینے لگا تھا وہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ گاندھی جی کی اسی پالیسی کے نتیجے میں اسی سال کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی۔

حالانکہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کرکے انگریز حکومت کو استحکام بخشا تھا' اس کے باوجود اگلے ہی ماہ انہیں گرفتار کرلیا گیا۔

اندولال یاجنک ایک زمانے میں گاندھی جی کے سیکریٹری رہے ہیں' انہوں نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہے کہ انگریز حکومت نے گاندھی جی کی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لیے ان کی گرفتاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔

ہم بہرحال اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکے تھے۔ ہم اسی لیے ہنگامے کے فوراً بعد اسی رات فیصل آباد سے نکل گئے تھے۔

○☆○

جس شب ہم فیصل آباد سے چلے' اس سے دو روز پہلے ہی مجاہد اول کا پیغام مجھے مل چکا تھا۔ مجاہد اول کا یہ پہلا پیغام تھا جس میں مجھے کوئی حکم دینے کے بجائے مشورہ دیا گیا تھا۔ وہ پنجاب میں نہیں تھا مگر اسے پنجاب کے حالات سے پوری طرح آگہی تھی۔ اس نے اپنا نائب ہونے کی حیثیت سے مجھے اس صوبے میں ہونے والی تمام سرگرمیوں سے آگاہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بنگال کے تفصیلی حالات بھی لکھے تھے اور مشورہ دیا تھا کہ میں فی الحال پنجاب ہی میں رہوں' یہ زیادہ بہتر ہے۔ اس پیغام کے ساتھ ہی پنجاب کے مختلف شہروں میں تنظیم کے جو کارکن تھے' ان کی فہرست اور کوائف بھی درج تھے۔ کراچی کے دوران قیام میں بالکل اسی طرح صوبہ سندھ میں سرگرم کارکنوں کی فہرست مجھے فراہم کی گئی تھی جسے میں نے زبانی یاد کرکے پھاڑ دیا تھا۔ موجودہ فہرست کے متعلق بھی مجھے یہی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ کسی عام آدمی کے لیے یقیناً انتہائی مشکل تھا' لیکن میرے لیے بہرحال مشکل ثابت نہ ہوا۔ مجاہد اول کو بھی میرے حافظے پر بھروسا تھا اور خود مجھے بھی۔ ملتان کی مہم کے بعد اول نے مجھے حافظے پر بھروسا کرنے کی تاکید کی تھی۔ قدرت کا یہ عطیہ تھا کہ اس نے مجھے بہترین حافظے سے نوازا تھا۔

اس رات میں دیر تک پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ بنگال میں میرا دل تھا' پنجاب میں دماغ۔ میں جیسے دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ مجاہد اول نے مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ میں تنظیم کی نیابت کے باب میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ نہیں کرسکتا تھا۔ جو بھی فیصلہ کرنا تھا خود مجھے ہی کرنا تھا۔

بنگال کے شہر کلکتے میں فاطمہ تھی اور اس سے بچھڑے ہوئے مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ حالانکہ اتنے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کیا جانے وہ مجھے کس حال میں اور کس لیے نظر آئی تھی کہ بھلائے نہیں بھولتی تھی۔ کوئی اور اسے دیکھتا تو شاید مجھ سے سودا کی زبان میں کہتا ہے

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

تو ساری بات دیکھنے ہی کی تو ہے' اگر دیکھنے والی آنکھ میسر ہو! ازل سے ایک ہی کہانی تو چلی آرہی ہے' آدم و حوا کی کہانی! مگر اس ایک کہانی کے کتنے رنگ' کتنے پہلو ہیں! کہانیاں کہنے والے اپنے اپنے لفظوں میں یہی ایک کہانی کہہ رہے ہیں' سننے والے پوری دلچسپی' پورے انہماک سے یہی ایک کہانی سنے جارہے ہیں اور سنتے سنتے اوب نہیں رہے۔ ایک ہی حوا ہے جو نسل بعد نسل آدم کو رجھائے جارہی ہے اور آدم اس کے عشق میں جلتا ہے' مگر میرا معاملہ ذرا سا مختلف تھا۔ میں تو آدم زاد ہوکر بھی آدم زادہ نہیں تھا۔ میرے باپ ہاموس نے بھی ایک آدم زادی ہی سے عشق کیا تھا اور اس "جرم" کی پاداش میں اپنی جان سے گزر گیا تھا اور میں بھی اسی مرض میں مبتلا تھا۔ میرا مذہب' میرا دین' ایمان عشق تھا اور وجہ تخلیق کائنات بھی تو عشق ہی ہے! میرے نزدیک بہ قول میر وہ سخت "کافر" تھا جس نے سب سے پہلے مذہب عشق اختیار کیا تھا۔ سو میرا عشق مجھے بنگال کی طرف کھینچ رہا تھا اور ارض وطن سے کیا ہوا عہد اس پر اکسا رہا تھا کہ میں ابھی پنجاب ہی میں رہوں۔ اب میں اس پر ایک پچھتاوا سا محسوس کررہا تھا کہ میں نے فاطمہ کے آنچل کو پرچم کیوں بنادیا! ایک تھکے ہارے مسافر کے لیے زلفوں کی چھاؤں کیوں حرام کردی! فاطمہ اگر تنظیم کی رکن نہ بنی ہوتی تو اس پر صرف میرا اختیار ہوتا' مگر اب وہ اپنی مرضی کی مالک نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے اختیار کو خود ایک عہد کی زنجیر پہنادی تھی اور اس میں' میں بھی برابر کا شریک تھا۔ پہلے میں نے اور شاید فاطمہ نے بھی کچھ اور ہی سوچا اور سمجھا تھا شاید یہ کہ اس طرح زندگی کی بھیڑ میں ہم ایک دوسرے کے قریب رہ سکیں گے' قدم سے قدم ملا کر چل سکیں گے۔ یہ خواب اس وقت مجھے بڑا حسین معلوم ہوا تھا اور اب یہی میری آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔

میں پنجاب میں تھا اور فاطمہ بنگال میں۔ بنگال کے حالات ایسے تھے کہ فی الحال وہاں میرے بغیر بھی کام چل سکتا تھا اور چل رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ میں جوگیندر کو بھی وہیں بھیج دیتا۔ جوگیندر وہاں کے معاملات کو بہ آسانی سنبھال سکتا تھا۔ مجاہد اول کے نائب کی حیثیت سے مجھے یہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد آخر کار میں نے اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کردیا تھا۔

جوگیندر اور سراج الدولہ نے میرے اسی فیصلے کے مطابق فیصل آباد سے کلکتے کا رخ کیا۔ میں' بخت خاں اور تیتو میر لاہور روانہ ہوگئے۔ مجاہد اول کو اپنے فیصلے سے میں نے دوسرے دن صبح ہی ایک خط کے ذریعے آگاہ کردیا تھا۔ وہ اس وقت نینی تال میں تھا۔

ادھر تو ہم فیصل آباد میں پولیس سے انتقام لے رہے تھے' ادھر لاہور میں اس کے برعکس تنظیم کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ اس دوران میں وہاں جو کچھ ہوا تھا' مجاہد اول نے اپنے پیغام کے ذریعے مجھے اس سے مطلع کردیا تھا۔ مجاہد اول نے اپنے اس شبے کا اظہار بھی کیا تھا کہ ممکن ہے لاہور میں کچھ "کالی بھیڑیں" بھی تنظیم کے ارکان میں شامل کرلی گئی ہوں۔ وہاں پے در پے جو واقعات پیش آئے تھے سو وہ اسی طرف اشارہ کررہے تھے۔ خفیہ کے محکمے سے وابستہ کیتھی نے لاہور میں گویا تنظیم کو مفلوج بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ اور اس کا ایک انگریز ساتھی جارج دونوں مل کے ایک اور ایک گیارہ ہوگئے تھے۔ حکومت کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ لاہور میں وطن پرست تنظیم کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ شملے سے اسی لیے بہ طور خاص جارج کو لاہور بھیجا گیا تھا۔ وہ عیار شخص' کیتھی ہی کی طرح بڑی صاف ستھری اردو بولتا تھا۔ خفیہ سے وابستہ انگریز افسران کے لیے اس زمانے میں یہ لازمی شرط تھی کہ وہ اردو پر قدرت رکھتے ہوں۔

مجاہد اول ہی کے پیغام سے پہلی مرتبہ مجھے کیتھی کے محکمہ جاتی عہدے کا علم ہوا تھا۔ وہ ڈپٹی چیف آف انٹیلی جنس تھی' مگر اسی کے ساتھ ساتھ اسے انگریز ہونے کے ناتے کچھ خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے' ایسے اختیارات جو چیف آف انٹیلی جنس ہونے کے باوجود میرے ڈیڈی تک کو حاصل نہیں تھے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میرے ڈیڈی بہرحال ہندوستانی تھے۔ حکمرانوں سے ان کا مذہبی رشتہ تو ضرور تھا مگر زمین کا رشتہ نہیں تھا۔ لاہور کے پہلے دوران قیام میں جو گرہ میرے ذہن میں پڑگئی تھی' اب کھلی تھی۔ مجھ پر لاہور کے سی آئی اے سینٹر میں جب تشدد کیا جارہا تھا تو مجھے اسی لیے حیرت ہوئی تھی سی آئی اے والوں نے اس کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا کہ میں ان کے محکمے کے چیف کا منہ بولا بیٹا

ہوں یا یہ کہ میری پرورش ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی ہے۔ میرا نام بھی ایسا تھا کہ جس سے عام آدمی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا' میں مسلمان ہوں یا میرا تعلق کسی اور مذہب سے ہے۔

لاہور ہی میں مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ میرے مکمل کوائف سی آئی اے والوں کے پاس موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ کوائف اسی شخص سے حاصل کیے تھے جس نے میری پرورش کی تھی اور جسے میں "ڈیڈی" کہتا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ چیف آف انٹیلی جنس ڈیسوزا سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں اور یہ کہ میں مسلمان ہوں' انگریز حکومت میرے ساتھ کوئی نرمی کس طرح کرسکتی تھی! میرے والد ہاموس کے بارے میں شاید ڈیڈی نے حکومت کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا ہو اس لیے کہ ان کے اس بیان کو دروغ گوئی ہی پر محمول کیا جاتا کہ میں جن زادہ ہوں۔ اس راز کو افشا نہ کرنے کی خاطر وہ بہ آسانی یہ کہہ سکتے تھے کہ میری ماں سے شادی کرنے کے بعد میرے والد کا کوئی سراغ نہیں مل سکا وغیرہ! یہ تو محض ایک مفروضہ تھا۔ ڈیڈی نے اس صورتِ حال کو کس طرح فیس کیا ہوگا۔ یہ تو وہی بہتر جان سکتے تھے۔ ان سے میری ملاقات کو اب تقریباً ایک سال ہونے والا تھا۔ راولپنڈی سے میں دہلی ہی گیا تھا مگر اس وقت ڈیڈی' دہلی میں نہیں تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو اس سے پہلے ہی میں گھر چھوڑ چکا تھا۔ میں دانستہ ان سے نہیں ملا تھا کیوں کہ میرے اور ان کے راستے اب واضح طور پر الگ الگ ہوچکے تھے۔ وہ اس جابرانہ نظام کا ساتھ دے رہے تھے جس کے خلاف میں برسرِپیکار تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں ان کی انتہائی عزت تھی۔ انہوں نے مجھے باپ کی شفقت ہی دی تھی۔ جوان ہونے تک تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں ان کی اولاد نہیں ہوں۔ انہوں نے اور ممی نے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میرے والد اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یوں گویا انہوں نے ایک یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر کم از کم اپنی آخرت تو سنوار ہی لی تھی۔ میری نظر میں ان کا اتنا ہی احترام تھا جتنا اپنے سگے باپ کا ہوسکتا تھا۔ اسی حقیقت کے ساتھ دوسرا بڑا سچ یہ تھا کہ میں کسی بھی مرحلے پر اپنے ڈیڈی کی محبت یا احترام کے پیشِ نظر ملک و قوم کی آزادی کا سودا نہیں کرسکتا تھا۔ اس سلسلے میں ڈیڈی سے مصالحت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

میں ان حالات میں دوبارہ لاہور کی طرف پلٹا تھا۔

اطلاعات کے مطابق لاہور میں میرے دو تنظیمی ساتھی خفیہ والوں کی گرفت میں آگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے تفتیش کے دوران میں خود ہی موت کو گلے لگالیا تھا اور دوسرے ساتھی پر اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان سے گزر گیا تھا۔ یہ "کارنامہ" جارج اور کیتھی نے انجام دیا تھا۔ جارج آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کے طور پر لاہور آیا تھا اور "اسپیشل ڈیوٹی" دینا اس نے شروع کردی تھی۔

یہ اطلاعات مجھے فیصل آباد میں آخری بڑا ہنگامہ ہونے سے پہلے ہی مل گئی تھیں۔ شاید اسی کا ردِعمل تھا کہ میں نے حکومت کے کارندوں سے انتقام لینے میں کسی بھی قسم کی نرمی نہیں برتی تھی۔ پنجاب اور خصوصاً لاہور کے موجودہ حالات میں مجھے بنگال جانا خود غرضی لگا تھا اور میں نے مجاہدِ اوّل کا مشورہ قبول کرلیا تھا۔ مجاہدِ اوّل کا نائب ہونے کی حیثیت سے اب میں پنجاب میں کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔

فیصل آباد کے دوران قیام میں جو کامیاب حکمتِ عملی میں نے اختیار کی تھی' اس نے میرے اندازِ فکر کو بڑی حد تک بدل دیا تھا۔

لاہور پہنچتے ہی میں نے اپنے تنظیمی ساتھیوں کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کرلی تھی جس میں انہیں نئی حکمتِ عملی کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا "اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا! ہم ظالموں سے ان کے ظلم کا حساب لیں گے!" پھر میں نے انہیں جارج اور کیتھی کے بارے میں بتایا "اب ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ہم راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے! مگر اس سے بھی پہلے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے کس طرح خفیہ والوں کے ہتھے چڑھ گئے؟ ہم سے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہورہی ہے۔" وہ جس کا تنظیمی نام ظفر تھا' میں نے اسے بولنے کا موقع دیا۔

"اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں اور مجاہدِ اوّل کو بھی اس سے آگاہ کرچکے ہیں کہ تنظیم کے نومنتخب ارکان ہی میں سے کوئی پولیس کے لیے مخبری کرسکتا ہے۔" ظفر نے بولنا شروع کیا "گزشتہ سال بھر کے عرصے میں ہماری تعداد دوگنی ہوچکی ہے۔ میری مراد صرف لاہور شہر سے ہے۔ تنظیم کی رکنیت سازی میں کم از کم اس شہر کی حد تک عجلت سے کام لیا گیا ہے۔"

"اس کی ذمّے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟" میری اجازت سے بخت خاں نے ظفر سے سوال کیا۔ اس میٹنگ کی صدارت بہرحال میں کررہا تھا اور میٹنگ میں شریک کوئی بھی شخص میری اجازت حاصل کیے بغیر بولنے کا مجاز نہیں تھا۔

ظفر نے بخت خاں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے

اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ اس شخص نے مجھ سے بولنے کی اجازت چاہی۔

"بخت خاں کے سوال کا جواب آپ دینا چاہتے ہیں دلاور؟" میں بولا۔ اس شخص کا تنظیمی نام یہی تھا۔

"جی ہاں جناب!" دلاور نے کہا "اس کی ذمّے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں ظفر کے خیال سے متفق ہوں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا!" میری تیوریوں میں ایک دم بل پڑگئے اور لہجہ بھی بدل گیا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا اعتراف دو قیمتی جانوں کے برابر ہے؟ بولیں! کیا اس طرح تلافی ممکن ہے؟۔ جواب دیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز میں مزید سختی آگئی۔

دلاور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ مجھے تنظیم میں اس کی حیثیت کا پورا احساس تھا' وہ لاہور شہر میں تنظیم کا نگرانِ اعلیٰ تھا اور کسی بھی نئے رکن سے حلف لینے کا مجاز بھی تھا' لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ جواب دہی ضروری تھی۔

"مجھے آپ کی نیت پر ہرگز شبہ نہیں" میں نے دلاور کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت اور جھکی ہوئی گردن دیکھ کر اس کے کچھ بولنے سے پہلے مزید کہا "اس کے باوجود غلطی بہرحال غلطی ہے۔ ہم اپنی ہتھیلیوں پر سروں کے چراغ لے کر اپنے گھروں سے نکلتے ہیں کہ غلامی کی اس سیاہ رات میں ہمارے پیچھے آنے والوں کو اپنی منزل کا صحیح راستہ نظر آجائے۔ ان حالات میں ہم کسی معمولی سی غلطی کو بھی برداشت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ دلاور! کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے؟"

"جی ہاں شاہین' میں جانتا ہوں۔" دلاور نے مجھے میرے تنظیمی نام سے مخاطب کیا "میں دراصل اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا کہ شاید ہماری افرادی قوت بڑھ جانے سے تنظیم اس شہر میں مزید مضبوط ہوجائے گی۔ مجھ سے جو غلطی ہوچکی ہے' میں اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے اسی لیے پہلے ہی مرحلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا۔"

"آپ نے اپنے حاصل شدہ اختیارات کے سبب اس شہر میں تنظیم کو خطرے سے دوچار کردیا ہے اور اسی کے نتیجے میں گزشتہ دنوں ہمارے دو سرفروش ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔ میں مجاہدِ اوّل کا نائب ہونے کی حیثیت سے آپ کو تنظیم کے موجودہ عہدے سے معزول کرتا ہوں۔ آپ نے خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کیا۔ کیا آپ تنظیم کے ایک معمولی رکن ہونے کی حیثیت سے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں؟"

مجھے علم تھا کہ دلاور کا جواب کیا ہوگا۔ یہی جواب تقریباً ایسی ہی صورتِ حال میں مجاہدِ اوّل کو میں نے بھی دیا تھا۔ یہ واقعہ کراچی کا تھا جب مجاہدِ اوّل نے ملتان مہم کی تحریری رپورٹ لکھنے پر مجھے معزول کرکے جوگیندر کو اس دستے کا سربراہ بنادیا تھا عملاً بخت خاں کی جگہ ملتان میں جس کی سربراہی میں کررہا تھا۔ دلاور نے بھی وہی جواب دیا اور یہ تنظیم سے اس کی وفاداری کا ثبوت تھا۔

دلاور کا جواب اگر نفی میں ہوتا یا میں یہ محسوس کرلیتا کہ اس کے جواب میں اخلاص کی خوشبو نہیں تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ وطن پرست تنظیم ایسی تنظیموں میں داخلے کا راستہ تو مشکل ہوتا ہی ہے۔ مگر ان سے نکلنے کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور یہ راستہ بس ایک ہی سمت جاتا ہے' موت اور صرف یقینی موت کی سمت! مجھے نہیں معلوم کہ دلاور کو یہ بات معلوم تھی یا نہیں البتہ میرا ہاتھ اس وقت پستول کے دستے پر ضرور تھا جب وہ میرے سوال کا جواب دینے والا تھا۔ کوئی ایسا شخص جو تنظیم کے رازوں سے واقف ہوجائے اور پھر تنظیم کے کسی فیصلے سے انکار کرے تو اس کا واضح مطلب بدعہدی یا دوسرے الفاظ میں غداری ہی ہوتا ہے۔ غداری کی سزا ایسی تنظیموں میں موت ہی ہوتی ہے کیوں کہ کسی ایک شخص کی غداری کی وجہ سے تنظیم کے بقیہ ارکان کی زندگی خطرے میں پڑجاتی ہے۔ سو یوں! ایک شخص کے مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان نہیں کیا جاتا۔ اسے سنگ دلی اور بے رحمی بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نظم و ضبط برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ زیرِ زمین تنظیمیں ایسے ہی سخت قوانین پر عمل کرکے اپنا تحفظ کرتی ہیں۔

دلاور کا جواب سننے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا' پھر بولا "دلاور! آپ کی غلطی کی کم سے کم سزا یہی ممکن تھی کہ آپ کے اختیارات سلب کرلیے جائیں۔ آپ کی جگہ یہ اختیارات شیر بہادر کے سپرد کیے جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے خوب صورت چہرے والے اس نوجوان کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر جذبوں کی تحریر صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

اس نے اٹھ کر میرا شکریہ ادا کیا۔ وہاں موجود چاروں مقامی تنظیمی ساتھیوں میں عمر کے اعتبار سے وہی سب سے چھوٹا تھا' مگر اسے اختیارات دینے کا سبب عمر نہیں اس کے وہ کوائف تھے جو میری نظر سے گزر چکے تھے۔ اتنی سی عمر میں وہ بڑی قیامت شے تھا۔ شیر بہادر اس کا تنظیمی نام ہی تھا۔

مجھے اس کا اصل نام بھی معلوم تھا کیوں کہ مجھے جو فہرست فراہم کی گئی تھی اس میں ارکان کے اصل اور تنظیمی نام دونوں ہی درج تھے۔

شیر بہادر کو مبارک باد دینے والا پہلا شخص دلاور ہی تھا۔ اس نے بڑے پرجوش اور کھرے لہجے میں کہا تھا "مجھے اس پر بے انتہا خوشی ہے کہ لاہور میں تنظیم کی قیادت ایک نوجوان کے سپرد کی گئی ہے' ایسے نوجوان کے سپرد جو کئی بار کڑی آزمائشوں سے گزر چکا ہے۔"

"شیر بہادر! تمہیں یہ ذمے داری سپرد کی جاتی ہے کہ تین دن کے اندر اندر دلاور کی معاونت سے تنظیم کے نو منتخب ارکان کے بارے میں فیصلہ کن رپورٹ دو!" میں نے کہا "تمہیں اس کام کے لیے اس سے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ دلاور کو تمہارا معاون محض اس لیے بنایا گیا ہے کہ یہ نو منتخب ارکان کی نشان دہی کر سکیں جن سے ظاہر ہے' تم واقف نہیں ہو گے۔"

مقامی تنظیمی ساتھیوں میں سے چوتھے فرد کا تنظیمی نام مجاہد تھا۔ میں نے اب اسے مخاطب کیا "مجاہد! تم اور ظفر' بخت خاں اور تیتو میر کے ساتھ مل کر شملے سے یہاں بھیجے جانے والے عیار انگریز جارج کو ٹھکانے لگاؤ گے۔ اس دستے کی سربراہی بخت خاں کریں گے۔ تین دن کے اندر اندر اس اہم مہم کے ابتدائی مراحل طے ہو جانا چاہئیں۔ اس سلسلے میں ضروری ہدایات تمہیں اور ظفر کو بخت خاں سے مل جائیں گی۔ تین دن کل سے شمار ہوں گے۔ اور اب آخری ہدایت! یہاں موجود چاروں مقامی ساتھیوں کے علاوہ فی الحال تنظیم کے کسی بھی رکن سے کوئی تنظیمی کام نہیں لیا جائے گا۔ تنظیم نے کیا نئے فیصلے کیے ہیں' اس کا علم یہاں موجود افراد کے سوا کسی کو بھی نہیں ہونا چاہیے' خواہ وہ شخص تنظیم کا کوئی پرانا رکن ہو یا نیا! یہ احکام اس وقت تک کے لیے ہیں جب تک ہم کسی "کالی بھیڑ" کا سراغ لگا کر اسے اس کے انجام تک نہیں پہنچا دیتے۔ کوئی سوال؟" میں نے باری باری اپنے تمام ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

کسی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا اور میں نے میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

ظفر' دلاور اور مجاہد میٹنگ ختم ہونے کے کچھ ہی دیر بعد چائے پی کر رخصت ہو گئے۔ شیر بہادر وہیں رہ گیا کیوں کہ وہی ہمارا میزبان تھا۔

لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی دن مجھے وہ خبر مل گئی جس کے لیے ایک ایک دن گن رہا تھا۔ یہ اس شخص کے رہا ہونے کی خبر تھی بعد میں جس کی موت پر ایک زمانے نے رشک کیا۔

سو اس شخص کو رہا کر دیا گیا جس نے قتل حسینؓ کو مرگ یزید کہا تھا۔ ہاں یہ وہی مولانا محمد علی جوہر تھے جنہوں نے میرے سینے میں تحریک آزادی کی شمع روشن کی تھی جن کا دیدار میں نے پہلی بار دہلی میں کیا تھا اور جن کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میری روح میں اترتے چلے گئے تھے۔

پھر میں نے لاہور ہی کے دوران قیام میں یہ بھی سنا کہ رہائی ملنے کے بعد جب مولانا جوہر امرتسر کانگریس سیشن میں شرکت کے لیے پہنچے تو سارا شہر ان کی زیارت کے لیے امنڈ آیا۔

یہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے مگر لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے!

تنظیم کے حلقۂ اہل فکر میں سے ایک اہم شخصیت لاہور میں بھی موجود تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے وطن پرست تنظیم کے بڑے گائڈ لائن لیتے تھے۔ ان کے مشوروں کو غور سے سنتے تھے۔ تنظیم کے لیے سوچنے والے ان افراد کی حیثیت دماغ کی سی تھی۔ کراچی میں ایسے ہی سوچنے والے ایک دماغ سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کو ہم سید صاحب کہتے تھے جن کا ذکر میں اپنی سرگزشت میں کر چکا ہوں۔ لاہور میں چودھری عنایت تھے۔ پنجاب کی فہرست میں سب سے پہلا نام انہی کا تھا۔ چودھری صاحب کے کوائف میں میرے لیے جو سب سے اہم بات تھی وہ یہ کہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور اس حلقۂ احباب میں علامہ اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ میں گویا ان کے ذریعے علامہ سے مل سکتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس وقت تک علامہ نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا مگر ان کے افکار ملت اسلامیہ پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ ان کی شاعری مسلمانوں کے دل کی آواز بنتی جارہی تھی۔ میرے سیاسی آئیڈیل مولانا محمد علی جوہر کی رہائی پر انہوں نے جو اشعار لکھے تھے' ان سے بھی میں بہت متاثر ہوا تھا۔

میں چودھری عنایت سے ملا اور ان سے پنجاب کے سیاسی حالات پر میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے کچھ نئے امکانات روشن ہوئے۔ چودھری صاحب نے اسی روز شام کو میری دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ علامہ اقبال سے وہ ملاقات آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں نے اس مختصر ملاقات میں ایک بات بہ طور خاص محسوس کی کہ علامہ نہ صرف ایک بڑے شاعر ہیں بلکہ وہ اعلیٰ تر قائدانہ صلاحیتیں

بھی رکھتے ہیں۔ پھر مستقبل نے میرے اس احساس پر مہر صداقت ثبت کر دی۔

جس شام میں علامہ اقبال سے مل کر لاہوری گیٹ کی طرف لوٹ رہا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ کچھ آنکھیں میری نگرانی کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے ٹھکانے پر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب میرا رخ بادشاہی مسجد کی طرف تھا۔ مغرب ہونے والی تھی اور میں نے مغرب کی نماز بادشاہی مسجد میں پڑھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دوران میں اپنا شک دور کر لینا چاہتا تھا۔

وہ دو تھے اور ان میں سے ایک کو پہچاننا میرے لیے کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں ہوا۔ اسے میں نے اور اس نے مجھے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ہرچند کہ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنے چہرے کے خدوخال نہیں بدل سکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی پہچان ٹوٹی ہوئی کلائی تھی جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ پلاسٹر چڑھی کلائی اس پٹی میں پڑی تھی جو اس کی گردن سے بندھی تھی۔ یہ وہی بھاری آواز والا تھا جس نے سی آئی اے میں مجھ پر تشدد کیا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ تیز اور چمکدار پھل والا استرا میری آنکھوں کے سامنے تھما تھما کر مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کی کلائی میں نے ہی توڑی تھی۔

میں جب مغرب کی نماز پڑھ کر بادشاہی مسجد سے نکلا تو وہ صدر دروازے کے باہر کاندھے پر جھولی ڈالے فقیروں کے بھیس میں کھڑا تھا۔

"اللہ کے نام پر!" میں نے اس کی بھاری آواز سنی۔ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا تھا۔

آج اللہ کے نام پر تجھے موت ملے گی! میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنے چہرے کو اس چادر سے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی جو وہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کا ساتھی میرے ہی ساتھ نماز پڑھ کر باہر آیا تھا اور اب کچھ فاصلے سے میرے پیچھے آرہا تھا۔

وہ دونوں خفیہ والے شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کی لاٹری نکل آئی۔ میرا سراغ مل جانا ان کے نزدیک لاٹری نکل آنے ہی کے برابر تھا۔ گزشتہ تین روز سے لاہور میں میری آزادانہ نقل و حرکت کا یہی منطقی نتیجہ نکلنا تھا۔ میں نے دانستہ خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ آج ہی صبح میں نے مجاہد اول کو تفصیلی رپورٹ بھیجی تھی اور اسے لاہور کے نئے حالات سے مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آئندہ اقدامات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

میں اس نقل و حرکت کے دوران میں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لاہور میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طارنوش کی حیثیت سے میری شناخت کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی خبر تھی کہ ان دنوں لاہور میں خفیہ والوں نے تنظیم کے لیے جال بچھا رکھا ہے اور پاگل کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں اگر انتہائی چوکنا اور محتاط نہ ہوتا تو شاید ان دونوں کو نظر انداز کر جاتا۔ میں تو چاہتا ہی یہ تھا کہ جو خفیہ والے مجھے پہچانتے ہیں' سامنے آجائیں۔ اس اعتبار سے میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں' اس زمانے میں لاہور کو باغوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ یہ باغ اندرون شہر بھی تھے اور شہر سے باہر بھی۔ سو میں آہستہ قدمی سے ایک باغ کی طرف چل دیا۔ میرا انداز چہل قدمی کا سا تھا۔ دن کے اجالے رات کے سیاہی میں آہستہ آہستہ مدغم ہو رہے تھے۔ جس راہ پر میں آگے بڑھ رہا تھا وہ شہر سے باہر جارہی تھی۔ وہ باغ مجھے دور ہی سے نظر آگیا تھا۔ باغ کے قریب پہنچتے ہی میں اچانک پلٹا اور کچھ ہی دور اس جعلی فقیر کو دیکھا۔ اس کا ساتھی غائب تھا۔ وہاں اس کے اور میرے سوا دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے پلٹتے ہی اس نے ایک پیڑ کے تنے کی اوٹ میں چھپنا چاہا تھا مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر اپنے شانے پر پڑی ہوئی جھولی میں ہاتھ ڈال کر آہستہ آہستہ میری ہی طرف بڑھنے لگا تھا۔

مجھے جس لمحے کا انتظار تھا' آخر وہ لمحہ آہی گیا۔ اس کا ہاتھ جھولی سے باہر آچکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھا۔ پستول کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"طارنوش! تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میں تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی بھاری آواز مجھے سنائی دی۔ اب وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آکے رک چکا تھا اور اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تمہارا ساتھی دکھائی نہیں دے رہا' وہ کہاں گیا؟" میں نے پرسکون آواز میں کہا "کیا تم نے اسے دوسرے کتوں کو جمع کرنے بھیج دیا ہے؟"

"بکواس نہ کر!" وہ چیخ اٹھا "میں چاہوں تو تجھے یہیں گولی مار سکتا ہوں۔"

میرا مقصد اسے طیش دلانا تھا اور وہ طیش میں آچکا تھا۔ میں اس وقت ایک انتہائی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا' ایک ایسا کھیل جو شاید کسی نے نہ کھیلا ہو۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر

گولی چلا دے۔

"تجھے! تو مجھے گولی مارے گا!" یہ کہتے ہوئے میں زور سے ہنس پڑا "تجھے بل سے باہر نکالنے ہی کے لیے تو میں لاہور آیا ہوں۔"

"خارنوش!" وہ حلق کے بل چیخا۔

"تو نے مجھے گولی ماردی تو اپنے باپ جارج کو کیا جواب دے گا؟" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے بہت کچھ معلوم ہے اور اب۔۔۔"

اس نے یقیناً کچھ اور بھی کہا تھا جسے میں ٹھیک طرح سن نہیں سکا۔ ہاں مجھے اتنا احساس ضرور ہوگیا تھا کہ وہ مجھے گولی ماردینا چاہتا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے شدید گرمی محسوس کی تھی اور میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا وجود نادیدہ ہوچکا تھا۔ عین اسی لمحے اس کے پستول نے شعلہ اگلا تھا۔ جس مقصد سے میں نے وہ خطرناک کھیل کھیلا تھا اس میں مجھے کامیابی ہوچکی تھی۔ دانستہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر میں نے اپنی خوابیدہ جناتی صفات میں سے ایک صفت کو بیدار کرلیا تھا۔ یہ صفات مجھے اپنے باپ ہاموس کی طرف سے ورثے میں ملی تھیں۔ جب بھی میری زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہوتا تھا خود بہ خود یہ صفات بیدار ہوجاتی تھیں۔ میں انہیں خود متحرک کرنے پر قادر نہیں تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے غائب ہوتا دیکھ کر خفیہ کا وہ شخص ہکا بکا سا ہوگیا تھا۔ اس کی نظریں اسی جگہ جمی ہوئی تھیں جہاں چند لمحے پہلے میں اسے نظر آیا تھا۔ میں اس دوران میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جس وقت میں اس کے ہاتھ سے پستول چھین رہا تھا' دور سے مجھے ایک پولیس جیپ آتی دکھائی دی۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ اس خبیث نے اپنے ساتھی کو کسی قریبی تھانے کی طرف بھیجا تھا۔

وہ جو اس لمحے میرے سامنے بدحواس اور دہشت زدہ سا کھڑا تھا' اس کی گردن پر جانے کتنے بے گناہوں کا خون تھا۔ اسے کیتھی کے دستِ راست کی حیثیت حاصل رہی تھی' یہ تو خود میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جب میں سی آئی اے والوں کی قید میں تھا تو خود اسی شخص نے اعتراف کیا تھا کہ ہمیں تو اس کی اجازت بھی ہے' حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث افراد کو گولی ماردیں۔ چند لمحے پہلے اس نے مجھ پر گولی چلا کر اپنا یہی حق استعمال کیا تھا اور اب میں اپنا حق استعمال کرنا چاہتا تھا' وہ حق جو ہر ذی روح کو حاصل ہے' اپنی زندگی بچانے کا حق! اس نے خود کو قاتل ثابت کردیا تھا اور قاتل کی سزا موت ہے۔

اسے جہنم رسید کرنے میں مجھے صرف چند ہی لمحے لگے تھے۔ میں نے اسی کے پستول کی گولی اس کے دل میں اتار دی تھی۔ اور پھر وہ پستول اس کے ہاتھ میں تھمادیا تھا۔

اس کا ساتھی پولیس کو لے کر جب وہاں پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا۔ میں وہیں موجود تھا اور میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ جانے کب اور کس لمحے میرا وجود نادیدہ نہ رہے اور ابھی ایک کام باقی تھا۔ پولیس والے تو مرنے والے کی موت کا معما حل کرنے میں مصروف ہوگئے اور میں نے اس عرصے میں وہ دوسرا کام بھی نمٹادیا۔ وہاں موجود افراد کو صرف یہی معلوم ہوسکا تھا کہ جو خفیہ والا زندہ تھا اس نے چیخنا شروع کردیا تھا اور پھر اس کی چیخیں دم توڑ گئی تھیں۔ میری انگلیوں کی آہنی گرفت اب اس کی گردن پر تھی اور اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ خود اس کی گردن پر تھے۔

"ارے۔۔۔ اسے کیا ہو رہا ہے!" کسی پولیس والے نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ رہا ہے۔" کوئی دوسرا خوف زدہ سی آواز میں بولا۔

پھر چند ہی لمحوں میں اس کا جسم ڈھیلا پڑگیا۔ کھیل ختم ہوچکا تھا۔ میں نے ان دونوں کو ختم کرکے اپنے دو ساتھیوں کی موت کا انتقام لے لیا تھا۔ بھاری آواز والا اگر اپنے ساتھی سے میری نشان دہی نہ کرجاتا تو شاید میں اسے زندہ چھوڑ دیتا۔

پولیس کے نزدیک ان دونوں خفیہ والوں نے خودکشی کی تھی اور ان میں سے ایک تو خود ان کی آنکھوں کے سامنے مرا تھا۔

وہاں مزید رکے بغیر میں نے واپسی کا سفر شروع کردیا۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اردگرد اب خاصا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ابھی میں داتا دربار کے قریب نہیں پہنچ سکا تھا کہ مجھے انتہائی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور پھر مجھے میرا جسم واپس مل گیا۔

چند قدم چلتے ہی مجھے اسنیٰ کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔

"خارنوش!" اس نے مجھے مخاطب کیا "یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"میں وہی کر رہا ہوں اسنیٰ جو مجھے کرنا چاہیے۔" میں نے اسنیٰ کے نادیدہ وجود کو جواب دیا۔

"مگر اس کے لیے تم نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔" اس کے لہجے میں خفگی سی تھی "تمہیں اس کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ اس طرح تم اس حصار سے باہر نکل جاتے ہو جو میں نے تمہاری حفاظت کے لیے قائم کیا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ عالم جنات میں بھی تمہارے دشمن موجود ہیں۔"

"ہاں اسنیٰ مجھے معلوم ہے' مگر پہلے تو کبھی تم نے مجھے اس خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔" میں چکرا کر رہ گیا۔

"پہلے کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔" وہ بولی "اس سے پہلے کبھی تم نے دیدہ و دانستہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا۔ سنو! جب تمہارے اندر جناتی صفات پیدا ہوجاتی ہیں تو تم آدم زادوں کے ہر وار سے بچ جاتے ہو مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک بڑے خطرے کی حدود میں داخل ہوجاتے ہو۔ عین ممکن ہے کہ ان لمحات میں تمہارا سراغ لگانے والے کافر جنات تم تک پہنچ جائیں' وہی جنہوں نے تمہارے باپ اور میرے بھائی ہاموس کو قتل کیا تھا۔ میرے بچے! میں تمہیں تاکید کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی خود اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالو گے۔ اللہ پر بھروسا رکھو کہ وہ بڑا کارساز ہے۔ انشاء اللہ تم ہر شر سے محفوظ رہو گے۔ سورۂ جن کی جو آیات میں نے تمہیں تعلیم کی تھیں' اب انہی کے ساتھ سورۃ الناس کا ورد بھی کرتے رہا کرو!" ان الفاظ کے ساتھ ہی اسنیٰ کی مخصوص خوشبو معدوم ہوگئی۔

مجھ پر اس وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں جیسے خود بہ خود سورۃ الناس کا ورد کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ عربی زبان جاننے کے سبب میں جو کچھ پڑھ رہا تھا اسے سمجھ بھی رہا تھا۔ اسی سورت میں جنات اور آدمیوں کے شر سے اللہ کی پناہ چاہی گئی ہے اور میں دونوں ہی کے شر سے محفوظ رہنا چاہتا تھا۔

لوہاری گیٹ تک پہنچتے ہوئے مجھ پر وہی نامانوس سی کیفیت طاری رہی اور میں غیر ارادی طور پر سورۃ الناس کا ورد کرتا رہا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو جو تین دن کی مہلت دی تھی وہ آج ختم ہو رہی تھی۔ شیر بہادر اور دلاور مجھے گھر ہی پر ملے البتہ بخت خاں ابھی نہیں لوٹا تھا۔ میرے لیے دروازہ شیر بہادر ہی نے کھولا تھا۔ ہم تینوں نشست گاہ میں آبیٹھے۔

"کیا رہا؟" میں نے سوالیہ نظریں شیر بہادر کی طرف اٹھائیں۔ شیر بہادر کو آج تنظیم کے نو منتخب ارکان کے بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کرنا تھی۔

"اس کالی بھیڑ کا سراغ مل گیا شاہین!" شیر بہادر نے مجھے میرے تنظیمی نام سے مخاطب کیا۔

"کون ہے وہ؟" میں نے فوراً سوال کیا۔

"اس کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے شاہین! کیوں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔" شیر بہادر بولا "میں معذرت خواہ ہوں کہ کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔"

"نہیں شیر بہادر' اس میں معذرت کی کوئی بات نہیں۔ ہاں میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تمہیں اس کی غداری کا ثبوت مل گیا تھا یا نہیں؟"

"شیر بہادر نے میری موجودگی میں عین اس وقت اسے گولی ماری جب وہ کیتھی کی کار سے اتر کر اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔" اس بار شیر بہادر کی بجائے دلاور نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"اور کیتھی؟" میں نے پوچھا۔

"افسوس کہ وہ بچ کر نکل گئی۔" شیر بہادر نے بتایا' پھر مجھے بقیہ تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

دلاور نے دو نئے ارکان پر اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ گزشتہ تین روز سے دلاور اور شیر بہادر انہی دونوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ آج شام ہی انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ نوجوان کیتھی کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوگیا تھا۔ دلاور کو اس پر شک اس لیے ہوا تھا کہ کچھ دنوں سے اس کی جیبیں بھری ہوئی رہنے لگی تھیں جب کہ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ شک کی دوسری وجہ یہ تھی کہ خفیہ کے ہتھے چڑھ جانے والے ہمارے دونوں ساتھی اسی نوجوان کے قریبی عزیز تھے۔ انہی دونوں کے ایما اور سفارش پر اس نوجوان کو تنظیم کا رکن بنایا گیا تھا۔

ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ بخت خاں اور تیتو میر بھی آگئے۔

لاہور میں وہ دن ہمارے لیے خوش قسمتی کا تھا کیوں کہ بخت خاں نے جارج کے ٹھکانے کا سراغ لگالیا تھا۔

بخت خاں بہت پرجوش تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "شاہین! ہم آج ہی رات اسے بھی ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔"

"نہیں" میں نے انکار کردیا "ہمیں کم از کم دو تین روز تک قطعی خاموش رہنا ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ ہمیں لاہور آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں! یہاں آنے کے دوسرے دن سے ہم نے اپنے کام کا آغاز کیا ہے۔ یوں

گویا ہمیں آج پورے تین دن ہوئے ہیں۔ ان تین دنوں میں حکومت کے لیے تین لاشوں کا تحفہ کافی ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"تین لاشیں؟" بخت خاں حیران ہو کر بولا۔

"ہاں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "ایک لاش ان کے مخبر کی اور دو لاشیں خود خفیہ والوں کی جو آج ہی شام میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

پھر میں نے اس طرح اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بیان کیا کہ میرے ساتھیوں پر میری پراسرار قوتوں کا راز نہ کھلے۔

○☆○

وطن پرست تنظیم کے سوچنے والے دماغ چودھری عنایت سے میری ملاقاتیں جاری رہیں۔ میں انہی کے توسط سے پنجاب کے ان سرکردہ سیاسی لیڈروں سے ملا جو اس خطے کی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اب مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہوئی کہ مجاہد اول ارضِ پنجاب کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا اور اس نے مجھے فی الحال اسی خطے میں رہنے کا مشورہ کیوں دیا تھا! چودھری عنایت نے ان رہنماؤں سے میرا تعارف علی گڑھ کے ایک پُرجوش طالب علم کی حیثیت سے کرایا تھا۔

لاہور میں پولیس' خفیہ اور انگریز انتظامیہ تین افراد کے قتل کا خلاف توقع کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ لائل پور (فیصل آباد) کی طرح یہاں بھی بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے گی' پولیس جگہ جگہ چھاپے مارے گی اور ظاہر ہے کہ اس دوران میں پولیس سے روایتی حماقتیں سرزد ہوں گی' مگر ایسا نہیں ہوا۔ نتیجتاً میں نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ تشکیل دیا تھا اسے بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔ کیتھی اور جارج اس معاملے میں کمال ہوشیاری دکھا گئے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ وہ لائل پور (فیصل آباد) والی کہانی یہاں دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا تھا۔ ہماری تنظیم نے اس کی ذمے داری قبول کی تھی۔ لاہور میں بھی اسی نوعیت کے واقعات کا مطلب حکومتِ پنجاب کی بدنامی پر منتج ہوتا۔ ملتان مہم کی ناکامی کا بدلہ میں نے لائل پور (فیصل آباد) میں لے لیا تھا۔ تین افراد کی قتل کی دہشت انگیز کارروائی پر انتظامیہ کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ ہونا میرے لیے حیران کن ہی تھا۔

جارج کا قتل بھی انتظامیہ کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن مجھے اس سے پہلے ہی ایک موقع مل گیا۔ شاہ عالمی والا واقعہ اسی کے نتیجے میں رونما ہوا۔

اس شام مجھے شیر بہادر حسبِ معمول شہر کی رپورٹ دے رہا تھا "وہ اپنے آپ کو کوئی (شاعر) کہتا ہے اور ہے تک بند!" شیر بہادر نے بتایا۔

شیر بہادر سے میں اس شخص کے بارے میں تفصیلات معلوم کر رہا تھا جس کا نام اس نے دھرم ویر بتایا تھا۔ بخت خاں اور تیتو میر بھی میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ کسی میٹنگ کے بجائے ہم چاروں ساتھی اس وقت دوستانہ فضا میں گفتگو کر رہے تھے۔

تیتو میر اپنے مزاج کی شگفتگی کے سبب شیر بہادر کی بات سن کر بول اٹھا "بتا یار بخت خاں اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ دینے کا مجاز ہے میرے بھائی! یہ شعبہ تمہارا نہیں بخت خاں کا ہے' وہ مذکورہ شخص کے بارے میں سراغ لگائے کہ وہ شاعر ہے یا تک بند!"

"بھائی توتا کہانی! میرا خیال ہے کہ تک بندی کا اندازہ لگانے کے لیے کسی شخص کا شاعر ہونا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ تیتو میر کو چھیڑنے کی خاطر عموماً میں اسے "توتا کہانی" کہتا تھا۔ یہ لقب میں نے اسے جلالی کی مہم میں دیا تھا۔

"لیکن شاہین' تم اس شخص میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟" بخت خاں نے مجھے مخاطب کیا "ایسے نہ جانے کتنے تک بند لاہور میں ہوں گے۔"

"بخت خاں! برادرِ عزیز' تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ میں گزشتہ کئی روز سے اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔"

"یعنی اس میں کوئی مسئلہ بھی درپیش ہے؟ تم اس شخص کی تک بندی کو مسئلہ بنانا چاہتے ہو؟" تیتو میر نے پھر مداخلت کی۔

"میں اسے مسئلہ نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس شخص کی تک بندی بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔ اس کی تک بندی کیا گل کھلا رہی ہے تم اگر شیر بہادر سے معلوم کر لو تو ہوش اڑ جائیں گے تمہارے!" میں تیتو میر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تو پھر فی الفور ہوش اڑائے جائیں' مابدولت ہمہ تن گوش ہیں۔" تیتو میر نے ہنس کر کہا۔

پھر جب میرے کہنے پر شیر بہادر نے اس ہندو شاعر کی تک بندی کے بارے میں بتایا تو واقعی تیتو میر کے ہوش اڑ گئے۔

"اگر ایسا ہے تو۔ تو پھر اس حرام زادے کو سزا دینا بے

حد ضروری ہے۔" تیتو میر پرجوش نظر آنے لگا "اور یہ سزا' سزائے موت سے کم نہیں ہونا چاہیے!"

بخت خاں کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا "تم کیا کہتے ہو؟ کیا تیتو میر کی رائے سے تم بھی متفق ہو؟"

"میں دراصل یہ سوچ رہا ہوں شاہین کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کوئی بلا سبب تو آگ سے نہیں کھیل سکتا۔" بخت خاں نے اظہارِ خیال کیا "یہ تو خود دھرم ویر کو بھی معلوم ہوگا کہ اس کی تک بندی سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔"

"اس اہم نکتے پر کل سے میں بھی غور کر رہا ہوں اور ایک نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔" میں نے کہا "اس کی دیدہ دلیری کا مطلب صرف یہ ہے کہ کوئی اس کی پشت پناہی کر رہا ہے' کوئی ایسا ذمے دار شخص جس پر دھرم ویر کو پورا بھروسا ہے۔ بھروسا ان معنوں میں کہ اگر مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اسے دیدہ دلیری ہی کہا جا سکتا ہے کہ عین اس وقت جب مسجد وزیر خاں میں باجماعت نماز ہوئی' یہ کل مغرب کا واقعہ ہے۔ تو مغرب کی نماز کے وقت دھرم ویر اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک کے گلے میں ڈھولک لٹک رہی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ دھرم ویر اور اس کی منڈلی نے دل آزارانہ اشعار گانا شروع کر دیے۔ شیر بہادر! تم بخت خاں اور تیتو میر کو بھی اس واقعے کی تفصیل بتاؤ۔"

"پہلی دل آزارانہ بات تو یہ ہے کہ وہ کمینہ اپنی تک بندی کو نعوذ باللہ وحی کہتا ہے۔ شاہ عالمی ہی میں اس حرام زادے کی دکان ہے کپڑے کی۔ اس کی دکان پر عموماً ہندو غنڈوں کی بھیڑ بھی رہتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھار وہ ڈھولک بجاتا ہوا نکلتا ہے اور اس ٹولی کو "دھرم منڈلی" کہتا ہے۔" شیر بہادر تفصیلات بیان کرنے لگا "پہلے بھی کبھار جب اسے شرارت سوجھتی تھی تو وہ اپنی ٹولی کے ساتھ دن کے وقت بازار میں گاتا بجاتا ہوا نکل آتا تھا۔ دوسرے دکانداروں اور امن پسند لوگوں نے کئی بار اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا' مگر وہ نہیں مانا۔ اصل مسئلہ اس کے اشعار ہی ہیں۔ ان اشعار میں وہ مسلمانوں کا کھلے عام مذاق اڑاتا ہے۔ اپنی اس تک بندی کے متعلق وہ یہ کہتا پھرتا ہے کہ آسمان سے ایک فرشتہ اترتا ہے اور وہ مجھے یہ اشعار سکھاتا ہے۔ اپنے ان اشعار کو وہ "دھرم کوتائیں" کہتا ہے۔

ان میں سب سے افسوس ناک امر یہ ہے کہ وہ ہمارے بزرگانِ دین اور فاتحین کو بھی نہیں بخشتا' جو چاہتا ہے بکواس کرتا ہے۔ کل تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس کی دکان کے پچھلے حصے میں بھنگ گھوٹی گئی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے خوب بھنگ پی' پھر وہ اور اس کے ساتھی ڈھولک کی تھاپ پر گاتے بجاتے نکلے۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور نمازی مسجد وزیر خاں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ حرام زادہ بھی اپنی منڈلی کے ساتھ مسجد کی طرف بڑھ آیا۔ پھر ادھر نماز شروع ہوئی ادھر دھرم ویر اور اس کے ساتھیوں نے زور زور سے گانا شروع کر دیا۔ اشعار یا تک بندی وہی تھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ نماز ختم ہونے سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے چمپت ہو گیا۔"

"ظاہر ہے کہ اس کی یہ ذلیل حرکت نمازیوں کو انتہائی ناگوار ہونا چاہیے۔" تیتو میر بولا "بازار والوں نے آج اس کی خبر نہیں لی؟"

"کیوں نہیں!" شیر بہادر نے جواب دیا "آج دوپہر تو جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لوگوں نے گزشتہ روز کی حرکت پر اس سے جواب طلبی کی تو وہ بولا کہ اب تو میں روز یہی کروں گا جسے روکنا ہے مجھے روک کے دکھائے! اسی پر بات بڑھ گئی۔ اسے پہلے سے اندازہ تھا کہ لے دے ہوگی اس لیے اس نے ہندو غنڈے دکان پر جمع کر رکھے تھے۔ اس کی دیدہ دلیرانہ جواب کی وجہ سے وہ لوگ سخت مشتعل ہو گئے جو اسے سمجھانے گئے تھے۔ نوبت باقاعدہ جھگڑے تک پہنچ جاتی کہ بازار کے کچھ بزرگ ہندوؤں نے دھرم ویر کی طرف سے معافی مانگ لی۔ یوں یہ بلا ٹلی۔"

"شاہین! تم نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے کوئی سوچی سمجھی سازش بھی ہو سکتی ہے۔" بخت خاں نے مجھے متوجہ کیا۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔ کوئی بھی بڑا جھگڑا ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔ تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ دھرم ویر کا یہ فعل انفرادی نہیں ہے۔"

"بالکل!" بخت خاں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا' پھر کہنے لگا "اس واقعے کو سرسری طور پر نہیں سمجھنا چاہیے۔ لاہور میں یہ ہندو مسلم فساد کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر واقعی یہ کوئی سازش ہے اور انگریز انتظامیہ لاہور میں ہندو مسلم فساد کی راہ ہموار کر رہی ہے تو ہمیں کوئی بھی قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ میں یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ مجاہد اول نے ہمیں ملتان اسی لیے بھیجا تھا کہ ہم ہندو مسلم فساد نہ ہونے دیں' یہ الگ بات کہ ہماری مہم ناکام رہی اور

وہاں فساد ہو کر رہا۔ اس معاملے میں تنظیم کی مداخلت کا مطلب یا نتیجہ ہندو مسلم فساد کی صورت میں نکل سکتا ہے۔"

بخت خاں غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے امکانات یقیناً تھے مگر وہ ایک بات بھول رہا تھا۔ میں نے اسی کی طرف بخت خاں کی توجہ مبذول کرائی "فرض کرو' ہم اس معاملے میں نہیں پڑتے' تو کیا اس طرح جو ہونے والا ہے وہ نہیں ہوگا؟"

"ہم اسے روکنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں!"

"اسی طرح جیسے ملتان میں ہم نے کوشش کی تھی۔ بخت خاں؟"

"نہیں' کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیا؟"

"سوچنا پڑے گا کوئی راستہ!" بخت خاں پر فکر انداز میں بولا' بہرحال یہ معاملہ ہے نازک! اگر اس کے پیچھے واقعی کوئی سازش ہے تو۔ تو پھر آج ہی سے حکومت کے ایجنٹ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں گے۔ اس واقعے کو بڑی آسانی سے بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔"

"تم نے ایک بات اور نظر انداز کر دی ہے بخت خاں!" میں بولا "وہ یہ کہ اس طرح کے واقعات سے ہندو شرپسند عناصر کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ دوسری طرف اس سے یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں بے حسی اور بددلی پھیلے گی' اگر ایسے واقعات کو نہ روکا گیا!"

"لیکن روکنے کا مطلب۔"

"ٹکراؤ ہوگا نا؟ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟"

"ہاں"

"ہماری پوری کوشش یہی ہوگی کہ یہ ٹکراؤ ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار نہ کرے' لیکن میں تیتو میر کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں بخت خاں کہ دھرم ویر کو اس کی گستاخیوں کی سزا ضرور ملنا چاہیے!" میری آواز آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پرجوش ہو گئی "یار ہم بے غیرت تو نہیں ہیں نا کہ سب کچھ خاموشی سے سنتے اور برداشت کرتے رہیں' صرف اس لیے کہ کہیں ہندو مسلم فساد نہ ہو جائے یہاں!"

ہرچند کہ ہم ساتھیوں کے درمیان دوستانہ ماحول ہی میں گفتگو ہو رہی تھی مگر وہ سبھی تنظیم میں میری حیثیت سے بھی واقف تھے۔ ان کے علم میں تھا کہ میں کوئی بھی قدم اٹھانے یا فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوں۔ شاید بخت خاں نے اسی لیے مزید بحث نہیں کی۔ ہاں مجھے چند مشورے ضرور دیئے۔ اسی کے مشورے پر میں نے یہ بات مان لی کہ دھرم ویر کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور یہ معلوم کیا جائے' اس کی ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے! یہ کام شیر بہادر کے سپرد کر دیا گیا۔ روز و شب دھرم ویر کی نگرانی کے لیے کم از کم چار ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ شیر بہادر یہ کام مقامی تنظیمی ساتھیوں میں کسی کے ذمے بھی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بخت خاں ہی کا مشورہ بھی میں نے قبول کر لیا کہ میں بہ ذاتِ خود بھی دھرم ویر سے مل کر اسے ٹٹولنے کی کوشش کروں اور اندازہ لگاؤں کتنے پانی میں ہے!

دوسرے ہی دن ہندوؤں کے مخصوص لباس میں تیتو میر اور میں شاہ عالمی پہنچ گئے۔ آدمی کا چہرہ مہرہ' لباس' اندازِ گفتار اور آواز بھی اس کے کردار کو بڑی حد تک سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے دھرم ویر کو ایک نظر دیکھ لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس کی دکان مسجد وزیر خاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شیر بہادر نے کپڑے کی اس چھوٹی دکان کی نشان دہی کر دی تھی اور لوٹ گیا تھا۔ وہاں جانے کا میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ محل وقوع سے آگاہی ہو جائے۔

ہم دونوں گاہک بن کر اس کی دکان پر پہنچ گئے اور کپڑا دیکھنے لگے۔ کپڑا تو ہمیں خریدنا نہیں تھا' ہم تو اسے قریب سے دیکھنے اور ممکن ہو تو چند جملوں کا تبادلہ کرنے آئے تھے۔ اس وقت دکان پر وہ اکیلا ہی تھا۔ ویسے بھی دکانیں کھلے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔

کپڑا دیکھتے ہوئے میں کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ شراب کا عادی ہے۔ ماتھے پر بڑا سا نمایاں قشقہ (تلک' ٹیکا) اس کا ثبوت تھا کہ وہ خود کو مذہبی ظاہر کرتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کے چہرے کی بناوٹ سے پتا چلتا تھا کہ وہ بڑا کائیاں ہے۔ جس کا اظہار بھی اس نے ذرا ہی دیر میں کر دیا۔

یوہنی کا وقت ہے' کچھ لینا دینا ہے تو لو ورنہ رستہ لو۔ منہ بنا کر بولا "یہ دکھاؤ' وہ دکھاؤ! تمہیں چاہیے کیا آخر؟"

میں اسے محض تپانے کی خاطر بولا "تمہاری دکان پر ڈھنگ کا کپڑا ہی نظر نہیں آ رہا تو خریدیں کیا! ہم تو یہ سوچ کر ادھر آ گئے تھے کہ چلو اپنے ہندو بھائی کی دکان ہے اسی کا فائدہ ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ تو یہاں مسلوں کی دکانیں بہت ہوں گی۔"

میری بات پر تپنے کے بجائے اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ یہ اثر یقیناً میرے آخری الفاظ ہی کا تھا۔ میں نے دانستہ "مسلوں" کا لفظ استعمال کیا تھا جو عموماً متعصب ہندو بہ طور تضحیک مسلمانوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔

"تم لوگ اپنی بولی سے ادھر کے تو نہیں لگتے!" اس کا انداز تصدیق طلب سا تھا۔

"ہاں ہم یوپی سے یہاں آئے ہیں پر تمہیں اس سے کیا!" یہ کہہ کر میں تیتو میر سے مخاطب ہوا "چل بھئی رام پرشاد کسی میلے کی دکان ہی پر چلتے ہیں' یہاں اس شہر میں تو ہر طرف یہی دکھائی پڑتے ہیں۔ اپنے یوپی میں ایسا نہیں۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو تم لوگ!" دھرم ویر جلدی سے بولا "کپڑا شپڑا لینا نہ لینا' گل تو کرو بادشاہو! دسو یوپی دا کی حال اے؟ تسی غلط کہہ رہے او اتھوں دی ناک دی وچ نکیل پاہ دی اے!" وہ آدھی اردو آدھی پنجابی ٹھوکنے لگا۔

"چھوڑو جی!" میں نے ہنس کر اس کے لہجے کی نقل اتاری "ادھر کچھ نہیں ہونا۔ ہم نے یوپی میں مسلوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ کیوں رام پرشاد؟" میں نے تیتو میر سے تائید چاہی۔ مقصد دھرم ویر کو بانس پر چڑھانا تھا۔

تیتو میر فوراً میری تائید میں آہستہ سے ہنس کر بولا "ہاں جی! انہیں کیا بتانا' کہاں الہ آباد کہاں لاہور! وہاں ہمارا پلہ بھاری ہے اور یہاں مسلوں کا! قدم قدم پر تو یہاں مسجدیں ہیں' مندر تو بس نام کو ہیں۔ یہی سامنے مسجد نظر آ رہی ہے۔"

بس پھر کیا تھا' دھرم ویر چڑھ گیا بانس پر! اور بکارنے لگا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور مجھ سے بولا "یہ پریمی سے کیا مطلب ہے؟ کیا تم کوئی کوی ہو۔"

"نہیں" میں نے کہا "میں اپنیاس (ناول) لکھتا ہوں۔"

"اور اسی کو بتا کیں کہتے ہیں۔" اس کا سینہ پھولنے لگا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ اپنی "بکواس" سنانا شروع نہ کر دے فوراً ہی کہہ دیا "مجھے کویتا سننے کا کوئی شوق نہیں۔ کویوں اور شاعروں وائروں کو میں زیادہ پسند نہیں کرتا' بے پر کی اور بے مقصد ہانکتے رہتے ہیں۔"

"مگر میری کویتاؤں کا ایک خاص مقصد ہے۔" پھر وہ مقصد بیان کرنے لگا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اس کے باوجود بھی "اچھا" کہہ کر میں نے اظہارِ حیرت ضرور کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا "ٹھہرے کہاں ہو تم لوگ؟"

"کیوں' کیا پکڑوانا ہے ہمیں؟" تیتو میر نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔

"یہ بات نہیں یار جی! میں تو تم لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ہم بھی یہاں دب کے نہیں رہتے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے تو کل شام کو ادھر آ جانا۔ میں نے مسلوں کی چھاتی پہ مونگ دلنے کے لیے ایک دھرم منڈلی بنائی ہے۔" دھرم ویر بڑکیں مارنے لگا اور ہمیں انجان جان کر اپنی "دھرم منڈلی" کا حالیہ "کارنامہ" بیان کرنے لگا جو پہلے ہی ہمارے علم میں تھا۔

"اتنے ویر (بہادر) نہ بنو دھرم ویر جی' دھر لیے جاؤ گے کسی روز!" میں نے دانستہ پانسا پھینکا کہ وہ کھلے۔

میری بات پر وہ زور سے ہنس پڑا۔ جیسے میں نے انتہائی احمقانہ بات کہہ دی ہو' پھر کہنے لگا "او جی چھڈو! کوئی ماں دا لال انکھ نئیں اٹھا سکدا! اتھوں ساڈا اوڑا ٹیکا اے۔"

"کیوں' آنکھ نہیں اٹھا سکتا' تم کیا شہر کوتوال لگے ہوئے ہو؟" تیتو میر نے اسے مزید بولنے کی شہ دی۔

معلوم نہیں اس بدذات نے کیسے یہ تاڑ لیا کہ ہم دونوں اسے بانس پر چڑھا رہے ہیں یا پھر اجنبیوں کے سامنے کچھ منہ سے نہیں پھوٹا' بات کو بس ہنس کر ٹال گیا۔ ہم اتنی دیر اس کی دکان پر بیٹھے تھے اور اسے اپنی طرف سے کسی شبے میں مبتلا بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے اوڑھنے کے لیے ایک چادر خرید لی۔ چلتے وقت اس نے آیندہ روز شام کو آنے کی ہمیں پھر دعوت دی۔ اس نے شام چار اور ساڑھے چار بجے کے درمیان ہم سے آنے کو کہا تھا۔

ہمارا وہاں آنا ان معنوں میں سود مند رہا تھا کہ ہمیں آیندہ روز وہاں برپا ہونے والے ہنگامے کا علم پہلے ہی سے ہو گیا تھا۔ واپسی میں میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس روز رات گئے تک میں نے دھرم ویر کے قتل کا منصوبہ ترتیب دے لیا۔ اس منصوبے سے میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"کل اس دریدہ دہن کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔" میں نے سونے سے پہلے بخت خاں کو مخاطب کیا تھا۔ جو میرے ہی کمرے میں برابر والی چارپائی پر دراز تھا۔

"انشاء اللہ" بخت خاں نے پرعزم لہجے میں جواب دیا تھا۔

دوسرے روز وقت مقررہ پر میں اور میرے ساتھی شاہ عالمی پہنچ گئے۔ دھرم ویر نے ہمیں چار سے ساڑھے چار بجے شام کا وقت دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ بھی ہونا تھا' شام ساڑھے چار بجے کے بعد ہی ہونا تھا۔ گزشتہ دن کی طرح آج میرے جسم پر کافروں کا لباس نہیں تھا' نہ تیتو میر یا میرے دوسرے ساتھیوں نے ایسا کیا تھا۔ پستول ہم چاروں ہی ساتھیوں کے پاس موجود تھے مگر ہم نے بہ مجبوری ہی ان کے استعمال کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم چاروں دو دو کی ٹکڑیوں میں

آگے پیچھے چل رہے تھے۔ آگے آگے شیر بہادر کے ساتھ تیتو میر تھا اور چند قدم کے فاصلے سے میں بخت خاں کے ساتھ ساتھ تھا۔ بازار کا ایک پھیرا لگا کر ہم دھرم ویر کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ اس وقت ساڑھے چار بجنے والے تھے۔ دھرم ویر کی دکان میں ہمیں تین چار ہٹے کٹے ہندو نظر آئے جو اپنے چہروں اور لباس ہی سے غنڈے نظر آ رہے تھے۔ دکان کے باہر ایک مونڈھے پر پتلا دبلا ایک تلک دھاری (ماتھے پر ٹیکا لگانے والا) شخص نظر آیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی جسے آدمی وہ جسم کے نچلے حصے پر باندھے ہوئے تھا اور آدمی جسم کے بالائی حصے پر اوڑھ رکھی تھی۔ داڑھی اور سر کے لمبے بالوں کی وجہ سے وہ سادھو قسم کی کوئی شے معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے پیروں میں کھڑاؤں تھے اور گود میں ڈھولک رکھی تھی۔ اس شیطان صورت ڈھونگیے کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ سو فیصدی درست تھا۔ دھرم ویر آج بھی نماز کے وقت اپنی کمینگی دکھانے والا تھا۔

اسی دن صبح مجھے شیر بہادر نے یہ اطلاع دی تھی کہ دھرم ویر گزشتہ رات ایک باا‌ثر ہندو سیٹھ سے ملا تھا۔ سرکاری حلقوں میں اس ہندو سیٹھ کی رسائی تھی اور اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لاہور کے سیاسی بازی گروں سے بھی سیٹھ کے مراسم تھے۔ سیٹھ حکم چند اور دھرم ویر کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور دونوں میں کیا قدر مشترک تھی، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا، لیکن دھرم ویر کی نگرانی کرنے والے ہمارے ساتھیوں نے اتنا بھی سراغ لگا لیا تھا تو بہت تھا۔ اس سے کم از کم مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ دھرم ویر کی پشت پر کون ہے اور اس ڈوری کا سرا کہاں سے ہلایا جا سکتا ہے! لاہور کے سرکاری حلقوں سے سیٹھ حکم چند کے تعلقات میرے لیے ایک واضح اشارہ تھے۔ دھرم ویر اسی کھونٹے پر اچھل رہا تھا۔

ہم گزشتہ روز بھی یہاں آئے تھے مگر پولیس والوں کو نہیں دیکھا تھا مگر آج ایسا نہیں تھا۔ بازار میں کئی جگہ اور خاص طور پر مسجد وزیر خاں کے آس پاس آج پولیس والے نظر آ رہے تھے اور یہ بات خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔

جس وقت ہم ٹہلتے ہوئے مسجد کے قریب پہنچے تو بخت خاں نے مجھ سے سرگوشی کی "اس حرام زادے نے تو پہلے ہی سے خاصا بندوبست کر رکھا ہے۔"

"ہاں، میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا "اب ہمیں بہت محتاط اور چوکنا رہنا پڑے گا۔ کام دکھاتے ہی یہاں سے ہوا ہو جانا ہے۔"

عصر کی اذان ہوئی تو ہم چاروں ساتھی کچھ ہی دیر کے بعد دیگرے مسجد میں داخل ہو گئے۔ اسی وقت دور ڈھولک کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ دھرم ویر کی اس کی دکان سے روانہ ہو چکی ہے۔ جو لوگ وضو کر جماعت کھڑی ہونے کا انتظار کر رہے تھے، ان کے چہرو تناؤ نظر آنے لگا۔ دکانیں بند ہونے کا ابھی وقت نہیں ہوا اس لیے مسجد میں خاصے نمازی تھے۔ ہم چاروں ساتھی کرکے دانستہ الگ الگ بیٹھے تھے۔ اسی کے ساتھ ہم خیال رکھا تھا کہ پچھلی صفوں میں رہیں۔ ڈھولک کی آواز رفتہ رفتہ بہت قریب آ چکی تھی۔ جماعت کھڑی ہونے میں ہی منٹ رہ گئے تھے کہ مسجد کے دروازے کی طرف سے ویر کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے الاپ لے کر آزارانہ تک بندی شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ پھاڑ پھاڑ کر اس کے اشعار دہرانے لگے اور ڈھولک زور سے بجنے لگی۔

جماعت کھڑی ہوئی اور اسی کے ساتھ ڈھولک کی اور شیطانی آوازوں میں شدت آ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے ویر کی ٹولی مسجد کے دروازے ہی پر جمی ہوئی ہے۔ سماعت سے جو الفاظ ٹکرا رہے تھے انہیں سن کر میرا جوش مار رہا تھا۔ بار بار میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ میری توجہ نماز ہی کی طرف رہے مگر مجھے اس میں کامیابی ہو رہی تھی۔ اتنے شور میں بھلا میں اپنی کوشش میں کا بھی کیسے ہوتا! وہاں پولیس موجود تھی، یہ میں اپنی آ سے دیکھ چکا تھا لیکن پولیس کی وہاں موجودگی کا سبب شرپسندوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ پولیس کی وہاں موجود تو ان کے حوصلوں کو اور بڑھا دیا ہو گا، میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے صبر کا امتحان لینا شروع کیا۔ بعد میں تو ہ نے اسے اپنا ایک مؤثر ہتھیار ہی بنا لیا تھا۔ جہاں انہیں برپا کرنا ہوتا وہ ایسی ہی حرکتیں کرنے لگتے۔ ہندو تاریخ میں متعدد مقامات پر ہندو مسلم فسادات کے واقعات کا ذکر موجود ہے۔ ایسے واقعات پھر ہندوستا تمام ہی علاقوں میں ہوئے۔ ذاتی طور پر لاہور میں مجھے اس کا تجربہ ہوا۔ یہ تجربہ میرے لیے سوہان روح تھا پڑھنا دوبھر ہو گیا۔ یقیناً یہی حال دوسرے نمازیوں کا بھی دھرم ویر کے بے تکے "اشعار" دل میں خنجر بن کر اتر تھے جن میں وہ کھلے عام ہمارے مذہب کا مذاق اڑا رہا تھا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سلام پھیرنے کے بعد جب پیش امام نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو اس وقت بھی ڈھولک کی تھاپ جاری تھی۔

جماعت میں بوڑھے بھی تھے اور میری طرح نوجوان بھی، ظاہر ہے کہ جو حال میرا تھا، سبھی کا تھا۔ غصے کے مارے سبھی کے چہرے تمتما رہے تھے۔

دعا مانگتے ہی بخت خاں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مختصر الفاظ میں بڑی پرجوش و مدلل تقریر کی۔ اس مختصر سی تقریر نے دھرم ویر کے خلاف نفرت اور غصے کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ نوجوانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھر مسجد کے دروازے کی طرف جھپٹ پڑے۔ انہی میں خود میں اور میرے دونوں ساتھی شیر بہادر اور تیتو میر بھی شامل تھے۔ بخت خاں سب سے پیچھے تھا۔

مسجد سے باہر آتے ہی مشتعل مجمع دھرم ویر منڈلی پر ٹوٹ پڑا۔ ایسے مواقع پر پولیس عموماً تماشائی کا کردار ادا کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ موقع پر موجود نہ ہو۔ مسجد سے نکلتے ہی میں نے خود اپنی آنکھوں سے آس پاس موجود پولیس والوں کو بھاگتے دیکھا۔ معاملہ اگر دو چار دس افراد تک محدود ہوتا تو شاید پولیس اپنا "فرض" ادا کرنے سے نہ چوکتی، مگر وہاں تو ایک ہجوم تھا وہ بھی مشتعل! پولیس والے یقیناً مسجد سے بلند ہونے والے نعرۂ تکبیر کو سنتے ہی وہاں سے کھسکنے لگے ہوں گے۔ انہوں نے شاید یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ وہ دھرم ویر کو نہ بچا سکیں گے۔

ڈھولکیا تو اسی وقت ریلس لگا گیا تھا جب اس نے نمازیوں کو مسجد سے نکلتے دیکھا تھا مگر ہندو غنڈے پٹے بغیر نہیں بھاگ سکے تھے۔ دھرم ویر بھی فرار ہونے کی فکر میں تھا، مگر وہ کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا! اس کا بلیک وارنٹ تو گزشتہ شب ہی جاری ہو چکا تھا۔ میں نے اور میرے دونوں ساتھیوں نے شروع ہی سے اسے نظر میں رکھا تھا۔ وہ ہم چاروں ساتھیوں کے نرغے میں آ گیا۔ ہم چاروں ہی کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے کراری دار بڑے چاقو تھے۔

دھرم ویر کے سینے پر پہلا وار میں نے ہی کیا تھا، دوسرا وار پہلو سے شیر بہادر نے کیا اور اس کا پیٹ چیر دیا۔

"ہے رام!" وہ گرتے گرتے چیخا۔

"مارو، مارو، مارو!" ہر طرف سے صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہم چاروں ساتھی ہی وہاں نہیں تھے بلکہ نماز پڑھ کر نکلنے والے دوسرے نوجوان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے بقیہ کام ان پر چھوڑ دیا۔ اصل کام ہم انجام دے چکے تھے۔ آخری وار اس پر بخت خاں نے کیا تھا۔ اس نے دھرم ویر کی گردن پر چاقو پھیرا تھا۔

پہلا وار کرتے ہی میں پیچھے ہٹ گیا اور اپنی جگہ ایک نوجوان کو دے دی تھی جو اسی ہجوم میں شامل تھا۔ خون آلود چاقو کو میں نے انتہائی سرعت کے ساتھ بڑے سے ایک رومال میں لپیٹ کر نیفے میں اڑس لیا تھا۔ ایسا ہی میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی کرنا تھا۔ پستول استعمال کیے بغیر ہی ہمارا کام چل گیا تھا کیوں کہ پولیس نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔ اگر پولیس مداخلت بھی کرتی تو دھرم ویر زندہ نہ بچتا۔ ہم اسے گولی مار دیتے۔

دھرم ویر کے قتل کا منصوبہ میں نے اس طرح ترتیب دیا تھا کہ قتل کا الزام کسی فرد واحد پر نہ آ سکے۔

ہمارے لیے یہ بھی مشکل نہیں تھا کہ خاموشی کے ساتھ دھرم ویر کو ٹھکانے لگا دیتے مگر اس سے وہ نتائج حاصل نہ ہوتے جو ہمارے پیش نظر تھے۔ ہم اس گستاخ کے قتل کو ہندوؤں کے لیے درس عبرت بنا دینا چاہتے تھے۔ اس نے جس طرح کھلے عام ہمارے مذہب کا مذاق اڑایا تھا، ہم بھی اسی طرح کھلے عام اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے تاکہ آئندہ کوئی متعصب ہندو ایسی ہمت و جرات نہ کر سکے۔

کوئی ایسا شخص جو نقص امن کا سبب بن رہا ہو، قانون اس کا ساتھ نہیں دیتا اور فیصلہ مفاد عامہ کے حق میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ شخص ہجوم کے ہاتھوں مارا جائے اور اس کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہ مل سکے تو عموماً ایسے کیسز داخل دفتر کر دیے جاتے ہیں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ کم از کم اس کیس میں ایسا نہیں ہو گا۔ انتظامیہ پے در پے حماقتوں کا ثبوت دے گی اور ہماری تنظیم کو اس کے خلاف مزید عملی اقدامات کا موقع مل جائے گا۔

انگریز نے آمر ہونے کے باوجود جمہوریت کا ڈھونگ رچا رکھا تھا اور انگریز ہی کیا ہر آمر کا یہی وتیرہ ہوتا ہے! ہمارا مقصد اس ڈھونگ کا پردہ چاک کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انتظامیہ اس سلسلے میں یک طرفہ کارروائی کرے گی اور بعد میں ہوا بھی یہی۔ میرے اندازے درست ثابت ہوئے۔ دھرم ویر کے قتل اور پولیس کی کارروائی نے بڑی حد تک انگریز کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیا۔ یہ ذکر میں بعد میں کروں گا پہلے اس روز کا پورا واقعہ بیان کر دوں۔

ہم چاروں ساتھی شاہ عالمی سے فرار ہو کر آگے پیچھے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے

پہلے ہم نے اپنے اپنے خون آلود چاقو دھوئے اور ان رومالوں کو جلا دیا جن میں چاقو لپٹے تھے۔ پھر شیر بہادر چائے بنالایا اور ہم چاروں ساتھی پیش آنے والے واقعے کے ردِ عمل پر گفتگو کرنے لگے۔ گفتگو کی ابتدا میں نے ہی کی "کیا خیال ہے بھائی بخت خاں' اس واقعے کو بہانہ بنا کر انگریز انتظامیہ لاہور میں بھی ہندو مسلم فساد کرادے گی یا نہیں؟"

"شاہین! میں نے تو پہلے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔" بخت خاں نے جواب دیا "اس کے امکانات سو فیصد ہیں۔"

"میرا خیال یہ ہے کہ گزشتہ سال اور اس وقت کے سیاسی حالات میں بڑا فرق ہے۔" شیر بہادر بولا "اس وقت تقریباً مسلمانوں کے سارے ہی صفِ اوّل کے لیڈر جیل میں تھے اور اب وہ جیل سے باہر ہیں۔"

"تمہاری مراد مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں سے ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں! انہیں رہائی ملے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ کم از کم اس موقع پر حکومت یہ نہیں چاہے گی کہ دوبارہ اس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو۔ پھر یہ کہ کوکاناڈا (مدراس) میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا ہے جس کے متعلق یہ خبر گرم ہے کہ مولانا جوہر اس اجلاس کی صدارت کریں گے۔ ایسے وقت میں حکومت ہندو مسلم فساد کرانے کی متحمل نہیں ہو سکتی' خواہ وہ فساد پنجاب کے کسی شہر میں ہو یا کسی اور صوبے میں۔"

شیر بہادر کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا مگر بخت خاں اور تیتومیر کی رائے ہم دونوں سے مختلف تھی۔ وہ شیر بہادر کے سیاسی تجزیے سے متفق نہیں تھے۔

لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوتا یا نہ ہوتا' ہمیں دونوں ہی صورتوں میں حالات پر پوری نظر رکھنا تھی۔ اس ضمن میں اسی روز میں نے ضروری اقدامات کے لیے احکام جاری کردیے۔ انہی احکام کے نتیجے میں دوسرے ہی دن صبح مجھے رپورٹ مل گئی کہ پولیس نے کیا قدم اٹھایا ہے!

پولیس نے گزشتہ رات ہی شاہ عالمی سے تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس میں المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام افراد کو قریبی تھانے کی حوالات ہی میں رات بھر قید رکھا گیا تھا۔ حوالات میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ گرفتار کیے جانے والے ڈیڑھ سو افراد کو اس میں رکھا جاتا پھر یہ کہ موسم گرمی کا تھا۔ پیاس کے مارے لوگوں کا برا حال ہوگیا اور آٹھ دس افراد گرمی اور پیاس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے۔ رات بھر لوگ پانی کے لیے چیختے چلاتے رہے مگر ان کی ایک

نہیں سنی گئی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی دھرم [illegible] قاتل نہیں تھا۔ وہ سبھی مظلوم اور بے گناہ تھے۔ کسی [illegible] ممکنہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے رات ہی کو میں [illegible] پوری تیاری کرلی تھی۔

ہاتھ سے لکھے ہوئے وہ چار بڑے بڑے پوسٹر تھے [illegible] چاروں ساتھیوں نے رات کو لکھے تھے۔ ان چاروں [illegible] عبارت ایک ہی تھی۔ یہ چاروں پوسٹر لاہور شہر میں [illegible] مقامات پر لگائے جانے تھے' وہ بھی دن کے اجالے میں [illegible] بہرحال یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان میں سے ایک [illegible] شاہ عالمی میں' دوسرا پولیس ہیڈ آفس کی دیوار پر' تیسر[illegible] تھانے کی دیوار پر جہاں ڈیڑھ سو بے گناہ افراد کو قید رکھ[illegible] اور چوتھا پوسٹر سی آئی اے سینٹر کی دیوار پر۔

اس پوسٹر کی عبارت مقتول دھرم ویر کے خلاف [illegible] کی سی تھی۔ آخر میں وطن پرست تنظیم نے اس قتل کی [illegible] داری قبول کی تھی۔

"ایک شرپسند ہندو کے قتل ہونے پر ڈیڑھ سو مسل[illegible] کی گرفتاری انتظامیہ کی جانب داری کا ثبوت ہے۔"

سرخ روشنائی سے جلی حروف میں مندرجہ بالا ج[illegible] ان چاروں پوسٹروں پر لکھ دیا گیا۔

ہم چاروں ساتھی گزشتہ روز لوگوں کے سامنے [illegible] تھے اور بخت خاں نے تو مسجد وزیر خاں میں تقریر بھی [illegible] اس لیے یہ مجبوری مقامی ساتھیوں ہی کو یہ اہم کام [illegible] تھا۔ مجاہد' دلاور اور مظفر کے علاوہ ایک اور بااعتماد سا[illegible] سپرد میں نے یہ کام کیا۔

میں جلد از جلد بے گناہ لوگوں کی رہائی کا آرزو[illegible] لیکن اس غلط فہمی کا شکار بہرحال نہیں تھا کہ صرف ذمے داری قبول کرلینے سے بات بن جائے گی۔ انت[illegible] دباؤ ڈالنے کے لیے میں اور بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ [illegible] چند کا اغوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ مقامی ساتھیوں نے اسے میرے حکم پر گزشتہ شب ہی اغوا کر[illegible] سیٹھ کو موچی گیٹ کے ایک مکان میں رکھا گیا تھا۔

ہرچند کہ ان حالات میں میرا موچی گیٹ جانا [illegible] سے خالی نہیں تھا مگر مجھے وہاں جانا ہی تھا۔ بخت خا[illegible] تیتومیر کو وہیں چھوڑ کر میں شیر بہادر کے ساتھ موچی [illegible] روانہ ہوگیا۔

وہ مکان ایک تانگے والے کا تھا۔ جس میں سیٹھ کو اس کی بڑی سی حویلی سے اغوا کرکے لایا گیا تھا۔ [illegible] والے بشیر کی بیوی مرچکی تھی۔ دو بیٹیاں تھیں جو اپنے

ہوچکی تھیں۔ بشیر وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اب اس کے دکھ سکھ کی ساتھی صرف ایک گھوڑی تھی جسے وہ بڑے چاؤ سے بنا سنوار کر رکھتا تھا۔ اس کی ضروریات محدود تھیں جب دو وقت کی روٹی کا سہارا ہوجاتا تو وہ اپنے گھر لوٹ آتا۔ بالکل ان پڑھ ہونے کے باوجود بشیر روزے نماز کا بہت پابند تھا۔ اسے صرف چند آیتیں یاد تھیں اور نماز پڑھنا آتا تھا مگر اس کا ایمان بہت مضبوط تھا۔ لاہور میں تنظیم کے سابق نگراں دلاور کو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا۔ دلاور نے اس وقت بشیر کا ساتھ دیا تھا جب بشیر کی بیوی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ بہ راہِ راست تنظیم سے بشیر کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن کئی مواقع پر محض دلاور کی وجہ سے بشیر نے تنظیم کا ساتھ دیا تھا۔ دلاور نے مجھے اس کے بارے میں یہ ساری باتیں گزشتہ رات ہی بتادی تھیں اور میری اجازت و اطمینان کے بعد یہ طے پایا تھا کہ سیٹھ حکم چند کو اغوا کرنے کے بعد بشیر کے گھر میں رکھا جاسکتا ہے۔

شیر بہادر کے ساتھ جب میں موچی گیٹ کے اس مکان کے دروازے پر پہنچ کر رکا تو ادھر ادھر کا جائزہ لے کر شیر بہادر نے دروازے پر دستک دی۔

چند ہی لمحے بعد دروازے کی دوسری جانب سے قدموں کی چاپ ابھری اور دروازے کے قریب آکر رک گئی۔

"چراغ بجھادو!" شیر بہادر نے شناختی الفاظ ادا کیے۔ یہ وہ شناختی الفاظ تھے جو چند روز پہلے ہی مقرر کیے گئے تھے۔

"صبح ہونے والی ہے۔" اندر سے جواب ملا۔

دروازہ کھلتے ہی شیر بہادر اور میں نے اندر قدم رکھا۔ ایک مقامی تنظیمی ساتھی نے ہمارے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس کا تنظیمی نام نصرت تھا۔ بشیر روزی کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ سیٹھ حکم چند کو میرے ایما پر وہاں تنہا نہیں چھوڑا گیا تھا نصرت وہاں اس کی نگرانی کے لیے موجود تھا۔ ہم اندر پہنچ گئے تو نصرت نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

گھر کا صحن عبور کرتے ہوئے ہم تینوں ہی ساتھیوں نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپالیے۔ صحن کے بعد ہم ایک دالان سے گزر کر اس کمرے کے سامنے جاکر رک گئے۔ جس کا دروازہ مقفل نظر آرہا تھا۔ نصرت نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تالے کی چابی نکالی اور آگے بڑھ کر تالا کھولنے کے بعد کنڈی کھولی۔

سیٹھ حکم چند نے شاید کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے کسی ایسی جگہ رات بسر کرنا پڑے گی جہاں اس کے ناز

اٹھانے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ ٹوٹی ہوئی سی ایک چارپائی سے بندھا ہوا تھا اور چارپائی دیوار کے سہارے کھڑی تھی' منہ پر کپڑا بندھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کررہی تھیں۔ اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ معلوم نہیں' وہ کیا سمجھا کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"آنکھیں کھول دو سیٹھ حکم چند!" میں نے اس کی پھولی ہوئی توند پر پستول کی نال رکھ دی۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل میں آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"یہ پستول میں نے محض اس لیے نکالا ہے سیٹھ کہ تمہیں یقین ہوجائے تمہاری زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے' کوئی بھی لمحہ تمہاری زندگی کا آخر لمحہ ثابت ہوسکتا ہے۔ منہ سے کپڑا کھلتے ہی اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو اپنی موت کے ذمے دار خود ہوگے۔" میں نے یہ کہہ کر نصرت کو مخاطب کیا "اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دو اور دونوں ہاتھ بھی رسیوں کی گرفت سے آزاد کردو!" پھر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "یہ لو!" پستول میں نے کچھ سوچ کر شیر بہادر کو تھمادیا اور گراری دار رامپوری چاقو نکال لیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے میں نے دھرم ویر پر پہلا وار کیا تھا۔ یہ چاقو مجھے اس لیے زیادہ پسند آیا تھا کہ کسی شخص کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس کی گراریوں سے نکلنے والی آواز بڑا اہم کام انجام دیتی تھی۔ پستول میں یہ خوبی نہیں تھی۔ میں اس وقت سیٹھ حکم چند کو دہشت زدہ کرکے ہی اس کی زبان کھلوانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میرا مقصد اس سے ایک اعتراف نامے پر دستخط کرانا بھی تھا۔ اعتراف نامے کا مضمون میرے ذہن میں تھا۔ قلم اور کاغذ شیر بہادر ساتھ لایا تھا۔ زبان کھولنے کی صورت میں سیٹھ حکم چند کے اغوا سے کچھ اور بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ وہ فائدہ کیا ممکن تھا' اس کا انحصار سیٹھ کے بیان پر تھا۔

سرخ و سفید چہرے والا سیٹھ خاصا صحت مند تھا' سر پر مخصوص انداز کی سفید پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ گال اس حد تک پھولے ہوئے تھے کہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں گوشت اور چربی کے اندر دھنسی ہوئی سی تھیں۔ پیٹ بڑا' قد لمبا تھا۔ کریم کلر کا ریشمی کرتا اور سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا' گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی جو اس کی امارت کی نشانی تھی۔ پیروں میں خوب صورت کام والے پشاوری سینڈل تھے۔ اس کمرے میں خاصی بلندی پر ایک روشندان تھا جس سے ہوا

اندر آ رہی تھی اور دن کا اجالا بھی۔ دائیں جانب سلاخوں دار کھڑکی بھی تھی جسے بند کردیا گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے بھی اجالا اندر آ رہا تھا۔ پھر بھی کمرے میں گرمی تھی اور دھند لکا سا بھی۔ بشیر نے گھر کی فالتو اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں وہاں ڈال رکھی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کمرا عموماً بند ہی رہتا ہوگا اس لیے وہاں ہلکی سی بو بھی تھی۔ جو ایسی جگہ پیدا ہوجاتی ہے جہاں ہوا کا گزر نہ ہو۔ یہ کمرا بہرحال سیٹھ حکم چند کے شایان شان نہیں تھا۔ اس کی حویلی میں تو نوکر بھی اس سے اچھے کمروں میں رہتے ہوں گے، لیکن ہمیں اس کی پروا نہیں تھی۔ سیٹھ کی حیثیت ہمارے لیے ایک قیدی کی سی تھی۔

نصرت نے جب اس کے ہاتھ کھول دیئے اور منہ پر بندھا ہوا کپڑا بھی ہٹادیا تو وہ منہ کھول کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میری دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس نے چیخنے چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ چاقو دیکھ رہے ہو سیٹھ!" میں نے اسے مخاطب کیا اور پھر آہستہ آہستہ چاقو کھولنے لگا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ توقع کے مطابق اس کے چہرے پر دہشت کے آثار دکھائی دینے لگے "یہی چاقو میں نے دھرم ویر کے سینے میں اتارا تھا اور اسی سے میں تمہاری پھولی ہوئی توند میں بھری غلاظت باہر نکال کر پھینک سکتا ہوں۔ اس سے میں تمہارا دل بھی چھید سکتا ہوں اور اسے تمہاری موٹی گردن پر بھی پھیر سکتا ہوں مگر شاید تم زندہ رہنا چاہتے ہو بولو ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟"

شدت خوف سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے مگر بولنے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔

"سنو سیٹھ! ہم تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتے۔" میری آواز میں قدرے نرمی آگئی "تمہیں بہ حفاظت تمہاری حویلی میں پہنچا دیا جائے گا۔ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا جائے گا، مگر اس کی ایک شرط ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا۔ بولو!" اس کی زبان پہلی بار کھلی۔

"پانی پیو گے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا تو اس نے اقرار میں سر ہلادیا "پانی لاؤ!" مڑ کر میں نے نصرت سے کہا۔ نصرت پانی لینے چلا گیا تو میں پھر بول اٹھا "سیٹھ! ہم انسانوں کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور درندوں کے لیے موت کا پیغام بن جاتے ہیں۔ تم خود ہی ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اللہ کا نام لینے والوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے! کیا قصور ہے ان کا جو تم غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر ان کا جینا حرام کر رہے ہو؟ یہ غیر ملکی لٹیرے تو ایک دن یہاں سے چلے ہی جائیں گے۔ پھر اس دھرتی پر تمہیں اور ہمیں ہی رہنا ہے۔ ہم اور تم تو صدیوں سے یہاں ایک ساتھ رہتے آئے ہیں، پھر اب کیا ہوگیا؟ تم کیوں اس زمین پر فساد بو رہے ہو۔ تمہارے ہی عقیدے کے مطابق یہ دھرتی تمہاری ماں ہے۔ ہمارا تو عقیدہ نہیں ہے۔ ہم تو ساری زمین کو اللہ کی زمین کہتے ہیں، مگر کبھی ہم نے تمہارے عقیدے کو ٹھیس نہیں لگائی۔ تم نے دھرتی ماتا کہا تو ہم نے تمہاری دل جوئی کی خاطر تم سے رشتہ محبت و اخوت استوار رکھنے کی خاطر وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا اور تمہاری ہی آواز میں آواز ملا کر مادرِ وطن کہا۔ ہمارے خلوص کو تم نے ہمارا احساس کمتری سمجھا اور برتری کے جنون میں مبتلا ہوگئے! بولو کیا کبھی ہم نے تمہارے مذہب کا مذاق اڑا کر تمہاری دل آزاری کی؟"

اسی وقت نصرت پانی لے کر آگیا۔ سیٹھ حکم چند کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لیے پانی چھلکنے لگا۔ پھر نصرت نے اسے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔

"اب شاید تم بولنے کے قابل ہو سیٹھ!" چند لمحے بعد میں نے کہا "میرے سوالوں کے جواب دو اور یہ سمجھ کر جواب دو کہ غلط جواب دینے کی صورت میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ دھرم ویر سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ آخری بار پھر تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ جھوٹ بولنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا ورنہ صرف تم ہی قتل نہیں کیے جاؤ گے بلکہ تمہاری حویلی میں تمہارے خاندان کے ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔

"دھرم ویر سے میری دور کی رشتے داری تھی۔" سیٹھ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیا۔

"پرسوں رات وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ۔ وہ پولیس۔" سیٹھ حکم چند ہکلانے لگا۔

"بولو، رکو مت!" میں نے اسے ٹوکا "ہمیں خود بھی کچھ معلوم ہے، ہم صرف تصدیق چاہتے ہیں اور سنو! جو کچھ معلوم ہے اس سے تمہارے جھوٹ یا سچ کا اندازہ ہمارے لیے مشکل نہیں ہوگا، ہاں جھوٹ بول کر تم مشکل میں ضرور پڑ جاؤ گے۔"

"بازار والوں پر دھونس جمانے کے لیے وہ پولیس بندوبست چاہتا تھا۔"

"پھر تم نے یہ بندوبست کردیا، ہے نا؟"

اس نے گردن ہلائی۔

"کس سے بات کی تم نے اس کے لیے؟"

"ڈی آئی جی رابرٹ سے۔"

"ڈی آئی جی سے کیا کہا تم نے؟ کس لیے پولیس چاہیے؟ یہ بتایا تم نے اسے؟"

"ہاں بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟" میں اسے سوچنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے تابڑ توڑ سوال کیے جا رہا تھا۔

"یہ۔ یہی کہ۔" وہ پھر ہکلانے لگا "کہ دھرم ویر کیا۔ کیا کرنے والا ہے!"

"انگریز ڈی آئی جی کے علاوہ اور کس کس کے علم میں یہ بات تھی؟"

"اور۔ سبھی۔ ان سبھی کو معلوم تھا جو۔ جنہوں نے میرے ذریعے دھرم ویر کو رقم دی تھی۔"

"کون لوگ تھے رقم دینے والے؟"

"میری۔ میری ہی طرح دو۔ دو سرے ہندو سیٹھ اور۔ اور جاگیردار۔"

"کتنی رقم تمہارے ذریعے اب تک دھرم ویر کو دی گئی ہوگی؟"

"وہ۔ وہ اپنی کویتاؤں کی کتاب بھی چھپوانا چاہتا تھا۔ دس ہزار سے اوپر دیے ہوں گے اسے اور۔ اتنے ہی ابھی دینے تھے۔"

"تمہارا حصہ اس میں کتنا تھا؟"

"کل دو ہزار جس میں سے ایک ہزار میں دے چکا تھا۔"

"بقیہ دس ہزار روپے جو اسے دیے جانا تھے، وہ تمہارے ہی پاس تھے؟"

"نہیں ابھی چار ہزار ہی جمع ہوئے تھے، بقیہ لوگوں سے آج رقم ملنے والی تھی مگر اب۔ اب تو وہ۔ وہ مارا ہی گیا۔"

"مارا نہیں گیا بلکہ مار دیا گیا!" میرے لہجے میں سختی آگئی۔ پھر میں نے پوچھا "تم لکھنا پڑھنا تو جانتے ہوگے؟" اس نے اقرار میں سر ہلایا تو میں بولا "یہ تمام باتیں جو تم نے مجھے بتائی ہیں لکھ دو!"

"تم۔ تم کیا۔ اس کا کیا کرو گے؟" وہ گھبرانے لگا۔

"اگر تمہیں اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی عزیز ہے سیٹھ تو وہی کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔"

پھر سیٹھ حکم چند کو اعتراف نامہ لکھنا ہی پڑا۔ ابتدائی عبارت میں نے خود بول کر اس سے لکھوائی تھی۔

"اپنے ضمیر کے بوجھ سے مجبور ہو کر میں بہ قید ہوش و حواس یہ اعتراف کرتا ہوں کہ۔" بقیہ باتیں وہی تھیں جو وہ بیان کرچکا تھا۔

جب اس نے اعتراف نامے پر دستخط کردیئے تو میں نے اس سے کہا "اس سازش کا اعتراف کرنے کی صورت میں قانون تمہیں سلطانی گواہ کی حیثیت دے سکتا ہے، سنو! جب تمہیں عدالت میں طلب کیا جائے تو تم اس اعتراف سے پھرو گے نہیں۔ تم نے اپنے وکیلوں یا کسی اور کے بہکانے میں آکر اگر عدالت میں یہ بیان دیا کہ تم سے زبردستی یہ اعتراف نامہ لکھوایا گیا ہے تو عدالت ہی میں تمہیں گولی ماردی جائے گی۔ ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ اگر تم وہاں بھی کسی طرح بچ گئے تو بھی زندہ نہیں بچو گے! تمہاری بچت کی صرف یہی صورت ہے کہ تم نے جو کچھ اعتراف نامے میں لکھا ہے، عدالت کے روبرو بھی وہی کہو گے۔ اس کے علاوہ چار ہزار روپے کی وہ رقم بھی ہمارے آدمیوں کے حوالے کردو گے جو دھرم ویر کو دی جانا تھی۔"

"مم۔ مگر وہ۔ وہ لوگ جنہوں نے یہ رقم میرے حوالے کی تھی اب۔ اب دھرم ویر کے قتل کے بعد رقم واپس مانگیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے!" میں چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ایسی صورت حال میں بھی وہ ہوس زر کا شکار تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا "تو پھر یہی بہتر ہے سیٹھ کہ تم دوسرے سیٹھوں کی رقم واپس کردینا۔ بیس ہزار کی رقم تو خود تمہارے لیے بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ تم خود اپنے پاس سے بھی ہماری تنظیم کا مطالبہ پورا کرسکتے ہو۔ تم نے شاید ایک محاورہ سنا ہو کہ سیانا کوا ہمیشہ گو کھاتا ہے۔ اس وقت تم نے بھی سیانا بننے کی کوشش کی ہے اور یہ بھول گئے کہ تم مجرم ہو اور اپنے جرم کا اعتراف کرچکے ہو۔ ہر جرم کی کوئی نہ کوئی سزا ضرور ہوتی ہے تم نے اور تمہارے ہم مذہبوں نے بلا سبب ایک کمینے شخص کی مالی امداد صرف اس لیے کی کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کا مذاق اڑائے، ان کے بزرگوں کی شان میں گستاخی کرے، دل آزاری کا سبب بنے۔ اس شخص کو تو سزا مل گئی جس نے براہِ راست یہ جرم کیا تھا مگر اس کے جرم میں تم اور دوسرے ہندو سیٹھ بھی برابر کے شریک تھے جواب دو ایسا ہی تھا؟"

سیٹھ حکم چند کا سر جھک گیا اور یہ جھکا ہوا سر ہی میرے سوال کا جواب تھا۔

"ہم لوگ اور اس شہر کی انتظامیہ بھی اس جرم میں شریک تھی۔ انتظامیہ کے ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کو علم تھا کہ کیا ہونے والا ہے، مگر اس نے مجرموں کو گرفتار کرنے کے بجائے ان کی پشت پناہی کی، انھیں تحفظ فراہم کرنا چاہا۔ انتظامیہ سے تو خیر ہم نمٹ لیں گے اور اسے نمٹ رہے ہیں مگر تم لوگوں کو کیوں معاف کر دیں! تمھیں اور تمہارے دوسرے ساتھیوں کو بھی جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ صرف چار ہزار جرمانہ کافی رہے گا، لیکن اب جرمانے کی رقم تمہاری کج بحثی کے بعد دس ہزار مقرر کی جاتی ہے۔ یہ وہی رقم ہے جو تم اور تمہارے ساتھی سیٹھ، دھرم دیر کو ادا کرنے والے تھے۔ اب تم یہ رقم ہماری تنظیم کو ادا کرو گے۔" میں نے فیصلہ سنایا "ہم اس رقم کی ادائیگی کا ذمے دار تمھیں مقرر کرتے ہیں۔ تم اپنے ساتھی ہندو سیٹھوں سے چندہ کر کے یہ رقم جمع کرو یا پھر اپنے پاس سے ادا کرو، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ جرمانے کی رقم بہرحال تمھیں ادا کرنا ہوگی۔"

دس ہزار روپے کی رقم اس زمانے میں خاصی بڑی رقم کہلاتی تھی مگر سیٹھ تھم چند ایسے لوگوں کے لیے یہ رقم بہت معمولی تھی۔

رقم کی وصولیابی کے لیے تمہاری رہائی کے تیسرے دن وطن پرست تنظیم کا کوئی بھی رکن تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ تم اسے جرمانے کی رقم ادا کرنے کے پابند ہو گے! اسی کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا کہ جو لوگ تمھیں تمہاری حویلی سے اغوا کر کے یہاں لا سکتے ہیں وہ تمھیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔ تم نے یا تمہارے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اس سلسلے میں زبان کھولی یا اپنے بدیسی آقاؤں کی مدد لینا چاہی تو تمھیں ختم کر دیا جائے گا۔ تم اپنے ساتھیوں کو بھی یہ بات بتا سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر میں نصرت کی طرف مڑا "سیٹھ کو کچھ کھلایا پلایا؟"

"ابھی نہیں" نصرت نے بتایا "خود میں نے بھی ابھی ناشتا نہیں کیا۔"

"ہم یہاں موجود ہیں، تم بازار سے ناشتا لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے" وہ سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھا۔

میں نے شیر بہادر کو اس کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا تاکہ گھر کا دروازہ بند کر لے۔

وہ دونوں چلے گئے تو سیٹھ نے ڈرے ڈرے سے لہجے میں مجھ سے پوچھا "مجھے کب رہائی ملے گی؟"

"اس کا انحصار حالات پر ہے سیٹھ!" میں نے جواب دیا "اس میں دیر بھی لگ سکتی ہے اور یہ کام جلدی بھی ہو سکتا ہے۔"

"میری بچی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔ صرف وہی۔۔۔ وہی میری اکلوتی ہے۔" سیٹھ تھم چند ہکلانے لگا۔

"اور بیوی؟" میں نے پوچھا "اسے تمہاری کوئی فکر نہیں ہوگی؟"

"وہ ان دنوں اپنے بھتیجے کے ساتھ جالندھر گئی ہوئی ہے اپنے بیمار باپ سے ملنے۔"

"تمہاری بچی کی کیا عمر ہے؟ اسے ماں کے ساتھ کیوں نہیں بھیج دیا؟"

"اس کی تعلیم کا نقصان ہوتا۔ وہ۔۔۔ کم عمر نہیں بیس سال کی ہے۔"

"تمھیں اپنی ایک بچی کا اتنا خیال ہے سیٹھ کہ ایک رات گھر سے تمہارے غائب ہو جانے پر وہ رو رو کر پاگل ہو جائے گی جب کہ وہ کوئی بچی بھی نہیں ہے! معلوم ہے تمھیں کہ کل رات دھرم دیر کو قتل کرنے کے الزام میں پولیس نے کتنے لوگوں کو پکڑا ہے؟" پھر میں نے اسے تفصیل بتائی اور کہا "ان کی بھی بیٹیاں اور بیٹے ہوں گے، سوچو سیٹھ کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ انھیں تو حوالات میں ایک بوند پانی بھی نہیں ملا۔ بولو تو یہ ظلم نہیں ہے کیا؟ یہ ظلم ان پر کیوں ہوا؟ کس کے اشارے پر ہوا؟ اس کا اصل سبب کون تھا؟ کیا تمھیں بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے؟ خدا کی لعنت ہو تم پر اور تم جیسوں پر! تم کس منہ سے رعایت طلب کر رہے ہو؟ اپنی اس بچی کے نام پر جو ناز و نعم میں پل کر جوان ہوئی ہے، جس نے اب تک زندگی میں کوئی دکھ نہیں اٹھایا ہوگا۔ تم اس کے نام پر رحم کی بھیک مانگ رہے ہو! اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو سیٹھ کہ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے!"

"مجھے معاف کر دو! میں۔۔۔ میں اب ساری زندگی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔" سیٹھ تھم چند بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کون ہوتا ہوں تمھیں معاف کرنے والا! اس سے معافی مانگو سیٹھ جو تمھیں اور مجھے سبھی کو معاف کرنے والا اور عزت و ذلت دینے والا ہے۔ تمھیں وہی معاف کر سکتا ہے، میں نہیں۔ رہی تمہاری رہائی کی بات تو ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پولیس نے جن ڈیڑھ سو بے گناہوں کو قید کر رکھا ہے ان کا تو کوئی فیصلہ ہو جانے دو۔"

"اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔" وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

اسی دوران میں شیر بہادر دروازہ بند کر کے لوٹ آیا تھا۔

اس موقع پر وہ بول اٹھا "ہم نے سنا ہے سیٹھ کہ سرکاری

حلقوں میں تمہاری بات بڑی توجہ سے سنی جاتی ہے اور تم بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہو۔ فرض کرو ہم تمھیں رہا کر دیں تو کیا تم ان بے گناہوں کی رہائی کے لیے کوشش کر سکتے ہو جو پولیس کی حراست میں ہیں؟"

شیر بہادر کے اس سوال نے مجھے ایک اور ہی راہ سجھا دی۔ میں نے کہا "سیٹھ کی طرف سے میں یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ تم جو چاہتے ہو، وہی ہوگا۔"

"بالکل!" سیٹھ تھم چند کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں "اگر تم لوگ مجھے رہا کر دو تو آج ہی میں ڈی آئی جی اور دوسرے بڑے دار حکام سے اس سلسلے میں بات کر سکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بے گناہ لوگوں کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے سیٹھ! آج ہی تمھیں رہا کر دیا جائے گا لیکن ایک شرط پر!" میں بولا۔

"وہ کیا؟" سیٹھ پرامید آواز میں کہنے لگا۔

"تمھیں ایک خط لکھنا پڑے گا۔"

"کس کے لیے؟ کسے؟" سیٹھ نے سوال کیا۔

"اپنی بچی کو" میں نے بتایا۔

"بب۔۔۔ بچی کو؟ پر کیوں؟ تم۔۔۔ تم لوگ کیا۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یقین کرو کہ اس کی عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔"

"لل۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔ کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟ میں۔۔۔ میں ہرگز اسے تمہارے کہنے پر کوئی خط وط نہیں لکھوں گا۔ چاہے تم لوگ مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دو۔" وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"خط تو خیر اب تمھیں لکھنا ہی پڑے گا! ویسے ہم نے جس طرح تمھیں اغوا کیا ہے، تمہاری بچی کو بھی اغوا کر کے لا سکتے ہیں، لیکن بہتر یہی ہے کہ تم ہمیں اس پر مجبور نہ کرو۔ بات دراصل یہ ہے سیٹھ کہ ہم تمہارے وعدے پر کیسے یقین کر لیں کہ تم رہائی ملنے کے بعد بے گناہ گرفتار ہونے والے مسلمانوں کو پولیس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے پوری کوشش کرو گے؟ اس عرصے میں تمہاری بچی ہماری مہمان رہے گی۔"

"وہ۔۔۔ اور اگر بھگوان نہ کرے اعلیٰ حکام نے میری بات نہ مانی پھر؟۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟۔۔۔ اور پھر میں۔۔۔ میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ۔۔۔ کہ تم لوگ میری بچی کے ساتھ اچھا سلوک کرو گے، اسے مہمان بنا کر رکھو گے۔"

"تو نہ کرو یقین! ہم تمہاری خوشامد تو نہیں کر رہے۔ ہمارے پاس دوسرا راستہ بھی ہے۔ ہم تمہاری بچی کو بھی اٹھوا لیتے ہیں، مگر اس صورت میں وہ ہماری مہمان نہیں، قیدی ہوگی۔ ہم اسے بھی تمہاری ہی طرح باندھ کر رکھیں گے، پھر شاید تمھیں عقل آ جائے گی۔"

"یہ۔۔۔ یہ تو ظلم ہے۔ تم لوگ اپنی زبان سے پھر رہے ہو۔"

"ہم نے کیا زبان دی تھی تمھیں؟ بولو! تم ہی اپنی رہائی کے لیے سودے بازی کر رہے تھے۔"

"نہیں ہونا مجھے رہا۔۔۔ مار ڈالو مجھے مگر تمھیں تمہارے خدا کا واسطہ میری بچی کو اغوا نہ کرنا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

"اس کے اغوا پر تو تم ہی مجبور کر رہے ہو ہمیں! مان لو میری بات! اسے خط لکھ دو کہ تمہارے بھیجے ہوئے آدمی کے ساتھ دس ہزار روپے لے کر چلی آئے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو سیٹھ کہ اسے اب آنا ضرور ہے۔ خواہ اغوا ہو کر آئے، خواہ اپنی مرضی سے!"

کچھ دیر سیٹھ تھم چند خاموش رہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہے، پھر وہ بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ "بھگوان جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب۔۔۔ جب وہ کمینہ مجھے بہکانے میں کامیاب ہو گیا اور میں نے اس کی بات مان لی ورنہ آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"کس کمینے کی یاد آ رہی ہے تمھیں سیٹھ؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہی جو تم لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا، دھرم دیر! اسی نے مجھے بہکایا تھا۔"

"اور تم کسی بھولے بچے کی طرح اس کے بہکانے میں آ گئے!" میں طنز آمیز انداز میں ہنسا "سنو! سارا الزام اس پر رکھ کے تم خود کو پارسا ظاہر نہیں کر سکتے! ہم اتنے بے عقل نہیں ہیں کہ تمہاری باتوں میں آ جائیں گے۔ اگر تمہارے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو تم کبھی بھی اس کی بات نہ مانتے۔"

اسی وقت دور سے دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دی اور شیر بہادر لپک کر کمرے سے نکل گیا۔

میں چوکنا ہو گیا۔ آنے والا نصرت ہی تھا۔ وہ ناشتا لے آیا تھا۔

"ناشتا کرو سیٹھ! اور اس عرصے میں فیصلہ کر لو کہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہو یا نہیں! تعاون کرنے کی صورت میں تم فائدے میں رہو گے، دوسری صورت میں بھی ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے۔ یقین کرو کہ ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہمیں اسی کمرے میں تمہاری لاڈلی بچی کے گلے پر

چاقو پھیر دیں۔ تم شاید اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرو گے۔" میں نے اسے راہ راست پر لانے کے لیے ایک بار پھر دھمکی دی اور اس کا چھوٹا دھواں دھواں ہو گیا۔ اپنی جوان بیٹی کا ذکر کرکے وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ "اگر ہم اسے اغوا کرکے یہاں لائے تو پھر قتل ہی کرنا پڑے گا جو ہم نہیں چاہتے اسی لیے تم سے کہہ رہے ہیں کہ اسے خط لکھ کر بلوا لو۔ اسے ہم یہاں نہیں اچھی جگہ رکھیں گے اور اس وقت رہا کردیں گے جب بے گناہ مسلمان پولیس کی قید سے نکل آئیں گے۔ سنو! ہم نے پولیس کو اس سے بھی آگاہ کردیا ہے کہ دھرم ویر ہمارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس طرح تمہارے لیے ان لوگوں کو رہا کرانے میں آسانی ہوجائے گی۔ دوسری طرف مسلمان بھی تمہارے ممنون احسان ہوجائیں گے کہ ہندو ہونے کے باوجود تم ان کی رہائی کے لیے اپنے اثر و رسوخ استعمال کررہے ہو۔ یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہے سیٹھ سوچ لو خوب اچھی طرح!"

اس دوران میں نصرت نے گرم گرم پوریاں کا دونا سیٹھ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اسی دونے میں آلو کی بھجیا بھی تھی۔

بھوک بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔ کچھ دیر تو سیٹھ دونا پکڑے رہا اور پوریاں نہیں کھائیں، پھر جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور پوریاں کھانے لگا۔ ناشتا کرکے پانی پینے کے بعد سیٹھ میری طرف دیکھ کر بولا "تم لوگ مجھے بھلے مانس لگتے ہو میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ میں تمہاری قید ہی میں رہنے کو تیار ہوں۔ یہاں رہ کر بھی میں ان لوگوں کو رہا کرانے کی کوشش کرسکتا ہوں جو پولیس کی حراست میں ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اپنے دوستوں کے نام تمہیں خط لکھ کر دے دیتا ہوں۔ وہ بھی میری ہی طرح اثر و رسوخ والے ہیں میرے۔"

"نہیں!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "فضول ہے یہ!"

"کیوں؟ اس طرح بھی تو تمہارا کام ہوجائے گا۔"

"کوئی کام نہیں ہوگا۔" میں نے انکار میں سر ہلایا "تم کل رات سے غائب ہو اور یہ اطلاع اب تک تمہارے سب دوستوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ ایسی صورت میں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ تم نے کن حالات میں یہ خط لکھے ہوں گے! اور یہ کیوں بھول رہے ہو سیٹھ حکم چند کہ تمہارے بااثر دوست احباب ان خطوں پر ہرگز یقین نہیں کریں گے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ تم مسلمانوں کے دوست نہیں دشمن ہو! ٹھیک ہے سیٹھ، تم اپنی ضد پر اڑے رہو۔ اب رات کو تم سے اسی وقت ملاقات ہوگی جب تمہاری بیٹی بھی یہیں اسی کمرے میں بندھی ہوگی اور اسے ہم پچھاڑ کر تمہارے سامنے ذبح کریں گے!" یہ کہتے ہی میں نصرت کی طرف مڑا "سیٹھ کے منہ پر کپڑا باندھ دو! ہم اب رات کو آئیں گے۔" پھر میں نے شیر بہادر کی طرف دیکھا "چلو!"

میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ سیٹھ حکم چند کی آواز ابھری "ٹھہرو بھگوان کے لیے رک جاؤ، میری ایک بات سن لو۔"

مجھے یہی توقع بھی تھی کہ میری دھمکی رائیگاں نہیں جائے گی۔ میں رک گیا اور پھر اس کی طرف مڑ کر بولا "کہو!"

"دیکھو، میرے پاس بہت دولت ہے۔ میں۔ میں تم لوگوں کو دس ہزار سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں۔ اس سے دگ۔ دگنی بھی۔ رقم دے سکتا ہوں۔ تم میری شیلا۔ اسے۔ اسے اغوا نہ کرو!" وہ رو دینے کے قریب تھا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ ایک باپ کو اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ سیٹھ حکم چند کو اپنی زندگی سے زیادہ اپنی بیٹی کی جان پیاری تھی اور یہی اس کا ویک پوائنٹ تھا۔

سیٹھ کی بات سن کر میں ہنس دیا اور بولا "تم شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو سیٹھ کہ ہم دولت کے لالچ میں آجائیں گے۔ تمہارے خیال میں کیا ہم نے تمہیں اسی لیے اغوا کیا ہے؟ جرمانے کی ادائیگی سے یہ نہ سمجھو سیٹھ کہ تم ہمیں خرید سکتے ہو۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر تم نے جو دولت جمع کی ہے، ہم اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتے۔ بتاؤ، کیا تمہیں اغوا کرکے لانے والوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ تمہاری تجوری بھی خالی کردیتے؟ کیا تم اپنی زندگی بچانے کے لیے تجوری کی چابیاں دینے سے انکار کردیتے؟۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسا نہیں کرتے! ہم لوگ ڈاکو نہیں ہیں سیٹھ! ہم اس ملک کے بتیس کروڑ عوام کے ہمدرد ہیں جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل ہیں۔ ہماری جنگ انگریز سے ہے اور انگریز کے ان پالتو غلاموں سے بھی ہے جو ہندوستان میں اپنے آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کررہے ہیں۔ کس لیے؟ اس لیے سیٹھ کہ وہ تمہاری طرح اپنی تجوریوں کے منہ بھر سکیں، اپنی آنے والی نسلوں تک کے لیے زر و جواہر چھوڑ جائیں! تمہارے آقاؤں نے اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے اور اسے لٹوانے والے تم ہو۔ بھوک اور افلاس کی ماری ہوئی آبادیاں تم پر نوحہ کرتی ہیں۔ بھوک سے بچے بلک بلک کر بھوکے سو جاتے ہیں اور تمہاری شیلا میں اخلاقی پھرتی ہیں۔ تمہارے بچے کبھی بھوکے نہیں سوتے اس لیے کہ تم نے بدیسیوں سے اپنے ضمیر کا سودا کرلیا ہے۔ تم بک چکے ہو، تمہیں خریدا جاچکا ہے اسی لیے تم سمجھتے ہو کہ دولت سے ہر چیز خرید لو گے۔ تم ہماری بولی لگا رہے ہو! تم جو خود بکاؤ مال ہو۔ آخری بار سن لو سیٹھ کہ تمہارے پاس صرف اور صرف ایک راستہ ہے، دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ عزت و آبرو کے ساتھ رہائی یا ذلت کی موت! تم اس میں سے جو راستہ چاہو منتخب کرسکتے ہو۔"

"مجھے سوچنے دو۔ سوچنے دو مجھے!" میرے چپ ہوتے ہی سیٹھ حکم چند بول اٹھا۔

"سوچو، ضرور سوچو! مگر اتنا خیال رکھنا کہ تم ہمیں فریب نہیں دے سکتے۔ نہ بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہو۔"

سیٹھ حکم چند کے لیے میں نے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا کہ وہ میری بات مان لے اور اپنی بیٹی شیلا کے نام خط لکھ دے۔ آخرکار اسے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے مگر ایک شرط کے ساتھ! اور وہ شرط سیٹھ نے بیان کردی۔

"قرآن شریف لاؤ!" میں نے نصرت سے کہا، پھر سیٹھ حکم چند کو مخاطب کیا "سیٹھ! میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کرنے پر آمادہ ہوں کہ تمہاری بیٹی کی جان اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی مگر تمہیں بھی گیتا اور رامائن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کرنا ہوگا کہ مظلوم مسلمانوں کو پولیس کی حراست سے رہا کرانے کے لیے سچے دل سے ہر امکانی کوشش کرو گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" سیٹھ حکم چند نے اقرار کرلیا۔

قرآن تو بشیر کے گھر میں موجود تھا البتہ گیتا اور رامائن کے حصول میں کچھ وقت ضرور لگا۔ میں نے اور سیٹھ حکم چند نے عہد کرلیا اور پھر وہ اپنی بیٹی شیلا کو خط لکھنے لگا۔ خاصی بحث و تکرار کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو ہی گئی تھی۔

"شیلا جب ہماری مہمان بن جائے گی سیٹھ تو تمہیں رہا کردیا جائے گا۔" میں نے سیٹھ حکم چند سے وہ خط لے لیا "اس وقت تک تمہیں یہ قید برداشت کرنا پڑے گی۔" یہ کہتے ہی میں نے شیر بہادر کو چلنے کا اشارہ کیا۔ نصرت نے سیٹھ کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور پھر دونوں ہاتھ بھی آزاد نہیں چھوڑے۔

سیٹھ حکم چند سے اعتراف نامہ اور شیلا کے نام خط لے کر میں شیر بہادر کے ساتھ لوہاری گیٹ پہنچ گیا۔

بخت خاں اور تیتو میرے پہنچنے سے میری آمد کے منتظر تھے۔ اس دوران میں دلاور اور ظفر بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اور بقیہ دونوں ساتھیوں نے طے شدہ مقامات پر پوسٹر لگادیے تھے۔

"کیا رہا شاہین، کچھ کامیابی ہوئی؟" بخت خاں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کامیابی سی کامیابی!" یہ کہہ کر میں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کردیا۔ پھر اسے وہ اعتراف نامہ بھی دکھایا جو سیٹھ حکم چند سے لکھوایا تھا۔

"لیکن شاہین، اس اعتراف نامے کی ضرورت تو اس وقت پڑسکتی ہے جب عدالت تک نوبت پہنچ جائے۔" بخت خاں بولا "ممکن ہے پولیس کی سطح پر ہی یہ معاملہ ختم ہوجائے۔"

"اور ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔" میں نے کہا "معاملہ ایک قتل کا ہے اور پولیس نے اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی ہیں۔ سیٹھ حکم چند اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے کتنا ہی اثر و رسوخ کیوں نہ استعمال کرلے، پولیس کا محکمہ اوپر والوں کو اپنی کارکردگی بھی تو دکھائے گا۔ یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ جو لوگ گرفتار کیے گئے ہیں، موجودہ حکمت عملی اختیار کرنے کی صورت میں ان کی بڑی تعداد ابتدائی تفتیش کے بعد چھوڑ دی جائے، لیکن یہ بہرحال نہیں ہوسکتا کہ سبھی افراد رہا کردیے جائیں۔ کچھ کا چالان تو پولیس کو عدالت میں پیش کرنا ہی پڑے گا۔ اس وقت یہ اعتراف نامہ کام آئے گا۔"

O☆O

گھوڑا گاڑی میں وہ نازک اندام سوار ہوئی تو میں نے خوشبو کا ایک جھونکا محسوس کیا اور پھر اس پر نظر پڑتے ہی میرے حواس جیسے گم ہوگئے۔ مجھے یوں لگا کہ وقت کی طنابیں کھنچ گئی ہوں اور اس نے آگے بڑھنے کے بجائے مجھے ماضی میں پہنچا دیا ہو۔ میں ایک ہی لمحے میں لاہور سے دہلی پہنچ گیا تھا اور وہ لمحہ بڑا قاتل لمحہ تھا۔ دو افراد کے درمیان ایسی مشابہت سنی ضرور تھی مگر اس کا عملی تجربہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ وہی ابرو، وہی رخسار و لب، وہی زلف بردوش چلتا پھرتا شراب خانہ، وہی جسم کی لچک، آنکھوں کی چمک سب کچھ وہی تھا تو پھر میں کیسے ہوش میں رہتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کب گھوڑا گاڑی چلی اور کب اس کے یاقوتی لبوں نے جنبش کی "میرے پتا جی ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں" میں اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

"یہ تم مجھے یوں دیوانوں کی طرح کیوں دیکھے جارہے ہو؟

کیا بات ہے؟"

میں اسے کیا یہ جواب دیتا کہ اے غارتِ ایمان تو میرے ایک بچھڑے ہوئے خواب کی پرچھائیں ہے۔ میں اسے کیسے بتا دیتا کہ اس کی ایک جھلک نے مجھ پر کیا سحر طاری کر دیا ہے' مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے! میں اسے کس طرح یقین دلاتا کہ ایک خوشبو نے زلفوں زلفوں اپنا جال پھیلایا ہے۔ ایک چہرہ وقت کی گرد میں چھپ کر پھر نمودار ہو گیا ہے اور یہ کہ اس چہرے نے مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے! وہ سردار بلونت سنگھ کی بیٹی کلونت کور تھی کہ سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا' میں دلی میں تھا یا لاہور میں! وقت آگے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ پیچھے کی طرف! میں طارنوش تھا کہ شاہین! وہ میری پہلی محبت تھی کہ ایک اجنبی لڑکی! کچھ دیر تو مجھے کوئی احساس ہی نہ رہا۔ میں حال اور ماضی کے درمیان وقت کی صلیب پر لٹکا رہا اور میری چشمِ تصور نے کلونت کور کو پاؤ تیغ کے ایک گھر میں قتل ہوتے دیکھا اور پھر میری سماعت سے اس کی چیخیں ٹکرائیں۔

ہوش میں آؤ طارنوش! تم خطرے میں ہو۔ ایک سرگوشی ابھری' آشنا پُراسرار سرگوشی! اسنی کی سرگوشی!

"کون ہو تم؟" میرے ہونٹ جیسے خود بہ خود حرکت کرنے لگے۔ میں ابھی تک اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا ہوں؟ کیا تم مجھے میرے پتاجی کے پاس لے کر نہیں چل رہے؟ مجھے تو پہلے ہی تم لوگوں پر شبہ ہو گیا تھا کہ تم لوگ دھوکے باز ہو اسی لیے جب میں گھر سے بد ستے اندر گئی تھی تو سیتا سے گھوڑا گاڑی کے پیچھے آنے کو کہہ دیا تھا۔" شیلا یہ سمجھی کہ میں اسنی سے نہیں اس سے مخاطب ہوں۔

سیٹھ حکم چند کی عیار بیٹی شیلا کی بات سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ شاید پُراسرار اسنی کی مخصوص خوشبو غائب ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے بروقت خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور خطرے کی نوعیت کا علم مجھے شیلا سے ہو گیا تھا۔

وہ کلونت کور نہیں شیلا تھی اور جب وہ شیلا ہی تھی تو کسی رعایت کی مستحق نہیں تھی۔ جب وہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوئی تھی تو مجھے اسی وقت اسے بے ہوش کر دینا چاہیے تھا مگر میں اس کے حسن قیامت خیز کی نیرنگیوں میں گم ہو گیا۔ خیر بہرطور اسے گھوڑا گاڑی میں سوار کرا کے جا چکا تھا۔ گھوڑا گاڑی کا کوچوان مجاہد تھا۔ شیر بہادری سیٹھ کی کوٹھی میں جا کر شیلا سے ملا تھا اور اسے سیٹھ کا خط دیا تھا اور بتایا تھا کہ کوٹھی کے احاطے میں جو گھوڑا گاڑی کھڑی ہے اس میں بیٹھ جائے'

اسے اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ میرے ہی ایما پر شیلا سے یہ کہا گیا تھا۔ شیلا کے بہ ظاہر محفوظ اور بے خطر اغوا کا منصوبہ میں نے ہی بنایا تھا۔

بہ ظاہر معصوم سی نظر آنے والی اس دوشیزہ نے مجھے اور میرے ساتھی مجاہد کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ سیتا نامی شخص سیٹھ حکم چند کا کوئی وفادار ملازم ہی ہو سکتا تھا۔ جو کسی سواری پر گھوڑا گاڑی کے تعاقب میں ہو سکتا تھا۔ یوں تو میری مقتول محبوبہ سے اس لڑکی کی حیرت انگیز مشابہت نے وقتی طور پر میرے حواس گم کر دیئے تھے اور میں اسے کلوروفارم نہیں سنگھا سکا تھا مگر یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ اگر فوری طور پر میں اسے بے ہوش کر دیتا تو وہ مجھے خطرے کی نوعیت سے آگاہ نہ کر پاتی۔

گھوڑا گاڑی پر چادر بندھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بڑے گھرانوں کی ہندو خواتین بھی عموماً پردہ کرتی تھیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے یہ فائدہ اٹھانا مقصود تھا کہ گھوڑا گاڑی کے اندر جو کچھ ہو باہر سے نظر نہ آ سکے۔ وہ گھوڑا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور میں بھی دانستہ اس سیٹ سے نہیں ہٹا تھا۔ گھوڑا گاڑی کی سیاہ چھتری تنی ہوئی تھی اور اس کے عقبی حصے کے درمیان میں سیٹ کے اوپر ہی سیاہ رنگ ترپن کا پردہ پڑا تھا جس سے باہر دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ سوچ کر میں نے اس پردے کو ذرا سا ہٹایا اور باہر دیکھتا ہوا بولا "خواہ مخواہ جھوٹ بول رہی ہو تم! گھوڑا گاڑی کے ساتھ تو کوئی نہیں آ رہا۔ تمہارا ملازم تمہیں کوئی دے گیا' اگر تم واقعی سچ بول رہی ہو!" یہ کہہ کر میں تحقیر آمیز انداز میں ہنسا جیسے اس کا مذاق اڑایا ہو۔

گھوڑا گاڑی اس وقت ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جس پر سواریاں زیادہ نہیں تھیں۔ میں نے دو سائیکل سواروں کو دیکھا تھا اور ایک تانگا پیچھے آ رہا تھا۔

میری بات کے ردعمل میں اس نے غصیلی آواز میں کہا "سیتا ایسا نہیں کر سکتا!" پھر وہ بھی پچھلی پردے سے جھانکنے لگی اور چلا کر بولی "دیکھو وہ آ رہا ہے سائیکل پر! بڑے عقل مند بن رہے تھے کہ کوئی ساتھ نہیں آ رہا! تمہیں شاید کم نظر آتا ہے ہونہہ!" اس کا انداز بھی تمسخر اڑانے والا تھا۔

"کہاں؟" میں نے بھی جھانک کر کہا "مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیا۔"

"وہ۔ ادھر وہ رہا! جو سر پر کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔" اس نے نشان دہی کر دی۔ انداز مجھے چڑانے والا تھا۔ "مضحکہ خیز! کیوں اس کر رہی ہو تم! ہو گا وہ کوئی راہ گیر! زبردستی

مجھ پر رعب ڈالنے کے لیے جسے تم اپنا ملازم بتا رہی ہو۔" میں ہنس پڑا۔

پھر وہ "ارے ارے" ہی کہتی رہ گئی اور میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ میں نے رومال اس کے منہ سے ہٹا کر اسے سیٹ پر لٹا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور میں بار بار خود کو یہ یاد دلا رہا تھا کہ وہ لڑکی میری محبوبہ کی ہم شکل ضرور ہے مگر محبوبہ نہیں۔ اس کے جسم کے زاویے اور قوسیں میری آنکھوں میں کھبی جا رہی تھیں۔ جیب میں رومال رکھتے ہوئے میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور سامنے والی سیٹ پر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر آہستہ سے مجاہد کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

میں نے مجاہد کو ہدایت دی کہ وہ گھوڑا گاڑی کو لوہاری گیٹ لے جانے کے بجائے کسی سنسان سڑک پر لے جائے۔ اسے میں نے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا شیلا کے ملازم سے جان چھڑانے کی صرف یہی صورت تھی۔

میری ہدایت پر مجاہد نے گھوڑا گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ خاصا لمبا فاصلہ طے کر کے اور شاہی قلعے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اب گھوڑا گاڑی جہانگیر کے مقبرے کی طرف جا رہی تھی۔ سیتا اب تک تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کی مالکن پر کیا گزر چکی ہے! وہ اتنا اناڑی تھا کہ گھوڑا گاڑی سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں بھی پردے سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

مجاہد کو میں اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا تھا اسی لیے گھوڑا گاڑی روکے جانے کا منتظر تھا۔

آخر کار وہ لمحہ آ ہی گیا جب مجاہد نے مجھے اشارہ دیا۔ سڑک کے کنارے پوری طرح گھوڑا گاڑی رکنے سے پہلے ہی میں نیچے کود گیا۔ میرا چہرہ نقاب کے پیچھے تھا۔

تقریباً جست بھرتا ہوا میں سیتا کے قریب پہنچا' پھر اس سے پہلے کہ وہ سمجھتا' میں نے اسے سائیکل سے نیچے گرا لیا۔ وہ چیخا اور اسی وقت میرا گھونسا پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر پڑا۔ اس کے بعد میں نے بہ طور احتیاط کلوروفارم میں بسا ہوا رومال بھی جیب سے نکال کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔

ذرا سی دیر کے بعد گھوڑا گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ شہر کی طرف دوبارہ واپس جا رہی تھی۔ میری کوشش تھی کہ شیلا کی طرف نہ دیکھوں مگر بار بار نظریں ادھر اٹھ جاتی تھیں۔ اس کی ایک سیاہ لٹ' سفید رخسار پر جھول رہی تھی اور ابھرے ابھرے ہونٹ ذرا سا کھلے رہ گئے تھے جیسے

ساری کا پلو بھی ڈھلک گیا تھا۔ اس کے حسین سراپا سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ نازک سی وہ لڑکی خود بے ہوش تھی اور مجھے بھی ہوش سے بیگانہ کرنے کے درپے تھی۔

"معلوم نہیں قدرت کیوں میرا امتحان لے رہی ہے!" میں بڑبڑانے لگا۔ پھر میں نے سوچا "وہ کوئی بھی ہو' اسے دیکھنا کوئی گناہ تو نہیں!" اس خیال نے میری نظروں کو بے باک کر دیا اور پھر مجھے وہ رنگ بھی نظر آنے لگے جو میری نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ انہی رنگوں کی برسات میں نہاتے ہوئے وہ سفر تمام ہوا۔ ان حالات میں وہ آخری مرحلہ طے کرنا میرے لیے کسی تیز نشے سے کم نہیں تھا۔ جب اس جسمِ دیبا و حریر کو میں نے جھک کر اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔

دن کا وقت تھا اس لیے مجاہد نے گھوڑا گاڑی کو گھر کے دروازے سے لگا کر کھڑا کیا تھا۔ گلی میں آمدورفت جاری تھی۔ شیلا کو اٹھائے ہوئے مجھے انتہائی تیزی کے ساتھ گھر کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو جانا تھا مگر میں اس وقت جب مجاہد کا اشارہ ملتا۔ میں اسی لیے شیلا کو بازوؤں میں بھرے گھوڑا گاڑی کے اندر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجاہد اس وقت اشارہ کرتا جب آس پاس کوئی نہ ہوتا۔

مجھے یاد نہیں کہ کتنے لمحے گزرے کہ صدیاں بیت گئیں اور میں اس مجسمۂ رنگ و خوشبو کو اپنی آغوش میں سمیٹے بیٹھا رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ وقت شاید رک گیا تھا یا مجھے رکتا محسوس ہوا تھا' بہرحال کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ضرور تھا ورنہ مجاہد کی آواز میں سن لیتا۔ اس نے کچھ کہا یقیناً تھا' مگر کیا' یہ میں نہیں سن سکا تھا۔ اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی سنائی دی تھی۔ میں تو جہانِ رنگ و بو میں کسی کے ساتھ ساتھ جیسے بہت دور نکل گیا تھا۔

"شاہین!" دوسری بار مجھے مجاہد کی آواز بہت واضح سنائی دی اور میں چونک اٹھا۔ اس نے تقریباً چیخ کر مجھے پکارا تھا۔ اسی کے بعد پے در پے صداؤں سے فضا گونج اٹھی تھی۔

خطرہ! خطرہ! میرے اندر جیسے کوئی چیخا اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔

میں نے شیلا کو تیزی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے پستول نکال کر گھوڑا گاڑی پر بندھی ہوئی چادر کا ایک سرا ہٹایا۔ اسی لمحے فائر ہوا اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ یہ فائر گھر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف سے ہوا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے اندر یہ احساس جاگا کہ وہ گھر اب محفوظ نہیں رہا۔ اس پر یقیناً ہمارے دشمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ میں نے لپک کر مخالف سمت کا پردہ اٹھایا

اور کسی طرف سے پھر گولی چلی اور پردے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"تمہیں گھیرا جاچکا ہے' خود کو قانون کے حوالے کردو! ورنہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کردیا جائے گا! فائر روکا جارہا ہے' گھوڑا گاڑی سے باہر آجاؤ!" کسی نے چیخ کر یہ الفاظ ادا کیے۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ میرا ہم وطن نہیں کوئی انگریز تھا۔ یہ آواز گلی کی طرف سے آئی تھی۔ چند لمحوں کے توقف سے وہی آواز پھر ابھری "اگر تمہارے پاس اسلحہ ہے تو اسے باہر پھینک دو! ہم تین تک گنیں گے۔ تم اگر گنتی پوری ہونے کے باوجود باہر نہیں آئے تو فائر کھول دیا جائے گا ایک۔"

اس سے قطع نظر کہ سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا' میری مقتول محبوبہ کلونت کور کی ہم شکل تھی۔ اس کی جان بچانا مجھ پر فرض تھا۔ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اس کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر میں خود کو قانون کے حوالے نہ کرتا تو مقابلہ کرتے ہوئے زندہ بچتا کہ نہ بچتا شیلا ضرور ماری جاتی۔ گھوڑا گاڑی پر گولیوں کی بارش کردی جاتی۔ ایک فیصلے تک پہنچنے کے باوجود میں نے تاکید کے بعد اپنا پستول باہر نہیں پھینکا۔ میں نے پستول اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

پھر جب میں پردہ ہٹا کر باہر کودنے والا تھا تو اسی انگریز کی بلند آواز گلی میں گونجی "دو!"

اس کے ساتھ ہی میں ہاتھ اٹھائے باہر آگیا اور اسی لمحے میری نظر بائیں جانب پڑی۔ میرے دل پر جیسے شدید ضرب لگی۔ ایک کھلونا ٹوٹ گیا تھا' ایک خوشبو بکھر گئی تھی۔ ایک مجاہد اپنے وطن پر قربان ہوگیا تھا' ایک وطن پرست اپنی جان کا نذرانہ دے کر گمنام شہیدوں میں اپنے نام کا اضافہ کرگیا تھا' ایک ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ ہاں وہ جس نے آخری بار مجھے پکارا تھا' وہی مجاہد جو کوچوان بنا ہوا تھا' اس کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پڑی تھی۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور میں نے چاروں طرف خون ہی خون دیکھا۔

"آگے آؤ!" مجھے حکم دیا گیا۔ یہ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔

میں مڑا اور قہر آلود نظروں سے حکم دینے والے کی طرف دیکھا۔ دائیں جانب کچھ ہی فاصلے پر وہ موجود تھا۔ اسی کے قریب چار باوردی سپاہی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ گھوڑا گاڑی اسی طرف سے گلی میں داخل ہوئی تھی حکم دینے والا کوئی انگریز ہی تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

شدید غصے اور جذبۂ انتقام نے صورتِ حال کی سنگینی سے مجھے قطعی بے نیاز کردیا۔

"آرہا ہوں' میں آرہا ہوں' تمہاری موت بن کر آرہا ہوں!" میں پوری قوت سے چیخا اور ان کی طرف بڑھا۔

"فائر! بھون دو اسے!" انگریز نے بلند آواز میں سپاہیوں کو حکم دیا اور پھر خود بھی میرا نشانہ لیا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میری آتشِ جاں تیز ہوگئی۔ میرا وجود دہکتے ہوئے انگاروں کی نذر ہو کر ان ظالموں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ عین اسی لمحے پے در پے دھماکے ہوئے اور آگ آگ کے درمیان سے گزر گئی۔ یہ "آگ" مجھے اپنے باپ ہاموس کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ نادیدہ ہوجانے کی پراسرار صفت نے میری زندگی بچالی تھی اور یہ اذیت ناک تجربہ' ایک تخلیق سے دوسری تخلیق کی طرف سفر' آدم زاد سے جن زادہ بن جانے کا اسرار میرے لیے نیا نہیں تھا مگر اس مرتبہ دانستہ میں نے اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا بلکہ ایک عیار انگریز نے مجھ سے دغا کی تھی' مجھے دھوکا دیا تھا۔ خود کو قانون کے حوالے کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا تھا کہ اس گرگٹ نے مجھے حراست میں لینے کا جھانسا دیا تھا۔ یہ فریب دے کر اس نے مجھے گھوڑا گاڑی سے اترنے پر آمادہ کیا اور پھر جب میں رائفلوں کی زد میں آگیا تو اپنے زر خرید غلاموں کو حکم دیا کہ مجھے بھون دیں۔ وہ اگر مجھے یہ دھوکا نہ دیتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ پھر شاید میرا وجود نادیدہ نہ بن جاتا' میرے اندر موروثی صفات بیدار نہ ہوتیں۔

ادھر میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوا ادھر سب سے پہلے انگریز افسر تیزی کے ساتھ مڑ کر سپاہیوں کو دھکا دیتا ہوا بھاگا۔ میں نے کسی ایسے چیتے کی طرح جست بھری جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ میں جیسے اڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر میں نے اسے چیر دیا اور وہ موت کے منہ میں پہنچ گیا۔ پھر میں پلٹ کر ان سپاہیوں کی طرف بھاگا جو اپنے آقا کی چیخ سن کر اسی طرف دوڑے ہوئے آرہے تھے۔ وہ بھی میرے نزدیک کسی رحم کے مستحق نہیں تھے۔ آناً فاناً انہیں بھی میں نے موت کی میٹھی نیند سلا دیا۔ گلی میں اب چھ لاشیں پڑی تھیں جن میں سے ایک لاش میرے ساتھی' میرے شہید مجاہد کی تھی۔

میں واپس گھر کی طرف پلٹ رہا تھا تو میری سماعت سے

اپنے ساتھی تیتومیر کی جگر خراش چیخ ٹکرائی اور میری روح میں اتر گئی۔ میرے پیروں میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ میں ہوا کے کسی تیز جھکڑ کی طرح گھر کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

"جارج زبان کھلوانا جانتا ہے' تو بول اب تیری باری ہے! ورنہ یہ خون آلود سنگین اب تیرے سینے میں اتر جائے گی۔ بتا طارنوش کہاں ہے؟" میں نے اندر والے کمرے سے ایک انگریز کی اجنبی آواز سنی۔

"تیری قضا آگئی کمینے! طارنوش آگیا!" میں ضبط نہ کرسکا اور چیخ اٹھا۔ اس لمحے مجھے خود اپنی آواز غیر انسانی اور اجنبی لگی۔

میں سمجھ گیا کہ وہی درندہ میرے ساتھیوں پر ظلم توڑ رہا تھا' انہیں موت کی نیند سلا دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ جسے شملے سے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی بنا کر لاہور بھیجا گیا تھا۔ آج وہ خود ہی سامنے آگیا تھا۔ آج خود اس کی موت اسے وہاں کھینچ کر لے آئی تھی۔

میری آواز سن کر وہ دوڑتا ہوا کمرے سے نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھی جس پر سنگین لگی ہوئی تھی اور سنگین سے تازہ تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی میں نے رائفل چھین لی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اب خون آلود سنگین لمحہ بہ لمحہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ سنگین اب اس کے سینے تک پہنچ گئی تھی۔

"جارج! اب یہ خون آلود سنگین تیرا سینہ چھیدے گی۔" میں پھنکارا "تجھے طارنوش کی تلاش تھی طارنوش تیرے سامنے کھڑا ہے مگر تو مجھے نہیں دیکھ سکتا اس لیے کہ طارنوش اندھوں کو نظر نہیں آتا۔"

"بھ۔۔۔ بھوت۔۔۔ بھوت!" وہ خوف زدہ ہو کر چیخا اور پھر مڑ کر بھاگا۔

"رک جا قاتل!" میں اس کی طرف لپکا "اے میرے تیتومیر کے قاتل رک جا! تو اپنی موت سے نہیں بھاگ سکتا۔"

وہ صحن میں اس جگہ پکڑا گیا جہاں ہم ساتھی بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ میں نے اس کی ایک کلائی تھام رکھی تھی اور وہ سردی کھائے ہوئے کسی چوہے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے ہلکا ہی سا جھٹکا دیا تھا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ انتہائی خوف نے اس کے چہرے کو مسخ کردیا تھا۔

پھر میں نے اسے جہنم کے دہانے تک پہنچانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے اس کا سینہ چھید ڈالا۔ اس کی چیخیں سن کر دو سپاہی بھاگتے ہوئے صحن میں آئے مگر میں اندر کمرے کی طرف دوڑا۔ رائفل میں نے صحن ہی میں پھینک دی تھی۔

کمرے میں چار سپاہی اور موجود تھے۔ جارج نے گویا پورے لاؤ لشکر کے ساتھ چھاپا مارا تھا۔ تیتومیر کی لاش بھی کمرے میں پڑی تھی۔ دو سپاہیوں نے بخت خاں کو جکڑ رکھا تھا اور بقیہ دو سپاہی دلاور کو قابو میں کیے ہوئے تھے۔ بخت خاں کو پشت کی طرف سے اور دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑ کر ایک سپاہی جکڑے ہوئے تھا اور دوسرا رائفل کی نال سینے پر رکھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہی صورتِ حال دلاور کے ساتھ بھی تھی۔ وہ دونوں سپاہی جو باہر مجھے نظر آئے تھے۔ وہ شاید تیتومیر کو قبضے میں کیے ہوں گے۔ تیتومیر کی شہادت کے بعد اب وہ اپنے ساتھیوں کو وہاں چھوڑ کر باہر کی خبر لینے جاسکتے تھے۔

مجھ پر تو اس وقت خون سوار تھا ہی! تیتومیر کی لاش دیکھ کر میں اور بھی جنون میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے اس سپاہی کی گردن دبوچ لی جو بخت خان کے سینے پر رائفل رکھے کھڑا تھا۔ وہ ڈھیر ہوا تو دوسرے رائفل والے کی باری آئی۔

اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دو ساتھیوں کو خاموشی سے ڈھیر ہوتے دیکھ کر بقیہ دونوں سپاہیوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ یہ وہ دونوں تھے جو بخت خاں اور دلاور کو پیچھے سے پکڑے ہوئے تھے۔ رائفل والوں کو گرتے دیکھ کر میرے دونوں ساتھی' سپاہیوں سے بھڑ گئے۔ میں نے زمین پر پڑی ہوئی ایک رائفل اٹھائی اور ان دو میں سے ایک کو ٹھنڈا کردیا۔ بخت خاں نے اسے گرتے دیکھا تو دوسری رائفل پر جھپٹا۔ دوسرا سپاہی' بخت خاں کی گولی سے مارا گیا۔ یہ دوسرا سپاہی' دلاور سے زور آزمائی کررہا تھا۔ باہر صحن میں جو دو سپاہی موجود تھے' ان میں سے ایک گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کا کاسہ سر ٹکڑوں میں تبدیل ہوگیا۔ اس پر میں نے گولی چلائی تھی۔

اسی لمحے مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا تو میں کمرے سے نکل بھاگا۔ رائفل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اجل گرفتہ آخری سپاہی میرے رستے میں آکر خود ہی مارا گیا۔ وہ وحشت زدہ سا ہو کر گھر کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔

پھر میں جیسے ہی گھر کے دروازے تک پہنچا۔ میرا جسم مجھے واپس مل گیا۔ دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی گھوڑا گاڑی کا میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ شیلا ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ میں دوبارہ گھر کے اندر جانے کے لیے پلٹنے ہی والا

تھا کہ مجھے عقب سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ بخت خاں تھا جو شہید تیتو میر کی لاش اپنے بازوؤں پر اٹھائے اندر سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ دلاور بھی تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یقیناً اس نے کسی مردہ سپاہی کی رائفل پر قبضہ کرلیا تھا۔

"شاہین!" مجھ پر نظر پڑتے ہی بخت خاں چیخا "یہ۔ یہ تمہاری تو آ کمانی۔۔" آگے وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا اور اس کا گلا رندھ گیا۔

میرے دل پر گھونسا لگا مگر میں ضبط کرگیا اور بخت خاں سے کہا "میرے شہید کو گھوڑا گاڑی میں لٹادو اور اس شہید مجاہد کو بھی جو ادھر محو خواب ہے۔ دلاور! تم اسے اٹھاؤ۔ رائفل مجھے دے دو!"

گلی اس طرح سنسان پڑی تھی جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ رہتا ہو۔ دن کے وقت ایسا سناٹا طاری تھا جس سے ہول آئے۔ گھروں کے دروازے تو الگ کھڑکیاں تک بند کرلی گئی تھیں۔

دونوں شہیدوں کی لاشیں گھوڑا گاڑی میں رکھ دی گئیں۔ میں اور بخت خاں بھی اندر بیٹھ گئے۔ دلاور اب کاظم کی جگہ کوچوان بن گیا تھا اور وہی گھوڑا گاڑی کو ایک نئے ٹھکانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہ نیا ٹھکانا بھاٹی گیٹ میں کرائے پر حاصل کیا ہوا ایک مکان تھا جو کسی ایسے ہی موقع کے لیے لیا گیا تھا۔ یہ مکان پنجاب کے دوسرے علاقوں اور شہروں سے آنے والے مسلمان کارکنوں کے لیے مخصوص تھا۔ شیر بہادر سے مجھے اس ٹھکانے کے بارے میں تین روز قبل معلوم ہوا تھا۔ راولپنڈی سے تنظیم کا ایک رکن فتح خاں لاہور آیا تھا، اسے وہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ فتح خاں ہی کے ذریعے مجھے راولپنڈی میں مقیم نمبو کا پیغام ملا تھا۔ اس نے مجھ سے پیغام میں یہ دریافت کیا تھا کہ ابھی راولپنڈی ہی میں رکے یا اجازت ہو تو میرے پاس لاہور چلا آئے؟ لاہور کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ایک خط کے ذریعے میں نے اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کیا تھا مگر وہ خط ابھی پوسٹ نہیں کرسکا تھا۔ اس کے علاوہ فتح خاں کو بھی میں نے لاہور ہی میں روک لیا تھا۔ لوہاری گیٹ سے چلتے ہوئے دلاور نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری اگلی منزل کون سی ہے۔



وہ شب ہمارے لیے شب گریہ تھی۔ ہم نے اپنے دونوں شہیدوں کو اس گھر کے کچے صحن میں دفن کردیا تھا۔ بخت خاں اور میں اداس بیٹھے تھے۔ دلاور اور فتح خاں موچی گاڑی لے کر موچی گیٹ گئے ہوئے تھے۔ انہیں اس گھوڑا گاڑی میں سیٹھ حکم چند کو بے ہوش کرکے شہر میں کہیں چھوڑ آنا تھا۔ دلاور کو میں نے یہ تاکید کردی تھی کہ سیٹھ حکم چند کو بے ہوش کرنے سے پہلے بتا دیا جائے، اس کی بیٹی شیلا ہماری مہمان ہے۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا اگر سیٹھ حکم چند نے اپنا عہد پورا کیا یعنی زیر حراست مسلمانوں کی رہائی کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا! سیٹھ کو یہ بھی بتایا جانا تھا کہ اسے اس کی حویلی کے بجائے شہر کے کسی بھی حصے میں بہ حالت بے ہوشی چھوڑ دیا جائے گا تاکہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

سیٹھ حکم چند کی حویلی سے شیر بہادر کو بھی موچی گیٹ میں بشیر تانگے والے ہی کے گھر پہنچنا تھا اور اس وقت تک وہیں نصرت کے ساتھ رہنا تھا جب تک سیٹھ کو رہائی نہ مل جاتی۔ سو شیر بہادر بھی وہیں تھا۔ میں اسی لیے شیر بہادر کی طرف سے فکرمند نہیں تھا۔ اسے میں نے دلاور ہی کے ذریعے لوہاری گیٹ میں پیش آنے والے اندوہناک واقعے سے آگاہ کردیا تھا اور اب بھاٹی گیٹ بلایا تھا۔

اس خونی معرکے میں جاسوس سمیت دشمن کے بارہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑا تھا۔ ہمارے دو ساتھی ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ ان دو قیمتی جانوں کے نقصان نے میرے دل کو لہولہو کردیا تھا۔ اس شب جب میں ایک خط کے ذریعے مجاہد اول کو اس واقعے کی روداد لکھ رہا تھا تو میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ تفصیلی رپورٹ لے کر آئندہ روز صبح ہی صبح فتح خاں کو دہلی روانہ ہونا تھا۔ مجاہد اول اب دہلی میں تھا۔

اپنے دکھوں کے کرب کو لفظوں کا پیرہن دینے کی خاطر میں اس لیے آمادہ ہوگیا تھا کہ شاید اس طرح میرے دل کا بوجھ کم ہوجائے۔ میں لالٹین کی روشنی میں خط لکھتا رہا اور بخت خاں مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر سر جھکائے سوچ میں گم بیٹھا رہا۔

جب میں اس رپورٹ کی آخری سطور لکھ رہا تھا تو دروازے پر دستک سنائی دی۔ بخت خاں خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

شیر بہادر، دلاور اور فتح خاں موچی گیٹ سے لوٹ آئے۔ شیر بہادر، بخت خاں کی رہنمائی میں شہید ساتھیوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آنگن کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس عرصے میں آخری سطریں لکھ لیں اور تفصیلی رپورٹ کو ایک لفافے میں بند کردیا۔

"فتح خاں! تمہیں کل صبح دہلی روانہ ہونا ہے۔" میں نے فتح خاں کو مخاطب کیا جو دلاور کے ساتھ چٹائی پر بیٹھا تھا "یہ رپورٹ اہم نوعیت کی ہے اس لیے ڈاک کے ذریعے نہیں بھیجی جاسکتی۔"

"بہتر ہے جناب! اور کوئی حکم؟" فتح خاں بوجھل سی آواز میں بولا۔ ہم سبھی سوگوار تھے۔ ان میں ہمارا ساتھی فتح خاں بھی شامل تھا۔

"کل صبح ہی تمہاری روانگی سے قبل میں تمہیں بتاؤں گا کہ دہلی پہنچ کر مجاہد اول تک یہ پیغام تمہیں کس کے ذریعے پہنچانا ہے۔" میں نے مزید کہا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ طبیعت اتنی بوجھل اور اداس تھی کہ ابھی تک ہم ساتھیوں میں سے کسی نے گزرے ہوئے واقعے کے متعلق ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جب میں مجاہد مرحوم اور شیر بہادر کے ساتھ لوہاری گیٹ سے سیٹھ حکم چند کی کوٹھی کے لیے روانہ ہوگیا تھا تو میرے پیچھے وہاں کیا گزری تھی؟ کب اور کیسے مقتول جاسوس وہاں پہنچ گیا تھا؟ نہ ہی بخت خاں نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ جب وہاں گولیاں چل رہی تھیں اور لاشیں گر رہی تھیں تو میں کہاں تھا؟ ہم سبھی پر ایک اداسی محیط تھی۔ کوئی بھی ہم میں سے نہ کچھ کہہ رہا تھا نہ پوچھ رہا تھا۔ میری ہی طرح شاید سبھی کے دل درد سے بوجھل تھے اور نیند آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ ہم سب ایک درد کے رشتے میں بندھے تھے اور یہ رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ شاید خون کا رشتہ بھی اس قدر مضبوط نہ ہو۔

ہم میں سے کسی نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ شیر بہادر بہرحال لاہور میں ہمارا میزبان تھا کچھ سوچ کر اسی نے مجھ سے کہا "شاہین! آپ کھانا کھا لیجیے! یہاں کھانا پکانے کا سارا سامان موجود ہے۔ میں اور بھائی فتح خاں کچھ پکا لیتے ہیں۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز میں جھجک سی تھی جیسے بہ مجبوری اسے کھانے کے لیے پوچھنا پڑا ہو۔

"تم لوگ کھالو، مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ جو کچھ میں نے کہا غلط نہیں کہا تھا۔ میری بھوک پیاس واقعی اڑ گئی تھی۔ ہاں اس وقت مجھے سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا کا ضرور خیال آیا کہ وہ بھی بھوکی ہوگی۔ اسے ہم نے دوپہر کے بعد اس کی حویلی سے اغوا کیا تھا اگر اس نے دوپہر کا کھانا کھا بھی لیا ہوگا تو رات کا کھانا بہرحال نہیں کھایا تھا۔ ہم تو خیر کچھ کھاتے نہ کھاتے مگر شیلا کا معاملہ مختلف تھا۔ اسے بھوکا رکھنا ظلم ہوتا۔ اس مکان میں لاکر ہم نے اسے ایک کمرے کے اندر بند کردیا تھا اور باہر کے اس کمرے کے دروازے پر تالا ڈال کر پھر جیسے اسے بھول ہی گئے تھے۔ اس کے بعد ہم اپنے ساتھیوں کو دفنانے کے لیے قبریں کھودنے لگے تھے۔ شہیدوں کو کفن نہیں دیا جاتا۔ ہم نے اسی لیے مجاہد اور تیتو میر کو انہی کپڑوں میں جو وہ پہنے ہوئے تھے، قبروں میں اتار دیا تھا۔ ایسے میں بھلا ہمیں شیلا کیا یاد آتی! اب شیر بہادر نے کھانے کے لیے کہا تھا تو پہلی بار مجھے اس کا دھیان آیا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی ذہن میں ابھرا کہ اسے اب تک ہوش آجانا چاہیے۔ پھر ایک اور خدشے نے سر ابھارا کہ کہیں ہوش آتے ہی وہ چیخنا چلانا شروع نہ کردے رات کے سناٹے میں اس کی چیخیں دور دور تک سنائی دے سکتی تھیں۔ اور ہم ایک نئے خطرے سے دوچار ہوسکتے تھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کمرے کے دروازے پر جو تالا پڑا تھا، اس کی چابی دلاور کے پاس تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا "دلاور! تم میرے ساتھ آؤ! لالٹین بھی اٹھالو۔"

دلاور کچھ کہے بغیر لالٹین اٹھا کر میرے ساتھ ہولیا۔ فتح خاں اسی کمرے میں موجود دوسری لالٹین جلانے لگا تھا۔

بائیں جانب باورچی خانے کے بعد ہی وہ کمرا سامنے کے رخ پر تھا۔ لالٹین زمین پر رکھ کر دلاور نے تالا کھولا، پھر کنڈی نیچے گرا کر دروازے کو آہستہ سے اندر کی جانب دھکا دیا۔ میں نے جھک کر لالٹین اٹھائی اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ تاریک کمرا روشن ہوتے ہی میرے اعصاب پر ایک چھناکا سا ہوا کمرا بالکل خالی تھا اور شیلا غائب تھی۔



اداسی کا غبار ذہن پر چھایا ہو تو ہر شے کا تاریک ہی پہلو سامنے آتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ میرے دل و دماغ اپنے شہید ساتھیوں کے غم سے نڈھال تھے۔ شاید اسی سبب فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ ایک مقفل کمرے سے کسی لڑکی کا غائب ہوجانا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ میں تو اس وقت چونکا تھا جب مجھے دائیں جانب کچھ فاصلے پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں تیزی سے اس طرف پلٹا اور پھر طویل سانس لے کر رہ گیا۔

دائیں جانب مجھے اسی کمرے سے ملحق ایک کوٹھری کا کھلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ شیلا ہوش میں آنے کے بعد اندھیرے میں یقیناً سمت کا اندازہ نہیں لگا سکی اور اس کوٹھری کے دروازے سے اندر چلی گئی۔ میں نے سوچا اور کوٹھری کے دروازے کی طرف لالٹین ہاتھ میں لیے بڑھا۔ دلاور نے بھی میری تقلید کی۔ عین اسی لمحے ہلکی سی نسوانی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی اور پھر گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ میں چونک کر اٹھا اور پلٹ کر دلاور کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ خوف زدہ سی نسوانی چیخ معدوم ہو چکی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر تیزی کے ساتھ اس کوٹھری میں داخل ہو گئے۔

چھوٹی سی وہ کوٹھری لالٹین کی روشنی میں جگمگا اٹھی تھی۔ وہاں قدم رکھتے ہی ایک بار پھر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کوٹھری بھی قطعی خالی تھی۔ وہاں ہم دونوں ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چند ہی لمحے پہلے میں نے ایک نسوانی چیخ سنی تھی جو ظاہر ہے کہ فریبِ سماعت نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق شیلا ہی چیخی تھی مگر وہ کیوں چیخی تھی اور کہاں غائب ہو گئی تھی؟ یہ سوال میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھا۔

"تم نے بھی چیخ سنی تھی نا؟" جانے کس خیال کے تحت میں نے دلاور سے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں" دلاور نے جواب دیا اور مزید بولا "چیخ کے ساتھ ہی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دی تھی، ایسی آواز جو کسی بھاری شے کے لڑھکنے یا اپنی جگہ سے ہٹ جانے پر پیدا ہوتی ہے۔"

دلاور کی اس بات سے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

"کہیں اس عمارت میں کوئی خفیہ تہ خانہ تو نہیں؟" میں نے دلاور سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"اس سلسلے میں تو مالک مکان ہی حتمی طور پر کچھ بتا سکتا ہے" دلاور بولا "وہ یہیں بھاٹی گیٹ ہی میں رہتا ہے، اس سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"تصدیق ہمارے لیے کسی خطرے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں خود ہی اس خفیہ تہ خانے کا سراغ لگانا چاہیے" میں نے کہا۔

[illegible] کوٹھری کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹھری کا فرش اور دیواریں پتھر کے چوکور ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ایک جگہ دیوار پر پتھروں کے جوڑ کے درمیان مجھے مسالا نظر نہیں آیا۔ میں نے اس پر دباؤ ڈالا تو خلافِ توقع وہ اندر دھنستا چلا گیا اور اسی وقت جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی اور ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں لمحہ بھر پہلے جس پتھر پر کھڑا تھا، وہ زمین میں غائب ہوتا چلا جا رہا تھا پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ اپنی جگہ واپس آگیا۔ مجھے یا دلاور کو اس تاریک خلا میں جھانکنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

وہ کسی تہ خانے کا راستہ ہی ہو سکتا تھا جس کا میں نے سراغ لگایا تھا۔ نادانستگی میں شیلا کا ہاتھ دیوار پر اس جگہ پڑ گیا ہوگا جس کے دبنے سے فرش کا پتھر زمین میں دھنس گیا اور پھر وہ تہ خانے میں جا پڑی ہوگی۔ معلوم نہیں مالک مکان نے وہ خفیہ تہ خانہ کس غرض سے بنوایا تھا؟ اس سوال پر غور کرنے کے بجائے اس وقت پہلے شیلا کو تہ خانے سے نکالنا ضروری تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ شاید پھر بے ہوش ہو گئی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو فرش پر خلا پیدا ہوتے ہی اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں ضرور سنائی دیتیں۔

کچھ سوچ کر میں نے دلاور کو چند ہدایات دیں اور پھر لالٹین ہاتھ میں لیے اسی بڑے سے چوکور پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ دلاور نے میری ہدایت کے مطابق دیوار والے پتھر پر ساتھ ہی دباؤ ڈالا اور میں خلا میں دھنسنے لگا۔ وہ پتھر خاصی تیزی سے بائیں جانب کھسکا اور میں تہ خانے میں جا گرا۔ تہ خانہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں کیوں کہ پہلے سے چوکنا تھا اس لیے گرتے گرتے اپنے جسم کا توازن بگڑنے نہ دیا ورنہ ہاتھ سے لالٹین ضرور گر جاتی۔ فرش پر ذرا ہی دور کسی صورت میں مجھے شیلا نظر آئی۔ وہ واقعی بے ہوش تھی۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، تہ خانے کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ خلا ابھی تک برقرار تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے دلاور سے کہا تھا کہ وہ دیوار کے پتھر پر دباؤ برقرار رکھے تاکہ راستہ بند نہ ہو مگر اب نہ صرف خود اس تہ خانے سے نکلنے کا مسئلہ درپیش تھا بلکہ شیلا کو بھی وہاں سے نکالنا تھا۔

"دلاور!" میں نے بلند آواز میں اپنے ساتھی کو پکارا "اپنی مدد کے لیے بخت خاں کو بلالو اور ایک مضبوط رسی لے آؤ!"

"میرے ہٹنے سے راستہ بند ہو جائے گا" میں دباؤ..."

"ہو جانے دو بند، پھر کھول لینا!" میں نے اس کی بات

کاٹ دی۔

دوسرے ہی لمحے ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ خلا بند ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مجھے قدرے گھٹن کا احساس ہوا۔ ممکن ہے تہ خانے میں بھی خلا پیدا کرنے کا کوئی نظام رہا ہو مگر میں نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی۔

کچھ ہی دیر بعد چھت میں پھر خلا نظر آنے لگا۔ اسی کے ساتھ ایک موٹی سی رسی نیچے پھینکی گئی اور بخت خاں کی آواز آئی۔

بے ہوش شیلا کو اس تہ خانے سے نکالنا مشکل ثابت نہ ہوا۔ ہم نے اسے وہاں سے ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا۔ اسے ہوش میں لایا گیا تو وہ بے انتہا خوف زدہ تھی۔ میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا اور تسلی دی۔ وہ اس طرح میری باتیں سن رہی تھی جیسے یقین نہ ہو۔

"تم یہاں سے فرار ہونے یا چیخنے چلانے کی کوشش نہیں کرو گی تو ہم تمہیں اپنے مہمان کی طرح رکھیں گے۔ بہ صورت دیگر ہمیں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھنے پڑیں گے اور تم بھی یقین کرو کہ یہاں تمہاری عزت و آبرو اور زندگی محفوظ رہے گی پھر جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، جلد ہی تم رہا کر دی جاؤ گی۔"

میری بات کے جواب میں وہ کچھ نہ بولی اور اس نے سر جھکا لیا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے سامنے اپنا چہرہ چھپائے بغیر نہیں آیا تھا۔ میرے چہرے پر نقاب تھی۔ اس کے بعد میں، بخت خان کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔ وہاں ہم نے ایک لالٹین چھوڑ دی تھی تاکہ اندھیرے میں وہ زیادہ خوف زدہ نہ ہو۔

شیر بہادر نے فتح خاں کی مدد سے کھانا بنا لیا۔ پہلے شیلا کو کھانا بھجوایا گیا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھیوں کی خاطر مجھے چند لقمے لینے ہی پڑے۔

دوسرے دن ہمارے حواس کسی قدر قابو میں آئے تو گزشتہ روز پیش آنے والے واقعے پر گفتگو ہوئی۔ لوہاری گیٹ کے ٹھکانے کا علم خفیہ والوں کو کس طرح ہو گیا، اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر قیاس یہی تھا کہ دلاور کا تعاقب کرتے ہوئے وہ لوگ وہاں پہنچے تھے۔ ادھر دلاور وہاں پہنچا ادھر دروازے پر دستک ہوئی۔ بخت خاں وغیرہ نے یہ سمجھا کہ کوئی ساتھی ہی آیا ہوگا۔ ان کا دھیان دلاور کی طرف گیا تھا۔ گمان غالب یہ تھا کہ کسی طرح انہیں دلاور پر شبہ ہو گیا تھا اور وہ دلاور کی نگرانی کر رہے تھے۔ دلاور کی نگرانی کرتے ہوئے انہوں نے دروازے کھلوانے کے لیے شناختی الفاظ بھی سن لیے ہوں گے۔ یہی شناختی الفاظ دروازہ کھلوانے کے لیے خود انہوں نے بھی ادا کیے تھے اور پھر گھر میں اچانک داخل ہو کر اسلحے کے زور پر سب کو قابو میں کر لیا تھا۔ ان کے نگراں افسر جارج نے کچھ مسلح افراد کو باہر بھی گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی اس چوہے دان میں آکر پھنس سکتے ہیں۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

بخت خاں اور دوسرے ساتھیوں سے انگریز افسر میرے بارے میں سوالات کر رہا تھا کہ طارنوش کہاں ہے؟ میرے کسی بھی ساتھی کو میرا اصل نام معلوم نہیں تھا اس لیے انہوں نے لاعلمی ہی کا اظہار کیا کہ وہ طارنوش نامی کسی شخص کو نہیں جانتے اگر وہ میرے اصل نام سے واقف بھی ہوتے تو بھی ان کا جواب یہی ہوتا۔

جارج نے دھمکیوں سے کام نہ چلتے دیکھ کر تشدد کا سہارا لیا مگر ظاہر ہے جو بات ان کے علم ہی میں نہیں تھی کس طرح بتا دیتے۔ میں اسی اثنا میں گھر کے باہر پہنچ گیا پھر جو کچھ ہوا، میرے سامنے ہوا۔

"معلوم نہیں یہ طارنوش کون ہے جس کے بارے میں جارج ہم سے پوچھ گچھ کر رہا تھا؟" بخت خاں کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"ممکن ہے کہ وہ بھی کوئی ہمارا ہی ساتھی ہو جس سے ہم ناواقف ہوں" میں نے خیال آرائی کی "اگر ایسا نہ ہوتا تو خفیہ والوں کو اس کی تلاش نہ ہوتی۔"

"مجھے کچھ یاد سا پڑتا ہے شاہین کہ جس وقت ٹیٹو میر کو شہید کر دیا گیا اور جارج نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تو میں نے ایک نامانوس اور اجنبی سی آواز سنی تھی۔ کیوں دلاور؟ تم نے بھی سنی تھی نا وہ آواز!"

"ہاں" دلاور نے تصدیق کی "کسی نے چیخ کر کہا تھا کہ تیری قضا آگئی کیتے! طارنوش آگیا!"

"اور پھر اچانک بازی پلٹ گئی تھی" بخت خاں کہنے لگا "جارج باہر بھاگ کر گیا تھا اور پھر ہم نے اس کی چیخیں سنی تھیں۔ اس کے بعد ہمیں یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی نادیدہ پُراسرار وجود وہاں موجود سپاہیوں کے لیے پیغامِ اجل بن گیا ہو۔ وہ سپاہی جو مجھ پر سنگین تانے کھڑا تھا، اسے میں نے خود بہ خود ڈھیر ہوتے دیکھا اور پھر دوسرے سپاہی کا بھی وہی حشر ہوا۔ دوسرا سپاہی وہ تھا جو دلاور کے سینے پر سنگین رکھے کھڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زندہ بچ جانے والے دو سپاہیوں میں سے صرف ایک میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔

دوسرے سپاہی پر کس نے گولی چلائی تھی؟ یہ سوال بھی حیران کن ہے۔"

"جو واقعات تم لوگوں نے بیان کیے ہیں، ان سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی پُراسرار وجود ہماری مدد کررہا ہے۔ وہ کون ہے؟ اس سوال سے قطع نظر ہمارے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ وہ ہمارا ہمدرد اور مددگار ہے۔ اسے ہم تائید ایزدی یا غیبی امداد بھی کہہ سکتے ہیں" میں نے بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا، کیوں کہ ان تمام باتوں کا کوئی عقلی جواز ممکن نہیں تھا اور ساتھیوں کو کسی طرح مطمئن بھی کرنا تھا۔

"جارج کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا کہ طارنوش آگیا" بجت خاں نے کہا "پھر اس کے بعد بازی پلٹی تھی اور پُراسرار واقعات پیش آئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی تو نکلتا ہے کہ وہ پُراسرار وجود طارنوش ہی ہوسکتا ہے۔" بجت خاں درست اندازے لگا رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر میرے ساتھیوں کو یہ معلوم ہوگیا، میں ہی طارنوش ہوں تو پھر ان پر میری پُراسرار قوتوں کا راز کھل جائے گا۔ میں یہ کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے دانستہ اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور بولا "مگر بجت خاں اگر طارنوش واقعی کوئی پُراسرار وجود ہوتا تو پھر جارج اس کے بارے میں تم لوگوں سے کیوں پوچھ گچھ کرتا؟ پھر یہ کہ اگر وہ آگیا تھا تو کسی کو نظر کیوں نہیں آیا؟"

"شاہین! نظر نہ آنے کی وجہ سے تو اس کا پُراسرار وجود ہوسکتا ہے" بجت خاں نے جواب دیا "لیکن تمہارا سوال واقعی الجھا دینے والا ہے۔ خفیہ والے کسی پُراسرار وجود کے بارے میں کس طرح جان سکتے ہیں؟"

کافی دیر یہی موضوع زیر بحث رہا مگر ظاہر ہے کہ کوئی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ سوائے قدرت کی طرف سے غیبی مدد کے ان واقعات کا کوئی اور جواز پیش کیا جانا ممکن نہیں تھا۔

دلاور کے بارے میں کیوں کہ یہ شبہ ہوچکا تھا کہ وہ قانون کی نظر میں آچکا ہے، اس لیے میں نے اسے فوری طور پر لاہور چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ فتح خاں میرا پیغام لے کر اسی روز صبح دہلی روانہ ہوچکا تھا۔ لاہور میں جو کچھ ہوا تھا، پُراسرار واقعات کا ذکر حذف کرکے اس کی تفصیلی رپورٹ مجاہد اوّل کو روانہ کردی تھی۔

اس دن کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو افراد میں سے ایک سو بائیس افراد کو پولیس نے ابتدائی تفتیش کے بعد رہا کردیا تھا۔ اب بھی پولیس کی حراست میں ستائیس افراد تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں پولیس نے دھرم دیر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔

پیش آنے والے روح فرسا واقعے کے سبب وقتی طور پر میں نے تنظیم کی تمام تر سرگرمیاں موقوف کردیں۔

اس طرح دس روز گزر گئے۔ اس دوران میں تین افراد کے سوا پولیس نے تمام افراد کو چھوڑ دیا۔ ان تینوں افراد کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ پولیس کو پہلے سے مطلوب تھے۔ ان پر دیگر مقدمات بھی تھے۔ ان کا چالان عدالت میں پیش کردیا گیا۔ اس سلسلے میں سیٹھ حکم چند اور دوسرے ہندو سیٹھوں نے مسلمانوں کی رہائی کے لیے انتہائی کوشش کی اور اہل لاہور کے لیے یہ بات بہت حیران کن تھی۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ہندو سیٹھوں کے دل میں اچانک مسلمانوں کا درد کیسے پیدا ہوگیا تھا؟ کیوں کہ وطن پرست تنظیم نے دھرم دیر کے قتل کی ذمے داری قبول کرلی تھی اس لیے پولیس کا کیس خاصا کمزور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیشن جج نے پہلی ہی پیشی میں مقدمہ خارج کردیا۔ بقیہ تینوں افراد بھی کم از کم اس کیس سے بری کردیے گئے۔ ان پر جو دوسرے کیس تھے، وہ البتہ قائم رہے جن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وعدے کے مطابق ہم نے سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا کو اس کے گھر پہنچادیا تھا۔ میں نے اس عرصے میں دانستہ اس کے سامنے جانے سے گریز کیا تھا تاکہ اسے دیکھ کر مجھے اپنی مقتول بہن کلونت کور کی یاد نہ آجائے۔ سیٹھ حکم چند سے میں نے جو اعتراف نامہ لکھوایا تھا، اسے عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شیلا کو رہا کیا جارہا تھا تو وہ ہماری حد ممنون تھی، اس نے کہا تھا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بچپن ہی سے مجھے تو کچھ اور بتایا گیا تھا۔ میں تو مسلمانوں کو انتہائی ظالم اور عزت و آبرو کا دشمن سمجھتی تھی" یہ ایک متعصب ہندو گھرانے کی نوجوان دوشیزہ کے الفاظ تھے۔

وہ گیارہواں دن تھا جب مجاہد اوّل کی طرف سے مجھے لاہور سے کلکتے روانگی کا حکم ملا۔ میں یہ حکم سن کر خوش ہوا کیوں کہ کلکتے ہی میں فاطمہ بھی تھی۔ اس سے بچھڑے مجھے ایک عرصہ ہوگیا تھا لیکن حکم کے ساتھ ہی جو ہدایات ملی تھیں ان پر عمل کرتے ہوئے مجھے وہاں جو گیند رہا فاطمہ سے فوری طور پر رابطہ قائم نہیں کرنا تھا۔ اس کے باوجود میرے لیے یہی کم خوش کن بات نہیں تھی کہ میں وہاں، اس شہر میں جارہا تھا، جہاں فاطمہ تھی۔

لاہور سے کلکتے روانگی کسی نئی مہم ہی کے سلسلے میں ممکن تھی، اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا مگر مہم کی نوعیت کا قطعی علم نہیں تھا۔ کلکتہ میرے لیے ایک نیا شہر تھا۔ میں اس سے پہلے وہاں نہیں گیا تھا۔ مجاہد اوّل نے مجھے ایک پتہ تعارف بھی بھیجا تھا۔ یہ پیغام مجھے کلکتے میں سیٹھ صدیق کو پہنچانا تھا۔ سیٹھ صدیق اس زمانے میں کلکتے کی جانی پہچانی شخصیات میں سے ایک تھے۔ مجھے تعجب سا تھا کہ وہ پیغام میرے ہی بارے میں ہوگا۔ سیٹھ صدیق کلکتے کے بہت بڑے مسلمان تاجر تھے جن کی دریا دلی کے قصے زبان زد خاص و عام تھے۔ تحریک خلافت کے لیے وہ دل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ مجھے سیٹھ صدیق ہی کو مجاہد اوّل کا پیغام پہنچانا تھا۔ اسی کے ساتھ مجاہد اوّل نے مجھ پر یہ پابندی لگادی تھی کہ سیٹھ صدیق کو خط پہنچانے کے بعد میں دوبارہ ان سے اسی وقت ملوں گا جب متوقع مہم کی تکمیل ہوجائے گی۔ مہم کے بارے میں ضروری ہدایات مجھے کلکتے ہی میں ملنا تھیں۔ کلکتے کے ساتھ ہی فاطمہ کا تصور میرے لیے انتہائی سکون بخش تھا۔ وہ میرے دل کے قریب رہتی تھی مگر قریب رہ کر بھی کتنی دور دور تھی۔ اس وقت فاطمہ کا خیال مجھے یوں لگا جیسے میں کسی قلعے کی شکستہ اور جلتی ہوئی فصیل کے کنگورے پر کھڑا ہوا دشمن کی منجنیقوں سے اچھلتے ہوئے پتھروں اور جلتے تیروں کی بارش کو اپنے سینے پر روک رہا ہوں اور فاطمہ بہت دور کسی پُرسکون وادی میں بنی ہوئی کٹیا کے دروازے پر جلتا ہوا دیا لیے کھڑی ہے تاکہ میں اندھیری رات میں رستہ نہ بھول جاؤں۔ فاطمہ میرے لیے دھنک کے خوش نما رنگوں کی کمان تھی جسے میں دیکھ سکتا تھا جس کے رنگوں میں میرا ذہن نہا سکتا تھا لیکن جسے میں چھو نہیں سکتا تھا۔

O☆O

ٹرین تیز رفتاری سے کلکتے کی طرف اڑی جارہی تھی۔ فرسٹ کلاس کے اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں اکا دُکا ہی مسافر تھے۔ میرے ساتھ لاہور سے صرف بجت خاں ہی چلا تھا مگر کلکتے پہنچ کر ہم دونوں کو الگ ہوجانا تھا۔ اس کی سکونت کا بندوبست مجھ سے الگ کیا گیا تھا۔ اسے کولوٹولہ کی ایک بلڈنگ میں ٹھہرنا تھا۔

لاہور میں جو واقعات پیش آئے تھے، انہیں میں نے اپنے ذہن سے دانستہ جھٹک دیا تھا۔ وہاں سے چلتے وقت تیتو میر کی یاد میرا سینہ چھلنی کررہی تھی کہ وہ وہیں کی مٹی کا حصہ بن چکا تھا مگر پیش قدمی کرنے والے فوجی کبھی پلٹ کر یہ نہیں دیکھتے کہ پیچھے کیا ہوا؟ کون دشمن کی چلائی ہوئی گولی کا شکار ہوا؟ انہیں تو بس سامنے اپنے ہدف پر نظر رکھتے ہوئے بڑھنا ہوتا ہے۔ میرا ذہن اب متوقع مہم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ حکومت وقت کے خلاف ہی ہوسکتی تھی۔

میں اور بجت خاں بقیہ مسافروں سے دور انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد پر مصروف گفتگو تھے۔ ہماری آوازیں دھیمی تھیں۔ میں بجت خاں سے کہہ رہا تھا "ہماری جدوجہد ضرور کامیاب ہوگی بجت خاں! ہماری زندگی میں نہیں تو آنے والی نسل کی زندگی میں! مجھے صرف اتنا یقین ہے کہ میں اور میرے ساتھی اس جنگ آزادی کا ہراول ہیں جو لڑی جانے والی ہے اگر ہم نے اپنا فرض دیانت داری سے انجام دیا تو ہمارے پیچھے آنے والوں کو آگے بڑھنے میں آسانی ہوگی میرے دوست!"

"اس کے باوجود کبھی کبھی میرا دل ڈوب سا جاتا ہے شاہین! مجھے اعتراف ہے کہ میں مایوسیوں کا شکار ہوجاتا ہوں۔" بجت خاں بولا۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا کیوں کہ پہلے کبھی بجت خاں نے ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔

"وہ اس لیے شاہین کہ میں اپنے لوگوں کو بٹتے اور تقسیم ہوتے دیکھ رہا ہوں" بجت خاں نے گہرا سانس لیا "ہندوستان ایک ملک ہے مگر یہاں کے لوگ گروہ در گروہ بٹ رہے ہیں۔ سب سے پہلی تقسیم ہندو اور مسلمان کی ہے پھر ہندو اور مسلمان مزید ٹکڑیوں میں منقسم ہیں۔ ٹھیک ہے، اس وقت ہندو مسلم ایکتا کا بہت چرچا ہے، خاص طور پر جب سے مولانا جوہر اور ان کے ساتھی رہا ہوئے ہیں؟ گاندھی جی اچھوتوں کی دل جوئی میں مصروف ہیں۔ اتحاد کے لیے بڑی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس اتحاد کے مظاہرے بھی جاری ہیں مگر اسی کے ساتھ اس اتحاد کو مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھیر دینے کی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔"

"یہ دنیا اسی آویزش اور تصادم کا نام ہے بجت خاں!" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس تصادم سے ایک نئی قوت اور توانائی جنم لے گی۔"

"میں اتنی خوش فہمیوں کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا" بخت خاں بولا "میں اس کا بھیانک انجام دیکھ رہا ہوں۔ اتحاد اور ایکتا کی باتیں جو اس وقت ہو رہی ہیں' وہ سب مجھے مصنوعی معلوم ہو رہی ہیں' بے سود لگتی ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک طرف ہم ہندوستانی ایکتا کی باتیں کرتے ہیں' دوسری طرف ہم آپس کی تقسیم اور تفریق کو گہرا کرتے جا رہے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی آوازیں جب میں سنتا ہوں تو چونک اٹھتا ہوں۔ جب ہم پانی کو ہندو اور مسلمان میں تقسیم کرسکتے ہیں تو پھر کیا نہیں کرسکتے! یہ آوازیں سن کر میرے اندر سے آواز ابھرتی ہے شاہین کہ ایک دن ہندو ہندوستان اور مسلمان ہندوستان کی صدائیں بھی لگیں گی اور پھر ہندوستان کی تقسیم کو کوئی نہیں روک سکے گا۔" بخت خاں کی آواز بھرا گئی۔ اس کے چہرے سے انتہائی دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں سوچنے لگا' بخت خاں واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔

"اور جب یہ آوازیں لگیں گی تو ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان کے لیے سوتیلی ماں بن جائیں گے" بخت خاں کہہ رہا تھا "وہ اس تقسیم پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس وقت ہندوستان کی کوئی سگی ماں نہ ہوگی جو بڑھ کر یہ کہے کہ نہیں اس کے دو ٹکڑے نہ کرو' یہ دوسرے کو دے دو!"

"یار' تم تو بڑی ہولناک تصویر دکھا رہے ہو" میں نے کہا۔

"یہ تصویر میں اکثر اپنے تصور میں دیکھتا ہوں۔ دونوں قوموں کے افراد میں چھپا ہوا انسان مر رہا ہے۔ آخر ہمارے لیڈر جو اتحاد اور ایکتا کے راگ الاپتے ہیں' ہندو پانی اور مسلمان پانی کی تفریق ختم کیوں نہیں کرتے؟ ایک پلیٹ فارم سے لمبے چوڑے دعووں سے پُر تقریریں کرنے والے لیڈر اسٹیشنوں پر آکر ہندو پانی اور مسلمان پانی کو ملا کیوں نہیں دیتے!"

"مگر اس انداز میں سوچنے سے فائدہ کیا بخت خاں!" میں بولا "ہمیں تو بس اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اسے حاصل کیا جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہین' مگر جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ حقیقت ہے۔ جو لنگڑی لولی ہندو مسلم ایکتا اس وقت قائم ہوئی ہے' انگریز اسے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے اشارے پر بہت سے ہندو اور مسلمان اس اتحاد کو ختم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔"

مستقبل کے انہیں اندیشوں اور وسوسوں میں سفر تمام ہوا۔ کلکتے شہر کا کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔ دریائے ہگلی کے ایک کنارے پر کلکتہ شہر آباد ہے۔ اور دوسرے کنارے پر ہاوڑا شہر۔ ٹرینیں ہاوڑا اسٹیشن ہی پر رکتی ہیں۔ دریائے ہگلی پر ہاوڑا برج ہے جسے کلکتہ شہر کی عظمت کا نشان کہا جا سکتا ہے۔ یہ بے ستون پل دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اتنا بڑا پل کسی ستون کے بغیر کمان کی صورت نظر آتا ہے۔

ہر چند کے بخت خان اور مجھے ایک ہی طرف جانا تھا۔ لوئر چیت پور روڈ سے کولو ٹولہ زیادہ دور نہیں تھا مگر ہم دونوں ہاوڑا ریلوے اسٹیشن ہی پر جدا ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ جیسے ہی مجھے موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے سے فاطمہ اور جوگیندر کی طرف جانے کی اجازت مل گئی' میں وہاں پہلی فرصت میں پہنچوں گا۔ جوگیندر کے والد موہن لال' ٹالی گنج میں رہتے تھے۔ یہ ہندوؤں کی آبادی کا بہترین اقامتی علاقہ تھا۔ جوگیندر مجھے اس سلسلے میں بتا چکا تھا۔ ٹالی گنج میں موہن لال جی کی کوٹھی کا پتا میرے پاس موجود تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجاہد اوّل کی طرف سے فاطمہ اور جوگیندر کے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے گی۔

میں موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں پہنچ گیا جو لوئر چیت پور روڈ پر تھا۔ مسافر خانہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہاتھ رکشا والے نے مجھے وہیں لے جا کر اتارا۔ میں اپنے پروگرام سے تین روز پہلے ہی کلکتے پہنچ گیا تھا۔

میرا یہ فیصلہ کہ مجھے مجاہد اوّل کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کوئی ہدایت ملنے سے پہلے ٹالی گنج کا رخ نہیں کرنا چاہیے' درست ہی ثابت ہوا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ قبل از وقت کلکتے پہنچ گیا ہوں تو جوگیندر اور فاطمہ سے مل لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تین دن میں ان کے ساتھ گزار کے مقررہ دن مسافر خانے میں آ جاؤں گا۔ یہ میرے دل کی آواز تھی جو فاطمہ کے قرب کا خواہش مند تھا مگر میرے ذہن نے دل کی اس خواہش پر فرض کو ترجیح دی۔

مجھے ابھی مسافر خانے میں آئے ہوئے آدھا گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے شناختی الفاظ دہرائے "ہم پانی میں آگ لگا سکتے ہیں" یہ شناختی الفاظ تھے۔

میں نے جواب دیا "خزاؤں کا سکوت خشک پتوں کے ساز پر کسی اداس لے میں نغمۂ بہار ہے" یہ جوابی شناختی الفاظ تھے۔

اس نے مجھے اور میں نے اسے ان الفاظ کے ذریعے پہچان لیا۔ وہ اندر آگیا۔ میں حیران تھا کہ وہ اس وقت کیوں اور کیسے میرے پاس پہنچ گیا؟ میں تو تین دن پہلے کلکتے آگیا تھا۔ میں نے اس سے کہا "مجھے حیرت ہے' میرا خیال تھا کہ مجھے تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

"مجھے رات ہی تار ملا تھا ساتھی شاہین!" اس نے کہا "ورنہ ہمارے پاس بھی یہ اطلاع تھی کہ آپ یکم کو یہاں پہنچیں گے" اس نے جیب سے تار نکالا "یہ دیکھیں!"

تار دہلی سے دیا گیا تھا۔ تار کا وہ حصہ پھاڑ دیا گیا تھا جس پر تار وصول کرنے والے کا نام اور پتا لکھا ہوتا ہے۔ تار کا مضمون یہ تھا "شاہین ۳۰ کو کلکتے پہنچ رہا ہے۔ مال کی بکنگ منسوخ ہو چکی ہے۔ مزید دو کریٹ نہیں بھیجے جاسکتے" میں نے تار کا مضمون پڑھ کر اسے تار واپس کردیا۔

"دیکھا آپ نے!" نو وارد نے کہا "اس طرح ہمیں آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی تھی۔"

"باقی دو جملوں کا مطلب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ متوقع مہم منسوخ کردی گئی ہے۔ یہاں مزید جن دو ساتھیوں کو پہنچنا تھا' اب وہ نہیں آئیں گے۔"

"مہم کیوں منسوخ کردی گئی؟" میں نے معلوم کیا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم ساتھی!" آنے والے نے کہا "میں آپ کو صرف یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ اگلے ہفتے' آج ہی کے دن شام ٹھیک چار بجے وکٹوریہ میموریل کے سامنے' میرا مطلب ہے مین گیٹ کے سامنے آپ موجود ہوں۔ آپ کے ہاتھ میں گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کا تازہ شمارہ ہونا چاہیے۔ ٹھیک چار بجے جب آپ مین گیٹ کے سامنے سے گزریں تو جھک کر اپنے جوتے کا فیتہ کھول کر باندھیں' یوں جیسے آپ فیتہ کس رہے ہوں۔ فیتہ کسنے کے بعد آپ "ینگ انڈیا" کا شمارہ موڑ کر بغل میں دبالیں اور رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے آگے چلے جائیں۔ سمجھ گئے نا آپ؟ اگلے ہفتے آج ہی کے دن' شام چار بجے وکٹوریہ میموریل اور ینگ انڈیا کا تازہ شمارہ! جب آپ مین گیٹ کے سامنے سے گزریں گے تو۔" اس نے ہدایات دہرائیں۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں اسی مسافر خانے میں مقیم رہوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس سلسلے میں میرے پاس کوئی ہدایت نہیں ساتھی!" وہ بولا "البتہ یہ ہدایت ضرور ملی ہے کہ اس عرصے میں آپ کلکتے کے محلوں' آبادیوں اور شاہراہوں سے جتنا زیادہ سے زیادہ واقف ہوسکتے ہیں' واقف ہو جائیں۔"

"اور کچھ؟"

"فی الحال اور کچھ نہیں۔ اب کوئی آپ سے رابطہ قائم نہیں کرے گا" اس نے جواب دیتے ہوئے بتایا "اچھا میں چلتا ہوں' خدا حافظ!"

میں نے پھر دروازہ بند کرلیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک وہ مہم منسوخ کیوں کردی گئی جس کے بارے میں مجھے معلوم تک نہیں تھا کہ تھی کیا؟ میں نے آنے والے ساتھی سے اس سلسلے میں پوچھا بھی تھا مگر جب اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اصرار کرنا ضروری نہیں سمجھا کیوں کہ یہ بات تنظیم کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھی۔ تنظیم کی ایک طے شدہ پالیسی تھی کہ کسی بھی مہم کے بارے میں صرف اتنے ہی ساتھیوں کو علم ہوتا جنہیں متعلقہ مہم میں براہِ راست حصہ لینا ہوتا یا مہم کے کسی مرحلے پر ان کی مدد کرنا ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کسی ساتھی کو کوئی مہم سونپی جاتی' اس سے رازداری کا حلف بھی لیا جاتا۔

میرا تنظیمی ساتھی مجھے اطلاع دے کر کبھی کا جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرا کلکتے آنا بے سود ہی رہا لیکن شاید اب مجھے اسی شہر میں کوئی نہ کوئی مہم سونپی جانی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اگلے ہفتے وکٹوریہ میموریل کے سامنے پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اصل مہم کیوں ملتوی کی گئی؟ یہ سوال میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ کیا حکومت کو ہمارے ارادوں کا علم ہوگیا تھا؟ یہ امکان بہرحال نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں' تو پھر وہ کالی بھیڑ کون تھی؟

اب میرے لیے مسافر خانے میں رکنا محال تھا۔ میں نے فوراً ہی وہاں سے جوگیندر کی کوٹھی میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا اصل سبب تو فاطمہ سے ملاقات ہی تھی لیکن اس کے علاوہ میں جوگیندر سے بھی گفتگو کرنا چاہتا تھا اور آج ہی رات سیٹھ صدیق سے مل کر مجاہد اوّل کا خط انہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

میں مطلوبہ پتے پر ٹالی گنج پہنچ گیا تو جوگیندر اور فاطمہ مجھے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے۔

"خیریت؟" جوگیندر میرے سینے سے لگ کر بولا۔ فاطمہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس طرف جوگیندر کی پشت تھی۔ میں نے ہونٹوں کو نیم دائرے کی صورت میں بنا کر ایک محبت بھرا اشارہ کیا۔ جواب میں وہ یاقوتی لب بھی حرکت کرنے لگے۔ مجھے اپنا دل ان حسین لبوں کے درمیان دھڑکتا محسوس ہوا۔

اسی وقت جوگیندر مجھ سے الگ ہو کر بولا "تم اچانک لاہور سے یہاں کب اور کیسے پہنچ گئے؟"

مختصراً میں نے اسے حالات سے آگاہ کردیا۔

"شاہین! تمہیں۔ یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر یقین سا نہیں آرہا آنکھوں پر!" فاطمہ کی نظریں میرے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

"اشنان (غسل) کرو گے؟" جوگیندر نے کہا "میرا خیال ہے تمہیں وہاں سے فوراً ہی بھاگنا پڑا ہے۔"

"پہلے میری بات سن لو" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جوگیندر کو مخاطب کیا "یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ متوقع مہم منسوخ ہوچکی ہے۔ میں اسی لیے تم لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اب!"

"مہم کی منسوخی کی اطلاع مجھے بھی ہوگئی ہے" جوگیندر نے بتایا "پہلے کسی متوقع مہم کے آغاز ہونے کی خبر ملی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے میں پنجاب سے تمہیں بنگال بلالیا جائے گا۔ بہرحال اس پر ہم بعد میں بات کریں گے' فی الوقت تم نہا دھو کر تازہ دم ہوجاؤ۔"

غسل کرنے کے بعد کپڑے تبدیل کرکے جب میں باتھ روم سے آیا تو ڈرائنگ روم میں فاطمہ اور جوگیندر چائے پر میرا انتظار کررہے تھے۔

"کیوں' یہاں تمہارے پتا جی کے ساتھ کوئی اور نہیں رہتا؟" میں نے دریافت کیا۔

"دو ملازم ہیں" جوگیندر نے بتایا "اور ہفتے میں تین چار دن کوئی نہ کوئی مہمان آتا جاتا ہی رہتا ہے" پھر وہ ہنسا "کوئی بہت ہی راز کی بات ہے تو بتاؤ' باہر چلے چلتے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"سوچ لو جوگیندر بھیا!" فاطمہ بولی "جب تک شاہین جی یہاں ہیں' تم کوئی بات مجھ سے چھپ کر نہیں کرسکتے۔"

چائے پیتے ہوئے جوگیندر نے سیاست پر گفتگو شروع کردی۔ گزشتہ کئی روز سے میں اخبارات نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے مجھے گزشتہ تاریخ کا ایک اخبار دیا۔ وہ کہنے لگا "لو یہ دیکھو! یہ کانگریس کا تازہ ترین ریزولیوشن پڑھو!" اخبار دے کر وہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ فاطمہ میرے پاس رہ گئی۔ تشنہ کامان محبت کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ فاطمہ نے میری مسیحائی میں دیر نہ کی اور میں نہال ہوگیا۔

"بھیا! آتے ہوں گے اور ابھی تمہیں ریزولیوشن بھی پڑھنا ہے" اس کے سانسوں کی حرارت مجھ سے دور ہوگئی۔

"اخبار اس وقت ہمارا سب سے بڑا رقیب بن گیا ہے" میں نے کہا۔

"اب تو تم ساتھ ہی رہو گے پھر ایسی بے قراری کیا ہے؟" وہ مسکرا کر بولی۔ سرخ رنگ کی ساڑھی میں وہ ایک مہکتا ہوا گلاب معلوم ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جوگیندر واپس آیا تو میں ریزولیوشن پڑھ چکا تھا۔

"اب بتاؤ کیا خیال ہے؟" وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"انتہائی مایوس کن ریزولیوشن ہیں" میں نے تبصرہ کیا "یہ ریزولیوشن ہندوستان سے غداری ہیں بلکہ شرمناک پسپائی کے مترادف ہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا شاہین!" جوگیندر بولا "یہ اس ملک اور اس کے عوام سے غداری ہیں۔ ان کے ذریعے اصل بڑی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں کراچی خلافت کانفرنس نے بعض ایسے اہم اور انقلابی ریزولیوشن پاس کیے تھے جو ایک طرح سے برطانوی حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھے۔ کانگریس کے ان ریزولیوشنوں میں ایک جھنکار تو سنائی دیتی ہے مگر یہ جھنکار جنگ کے نقارے کی نہیں' بھڑکتے الاؤ پر پانی ڈالنے سے پیدا ہونے والی سنسناہٹ کی آواز ہے" جوگیندر اپنی رو میں کہے جارہا تھا "کراچی خلافت کانفرنس نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کے عوام' پولیس اور فوج کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس کانفرنس میں جو تقریر کی تھی' وہ ایک باغیانہ تقریر تھی جس کے نتیجے میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور سزا ہوئی۔ مولانا جوہر کی وہ آواز پورے ہندوستان کی آواز تھی مگر اب مولانا جوہر کی رہائی کے بعد ان ریزولیوشنوں سے ایسا لگتا ہے کہ کانگریس کو وہ طبل جنگ ہی سنائی نہیں دیا جس پر کراچی میں تھاپ پڑی تھی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگریس سے یہ چوک کیسے ہوگئی؟" میں نے کہا۔

"یہ بھول چوک کی بات نہیں ہے میرے دوست! یہ ایک سوچی سمجھی حرکت ہے" جوگیندر کی آواز پُرجوش اور پُریقین تھی "گاندھی جی نے سوراج کے قیام کے لیے ایک سال کی مدت دی تھی۔ انہوں نے یہ دعوے کیے تھے کہ یکم اگست کو ہندوستان میں سوراج قائم ہوجائے گا پھر انہوں نے یہ مدت جنوری تک بڑھادی۔ اس سوراج کے قیام کا تیسرا مرحلہ انہوں نے فوج اور پولیس کی ملازمتوں سے علیحدگی کو قرار دیا تھا۔ اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گاندھی جی اور کانگریس کا یہ فرض تھا کہ وہ اس ضمن میں

کوئی ریزولیوشن پاس کرتے' کراچی خلافت کانفرنس سے بڑھ کر ریزولیوشن پاس کرتے مگر انہوں نے تو خلافت کانفرنس کے اس ریزولیوشن کی حمایت میں بھی کلمۂ خیر نہیں کہا۔ کانگریس اور گاندھی جی کا یہ رویّہ مجرمانہ ہے" یہ کہہ کر جوگیندر خاموش ہوگیا۔

"ہوسکتا ہے کانگریس نے اس معاملے میں خلافت کمیٹی سے مشورہ کرکے یہ روش اپنائی ہو" میں نے اپنا خیال پیش کیا۔

"کیا بات کرتے ہو شاہین!" اس مرتبہ جوگیندر کا لہجہ تیکھا تھا "تم شاید کھل کر کچھ کہنے سے اس لیے بچ رہے ہو کہ تم مسلمان اور میں ہندو!" جوگیندر چند لمحوں کو خاموش ہوگیا۔ بات واقعی کچھ ایسی ہی تھی مگر پھر بھی میں نے اظہار نہیں کیا۔ جوگیندر کہہ رہا تھا "مگر میں شاہین' تمہیں بھی اور خود کو بھی صرف ہندوستانی سمجھتا ہوں' انسان سمجھتا ہوں! انسانیت میرے نزدیک سب سے بڑا مذہب ہے۔ مجھے بتاؤ شاہین! کیا تمہاری جدوجہد صرف مسلمانوں کے لیے ہے؟ یا پھر ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ہے؟"

"ہماری جدوجہد کا مقصد ہندوستان کی آزادی ہے' ہندوستان کے تمام باشندوں کی آزادی" میں بولا۔

"اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ ہوتا" جوگیندر پُرجوش آواز میں کہنے لگا "اسی وجہ سے میرے لہجے میں تلخی ہے۔ تمہیں یاد ہے' خلافت کانفرنس نے اعلان کیا تھا کہ فوج اور پولیس کے مقاطعے کی تحریک پورے ہندوستان کی امنگوں اور خواہشوں کی مظہر ہوگی۔ اب اگر کانگریس اس ریزولیوشن کی حمایت نہیں کررہی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کانگریس' فوج اور پولیس کے مقاطعے کی حمایت میں نہیں ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کانگریس اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے۔ اس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اور خلافت تحریک کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں سے ہے۔ کانگریس نے خلافت کانفرنس کی اس قرارداد کی حمایت نہ کرکے مسلمانوں کو اس تحریک سے الگ کرنے کی سازش کی ہے جس میں وہ آج تک ہندوؤں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ باور کرانا ہے کہ پولیس اور فوج کے مقاطعے کی تحریک صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ پتا ہے' اس طرح ہم پھر اٹھارہ سو ستاون میں آگئے ہیں۔ ہم آزادی سے اتنی ہی دور چلے گئے ہیں جتنے اٹھارہ سو ستاون میں تھے۔ کتنی ہولناک پسپائی ہے یہ!"

جوگیندر جو کچھ کہہ رہا تھا' صحیح تھا۔ کانگریس نے مولانا محمد علی جوہر اور خلافت تحریک کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ کانگریس اگر ایسا نہ کرتی تو شاید ہندوستانیوں کو وہ تمام مراعات مل جاتیں جس کا وہ مطالبہ کررہے تھے۔

"میں نے کہا تھا کہ کانگریس کے ان ریزولیوشنوں کی جھنکار بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی چھینکنے کی آواز ہے" جوگیندر کہہ رہا تھا "اس کا ثبوت بدیسی کپڑوں کو نذر آتش کرنے کا ریزولیوشن ہے گویا یہ اقدام فوج اور پولیس کے بائیکاٹ سے زیادہ اہم ہے۔ لوگوں کو اس معاملے میں پاگل بنانے کے لیے کل کا دن بھی مقرر کردیا گیا ہے تاکہ وہ یہ سوچ بھی نہ سکیں کہ کانگریس انہیں دھوکا دے چکی ہے۔ یہ ہے سیاسی پینترے بازی! اب عالم یہ ہے کہ سیاسی کارکنوں' رضاکاروں اور طلبہ کو اس کام پر لگادیا گیا ہے کہ وہ کلکتے کے گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں' ہر گھر اور ہر در کو کھٹکھٹا رہے ہیں اور بدیسی کپڑے جمع کررہے ہیں۔ یہی بمبئی میں بھی ہورہا ہے۔ لوگ ہیں کہ اصل تحریک کو بھول گئے ہیں۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ وہ پسپائی اختیار کررہے ہیں۔ وہ اصل تحریک سے ہٹ کر اس کے صرف ایک محدود حصے ہی کو اصل تحریک سمجھنے لگے ہیں۔ پولیس اور فوج کے مقاطعے کو تو چھوڑو' وہ تو یہ بھی بھول گئے ہیں کہ سوراج کی اصل تحریک کیا ہے۔ کانگریس نے بہت بڑا ظلم کیا ہے اگر وہ کراچی خلافت کانفرنس کی حمایت کرتی تو یہ آزادی کی سمت ایک لمبی چھلانگ ہوتی مگر کانگریس نے اس مرحلے پر ہندوستانیوں کی ٹانگ کھینچ لی ہے۔"

میں بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان سیاست دانوں کو کیا ہوگیا ہے؟"

"ہاں" جوگیندر نے تائید کی "سوچنے کی بات یہ ہے کہ بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ کرنے سے کیا فائدہ؟ برطانیہ سے صرف تین کروڑ پاؤنڈ کا کپڑا ہندوستان آتا ہے اگر ہم مقاطعہ کرکے اپنی ضروریات کا تمام کپڑا یہیں تیار کرنے لگیں تو کیا اس نقصان سے برطانوی استعمار کا ہندوستان سے خاتمہ ہوجائے گا؟ کیا برطانوی شہنشاہیت اس سے ختم ہوجائے گی؟ برطانیہ یہاں سے جتنی دولت سمیٹ رہا ہے' یہ تین کروڑ پاؤنڈ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ کانگریس نے جو رویّہ اختیار کیا ہے' بہت افسوس ناک ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے شاہین کہ ہندو پانی اور مسلمان پانی کا نعرہ سیاست میں بھی داخل ہوگیا ہے۔ ہندوستان کی سیاست اب ہندو سیاست اور مسلمان سیاست میں تقسیم ہوچکی ہے۔ جب سیاست بٹ جاتی ہے تو لوگ بٹ جاتے ہیں' جب لوگ بٹ جاتے ہیں تو

ملک تقسیم ہوجاتے ہیں۔ کانگریس نے بہت نقصان کیا ہے اور اس نقصان کی تلافی ناممکن ہوگی!"

جوگیندر کے خیالات حیرت انگیز طور پر بخت خاں سے مماثل تھے۔ لاہور سے کلکتہ آتے ہوئے اس نے بھی تقریباً ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ دو ذہن اپنی اپنی جگہ حالات وواقعات کا ایک ہی طرح اور ایک ہی سمت میں تجزیہ کررہے تھے مگر یہ باتیں تھیں بہت سچی اور کھری! وہ سینا واقعی ہندوستان کی سیاست کا ایک اہم موڑ تھا جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں کھڑے تھے۔

ہماری یہ گفتگو بہت دیر جاری رہی۔ معاً باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی اور فاطمہ یہ کہتی ہوئی باہر لپکی "پتا جی آگئے۔"

سیٹھ موہن لال اس مخلوط ہندو مسلم تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے جو ہندوستان میں صدیوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی لالہ مرلی دھر سے قطعی مختلف تھے جس سے میری ملاقات جلالی کی مہم کے دوران میں ہوئی تھی۔ جوگیندر اور فاطمہ ان کی تربیت اور ان کے مزاج کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ایک ہندو گھرانے کی لڑکی سیٹھ موہن لال کی بیٹی سیتا' اب مسلمان ہوکر فاطمہ بن چکی تھی اور اپنے باپ کے گھر میں رہ رہی تھی' یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی' بڑے دل گردے کی بات تھی۔ مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر سیٹھ جی نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا پھر وہ بھی ہماری گفتگو میں شریک ہوگئے تھے۔

دن ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ میں نے جوگیندر سے کہا کہ میں سیٹھ صدیق کے گھر جانا چاہتا ہوں جنہیں ایک خط دینا تھا۔

"ضرور جاؤ!" سیٹھ موہن لال بولے "کار لیتے جاؤ جوگیندر! تمہیں وہاں کلکتے اور ہندوستان کی سیاست کا رخ دیکھنے کو بھی ملے گا۔"

"میں بھی چلوں گی" فاطمہ بول اٹھی "کیوں پتا جی' چلی جاؤں؟"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے! شاہین اور جوگیندر سے پوچھ لو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں ہی سیٹھ صدیق کے گھر جارہے تھے۔ سیٹھ صدیق پارک سرکس کے علاقے میں رہتے تھے۔ جوگیندر کو بھی ان کے گھر کا علم تھا۔ میں جوگیندر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور فاطمہ پچھلی سیٹ پر موجود تھی۔ اس وقت سورج غروب ہوچکا تھا۔ کلکتے کی سڑکیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں کبھی رات نہیں ہوتی تھی۔

جب ہم سیٹھ صدیق کے گھر پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کلکتے کے سیاسی کارکن اور رضاکار ان کرسیوں پر بیٹھے تھے' گھاس پر بیٹھے تھے اور ادھر ادھر کھڑے تھے۔ سبھی کا موضوع گفتگو اس وقت بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ اگلے دن ہندوستان کے دو بڑے شہروں کلکتے اور بمبئی میں تاریخ کی سب سے بڑی ہولی جلائی جانے والی تھی۔

ہم تینوں ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف آئے۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت اجلاس ہورہا تھا۔ اس اجلاس میں کلکتے کے مقامی سیاست دانوں کے علاوہ کانگریس کی مرکزی کمیٹی میں شرکت کے لیے کلکتے آنے والے دوسرے سیاست داں بھی تھے۔ سیٹھ صدیق نے ان سب کو ڈنر پر مدعو کررکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم اندر نہیں جاسکتے تھے۔ میں نے جیب سے لفافہ نکالا اور دروازے پر موجود ملازم کو دیتے ہوئے کہا "سیٹھ صدیق صاحب کو یہ لفافہ دے دینا" ان سے کہنا کہ علی گڑھ سے آیا ہوں اور ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ملازم وہ لفافہ لے کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم پھر باہر آیا "ادھر آیئے!" اس نے کہا۔

ہم تینوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے کوٹھی کے پہلو میں آگئے۔

"آیئے؟" ملازم نے ایک دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جوگیندر اور فاطمہ وہیں رک گئے "ٹھیک ہے تم جاؤ" ہم یہیں کھڑے ہیں۔"

"ارے نہیں یار!" میں بولا "تم بھی آجاؤ! اب تم سے کیا پردہ رہا ہے!" میں نے جوگیندر کا ہاتھ پکڑلیا پھر ہم آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئے۔ ہر طرف دیواروں کے ساتھ الماریاں کھڑی تھیں اور الماریوں میں قرینے سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سیٹھ صدیق ان روایتی سیٹھوں میں سے نہیں تھے جو صرف سرمائے کے بل بوتے پر ہر شعبے میں اپنی برتری منوانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اگر خود صاحب علم یا عالم نہیں تھے تو انہیں کم از کم صاحب علم حضرات کی صحبت ضرور میسر تھی اور علم کا ذوق بھی یقیناً تھا ورنہ وہاں کتابیں اتنے سلیقے سے سجی ہوئی نظر نہ آتیں۔ اسی کمرے میں ایک کونے میں رکھی ہوئی میز پر کاغذات اور قلمدان موجود تھے۔

"آپ لوگ یہاں انتظار کریں۔ سیٹھ جی ابھی آتے ہیں" ملازم نے کہا اور ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سیٹھ صدیق کمرے میں داخل ہوئے۔ خلافِ توقع وہ چھریرے بدن کے نوجوان ثابت ہوئے۔ میں انہیں ادھیڑ عمر یا عمر رسیدہ سمجھا تھا۔ ان کے چہرے پر وہ سنجیدگی اور وقار تھا جو اس سیاسی دباؤ کا عطیہ تھا جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔ قومی سیاست کی ذمے داریوں نے انہیں وقت سے پہلے بردبار و باوقار بنادیا تھا۔

"معاف کیجیے شاہین صاحب!" سیٹھ صدیق نے کہا' "میٹنگ آخری دور میں تھی اس لیے مجھے دیر ہوگئی" پھر انہوں نے جوگیندر کو مخاطب کیا "اور سناؤ جوگیندر' تمہارے پتا کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں جناب! دعا ہے آپ کی" جوگیندر نے کہا۔

"شاہین صاحب! میں نے خط پڑھ لیا ہے" سیٹھ صدیق پھر مجھ سے مخاطب تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خط میں کیا لکھا تھا۔ "بے فکر رہیں' آپ کو جب بھی' جس وقت بھی اور جس قسم کی بھی مدد درکار ہو' میں حاضر ہوں۔ دن یا رات کے جس حصے میں بھی آپ چاہیں مجھ سے آکر مل سکتے ہیں۔ آپ جیسے سرفروش ہی ہندوستان کی امید ہیں۔ کاش میں بھی آپ لوگوں کی صفوں میں ہوتا۔"

"آپ اب بھی ہماری ہی صفوں میں ہیں جناب!" میں بولا "آپ جس انداز میں ہندوستان کی خدمت کررہے ہیں' ہم سب اس سے واقف ہیں اگر ہمارے دوسرے سرمایہ دار بھی آپ کی راہ پر چلنے لگیں تو ہم اپنی جنگ بہت جلد جیت سکتے ہیں۔"

"میں کیا کررہا ہوں بھئی!" سیٹھ صدیق نے کہا "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنا سر دینے سے زیادہ آسان بات یہی ہے کہ آدمی اپنی جیب خالی کردے۔ تم لوگوں نے قوم کے لیے اپنا سر دینے کی پیشکش کی ہے۔ میں شاید بزدل ہوں' ایسا نہیں کرسکتا۔"

"نہیں جناب! مجھے بتایئے کہ صرف آپ ہی اس سلسلے میں' سرمایہ دار طبقے کے اندر سرفہرست کیوں ہیں؟"

"ہاں میرا نام۔۔" سیٹھ صدیق نے کہا "مگر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنا نام بھی نہیں آنے دیتے۔ سیٹھ موہن لال ہی کو لے لو' ان جیسے لوگ میرے ساتھ نہ ہوں تو میری خدمات اور میری کوششیں بے معنی ہوجائیں۔"

"آپ بلاوجہ پتا جی کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں" جوگیندر بول اٹھا۔

"یہ بلاوجہ نہیں ہے جوگیندر!" سیٹھ صدیق نے کہا "خیر چھوڑو' کبھی موقع ملا تو بتاؤں گا کہ تمہارے پتا جی کے ہمارے اوپر کیا کیا احسانات ہیں!۔۔ ہاں تو شاہین صاحب!" سیٹھ صدیق نے پھر مجھے مخاطب کیا "کلکتے میں جب تمہارا کام ختم ہوجائے تو مجھ سے مل لینا۔ ویسے تم اس سے قبل بھی مل سکتے ہو۔"

"بہتر ہے جناب!" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

سیٹھ صدیق نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "یہ بات میں نے اس خط کی روشنی میں کی تھی۔ میرے یار نے لکھا ہے کہ شاہین اپنا کام ختم کرنے کے بعد مجھ سے ملے گا کیوں کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں" سیٹھ صدیق نے یہ جملے "ڈرامائی" انداز میں کہے "میرے یار کو یہ نہیں معلوم کہ صدیق کیا ہے! تم جیسے سرفروشوں کے لیے میں ہر مصروفیت قربان کرنے کو تیار رہوں۔"

اس کے بعد سیٹھ جی نے ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ اس پر میں نے کہا "اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج رات میں کلکتے کی سیر کرنا چاہتا ہوں پھر شاید فرصت نہ ملے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" سیٹھ جی نے کہا "تم لوگوں کی زندگی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے۔ اس پُر خطر زندگی میں فرصت کے جو لمحات مل جائیں' غنیمت ہیں۔ میرا خیال ہے شاہین صاحب کہ آپ کھانا کھاکر ہی جائیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو کھانا کھانے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔"

اس پُرخلوص اصرار پر انکار کرنا' بداخلاقی ہوتی' سو ہمیں دعوت قبول کرنا ہی پڑی۔

کھانے پر میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام لیڈروں کو دیکھا جن کے نام کا شہرہ ان دنوں ہندوستان بھر میں تھا۔ ڈنر پر بھی سیاست کی باتیں ہونے لگیں مگر تمام گفتگو کا محور بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ گاندھی جی بہت خوش تھے۔ جب بھی گفتگو کا رخ بدلتا وہ پھر بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کے کسی نئے پہلو کو چھیڑ دیتے۔

"دیکھ رہے ہو' تم گاندھی جی کو؟" جوگیندر نے مجھ سے کہا "کتنی چالاکی سے بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کو سب سے بڑا سیاسی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں!"

کھانا کھانے کے بعد سیٹھ صدیق پھر ہمارے پاس آئے اور بولے "شاہین صاحب! میرا خیال ہے کہ کل صبح آپ سیدھے یہیں آجائیں پھر ہمارے ساتھ ہی دھرم تلہ گراؤنڈ چلیے گا" پھر وہ جوگیندر سے مخاطب ہوئے "کل دھرم تلہ تو

آرہے ہونا!"

"جی ہاں' ہم سیدھے دھرم تلہ ہی پہنچیں گے" جوگیندر نے جواب دیا۔

"بہرحال وہاں ضرور آنا" سیٹھ صدیق خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہوئے "وہاں ایک خوش گوار تحیّر تمہارا منتظر ہوگا" پھر انہوں نے ایک نوجوان کو اشارے سے بلایا "یہ ہمارے ایک بہت ہی عزیز مہمان ہیں۔ شاہین نام ہے ان کا' علی گڑھ سے آئے ہیں۔ کل یہ دھرم تلے آئیں گے' ان کے ساتھ یہ دونوں بھی ہوں گے" انہوں نے جوگیندر اور فاطمہ کی طرف اشارہ کیا "تمہیں ان تینوں کو اسٹیج پر جگہ دینی ہے۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔"

اس کے بعد ہم وہاں سے وکٹوریہ میموریل آئے تھے۔ سنگِ مرمر سے بنی ہوئی وہ عمارت اس وقت بہت خوب صورت معلوم ہورہی تھی۔ وہاں پر رات بہت حسین لگی یا شاید اس کا سبب یہ تھا کہ فاطمہ بھی ساتھ تھی۔ وہاں لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہرمذہب وملت کے لوگ اس چاندنی رات سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ دور دور پر سبز گھاس کے میدان میں لوگوں کے پرے کے پرے موجود تھے۔ حسین پُرفضامقامات کتنے مقدس ہوتے ہیں! میں نے سوچا تھا۔ ان کے حسن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ انسان کو سکون سا بخشتے ہیں۔ یہ حسین مقامات فطرت کی تخلیق کی ہوئی وہ عبادت گاہیں ہیں' جہاں ہر انسان سکون اور خوشی حاصل کرنے جاسکتا ہے۔

تیز ہوا سائیں سائیں کررہی تھی۔ ہم نے مڑی (مرمرے جن میں سرسوں کا کچا تیل اور نمک ملایا جاتا ہے اور ہری مرچوں سے کھائے جاتے ہیں' بنگال کی ایک چٹپٹی اور سستی غذا) کھائی اور ڈاب پیا۔ ڈاب کچے ناریل کو کہتے ہیں۔ اسے کاٹ کر منہ سے لگانے کے بعد ناریل کا پانی پیا جاتا ہے جو ہاضم اور صحت بخش ہوتا ہے۔ ہم گفتگو کرتے رہے اور سیر کرتے رہے۔ ایک جگہ جوگیندر کا ایک دوست آٹکرایا۔ جوگیندر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اور فاطمہ نے اس دوران میں وہ باتیں کیں جن میں ہم کسی کو بھی شریک نہیں کرسکتے تھے۔

پہل فاطمہ ہی نے کی تھی "شاہین! تمہیں وہ دن یاد ہے نا!" اس کے لہجے میں یادوں کا دھواں سا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ فاطمہ اس دن کا ذکر کررہی تھی جو ہم نے کراچی کے ایک فلیٹ میں ساتھ ساتھ گزارا تھا۔

"وہ دن میری زندگی کا حاصل ہے فاطمہ! اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں!"

"اپنے وعدے بھی یاد ہیں؟" فاطمہ نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"وہ وعدے اب میرا ایمان ہیں۔"

"تم کتنے اچھے ہو!" فاطمہ کے ہونٹوں سے پھول جھڑنے لگے "دیوتا تو ہوتے ہی اچھے ہیں!"

"ایک بات بتاؤں فاطمہ!" میں آہستگی سے بولا "میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے زندگی کی حسین خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔"

"شش۔ میرے شاہین!" اس کے ہونٹوں پر ایک نغمہ تھا کہ پھوٹ بہا تھا "ہم تو اپنے دیوتا کے سیوک (خدمت گزار) ہیں۔ میں تمہاری لیے خوشی کا باعث ہوں' میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

"تم مجھے دیوتا نہ کہا کرو فاطمہ!" میں نے کہا تھا "میں یہیں زمین پر تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ پر یہ پابندی نہ لگاؤ شاہین!" فاطمہ نے گلابوں کی خوشبو پھیلائی "تمہیں دیوتا کہہ کر بھی میری پیاس نہیں بجھتی۔ میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔۔۔ تمہیں جس طرح جن لفظوں سے پکارنا چاہتی ہوں' شاید انسان کی ایجاد کردہ کسی بھی زبان میں آج تک وہ الفاظ ہی تخلیق نہیں ہوسکے ہیں۔ پھر شاہین' تم ان دیوتاؤں میں سے نہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں۔ وہ جو نہ باتیں کرتے ہیں نہ تسلی دیتے ہیں اور نہ خوشی بخشتے ہیں۔ شاہین! تم تو میرے من میں رہتے ہو' تم تو میرے من سے باتیں کرتے ہو' اس سے بھی جب میرے سامنے نہیں ہوتے!"

"فاطمہ! تم مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوگئی ہو" میں نے کہا "اور میں اتنا تہی دامن کہ تمہیں کچھ نہیں دے کر تمہارے احسانات کو اتار بھی نہیں سکتا۔"

"دیکھو شاہین' ایسی باتیں نہ کرنا!" اس کے لہجے میں ناراضگی تھی "بھلا میں نے کیا احسانات کیے ہیں؟"

"کراچی کا وہ دن میں کیسے بھلادوں فاطمہ! اس دن تم نے مجھ پر احسانات اور کرم کے جتنے پھول نچھاور کیے ہیں فاطمہ' میں انہیں کیا نام دوں؟" میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا مطلب کیسے واضح کروں مگر فاطمہ میرا مقصد سمجھ گئی تھی۔

"میں نے اس دن اپنے دیوتا کے چرنوں میں عقیدت کے پھول رکھے تھے اور میرا دیوتا اتنا سخی ہے کہ اس نے اسی دن میرے گلے میں اپنے پیار کی مالا ڈال دی تھی۔" فاطمہ کی آواز بوجھل تھی "میں نے اس روز ایک خواب سا دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی وہ خواب تعبیر میں ڈھل کر مجسم ہوگیا۔ کرم تو تم نے کیا ہے شاہین! تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ اپنی بلندیوں سے اتر کر تم میری سطح پر آگئے' جہاں تم تھے' جہاں تم ہو!"

"بلندیوں پر تم ہو فاطمہ!" میں بولا "میں نہیں' تم کچھ نیچے اتری ہو۔"

"ارے تمہیں کیا خبر شاہین کہ تم کتنی بلندیوں پر ہو! وہ بلندیاں میں نے رادھا کے حوالے سے جانی تھیں۔ وہی رادھا جو جلالی میں تم سے ملی تھی' لالہ منی دھر کی بڑی بیٹی! وہی جسے تم نے اغوا کیا تھا اور وہ تمہیں دل دے بیٹھی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ تم کتنے پشیمان ہوگئے تھے!"

"سنو فاطمہ! میں سوچ رہا ہوں' ہم جو دنیا کی بنائی ہوئی دیواروں میں قید ہیں' ہم جو اس دنیا کی تراشی ہوئی مصنوعی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں' اچانک ہی ایک دوسرے سے آملے ہیں مگر یہ ملاپ محض ایک سراب ہے۔ جب ہم حقیقت کی دنیا میں لوٹیں گے تو الگ الگ ہوں گے اور۔۔۔ اور پھر شاید کبھی نہ مل سکیں گے۔"

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا "کل کیا ہوگا شاہین' کسی کو معلوم نہیں۔ میں تو آج میں زندہ ہوں اور آج کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ تم میرے پاس ہو۔"

"اور آج کی سب سے بڑی حقیقت ایک اور بھی ہے" میں نے کہا "میری آج کی زندگی' طوفانی زندگی ہے۔ یوں سمجھو' آج میں ایک لق ودق صحرا میں بھاگ رہا ہوں۔ جنگلی کتے میرے تعاقب میں ہیں۔ آج ہی یا کل کسی وقت۔۔۔"

"بس شاہین!" فاطمہ نے میری بات کاٹ دی "آگے کچھ مت کہو! میں سمجھ گئی تم کیا کہنا چاہتے ہو! یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے اس روز بھی معلوم تھی جب میرے ہونٹوں پر پیار کی سلگتی ہوئی گرمی اتری تھی۔ میں نے اس وقت تمہیں اپنا دیوتا بنایا تھا جب مجھے یقین بھی نہیں تھا کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

"فاطمہ! میری فاطمہ! میری اچھی فاطمہ!" میرے دل میں اس وقت کیا کیا تھا جسے کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے "میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں! جی یہ چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھے ہی جاؤں۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو اور تم مجھ سے یونہی اسی طرح باتیں کرتی رہو۔ میں۔۔۔ بھی۔۔۔ مجھے تم سے پیار ہے فاطمہ! پیار ہے۔ پیار ہے۔"

"بس۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے شاہین!" فاطمہ کی آواز بھرّا گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی' میں نے شبنم کی طرح چمکتی دیکھی "کیسی خوشی دی ہے تم نے اس وقت! میں۔ میں تھک سی گئی ہوں۔"

فاطمہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کوئی مسرت سی مسرت تھی! شراب کے نشے کی طرح وہ مسرت نس نس میں اترتی جارہی تھی۔ جسم اور ذہن بوجھل سے ہوگئے تھے۔ بعض خوشیاں کتنی گراں بار ہوتی ہیں' اس کا اندازہ اس دن مجھے ہوا تھا۔

وہ رات فاطمہ کی انہی باتوں کی وجہ سے آج بھی میرے ذہن میں جاگتی رہتی ہے۔ میں نے اس رات وکٹوریہ میموریل کی سیر نہیں کی تھی' اس دنیا کی سیر کی تھی جو فاطمہ نے اپنی پھول باتوں سے سجائی تھی۔

آنے والے دن کی صبح بہت روشن اور چمکیلی تھی۔ ہم لوگ ناشتا کررہے تھے کہ سیٹھ موہن لال تیار ہوکر ڈائننگ روم میں آگئے۔ "اچھا بچو! میں چل رہا ہوں۔" انہوں نے کہا "گاڑی تو نہیں چاہیے؟ ضرورت ہو تو بھجوادوں گا۔"

"نہیں پتاجی!" جوگیندر نے جواب دیا "آج گاڑی نہیں چاہیے۔"

"کیوں' کیا آج شاہین کو سیر نہیں کراؤ گے؟"

"سیر ہی تو کرانی ہے" جوگیندر مسکرا کر بولا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی آج ہمارا ارادہ دھرم تلہ گراؤنڈ جانے کا ہے۔ ٹرام میں بیٹھ کر جائیں گے۔"

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر سیٹھ موہن لال وہاں سے چلے گئے۔

ناشتے کے بعد ہم تیار ہوئے اور کوٹھی سے نکل آئے۔

کلکتہ کتنا بڑا شہر ہے' اس کا احساس مجھے اسی دن ہوا تھا۔ ہم ٹرام میں بیٹھ کر دھرم تلہ پہنچ گئے۔ کلکتہ شہر میں اس کی حیثیت مرکزی ہے۔ یہاں سے شہر کے کسی بھی حصے کے لیے براہ راست ٹرام مل سکتی تھی اگر خدانخواستہ اس شہر میں کوئی راستہ بھول جائے تو کسی بھی جگہ سے اسے دھرم تلے کے لیے ٹرام مل سکتی ہے اور پھر وہاں سے وہ جہاں پہنچنا چاہتا ہے پہنچ سکتا ہے۔ کلکتہ شہر میں ٹرام کا جال بچھا ہوا ہے۔ ٹرام میں دو ڈبے ہوتے تھے' ایک فرسٹ کلاس' دوسرا سیکنڈ کلاس! فرسٹ کلاس کا ڈبا' ریل کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس میں ٹیوب لائٹس اور پنکھے لگے ہوئے تھے اور سیٹیں نرم' گداز اور آرام دہ تھیں۔ کرایہ بھی بہت کم تھا۔ ٹراموں کی وجہ سے کلکتے جیسے بڑے شہر میں آمدورفت کے لیے بڑی آسانی تھی۔ دھرم تلے میں

اس کا مرکزی ڈپو بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔

ہم دھرم تلہ پہنچے تو یوں لگا جیسے سارا شہر وہاں امنڈ آیا ہو۔ ہر جگہ لوگوں کے غول در غول' جتھے کے جتھے نظر آرہے تھے۔ لوگ دس دس' پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں ایک ہی سمت رواں تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ تمام دھرم تلہ میدان ایک صدا بن گیا تھا۔ جیسے جیسے ہم بڑھتے رہے' بھیڑ میں اضافہ ہوتا رہا۔ سڑک پر تو یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میٹرو سینما کے سامنے تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ فاطمہ میرے اور جوگیندر کے درمیان تھی۔

ہر شخص کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک جگہ کسی شخص کو لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی قمیص بدیسی کپڑے کی تھی البتہ پاجامہ کھدر کا تھا۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ قمیص اتار دے اور وہ کہہ رہا تھا "ارے بھیا! میرے پاس اور قمیص نہیں ہے' پاجامہ تو کھدر کا پہنے ہوئے ہوں۔"

پھر کسی نے اس کے سر پر چیت ماری تھی۔ ایک آدمی نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر قمیص جھیر جھیر کر دی۔ ذرا سی دیر میں اس کی قمیص اس کے جسم سے الگ کر دی گئی۔ کسی نے اس کی پھٹی ہوئی قمیص کو سوکھی ہوئی شاخ پر ٹانگ کر سروں سے بلند کیا۔

"انگریز حکومت!" ایک نعرہ ابھرا۔

"مردہ باد!" جواب دیا گیا۔

"انگریز کے پٹھو!"

"ہائے ہائے!"

"بول بجرنگ بلی کی!"

"جے!"

"نعرۂ تکبیر!"

"اللہ اکبر!"

"ہے نرا پاگل پن!" جوگیندر بڑبڑایا۔

"آہستہ بولیں بھیا!" فاطمہ نے مصلحتِ وقت کے تحت کہا۔

اب میں' جوگیندر اور فاطمہ بڑے سے اس گیٹ میں داخل ہو رہے تھے' جو بلیاں کھڑی کرکے بنایا گیا تھا۔ یہیں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی جانے والی تھی۔ گیٹ کے اندر لوگوں کا اتنا اژدہام تھا کہ میدانِ حشر کا گمان ہونے لگا۔ گیٹ ہی پر ہمیں صابر مل گیا جسے سیٹھ صدیق نے ہمارے لیے ہدایات دی تھیں۔

"آیئے شاہین صاحب!" صابر نے ہمیں دیکھتے ہی کہا "آپ اچھے موقعے پر آگئے۔"

ہم صابر کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک اسٹیج تک پہنچ گئے۔ کلکتے کے کئی سرکردہ لیڈر اسٹیج کے پاس موجود تھے۔ صابر نے ہمیں اسٹیج پر لے جا کر بٹھا دیا جہاں دو ایک آدمی پہلے ہی کرسیوں پر براجمان تھے۔ ایک بچہ اسٹیج پر مائک کے سامنے کھڑا ہوا ترانہ پڑھ رہا تھا۔

وسیع و عریض میدان میں ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے' حدِ نظر تک آدم ہی آدم تھا۔ اس میدان کے وسط میں بدیسی کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ ڈھیر کیا' مینار تھا اور اس مینار کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارکن اور رضاکار آتے تھے اور کپڑوں کے ڈھیر پر مزید کپڑے ڈال دیتے تھے۔ دو تین آدمی تو بس کپڑوں کے اس مینار کو درست کرنے میں مصروف تھے۔ جب بھی اس ڈھیر پر بدیسی کپڑوں کی کوئی پوٹلی پھینکی جاتی' فضا مردہ باد کے نعروں سے گونج اٹھتی۔

ذرا ہی دیر بعد لوگوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی "گاندھی جی آگئے' گاندھی جی آگئے" آواز کی ایک لہر' مختلف آوازوں کے سمندر میں جیسے لوٹ لگاتی ہوئی اس کنارے سے اس کنارے تک پھیل گئی۔ اسی گیٹ سے جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے' گاندھی جی' سیٹھ صدیق اور مختلف لیڈروں کے جلو میں آگے بڑھے اور لوگوں کے درمیان سے ہو کر اسٹیج پر پہنچے۔ ہم تینوں اور وہ بھی جو پہلے سے اسٹیج پر موجود تھے' احتراماً کھڑے ہوگئے۔

فضا ایک مرتبہ پھر نعروں سے گونج اٹھی۔ جب گاندھی جی اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو ان نعروں میں کمی آئی پھر سیٹھ صدیق مائک کے سامنے آئے۔ چند مختصر سے تعارفی جملے انہوں نے اس دن کی اہمیت اور بدیسی کپڑے کے مقاطعے کے بارے میں کہے اور پھر انہوں نے ایک دھماکا کیا۔

کم از کم میرے لیے تو یہ ایک دھماکا ہی تھا۔ سیٹھ صدیق نے مجھے دھرم تلہ آنے کی دعوت دیتے ہوئے گزشتہ روز کہا تھا "وہاں ایک خوش گوار تحیر تمہارا منتظر ہوگا۔" اس جملے کے معنی مجھے اس وقت سمجھ میں آئے تھے۔ سیٹھ جی کہہ رہے تھے "اس سے پہلے کہ میں گاندھی جی سے درخواست کروں' میں ایک ایسے نوجوان کو تقریر کے لیے بلا رہا ہوں جس کی زندگی کو میں اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھتا ہوں۔ یہ نوجوان اس قبیلے سے ہے جو کسی بھی قوم کا بازوئے شمشیر زن ہوتا ہے۔ یہ نوجوان علی گڑھ کا ایک طالب علم ہے۔ اس کی فطرت سیمابی ہے' آزادی کے لیے یہ پارے کی طرح تڑپتا رہتا ہے' دریا کے مانند محوِ سفر رہتا ہے۔ اس کا نام شاہین ہے۔ یہ ان نوجوانوں میں سے ہے جو اپنے خون سے قوموں

کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔"

نہ جانے سیٹھ صدیق کے ان مختصر جملوں میں کیا تاثیر تھی کہ لوگوں نے پھر پُرجوش نعرے لگانا شروع کر دیے۔ مجھے اس دوران میں یوں لگا جیسے میں ایک کھلے میدان میں ہوں اور شدید آندھی سن سن چل رہی ہے۔ ملتان کی مہم میں مجھے کئی بار تقریر کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن کسی سیاسی جلسے میں' وہ بھی لاکھوں افراد کے سامنے تقریر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ جو لوگ مجمع کا سامنا کرتے ہیں' اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجمع کی اپنی ایک الگ دہشت ہوتی ہے۔ ہر شخص مجمع کا سامنا کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ میں نے سیٹھ صدیق سے معذرت چاہی مگر سیٹھ جی کے اصرار اور پھر لوگوں کے نعرے مجھے مائک تک لے ہی آئے۔

فاطمہ نے کہا "کیوں پریشان ہوتے ہو شاہین! تم تو من موہ لینے والی باتیں کرتے ہو' تقریر مت کرو' لوگوں سے باتیں کرو!"

میں نے تقریر کی اور خوب تقریر کی۔ بعد میں جوگیندر اور فاطمہ نے میری تقریر کی بہت تعریف کی لیکن اس وقت میرا عالم یہ تھا کہ سارا خون جیسے میرے چہرے پر سمٹ آیا تھا' دماغ میں گرمی کی لو سی دوڑ رہی تھی۔ ابتدا میں' میں ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر بولتا رہا پھر میرا حجاب کھل گیا اور میں بولتا ہی چلا گیا۔

"مت سوچیے!" میں نے کہا تھا "کپڑوں کے اس بڑے سے ڈھیر کو جلانے سے پہلے آپ اس حکومت کو ہلا دیں گے جس نے دو سو برس سے اس دیس کو' ہمارے پیارے ہندوستان کو الاؤ بنا رکھا ہے' جس نے ہماری جنم بھومی کو ہمارے لیے چتا' قبر' شمشان گھاٹ اور قبرستان بنا دیا ہے۔ اب یہاں آزاد انسان نہیں غلام اور مزدور لاشیں اگا کرتی ہیں۔" میں نے اور بھی نہ معلوم کیا کہا تھا' ایسا بھیانک نقشہ کھینچا تھا کہ لوگ رو پڑے تھے اور پھر میں آزادی کی جدوجہد کی طرف آیا تھا۔ "آگ ہی لگانی ہے تو ملوں کو آگ لگاؤ' دفتروں کو آگ لگاؤ! کپڑوں کے اس ڈھیر کو علامت بنا لو اس بات کی علامت کہ اس ڈھیر سے بلند ہونے والے شعلوں کو تم بجھنے نہیں دو گے جب تک سات سمندر پار سے آنے والے دشمن کو تہس نہس نہیں کر دو گے جس نے تمہاری رگوں سے لہو نچوڑ لیا ہے' تمہیں غلامی کی زنجیریں پہنا کر انہیں زیور کا نام دیا ہے۔"

لوگوں نے پھر نعرے لگا کر گویا آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ میں نے دوبارہ تقریر شروع کی "ایسے ظالم دشمن سے' سفاک اور بے رحم قاتل سے تم اہنسا پر عمل کرکے جنگ نہیں جیت سکتے۔ اہنسا یا عدم تشدد شریفوں اور مہذب لوگوں کا اصول ہے۔ تم ایک کمین فطرت قوم کو اس اصول سے زیر نہیں کر سکتے۔ تم ایک پیشہ ور قاتل کے سامنے یہ اصول اپناؤ گے تو قتل ہو جاؤ گے' قتل ہوتے رہو گے اور وہ قتل کرتا رہے گا۔ تمہیں اس کا ہاتھ کاٹنے کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے!"

لوگوں نے پھر نعرے لگائے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' گاندھی جی نے سیٹھ صدیق کو ٹہوکا دے کر ان کے کان میں کچھ کہا تھا۔ میں نعروں کے ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ سیٹھ صدیق اپنی نشست سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور چپکے سے تقریر ختم کرنے کے لیے کہا۔ میں واپس اپنی نشست پر آنے لگا تو مجمع بگڑ گیا "اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور!"

"اب گاندھی جی۔۔۔" سیٹھ صدیق نے کچھ کہنا چاہا۔

میدان میں مگر وہ شور و غوغا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سیٹھ صدیق نے پہلے میری طرف پھر گاندھی جی کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اب اس بگڑے ہوئے مجمع کو آسانی سے نہیں سنبھالا جا سکے گا۔ سو میں بڑھا۔ میں نے پھر مائک سنبھال لیا۔ "دوستو! مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا۔ آخر میں صرف ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں' سو وہ بھی سن لو! آزادی اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ کپڑوں کے اس ڈھیر میں آگ لگا کر تمہیں آزادی نہیں مل سکتی! آزادی حاصل کرنے کے لیے ہتھیار اٹھانے پڑتے ہیں' ظالم کے وہ ہاتھ کاٹنے پڑتے ہیں جن سے وہ ظلم کرتا ہے۔ تم نے کانگریس کے حالیہ ریزولیوشن پڑھے ہوں گے۔ ان ریزولیوشنوں میں ایک ریزولیوشن کی کمی ہے۔ آؤ آج ہم اس میدان میں اعلان کریں' آج سے ٹھیک اسی وقت سے جب کپڑوں کے اس ڈھیر میں پہلا شعلہ بھڑکے گا' ہم ہندوستان کے طول و عرض میں' چپے چپے میں فوج اور پولیس کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں گے۔"

مجمع بڑی دیر تک نعرے لگاتا رہا۔ میں اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ اب گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر بڑی مختصر تھی لیکن ایسے پینترے سے کی گئی تھی کہ لوگوں کے ذہن سے میری تمام باتوں کا اثر شاید زائل ہو گیا تھا۔

گاندھی جی کہہ رہے تھے "ابھی تھوڑی دیر میں کپڑوں کے اس ڈھیر سے ایک شعلہ بھڑکے گا' دھواں اٹھے گا' آگ کی لپٹیں نکلیں گی اور اس شعلے کے ساتھ ہی ہماری غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں گی۔" اس کے بعد انہوں نے اسٹیج سے اتر کر

کپڑوں کے اس مینار کو آگ لگادی تھی۔

سو میں نے اس دن سب سے بڑی ہولی کو بھڑکتے ہوئے دیکھا مگر اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس دن تقریر کرکے میں نے اپنے لیے کیا کیا خطرات مول لے لیے تھے! اگر آج بھی اس ہولی میں شرکت کرنے والے کچھ لوگ زندہ ہیں تو انہیں یقیناً میری تقریر یاد ہوگی۔ وہ علی گڑھ کے اس طالب علم کو نہیں بھولے ہوں گے جس کی تقریر کے ہر ہر جملے پر انہوں نے فلک شگاف نعرے لگائے تھے اور جس کی زبان اس دن ان کے دل کی ترجمان بن گئی تھی اگرچہ میری تقریر کو اخبارات نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی بلکہ بعض اخبارات نے تو سرے سے میری تقریر کا ذکر ہی نہیں کیا تھا البتہ کچھ اخبارات نے میرے بعض جملوں کو گاندھی جی سے منسوب کرکے رپورٹ کیا تھا۔ گاندھی جی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا تھا "میں اس نوجوان کی بیشتر باتوں سے اتفاق کرتا ہوں" یہ بڑا محتاط جملہ تھا اگر وہ میری پوری تقریر سے اتفاق کرجاتے تو اخبارات میری تمام تقریر ان سے منسوب کردیتے حالانکہ یہ مس رپورٹنگ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض اخبارات نے میرے جو جملے گاندھی جی سے منسوب کیے تھے، وہ صرف اس دن کے واقعے، یعنی بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ سے متعلق تھے۔

اخبارات کے مقابلے میں سی آئی ڈی کے لوگوں نے میری تقریر کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا تھا۔ اخبارات نے تو اس تقریر کو اس لیے اہمیت نہ دی کہ یہ تقریر ایک غیر معروف اور گمنام شخص نے کی تھی لیکن سرکاری مشنری میری اس تقریر کو ہضم نہ کرسکی۔ اس وقت مجھے اس بات کا قطعی احساس نہ تھا۔ بہرحال اس تقریر کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں ایک ہی دن میں کلکتے کے سیاسی حلقوں کا جانا پہچانا آدمی ہوگیا۔ سیاسی کارکنوں اور رضاکاروں میں میری دھوم مچ گئی۔ ایک تو سیٹھ صدیق کے تعارفی جملے پھر میری تقریر اور ایسا موقع کہ جب کلکتے اور ہندوستان کی تمام سیاست دھرم تلہ کے میدان میں سمٹ آئی تھی، میں اسی لیے جانی پہچانی شخصیت بن گیا۔

جب گاندھی جی بدیسی کپڑوں کی ہولی پھونک رہے تھے اور تمام لیڈر ان کے گرد جمع تھے تو سیٹھ صدیق لپک کر میرے پاس آئے اور صرف اتنا کہا "آج شام کو مجھ سے ضرور ملنا! میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"مگر۔" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"آج شام ضرور ملنا!" سیٹھ جی نے تاکید کی "تم نے اپنے لیے پریشانیاں مول لے لی ہیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میں اتنی آگ اور زہر بھرا ہوا ہے تو میں کبھی تمہیں تقریر کرنے کے لیے نہ بلاتا مگر اب کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال آج شام ضرور ملنا، شام چار بجے کے بعد میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ میں اپنے دوست سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا" ان کا اشارہ مجاہد اوّل کی طرف تھا پھر وہ وہیں چلے گئے جہاں گاندھی جی دوسرے لیڈروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

بدیسی کپڑوں کا الاؤ خوب بھڑک اٹھا تھا اور گاندھی جی دوسرے لیڈروں کے ساتھ واپس جارہے تھے۔ میں، فاطمہ اور جوگیندر اس وقت سیاسی کارکنوں اور رضاکاروں کے درمیان گھرے کھڑے تھے۔ ہر شخص مجھ سے تعارف چاہتا تھا۔ میرے شانے ہاتھ ملاتے ملاتے تھک گئے۔ وہ مجھ سے مختلف نوعیت کے سوالات کررہے تھے۔ "آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا علی گڑھ ہی کے رہنے والے ہیں یا صرف وہاں تعلیم حاصل کررہے ہیں؟ کس تحریک سے متعلق ہیں؟ کس قسم کی جدوجہد کے قائل ہیں؟"

میں انہیں گول مول جواب دے رہا تھا۔ سیٹھ صدیق کے اس جملے کے بعد کہ میں نے اپنے لیے بہت سی پریشانیاں مول لے لی ہیں، میں بہت محتاط اور چوکنا ہوگیا تھا۔ اس مرحلے پر صابر فرشتہ رحمت بن کر آگیا۔ وہ مجھے ان لوگوں کے نرغے سے نکال لایا۔ ہم اس کے ساتھ باہر آئے اور ایک کار میں وہاں سے جوگیندر کی کوٹھی کے لیے روانہ ہوگئے۔ کار اور ڈرائیور کا بندوبست سیٹھ صدیق کے ایما پر صابر نے کیا تھا۔

راستے میں صابر نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت جب مجھے لوگوں کے نرغے سے نکال کر لایا تھا تو میرے گرد سی آئی ڈی کے کئی افراد موجود تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ اس شہر کی سی آئی ڈی کے پاس میرا سابقہ ریکارڈ موجود نہیں تھا، نہ یہ علم تھا کہ میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب میں پولیس کو مطلوب ہوں، نہ وہ لوگ میری حقیقت سے واقف تھے ورنہ مجھے فوراً گرفتار کرلیا جاتا۔

یہ بات تو میرے لیے پریشان کن نہیں تھی کہ پولیس یا خفیہ کے لوگ پنجاب کی طرح بنگال میں بھی میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ میری پریشانی کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ ہماری تنظیم کی سخت ہدایت تھی کہ کارکنوں کو اپنی تمام زندگی میں کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ ہماری تنظیم کو آگے چل کر ہندوستان کی فوج آزادی کی شکل اختیار کرنا تھی اور میں نے کلکتے میں ایک سیاسی اسٹیج سے تقریر کی تھی جس پر تنظیم کے بڑے مجھ سے پوچھ گچھ بھی کرسکتے تھے۔ تنظیم کے چند ارکان کے سوا جو پہلے ہی خلافت تحریک کے رکن تھے، کسی رکن کا بھی سیاست سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔ یہ ارکان بھی تنظیم کے احکام کی پابندی پہلے کرتے تھے، ان کی سیاسی حیثیت تنظیم کی رکنیت کے بعد ثانوی رہ گئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ مجھ سے نادانستگی میں جو غلطی ہوگئی ہے، تنظیم اس پر مجھے رکنیت سے معطل بھی کرسکتی ہے اور معطلی کا مطلب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس کا صرف اور صرف مطلب بلیک وارنٹ تھا، یعنی موت! آج تک کبھی ایسا ہوا تو نہیں تھا کہ کسی رکن کو معطل کیا گیا ہو اس لیے کہ ہماری تنظیم ابھی نئی نئی تھی۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب بھی اس قسم کی کوئی تنظیم بنتی ہے، کم از کم ابتدائی مراحل میں اس کے قوانین اور اصول وضوابط کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔

میں اسی پہلو پر غور کررہا تھا کہ جوگیندر کی کوٹھی آگئی۔ ہم ٹالی گنج پہنچ چکے تھے۔ صابر خود بھی ہمیں چھوڑنے ساتھ آیا تھا۔ وہ ہمیں کار سے اتار کر واپس چلا گیا۔

صابر کے جاتے ہی جوگیندر نے پوچھا "کیوں شاہین، تم چپ چپ سے کیوں ہو؟ کیا خفیہ والوں کے بارے میں جان کر پریشان ہوگئے؟"

"نہیں، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے" میں نے جواب دیا "ہماری جدوجہد کا جو رخ ہے، اس میں ہمارا مقابلہ فوج، پولیس اور خفیہ ہی سے ہوگا۔"

"پھر پریشانی کی کیا وجہ ہے؟" جوگیندر نے پوچھا "کوئی تو بات ہوگی نا!"

"پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھ سے ایک حماقت ہوگئی ہے" میں نے کہا "سیاسی جلسے میں تقریر کرکے میں نے تنظیم کا ایک اصول توڑ دیا ہے۔ تنظیم کی طرف سے ہم پر پابندی ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور تنظیم کا رکن ہونے کی حیثیت سے تم بھی یہ بات جانتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہین! مگر اس کی ذمے داری تم پر عائد نہیں ہوتی۔ تمہیں تو تقریر کرنے پر مجبور کیا گیا تھا پھر وہ موقع بھی ایسا نہ تھا کہ تم انکار کرسکتے" جوگیندر نے گویا تاویل پیش کی "ویسے بھی تم نے کانگریس کے اسٹیج سے کانگریس ہی کی مخالفت کی ہے۔ تم نے کانگریس کی پالیسی سے تو اتفاق نہیں کیا۔"

"یہ سب کچھ درست سہی مگر مجھ سے حماقت تو ہو ہی گئی ہے۔"

"پھر ہوگا کیا؟" فاطمہ بول اٹھی۔

"مجھے سزا دی جائے گی" میں نے جواب دیا۔

"سزا؟" فاطمہ نے حیرت سے کہا "کس قسم کی سزا؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، سزا کا فیصلہ تنظیم کے بڑے کریں گے" میں جواب میں بولا "خیر دیکھا جائے گا۔ آدمی کو اپنی حماقت کا نتیجہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے ماحول کی سنجیدگی ختم کرنا چاہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنی حماقت کی سزا اور نوعیت بتاؤں۔

"مگر شاہین!" فاطمہ نے کہا "تم نے بھی حد کردی تھی۔ اتنی سخت تقریر تو ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر کے سوا کوئی کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے تمہارے اندر مولانا جوہر کی روح حلول کرگئی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو مجھے بھی محسوس ہوئی تھی" جوگیندر نے بھی اپنی بہن کے خیال سے اتفاق کیا "سیٹھ صدیق ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، تمہاری تقریر بہت زہریلی تھی عام گفتگو میں تو پتا نہیں چلتا کہ تم اتنے آتش نفس اور شعلہ بیاں مقرر بھی ہوسکتے ہو۔ تمہارے اندر واقعی بہت زہر بھرا ہوا ہے۔"

"یہی زہر اس غلام ملک کے لوگوں کی غلامی کا تریاق ہے میرے دوست!" میں نے کہا۔

میں اور جوگیندر اس روز ٹھیک چار بجے شام سیٹھ صدیق کی کوٹھی پر پہنچ گئے تھے۔ فاطمہ ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اپنے والد سیٹھ سوہن لال کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔

سیٹھ صدیق برآمدے ہی میں ہمارے منتظر تھے۔ پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی "آؤ آؤ!" انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا "میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا" پھر وہ ہمیں اسی کمرے میں لے آئے جہاں گزشتہ روز ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے ملازم کو ہدایت کردی تھی کہ اگر کوئی ملنے آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس سے انتظار کرنے کے لیے کہہ دے۔ ملازم چلا گیا تو انہوں نے مجھے مخاطب کیا "تم نے مجھے پریشانیوں میں مبتلا کردیا ہے شاہین!"

"میں شرمندہ ہوں" میں بولا "مگر اس میں میرا قصور نہیں ہے۔"

"تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں" سیٹھ جی نے کہا "غلطی میری ہی تھی کہ تمہیں تقریر کی دعوت دے بیٹھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں کلکتے میں تمہارے تحفظ کا انتظام کروں، تمہیں مدد فراہم کروں مگر میں نے تمہیں الٹا خطرات

میں ڈال دیا ہے اور اپنے لیے بھی پریشانیاں مول لے لی ہیں۔"

"پھر آپ کو مجھے یہاں نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں اپنی ذات کو اپنے کسی بہی خواہ کے لیے مصیبت کا باعث نہیں بنانا چاہتا" میں بولا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو!" سیٹھ جی کہنے لگے "میری پریشانیوں کا تعلق دوسرے معاملے سے ہے۔ کانگریس کے بعض اہم لیڈر مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے کل کے ایک لونڈے سے بھرے جلسے میں ان کی کرکری کرادی ہے۔ گاندھی جی بہت برہم تھے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا ہے لیکن وہ میری بات سننے ہی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیوں کہ کانگریس نے خلافت کانفرنس کے کراچی ریزولیوشن کی حمایت نہیں کی۔"

"اگر بات یہ بھی ہے تو بھی کیا غلط ہے؟" جوگیندر نے گفتگو میں حصہ لیا "کانگریس نے ایسا نہ کرکے بہت بددیانتی کی ہے۔"

"بہرحال شاہین!" سیٹھ جی بولے "تم بہت خطرات میں گھر چکے ہو۔ خفیہ والوں نے تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے جناب! اور میں اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہوں" میں نے جواب دیا۔

"مگر تمہیں ایک اور خطرہ بھی ہے" سیٹھ صدیق نے بتایا "اس کا تعلق پولیس یا حکومت کے کسی اور محکمے کی طرف سے نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں سزا دینے کے احکام بھی جاری کردیے گئے ہوں۔ اب اسی لیے تمہیں دو طرف سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔"

"یہ دوسرا دشمن کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مجھے بھی معلوم نہیں" سیٹھ صدیق نے کہا "اس کے بارے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تک مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ تمہاری آمد سے کچھ دیر ہی قبل مجھے اطلاع ملی تھی۔ یہ دیکھو!"

سیٹھ صدیق نے وہ کاغذ میری طرف بڑھادیا جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا۔ یہ ایک خط تھا۔ خط لکھنے والے نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ پیغام صرف اتنا تھا "سیٹھ جی! اگر آپ علی گڑھ کے طالب علم شاہین صاحب کی قیام گاہ سے واقف ہیں تو انہیں بتادیں کہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ بعض لوگ ان کی آج کی تقریر کے بعد انہیں ٹھکانے لگانے کی باتیں کررہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اب تک ان کے قتل کا فیصلہ بھی کردیا گیا ہو۔"

"مگر یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں جو میری تقریر سے اتنے برافروختہ ہوگئے ہیں" میں نے دریافت کیا۔

"یہ بات میرے لیے بھی پریشان کن ہے" سیٹھ جی بولے "یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اس قسم کی اطلاع ملی ہے۔ بہرحال میں نے صبح تم سے یہاں آنے کے لیے صرف اس بنا پر کہا تھا کہ تمہارے واسطے کسی ایسی جگہ کا بندوبست کردوں جہاں تم پولیس اور خفیہ کے چھاپے سے بے نیاز ہوکر ٹھہر سکو۔ میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔"

"میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں جناب!" میں نے کہا "اب میں اپنے بچاؤ کا خود ہی انتظام کروں گا۔ میں اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کرسکتا" میرے لیے سیٹھ جی کی پیش کش منظور کرنا ممکن نہیں تھا۔ تنظیم کی ہدایت تھی کہ خطرات میں بھی کسی سے مدد نہ لو۔ خطرات میں ہمارے بہترین محافظ ہمارے تنظیمی ساتھی ہی ہوسکتے ہیں لہٰذا اس وقت جب حالات خطرناک ہوں، کسی سے مدد یا تعاون حاصل نہیں کرنا چاہیے، خواہ وہ کوئی قریبی عزیز یا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

"میں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں" سیٹھ جی واقعی فکرمند نظر آرہے تھے "میں اپنے دوست سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا" دوست سے مراد مجاہد اوّل ہی تھا۔

"آپ فکر نہ کریں جناب!" میں نے انہیں تسلی دی "یہ خطرات ہی تو ہماری زندگی ہیں۔ ہم ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔ آپ کا یہی بہت کرم ہے کہ آپ نے مجھے دوسرے خطرے سے قبل از وقت ہی آگاہ کردیا۔ آپ نہ بتاتے تو میں اس کی طرف سے لاعلم ہی رہتا اور انجانے میں نقصان اٹھا سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے" سیٹھ صدیق نے طویل سانس لیا "اپنی حفاظت کرنا، تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے" پھر انہوں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے میں نوٹ بھرے ہوئے تھے "یہ رکھو، شاید تمہیں اس کی ضرورت پڑے۔"

میں نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ وہ لفافہ لینے سے انکار کردیا۔ مجھے رقم کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے تھے۔

باہر آتے ہی جوگیندر نے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے شاہین؟"

"میں آج ہی رات تمہارے گھر سے کہیں اور منتقل ہوجاؤں گا" میں نے جواب دیا "اب میرا وہاں رہنا مناسب

نہیں۔"

"جاؤ گے کہاں؟" جوگیندر بولا "اس شہر میں تم بالکل نئے ہو، مناسب سمجھو تو مجھے بتادو۔"

"کیا بات کرتے ہو جوگیندر!" میں نے جواب دیا "میں تم پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا اعتماد خود پر کرسکتا ہوں۔ میں تمہیں خود سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ آیندہ ایسی بات نہ کرنا۔ سنو! میں تمہارے گھر سے موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے جاؤں گا، رات کے وقت سب سے چھپ کر!"

"مگر میرے ذہن میں ایک اور ترکیب ہے" جوگیندر نے کہا "تمہیں ہمارے گھر سے چھپ کر نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں دن دہاڑے جانا چاہیے اور آج نہیں کل جانا چاہیے تاکہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو، تمہیں خطرے کا احساس ہوگیا ہے۔ میں تمہارے لیے ٹھہرنے کا ایسا انتظام کرسکتا ہوں کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ میرا دوست ہے۔ ایک نظریاتی شخص ہے وہ! کل دن میں تم ہماری کوٹھی سے اسی کے گھر چلے جانا پھر رات کو کسی وقت چھپ کر کوٹھی واپس آجانا۔ اس طرح تم ہماری کوٹھی سے چلے جانے کے باوجود بھی ہماری ہی کوٹھی میں رہو گے۔"

جوگیندر کی تجویز اچھی تھی۔ اس طرح دشمنوں کو دھوکے میں رکھا جاسکتا تھا۔ میں اس پر راضی ہوگیا۔ سیٹھ صدیق کی کوٹھی سے نکل کر میں نے اپنے اردگرد یوں دیکھا جیسے میں اس دنیا پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں اور مجھے اس دنیا کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

"گھر چلنا ہے یا گھومو گے؟" جوگیندر نے کار میں بیٹھنے کے بعد دریافت کیا۔

"ذرا گھوم ہی لیں" میں نے کہا "وکٹوریہ میموریل کی طرف چلو، وہ جگہ مجھے اچھی لگی تھی۔ ویسے بھی شام کا وقت ہے، وہاں رونق ہوگی۔"

جوگیندر نے کار اسٹارٹ کردی۔

اس رات جب ہم شہر کی سیر کرکے واپس کوٹھی پہنچے تو عجیب صورتِ حال ہماری منتظر تھی۔ سیٹھ موہن لال بڑی بے قراری سے لان میں ٹہل رہے تھے۔ جیسے ہی کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی، لپک کر کار کی طرف آئے "جوگیندر! جوگیندر!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے اور بے قراری سے اپنے ہاتھ ملنے لگے۔ گھر کے دونوں ملازم برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔

سیٹھ موہن لال کے لہجے میں ایسی ہی کوئی بات تھی کہ میں سمجھ گیا، کوئی بہت ہی پریشان کن واقعہ رونما ہوچکا ہے۔

جوگیندر تیزی سے باہر آیا اور میں بھی کار سے اتر گیا۔

"ادھر آؤ!" سیٹھ موہن لال کوٹھی کی طرف بڑھ گئے۔ جوگیندر اور میں ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

مجھے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ جو میری جان کے دشمن ہوگئے ہیں، اتنی جلدی حرکت میں آجائیں گے۔ انہوں نے فاطمہ کو اغوا کرلیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اگر میں خود کو ان کے حوالے کردوں تو وہ فاطمہ کو چھوڑ دیں گے۔

فاطمہ کے اغوا کا واقعہ بہت مختصر تھا۔ سیٹھ موہن لال، فاطمہ کے ساتھ رات آٹھ بجے کوٹھی واپس آئے تھے۔ ابھی ان کا دوست انہیں کار سے اتار کر گیا ہی تھا کہ ان کی کوٹھی کے پھاٹک سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی کار کے پاس سے تین نوجوان ان کی طرف بڑھے۔ اس کار کے پاس دو افراد اور اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ کار کی کوئی خرابی دور کررہے ہوں۔ ان کے پاس آنے والے نوجوانوں میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"ادھر آجایئے سیٹھ صاحب! اور دیوی جی آپ بھی!" پستول والے نوجوان نے اشارہ کیا اور پھر دو نوجوان ان کے دائیں بائیں آگئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فاطمہ کو کار میں بٹھایا تھا۔ پستول والا نوجوان اور اس کا ایک ساتھی وہیں رہ گیا۔ انہوں نے سیٹھ موہن لال سے کہا کہ اگر آج رات تک آپ نے علی گڑھ کے اس طالب علم شاہین کو جو آپ کے یہاں ٹھہرا ہے، ہمارے حوالے کردیا تو ہم آپ کی بیٹی کو رہا کردیں گے۔ یہ دھمکی دیتے ہوئے وہ دونوں چلے گئے تھے "سیٹھ جی! شور مچانے یا ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں اگر آپ نے ایسا کیا تو ہمارے ساتھی آپ کی بیٹی کو گولی ماردیں گے۔ اب آپ اپنی کوٹھی میں جایئے اور اطمینان سے بیٹھیے۔ ہم رات کو دو بجے آئیں گے اگر آپ نے کسی چالاکی کے بغیر اپنا مہمان ہمارے حوالے کردیا تو پھر آپ کی بیٹی واپس مل جائے گی۔ پولیس کو خبر کرنے کی صورت میں بھی آپ کی بیٹی زندہ نہیں چھوڑی جائے گی اور اس کے قتل کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔"

یوں میری زندگی، میری فاطمہ کو اغوا کرلیا گیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جوگیندر!" سیٹھ موہن لال نے سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد مضطرب لہجے میں کہا تھا "تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"آپ مطمئن رہیں چاچا جی!" میں بول اٹھا "دو ہی گھنٹے کی تو بات ہے۔ دو گھنٹے کے بعد فاطمہ آپ کے پاس ہوگی" اس وقت رات کے بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں پولیس کو اطلاع دے دینا چاہیے" جوگیندر نے رائے دی۔

"نہیں میرے دوست!" میں نے مداخلت کی "فاطمہ کو میری وجہ سے یرغمال بنایا گیا ہے۔ میں خود کو ان غنڈوں کے حوالے کردوں گا۔"

"یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے" سیٹھ موہن لال نے کہا "ایسا نہیں ہوسکتا!"

"ایسا ضرور ہوگا" میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا "یہ بات میرے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہے کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچے۔"

ابھی جوگیندر کچھ کہنے والا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک لمبا چوڑا، بڑی بڑی مونچھوں والا سیاہ فام شخص نمودار ہوا۔ اس کے چہرے سے بے رحمی اور سختی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تمہارے دونوں ملازم اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں" اس خونخوار شخص نے بھاری آواز میں کہا پھر مجھ سے بولا "آیئے شاہین صاحب!"

"کون ہو تم؟" جوگیندر نے سخت لہجے میں اس شخص سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم" اس شخص نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔ سیاہ چہرے کی وجہ سے اس کے سفید دانت بڑے عجیب سے لگے تھے "مجھے اتنا معلوم ہے کہ تمہاری بہن ہمارے قبضے میں ہے۔ بولو سودا کرتے ہو؟ اپنی بہن کے بدلے شاہین کو دے رہے ہو؟" وہ رکا "حیران ہوگئے تم کہ ہم اتنی جلدی اور وقت سے پہلے کس طرح آدھمکے! دراصل ہم یہاں سے گئے ہی نہیں تھے۔ ہم تو تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دیر لگا کر ہم تمہیں کچھ سوچنے کا موقع کیوں دیتے!"

"میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں" میں بولا "سیتا دیوی کہاں ہیں؟" میں نے دانستہ فاطمہ کا سابق نام لیا تھا۔ وہ فاطمہ کو اسی حیثیت سے جانتے تھے اور انہیں یہ بتانا فضول ہی تھا کہ سیتا اب مسلمان ہوکر فاطمہ بن چکی ہے۔ مصلحت کے پیشِ نظر ابھی اس راز کو افشا نہیں کیا گیا تھا۔ جوگیندر اور سیٹھ موہن لال کے سوا گھر کے ملازمین بھی اس سے ناواقف ہی تھے۔

"بڑے جیالے ہو!" سیاہ فام شخص مسکرا کر بولا "تم میرے ساتھ چلے چلو! تمہارے اس کوٹھی سے نکلنے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر سیتا دیوی یہاں پہنچ جائیں گی۔"

میں صوفے سے اٹھا ہی تھا کہ جوگیندر نے بڑھ کر کہا "سنو شاہین! میری ایک بات سنو!"

"واپس آکر سن لوں گا" میں اطمینان سے بولا۔ اسی وقت میں نے دروازے کے باہر ایک اور شخص کی جھلک دیکھی تھی۔

میں دروازے سے نکلا۔ وہاں ایک اور شخص پستول تانے کھڑا تھا۔ اس نے پستول کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

"اگر تم میں سے کسی شخص نے شور مچایا یا اس گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم سیتا کو واپس نہیں کریں گے۔ تم کوٹھی سے باہر نہیں آؤ گے، البتہ دروازے پر کھڑے ہوکر سیتا کا انتظار کرسکتے ہو۔ گیٹ سے باہر قدم رکھا تو ہم پھر کہتے ہیں سیتا کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو جوگیندر!" میں نے پلٹ کر کہا "زندہ رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔"

سیٹھ موہن لال اور جوگیندر اب ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے میں آگئے تھے۔

"چلتے رہو!" پستول والے نے مجھے حکم دیا۔

جس وقت ہم گیٹ سے باہر آئے، میں نے جوگیندر اور موہن لال کو برآمدے سے اتر کر لان میں آتے دیکھا۔ گیٹ سے نکل کر ہم دائیں طرف بڑھے تھے۔ کوئی بیس قدم چلنے کے بعد ہم ایک درخت کے نیچے کھڑی کار کے پاس پہنچے۔ اسی وقت کار کا دروازہ کھلا۔ فاطمہ کار سے اتری۔ تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی اترا تھا۔

اب پستول کا رخ فاطمہ کی طرف ہوگیا تھا "تمہاری ذرا سی غلط حرکت سے سیتا مرسکتی ہے" پستول والے نے سرد لہجے میں مجھے دھمکی دی۔

پھر فاطمہ کے ہاتھ کھول کر میرے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ اس کے بعد فاطمہ کا منہ بھی کھول دیا گیا اور میرا منہ بند کردیا گیا۔

"چلو اندر بیٹھو!" جس شخص نے میرے ہاتھ اور منہ باندھا تھا، اس نے مجھے کار کی طرف دھکا دیا۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا، سو لڑکھڑا گیا پھر میں کار میں بیٹھ گیا۔

"جاؤ دیوی، جاؤ!" پستول والا فاطمہ سے بولا "جاؤ تمہارے پتاجی بہت پریشان ہیں۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی شاہین!" فاطمہ کی کپکپاتی آواز میں جو کرب تھا، وہ میں نے اپنے دل کی گہرائی میں محسوس کیا۔

اسی دوران میں کار کا انجن جاگ اٹھا۔ پستول والا بھی میرے ساتھ کار میں آبیٹھا۔ اب میں دو افراد کے درمیان بیٹھا تھا۔ اگلے لمحے کار حرکت میں آچکی تھی۔

پھر میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ اس وقت میرے احساسات بہت عجیب تھے۔ مجھے ولسن کا اغوا یاد آرہا تھا۔ آج مجھے خود اغوا کرلیا گیا تھا، یہ کیسی عجیب بات تھی! اگر فاطمہ کی زندگی کا سوال نہ ہوتا تو شاید میں اتنی آسانی سے قابو میں نہ آگیا ہوتا۔

کار پندرہ بیس منٹ کے قریب چلتی رہی۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں انہی لوگوں کے چکر میں پھنس چکا ہوں جن سے مجھے سیٹھ صدیق نے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی مگر یہ بات میرے لیے پریشان کن تھی کہ آخر میرے دشمن کون ہیں؟ وہ کیوں میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے؟ جن دو افراد کو میں نے جوگیندر کی کوٹھی میں دیکھا تھا، وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ زندگی کے کسی موڑ پر وہ میرے سامنے نہیں آئے تھے مگر مجھے خوشی تھی کہ میں نے خود کو ان لوگوں کے حوالے کردیا تھا اور فاطمہ کو ان کے چنگل سے نجات دلا دی تھی۔ میں فاطمہ کو ہر مصیبت سے بچانے کے لیے ہر عذاب سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔

کار رک گئی۔

"اترو!" کسی نے مجھ سے کہا۔ اس سے پہلے میرے دائیں جانب بیٹھا ہوا شخص کار سے اتر چکا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

میں کار سے اتر آیا۔ اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ لیا گیا۔ ہم تقریباً تین منٹ تک چلتے رہے۔ اس دوران میں کئی جگہ مجھے مڑنا پڑا۔ وہ کوئی سنسان سا مقام لگتا تھا۔ ہم کسی سڑک یا پختہ فرش پر نہیں چل رہے تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے کچی اور ناہموار زمین تھی۔ چند موڑ سے گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کسی دروازے میں داخل ہو رہا ہوں۔ دروازے میں داخل ہوکر ہم شاید صحن سے گزرے تھے۔ یہ کچا صحن تھا پھر تین سیڑھیاں چڑھ کر پکا فرش آگیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم شاید ایک کمرے میں آگئے تھے۔ یہاں مجھے زور سے دھکا دیا گیا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر میری ٹانگیں کرسی

کے پیروں سے باندھ دی گئیں پھر میری کمر کے گرد بھی رسی باندھ دی گئی۔ اب میری کمر کرسی کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں کسی نے بھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سب کچھ نہایت خاموشی کے ساتھ میکانیکی انداز میں ہو رہا تھا۔

پھر میں نے کمرے سے واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اس کے بعد دروازہ بھی بند کردیا گیا۔

"چترجی!" میں نے ایک آواز سنی "تمہیں یہیں رہنا ہے۔ تم اس کی نگرانی کرو۔ استاد آتے ہی ہوں گے، ہمارا کام ختم ہوگیا ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں حالات کی اس ستم ظریفی پر غور کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کہ مجھے اس خطرے سے آگاہ کردیا گیا تھا، میں بچ نہ سکا۔ یہ تمام اسکیم بہت تیزی اور نہایت ذہانت سے بنائی گئی تھی۔ وقت کا عنصر اس اسکیم کا سب سے اہم جزو تھا۔ پہلے انہوں نے سیٹھ موہن لال کو اس دھمکی کے ساتھ خاموش کردیا تھا کہ اگر اس نے پولیس یا کسی اور کو اطلاع دی تو وہ فاطمہ کو ختم کردیں گے پھر جب میں اور جوگیندر کوٹھی پہنچے تو انہوں نے اپنی اسکیم کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے پر فوراً ہی عمل کیا تھا۔ انہوں نے دو بجے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ یقیناً وہ اس عرصے میں کوٹھی کی نگرانی کرتے رہے ہوں گے۔

میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور دائیں کونے کی طرف جھکا پھر آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کو کرسی کے کونے سے ٹکا کر اوپر کی جانب جنبش دی۔ نتیجہ نہ قطعی مایوس کن تھا نہ قطعی حوصلہ افزا۔ آنکھوں کی پٹی ذرا سی سرکی تھی لیکن اب بھی میری آنکھیں بند تھیں۔ میں نے یہی عمل بار بار دہرایا اور میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ پٹی اب میری آنکھوں سے سرک چکی تھی مگر ناک کے بانسے پر آکر رک گئی تھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

وہ کمرا چھوٹا اور تاریک سا تھا۔ ایک کونے میں لمبی چمنی والا مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کی بتی کو اچھی طرح نہیں تراشا گیا تھا، اس لیے لو ایک طرف سے بڑھی ہوئی تھی اور لمبی چمنی اوپر تک کالی ہوگئی تھی۔ کمرے میں سامان بھی بہت مختصر تھا۔ چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ایک ست میز جس پر نہ معلوم کیا کیا الا بلا رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے فرش پر سگریٹوں اور بیڑیوں کے ٹوٹے پڑے ہوئے تھے ہر چیز گرد آلود تھی۔

باہر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کمرے

میں گھٹن تھی کیوں کہ اس میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہیں تھی۔ میں نے جس طرح آنکھوں کی پٹی اتاری تھی اسی طرح منہ کی پٹی بھی اتارنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہا۔

میں نے دو تین مرتبہ اپنے پیروں کو فرش پر جما کر کرسی کے پچھلے پیر اٹھائے اور انہیں زمین پر مارا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز بھی خاصی تھی۔

"اے بابو!" باہر سے آواز آئی "کیا گوز بوز (گڑبڑ) کرتا ہے" آواز قدرے نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے کرسی کے پچھلے پیر پھر فرش پر مارے۔ دوبارہ وہی آوازیں ہوئیں۔ اس مرتبہ ردِ عمل بھی مختلف تھا۔ دروازہ کھلا' ایک پستہ قد شخص اندر آیا اور دو قدم چل کر ہی رک گیا۔

"اے بابو!" وہ حیرت سے بولا "سالا لوگ' یہ کیا کیا توم (تم) نے! یہ پٹی کیسے اتارا آنکھوں سے؟"

میں نے زور سے سر ہلا کر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

"کھاموس! استاد آئیں گا اور تمہارا موی نکالیں گا" یہ کہہ کر پستہ قد پھر باہر چلا گیا۔ دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔ میں نے کنڈی لگانے کی آواز سنی تھی۔ گویا اس وقت مکان میں کوئی اور نہیں تھا مگر یہ بات معلوم ہو جانے سے بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں قطعی بے بس تھا پھر میں نے تمام کوششیں ترک کر دیں۔ پیروں پر اور سینے پر رسی کی بندشیں بہت سخت اور مضبوط تھیں۔

اب میں اس کرسی پر بے بسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماضی کے واقعات تیزی سے یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ مجھے بخت خاں کا خیال بھی آیا۔ خدا معلوم وہ ابھی اس شہر میں ٹھہرا ہوا تھا یا مہم کی منسوخی کے بعد مجاہدِ اوّل کے حکم پر اس شہر سے کہیں اور چلا گیا تھا پھر میرے خیالات اس نقطے پر مرتکز ہو گئے کہ مجھ سے دشمنی رکھنے والے یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ مگر اس وقت یہ سوچنا بھی بے سود تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے' جلد ہی سامنے آنے والے تھے۔ اس کے بعد میرے خیالات کی رو فاطمہ کی طرف مڑ گئی۔

میں اس وقت فاطمہ کے خیالوں میں گم تھا۔ نہ معلوم کیا وقت ہوا ہو گا کہ میں چونک اٹھا۔ کمرے کے باہر ایک دم کئی آوازیں ابھری تھیں۔ وہ کئی افراد تھے۔ دروازہ پُرشور آواز کے ساتھ کھلا۔ کمرے میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوا' وہ بہت لمبا سا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں' جسم کسرتی' سینہ چوڑا' بال چھوٹے چھوٹے گھنے اور گھنگھریالے تھے۔ طویل قامتی کی وجہ سے وہ دبلا پتلا معلوم ہوتا تھا لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور درشتی برس رہی تھی۔ اس کے پیچھے تین افراد اور تھے۔ یہ بھی شکل و صورت سے بدمعاش اور غنڈے معلوم ہوتے تھے مگر ان سب میں نمایاں شخصیت اسی لمبے تڑنگے شخص کی تھی۔ پستہ قد شخص اب بھی دروازے میں کھڑا تھا۔

"واہ بیٹا!" طویل قامت شخص نے کہا "آنکھوں کی پٹی کھول لی!"

میں نے حقارت سے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا کہ اس کے سوا میرے بس میں اور تھا بھی کیا!

"تھوبڑا کھولو اس کا!" طویل قامت شخص نے مڑ کر حکم دیا۔

طویل قامت شخص ان کا گرو تھا' استاد تھا۔ ایک شخص یہ کہتا ہوا میری طرف بڑھا "ابھی لو استاد!"

ذرا ہی دیر میں میرے منہ کی پٹی کھل گئی۔ میں نے دو تین گہرے سانس لیے۔ اب میں ہر صورت سے گزرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ ان کے ارادے خطرناک لگتے تھے۔

"کون ہے بے تو؟" استاد نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا تھا۔ میرا منہ اسی لیے کھولا گیا تھا کہ میں اس کے سوالوں کے جواب دے سکوں۔

"شاہین" میں نے جواب دیا۔

"پورا نام بتا!" استاد نے غصے سے پوچھا' پھر وہ دو قدم اور آگے آ گیا۔ اب وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔

"شاہین خان!" میں نے یوں ہی "خان" کا اضافہ کر دیا۔ مقصد اسے مطمئن کرنا تھا ورنہ میرا تنظیمی نام صرف شاہین ہی تھا۔

"کہاں سے آیا ہے؟" استاد کا انداز وکیلوں کی جرح کا سا تھا۔ وہ اس وقت شاید خود کو عرشِ معلیٰ پر تصور کر رہا تھا۔

"علی گڑھ سے" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کل تو سیٹھ صدیق سے کیوں ملا تھا؟" وہ دائیں جوتے کی ایڑی پر گھوم گیا۔

تو کیا اس ذرائے کا ہندوستان کی سیاست سے بھی کوئی تعلق ہے؟ میں نے سوچا' پھر بولا "ایک پیغام پہنچایا تھا انہیں۔"

"کیا پیغام تھا؟" استاد نے پھر سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"ابے کیوں جان کا لاگو ہوا ہے' بتا دے سیدھے سے" استاد کے ایک چمچے نے کہا "تو نے استاد کا غصہ نہیں دیکھا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم۔"

ابھی میرا جملہ مکمل ہوا تھا کہ استاد کا زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ تھپڑ اچانک ہی مارا گیا تھا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میری زبان دانتوں میں آ کر کٹ گئی۔

"کنجر کی اولاد!" استاد نے مجھے تھپڑ مارنے کے بعد گالی دی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں" میں نے پھر کہا "مجھے سیٹھ جی کو ایک خط پہنچانا تھا۔ یہ خط لفافے میں بند تھا" جلدی جلدی میں نے پوری بات بتا دی۔

"مہاتما جی کے خلاف کیوں بولا تھا آج؟" استاد نے اس بار خلافِ توقع ایک سوال کیا۔

"وہ میرے اپنے خیالات تھے" میں بولا۔

"ابھی دیکھے گا تمہارے خیالات!" استاد نے منہ بگاڑ کر کہا "بڑا آیا خیالات والا!" اس کا تھپڑ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ "کس نے بولا تھا ایسا کرنے کو؟"

میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ کم بخت کے ہاتھ بہت ہی سخت تھے۔ میں نے فرش پر خون تھوکتے ہوئے جواب دیا "کسی نے نہیں۔"

"پھر جھوٹ بولتا ہے!" اس مرتبہ اس کی ٹانگ گھومی تھی۔ جوتے کی نوک میری ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ کرسی الٹ گئی۔ میرا سر زور سے فرش سے ٹکرایا۔ "اسے اٹھاؤ!" استاد کی آواز ابھری۔ میری کھوپڑی میں بے شمار پھلجھڑیاں چٹ پٹ کر کے چھوٹ رہی تھیں۔

کرسی سیدھی کر دی گئی۔ سر کے پچھلے حصے پر چوٹ کچھ شدید آئی تھی۔ کمرا مجھے ایک مرتبہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومتا محسوس ہوا۔ چند لمحے بعد ہر چیز اپنی جگہ ٹھہر گئی۔

"ابھی جلدی بول دے' سچ سچ! کیوں اپنی جان کا دشمن بنتا ہے!" استاد کے اس چمچے نے کہا جس نے مجھے کرسی سمیت فرش سے اٹھایا تھا۔

"میں سچ بول رہا ہوں' اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے" میں جلدی سے بولا "میں نے کسی کے کہنے پر گاندھی جی کے خلاف تقریر نہیں کی تھی۔"

"گاندھی جی مت بول!" استاد چیخا "مہاتما جی بول!" اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔

جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے غیر متوقع تھا۔ یہ سب کچھ سیاسی بنیادوں پر ہو رہا تھا۔ یہ ان لوگوں کا عقوبت خانہ تھا جنہیں مہاتما گاندھی اہنسا کی تلقین کر رہے تھے مگر انسان کے اندر چھپا ہوا وحشی درندہ کبھی مرا ہے! اسے جب بھی موقع ملا ہے پوری قوت سے سامنے آیا ہے۔ کبھی اس درندے نے ہلاکو کا نام پایا ہے۔ کبھی چنگیز خاں کا' کبھی ہٹلر اور کبھی بے رحم آمروں کا اس نے روپ دھارا ہے۔

"تو نے سب کچھ سیٹھ صدیق کے کہنے پر کیا ہے" اس مرتبہ استاد نے سوال نہیں کیا تھا بلکہ اپنی طرف سے ایک مفروضہ بیان کیا تھا "ہم سب جانتا ہے بیٹا!"

"یہ غلط ہے' جھوٹ ہے!" میں نے زور سے کہا "مجھ سے کسی نے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ میری سوچ ہے' میرے ساتھیوں کی سوچ ہے!" میں جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ میں اس تاثر کو مٹانا چاہتا تھا جو نہ معلوم کیسے ان کے ذہن میں پیدا ہو گیا تھا!

"پھر جھوٹ!" استاد نے پھر طمانچہ مارا۔

"ارے کیوں اڑی کرتا ہے!" ایک اور چمچے نے کہا "استاد کا مغز بہت خراب ہے' ہاں۔"

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا" میں بولا "سیٹھ صدیق نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"یہ سمجھتا ہے' ابھی استاد کو کچھ پتا نہیں" استاد نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا "سیٹھ صدیق نے کل تیرے سے ملنے کے بعد تیری بڑی تعریف کی تھی پھر تو نے آج مہاتما جی کے خلاف بولا۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں تقریر کرنا ہو گی" میں تیزی سے بولا "تم لوگوں کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔"

"تجھے تقریر نہیں کرنی تھی تو اوپر اسٹیج پر کیوں بیٹھا تھا؟ وہاں تجھے صدیق ہی نے بٹھوایا تھا۔ تجھے صدیق ہی نے بلوایا تھا" استاد اب اور بھی برہم تھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "یہ سب ٹھیک ہے مگر سیٹھ صدیق نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے تقریر کرنی ہے۔"

"جھوٹ مت بول!" استاد نے میری گردن پر اپنا چوڑا ہاتھ جما دیا۔ میرا سانس گھٹنے لگا۔ میری آنکھوں میں پانی آ گیا پھر اس نے جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی۔ اسی وقت مکان کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ استاد بولا "سیٹھ جی آ گئے' اوئے ٹنی! جا دروازہ کھول۔"

پستہ قد شخص جو کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا' اچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے پوچھ گچھ کا سلسلہ

رک گیا۔ میری گردن بری طرح دکھنے لگی تھی۔

ذرا ہی دیر میں دو افراد کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں سیاہ رنگت کے ٹھگنے کھدر پوش تھے۔ وہ لمبے کرتے اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ آگے آگے جو شخص تھا اس کا پیٹ بہت پھیلا ہوا تھا۔ پیروں میں سفید جوتے، سر پر سفید چونچ والی کھدر کی ٹوپی، موٹے موٹے ہونٹ، بھدی پھیلی ہوئی ناک کے نیچے بیسی کے کانٹوں کی طرح کھڑی مونچھیں، ہاتھ میں بیت اور آنکھوں پر گول شیشوں کا چشمہ! اس کے پیچھے اس کا "اختصاریہ" تھا، اس سے قدرے چھوٹا، کم موٹا، کم کالا اور آدھے شیشوں کا چشمہ لگائے ہوئے!

"آؤ آؤ سیٹھ جی!" استاد نے کہا "یہ ہے وہ جوان، شاہین خان۔"

"ہوں!" سیٹھ نے میرے قریب آتے ہوئے گہرا ہنکارا بھرا "تو یہ ہے وہ جوان؟ کچھ بتایا اس نے؟" سیٹھ نے میری کرسی کے گرد چکر لگا کر استاد سے پوچھا۔

"سیٹھ جی! اس کی بڑی موٹی کھال ہے" استاد نے جواب دیا "مگر دیکھوں گا کب تک زبان نہیں کھولے گا!"

"ٹھیک ہے، صبح تک کام ہو جانا چاہیے" سیٹھ نے کہا۔

"چنتا (فکر) ہی مت کرو مہاراج!" استاد پُر یقین آواز میں بولا۔

"ادھر آؤ" سیٹھ نے استاد کو اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔

تھوڑی دیر تک کمرے کے باہر سے کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی کا وقفہ ہوا، اس کے بعد استاد نے کچھ کہا، کیا کہا، یہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، سمجھ گئے نا!" سیٹھ کی واضح آواز آئی "صبح تک سب کام ہو جانا چاہیے۔ اس وقت سوا دو بج رہے ہیں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا" استاد کی آواز ابھری "اپن کا نام استاد ذیلی ہے سیٹھ!" وہ کسی عیسائی معلوم ہوتا تھا۔ نام سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔

"ساری باتیں معلوم ہونا چاہئیں" سیٹھ کی تاکیدی آواز سنائی دی۔

"ارے بول دیا نا سیٹھ تیرے کو! ابھی کیا اسٹامپ پر لکھ کر دے!" اس مرتبہ استاد ذیلی کچھ گرم ہو گیا "ناؤ انعام نکالو!"

"انعام صبح ملے گا" سیٹھ بولا "کام کے بعد۔"

"اپن کچا سودا تو کیا ہی نہیں کبھی!" استاد نے کہا "ابھی ہم اتنا کام ہی کیے دائیں کے گھیر کیا ہے۔ بولو انعام دیتا ہے یا نہیں؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ صبح کام کے بعد لے لینا۔ آج بینک بند ہو گئے تھے" سیٹھ نے عذر پیش کیا۔

"ہم سے مسخری مت کرو سیٹھ جی!" استاد تیکھے لہجے میں بولا۔ "اپن بینک ویک نہیں جانتا ہے۔ رو کڑا نکال سیٹھ! نہیں نکالے گا تو ہم چھوڑ دے گا اس نوجوان کو۔ خدا کے بیٹے کا قسم، بولتا ہے چھوڑ دے گا اسے۔"

"منشی جی!" سیٹھ نے آواز لگائی اور سیٹھ کے ساتھ آنے والا لپک کر کمرے سے نکل گیا۔

"جی مالک!"

"اسے رقم دے دو" سیٹھ نے منشی کو حکم دیا پھر استاد سے بولا "اس وقت آدھی رقم ہے، باقی صبح لے لینا۔"

"ارے کیوں میٹنگ خراب کرتا ہے سیٹھ!" استاد نے زور سے کہا "پورا رقم دو، ورنہ بھاگ جاؤ!" آخری الفاظ استاد نے اتنی زور سے کہے کہ منشی کو میں نے اچھلتے ہوئے دیکھا جو دروازے کے سامنے ہی کھڑا تھا۔

"ارے تو اتنی زور سے کاہے کو بولتا ہے!" منشی بولا۔

"دے دے منشی!" سیٹھ نے آخر کہہ ہی دیا۔

"پوری رقم چاہیے!" استاد نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

"ارے ہاں ہاں، پوری رقم!" سیٹھ نے ناگواری سے کہا۔

پھر میں نے منشی کو تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دروازے کی دائیں سمت بڑھتے دیکھا۔ اب وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔

"کیوں جھوٹ بولتا تھا سیٹھ!" استاد کی آواز ابھری "بیکار لفڑا ڈال رہا تھا۔"

"کام ہو جانا چاہیے" سیٹھ سنی ان سنی کر کے بولا۔

"استاد حرام نہیں کھاتا سیٹھ!" استاد کی آواز آئی پھر سیٹھ اور منشی وہاں سے چلے گئے تھے "چل بے نپی! دروازہ بند کر" استاد نے پستہ قد شخص کو حکم دیا اس کے بعد وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا "سن اوئے! مجھے سچ سچ بتا مہاتما جی کے خلاف کس کے کہنے پر بولا تھا تو؟"

میرا جواب وہی تھا "کسی کے کہنے پر نہیں۔"

"صدیق نے تجھ سے کیا بولا تھا؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا "اس نے تجھ کو بولا تھا نا کہ مہاتما کو برا کہنا؟"

"نہیں، مجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا۔"

"تیرے ساتھی کون ہیں؟" استاد نے پوچھا۔

"میرا یہاں کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔"

"میں یہاں کا نہیں پوچھتا۔" استاد بولا "ہم علی گڑھ کا پوچھتا ہے!"

"علی گڑھ میں میرے بہت سے ساتھی ہیں۔" میں نے جواب دیا "میں وہیں تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے طالب علم پڑھتے ہیں، وہ سبھی میرے ساتھی ہیں۔"

"اوئے کنجر کی اولاد!" استاد پھر غصے میں آگیا "وہ ساتھی نہیں، وہ ساتھی کے بارے میں بول جن کے ساتھ تم کام کرتا ہے، ہنگامہ کرتا ہے، ڈاکا مارتا ہے!"

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"کرتا ہے، کرتا ہے!" استاد نے جھلا کر پیر پٹخے "تم حکومت کے خلاف کام کرتا ہے۔ تم خود اپنی تقریر میں بولا تھا۔ صدیق سیٹھ بھی بولتا ہے۔"

"میں ایسے کام نہیں کرتا۔ سمجھے!" اس مرتبہ میں بھی چیخا تھا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" استاد بولا "ابھی سب اڑی نکل جائے گا۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا "ابھی ڈھائی بجا ہے۔ تین بجے ہم کو سب سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب چاہیے۔ ابھی تم کو جواب دینا پڑے گا! گلو!۔ نچھو! ترکیب نمبر دو۔"

میں ترکیب نمبر دو کے مطابق ملنے والی سزا کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچنے کے لیے مجھے زیادہ مہلت نہ ملی۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ دیوار میں لگی ہوئی ایک مضبوط سی کھونٹی میں باندھ دیئے۔ اب میں دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے پھر میری ایک ٹانگ ایک طرف دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی میز سے باندھ دی گئی۔ میں نے زور لگایا۔ میز پر اتنا وزن تھا کہ میرے لیے پیر کو جنبش دینا ناممکن تھا۔ اس کے بعد وہ باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑا سا کنستر لے آئے پھر اسے مٹی اور ریت سے بھر دیا گیا۔ اس کے بعد میری دوسری ٹانگ اس کنستر سے باندھ دی گئی۔ اب میری دونوں ٹانگیں اتنی چری ہوئی تھیں کہ میں تقریباً اپنی کلائیوں کے بل لٹکا ہوا تھا میرے جسم کا تمام زور کلائیوں پر تھا۔

"نپی! موم بتی جلاؤ۔"

پستہ قد شخص باہر سے ایک موٹی سی ادھ جلی موم بتی اٹھا لایا پھر اس نے ایک کنستر میری پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان رکھ کر اس پر جلتی ہوئی موم بتی ٹکا دی۔

"لاؤ تاش نکالو!" استاد نے کہا۔

پھر وہ سب ایک ایک کر کے کمرے سے چلے گئے۔

"ابھی ہم تاش کھیلتا ہے۔" باہر سے استاد کی آواز آئی "جب تم سچ بولنا چاہے آواز دے لینا" پھر وہ اندر آگیا "سچ بولنا ہے تو اب بھی بول دے۔"

"میں نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔" میں نے کہا اور استاد باہر چلا گیا۔

استاد اپنے چمچوں کے ساتھ باہر تاش کھیل رہا تھا۔ میں نے پھونک مار کے موم بتی بجھا دی۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ ان لوگوں کو اس بات پر تشویش اور برہمی کیوں ہے کہ میں نے گاندھی جی کے خیالات و نظریات کے خلاف تقریر کی تھی۔ میری تقریر کی نوعیت ایسی تھی جس پر انگریز حکومت کی برہمی تو بجا ہو سکتی تھی لیکن انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف کسی شخص کے لیے اس پر اتنا برہم ہونا تعجب خیز تھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس دور کے ہندوستان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار انقلابی فکر رکھنے والے بہت سے نوجوان اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے لیے قابلِ فہم نہ تھی کہ آخر یہ لوگ کس بنیاد پر شبہ کر رہے ہیں، میں نے وہ تقریر سیٹھ صدیق کے اشارے پر کی تھی؟ تو کیا ایسا ہے کہ انگریزوں کے خلاف مختلف محاذوں پر جدوجہد کرنے والے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں؟ وہ آپس میں بے اعتمادی اور بدگمانی کا شکار ہو گئے ہیں؟ یہ وہ پریشان کن سوالات تھے جن کے جواب میرا ذہن اثبات ہی میں دے رہا تھا۔ اس کا سبب سیٹھ صدیق کی وہ باتیں تھیں جو انہوں نے گزشتہ شام مجھ سے کی تھیں اور مجھے خبردار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے مجھے سزا دینے کے احکام جاری کر دیئے گئے ہوں گویا سیٹھ صدیق کو یہ علم تھا کہ بعض حلقے میری تقریر سے بہت زیادہ برہم تھے۔

میں یہ بات بہ خوبی سمجھ چکا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے صرف وہی بات سننا چاہتے ہیں جو ان کے مفروضے کو صحیح ثابت کر دے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی میں جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ پے درپے سوالات کریں گے جن کے بارے میں میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا پھر یہ بات بھی انتہائی اخلاقی گراوٹ کی تھی کہ میں سیٹھ صدیق جیسے شخص کے بارے میں ایسا جھوٹ بول دوں جس کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا۔ میں نے اس لیے یہی فیصلہ کیا کہ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے، میں ان لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

چند منٹ گزرنے کے بعد استاد ڈپی کی آواز آئی "ٹنی! جا دیکھ وہ ٹمس تو نہیں ہوگیا۔"

ٹنی پھدکتا ہوا کمرے میں آیا اور وہیں سے ہانک لگا کر بتایا کہ موم بتی میں نے بجھادی ہے۔

پھر استاد اپنے گرگوں کے ساتھ کمرے میں آگیا اور مجھ سے بولا "ابھی تم نے موم بتی بجھا کر اچھا نہیں کیا" پھر اس نے اپنے گرگوں کو حکم دیا "اس کی گردن میں رسی ڈال کر ہاتھ سے باندھ دو!" اس کے حکم کی فوراً ہی تعمیل ہوئی۔ اب میری گردن بالکل سیدھی تنی ہوئی تھی۔ موم بتی پھر روشن کردی گئی۔ اس مرتبہ اسے اینٹ پر رکھ کر تھوڑا اونچا بھی کردیا گیا تھا پھر وہ سب آگے پیچھے باہر چلے گئے۔

موم بتی کا شعلہ میری ران کے اب زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ اس کی لو کی گرمی سے میری ران میں جیسے سوراخ ہونے لگا تھا۔ یہ جلن اتنی بڑھی کہ میرے تمام خیالات منتشر ہوکے رہ گئے۔ میں نے اپنے جسم کو ذرا سا موڑ کر ران کے اس حصے کو لو کی زد سے بچانا چاہا مگر اس کوشش میں میرا تمام بوجھ دیوار میں لگی میخوں سے بندھے ہوئے پنجوں پر آگیا۔ ساتھ ہی گردن میں بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ میرا سر پیچھے ہوگیا اور رسی میری گردن کو جیسے کاٹنے لگی، رسی کی بندشیں میرے پنجوں میں اتر گئیں۔ میں نے بے قرار ہوکر پھر سابقہ پوزیشن میں آنا چاہا مگر میں اپنے پنجوں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ ایک اور جھٹکا لگا۔ میرا جسم سامنے کی طرف جھک کر کمان بن گیا۔ میری آنکھوں میں تکلیف سے آنسو آگئے۔ بڑی مشکل سے میں پھر پنجوں کے بل کھڑا ہوسکا۔ شعلہ میری ران میں برے کی طرح اترنے لگا اور میرے جسم کا روم روم پسینے میں بھیگ گیا۔

اس تکلیف سے گزرتے ہوئے میرا ذہن اسی ادھیڑبن میں مصروف رہا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے میرے لیے اس ایذا رسانی کا بندوبست کیا ہے؟ پھر ایک راہ مجھے سوجھ ہی گئی۔ استاد ڈپی اپنے گرگوں کے ساتھ اب بھی تاش کھیل رہا تھا۔

"استاد ڈپی!" میں نے آواز دی۔

"کیا ہے بے؟" استاد کی آواز آئی۔

"ادھر آؤ!" میں نے کہا۔

استاد فوراً نہیں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بازی ختم ہونے کے بعد آئے گا۔ وہ شاید میری قوتِ برداشت کو بالکل ہی ختم کردینا چاہتا تھا۔ میں نے پھر استاد ڈپی کو آواز دی تھی۔ اس نے پھر مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا تھا "ابے جان کیوں نکل رہی ہے۔"

"مستک آگیا اپنی جگہ!" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"اسے ہٹاؤ! موم بتی کو۔" میں جلدی سے بولا "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں!۔ ہو بات کریں گا۔" استاد نے لطف لیتے ہوئے کہا "ٹنی! ہٹالے۔"

ٹنی نے استاد کے حکم کی تعمیل میں موم بتی ہٹالی۔ دہکتا ہوا انگارا جیسے اچانک میری ران سے ہٹ گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کمرے میں اس وقت میرے علاوہ پانچ افراد تھے۔ استاد، ٹنی، گلو، مچھو اور ایک شخص جس کے نام سے میں واقف نہیں تھا۔

"ہاں بیٹا!" استاد نے ترنگ میں آکر کہا "مہاتما کے خلاف کس کے بولنے پر اسپیچ کیا تھا؟" اب اس کا انداز گفتگو بھی کچھ شیخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میں سب کچھ بتادوں گا، ان لوگوں کو باہر بھیج دو۔" میں نے کہا۔

"کیا بولا؟" استاد نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "ان کو باہر بھیج دوں! مجھ سے محبت بنائے گا کیا؟" یہ کہہ کر وہ ہنسا جیسے کوئی بڑی پُرلطف بات کہہ دی ہو۔ اس کے گرگے بھی ہنسنے لگے۔ مجھے ان کی یہ ہنسی بڑی زہر لگی۔ وہ مجھ سے چوہے بلی والا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوچی تھی اور اس پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ترکیب کامیاب ہوگی یا نہیں، ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

"محبت کیسے بنائے گا استاد!" ایک گرگے نے ہنس کر کہا "یہ تو بندھا ہوا ہے۔"

"ابھی کیا معلوم؟" استاد لطف لیتے ہوئے بولا پھر وہ مجھ پر غرّایا "بول جواب دیتا ہے یا نہیں؟"

استاد مجھ سے اب چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے پھر کہا "میں سب کچھ بتادوں گا، ان لوگوں کو یہاں سے بھیج دو۔"

اس کے ساتھ ہی استاد اور اس کے گرگوں نے پھر قہقہے لگائے۔

میں نے ان قہقہوں کی آڑ میں سرگوشی کی "اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے استاد!" مجھے یقین تھا کہ استاد ڈپی کے سوا میرا یہ جملہ کسی نے نہیں سنا تھا۔

استاد کے چہرے پر تعجب کے آثار کچھ اور گہرے ہوگئے۔ میں نے معنی خیز انداز میں اسے آنکھ بھی ماری۔

"یہ سالا میرے سے پرائیویٹ بات کریں گا۔" استاد نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے گرگوں سے کہا "ابے تم سب باہر جاؤ!" اس کا لہجہ حاکمانہ تھا۔

تمام گرگے ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

"اب بول کیا بات کریں گا؟" استاد بولا "جلدی بول! ابھی ہم ترا سرونٹ نہیں ہے۔"

"تم مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"او بابا! ابھی ہم پوچھے گا نہیں تو کیا کریں گا، سیٹھ نے بولا تھا۔ ابھی تم ٹھیک ٹھیک بولو، فائدے والی بات بولو!"

استاد فائدے والی بات سننے کو بے چین تھا۔ یہ بات میرے لیے اطمینان بخش تھی۔

"استاد ڈپی!" میں نے کہا "میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔ میں علی گڑھ سے آیا ہوں اور یہاں کلکتے میں کسی کو نہیں جانتا۔ سیٹھ صدیق کے نام علی گڑھ کے ایک صاحب نے خط دیا تھا، وہ میں نے سیٹھ جی کو پہنچا دیا تھا پھر انہوں نے مجھے دھرم تلہ میدان میں 'الاؤ' کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے کہا۔ مجھ سے تقریر کے بارے میں قطعی کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ مجھ سے وہاں تقریر کرنے کو کہا جائے گا۔ میں نے تقریر میں جو کچھ کہا، وہ میرے اپنے خیالات ہیں۔ بہت سے لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں۔ میں گاندھی جی کی عزت کرتا ہوں، لیکن میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ انگریز کو اس ملک سے ان طریقوں سے نہیں نکالا جاسکتا جو گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے بتاتے ہیں۔ ہمیں انگریز کے خلاف جنگ کرنی ہوگی۔ ہمیں انگریز سے نجات پانے کے لیے ہتھیار اٹھانے پڑیں گے۔ ہمیں۔۔۔"

"باس۔ باس!" استاد ڈپی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا "اسپیچ مت کرو! اپن کو یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ کیا سمجھا! تو اپن سے فائدے کی بات بول!"

"سیٹھ موہن لال کی بیٹی کو تم نے اٹھایا تھا؟" میں نے اس سے پھر سوال کیا۔

"اپن کی پارٹی کے لوگ نے اٹھایا تھا، پر تجھے اس سے کیا! تو بات بتا!"

"اس سیٹھ کا نام کیا تھا جو ابھی یہاں آیا تھا؟" میں نے پھر ایک سوال جڑ دیا۔

استاد ڈپی بگڑ گیا "ابھی تو کائے کو اپن کو گھماتا ہے! فائدے کی بات بول نا۔"

"تم اسی سیٹھ کے لیے کام کررہے ہو، نا! اسی کے کہنے پر تم نے سیٹھ موہن لال کی بیٹی کو اٹھایا تھا اور مجھے یہاں لائے تھے؟"

"ارے ہاں بابا!" استاد تنگ آکر بولا "مگر۔"

"اور اس کے لیے اس نے تمہیں پیسا بھی دیا ہے؟" میں نے استاد کی بات کاٹ دی۔

"دو کڑ بول دو کڑ!" استاد نے جھلا کر کہا جیسے میں نے اس کی توہین کردی ہو "چھوٹا کام تو اپن کرتا ہی نہیں۔"

"کتنا دو کڑ؟" میں نے پوچھا۔

"دو ہزار" استاد نے اپنی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے بتایا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کی جیب میں کوہ نور ہیرا ہو۔

"بس، صرف دو ہزار!" میں نے حقارت اور تعجب سے کہا "صرف دو ہزار کے لیے تم مجھے جان سے ماردو گے؟"

"یہ کون بولا تجھ کو!" استاد حیرت سے بولا "اس سالا ٹنی نے تیرے کو بتایا ہوگا" پھر اس نے اعتراف کیا "ہاں جان سے ماریں گا۔ اپن چھوٹا کام نہیں کرتا۔ جانتا نہیں، نہیں جانتا تو! ابھی اپن ٹنی کو بھی دیکھیں گا۔ اس نے کیوں بتایا تیرے کو! ٹنی!" اس نے غصے میں زور سے آواز دی۔

"نہیں، ٹنی نے نہیں بتایا۔" میں نے زور سے کہا "سیٹھ نے تجھ سے جو باتیں کی تھیں، اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا۔"

"ابے تیرا مستک تو اپنی گلو کے بلیڈ کی مافک تیز ہوتا رہے، وا!" استاد نے گویا میری ذہانت کی تعریف کرڈالی۔

اس دوران میں ٹنی پھدکتا ہوا کمرے میں آگیا۔ اس کا نام چٹرجی تھا مگر استاد اسے ٹنی ہی کہتا تھا۔ اس کی وجہ کوتاہ قامتی ہی رہی ہوگی۔

"میرے کو بلایا استاد؟" ٹنی نے آکر دریافت کیا۔

"جان لینے کا بات تو نے بولا اس کو؟" استاد نے غصے سے پوچھا۔

"نہیں استاد! رام کوسم (قسم) نہیں۔ یہ سالا لوگ جھوٹ بولتا۔" ٹنی کپکپاتے ہوئے بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا استاد کہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" میں نے پھر کہا "مجھے سیٹھ کی باتوں سے پتا چلا تھا۔"

"جا بھاگ یہاں سے!" استاد نے ٹنی کو حکم دیا پھر مجھ سے بولا "ابھی تم ٹیم پاس مت کرو، فائدے کی بات بولو!"

"سنو استاد!" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "میں واقعی تمہیں فائدے کی بات بتا رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ پھر تم

مجھے چھوڑ دو گے!"

"چھوڑ دیں گا' چھوڑ دیں گا۔" استاد بے تابی سے بولا "تم آگے بولو!"

"مجھے چھوڑ دو' میں تمھیں چار ہزار روکڑ دلا سکتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر یہ جملہ مکمل کیا۔

وہ احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹانے لگا "کیا' کیا بولا' تم کیا بولا؟" اسے شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اپنی پیشکش دہرا کر اس کی طرف متوقع نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ استاد نے بڑھ کر اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ مجھے ستارے سے نظر آ گئے۔

"کیا بولا تم!" وہ چیخا "ابھی ہم بے ایمانی کریں گا۔ بے ایمانی کو بولتا۔" اس مرتبہ اس نے الٹا ہاتھ گھمایا تھا۔

استاد ڈپی کا یہ ردِ عمل میرے لیے غیر متوقع تھا۔ فائدے کی بات پر اس نے جس بے چینی کا اظہار کیا تھا' اس کی بنا پر مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہ میری پیشکش کو مسترد نہیں کر سکے گا مگر میں نے امید کا دامن اب بھی نہیں چھوڑا تھا۔

"ٹھیک ہے' تو پھر تم سیٹھ ہی سے اس کام کے لیے چار ہزار مانگو۔" میں نے کہا۔

"ابھی اپن سودا پکا کر لیا ہے۔ سمجھ آیا کہ نئیں!" استاد ڈپی بولا "زبان دے چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں جو کچھ بتا سکتا ہوں' سیٹھ ہی کو بتاؤں گا۔" میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا "سیٹھ کو بلاؤ۔"

"ابھی وہ تم سے پکار نئیں لیتا ہے کہ ادھر آئے گا۔ سمجھا' کیا سمجھا!" اس کے لہجے میں اطمینان تھا "ابھی تجھے یہاں کوئی بچانے نئیں آئیں گا۔"

"مگر میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے اس سیٹھ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

"اپن بتاتا ہے۔ تم نے مہاتما کو برا کہا۔" استاد ڈپی بولا "تم ملیچھ مسلا!"

تو گویا یہ ہندو مسلم اختلافات تھے جن کی بنا پر میں اس صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا "میں نے گاندھی جی کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بولا تھا' بولا تھا' بولا تھا!" اس نے بائیں ہتھیلی پر اپنا دایاں مکا مارتے ہوئے کہا "ابھی ہم سے چالاکی مت کرو! سیدھا سادا بتاؤ کس کے بولنے پر تم وہ باتیں بولا تھا؟"

"میں نے کسی کے بھی کہنے پر وہ باتیں نہیں کی تھیں۔" میں جھلا کر بولا "تمھیں یقین نہیں آتا تو بھاڑ میں جاؤ۔"

اس مرتبہ دو تین کے میرے منہ پر پڑنے "گالی نکالا ہے! ابھی ٹھپّے مار مار کر تھوتو بگاڑ دیں گا۔ اپن استاد ڈپی ہے' ڈپی استاد! اپن سب جانتا ہے۔ تم کو صدیق سیٹھ بولا' سیٹھ کو انگریز بولا۔ تم مچھ مسلمان انگریز سے مل گیا ہے۔ اس سے مل کر ہندو کے خلاف کھیلا کرتا ہے۔ اپن سب جانتا ہے۔ مائی نیم از استاد ڈپی!" وہ تکبر سے بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے پھر چیخ کر کہا۔

"ابھی تم سب ٹریو ٹریو بولیں گا۔" استاد ڈپی بولا "اپن سب جانتا ہے کیا رائٹ ہے کیا رانگ! مائی نیم از استاد ڈپی! ابھی تیرا فادر بھی بتائیں گا۔" اس کا انداز شاہانہ ہو گیا تھا۔ وہ کمرے میں کسی وائسرائے کی طرح ٹہلنے لگا۔ انگریزی کی قابلیت بگھار کر وہ گویا اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کو منوانا چاہتا تھا "گلو' مچھو' ٹنی!" اس نے اپنے گرگوں کو آواز دی۔

ایک مرتبہ پھر موم بتی روشن کر دی گئی۔

"ابھی تمہارا موی باہر آئیں گا تو فر فر بولیں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے گرگوں کے ساتھ پھر باہر چلا گیا۔

ٹنی ابھی کمرے ہی میں تھا۔ باہر ایک بار پھر تاش کی بازی جم گئی۔

موم بتی کے شعلے سے بھڑکتی ہوئی توانائی میری بائیں ران کے بالائی حصے پر مرکوز تھی۔

ٹنی میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی "ابھی کیوں مرنا مانگتا ہے' استاد کو بتا دے نا!"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ابھی تیرے کو مرنا ہے' کیا؟" اس نے کہا "پھر کاہے کے لیے یہ لفڑا مول لیتا ہے۔ آرام سے مر جا۔"

میں نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا! میرا تمام جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ جسم کا تمام بوجھ اب میرے پنجوں پر تھا۔ مجھ میں اب اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ جسم کو جنبش دے کر پھر پنجوں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ میری ران اب یوں لگ رہی تھی جیسے اسے کسی تنور میں لٹکا دیا گیا ہو۔ گردن میں پڑی ہوئی رسی پھانسی کا پھندا بن گئی تھی۔ میرا سانس گھٹنے لگتا۔ ایسی تکلیف تھی کہ اس کا بیان مشکل ہے۔

پھر میری ہمت' عزم' حوصلہ اور قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ واقعی اگر مرنا ہی تھا تو پھر اتنی اذیت کس لیے؟ میں نے سوچا تھا پھر یہ بھی سوچا تھا کہ ان لوگوں نے صحیح یا غلط ایک مفروضہ قائم کر لیا تھا' اس کے خلاف یہ لوگ ایک لفظ سننے کے روادار نہیں تھے۔ جو بات جھوٹی تھی اسے یہ لوگ

حقیقت سمجھتے تھے اور مجھ سے اس کی تصدیق چاہتے تھے۔ میرے انکار سے وہ اپنا اندازِ فکر تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔

"استاد!" میں زور سے چیخا "بتاتا ہوں' بتاتا ہوں۔"

"ابھی تھوڑا ویٹ کرنا!" استاد کی آواز جواب میں آئی "ابھی کاہے کو بتاتا ہے۔"

"استاد!" میں پھر چیخا۔

اس مرتبہ ٹنی نے دوڑ کر موم بتی ہٹا لی۔ وہ واقعی نرم دل ہی تھا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے تشکرانہ انداز میں دیکھا۔ اسی وقت استاد اپنے گرگوں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ موم بتی کی لو ہٹتے ہی میرے جسم میں جیسے ٹھنڈک سی آ گئی۔ تمام جلن' تمام درد اور آگ صرف ران میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اپنی جگہ بے سدھ اور بے دم سا ہو کر رہ گیا۔ پنجوں میں اٹھنے والی ٹیس اب ران کی تکلیف میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔

"اے چلو! اسے ہولی کر اس سے اتارو۔" استاد ڈپی نے اپنے گرگوں کو حکم دیا۔

گلو اور مچھو میرے دونوں ہاتھوں کی بندشیں کھولنے لگے۔ تیسرا گرگا میری گردن میں پڑی رسی کھول رہا تھا۔ اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

"اس ٹیم کون اپنی مدد کا ہزبینڈ آ گیا۔ ٹنی' جا دیکھ!" استاد نے کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا "ابھی فر فر بولیں گا کیوں!"

اسی لمحے ٹنی کی چیخ سناٹے میں گونج اٹھی "استاد!" وہ بے اختیار چلایا تھا۔ اس کے ساتھ کسی کے بھد سے گرنے کی آواز آئی۔ استاد اور اس کے گرگے چونک اٹھے۔ تکلیف سے ہلکان میرا ذہن بھی چوکنا ہو گیا۔ استاد اور اس کے گرگوں کے ردِ عمل سے ظاہر تھا کہ جو کچھ ہوا ہے ان کی توقع کے خلاف ہوا ہے۔ استاد اور اس کے گرگے باہر کی طرف لپکے ہی تھے کہ انہیں ٹھہر جانا پڑا۔

"ہینڈز اپ!" ایک گھمبیر آواز گونجی اور ایک نقاب پوش دروازے میں آ گیا "پیچھے ہٹو! الٹے قدموں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ' ہاتھ اٹھائے رکھو۔" اس نقاب پوش نے حکم دیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

استاد ڈپی اور اس کے ساتھی' نقاب پوش کی ہدایت کے مطابق الٹے چلتے ہوئے دیوار سے لگ گئے۔ استاد کے چہرے سے سخت برہمی ظاہر تھی۔ اس نے درشت آواز میں کہا "ابھی میرے کو بتاؤ' تم کون ہے؟"

"تم خاموش رہو گے استاد ڈپی!" نقاب پوش سخت لہجے میں بولا "ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گا۔"

"تم مشٹاکا لوگ معلوم ہوتا ہے۔" استاد نے کہا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ایک بڑا سا پتھر استاد ڈپی کے پیٹ پر آ کر لگا۔ یقیناً نقاب پوش کے ساتھی باہر بھی موجود تھے جنھیں میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ استاد ڈپی تکلیف سے دہرا ہو گیا۔

"اے ڈپی! ہاتھ اوپر ہی رکھو ورنہ ایک اور پتھر پڑے گا۔" نقاب پوش نے اور بھی سرد لہجے میں کہا "تم خاموشی سے دیکھتے رہو جو ہو رہا ہے۔"

"ہولی گاڈ کا قسم' اپنا ٹیم آنے پر ہم تمہارا موی نکالیں گا۔" استاد ڈپی بولا۔ اس مرتبہ پتھر اس کے سینے پر آ کر لگا تھا۔

"اور اب اگر تم بولے استاد ڈپی تو پستول کی گولی لگے گی۔" نقاب پوش نے دھمکی دی "میں کچھ سننے نہیں آیا' میں خاموشی چاہتا ہوں' سمجھے۔"

اس کے بعد جیسے استاد ڈپی بولنا ہی بھول گیا۔ اس کے گرگوں کو تو پہلے ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے استاد ڈپی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔ اس کے بعد نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں کو بھی اندر بلا لیا۔ وہ دو آدمی تھے اور دونوں ہی کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

تو کیا یہ میرے تنظیمی ساتھی ہیں؟ میری تنظیم کے رکن ہیں؟ میں نے تکلیف کے سبب نڈھال ذہن سے سوچا۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا تعلق یوپی سے ہے پھر انھوں نے آپس میں ابھی تک کسی کو نام سے بھی نہیں پکارا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے اسی نتیجے پر پہنچایا کہ وہ میرے رفیق' میرے تنظیمی ساتھی ہیں مگر انھیں یہ کیسے پتا چلا کہ اس وقت میں یہاں ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آ سکا۔ میں نے سوچا ممکن ہے انھوں نے جوگیندر کے ہاں مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہا ہو اور پھر وہاں سے انھیں میرے اغوا کا پتا چلا ہو۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ برقرار تھا کہ انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مجھے یہاں قید کیا گیا ہے؟

پستول تانے ہوئے نقاب پوش کی ہدایت پر اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھے بقول استاد ڈپی کے ہولی کر اس سے اتار لیا اور میں بے سدھ ہو کر ٹانگوں کے درمیان سر رکھے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میری ٹانگوں میں اتنی جان نہیں تھی کہ میں کھڑا رہ سکتا' نہ جسم میں اتنی سکت تھی کہ دو قدم چل سکتا

میرے پنجے دکھ رہے تھے۔ میری گردن میں تکلیف تھی اور ران میں جو سوزش اور جلن تھی اس کا بیان تو الفاظ سے باہر ہے۔ میں کنستر پر بیٹھا ہوا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

مجھے کھولنے کے بعد ان رسیوں کو جن سے مجھے باندھا گیا تھا' استاد ڈینی اور اس کے ساتھیوں کی طرف پھینک دیا گیا۔

"مچھو!" نقاب پوش نے کھرکھراتی آواز میں کہا "اس سے اپنے استاد کی مشکیں کس دو! اور گلو تم پینڈو کی مشکیں کس دو' جلدی کرو!"

گلو اور مچھو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتے رہے۔ نقاب پوش شاید یہ سمجھ گیا کہ وہ دونوں مشکیں کسنے کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے۔

"ڈینی اور پینڈو!" نقاب پوش پھر بولا "دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جاؤ!" وہ دونوں گھوم گئے تو نقاب پوش نے دوسرا حکم دیا "ڈینی اور پینڈو اب تم دونوں اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے لے آؤ!" انہوں نے ایسا ہی کیا تو نقاب پوش نے کہا "ہاں مچھو اور گلو اب تم ان کے ہاتھ باندھ دو۔"

ذرا ہی دیر میں یہ مرحلہ طے ہو گیا پھر گلو کو حکم دیا گیا کہ وہ مچھو کے ہاتھ بھی اسی طرح باندھ دے۔ آخر میں نقاب پوش کے ساتھیوں نے گلو کے ہاتھ بھی باندھ دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے ڈینی اور پینڈو کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیوار میں لگی ہوئی انہی میخوں سے باندھ دیا جن سے تھوڑی دیر پہلے میں بندھا ہوا تھا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا سا بھی ادھر ادھر جنبش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد مچھو کو ڈینی کی ٹانگوں کے پاس پیٹ کے بل لٹا دیا گیا تھا اور ڈینی کی ایک ٹانگ سے ٹخنوں کے اوپر اس کے ہاتھوں کو کس کر باندھ دیا گیا۔ گلو کو اسی طرح پینڈو کی ٹانگ سے باندھ دیا گیا۔ یہ تمام کارروائی دس منٹ سے بھی کم وقفے میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد نینی کو اندر لا کر میز کے پائے سے باندھ دیا گیا۔

"شاہین!" اب نقاب پوش مجھ سے مخاطب تھا "تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟ چل سکتے ہو؟"

"شاید" میں نے جواب دیا۔ اس قید سے رہائی پر میرے اندر ایک توانائی سی عود کر آئی تھی۔ میں کھڑا ہوا مگر میری ایک ٹانگ پھوڑے کے مانند دکھ رہی تھی۔ میں نے لنگڑاتے ہوئے ایک دو قدم اٹھائے "شاید چل سکوں مگر زیادہ دور نہیں۔"

"تم مٹھا کا مین معلوم ہوتا ہے۔" استاد ڈینی نے پھر کہا۔

"تم پھر بولے!" نقاب پوش نے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا پھر اس نے مجھ سے کہا "آؤ چلو!"

"مگر انہوں نے شور مچایا تو؟" میں نقاب پوش سے بولا۔

وہ زہریلی ہنسی ہنسا "ان کی فکر مت کرو! ہمارا ایک ساتھی پندرہ منٹ تک یہیں رہے گا۔ اسے ہدایت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بلند آواز سے بات کرے یا شور مچائے تو اسے گولی مار دے" پھر وہ ایک نقاب پوش کی طرف متوجہ ہوا "تم یہیں رہو گے اور باقی پروگرام پر عمل کرو گے۔"

"اب ہمیں کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے جواب دیا اور پھر اسی شخص سے مخاطب ہوا جسے یہاں ٹھہرنے کی ہدایت کی تھی "اچھا ہم چلتے ہیں۔"

یہ لوگ کون تھے؟ ابھی تک میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا اگر ان کا تعلق ہماری تنظیم سے ہوتا تو اب تک وہ شناختی الفاظ ادا کرکے مجھے اپنی شناخت کرا چکے ہوتے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا اس لیے میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ میری ران میں اب تکلیف اور بڑھ گئی تھی۔ چھالے پر کپڑے کی رگڑ سے یہ تکلیف اور بھی بڑھتی جا رہی تھی لیکن اس وقت میں اس تکلیف کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اس ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے مکان سے باہر آکر اس نقاب پوش سے پوچھ ہی لیا۔

"تمہارا ایک ہمدرد۔" اس کا جواب تھا "اور اب ہم اپنی منزل پر پہنچنے تک کوئی بات نہیں کریں گے۔"

"جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے' میں آگے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ مجھے اب تک پیش آنے والے واقعات میں ایک عجیب سا غیر فطری پن محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نقاب پوش نے مجھے استاد ڈینی کے عقوبت خانے سے نجات دلائی تھی' اس کے باوجود اس پر اعتماد کرتے ہوئے میرا دل ہچکچا رہا تھا۔ میں ٹھہر گیا۔

"تمہارے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" نقاب پوش بولا "تم وہی کرنے پر مجبور ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔" خلافِ توقع اس کے لہجے میں سختی آگئی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت خود مختار نہیں تھا۔ میں اس نقاب پوش کے بس میں تھا جس نے مجھے استاد ڈینی سے رہائی دلائی تھی۔

یہ مکان جس سے ہم برآمد ہوئے تھے' ایک میدان میں تھا۔ آبادی اس سے تھوڑے فاصلے پر تھی جہاں مکانات کے ہیولے مجھے آسمان کے پس منظر میں نظر آ رہے تھے۔ تب مجھے خیال آیا کہ وہ لوگ جو مجھے یہاں مکان میں لائے تھے' بلاوجہ ہی شاید میدان میں ادھر ادھر مڑ رہے تھے کیوں کہ کار سے اترنے کے بعد میں کئی موڑ مڑنے پر ہی اس عقوبت خانے تک پہنچا تھا۔ اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ مجھے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ میں کسی آبادی سے گزر رہا ہوں۔

تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک کار نظر آگئی۔ ہمارا رخ اسی کی طرف تھا۔

ابھی ہم کار میں بیٹھے ہی تھے کہ میں نے دو کاروں کو آگے پیچھے میدان میں بڑھتے دیکھا۔ میدان میں ان کی روشنیاں آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھیں۔ وہ کار جس میں ہم بیٹھے تھے۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ ان کاروں میں موجود کوئی بھی شخص اس کار کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کاروں کا رخ میدان میں اسی مکان کی طرف تھا جہاں سے مجھے لایا گیا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"شیام دت ہے شاید۔" اس نقاب پوش نے جواب دیا جو ان کا سربراہ تھا اور میرے برابر بیٹھا ہوا تھا "کار آگے بڑھاؤ' لائٹ مت جلانا!"

جس وقت ہماری کار نے حرکت کی' وہ دونوں کاریں میدان کے اس کونے پر پہنچ کر رک گئیں جہاں استاد ڈینی کا اڈا تھا۔ میں نے ادھر دیکھا۔ میرے ذہن میں اس وقت دو شخصیتوں کے بارے میں سوال ابھرے۔ مٹھا کون تھا؟ شیام کون ہے؟ مٹھا کا نام استاد ڈینی نے لیا تھا۔ اس نے نقاب پوش سے کہا تھا کہ وہ مٹھا کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شیام دت کا حوالہ اس نقاب پوش نے چند لمحے پہلے دیا تھا۔

"تم مٹھا کے آدمی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"میں خود اپنا آدمی ہوں۔" نقاب پوش جواب میں بولا۔

"شیام دت کون ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ ایک آدمی ہے' ہندو ہے اور کلکتے میں پیدا ہوا ہے۔" نقاب پوش کی آواز میں چبھن تھی۔

میں گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ نقاب پوش کچھ بتانے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا' وہ بہت گہرا آدمی ہے اور باتیں کرنے کا ماہر بھی۔ کار پکی سڑک پر آکر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی تھی۔

"تم مجھے وہاں سے نکال کر کیوں لائے ہو؟ کیوں بچایا ہے تم نے مجھے؟" میں بولا۔

نقاب پوش ہنسا "میں تمہیں اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ اس کے بعد تم کوئی سوال نہیں کرو گے' بالکل خاموش بیٹھو گے ورنہ مجھے مجبوراً سختی کرنا پڑے گی۔ میں بہت نرم دل بھی ہوں اور بہت بے رحم بھی۔ میری مرضی کے مطابق کام ہوتا رہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور جب ایسا نہ ہو تو پھر اتنا ہی خطرناک بھی ہوں' سمجھے! اور اب سنو اپنے سوال کا جواب! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جا رہی تھی مجھ سے' اس لیے میں تمہیں بچا لایا۔"

میں طویل سانس لے کر بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"

"بس اب خاموش ہو جاؤ۔"

"تمہیں اپنے اس آدمی کی بھی پروا نہیں ہے جسے تم استاد ڈینی کے اڈے پر چھوڑ آئے ہو؟" میں نے پھر سوال کر دیا گو مجھے معلوم تھا نقاب پوش خاموشی چاہتا تھا۔

"تم چپ نہیں رہو گے!" نقاب پوش اس مرتبہ واقعی برہم ہو گیا پھر خود ہی ہنس پڑا۔ اس وقت مجھے اس کی ہنسی عجیب لگی "وہ اپنا کام جانتا ہے جسے میں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ویسے تمہیں اس سے اچانک اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے؟ کیا اس سے محبت کرنے لگے ہو؟"

"بہرحال اس نے مجھے وہاں سے نکالنے میں ایک کردار ادا کیا ہے۔" میں نے جواب دیا "حیرت مجھے تمہارے اطمینان پر ہو رہی ہے۔ تمہارا ساتھی وہاں پھنس بھی سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے پوچھا تھا۔"

"اچھا اب زیادہ باتیں نہیں۔ بالکل خاموش ہو جاؤ! ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے!" اس کا لہجہ سخت اور تنبیہی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے' سو میں خاموش رہا۔ اس وقت میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

کار دوڑتی رہی۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ ہم کس راستے سے گزر رہے ہیں' کہاں جا رہے ہیں۔ میرے لیے یہ تمام علاقہ اجنبی تھا۔ میں خاموشی سے فاطمہ کے اغوا سے اب تک پیش آنے والے واقعات پر غور کر رہا تھا۔

پہلی بات تو میری سمجھ میں یہی نہیں آ رہی تھی کہ آخر بعض لوگ میری تقرری پر اتنے برہم کیوں تھے جو میری جان کے دشمن ہو گئے تھے؟ پھر آخر وہ مجھے قتل کرا کے کیا مقصد حاصل

لرنا چاہتے تھے؟ اور اب یہ بات میری فہم سے بالاتر تھی کہ آخر ان نقاب پوشوں کو مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟ یہ مجھے استاد ڈبی کے چنگل سے کیوں چھڑا لائے تھے؟ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ یک بہ یک دو پارٹیاں مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھیں؟ وہ کیا بات تھی کہ اچانک میں بعض لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا تھا؟ بہرحال میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اب میں جن لوگوں کے درمیان تھا اور جنہیں میں پہلے اپنا تنظیمی ساتھی سمجھا تھا' وہ ہماری تنظیم سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

میں خیالات کی انہی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر سامنے کھڑی دو سڑک کے کنارے ایک گھڑسوار پولیس پارٹی پر پڑی جیسے ہی کار ان پولیس والوں کے پاس سے گزری میں پوری قوت سے چیخ اٹھا "مدد! بچاؤ! ہیلپ"

اسی وقت میری کھوپڑی جھنجھنا اٹھی۔ کئی پھلجڑیاں سی چھوٹیں' پھر نقاب پوش کے مضبوط ہاتھ میری گردن پر جم گئے اور آخر کار میرے ذہن پر تاریکی کی چادر پھیل گئی۔ اس سے قبل میں نے محسوس کیا تھا کہ کار کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

○☆○

میں اس وقت بھی کار میں تھا جب اس بے ہوشی سے نکلا مگر اب میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی' منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میری ران' میرا سر اور ٹخنے بری طرح دکھ رہے تھے۔ کار رکی ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ کسمسایا' کچھ ہوں ہاں کی تو اسی وقت نقاب پوش نے مجھے آواز دی "مسٹر! بس چپ چاپ بیٹھے رہو۔ میں بلا کسی وجہ کے کسی کو مارنے پیٹنے سے بچتا ہوں لیکن جب مجھے مجبور کر دیا جاتا ہے تو انتہائی قدم سے بھی گریز نہیں کرتا۔"

میں خاموش ہو گیا بلکہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ مزید مار پیٹ کا متحمل ہو سکتا۔ شاید اسی کیفیت میں مجھے صدیاں گزر گئیں پھر میں نے کار کا دروازہ کھلنے اور نقاب پوش کے کھنکنے کی آواز سنی۔ اس نے ذرا سے دور سے کہا تھا کہ "بھئی آ گئے شیام دت" "آ کر کے پیچھے آ چلے تھے مجھے دو دینے!"

اس کے جواب میں ذرا سی دیر سے دبا دبا قہقہہ لگایا۔

"آ گئے ہو شیام دت!" نقاب پوش کی آواز سنائی دی۔

"تم۔ تم۔ کیوں بلایا ہے مجھے؟" تا تا شیام دت ہی نے جواب دیا۔ یہ آواز پہلے بھی میں سن چکا تھا مگر مجھے یاد نہیں آیا کہاں سنی تھی۔ میں اس آواز کو کسی شخصیت سے وابستہ نہیں کر سکا تھا۔

"سیٹھ!" نقاب پوش کی آواز ابھری "ہاتھی سے گنے چھینے چلے تھے۔ ادھر آؤ' میں بتاتا ہوں کیوں بلایا ہے!"

اس وقت مجھے یاد آیا کہ یہ آواز اسی سیٹھ کی تھی جس نے استاد ڈبی سے مجھے اغوا کرایا تھا۔ میں نے قدموں کے آگے بڑھنے کی آواز سنی۔ یہ آوازیں کار کے پاس آ کر رک گئیں پھر میں نے اپنی ناک کے بانسے کے نیچے پٹی کی جھری سے روشنی چکراتی دیکھی۔ روشنی یقیناً میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"یہ وہی علی گڑھ کا طالب علم شاہین ہے اور اب میرے قبضے میں ہے۔"

"تک۔ کیا؟ یہ تو ڈبی کے پاس تھا۔" سیٹھ کی آواز آئی۔

"ہاں آدھے گھنٹے پہلے تک!" میں نے نقاب پوش کی آواز سنی "اسے حاصل کرنا ہے تو سودا کر لو۔"

"مم۔ مگر۔ مگر" سیٹھ شیام دت کچھ نہ کہہ سکا اور ہکلا کر رہ گیا۔

"سوچ لو! کل بارہ بجے مجھے جواب مل جانا چاہیے اگر اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک بارہ بجے اسی جگہ آ جانا تنہا! میں چھ ہزار میں اسے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"چھ ہزار!" سیٹھ شیام دت نے جیسے ہچکی لے کر کہا۔

"کم نہ زیادہ' چھ ہزار اور باقی کام بھی مجھ سے کرانا چاہتے ہو تو مزید دو ہزار روپے!"

"دو ہزار اور؟"

"ہاں دو ہزار اور!" نقاب پوش بولا "ویسے ڈبی کو اب تک پولیس گرفتار کر چکی ہو گی۔"

"پولیس!" شیام دت کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔

"ہاں" نقاب پوش نے کہا "اس لیے دوسرا کام بھی تمہیں مجھی سے کرانا ہو گا۔ آٹھ ہزار دے دیے تو دونوں کام ہو جائیں گے۔ چھ ہزار دو گے تو شاہین کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا نہیں دو گے تو ٹھیک بارہ بجے کے چند رہ منٹ بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اسے تمہارا نام معلوم ہی ہے' پتا اور بتا دیا جائے گا پھر یہ اس کی مرضی ہو گی کہ یہ پولیس کے پاس جائے یا خود تم سے انتقام لے۔" نقاب پوش انسانی نفسیات خوب سمجھتا تھا۔

"تو کیا ڈبی کو واقعی پولیس۔"

"ہاں" نقاب پوش بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا "جس وقت ہم اسے وہاں سے لے کر چلے تھے' پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یا غلط' میں اس وقت

کوئی اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دو کاریں جنہیں میں نے میدان میں بڑھتے دیکھا تھا' پولیس ہی کی ہوں۔

"ہائے رام! اگر اس نے بتا دیا تو؟" شیام دت کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔" نقاب پوش نے یقین دلایا "اچھا میں چلتا ہوں۔ دن کے بارہ بجے ملاقات ہو گی۔" میں نے نقاب پوش کو اپنے برابر بیٹھتے محسوس کیا۔

"ارے ارے رکو!" شیام دت بے تابی سے بولا "آٹھ ہزار بہت زیادہ ہیں' چار ہزار میں دونوں کام کر دو۔ ڈبی تو دو ہزار میں راضی ہو گیا تھا۔"

"تو پھر ڈبی ہی سے کام کرا لینا۔" نقاب پوش نے کہا "منظور ہو تو بارہ بجے آ جانا ورنہ تمہاری مرضی! میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں پھر کیا ہو گا!"

"ارے ارے ٹھہرو!" شیام دت کی آواز پھر سنائی دی "چھ ہزار لے لو۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر بارہ بجے یہ تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ اگر تم ابھی دے رہے ہو تو اسی وقت چھوڑ جاتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" شیام دت کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ "چھ ہزار میں تمہیں سب کام کرنا ہو گا۔ میرے پاس اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

"پھر بھی تمہارے پاس دو ہزار بچ جائیں گے۔" نقاب پوش کہنے لگا "یقین کرو میں دنیش چودھری کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے دو ہزار کی رقم بچا لی ہے۔"

"کیا؟" شیام دت تقریباً چیخ اٹھا "تمہیں کیا پتا دنیش چودھری کا!"

"پتا نہ ہوتا تو میں یہاں ہوتا نہ تم! ہاں تو بولو' آٹھ ہزار مجھے دے کر بھی دو ہزار کے فائدے میں رہو گے۔"

"میں دو ہزار ڈبی کو بھی تو دے چکا ہوں۔"

"میں ان دو ہزار کی نہیں' اس دو ہزار کی بات کر رہا ہوں جو تمہیں اپنے پاس سے ملانے تھے۔ تم نے اس کام کے بارہ ہزار ہی بتائے تھے نا۔"

جواب میں شیام دت کی بڑبڑاہٹ سنائی دی "پر۔ پر" وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا "تم۔ تم بدذات ہو۔" اسے شاید کوئی گالی ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔

"بدذات تو تم ہو شیام دت۔" نقاب پوش جواباً بولا "ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں۔"

"ارے رکو تو!" شیام دت کی آواز آئی "ٹھیک ہے آٹھ ہی لے لو مگر بارہ بجے تک مجھے سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے اور اسے ٹھکانے بھی لگا دینا!"

"ڈن!" نقاب پوش نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ!" شیام دت بولا۔

"یہیں لے آؤ! اور دیکھو زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

"مجھے اور کچھ بھی بتانا ہے تمہیں۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" نقاب پوش کی آواز ابھری "تمہیں اس سے کیا کیا سوال کرنے ہیں' مجھے معلوم ہے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

شیام دت کی بڑبڑاہٹ کی آواز آئی پھر قدموں کی دور ہوتی آوازیں ابھریں۔

"جلدی شیام دت جی! میں دس منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گا۔" نقاب پوش نے ہانک لگائی۔

شیام دت کے قدموں کی آواز رات کے سناٹے میں گم ہو گئی۔

اس وقت میری کیفیت وہی تھی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب میری زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فصل باقی رہ گیا ہے۔ میں اپنی جگہ ایک مرتبہ پھر کسمسایا' ہاتھوں کو ادھر ادھر جنبش دے کر بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر بندشیں بہت سخت تھیں۔ میری اس کوشش کو نقاب پوش نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسی سبب اس نے میری دکھتی ہوئی ران پر زور دار دھپ ماری۔ تکلیف کی وجہ سے میں بے اختیار چیخنے لگا مگر یہ چیخیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئیں کیونکہ میرے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ شدید تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مسٹر!" نقاب پوش کی سرد آواز ابھری "میں نے تم سے کہا تھا کہ بلاوجہ خود کو تکلیف میں نہ ڈالو۔"

میں اپنی جگہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ واقعی بلاوجہ اذیت مول لینے سے فائدہ بھی کیا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد کار حرکت میں آئی۔ میری موت کا سودا پکا ہو گیا تھا۔ شیام دت دس منٹ بعد وہاں پہنچ گیا تھا اور نقاب پوش نے فقرہ بھی چست کیا تھا پھر چند منٹ رقم کی گنتی میں لگے تھے۔ میں پھر اپنی جگہ کسمسایا۔ اس مرتبہ تشدد کے بجائے نقاب پوش نے مجھے دلاسا دیا "بے فکر رہو چند منٹ کی بات اور ہے۔"

میرے خیالات اس وقت قطعی بے ترتیب ہو گئے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات میرے ذہن میں بجلی

سے ٹوکنوں کی طرح چپتے اور ... تے رہے۔ میں بہت کوشش کررہا تھا کہ اپنے خیالات کو اس وقت کے حالات پر مرکوز رکھوں لیکن زندگی کی طرف سے جب مایوسی ہوجائے تو ذہن شاید اسی طرح بے قابو ہوجاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے پُراسرار ہستی تک کا خیال نہیں آیا۔ معلوم نہیں' وہ کہاں تھی؟ مجھ پر جو گزر رہی تھی' اسے علم بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر علم تھا تو وہ میری مدد کیوں نہیں کررہی تھی؟ اب تو مجھے اس پر بھی شک ہورہا تھا کہ جب میں موت کے دہانے پر پہنچ جاؤں گا تو میرے اندر جناتی صفات پیدا ہوجائیں گی اور میں بچ جاؤں گا۔

پھر ایک جگہ کار رک گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص کار سے اترا' اس کے ساتھ نقاب پوش بھی جو میرے برابر بیٹھا تھا' کار سے نکل گیا۔ وہ یقیناً دوسرے شخص کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ پھر میرے پاس آبیٹھا اور کار حرکت میں آگئی۔

اس مرتبہ یہ سفر چند منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ کار رک گئی تو مجھ سے اترنے کو کہا گیا پھر میں اتر گیا تو کار کے روانہ ہونے کی آواز آئی۔ کئی سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر آئے پھر میں نے آواز سے اندازہ لگایا کہ تالا کھولا گیا ہے۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور نقاب پوش میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ کھڑا کردیا گیا اور میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی گئی۔

میں اس وقت ایک بڑے سے آراستہ کمرے میں تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر کے حساب سے وہ کمرا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کی آرائش صاحبِ خانہ کی خوش ذوقی اور نفاست کا مظہر تھی۔ سامنے دیوار پر کلاک آویزاں تھا۔ اس وقت پانچ بج کر چند منٹ اوپر ہوئے تھے گویا میری زندگی کے چند گھنٹے ابھی باقی تھے۔

"تشریف رکھیے مسٹر شاہین!" اس شخص نے نہایت شائستگی سے کہا جسے میں اب تک نقاب پوش لکھتا رہا ہوں۔ اب اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ میں نے اسے اس کی آواز سے پہچانا تھا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا' چہرے سے ذہانت کے ساتھ عیاری' شائستگی کے ساتھ سفاکی اور لہجے میں اعتماد کے ساتھ مکاری عیاں تھی۔ اس کا چہرہ تضادات کا نمونہ تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ کی لکیریں قوس بناتی تھیں تو ماتھے پر غصے کی شکنیں ابھر آتی تھیں۔ عجیب دوغلا' دورُخا اور دھوکے باز چہرہ تھا۔ وہ بڑے پیار سے پھر کہنے لگا "بیٹھو یار!" اسی کے ساتھ زور سے مجھے پیچھے دھکا دیا۔

میں لڑکھڑا کر صوفے پر گر گیا۔ میں اس بدتمیزی پر اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"میں ہر کام چپ چپاتے اور نفاست سے کرنے کا عادی ہوں۔ ہڑبونگ اور شوروغوغا مجھے پسند نہیں۔ کسی کو جان سے مارنا ہو تو اسے بلاوجہ قتل کرنے سے پہلے اذیت دینا بھی میری فطرت نہیں۔ جو لوگ مجھ سے تعاون کرتے ہیں سکون سے مرجاتے ہیں اور جو تعاون نہیں کرتے' انہیں ایسی اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ ـــــ" وہ جھرجھری لے کر خاموش ہوگیا اور اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے "مجھے خود بہت تکلیف ہوتی ہے۔ احمق بلاوجہ سکون و اطمینان کی موت کے بجائے غلط راہ اختیار کرتے ہیں۔" وہ خاموش ہو کر اس طرح ٹہلنے لگا جیسے کوئی پروفیسر کلاس لیتے ہوئے ادھر ادھر ٹہل کر لیکچر دیتا ہے "اوہ ہاں' تمہارا منہ بند ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" زباں بندی ختم ہوتے ہی میں بول اٹھا۔

"ہاں میں بتاتا ہوں' آدمی کے لیے سکون سے مرنے کی خاطر یہ بہت ضروری ہے کہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ وہ مر کیوں رہا ہے!" اس نوجوان نے کہا "میں تمہاری بے چینی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ دراصل ہر آدمی مرنے سے پہلے اپنے مرنے کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔ تو سنو!" وہ چند لمحے رکا پھر بولا "میرا خیال ہے اگر ڈیزی تمہیں وجہ بتادیتا کہ تمہیں کیوں قتل کیا جارہا ہے تو تم اسے ہر سوال کا جواب آسانی سے دے سکتے تھے۔"

"ڈیزی مجھ سے بے سروپا سوال کررہا تھا۔" میں بولا۔

"میں جانتا ہوں" اس نے کہا "بہرحال میں نے اپنے ساتھی کو سائنائڈ لینے بھیجا ہے ممکن ہے تمہیں پتا نہ ہو کہ سائنائڈ بہت زود اثر زہر ہوتا ہے۔ زبان پر اس کا ایک قطرہ ٹپکتے ہی زندہ انسان لاش میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ نہ مارنے والے کے لیے کوئی مصیبت نہ مرنے والے کو کوئی تکلیف! تمام کام چٹ پٹ ہوجاتا ہے۔ آج تک کوئی شخص اس زہر کا ذائقہ نہیں بتاسکا۔ اس کے استعمال کے بعد اتنی مہلت ہی نہیں ملتی۔ میں' تمہیں بھی اسی زہر سے ماروں گا۔"

آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوجائے تو آدمی کی قوتِ گویائی سلب ہونے لگتی ہے پھر بھی میں نے ہمت کی اور بولا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ آخر مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ کوئی وجہ تو ہوگی اس کی!"

"ہاں تمہارے سوال کا جواب بھی دینا ضروری ہے۔" وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی "تمہیں ذہنی طور پر مرنے کے لیے آمادہ تو کرنا ہی پڑے گا' مطمئن تو کرنا ہوگا نا نہیں! ورنہ آدمی بڑی مشکل سے مرنے پر تیار ہوتا ہے حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ دیر ہی کتنی لگتی ہے مرنے میں۔ بہت سے لوگوں کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ دراصل سارا ہنگامہ مرنے سے پہلے پہلے ہی کا ہے پھر تو سکون ہی سکون ہوتا ہے! بات دراصل یوں ہے کہ ـــ" وہ رکا "میں تمہیں پہلے یہ بتادوں کہ یہ سب کچھ کیوں بتارہا ہوں! یہ اس وقت حکومت کا سب سے بڑا راز ہے۔ کم از کم میرے خیال کے مطابق اس کی تہ میں جو فلسفہ کارفرما ہے اسے ڈیوائڈ اینڈ رول کہا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب سے مولانا جوہر اور ان کے ساتھی رہا ہوئے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد مضبوط ہوا ہے۔ حکومت ہندوستانیوں کے سیاسی اتحاد سے اس وقت بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ گزشتہ سال جو ہندو مسلم فسادات ہوئے اور جن کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا ہوگئی وہ دوری اب پھر قربت میں بدلتی جارہی ہے۔ اس اتحاد کو کمزور کرنے کے لیے حکومت اب پھر وہی آزمودہ نسخہ آزمانا چاہتی ہے یعنی ہندو مسلم فساد! کچھ آیا سمجھ میں ـــ ارے ہاں' میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں ـــ اس لیے شاہین کہ تمہیں یہ سب بتانا ایسا ہی جیسے میں اس وقت خالی کمرے میں اپنے آپ سے گفتگو کررہا ہوں' خود کلامی سے مراد ہے میری! تم میرے لیے ابھی سے مرچکے ہو۔ ایک مردہ آدمی کسی بھی راز کا سب سے بہتر امین ہوتا ہے' زندہ آدمی تو گراموفون کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ چابی دی پہیا چلا' سوئی رکھی اور اس نے بولنا شروع کردیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" وہ خاموش ہوگیا۔

میں جانتا تھا' اس وقت وہ میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں لقمہ دوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" اس نے اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑا "حکومت مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ یہاں اس مقصد کے حصول کی خاطر تمہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کل تمہاری لاش کلکتے کے کسی علاقے میں پائی جائے گی۔ لاش کے ساتھ ایک خط بھی ہوگا جو کسی انتہا پسند ہندو تنظیم کی طرف سے لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں مسلمانوں کو برا بھلا کہا جائے گا' ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے گا کہ ہندوستان کا کوئی ہندو کسی مسلمان کو ہرگز یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ مہاتما گاندھی یا کسی بھی ہندو لیڈر کو برا بھلا کہے۔ اس سے کلکتے میں تو فساد ہوگا ہی' اس کے ساتھ علی گڑھ بھی فساد کی زد میں آجائے گا کیوں کہ تم وہیں کے طالب علم ہو۔"

اس کی یہ باتیں سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ملتان میں جو خوں ریزی ہوئی تھی اور جسے ہم نہیں روک سکے تھے' وہ مجھے یاد آگئی۔ حکومت پھر وہی خونی کھیل کھیلنے کا منصوبہ بنارہی تھی "مگر وہ شیام دت اور ڈیزی تو سیٹھ صدیق کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" میں بولا۔

"یہ بھی اسی منصوبے کا حصہ ہے۔ ڈیزی اور اس کے ساتھیوں کے ذریعے یہ بات یقیناً کچھ اور لوگوں تک بھی پہنچے گی کہ سیٹھ صدیق نے گاندھی جی کے خلاف تقریر کرائی۔ ایسی باتیں پر لگا کر اڑتی ہیں اور جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ اس منصوبے میں شیام دت کی حیثیت محض آلۂ کار کی ہے۔ کیا سمجھے مسٹر شاہین!"

"مگر میرا خیال ہے' حکومت کی اس سازش سے ہندو اور مسلمان لیڈر دونوں ہی آگاہ ہیں کیوں کہ یہ کھیل نیا نہیں رہا اب! شیام دت نے ڈیزی کو بتایا تھا کہ میرے قتل کے احکام جاری ہوچکے ہیں۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"ضرور بتایا ہوگا اس لیے کہ اس منصوبے سے مسلمان اور ہندو لیڈروں کو حکومت کے پٹھوؤں نے آگاہ کیا ہے۔" اس نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ خود حکومت نے؟" میری سمجھ سے یہ بات بالا تھی۔

"ہاں مگر ذرا مختلف انداز میں۔" اس نے جواب دیا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہندو اور مسلمان لیڈروں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو حکومت کے تنخواہ دار ہیں' زر خرید! یہ لوگ سیاسی پارٹیوں میں رہ کر حکومت کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ ان جاسوسوں کے بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو ان کے ذریعے سیاسی پارٹیوں کے راز حکومت کو معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہی کے ذریعے پارٹیوں میں بے اعتمادی' بددلی اور مایوسی پھیلائی جاتی ہے۔ یہ لوگ تمام اہم مسائل پر ہونے والے مباحثوں کو الجھادیتے ہیں اور فروعی مسئلوں کو نہایت اہم بنا کر انہیں پارٹی کی سطح پر

جذباتی انداز میں اس شدّت سے اُبھارتے ہیں کہ وہی سب سے اہم مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کانگریس کی مجلس عاملہ تحریک خلافت کی قرارداد کی حمایت میں ایک قرار داد بھی آج تک منظور نہیں کر سکی۔ زور دیا گیا بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ پر! بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ سے کیا ہوگا' صرف یہی کہ بدیسی کپڑے کی مانگ بڑھے گی کیوں کہ بائیکاٹ کی عملی صورت یہ بتائی گئی کہ بدیسی کپڑا جلا دیا جائے۔ پرانا کپڑا یا اسٹاک میں موجود کپڑا جلا دیا جائے گا تو اس کی جگہ نیا کپڑا آئے گا اور مانچسٹر کے کارخانے زیادہ مصروف ہو جائیں گے۔"

وہ خاموش ہوگیا تو میں نے پوچھا "مگر یہ سب باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟" مجھے اس کی باتوں میں وزن معلوم ہو رہا تھا۔

"میں بہت اہم آدمی ہوں!" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "تمہیں تو خیر مرنا ہی ہے اس لیے تمہیں یہ بھی بتائے دیتا ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھی "بس دس منٹ کے اندر اندر سائنائڈ آ ہی جائے گا۔ اس کے بعد تم ایک لاش میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ ایسی صورت میں کوئی حرج نہیں کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم کوئی حسرت دل میں لے کر نہ مرو' تم اس اطمینان کے ساتھ مرو کہ تمہیں اس راز کی ہر تفصیل معلوم تھی۔ بہرحال سنو! میں صوبہ بنگال کے گورنر کے عملے کا آدمی ہوں۔ بنیادی طور پر میں سی آئی ڈی کا ملازم ہوں۔ سیاست سے متعلق گورنر صرف میری رپورٹ پر بھروسا کرتا ہے۔"

ایک مرتبہ پھر میری موت کا ذکر چھیڑ کر اس نے مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا تھا' جس سے میں دوچار تھا مگر میرے ہاتھ کی بندشیں بہت سخت تھیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہاتھوں کو اِدھر اُدھر حرکت دی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

وہ ہنس پڑا "اپنی انرجی کیوں ضائع کر رہے ہو۔ یہ وہ مخصوص گرہ ہے جو کسی بندھے ہوئے آدمی کے لیے کھولنا ناممکن ہے۔"

میں نے اپنی کوشش ترک کردی اور بولا "ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں ذکی کو اس کے سوالوں کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں سچائی نہیں تھی۔"

"ارے یار!" اس نے پھر اسی نرم اور تیا دینے والے لہجے میں کہا "تم سے سچ بات کون اُگلوانا چاہتا تھا! شیام دت نے اسے چند سوالات بتائے تھے اور اس سے کہا تھا کہ تم سے یہ اعتراف کرانا ہے۔ تم نے شاید سوالوں کی نوعیت پر غور نہیں کیا۔ ہر سوال کے ساتھ اس کا جواب موجود تھا۔ مثلاً کیا تمہیں گاندھی جی کے خلاف تقریر کرنے پر ... صدیق نے اکسایا تھا؟ تم مسلمان گاندھی جی کے خلاف سازش کر رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔ شیام دت نے کہا تھا کہ تم سے ان باتوں کا اقرار کرا لے۔ تم انکار کرتے تو وہ تمہیں زیادہ تکلیف دیتا اگر تنگ آ کر اقرار کر لیتے تو وہ سمجھتا تم تشدّد سے گھبرا کر صحیح بات کا اقرار کر لیا ہے اگر تم انکار کرتے رہتے تو وہ تمہیں زیادہ سخت جان سمجھتا۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں یہی ہوتا کہ وہ تمہیں ٹھکانے لگا دیتا پھر کیا ہوتا یہ میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ابھی میرے ذہن میں کئی اور بھی خیالات و سوالات تھے مگر اس وقت میں صرف اس بات پر سوچنا چاہتا تھا کہ اپنی متوقع موت کو کیسے ٹالا جائے؟ وہ شخص جس نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا شاید ذہن پڑھنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا یا پھر بہت بڑا چہرہ شناس و قیافہ شناس تھا۔

"اور بھی جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو' اس کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ کہ تم یہاں سے بچ کر جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"تم نے میرے قتل کے لیے رقم کی بات کی تھی' بارہ ہزار روپے! یہ رقم کس کس نے دی تھی؟ دو ہزار تو اس کی ... ہے۔ شیام دت کے حصّے میں آئے تھے۔" میں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر سوال کیا۔ میں اس کے سامنے خود کو خوف زدہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ موت تو میرا مقدر بن ہی چکی تھی میں نے سوچا پھر کیوں نہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لی جائے۔

"یہ تمام رقم دراصل حکومت ہی کی ہے۔" اس نے جواب دیا "ویسے پانچ مختلف آدمیوں نے دو دو ہزار روپے دیئے تھے اور چھٹا آدمی شیام دت ہے جسے دو ہزار اپنی طرف سے ملانے تھے۔ یہ چھے آدمی حکومت کے تنخواہ دار ہیں۔ خصوصی اخراجات کے لیے حکومت نے انہیں ایک مخصوص فنڈ دے رکھا ہے تاکہ وقت بے وقت یہ لوگ نوٹا دو لاکھ روپے تک جمع کر سکیں۔ اس فنڈ سے یہ لوگ اخراجات کرتے ہیں وہ رقم انہیں پھر ادا کردی جاتی ہے۔ ہر شخص کے پاس پچاس پچاس ہزار روپے اس فنڈ میں موجود ہیں۔ شیام دت کا خیال یہ ہے کہ اس کام کے لیے بارہ ہزار کی ادائیگی اسے کرنا تھی جس میں دو ہزار روپے اسے دینے تھے۔ اب وہ یہ رقم خرچ کیے بغیر حکومت سے دس ہزار روپے وصول کر سکے گا اگر ذکی یہ کام کر دیتا تو اسے مزید آٹھ ہزار کا فائدہ ہوتا۔"

بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے انگریز حکومت کے طریقۂ کار کا علم ہوا تھا۔ یہ لوگ معاشرے میں ایسی حیثیت رکھتے تھے کہ کوئی ان پر شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ انگریز حکومت کے پٹھو یا زر خرید ہوں گے۔ انگریز نے دولت سے ان کے ضمیر خرید لیے تھے۔ وہ اپنے ہی ہم وطنوں کو آگ اور خون کی ہولی میں پھونک دینا چاہتے تھے۔

"پوچھو پوچھو یار!" اس نے پھر کہا "اور کوئی سوال بھی کرو! ابھی تو تمہاری موت میں پورے پانچ منٹ باقی ہیں۔ خاموشی میں مجھے نیند آنے لگتی ہے۔ آج تو تمام رات ہی کالی ہوگئی۔"

"یہ بتاؤ کہ اچانک میرے قتل کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟ میں تو اس شہر میں بالکل نیا ہوں' یہاں کے لیے قطعی اجنبی ہوں۔ یہاں تو کوئی بھی مجھے نہیں جانتا۔ لگتا تو ایسا ہے کہ اس کی تیاریاں بہت پہلے سے تھیں۔" میں نے دریافت کیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تم اس شہر میں اجنبی تو ضرور ہو لیکن انجانے نہیں۔ تمہاری تقریر کی گونج پورے کلکتے میں ہے۔ ہر شخص کی زبان پر علی گڑھ کے طالب علم شاہین کا ذکر ہے۔ لوگ اس کی تقریر کے حوالے دے رہے ہیں۔ یہ میں تمہاری تعریف نہیں کر رہا' حقیقت بیانی سے کام لے رہا ہوں۔ حقیقتِ حال کی رپورٹ دینا میرے فرائض میں شامل ہے کیوں کہ غلط رپورٹ کی بنیاد پر کبھی صحیح یا مؤثر اسکیم نہیں بنائی جا سکتی۔ سمجھتے ہو نا! میں سی آئی ڈی میں ہوں۔" وہ چند لمحوں کے لیے رُکا' آہستہ سے ہنسا اور کھنکار کر بولا "تم نہ ہوتے تو تمہاری جگہ کوئی اور مسلمان ہوتا۔ تمہارے بارے میں فوری فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ تم آج کے ہیرو ہو۔ لوگوں کے جذبات تمہارے لیے بیدار ہیں۔ تمہاری موت سے جتنے مؤثر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں' اس وقت کسی اور کی موت سے یہ نتیجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ تمہارا سیاسی قتل حکومت کے مفاد میں ہے اور کچھ؟" اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

"کیا واقعی اس قسم کی اسکیم پورے ہندوستان کے لیے بنائی گئی ہے۔ کیا جگہ جگہ اسی نوعیت کے سیاسی قتل ہوں گے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا حالانکہ مجھے اس کی بات پر یقین آچکا تھا۔ اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک مرتے ہوئے آدمی سے بھلا کون جھوٹ بولتا ہے۔

"بالکل میرے دوست!" اس نے تائید کی "کہیں مسلمان کا قتل تو کہیں کسی نمایاں مقامی ہندو لیڈر کا قتل! حکومت ہر صوبے میں فسادات کرانا چاہتی ہے۔ مقصد واضح ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کردیا جائے۔ ضروری نہیں کہ فسادات سارے ملک میں ایک ہی دن ہوں یا ایک ہی ہفتے میں ہوں۔ بس جیسے کوئی مناسب موقع ملے فسادات کے لیے زمین ہموار کردی جائے کیا سمجھے! میاں' یہ انگریز حکومت ہے' انگریز کا دماغ ہے!" اس نے پھر گھڑی دیکھی "یہ کمبخت ابھی تک نہیں آیا؟ اب تک اسے زہر لے کر آجانا چاہیے تھا۔ آتا ہی ہوگا۔" اس نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب دے دیا "اس عرصے میں تم کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو! چند سانسوں کو جو مہلت ملی ہے' اسے غنیمت جانو اس کے آتے ہی تمہیں قتل کر کے میں سو جاؤں گا' بڑی نیند آرہی ہے۔" اس نے زور سے جماہی لی۔

"خوش قسمت ہو تم کہ آج ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جاؤ گے۔ مرنے بھی کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں! مجھے بار بار شیام دت سے یہیں بھی پہنچنا ہے۔"

"تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو پھر تمہیں یہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے سوال کیا "یہ کام ذکی بھی کرلیتا۔ شیام دت کیا تمہیں نہیں پہچانتا؟"

"میں ایک بے چہرہ آدمی ہوں۔" اس نے خاص انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "گورنر سے میری ملاقات ہفتے میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔ اس رات گورنر ہاؤس کا ایک خاص دروازہ میرے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ میں اس دروازے سے گورنر ہاؤس میں داخل ہو جاتا ہوں پھر میں گورنر کو رپورٹ دیتا ہوں۔ یہ رپورٹ زبانی ہوتی ہے کیونکہ بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جنہیں ضبطِ تحریر میں لانا' مناسب نہیں ہوتا۔ مجھے آج تک کسی بھی شخص نے گورنر ہاؤس میں نہیں دیکھا ہوگا۔ میں بہ ظاہر ایک سیاسی پارٹی کا عام رکن ہوں۔ زور دار نعرے لگانے میں میرا جواب نہیں۔ میری ظاہری زندگی یہ ہے کہ میری ایک چھوٹی سی دکان کینسنگ اسٹریٹ پر ہے جس میں میرا ایک ملازم بیٹھتا ہے۔ یہ گویا میری گزر بسر کا ظاہری ذریعہ ہے۔ یہ مکان جس میں تم اس وقت بیٹھے ہو' میری شب بسری کی جگہ ہے۔ یہاں دن کے وقت میرے محکمے کا ایک چپراسی رہتا ہے۔ وہی صفائی اور دیکھ بھال کرتا ہے مگر میں تمہیں یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں' مسٹر شاہین!" اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو اور اس کے جملوں سے اس کے اندر کا شیطان پوری طرح نمایاں تھا۔

"پتا نہیں تم مجھے یہ ساری باتیں کیوں بتا رہے ہو!" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"شاید اس لیے شاہین کہ میں تمہارے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کررہا ہوں۔ یقیناً تمہارے ماں باپ' بہن بھائی ہوں گے اور تم یہاں غریب الوطنی میں جام شہادت نوش کرجاؤ گے کیوں' ہے نا؟ تم اسے شہادت ہی کہو گے نا؟ خیر تو یہ بات ہورہی تھی کہ شیام دت مجھے پہچانتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیام دت بے چارہ مجھے آج سے پہلے نہیں جانتا تھا' البتہ وہ میرے دستخطوں کو ضرور پہچانتا ہے اگر میں ایک کاغذ پر دو ہزار روپے کی رقم لکھ دوں اور اس کے نیچے اپنے دستخط کردوں تو سمجھو کہ وہ نقد دو ہزار روپیا ہے۔ تم وہ پرزہ لے کر شیام دت کے پاس چلے جاؤ تو وہ دو ہزار کی رقم بے چون و چرا تمہیں دے دے گا مگر افسوس کہ تمہیں اس تجربے کا موقع نہیں ملے گا۔ خیر تو میں پانچ برد کروں سے رقم جمع کرکے اس کے پاس دس ہزار روپے لے کر گیا ور اس سے کہا کہ صاحب نے یہ رسید دی ہے' دو ہزار روپے آپ بھی اس میں جمع کرادیں۔ ساتھ ہی اسے یہ پیغام بھی بھیجا کہ شاہین کو آپ مجھ سے قتل کرائیں۔ سیٹھ نے مجھ سے سودا کیا۔ معاملہ پانچ ہزار پر پٹا مگر وہ کمبخت بہت لالچی نکلا۔ میرے آتے ہی اس نے ڈپٹی سے معاملہ کرلیا۔ اب یار' تم مانو اگر حکومت ان بھڑوؤں کو پچاس ہزار کا فنڈ دیتی ہے تو کیا ان کی نگرانی نہیں کراتی ہوگی! شیام دت کی نگرانی اس کا ایک ملازم کرتا ہے۔ اس نے فوراً یہ خبر اپنے متعلقہ افسر کو دی جو آخرکار مجھ تک پہنچ گئی پھر مجھے جو کچھ کرنا تھا' کرگزرا۔ دولت کی کسے ضرورت نہیں ہوتی! شیام دت جیسے آدمی کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے اور میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں پھر اس میں حرج بھی کیا ہے۔ تمہیں قتل ہی تو کرنا ہے۔ اس کام کے بارہ ہزار حکومت دے رہی ہے حکومت کو تو کام چاہیے جی کرے یا میں۔"

"تو گویا تم مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو؟" میں بولا

"نہیں' نہیں میرے دوست!" اس نے جواب میں کہا "میں نے نہیں حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں بھلا فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہوں!" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے "تمہارے قتل کا حکم حکومت نے صادر کیا ہے۔ میں تو صرف جلاد کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔"

"ایک ہندوستانی ہوکر تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" میں نے اپنی دانست میں آخری حربہ استعمال کیا "تم پڑھے لکھے سمجھدار آدمی ہو' تمہارا نام کیا ہے؟ گفتگو سے تم مجھے مسلمان معلوم ہوتے ہو۔ کیا تم مجھے ایک مسلمان کو اس طرح قتل کردو گے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون حرام ہے؟"

"میں کون ہوں!" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔ اس کا چہرا ایک دم سرخ ہوگیا اور جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں' آنکھوں میں جیسے وحشت ناچنے لگی۔

"میں بتاتا ہوں' میں کون ہوں!" اس نے زور سے صوفے کو ٹھوکر ماری اور اپنے سر کے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر جھٹکے دے ڈالے "میرا نام عبداللہ ہے' بھگوان داس ہے' بھوپیندر سنگھ ہے اور میرا نام چارلس بھی ہے۔" اس کے منہ سے کف جاری ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ایش ٹرے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سے ٹکرائی۔ گھڑی کا شیشہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔ میں نے گھڑی کو دیکھا۔ ساڑھے پانچ بجنے والے تھے۔ ایش ٹرے کی ضرب سے گھڑی رک گئی تھی "میں ہندوستان کی ایکتا ہوں۔ میں ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی اتحاد کی علامت ہوں۔" لگ رہا تھا جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا "سنو! میں بتاتا ہوں' میں کون ہوں۔"

میں حیران تھا کہ آخر اسے غصہ کس بات پر آگیا تھا۔

وہ بے سدھ ہوکر فرش پر بیٹھ گیا پھر وہ پُرسکون ہوتا گیا۔

"میں اس لیے بتارہا ہوں' کون ہوں کہ تم یہ بات کسی کو نہیں بتا سکو گے۔" وہ زہریلے انداز میں ہنسا "شملے میں ایک انگریز آفیسر تھا' بڑا رحم دل' نیک اور شریف النفس! ایک نوجوان ہندو عورت اس کے یہاں آیا تھی۔ وہ بیوہ تھی اور حسین بھی پھر ایسا ہوا کہ اس افسر کی کوٹھی کے مالی عبداللہ باورچی بھگوان داس اور ایک ملازم بھوپیندر سنگھ نے رات کے وقت اسے باغ میں پکڑلیا۔ باری باری تینوں نے اسے پامال کیا پھر انگریز افسر جس کی بیوی ہندوستان ہی میں مری تھی اور جس کی بچی کی وہ آیا تھی' ادھر آنکلا تینوں ملازم اسے دیکھ کر ہی بھاگ نکلے مگر اس حالت میں ایک جوان و حسین عورت کو دیکھ کر اس انگریز کے اندر موجود مرد بھی جاگ اٹھا۔ سو اس رات وہ عورت اس انگریز کی ہوس کا بھی نشانہ بنی۔ اگلے دن انگریز نے اس سے بہت معذرت کی۔ بہت معافی مانگی مگر جو کچھ ہونا تھا ہوچکا تھا۔ نو ماہ بعد اس عورت کے بچہ ہوا وہ بچہ میں ہوں۔ ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی اتحاد کا مظہر! میری ماں بھی نہیں بتاسکتی تھی کہ میں ان چاروں میں سے کس کا بیٹا ہوں! وہ چاروں ہی میرے باپ تھے۔ میں کس کو اپنا باپ کہوں' کیا بتاؤں میں کون ہوں!" اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے مگر اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے پھیلنے والی مسکراہٹ کی لکیر بھی گہری ہوگئی۔

"مجھے ہمدردی ہے تم سے۔" میں نے کہا' مجھے اس وقت کوئی جملہ ہی نہ سوجھا۔ میں واقعی بہت افسردہ ہوگیا تھا۔

"شکریہ!" اس نے بڑے طنزیہ انداز میں یہ لفظ ادا کیا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا تھا۔ وہ جو ایک خوابیدہ آتش فشاں تھا' ذرا دیر جاگ کر' اندر ہی اندر کھول کر پھر ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اب وہ پھر وہی سرد مزاج شخص تھا۔

"تو کیا اس انگریز نے تمہاری ماں سے شادی کرلی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ انگریز اتنا شریف بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ میری ماں کو بہت محبت سے پناہ دی بدلے میں میری ماں کی تنہائیاں آباد کرتا رہا پھر جب میں پیدا ہوا تو میری پرورش بھی اس نے کی۔ جب میں پانچ برس کا ہوا تو وہ انگریز مرگیا۔ اس نے اپنی وصیت میں میری ماں کے لیے بھی تھوڑی بہت رقم رکھی تھی۔ یہ رقم اتنی تھی کہ میری ماں نے مجھے میٹرک تک تعلیم دلائی۔" یہ کہہ کر وہ پھر ٹہلنے لگا "یہ کمبخت ابھی نہیں آیا۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ آتا ہی ہوگا" پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا "تم نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک ہندوستانی کو قتل کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ ہاں ہاں نہیں آتی۔ نہیں آئے گی شرم! میں۔ میں تمام ہندوستانیوں کا دشمن ہوں۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ ہندوستان اور اس میں بسنے والے کروڑوں افراد مجھے ایک باپ تو نہیں دے سکتے۔ تمہیں پتا ہے' میری ولدیت کا خانہ خالی ہے۔ میرے سرٹیفکیٹ میں میرا نام رحمان چارلس لکھا ہے' سن آف شانتی! میں نے لوگوں کو کیا کیا کہانیاں نہیں سنائیں! کبھی کہا میرا باپ میرے پیدا ہونے سے پہلے مرگیا تھا۔ میری پیدائش سڑک کے کنارے اس طرح ہوئی کہ میری ماں مرگئی۔ ادھر سے گزرنے والے ایک شخص چارلس نے مجھے اسپتال پہنچایا اور پھر اسی نے میری پرورش کی۔ میری ماں کسی کو یہ بھی نہ بتا سکی کہ میرے باپ کا نام کیا تھا مگر میری یہ کہانیاں' کہانیاں ہی رہیں۔ میں نے اپنے حرامی پن کو چھپانا چاہا' اس کے لیے جھوٹ بھی بولا مگر لوگوں کی زبان بند نہ ہوسکی۔ اب مجھے اس ملک سے' اس کے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا دھرم' میرا دین' میرا ایمان صرف دولت ہے' وہ دولت جس کے سہارے میری ماں نے مجھے میٹرک کرایا۔ اس کی خاطر میں گاندھی جی کو بھی قتل کرسکتا ہوں اور محمد علی جوہر کو بھی! کیا سمجھے" وہ خاموش ہوگیا اور میزپوش گھسیٹ کر اس سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔

کمرے میں گمبھیر خاموشی چھائی تھی۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا پھر بھی میں نے کہا "تمہارا انداز فکر غلط ہے رحمان! یہ حادثہ کسی بھی عورت کے ساتھ پیش آسکتا تھا' کوئی بھی عورت ایسے حالات کا شکار ہوسکتی تھی۔"

"مسٹر!" وہ بولا "بس اب اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔ بہرحال تمہیں قتل کرنے کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔" اسی وقت زینے پر قدموں کی آواز آئی "لو بھئی وہ زہر لے کر آہی گیا! صرف ایک قطرہ تمہاری زبان پر پڑے گا اور تم تمام فکروں سے آزاد ہوجاؤ گے۔"

"مگر۔" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

اس نے اٹھ کر زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا "کہہ دیا خاموش رہو! خاموشی ہزار بلائیں ٹالتی ہے۔"

میں حیرانی سے منہ پھاڑے رہ گیا۔ زینے پر قدموں کی آوازیں واضح ہوتی چلی گئیں۔

"ابے جلدی آ! کیا ہوگیا آج تجھے۔" رحمان نے آواز لگائی پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے بے چین ہوکر پہلو بدلا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

عین اسی لمحے میرے گرد پراسرار اسنی کی مخصوص مانوس خوشبو چکرائی اور پھر اسنی کی آشنا آواز میں نے سنی "طارنوش! آزمائش کا وقت ختم ہونے والا ہے کہ یہی خدا کی مصلحت تھی۔ تم بہت جلد اس عذاب سے نجات پانے والے ہو۔"

مگر کیسے اسنی؟ میری ذہن میں سوال ابھرا۔

"ابھی چند لمحوں میں معلوم ہوجائے گا۔" اسنی کا جواب سنائی دیا اور پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھ سکتا "اب تک وہ کہاں تھی" اس کی خوشبو معدوم ہوگئی۔ وہ چلی گئی۔

میں جب زندگی سے قطعی مایوس ہوچکا تھا تو اسنی نے زندگی کی خوش خبری دی تھی۔ اس سے میں نے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس کیا۔

"رحمان!" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ اس آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔ مجھے اس آواز میں خوف کا تاثر محسوس ہوا۔

"کیا ہے بے؟" اپنی کہانی سنانے کے بعد رحمان اپنا رکھ رکھاؤ بھول گیا تھا۔ اب اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی' شائستگی دم توڑ چکی تھی۔

"ذرا ادھر آؤ! بہت اہم بات ہے۔"

"کیا مصیبت ہے!" رحمان کچھ جھلایا ہوا اٹھا "ایک تو اتنی دیر کردی" وہ تیز تیز قدموں چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں جلدی سے ... میں نے سوچا تھا کہ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی دھار سے رسی کاٹنے کی کوشش کی جائے۔ اسی وقت مجھے کمرے کے باہر ہنگامہ تھا پائی کی آواز سنائی دی پھر ذرا سی دیر میں یہ آوازیں ختم ہو گئیں۔ اگلے ہی لمحے میں خوش گوار ترین حیرت سے دوچار تھا۔ وہ آواز ہی ایسی تھی۔ اسی کی پیش گوئی غلط نہیں تھی۔

"شاہین!" فاطمہ کی آواز گونجی "کہاں ہو تم؟"

"فاطمہ!" میں نے جواب میں آواز دی۔

پھر چند ہی لمحے بعد فاطمہ میرے سامنے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے سینے سے اپنا سر ٹکا دیا "شاہین! میرے شاہین!" وہ اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکی۔ شاید کچھ اور کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"پگلی ہو گیا؟" میں نے اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا "میرے ہاتھ کھولو!"

"جوگیندر بھیا اور بخت خاں بھی ساتھ ہیں۔" فاطمہ نے بتایا "وہ رحمان کا بندوبست کر رہے ہیں۔"

میں حیرت سے بولا "بخت خاں، جوگیندر سے کب ملا؟"

"آج ہی چند گھنٹے پہلے!" فاطمہ نے جواب دیا "بخت خاں کو تم سے رابطے کا حکم ملا تھا۔ پہلے اس نے تمہیں موتی سیٹھ کے مسافر خانے میں دیکھا پھر وہ کوٹھی پہنچ گیا۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا ورنہ رات ہی کے وقت تالی گنج نہ پہنچ جاتا! تمہارے اغوا کے چند ہی منٹ بعد وہ کوٹھی پر پہنچ گیا تھا پھر بھیا نے اسے نہیں جانے دیا۔"

ذرا سی دیر میں میرے ہاتھ کھل چکے تھے۔ میں فاطمہ کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر صرف اتنا کہہ سکا "میری جان، میری اچھی سی فاطمہ۔"

"ہائے شاہین! میں تو جیسے جیتی جی مر گئی تھی۔" فاطمہ نے میرے ہاتھوں کو زور سے دبایا۔

"شاہین تو ٹھیک ہے فاطمہ؟" جوگیندر کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہوں دوست!" اس وقت میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں نے موت کو چند لمحوں کے فرق سے شکست دے دی تھی مگر یہ شکست میں نے دی تھی یا جوگیندر اور فاطمہ نے؟

"ٹانگ کا کیا حال ہے؟" جوگیندر کی آواز ابھری۔

"لنگڑا کر چل سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ فاطمہ بار بار میرے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔

"تم وہیں بیٹھو، میں ابھی آیا۔" جوگیندر کی آواز سنائی دی۔

میں قالین پر بیٹھ گیا اور فاطمہ صوفے کے ساتھ قالین پر بیٹھنے لگی تو میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا "صوفے پر بیٹھو، یہ کیا کر رہی ہو؟"

"میری جگہ تمہارے قدموں ہی میں ہے شاہین!" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ان آنکھوں میں اس وقت وہی بھیگی بھیگی چمک تھی جو گلاب کی کنواری پتی پر اوس کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ عجیب انداز تھا۔ میں کتنے ہی الفاظ لکھ ڈالوں مگر اس تاثر کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ انسان شاید ابھی تک اس انداز نظر کو بیان کرنے کے لیے کوئی لفظ، کوئی ترکیب تخلیق نہیں کر سکا۔ میں اگر مصور ہوتا تو اس انداز کو پینٹ کرتا اور لیونارڈو کی مونالیزا کی مسکراہٹ خفیف سی ہو کر رہ جاتی "لاؤ تمہارے ہاتھ دبا دوں۔" اس نے واقعی میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ہولے ہولے دبانا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں جوگیندر اور بخت خاں اس کمرے میں آ گئے۔ جوگیندر کا اصرار تھا کہ ہمیں فوراً وہاں سے چل دینا چاہیے مگر میں اس دوران میں انگریزی اسکیم کو کم از کم کاغذ کی حد تک ناکام بنانے کا لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔ اس مکان میں کم از کم ایک دن میں رہ سکتا تھا۔ رحمان جس شعبے سے تعلق رکھتا ہے اس میں کسی کارکن کے دو ایک روز کی غیر حاضری کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ خود مجھے بتا چکا تھا کہ اس مکان میں تنہا رہتا ہے۔ مکان کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے اس کے محکمے ہی کا ایک چپراسی روزانہ صبح وہاں آ جاتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں وہیں ٹھہر کر چپراسی کو بھی اس طرح بے بس کر لوں جس طرح رحمان اور اس کے دوسرے ساتھی کو بے بس کر لیا تھا اور پھر اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے تک یہیں مقیم رہوں۔ یہ اسکیم دوسرے روز تک یقینی طور پر مکمل ہو جاتی۔ اس کے بعد یہاں سے میرے کہیں اور منتقل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

جوگیندر اور بخت خاں کو جب میں نے اپنی اسکیم سے آگاہ کیا تو ان دونوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔

"اس منصوبے میں بخت خاں کو اہم کردار ادا کرنا ہے۔" میں نے جوگیندر سے کہا "بات یہ ہے کہ میں شیام دت کے سامنے نہیں جا سکتا، نہ تم جا سکتے ہو کیوں کہ جب بلسکا پتردوں کی ہولی جلائی جا رہی تھی تم بھی اسٹیج پر موجود تھے پھر یہاں کے سیاسی حلقوں کے لیے بھی تم اجنبی نہیں ہو۔ شیام دت کے پاس کسی ایسے آدمی کو جانا چاہیے جو اس کے لیے اجنبی ہو۔"

جوگیندر نے میری تائید کی۔ بخت خاں نے بھی اس پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ میں اور بخت خاں یہیں رکیں گے۔ رحمان کے چپراسی کو ہم قابو میں کر لیں گے۔ اس وقت ضروری یہی ہے کہ رحمان اور اس کے ساتھ رات کو کام کرنے والے افراد کسی سے رابطہ قائم نہ کر سکیں پھر اس کے ملازم کو بھی یہیں روکنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ڈرائیور بھی آ جائے۔ ہم یہاں رہ کر اسے بھی آسانی سے بے بس کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کو رحمان اور اس کے ساتھیوں کے غائب ہونے کا احساس نہ ہو۔"

پھر ہم تینوں ڈرائنگ روم ہی میں ٹھہر گئے۔ یہ معاملہ طے ہونے کے بعد جوگیندر کو میری ٹانگ کی فکر ہوئی۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد اسے ایک الماری میں فرسٹ ایڈ بکس مل ہی گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا کہ رحمان جیسے آدمی کے گھر میں ضروری اور فوری نوعیت کی دوائیاں ہونا لازمی امر ہے۔

جوگیندر میری مرہم پٹی کر کے فارغ ہوا۔ میری ٹانگ پر چاندی کے روپے کے برابر آبلہ پڑا ہوا تھا اور تمام ران سرخ ہو رہی تھی۔

اس دوران میں جب جوگیندر میری مرہم پٹی میں مصروف تھا، میں نے ان لوگوں کو جوگیندر کی کوٹھی سے اغوا ہونے سے لے کر رحمان چارلس کے گھر آنے تک کے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ بتا دیے۔ فاطمہ درمیان میں سوال کر کے مجھ سے ایک ایک بات پوچھ رہی تھی۔

اپنی بپتا سنانے کے بعد میں نے جوگیندر سے کہا "تو یہ واقعات مجھے پیش آئے۔ یہ بتاؤ کہ تم عین اس وقت جب کہ میری موت کا سامان آ گیا تھا اچانک کیسے یہاں پہنچ گئے؟"

جوگیندر مسکرایا اور پھر مجھے ان باتوں سے آگاہ کرنے لگا جو میرے علم میں نہیں تھیں۔

جوگیندر نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یہ تھا کہ جب ذیشی کے آدمی مجھے وہاں سے اغوا کر کے روانہ ہوئے اور بخت خاں وہاں پہنچ گیا تو ان دونوں نے فوراً ہی تعاقب کا فیصلہ کیا۔ وہ بھی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت فاطمہ بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی ضد پر اڑ گئی کہ جوگیندر اور بخت خاں کے ساتھ جائے گی۔ وقت کیوں کہ بہت کم تھا اس لیے جوگیندر کو اس کی بات ماننا پڑی۔ سیٹھ موہن لال نے بھی فاطمہ کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ میں جوگیندر بھیا کے ساتھ جا رہی ہوں "اب خطرے کی کیا بات ہے!" جوگیندر تعاقب کرتا ہوا اس مکان تک پہنچ گیا جہاں مجھے اذیت دی گئی تھی۔ مکان کا پتا چلانے کے بعد وہ فوراً اپنے چند دوستوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بخت خاں نے اختلاف کیا تھا مگر جوگیندر کا کہنا تھا کہ مجھے اغوا کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے صرف دو افراد قابو نہیں پا سکیں گے۔ جوگیندر اس سلسلے میں پولیس سے بھی رابطہ کرنے کے حق میں تھا لیکن بخت خاں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ بخت خاں کا خیال تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں لے جانے سے میرے لیے پریشانیاں بڑھ جائیں گی پھر میں ایک بڑے اور بااختیار دشمن کے چنگل میں پھنس جاؤں گا۔ جوگیندر نے بخت خاں کی رائے سے اتفاق کیا اور وہ اپنے ہم خیال دوستوں کی

تلاش میں نکل گیا جو اس کے نظریات کے حامی تھے جو انسانیت کو سب سے بڑا مذہب سمجھتے تھے اور قطعی طور پر غیر متعصب تھے۔ ان لوگوں کی تلاش میں اسے خاصا وقت لگ گیا اور پھر وہ دو گاڑیوں میں بھر کر وہاں پہنچے۔ یہ وہی وقت تھا جب رحمان نے مجھے ذیبی سے چھڑایا تھا اور ہم میدان سے گزر کر ایک کار میں آبیٹھے تھے۔ اسی وقت دو کاریں آگے پیچھے میدان میں داخل ہوئی تھیں۔ جوگیندر اور بخت خاں نے ذیبی اور اس کے بندھے ہوئے ساتھیوں سے چند سوالات کیے جن کے جواب ان لوگوں نے صحیح نہیں دیے۔

جوگیندر نے بتایا کہ مجھے وہاں نہ پا کر ہم مایوس ہو گئے پھر بخت خاں ان میں سے ایک کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ ٹپی تھا جو تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا۔ ٹپی کو ساتھ لے کر وہ وہاں سے چلے آئے۔ باہر آکر ٹپی نے جوگیندر کو بتایا کہ مجھ پر کیا گزری تھی! پھر کہا تھا کہ میں اس شخص کو پہچان گیا ہوں جو شاہین کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کا نام ٹپی نے رحمان چارلس بتایا تھا اور کہا تھا کہ جہاں رحمان رہتا ہے اسی محلے میں اس کی ایک دکان ہے۔ رحمان کہاں رہتا ہے اس کا علم ٹپی کو نہیں تھا البتہ رحمان کی دکان پر بیٹھنے والے ملازم کو رحمان کے گھر کا پتا تھا۔

یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جوگیندر نے ایک ساتھی کے سوا سب کو رخصت کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ پوری برات کی برات ساتھ رکھنے سے معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ وہاں سے وہ لوگ رحمان کے ملازم کے گھر پہنچے۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ ٹپی کو یاد آیا کہ وہ جوا کھیلنے کا عادی ہے چنانچہ ٹپی جوئے کے اڈے پر پہنچا۔ وہاں سے وہ رحمان کے ملازم کو چند منٹ کے لیے اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ٹپی کو بڑی ردوکد کے بعد رحمان کے مکان کا پتا بتایا۔ رحمان نے اسے بتا رکھا تھا کہ یہ مکان اس کے کسی دوست کا ہے جو تجارت کے سلسلے میں عموماً ہندوستان کے مختلف شہروں میں آتا جاتا رہتا ہے اور مہینے دو مہینے بعد کلکتے آتا ہے۔ ایک دو دن رہ کر وہ پھر کاروباری دورے پر نکل جاتا ہے۔

پتا اچھی طرح ذہن نشیں کرنے کے بعد وہ رحمان کے مکان کی طرف آئے تھے۔ انہوں نے رحمان کے ملازم سے بہت کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے مگر وہ جوا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ انہیں صرف بتائے ہوئے پتے کے سہارے اس علاقے میں رحمان کا مکان تلاش کرنا پڑا۔ جب انہوں نے مکان تلاش کر لیا تو جوگیندر کا ساتھی ننگے پیر دبے پاؤں زینے چڑھ کر اوپر گیا۔ اس نے آہٹ لی اور پھر مکان کے اندر چلا گیا۔ اس وقت رحمان مجھے پُرسکون موت کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنے ایک ساتھی کا تذکرہ کیا جسے اس نے سائنائڈ لینے کے لیے بھیجا تھا اور جو کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ وہ یہ سنتے ہی الٹے قدموں واپس ہوا پھر انہوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ انہیں اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ جب تک سائنائڈ نہیں آجاتا، میری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ سب نیچے ہی دبک گئے اور رحمان کے ساتھی کا انتظار کرنے لگے۔ رحمان کا ساتھی تھوڑی ہی دیر بعد آگیا تو انہوں نے اسے چھاپ لیا۔ اس کے بعد کے حالات مجھے معلوم ہی تھے۔

"اچھا بھئی شاہین! اب ہم چلتے ہیں۔" جوگیندر بولا "پتا جی بہت پریشان ہوں گے۔ میں ٹھیک نو بجے پہنچ جاؤں گا۔"

پھر جوگیندر اور فاطمہ دونوں بھائی بہن وہاں سے چلے گئے۔

O☆O

صبح کا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ رات کی تاریکیاں سمٹتی جارہی تھیں۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری آنکھیں جل رہی تھیں اور ذہن بوجھل ہوتا جارہا تھا۔ میں نے بخت خاں سے کہا کہ وہ جاکر رحمان کے کپڑوں کی تلاشی لے۔ اس کے پاس یقیناً گھر کی چابیاں ہوں گی۔ وہ چابیاں نکال کر لے آئے۔ وہ ادھر گیا اور میں لنگڑاتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ میں نے خوب منہ دھویا سر کو بھگویا اور تولیے سے سر پونچھتا ہوا باہر آگیا۔ اس سے میرے ذہن کا بوجھل پن ختم ہو گیا اور آنکھوں کی جلن بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ رحمان کے پاس چابیوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس کا شناختی کارڈ بھی تھا جس سے تصدیق ہوتی تھی کہ رحمان سی آئی ڈی کے محکمے سے وابستہ تھا۔ میں نے ان چابیوں سے وہ کمرا بند کر دیا۔ جس میں رحمان اور اس کا ایک ساتھی بندھا پڑا تھا۔

یہ پورا مکان رحمان کے پاس ہے۔" میں نے بخت خاں سے کہا "اس کے چپراسی پر قابو پانے کے بعد ہم اس مکان کا جائزہ لیں گے۔ ہم ان لوگوں کو ایک ہی کمرے میں بند کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" بخت خاں نے تائید کی "یہی سوچتے ہوئے جوگیندر نے دونوں کو سینے کے بل ملا کر باندھا تھا تاکہ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کی بندشوں تک نہ پہنچ سکیں اور وہ کسی طرح آزاد نہ ہو جائیں!"

"پتا نہیں کمبخت چپراسی کب تک آئے گا!" میں بولا

"اس وقت تک ہمیں چوکنا رہنا ہو گا۔"

"تم آرام کر لو میں جاگ رہا ہوں۔" بخت خاں نے مجھ سے کہا۔

"نہیں" میں نے انکار کر دیا "پہلے کام پھر آرام!"

چپراسی کا انتظار ٹھیک آٹھ بجے ختم ہوا۔ دروازہ بخت خاں نے کھولا تھا۔ چپراسی شاید اس گھر میں روز نئے نئے چہرے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے اس لیے بخت خاں کی وہاں موجودگی پر اظہار حیرت نہیں کیا اور اندر آتے ہی پوچھا "صاحب کہاں ہیں؟ کیا وہ ہیں؟"

"ہاں" بخت خاں نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اسے آڑے ہاتھوں چھاپ لیا۔ وہ پست قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ ذرا ہی دیر میں بے بس ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر اور منہ پر کپڑا باندھنے میں بخت خاں کی مدد کی پھر اسے ایک کمرے میں گٹھری بنا کر ڈال دیا۔

اب ہم مطمئن تھے۔ چپراسی کے بعد اب ہمیں کسی طرف سے کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔

"اب تم ایسا کرو بخت خاں کہ اس پورے مکان کا جائزہ لے ڈالو۔" میں نے چابیاں اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "میری ٹانگ میں تکلیف ہے اس لیے چلا نہیں جارہا۔"

"ٹھیک ہے۔" بخت خاں بولا اور چلا گیا "تم آرام کرو!"

میں صوفے پر لیٹ گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہی بخت خاں تمام مکان کا جائزہ لے کر واپس آگیا۔

"اس دو منزلہ مکان کے زینے کا ایک دروازہ گراؤنڈ فلور پر بھی کھلتا ہے۔ نیچے بھی اسی طرح چار کمرے بنے ہوئے ہیں۔ تمام کمروں میں مختلف قسم کا فرنیچر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا رحمان نے اس مکان کو اتنا بنا سنوار کر کیوں رکھا ہے۔ اس کے لیے تو یہی بالائی منزل کافی تھی۔"

"اس قسم کے لوگ عموماً ایسی ہی پرتعیش زندگی گزارتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "تمام کمروں کی چابیاں موجود ہیں؟"

"ہاں۔ تمام کمروں میں تالے پڑے ہیں۔ سب کی چابیاں اسی گچھے میں موجود ہیں۔" بخت خاں نے بتایا "دو اسٹور بھی ہیں جو خالی پڑے ہیں۔ میرا خیال ہے دونوں اسٹورز میں انہیں بند کیا جاسکتا ہے۔"

اب جوگیندر کا انتظار کرنے کے سوا ہمارے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ وعدے کے مطابق وہ ٹھیک نو بجے پہنچ گیا۔ اس کے آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ چپراسی

اور سائنائڈ لانے والے کو ہم نے مکان کی زیریں منزل کے اسٹور میں بند کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے رحمان پر "طبع آزمائی" شروع کر دی۔ اس کے مکان سے ہمیں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ سب سے زیادہ معلومات اس کی ڈائری سے ملی تھی جس میں اس نے ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو بروکر یعنی دلال ہی لکھا تھا جو ہندو مسلم فسادات کرانے کے لیے انگریز کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے ذمے دار تھے۔ رحمان نے ناموں کے پہلے حروف لکھے تھے۔ اس ڈائری میں اپنے طور پر اس نے یہ حساب بھی رکھا ہوا تھا کہ سرکار کے خفیہ خصوصی فنڈ کی کتنی رقم ان کے پاس موجود تھی۔ اس کے علاوہ ڈائری سے ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ اکثر ان بروکروں کے اجلاس اسی گھر میں ہوتے تھے لیکن ایسے موقعوں پر رحمان کبھی بہ ذات خود شریک نہیں ہوتا تھا۔ ان اجلاسوں کے موقعوں پر اس کا چپراسی ان لوگوں کو زبانی یا تحریری حکم دیا کرتا تھا کہ انہیں آئندہ کیا کرنا ہے پھر وہ وہیں اس کے حکم کی تعمیل کے لیے حکمت عملی وضع کرتے، اس حکم پر تبادلۂ خیال کرتے اور یہ طے کرتے کہ ان کے ذمے کیا کیا فرائض ہوں گے۔ اس ڈائری سے یہ بھی پتا چلا کہ ان اجلاسوں کے موقعوں پر رحمان وہیں کسی قریبی کمرے میں چھپا رہتا تھا۔ اس کمرے کے باہر تالا پڑا ہوتا تھا تاکہ اجلاس میں شریک کوئی بروکر وہاں نہ آسکے۔ وہ یہ اہتمام اس لیے کرتا تھا کہ اسے لوگوں کی گفتگو سے ان کے اندازِ فکر کا پتا چلتا رہے۔ اس نے ان چھے بروکروں کے بارے میں، اپنے مخصوص انداز میں تبصرے بھی کیے تھے جو بہت دلچسپ تھے۔

ش۔ د۔ انتہائی حریف، لالچی، بزدل شخص، اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے دریغ نہ کرنے والا! اگر میں اسے دس ہزار روپے کی پیشکش کردوں اور یہ بھی بتادوں کہ میں حرامی ہوں تو بھی اپنی حسین و نوجوان بیٹی کو ایک رات کے لیے میرے حوالے کردے گا۔

ق۔ م۔ بدطینت، بدخو، ظالم اور سفاک مگر ایمان دار!

پیسے پیسے پر جان دینے والا مگر دو سرے کی ایک پائی بھی اپنے پاس رکھنے کو حرام سمجھنے والا۔ اردو شاعری میں محبوب کو مذکر باندھتے ہیں مگر یہ عملی زندگی میں اردو شاعری کرتا ہے۔ خوب صورت اور حسین ترین لڑکی بھی اس سے کوئی راز نہیں اگلوا سکتی۔

ل۔م۔ چار سو بیس' چرب زبان' کینہ پرور' انتہائی کنجوس' چمڑی جائے دمڑی نہ جائے کی زندہ تصویر! اندھے فقیر کو جعلی نوٹ دے کر اصلی سکے لینے کا قائل۔ ایک بیٹی میعادی بخار سے مر گئی مگر علاج کے لیے اس کی جیب سے رقم نہ نکلی دھن اس کا دھرم!

م۔ل۔ وسیع القلب' خوش گفتار' رحم دل مگر اس صورت میں کہ اپنا کوئی نقصان نہ ہو۔ گھاٹے کی صورت ہو تو پھر خود غرض' رکھ رکھاؤ کا آدمی! بے چارہ پھنسا اس لیے کہ خوب صورت عورت اس کی کمزوری ہے۔ ایک ہندو لڑکی کو داشتہ بنا رکھا ہے۔ اس راز کو راز رکھنے کے لیے بدکر بن گیا۔

ط۔ج۔ مسلمان بنیا' مایا کا سانپ' شکل پر ہر وقت مسکینی کی پھٹکار' بہ ظاہر منکسر المزاج! اصولوں کا زبردست حامی مگر صرف ان اصولوں کا جو اس کی ذات کو فائدہ پہنچا سکیں۔ عیاش بیوی کا وفادار شوہر کہ دولت کی شکل بیوی کے ذریعے دیکھی۔ ڈرپوک اتنا کہ اسے قتل کی دھمکی دے کر کسی کو بھی قتل کروالو' صرف تحفظ کی ضمانت پر۔

چ۔ل۔ بڑا انقلابی' بڑا فسادی' بڑا خبیث' مجھ سے بھی بڑا! دولت کو سونے میں تبدیل کرنے کا رسیا' لاکھوں کا آدمی' بروقت پکڑا! بڑی کوٹھی میں جھونپڑی جتنا سامان' لان کو کھیت میں اس لیے تبدیل کردیا کہ بارہ مہینے مفت کی سبزیاں ملتی رہیں۔ کنجوسی کو کفایت اور کفایت کو اسراف بے جا سمجھنے والا۔ شادی اس لیے نہیں کی کہ جوانی کی توانائی صرف ہوجاتی۔

۔۔۔یہ تھے وہ چھ بدکر جن کے چہرے رحمان نے اپنی ڈائری میں لکھے تھے۔ کلکتہ شہر میں میری مصروفیات کی یادگار یہی ایک ڈائری ہے جو آج بھی میرے پاس ہے۔ اس ڈائری کی وجہ سے مجھے اپنی اسکیم کے دوسرے حصے پر عمل کرنے میں زیادہ آسانی ہوئی ورنہ شاید ذرا لمبا چکر پڑجاتا۔ اس ڈائری کی وجہ سے نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آگیا۔

رحمان بہت بوگس اور بودا آدمی ثابت ہوا۔ میں سمجھا تھا کہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے' سخت جان ہوگا اور آسانی سے شکست قبول کر نہیں دے گا وہ واقعی ایک نازک طبع شخص تھا۔ تکلیف تو وہ برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ تیسرا منٹ بھی نہیں گزر پایا تھا کہ وہ ٹپ گیا اور ہم سے مکمل تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے ہمیں ان چھے دلالوں کے اصل نام اور پتے بھی بتادیے جن کے چہرے ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان کے اصل نام علی الترتیب یہ تھے' شیام دت' قادر منشا' لالہ موتی چند' ماوا لنکر' طیب جی اور چونی لال! یہ نام میرے لیے تو نہیں البتہ جوگیندر اور بخت خاں کے لیے چونکا دینے والے تھے۔ ان کے بارے میں رحمان نے اپنی ڈائری میں جو کچھ لکھا تھا' وہ بھی بیشتر ان دونوں کے لیے انکشافات ہی تھے۔ یہ بھی سیاسی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔ قومی سطح پر اگرچہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی مگر مقامی سیاست میں وہ ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان تمام معلومات کے بعد ہم نے رحمان سے ان تمام بدکروں کے نام وہ پرچیاں بھی لے لیں جو بہ قول رحمان کے ہنڈیاں تھیں۔ ہر ہنڈی تیس تیس ہزار روپے کی تھی۔ پرچی پر سب سے اوپر کی سطر میں بدکر کا نام لکھا تھا یعنی شیام دت کے لیے لکھا' بدکر نمبر ایک! دوسری سطر میں رقم لکھی تھی تیس ہزار! تیس ہزار کے ہندسوں کے دائیں بائیں رحمان نے اپنے مختصر دستخط کیے تھے۔ جنہیں انگریزی میں "انی شل" کہتے ہیں۔ آخر یعنی تیسری سطر میں اس نے اپنے پورے دستخط کیے تھے۔ ان پرچیوں کو اس نے مخصوص رنگ کے لفافوں میں رکھوایا تھا۔ ہر بدکر کے الگ الگ رنگ کا لفافہ تھا۔ یہ لفافے اسی الماری میں رکھے ہوئے تھے جہاں سے ڈائری ملی تھی۔ اس وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ رحمان! اگر تم نے ذرا بھی دھوکا دیا تو تمہارا کام تمام کر دیا جائے گا۔ اس پر اس نے مجھ سے اسی ڈائری کا وہ صفحہ دیکھنے کے لیے کہا جس پر چھے بدکروں کے چہرے لکھے تھے پھر اس نے ان چہروں کے اختتام پر لکھے ہوئے حروف کی طرف توجہ دلائی۔ ان پر علی الترتیب ل' ن' پ' ہ' س' خ کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ حروف لال' نیلے' پیلے' ہرے' سفید اور خاکی رنگوں کے مخفف کے طور پر لکھے ہیں۔ ان لوگوں کو ہمیشہ اسی رنگ کے لفافوں میں ہنڈیاں بھیجی جاتی ہیں جو ان کے لیے مخصوص ہیں اگر غلط رنگ کا لفافہ کسی کے پاس بھی پہنچ جائے تو لفافہ لے جانے والا خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

"سوچ لو رحمان!" میں نے کہا "ہم میں سے ایک تمہارے پاس یہاں رہے گا اگر ان لوگوں کے پاس جانے والے دونوں آدمیوں میں سے کوئی بھی خطرے میں پڑا تو تمہاری موت بڑی اذیت ناک ہوگی! میں تمہیں سائنائڈ سے نہیں ماروں گا بلکہ

چھری سے تمہارے جسم کی ایک ایک بوٹی اتاروں گا اور اس وقت تک اتارتا رہوں گا جب تک تم ہلاک نہیں ہوجاؤ گے۔ ہوسکتا ہے کہ ہر مرتبہ بوٹی کاٹنے کے بعد میں زخم پر نمک اور مرچ بھی چھڑکتا رہوں۔ تم نے دیکھا مرچ کیسی ظالم چیز ہوتی ہے' ابھی ایک چٹکی مرچ ہی پھونک مار کر تمہارے چہرے کی طرف اڑائی گئی تھی اور تمہاری آنکھیں اب تک پانی بہا رہی ہیں۔ جب مرچیں زخم میں لگتی ہیں تو تکلیف اور زیادہ ہوتی۔ آنکھیں زیادہ پانی بہانے لگتی ہیں۔"

اس نے زور سے جھرجھری لی۔ شاید وہ زخموں پر مرچیں چھڑکے جانے کے تصور ہی سے کپکپا کر رہ گیا تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر چیخ اٹھا "نہیں' نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اس کے لہجے کا وہ اعتماد اور کمینہ پن ختم ہوگیا تھا جو رات کو اس کے انداز گفتگو کا حصہ بنا ہوا تھا۔

"تم ان چھے بدکروں کو یہاں جمع بھی کرتے ہو؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"ہاں جب کبھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی میٹنگ بلالیتا ہوں۔" رحمان نے جواب دیا۔

"کیا وہ اپنی مرضی سے بھی یہاں آسکتے ہیں؟"

"نہیں۔ انہیں سخت ہدایت ہے کہ جب تک انہیں یہاں نہ بلایا جائے وہ ادھر کا رخ بھی نہ کریں۔ وہ یہاں صرف اس وقت آتے ہیں جب انہیں بلایا جاتا ہے۔"

"اجلاس کس طرح بلایا جاتا ہے؟ میرا مطلب ہے انہیں میٹنگ کی اطلاع کس طرح دی جاتی ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"ایک کاغذ کی پیشانی پر میٹنگ کی تاریخ اور وقت لکھ کر میں اس کے نیچے اپنے دستخط کردیتا ہوں پھر اس کے نیچے ایک سے چھے تک نمبر ترتیب وار لکھ دیے جاتے ہیں۔ دعوت نامہ ایک لیٹر ہیڈ پر لکھا جاتا ہے جس پر "بدکرز ایسوسی ایشن" چھپا ہوا ہے پھر گنگے کے کسی کارندے سے کہا جاتا ہے کہ وہ بدکروں سے اس کاغذ پر دستخط کرالائے۔ ہر بدکر اپنے نمبر کے آگے دستخط کردیتا ہے اور پھر وہ سبھی مقررہ تاریخ کو معینہ وقت پر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔" اس نے ایک ایک بات مجھے بتادی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک الماری میں رکھے ہوئے فائل میں اس قسم کے کاغذ دیکھے تھے۔ اس وقت جب میں وہ فائل دیکھ رہا تھا' میری سمجھ میں اس کا مقصد اور مطلب نہیں آیا تھا۔

"مقام کا نام کیوں نہیں لکھتے؟" میں نے پوچھا۔

"مقام انہیں معلوم ہے۔" رحمان نے بتایا "ان

بدکروں کو بتادیا گیا ہے کہ تا اطلاع ثانی اجلاس یہیں ہوا کریں گے۔"

"یہاں تمہارے ذاتی دوست وغیرہ آتے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔ یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں تھا۔

"نہیں" رحمان بولا "یہاں میرے بنگلے کے صرف تین آدمی آتے ہیں۔ ایک چپراسی' ایک مخبر مجید! ان دونوں کو تم نے پکڑ رکھا ہے۔ تیسرا وہ ڈرائیور ہے جو رات کو ہمارے ساتھ تھا۔"

"آج وہ آئے گا؟" میں نے دریافت کیا "ٹھیک ٹھیک جواب دینا!" میرا لہجہ سرد تھا "ورنہ اس سے قبل کہ کوئی تمہاری مدد کو آسکے میں تمہارا کام تمام کردوں گا۔ ہوسکتا ہے' وہ یہاں سے ہماری لاشیں ہی اٹھائیں مگر تم یہ منظر دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔"

"اسے نہیں آنا چاہیے۔" رحمان نے کہا "ویسے رات بارہ بجے مجھے اس سے ڈلہوزی اسکوائر میں بڑے ڈاک خانے کے سامنے ملنا تھا۔"

"اگر تم اس سے ملنے نہیں گئے تو پھر وہ یہیں آئے گا؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہوسکتا ہے بلکہ۔۔۔وہ یقیناً آئے گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہمیں آج رات تمہاری لاش ٹھکانے لگانا تھی۔"

میں ہنس پڑا "میری لاش ٹھکانے لگانا تھی مگر وہ سیدھا یہاں بھی آسکتا تھا' تمہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ پروگرام میں نے ہی بنایا تھا۔ دراصل میں اس وقت اسی علاقے میں ہوتا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو ان تین افراد کے سوا کوئی اور یہاں نہیں آتا؟"

"نہیں"

پھر میں نے رحمان سے اس کار اور اس کے ڈرائیور کی شناخت معلوم کی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتادیا تو میں نے اس سے کہا۔ "ہاں تو مسٹر رحمان چارلس! تم آج رات ان چھے بدکروں کا اجلاس طلب کررہے ہو!"

"مم۔ مگر۔ مگر کیوں؟" وہ ہکلانے لگا۔ "آج۔ آج تو ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اجلاس۔"

"یہ میں جانتا ہوں کہ کوئی بات ہے یا نہیں!" میں نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "ویسے کیا یہ بات اہم نہیں ہے کہ تم آج رات ہمارے قبضے میں ہو؟" میں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ "کیوں' بتاؤ نا یہ بات اہم ہے یا نہیں؟"

رحمان بے چارہ کیا جواب دیتا! اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ "وہ۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر تم۔ تم انہیں یہاں کیوں بلا رہے ہو؟"

"اچار ڈالنے کے لیے! ہم ان کا اچار ڈالیں گے مسٹر رحمان چارلس!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ویسے ہم وطن دشمن اور قوم فروشوں کو ایسا سبق دینا چاہتے ہیں کہ وہ عمر بھر یاد رکھیں کہ قوم سے غداری کی سزا کیا ہوتی ہے تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔"

رحمان نے پوری طرح ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کی مدافعتی حس ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ موم کا ایسا پتلا تھا کہ اسے جس طرح چاہے موڑا جا سکتا تھا۔ میں نے اس سے اجلاس بلانے کا دعوت نامہ لکھوا لیا۔ اس میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا' اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بندشوں کا جائزہ لیا اور اسے اسٹور میں بند کر دیا۔ میری اسکیم کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب صرف عمل درآمد کی ضرورت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں بھی کوئی دقت نہیں ہو گی۔

اس دوران میں جب کہ میں رحمان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا' بخت خاں اور جوگیندر باہر گئے ہوئے تھے۔ یہ چھے بروکر کیوں کہ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر رہتے تھے لہٰذا جوگیندر نے یہ سوچا تھا کہ اپنے ڈیڈی کے دفتر جا کر کار لے آئے تاکہ کام جلد نمٹ سکے۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں بھی آ گئے۔ میں نے رحمان سے اپنے سوال جواب کی تفصیل سے انہیں آگاہ کیا اور پھر اس پروگرام پر گفتگو ہوئی جس پر ہم عمل کرنے والے تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہنڈیاں اور دعوت نامہ لے کر بروکرز کے پاس بخت خاں ہی جائے گا۔ ہم اس مرحلے پر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سب بروکرز سیاسی آدمی تھے اور یہ بات خارج از امکان نہیں تھی کہ یہ سب حضرات گزشتہ روز دھرم تلہ گراؤنڈ میں بدیسی کپڑے کے الاؤ کی تقریب میں شریک رہے ہوں۔ ویسے بھی وہاں ان کی شرکت یقینی تھی کیوں کہ وہ سب حکومت کے مخبر تھے اور سیاسی مواقع پر ان کی موجودگی لازمی ہوگی۔ میں اور جوگیندر کیوں کہ اسٹیج پر بیٹھے تھے پھر میں تو ویسے ہی اپنی تقریر کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ طے یہ ہوا کہ اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے جوگیندر اور بخت خاں جائیں اور میں وہیں مکان میں رہوں۔ اس طرح ایک تو مکان کی حفاظت بھی رہتی' دوسرے اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں تھا کہ میں کسی ایسے شخص کی نظر میں آ جاؤں گا جسے میری تلاش ہو گی یا یہ معلوم ہو گا کہ کچھ لوگ میری تلاش میں ہیں۔ اگرچہ رحمان نے بتایا تھا کہ اب کسی کے وہاں آنے کا امکان نہیں تھا لیکن اس پر کس حد تک یقین کیا جا سکتا تھا! خود اس کا ملازم جو اس کی دکان پر کام سنبھالتا تھا' اس مکان سے واقف تھا۔ رحمان نے جان کر یہ نہیں بتایا تھا یا وہ بھول گیا تھا' میں کہہ نہیں سکتا تھا اس کے بعد یہ طے ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے ایک شیشے پر سبز کپڑا لگا دیا جائے تاکہ جوگیندر اور بخت خاں واپس آئیں تو وہ اس کپڑے کو دیکھ کر سمجھ جائیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ رات کے وقت شیشے کے پیچھے موم بتی جلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ جب جوگیندر اور بخت خاں واپس آئیں گے تو دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دیں گے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہی آئے ہیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں جب بھی دروازے پر دستک ہو یا میں خطرہ محسوس کروں تو سب سے پہلے کھڑکی کے نچلے حصے پر پڑا ہوا سبز کپڑا اتار دوں۔ سبز کپڑے کا خیال ہمیں اس لیے آیا تھا کہ ایک طرف میز پر سبز سا رومال پڑا ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہم اس رومال کو آسانی سے استعمال کر سکتے تھے۔ یہ رومال کیلوں کی مدد سے جوگیندر اور بخت خاں کی روانگی سے پہلے ہی کھڑکی کے شیشے پر لٹکا دیا گیا تھا۔

بخت خاں اور جوگیندر جا چکے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس مکان کا جائزہ لیا۔ میرے نقطۂ نظر سے اس مکان میں زیادہ اہم وہ الماری تھی جس میں رحمان کے کاغذات رکھے تھے۔ اس مرتبہ بھی جائزے کے بعد مجھے کہیں کوئی اور چیز نہ مل سکی۔ میں نے ان تمام کاغذات کو جو الماری میں تھے ایک جگہ سمیٹ کر ایک میز پوش میں باندھ لیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہمیں اپنی اسکیم کے دوسرے مرحلے کی تکمیل کے بعد اس مکان کو چھوڑ دینا تھا۔ ان تمام کاغذات کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ایک مرتبہ پھر تمام حالات کا جائزہ لیا۔ ابھی مجھے کم از کم پانچ دن تو کلکتے میں قیام کرنا ہی تھا پھر مجھے وکٹوریہ میموریل کے صدر دروازے کے سامنے سے حسب ہدایت گزرنا تھا۔ شاید اس دن مجھے آیندہ کا کوئی پروگرام بتایا جاتا یا کوئی اور مہم مجھے سونپی جانے والی تھی۔ میرا قیاس تھا کہ شاید کلکتے میں مجھے کچھ زیادہ ہی عرصے قیام کرنا پڑے گا۔

پھر میں نے موجودہ حالات پر غور شروع کر دیا۔ اب میرے ذہن میں ایک اور پروگرام ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اس ہندو لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے ماوا لنگر نے اپنی داشتہ بنایا ہوا تھا۔ میں چونی لال کی اس دولت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے سونے میں تبدیل کی تھی۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں مجاہد اوّل کی تصویر بھی ابھر رہی تھی جو اصولوں پر سختی سے کاربند تھا۔ میں اس عہد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میں نے جلالی کے اس چھوٹے سے کمرے میں اٹھایا تھا' تنظیم سے وفاداری کا عہد! اس کے فوراً بعد قاسم تانگے والے کو لاش میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا کیوں کہ مجاہد اوّل اس کی غداری سے واقف ہو گیا تھا۔ کیا میں تنظیم سے غداری کا مرتکب ہو رہا تھا؟ کیا میں نے تنظیم کی ہدایات سے انحراف کیا تھا؟ کیا اب جو کچھ میں کر رہا تھا' وہ تنظیم کے متعینہ اصولوں کے خلاف تھا؟ کیا میں جو کچھ سوچ رہا تھا' اس سے تنظیم کو نقصان پہنچ سکتا تھا؟ پھر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میں جن حالات کا شکار ہوا تھا اور جن کی وجہ سے یہ صورتحال بنی تھی' اس میں دانستہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ تنظیم بنیادی طور پر انگریز حکومت کے خلاف ہی کام کر رہی تھی۔ میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا تھا' وہ اسی حکومت کے ایک گھناؤنے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کر رہا تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔

تین گھنٹے کے بعد جوگیندر اور بخت خاں واپس آ گئے۔ رحمان نے ہم سے واقعی بھرپور تعاون کیا تھا۔ جوگیندر اور بخت خاں نہ صرف ان چھے دلالوں سے وہ ہنڈیاں بھنا لائے تھے جو رحمان نے دی تھیں بلکہ رات آٹھ بجے ہونے والی میٹنگ کے دعوت نامے پر ان چھے دلالوں کے دستخط بھی لے آئے تھے۔ شیام دت نے رقم دینے کے علاوہ ایک خط بھی دیا تھا۔ یہ خط وہ تھا جو رحمان اور شیام دت کے پروگرام کے مطابق میری لاش کے ساتھ ہی پولیس کو ملتا پھر حکومت اس خط کو خوب خوب اچھالتی۔ ہندو مسلم منافرت کو خوب ہوا ملتی۔ اس خط میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے وہ خط اپنے پاس رکھ لیا۔

پہلا مرحلہ نہایت کامیابی سے طے ہو گیا تھا۔ اب اسکیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہونا تھا۔ اس کے لیے ہمیں سورج ڈھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہم تینوں نے فرصت کو غنیمت جانا اور سونے کا پروگرام بنایا' اس طرح کہ باری باری ایک شخص جاگتا رہے۔



سورج کا جلتا دیا کبھی کا بجھ چکا تھا۔ رات جوان ہو کر انگڑائیاں لیتے ہوئے بہت دیر پہلے دنیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ چکی تھی۔

ہم نے آٹھ بجے ہی اپنے دو اسیروں کو چائے اور توس کے ساتھ خواب آور دوا دے دی تھی۔ صرف رحمان کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ ہم چھے دلالوں کے اجلاس کی کارروائی مکمل کر چکے تھے اور اپنے مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ مخصوص دستک بخت خاں نے دی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہمارا پہلا مہمان آنے والا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مہمان آ گیا۔ یہ کمبخت شیام دت ہی تھا۔ وہ اطمینان سے مکان میں داخل ہوا' دروازے کو آہستگی سے بھیڑا اور کانفرنس روم میں آ گیا۔ ابھی وہ دو قدم ہی اندر آیا ہو گا کہ بغلی کمرے کی طرف اس کی نظر پڑی۔ وہاں جوگیندر چہرے پر نقاب ڈالے اور ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔

"تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو میں گولی مار دوں گا!" جوگیندر نے سختی سے کہا۔ گفتگو کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی جنبش اور سانسوں کی آمدورفت سے اس کے چہرے پر پڑے نقاب میں حرکت پیدا ہوئی۔

شیام دت جیسے پتھر کا ہو گیا۔

"ہاتھ پیچھے کرو شیام دت!" میں نے دروازے کی آڑ سے اس کے پیچھے آ کر کہا۔

شیام دت مڑنا چاہتا تھا کہ جوگیندر نے اسے مخاطب کیا۔ "تم اپنی جگہ سے ہلو گے بھی نہیں!"

ذرا سی دیر میں ہم اسے بے بس کر کے باندھ چکے تھے اور پھر بغلی کمرے میں لے جا کر اس کے پیر بھی باندھ دیے تھے۔

نو بجے تک ہم چھے دلالوں کا اسی طرح "استقبال" کر چکے تھے۔ ایک مرتبہ ذرا سی پریشانی ہوئی تھی کیوں کہ ماوا لنگر اور چونی لال خلاف توقع ایک ساتھ ہی آئے تھے مگر وہ پریشانی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ ہم نے اس امکان پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ دو مہمان ایک ساتھ بھی آ سکتے ہیں۔ بہرحال' ان دونوں کو بھی ہم نے سنبھال لیا۔ دراصل نقاب

اور پستول کے ساتھ ایک آدمی کھڑا ہو اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص ہو جس کا ضمیر بھی مجرم ہو تو اس کی آدھی جان تو ویسے ہی نکل جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ جب وہ دوسروں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوتا ہے تو دوسرا اس سے رحم کا سلوک کیوں کرنے لگا!

آج بھی اس رات کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک ٹھنڈی سی لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ ہم تینوں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ ہماری واپسی کسی بھی صورت اب ممکن نہیں رہی تھی۔

اگر ہم اس رات ان تمام اسیروں میں سے ایک کو بھی زندہ چھوڑ دیتے تو اپنے لیے نت نئی مصیبتیں مول لے لیتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو زندہ چھوڑنا خود اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ سو ہم نے ان کے لیے سرسری عدالت قائم کی۔ جوگیندر اس عدالت کا صدر تھا۔ آج میں سوچتا ہوں تو یہ حرکت بچوں کی سی معلوم ہوتی ہے مگر اس وقت شاید ہم نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا۔

آدمی بھی کیا شے ہے! خود کو مطمئن کرنے کے لیے کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے مگر وہ جو ضمیر ہوتا ہے' اس میں ایک پھانس سی کھس جاتی ہے اور کھٹکتی رہتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے' اس نے جو کچھ کیا وہ محض اداکاری تھی' ایک جھوٹ تھا۔ جھوٹ نے انسان کو کبھی اطمینان بخشا ہے! وہ خلش جو آج بھی میرے دل میں ہے' یہ ہے کہ اس وقت اپنے اقدام کو درست ثابت کرنے کے لیے ہم نے عدالت اور انصاف کا مذاق اڑایا تھا۔ ہم اس کے بغیر بھی وہی سب کچھ کر سکتے تھے۔ وہ چھے بدکر' رحمان اور اس کے ساتھی سب اس قوم کے مجرم اور غدار تھے جو غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتارنے کے لیے مصروفِ جدّوجہد تھے۔ ان کے اعمال نامے ہمارے سامنے تھے۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارنا اس لیے ضروری تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سیکڑوں بے گناہ افراد مارے جاتے۔ یہ موذی اور آدم خور درندے تھے۔ انہیں ہم عدالت کا سوانگ رچائے بغیر بھی اسی انجام کو پہنچا سکتے تھے جو ہم نے ان کے لیے طے کر لیا تھا۔

بہرحال عدالت لگی۔ ان کے خلاف ثبوت کے طور پر وہ کالی ڈائری پیش کی گئی جو رحمان لکھا کرتا تھا۔ وہ کاغذات پیش کیے گئے جو رحمان کے گھر سے ملے تھے۔ خصوصی اخراجات کے فنڈ کے وہ گوشوارے پیش کیے گئے جو ایک فائل میں موجود تھے۔ آخری اور ٹھوس ثبوت کے طور پر اس اجلاس کا دعوت نامہ پیش کیا گیا جس میں شرکت کے لیے وہ سب یہاں جمع ہوئے تھے پھر شیام دت کا وہ خط پیش کیا گیا جو میری لاش کے ساتھ پایا جاتا تھا۔

وہ چھے تھے اور عدالت کے کمرے کی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں پیروں کو ٹخنوں کے پاس باندھ دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ حرکت نہ کر سکیں۔ ان کے منہ پٹیوں سے باندھے گئے تھے کہ بول نہ سکیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے' التجا تھی کہ ہم انہیں چھوڑ دیں مگر اب ان کا چھوڑنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔

جوگیندر نے ان سب کو سزائے موت سنا دی۔ جونی لال اور ماوا لنگر کے سوا باقی کو اسی وقت موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا پھر اس نے رحمان کی موت کا حکم بھی سنایا۔ رحمان اور اس کے ساتھیوں پر علیحدہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔ جس وقت رحمان پر مقدمہ چلا' اسے بھی عدالت کے کمرے میں لایا گیا۔ اسے بھی دوسروں کی طرح دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ رحمان کے چوتھے ساتھی' یعنی ڈرائیور پر اس کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا اور اس کی گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ رحمان کے دونوں ساتھیوں کو بھی عدالت برخاست ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا گیا۔ رحمان کی موت چھے دن کے لیے موخر کر دی گئی کیونکہ سزائے موت پانے والے مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فرض بھی انجام دینا تھا۔

وقت کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی! یہ سب لوگ اسی کمرے میں بیٹھ کر مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کے منصوبوں کے تاروپود تیار کرتے تھے' یہاں بیٹھ کر انسانوں کو انسانوں سے لڑوانے کی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ آج کمرا ان کے لیے عدالت کا کمرا بن گیا تھا۔

عدالت برخاست ہوئی تو وہ ساتوں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ بار بار زمین پر اپنا سر رکھ رہے تھے مگر ہمیں ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ قاتلوں سے کیسی ہمدردی! فیصلہ سنانے کے بعد میں نے جوگیندر کا چہرہ دیکھا جو زرد پڑا ہوا تھا۔ اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ خود میری قمیص کے کالر کے نیچے بھی پسینے کی لکیریں سرسرا رہی تھیں۔ میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی سے پسینے کو صاف کیا تھا۔ بخت خان کی آنکھوں سے زندگی کی ساری چمک جیسے ختم ہو گئی تھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے قریب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جو جج صاحبان' مجرموں کو سزائے موت سناتے ہوں گے کتنے باحوصلہ ہوتے ہوں گے! انہیں کس قدر کرب سے گزرنا پڑتا ہوگا۔ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کو موت کی سزا سنانا بہت ہمت کی بات ہے۔

بڑی دیر تک موت کا سا سناٹا طاری رہا۔ ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ بات کرتا۔ بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ساتوں ہمارے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے بندھے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ شاید برخاست ہو جانے والی عدالت کے طریقۂ کار پر احتجاج کر رہے تھے۔ رحم کی اپیل کر رہے تھے مگر اس وقت ہم انصاف کے کرتا دھرتا بنے رہے۔ ہم نے اپنے کان ہر فریاد کے لیے بند کر لیے تھے' شاید اس خوف سے کہ ہم انہیں چھوڑ دیتے تو ہماری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

"اب کیا کیا جائے؟" کافی دیر کے بعد جوگیندر نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اب سزائے موت پر عمل درآمد کیا جائے اور کیا!" میں بولا۔ "بخت خاں اوپر سے سائنائڈ زہر کی شیشی اور ڈراپر لے آؤ!"

بخت خان منہ سے کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ یوں جیسے وہ اس اعصاب شکن ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا ہو۔

"تم کچھ خاموش ہو جوگیندر!" میں نے اپنے دوست کو مخاطب کیا۔ "کیوں؟"

"تم بھی تو خاموش ہو شاہین!" جوگیندر کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے کی تازگی اور لہجے کی شگفتگی دم توڑ گئی تھی۔

"ہاں میں بھی خاموش ہوں۔" میں نے کہا۔ "شاید تمہاری طرح میں بھی اس ماحول کی سنگینی سے متاثر ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے جوگیندر کہ کل جب میں زیبی کے عقوبت خانے میں اذیت سے گزر رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا' صرف بیس بائیس گھنٹے بعد بازی اس طرح پلٹ جائے گی۔ کل میں نے ان میں سے کسی کو جو میری زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے' اس طرح پریشان و افسردہ نہیں دیکھا تھا کیوں جوگیندر' آخر انسان اس قدر بے حس ہو جاتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا تھا مگر وہ کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ "ذرا سوچو جوگیندر! یہی لوگ کتنے ٹھنڈے دل سے انسانوں کو مروانے کے منصوبے بناتے ہیں یا یوں کہہ لو کہ بناتے تھے۔ کبھی ان کے دل میں انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ

نہیں جاگا میرے دوست! یہ لوگ وہ موذی جانور ہیں کہ اگر تم ان پر اس وقت ذرا سی گرفت ڈھیلی کر دو گے تو یہ پلٹ کر تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان کی موت پر افسردہ ہوا جائے۔ ان کی موت ہمارے لیے باعث تاسف نہیں ہونا چاہیے۔

"دلائل اور منطق کے اعتبار سے تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہین!" جوگیندر بولا۔ "حقائق کا تقاضا بھی یہی ہے مگر میں نے انسان کو ہمیشہ انسان سمجھا ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں کر سکتا تھا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ یہ لوگ ننگ انسانیت ہیں۔ ان پر رحم کرنا' ان کی موت پر افسردہ ہونا انسان اور انسانیت سے دشمنی ہے۔" وہ جھرجھری لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیسے اپنے ان تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا ہو جو اسے افسردہ کیے ہوئے تھے۔ "ہمیں جلدی کرنا چاہیے' ابھی بہت کام ہے۔"

بخت خاں سائنائڈ کی شیشی اور ڈراپر لے کر آنے کے بعد احتیاط سے میز پر رکھ چکا تھا۔ میں نے ڈراپر میں سائنائڈ بھرا۔ ڈراپر میں تقریباً پچاس قطرے آ چکے تھے۔ یہ زہری قطرے کے حساب سے پچاس آدمیوں کے لیے ہلاکت کا پیغام بن سکتا تھا اور ہمیں صرف سات افراد کو موت کی سزا دینا تھی۔

سب سے پہلے شیام دت کو اٹھایا گیا۔ یہ وہی تھا جس نے میری موت کا سودا زیبی اور پھر رحمان سے کیا تھا۔ وہ بری طرح مچلا مگر اس کی ہر کوشش بے سود تھی۔ میں اور بخت خاں اسے سزائے موت پانے والے دوسرے مجرموں سے علیحدہ لے آئے۔ وہ فرش پر پڑا بری طرح مچل رہا تھا۔ باقی چھے مجرم سمٹ سمٹا کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ سخت ابتلا اور خوف کے وقت انسان اسی طرح ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

میں نے رحمان سے کہا۔ "رحمان! تم نے رات کو مجھ سے کہا تھا کہ تم صرف جلاد کے فرائض انجام دے رہے ہو۔ تمہیں میری جان لینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب بھی تمہیں یہ کام کرنا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجرم بدل گئے ہیں۔ کل تمہیں صرف ایک مجرم کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا' آج چھے مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارو گے۔ کل تم انگریز کی خواہش پر مجھے قتل کرنے کے لیے تیار تھے' آج تمہیں ہماری عدالت کے فیصلے پر عمل کرنا ہے۔ تمہارے لیے اس وقت ہمارا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تمہیں یاد رکھنا

چاہیے کہ چھے دن کی مہلت تمہیں صرف اس لیے دی گئی ہے کہ ان مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے اگر تم نے اس فرض کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو یاد رکھو تمہیں ایسی ہولناک سزا دی جائے گی کہ تمہارے بزرگوں کی روحیں بھی تڑپ اٹھیں گی۔ ان چھے دنوں میں تمہیں ایسی اذیت سے گزرنا پڑے گا کہ تم موت کی خواہش کرتے رہو گے مگر موت تم سے دور کھڑی مسکراتی رہے گی۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنا کام نفاست اور مہارت سے کرو۔ یہ رہا ڈراپر!" میں نے میز پر رکھے ہوئے ڈراپر کی طرف اشارہ کیا۔ "ہر ایک کے نتھنوں میں ایک ایک قطرہ ٹپکا دو۔ تم ہر کام سکون سے کرنا چاہتے ہو اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ان کے منہ اسی طرح بندھے رہنے دو ورنہ منہ کھولا تو یہ اسی طرح ممیائیں گے جیسے بکرا قصاب کی چھری کو دیکھ کر ممیاتا ہے۔"

باقی چھے مجرم پھر کسمسائے تھے۔ شیام دت بری طرح مچلے جا رہا تھا۔

"میں تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔" میں نے رحمان کو گھسیٹ کر ایک طرف کیا۔ "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ وہی کرو جو کہا گیا ہے۔" ڈراپر میز سے اٹھا کر میں، رحمان کی طرف پلٹا تو وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ "مجھے غصہ مت دلاؤ رحمان!" میں نے جھلا کر کہا۔ "یہ تھامو!" یہ کہہ کر میں نے سائنائڈ سے بھرا ہوا ڈراپر اسے دے دیا۔

اس دن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر جب انسان زندگی کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اس میں کتنی قوت آ جاتی ہے! کہتے ہیں کہ دیوانے آدمی میں سمجھدار انسان کے مقابلے میں دس گنا قوت ہوتی ہے۔ مایوسی کے عالم میں جب انسان جدوجہد کرتا ہے تو وہ بھی عالم دیوانگی میں ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اور بخت خاں نے مل کر شیام دت کو بے بس کر لیا۔ بخت خاں نے اسے ٹانگوں کی طرف سے پکڑا تھا اور میں اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا چہرہ سیدھا کیے ہوئے تھا پھر رحمان نے اس کے نتھنوں میں سائنائڈ کا ایک ایک قطرہ ٹپکا دیا۔

چند لمحوں میں وہ ساکت ہو گیا۔ میں اس کے سینے سے اتر آیا۔ اس وقت میرے جسم کے تمام مساموں سے جیسے پسینا پھوٹ بہا تھا۔ بخت خاں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ رحمان زمین پر ایک طرف بیٹھا کپکپا رہا تھا اور ڈراپر اس نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔

میں نے پلٹ کر باقی مجرموں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی اور چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ خوف کی وجہ سے شاید ان کے حلق بھی بند ہو کر رہ گئے تھے۔ جوگیندر مجھے اس وقت انسان نہیں، موسیائی ہوئی لاش معلوم ہو رہا تھا۔ خود میری حالت اس وقت عجیب ہو رہی تھی، دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا، جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ رحمان، شیام دت کی لاش کے پاس منجمد سا بیٹھا تھا۔

"اب باقی کام بھی جلدی کرو!" جوگیندر کے ہونٹ ہلے۔ اس کی آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہوئی "پھر اور بھی بہت سا کام ہے۔"

مجرموں میں پھر بے چینی دوڑ گئی۔ "آؤ بخت خاں!" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شیام دت کو مارنے کے بعد اب ہمارے لیے کوئی اور راہ ہی نہیں رہ گئی تھی۔ کاش میں ایسا نہ کرتا! میں سوچ رہا تھا۔

اس کے بعد قادر مٹھا، لالہ موتی چند اور طبیب جی بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

یہ وہ کمرا تھا جہاں ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے، بڑے پیمانے پر انسانوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے، اجلاس ہوتے تھے۔ آج کمرا ان لوگوں کے لیے قتل گاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہم اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل پر روشنی نہیں تھی، ٹارچ کی روشنی سے کام چلایا پھر رحمان کے ذریعے اس کے چپراسی اور دوسرے کارندے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ہم ان کی لاشوں کو بھی نیچے لے آئے تھے۔

اب ان لاشوں کو کلکتے کے مختلف علاقوں میں پھینکنے کا مرحلہ تھا مگر جوگیندر نے اس پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ جوگیندر نے اس دوران میں جب کہ بالائی منزل پر دو مجرموں کو سزائے موت دی جا رہی تھی، چاروں لاشیں اسٹور میں بند کر دی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ لاشیں شہر کے ایک مقام سے ملیں یا مختلف مقامات سے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ اگر یہ لاشیں اسی مکان سے برآمد ہوں تو زیادہ بہتر ہے کیوں رحمان غائب ہو گا تو پولیس اسی نتیجے پر پہنچے گی کہ رحمان ہی ان کا قاتل ہے یا پھر ان لوگوں کے قتل سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہم نے اسی لیے باقی دو لاشیں بھی اسی اسٹور میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا۔

ہمیں اب اس مکان کو چھوڑ دینا تھا۔ جوگیندر نے اپنی کار مکان کے عقبی حصے کے نکڑ سے قریب کھڑی کی تھی۔ میں نے مکان کا پچھلا دروازہ کھول کر گلی کا جائزہ لیا۔ گلی تاریک اور سنسان پڑی تھی۔ اسی وقت جوگیندر میرے پاس آیا اور

اس نے کہا کہ ان لوگوں کو گلی سے نہیں بلکہ اس کمرے سے کار میں منتقل کیا جائے جس کا دروازہ پہلو کی سڑک پر کھلتا تھا۔ تجویز معقول تھی ہم لوگ واپس آ گئے۔

جوگیندر نے کچھ سوچ کر ہی کار اس دروازے کے سامنے کھڑی کی تھی اور اس سے ان تینوں یعنی ماوا لنگر، چونی لال اور رحمان کو کار میں منتقل کرنا آسان تھا۔ میں نے سب سے پہلے وہ گٹھری کار میں رکھی جس میں رحمان کے مکان سے ملنے والے کاغذات اور ہنڈیوں کے عوض ملنے والی رقم موجود تھی۔ اس کے بعد ماوا لنگر اور رحمان کو کار میں منتقل کر دیا گیا۔ جوگیندر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اور بخت خاں اسی وقت چونی لال کو لے کر کمرے میں پہنچے تھے کہ مکان کے باہر ہمیں سرگرمی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا، تین چار آدمی دوسری منزل کے زینے پر موجود ہیں۔

میں نے چونی لال کو کندھے سے اتار کر بخت خاں سے کہا۔ "تم اسے لے کر کار میں جاؤ، میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے!"

میں تیزی سے دبے پاؤں باہر آیا اور باہر کی آوازوں پر کان لگا دیے۔

"یہ دیکھو استاد، تالا لگا ہے۔" یہ آشنا آواز استاد ڈیبی کے ایک گرگے مچھو کی تھی۔

ابھی یہ اپنی مدر کا بزپینڈ کہاں گیا ہے۔ استاد ڈیبی کی آواز ابھری۔ "ابھی ہم کار میں بیٹھتا ہے۔ تم لوگ نیچے کے لوگوں سے پتا کرو، رحمان کب آئیں گا؟ کہاں گیا ہے؟ ابھی ہم دیکھیں گا، بچ کے کہاں جائیں گا! اس کا تو ماں کا۔" استاد ڈیبی نے موٹی سی گالی دی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ دستک نچلی منزل کے دروازے پر ہوئی تھی۔ بخت خاں میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے چپکے سے کہا۔ "دروازہ کھولو اور پوچھو کہ کون ہے؟ رحمان کے بارے میں پوچھا جائے تو کہنا۔ وہ صبح آئے گا بیلگچھیا گیا ہے۔"

میں پستول لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نہ معلوم کیا حادثہ پیش آنے والا تھا۔ بخت خاں نے دروازہ کھولا۔ "کہیے!"

"یہ رحمان صاحب اوپر رہتا ہے۔"

"ہاں اوپر رہتا ہے۔"

"معلوم ہے کب آئیں گا؟ تالا لگا پڑا ہے۔"

"رحمان صاحب، آج شام بیلگچھیا گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کل صبح آئیں گے۔ کسی کے انتقال میں گئے ہیں۔" بخت خاں نے جواب دیا۔

"رام رام۔" مچھو بولا۔ "بڑا سوری ہوا سن کر۔"

"آپ کا نام؟" بخت خاں نے پوچھا۔ "میں انہیں بتا دوں گا۔ کوئی پیغام؟"

"نہیں تھینک یو، ہم صبح مل لیں گا۔" مچھو نے کہا۔ "ویسے رات کو تو نہیں آئیں گا؟"

"پتا نہیں، مجھ سے تو صبح ہی آنے کو بول گئے تھے۔"

"اچھا شکریہ! آپ کو تکلیف دیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" بخت خاں نے کہا۔

پھر مچھو کے دور ہوتے قدموں کی آواز ابھری۔ بخت خاں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں وہاں سے تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے جوگیندر کی کار میں آ بیٹھے۔

"کیا ہو گیا تھا؟ اتنی دیر کیسے ہو گئی تھی؟" جوگیندر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"استاد ڈیبی اپنے گرگوں کے ساتھ رحمان کی تلاش میں آیا تھا۔" اس نے بتایا۔

کار چل پڑی۔ جوگیندر خاموش ہو گیا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر استاد ڈیبی کو رحمان سے کیا کام پڑ گیا؟ مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ استاد ڈیبی کو رحمان کا کیسے پتا چلا؟ رحمان نے بتایا تھا کہ اس کی قیام گاہ سے صرف اس کے ٹھکے کے تین افراد واقف ہیں، ایک چپراسی، ایک ڈرائیور اور ایک وہ کارندہ جو سائنائڈ لایا تھا۔ اس وقت ان میں سے دو، لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ڈرائیور رات بارہ بجے ڈلہوزی اسکوائر میں ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ استاد ڈیبی اس ڈرائیور کے ذریعے یقیناً اس مکان تک نہیں پہنچا ہو گا کیوں کہ ڈرائیور تو ڈیبی کے عقوبت خانے میں گیا ہی نہیں تھا۔ اس وقت مجھے رحمان کے اس ساتھی کا خیال آیا جسے اس نے ڈیبی کے اڈے ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہی استاد ڈیبی کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ رحمان کے گھر پہنچنے کا دوسرا ذریعہ شیام دت تھا مگر میں نے یہ خیال بھی مسترد کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شیام دت سے مل بھی لیتا تو شیام دت اسے یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ رحمان یہاں رہتا ہے۔ رحمان کا بیان تھا کہ اس کے چھے بدکردوں میں سے ایک بھی اس کی قیام گاہ سے واقف نہیں پھر استاد ڈیبی کس طرح یہاں پہنچا؟ کس نے اسے رحمان کے گھر کا پتا بتایا؟ میں سوچتا رہا۔

کار تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ تینوں مجرم پچھلی اور اگلی نشستوں کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔ بخت خاں پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔

"سنو جوگیندر!" میں نے کہا۔ "کل رات جب تم

استاس ذیبی کے ٹھکانے پر میری تلاش میں پہنچے تھے تو وہاں تمہیں کوئی اور آدمی بھی ملا تھا؟"

"اور کون آدمی؟ وہاں چار آدمی تھے اور چاروں ہی بندھے ہوئے تھے۔ کیا سوچ رہے ہو تم؟" جوگیندر نے کہا۔

"سوچ رہا ہوں۔ استاد ذیبی' رحمان کے گھر کس ذریعے سے پہنچا ہو گا؟"

"ذیبی؟" جوگیندر بولا۔ "شاید ٹینی کے ذریعے۔ ہم بھی اسی کی وجہ سے یہاں پہنچے تھے۔ شاید ذیبی نے ٹینی کو کہیں پکڑ لیا ہو گا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دو چار دن تک اپنے گھر نہ جائے۔"

"یقیناً وہ ٹینی ہی کے ذریعے وہاں پہنچا ہو گا۔ میرا دل جوگیندر کی بات پر ٹھٹک رہا تھا۔

اسی وقت جوگیندر نے بتایا۔ "ایک کار بڑی دیر سے ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔" اس کی نظریں عقبی آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔

یہ سن کر میں چونک اٹھا اور مڑ کر سڑک کا جائزہ لیا۔ کافی فاصلے پر ایک کار کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں پھر بخت خاں نے بھی کار کے تعاقب کی تصدیق کر دی۔ وہ بھی اس کار کو خاصی دیر سے پیچھے آتے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟" جوگیندر بڑبڑایا۔

"اب کیا کرو گے؟" میں نے جوگیندر سے پوچھا۔

"دیکھتے جاؤ۔" جوگیندر نے یہ کہتے ہوئے کار کی رفتار بڑھا دی پھر تین چار موڑ تیزی سے کاٹے۔ دو موڑ تک وہ کار پیچھے لگی رہی۔ تیسرے موڑ پر کار موڑتے ہی جوگیندر نے کار کی رفتار انتہائی تیز کر دی پھر جب اس نے اگلا موڑ کاٹا تو تعاقب کرنے والی کار کی روشنیاں عقب میں نہیں تھیں مگر جوگیندر نے کار کی رفتار کم نہیں کی۔ وہ اب ہر قیمت پر تعاقب میں آنے والی کار سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔

اس وقت ہم شیام بازار جا رہے تھے۔ شیام بازار میں بھی سیٹھ موہن لال کی ایک کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی آراستہ و پیراستہ حالت میں ان دنوں کرائے کے لیے خالی تھی۔ اسے وہ صرف انگریز افسروں کو کرائے پر دیتے تھے کیوں کہ ان سے ایک تو کرایہ اچھا ملتا تھا' دوسرے انگریز کوٹھی کو بھی اچھی حالت میں رکھتے تھے۔ کوٹھی ہمارے پروگرام کے لیے بہت مفید رہے گی۔ کوٹھی میں ایک لمبا چوڑا تہ خانہ بھی تھا جہاں دو کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کوٹھی میں ایک گونگا چوکیدار بھی رہتا تھا جو کوٹھی کی نگہداشت کرتا تھا۔

"یار جوگیندر!" میں پھر بولا "اگر استاد ذیبی' ٹینی ہی کے ذریعے رحمان کے گھر پہنچا تھا تو شاید اس نے ٹینی سے یہ بھی معلوم کر لیا ہو کہ تم بھی رحمان کی تلاش میں تھے۔"

"ہو سکتا ہے۔" جوگیندر نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو استاد ذیبی دوبارہ تمہاری کوٹھی پر حملہ کر سکتا ہے۔" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

جوگیندر بے چین ہو گیا۔ "ہاں یہ ممکن ہے میں تمہیں چھوڑ کر سیدھا ٹالی گنج جاؤں گا۔" اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔

دس منٹ بعد ہم شیام بازار میں جوگیندر کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ بوڑھے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جوگیندر نے چوکیدار کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ "یہ میرے دوست ہیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔ ان کا خیال رکھنا!"

بوڑھے بابا نے جھک کر ہاتھوں سے اس طرح اشارے کیے جیسے جوگیندر کی بات سمجھ گیا ہو۔

"اچھا جاؤ' اب جا کر سو جاؤ!" جوگیندر' چوکیدار سے بولا۔ بوڑھا ہاتھوں سے کچھ اشارے کرنے لگا۔ "نہیں' نہیں اب تم جا کر سو جاؤ۔ ان لوگوں کو میں خود اندر لے جاؤں گا۔ اب کوئی کام نہیں ہے۔" جوگیندر نے جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر بابا کو دیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے دو چار قدم اس کی کوٹھری کی طرف لے گیا۔ "جاؤ اب تم سو جاؤ!"

بابا چلا گیا تو جوگیندر نے کوٹھی کا صدر دروازہ کھولا' سوئچ دبا کر لائٹ آن کی پھر ان تینوں مجرموں کو ہم نے یکے بعد دیگرے تہ خانے میں پہنچا دیا اور باہر آنے سے قبل ایک مرتبہ پھر ان کی بندشیں دیکھیں۔

"میرا خیال ہے شاہین کہ بخت خاں کو اب اس شہر میں نہیں رہنا چاہیے۔" جوگیندر نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "مجاہد اوّل کا نائب ہونے کی حیثیت سے تمہیں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ میرے خیال میں بخت خاں کو کل صبح تک اس شہر سے نکل جانا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟" بخت خاں نے وضاحت چاہی۔

"بات یہ ہے بخت خاں کہ اتنے اہم آدمیوں کی ہلاکت سے حکومت پاگل ہو جائے گی۔ بڑے پیمانے پر تفتیش ہو گی۔ اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آنا لازمی ہے کہ چھے نوکروں کے پاس ایک ہی حلیے کا شخص پہنچا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان چھے جگہوں پر کوئی ایسا آدمی بھی رہا ہو جو تمہیں شکل سے پہچان لے پھر پولیس کو تم تک پہنچنے میں دیر نہیں ہو گی۔" جوگیندر نے تفصیل کے ساتھ بخت خاں کو خطرے سے آگاہ کیا۔

"میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔" بخت خاں حسب توقع بولا۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں بخت خاں!" میں نے مداخلت کی۔ "جوگیندر ٹھیک کہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں سے دہلی چلے جاؤ! میں مجاہد اوّل کو اس سے آگاہ کر دوں گا۔ میں اور جوگیندر' ٹالی گنج جا رہے ہیں۔ راستے میں ہم تمہیں کولوٹولہ اتار دیں گے جہاں تم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں تمہارا سامان بھی ہے اور سنو! اخراجات کے لیے نوکروں سے حاصل شدہ مالِ غنیمت میں سے پانچ ہزار روپے تم لے جاؤ!"

بخت خاں کچھ نہ بولا۔ ہم تینوں کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہم نے بخت خاں کو کولوٹولہ میں اتار دیا۔ اگلے روز صبح اسے دہلی روانہ ہو جانا تھا۔ جوگیندر نے جو کچھ سوچا تھا میری دانست میں درست ہی تھا۔ واقعی اس بات کا امکان تھا کہ پولیس سراغ لگاتی ہوئی اس تک پہنچ جاتی۔

اب کار کا رخ ٹالی گنج کی طرف تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہ رات ہمارے لیے بہت اہم تھی۔ ہمیں آج رات ابھی دو اور کام نمٹانے تھے مگر ان سے پہلے جوگیندر کے گھر جا کر سیٹھ موہن لال کو خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ بات بعید از امکان نہیں تھی کہ ذیبی دوبارہ فاطمہ کو اغوا کر لیتا یا سیٹھ موہن لال اور جوگیندر میں سے کسی کو بھی اغوا کر کے لے جاتا۔

اس سڑک پر مڑتے ہی جو سیٹھ موہن لال کی کوٹھی کو جاتی تھی' جوگیندر نے کار کی روشنیاں بجھا دیں اور اسے ایک گلی میں موڑ لیا۔

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے اس کار میں جو ہمارے تعاقب میں تھی' ذیبی یا اس کے ساتھی رہے ہوں۔" جوگیندر نے جواب دیا "اگر ایسا ہی تھا تو وہ لوگ سیدھے کوٹھی ہی آئے ہوں گے اور آس پاس ہی یا تو منڈلا رہے ہوں گے یا پھر۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سڑک کے کنارے کنارے درختوں اور دیواروں کے سائے سائے ہم دونوں' سیٹھ موہن لال کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہمیں ایک کار نظر آئی۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی جہاں وہ کار لا کر کھڑی کی گئی تھی جس میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔

اس کار کا ہیولا میں نے ہی دیکھا تھا۔ میں نے جوگیندر کا ہاتھ دبایا اور ہم دونوں وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

پھر ہم دونوں تیزی سے پہلو والی سڑک پر مڑ گئے اور چکر کاٹ کر عقبی راستے سے گزرتے ہوئے اس کار کے پیچھے آ نکلے جسے دیکھ کر ہم دونوں ٹھٹکے تھے۔ میں اور جوگیندر دونوں ہی خاموش تھے۔ جوگیندر بھی میری طرح اندازہ لگا رہا ہو گا کہ وہ کار کس کی تھی۔ ہم دونوں پوری طرح چوکنا تھے اور نہایت آہستگی سے کار کی طرف بڑھ رہے تھے کہ عقب سے ایک آواز گونجی۔ "شاہین!"

یہ آواز میرے لیے غیر متوقع تھی۔ غالباً ہم دونوں ہی نے ایک ساتھ پلٹنا چاہا تھا۔

عین اسی لمحے پھر کہا گیا۔ "نا' نا! سیدھے چلتے رہو اور کار میں بیٹھ جاؤ!" یہ آواز مجاہد اوّل کی تھی۔

"جناب! آپ یہاں کیسے؟" میں نے سوال کیا پھر ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہیولا ہمارے پاس سے گزر کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے سر پر بھاری سی پگڑی تھی اور شانوں پر موٹی سی چادر پڑی تھی جس کی وجہ سے ہم اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"تمہارے ساتھ غالباً جوگیندر ہے؟" مجاہد اوّل کی آواز ابھری۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا "مگر میں حیران ہوں کہ آپ اچانک یہاں کیسے آ پہنچے! آپ تو۔"

"بعض تشویشناک اطلاعات کے سبب اور تمہاری حماقتوں کی وجہ سے۔" مجاہد اوّل نے جواب دیا۔

"مگر جناب' شاہین نے تو کوئی غلطی نہیں کی۔" اس مرتبہ جوگیندر میری حمایت میں بول اٹھا۔

"لاعلمی' بے عمل زندگی میں باعثِ رحمت ہو سکتی ہے لیکن عملی زندگی میں موت کے فرمان کے سوا کچھ نہیں! شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی جوگیندر کہ تمہارے دوست کا نام' ہندوستان بھر کی پولیس میں خطرناک اور مطلوبہ شخص کی حیثیت سے گشت کرانے کی تجویز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شاہین کے لیے ایسے خطرات پیدا نہیں ہو سکتے تھے لیکن نادانی کی بنا پر ایسے خطرات پیدا کرنا دانش مندی نہیں ہے۔ بہرحال شاہین! میں بڑی دیر سے تمہارا منتظر تھا' اب مجھے رپورٹ دو' مکمل رپورٹ!" کار چلتی رہی۔

کلکتہ شہر میں قدم رکھنے کے بعد مجھے جو واقعات پیش آئے تھے میں تفصیل کے ساتھ مجاہد اوّل کو بتانے لگا۔ خاص طور پر میں نے رحمان چارلس سے حاصل ہونے والی معلومات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیں۔ اس دوران

مجاہد اوّل نے چند سوالات بھی کیے اور وضاحتیں بھی طلب کیں۔

جب میں سب کچھ بتا چکا تو کار میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر مجاہد اوّل نے مجھ سے دریافت کیا۔ "اب تم اپنے تینوں قیدیوں کا کیا کرو گے؟"

"رحمان چارلس ایک ایسا شخص ہے جس سے ابھی بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" میں بولا۔ "ماوا لنگر کو اس لیے زندہ رکھا گیا ہے کہ اس کے قبضے سے اس ہندو لڑکی کو رہا کرایا جا سکے جسے اس نے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ چونی لال اس لیے زندہ ہے کہ اس سے تنظیم کے لیے وہ سونا حاصل کیا جا سکے جو اس نے جمع کر رکھا ہے۔"

"ہوں" مجاہد اوّل نے ہنکارا بھرا پھر مجاہد اوّل نے ہدایت دی کہ اب ان تینوں مجرموں کو ہمیں اس کے حوالے کر دینا ہو گا۔ ان سے متعلق باقی کام کی ذمے داری اب مجاہد اوّل نے خود اپنے ذمے لے لی تھی۔ جب اس کے استفسار پر میں نے بخت خاں کے بارے میں بتایا تو اس نے میرے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم بخت خاں کو کوٹوٹلہ سے شیام بازار والی کوٹھی میں صبح ہونے سے پہلے منتقل کر دیں، اسی کوٹھی میں جہاں تینوں مجرموں کو رکھا گیا ہے۔

ان ہدایات کے بعد گفتگو کا موضوع ہندو مسلم آویزش کو ہوا دینے کے لیے انگریز کی سازش پر آگیا۔ مجاہد اوّل نے بتایا تھا کہ انگریز کی یہ پالیسی ہمیشہ سے رہی ہے لیکن اب سیاسی سطح پر کانگریس، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ میں جو اتحاد پیدا ہو گیا ہے، وہ واقعی انگریز کے لیے خطرہ ہے۔ اس کا توڑ اسے کرنا ہی ہے۔ ہندوستان جیسی بڑی منڈی کو انگریز آسانی سے تو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا، سو اس مرتبہ اس نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دینے کے لیے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے کی ٹھانی ہے۔ انگریز کی یہ سازش زیادہ خطرناک ہے۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ انگریز اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہندوستان کے اہم لیڈروں کو قتل کرا دے اور پھر—"

"نہیں۔" مجاہد اوّل نے میری بات کاٹ دی۔ "اس وقت ایسا براہِ راست اقدام انگریز مناسب نہیں سمجھے گا۔ اس وقت مولانا جوہر کی کوششوں سے اتحاد کی جو نوعیت بنی ہے، اس میں ایسے اقدامات سے تمام ہندوستان، انگریزوں کے خلاف اور بھی متحد ہو جائے گا۔ وہ پہلے اس اتحاد کو شکوک و شبہات پیدا کر کے کمزور کرنا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ اتحاد ختم ہوا تو ہندو، مسلم ایک دوسرے سے بہت دور اور ایک دوسرے کے حریف بنے کھڑے ہوں گے پھر انگریز ان دونوں کو آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو منتشر کر دے گا۔"

اس وقت کار ڈلہوزی اسکوائر کے قریب پہنچ چکی تھی۔

مجاہد اوّل نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "شاہین! آس پاس دیکھو۔ رحمان کا ڈرائیور یہیں کہیں کار لیے کھڑا ہو گا۔ پونے بارہ ہو رہے ہیں۔"

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجاہد اوّل حالات و واقعات کے ہر پہلو پر کتنی کڑی نظر رکھتا ہے۔

"رحمان کے مکان پر ہونے والے واقعات سے لے کر اب تک میں رحمان کے ڈرائیور کو بھولا ہوا تھا۔ رحمان نے بتایا تھا کہ ڈرائیور کو کار لیے ہوئے رات بارہ بجے یہیں ملنا ہے۔ اگر رحمان اسے وہاں نہ ملتا تو وہ اس کے گھر پہنچتا اور ہماری کارگزاری وقت سے پہلے ہی طشت از بام ہو جاتی۔ شاید ہم وہ دونوں کام بھی نہ کر پاتے جن کے لیے ہم نے لال اور ماوا لنگر کو زندہ رکھا تھا۔ یہی دو کام تھے جو ہمیں سب سے پہلے نمٹانا تھے۔

"آپ کو بہت یاد رہا جناب!" جوگیندر بولا۔ "ڈرائیور کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔"

"اس میں تم لوگوں کی عمر اور جذباتیت کو زیادہ دخل ہے۔ تم لوگ ذرا سی کامیابی پر خوشی سے دیوانے ہو جاتے ہو اور ذرا سی ناکامی پر مایوس۔ دونوں ہی صورتوں میں تم بعض اہم باتوں کو بھول جاتے ہو۔ ناتجربہ کاری اسی کو کہتے ہیں۔" مجاہد اوّل نے کہا۔

ڈاک خانے کی عمارت کے صدر دروازے کے قریب مجھے رحمان چارلس کی کار اور اس کے پاس کھڑا ہوا ڈرائیور نظر آگیا۔ میں نے جب مجاہد اوّل کو بتایا تو اس نے کار روک دی پھر ہم دونوں سے گھر واپس جانے کو کہا۔

"آپ سے ایک درخواست ہے جناب!" جوگیندر بولا۔

"کہو!"

"پہلے آپ وعدہ کیجیے کہ میری درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں۔"

مجاہد اوّل ہنسا۔ یہ ہنسی عجیب سی تھی۔ "چلو تمہاری کارکردگی کے انعام کی خوشی میں وعدہ!"

"جناب! میری درخواست ہے کہ آپ مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔ پتاجی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"ایسی ملاقات کا کیا فائدہ کہ میزبان اپنے مہمان کا چہرہ ہی نہ دیکھ سکے۔"

اس وقت مجھے جوگیندر کی شخصیت پر رشک آیا۔ وہ واقعی گفتگو کرنے کا ماہر تھا پھر جرأت مند بھی۔ میرا خیال تھا کہ تنظیم کے کسی فرد نے مجاہد اوّل سے اس نوعیت کی درخواست کبھی نہ کی ہو گی۔ خود مجاہد اوّل کی گفتگو سے بھی یہ بات عیاں تھی مگر وہ کیوں کہ وعدہ کر چکا تھا اس لیے اب اس سے پھرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے جوگیندر!" مجاہد اوّل نے چند جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔ "میں کسی بھی رات ایک اور دو بجے کے درمیان تمہاری کوٹھی کے عقبی حصے سے خاموشی کے ساتھ داخل ہو کر تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہوں گا۔"

اور اسی رات پونے دو بجے مجاہد اوّل، جوگیندر کے گھر موجود تھا۔ ہم اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ملازمین سونے کے لیے جا چکے تھے اچانک کھڑکی پر ہلکی سی دستک ہوئی، ساتھ سرگوشی ابھری۔ مجاہد اوّل نے جوگیندر کا نام لیا تھا۔

اس وقت مجاہد اوّل کی آمد غیر متوقع تھی۔ ہمارے خواب و خیال میں نہیں تھا کہ مجاہد اوّل اپنا وعدہ پورا کرنے اسی رات پہنچ جائے گا۔

ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ صرف ایک بلب روشن تھا جس کی ہلکی سی روشنی ڈرائنگ روم میں آرہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا ہونے کے بعد مجاہد اوّل ایک سایہ بنا وہاں آیا۔ اس کا تمام جسم ایک سیاہ چغے میں چھپا ہوا تھا، چہرے پر حسبِ معمول نقاب تھی۔ وہ اندر آتے ہی دروازے کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آداب موہن لال!" مجاہد اوّل نے کہا۔

"آداب!" سیٹھ موہن لال نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی فاطمہ نے مجاہد اوّل کو سلام کیا۔

سیٹھ موہن لال کے کہنے پر مجاہد اوّل نے آزادی، جدوجہد آزادی اور ہندوستان میں قومی اتحاد پر اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا۔

"مگر آپ نے اپنے لیے جو راہ منتخب کی ہے، اسے دیکھتے ہوئے آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" فاطمہ نے مجاہد اوّل سے کہا۔

"میں اپنے دوستوں میں آیا ہوں۔" مجاہد اوّل بولا۔ "میں تم سب سے اچھی طرح واقف ہوں جس طرح گوشت ناخن سے۔ پھر سیٹھ موہن لال تو وہ شخص ہے جس کی حب الوطنی کا گواہ سیٹھ صدیق جیسا شخص ہے۔ سیٹھ صدیق کے توسط سے تمہارے پتاجی نے ہماری تنظیم کی کتنی مدد کی ہے، مجھی کو معلوم ہے۔ تنظیم کے مالی اخراجات جو چند صاحب

حیثیت لوگ اٹھاتے ہیں' ان میں تمہارے پتا کا بھی نام شامل ہے۔"

"سیٹھ صدیق مجھ سے زیادہ عظیم اور دیالو (سخی) شخص ہے۔ وہ دیوتا ہے دیوتا! جو اس سے مانگو' اس کے پاس ہو تو ضرور مل جاتا ہے۔ انکار کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں۔"

"اور سیٹھ صدیق تمہارے پتا جی کی دریا دلی کا معترف ہے۔ ایسے لوگوں کے گھر آنا میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔" مجاہد اوّل کہنے لگا۔ "ہاں سیٹھ موہن لال! میں یہاں ایک اور مقصد سے بھی آیا ہوں کہ تمہارے بیٹے اور بیٹی کے سلسلے میں تمہیں مبارکباد دے سکوں کہ یہ دونوں تنظیم کے رکن بن چکے ہیں۔ میرا اپنا بیٹا بھی اس تنظیم کا رکن ہے۔ وہ بھی اس وقت اپنے گھر سے دور اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور میں مطمئن ہوں۔"

"مجھے اپنی بیٹی اور بیٹے کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ ان دونوں نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا اور میں نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔" سیٹھ موہن لال نے بتایا۔ "میرا دھن دولت اور اولاد' سب کچھ ہندوستان کی آزادی کے لیے وقف ہے۔ جوگیندر اور فاطمہ بھی میرا دھن دولت ہیں' میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں انہیں بھی اپنی طرف سے وقف کرتا ہوں۔"

"تم واقعی عظیم ہو سیٹھ موہن لال!" مجاہد اوّل کی آواز میں ارتعاش تھا "اب تنظیم نے جوگیندر اور فاطمہ کے ماں باپ کی جگہ لے لی ہے۔ تنظیم کے احکام اب ان دونوں کے لیے تمہارے احکام سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔"

"آپ یقین رکھیں مجاہد اوّل! میں بھی اس معاملے میں اپنی اولاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔" سیٹھ موہن لال کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

"سیٹھ موہن لال! تمہارے گھرانے کو دو اعزاز حاصل ہیں۔ پہلا اعزاز یہ کہ تمہاری بیٹی آزادی ہند کے لیے جدوجہد کرنے والی اس تنظیم کی پہلی مجاہدہ ہے۔ دوسرا اعزاز یہ کہ تمہارا گھرانا ہندوستان کا پہلا گھرانا ہے جس کا ہر فرد اس تنظیم میں کسی نہ کسی طرح شامل ہے۔ میں اس گھرانے کو تنظیم کی طرف سے سلام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے تنظیمی انداز میں ہاتھ اٹھایا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" سیٹھ موہن لال نے اظہار لجاجت کیا۔

"سیٹھ موہن لال! ہو سکتا ہے تم ذہنی کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہے ہو۔ آج صبح تک اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ تنظیم ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتی ہے۔ ہاں جوگیندر' ایک بات اور یاد آئی۔" مجاہد اوّل بولا۔ "احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تمہارے تنظیمی ساتھی بھی تمہاری اصل شخصیت اور نام سے واقف نہ ہوں۔ فاطمہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ لوگ اسے سیتا کی حیثیت ہی سے اب تک جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کا تنظیمی نام بھی یہی بہتر ہے۔ ہاں تمہارا تنظیمی نام آج سے منور ہے۔ شاہین! آج کے بعد تم بھی جوگیندر کو منور ہی کہو گے۔"

اس کے بعد فاطمہ چائے بنا لائی۔ چائے پینے کے بعد دو تین منٹ تک اور گفتگو رہی پھر مجاہد اوّل جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔ ابھی ہمیں ایک اور کام کرنا تھا۔ مجاہد اوّل کے حکم کے مطابق بخت خاں کو کولو ٹولہ سے شیام بازار والی کوٹھی میں پہنچانا تھا اور مجاہد اوّل کا یہ پیغام دینا تھا کہ ابھی وہ اسی شہر میں رہے گا۔ غالباً مجاہد اوّل اس سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ کوٹھی کی چابیاں جوگیندر پہلے ہی ڈلہوزی اسکوائر میں مجاہد اوّل کے حوالے کر چکا تھا۔ مجاہد اوّل نے کہا تھا کہ جب ہم بخت خاں کو وہاں لے کر پہنچیں گے تو چابیاں ہمیں تالے ہی میں مل جائیں گی۔

مجاہد اوّل چلا گیا تو میں اور جوگیندر اس کام کی تکمیل کے لیے نکلے اور جب واپس ٹالی گنج پہنچے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔

میں جب بستر پر دراز ہوا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ سیٹھ صدیق کا ایک ملازم آ گیا۔ وہ میرے اور جوگیندر کے لیے پیغام لایا تھا۔ سیٹھ صدیق نے ہمیں اپنی کوٹھی پر بلایا تھا۔ کام کی نوعیت کیا تھی' اس سلسلے میں ملازم کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ البتہ ملازم نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا۔ "آپ جو خط لائے تھے' اس کا جواب لکھ لیا ہے۔ صاحب وہ جواب آپ کو دینا چاہتے ہیں۔"

میں اشارہ سمجھ گیا' معاملہ تنظیم ہی سے متعلق تھا۔ ہم دونوں فوراً پارک سرکس روانہ ہو گئے جہاں سیٹھ صدیق کی کوٹھی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے جس سازش کا علم ہمیں رحمان چارلس کے توسط سے ہوا تھا' تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سازش کو پھلنے پھولنے اور پنپنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔ یہ سازش ایک ایسی بھڑکتی ہوئی آگ کے مانند تھی کہ شروع ہو جاتی تو پورا ہندوستان اس میں بھسم ہو جاتا۔

اس آگ کو جو انگریز بھڑکانا چاہتا تھا' ہندو اور مسلمان لیڈر ہی اپنی فہم و فراست سے روک سکتے تھے۔ کانگریس' خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ اس وقت کسی نہ کسی طور پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس اتحاد کو زیادہ مستحکم کیا جاتا' اس کے خلاف ہونے والی سازش سے ہندوستان کے سرکردہ لیڈروں کو آگاہ کر دیا جاتا اور اس کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ کلکتے میں اس وقت ہندوستان کے دو بڑے لیڈر موجود تھے' گاندھی جی اور قائد اعظم محمد علی جناح! دو روز کے بعد کلکتے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ قائد اعظمؒ اسی سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام ایسٹرن ہوٹل میں تھا۔ سیٹھ صدیق نے قائد اعظمؒ سے ہمارے لیے ملاقات کا وقت لے لیا تھا۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ میں اس شخصیت سے ملنے جا رہا تھا جس کا احترام پہلے ہی سے میرے دل میں تھا۔ علی گڑھ کے دوران قیام ہی میں قائد اعظمؒ کی شخصیت سے میں متاثر ہو چکا تھا۔ گاندھی جی ابھی تک کلکتے سے واپس نہیں گئے تھے۔ ان کا ارادہ مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد شہر سے جانے کا تھا۔ سیٹھ صدیق نے مجھ سے کہا تھا کہ پہلے تم لوگ محمد علی جناح سے مل لو پھر گاندھی جی سے تمہاری ملاقات کا بندوبست کروں گا۔

اس روز ہم اسی مہم کے پہلے مرحلے کے طور پر ایسٹرن ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھے جہاں محمد علی جناح ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان دنوں قائد اعظمؒ ہندو مسلم اتحاد کو عملی شکل دینے کے لیے سب سے زیادہ فعال نظر آتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے ایسی مثبت کوششیں کی تھیں کہ انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جانے لگا تھا۔

قائد اعظمؒ ہم سے نہایت شفقت اور محبت سے ملے۔ اس کا سبب مجھے کچھ ہی دیر میں معلوم ہو گیا۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو وہ آپ ہیں' شعلہ نفس نوجوان جس نے بدیسی کپڑوں کی ہولی کے موقعے پر گاندھی جی کی بے معنی سیاست پر نکتہ چینی کی تھی' خوب!"

قائد اعظمؒ اس وقت گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس' عزم و استقلال کا پیکر نظر آ رہے تھے۔ ابتدائی چند ہی لمحوں میں ان کی دل آویز شخصیت کا سحر مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ میں خود کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا کہ مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ یہی احساسات تقریباً اس وقت تھے جب میں پہلی مرتبہ لاہور میں علامہ اقبالؒ سے ملا تھا۔

اس کے بعد میں نے اور جوگیندر نے مل جل کر انگریزوں کی سازش کے بارے میں قائد اعظمؒ کو آگاہ کیا' انہیں بتایا کہ کس طرح ہندوستان کے باشندوں کو انگریز نے آپس میں لڑانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے لیے میں نے قائد اعظمؒ کو دھرم تلہ گراؤنڈ میں اپنی تقریر کے بعد فاطمہ کے اغوا پھر اپنے اوپر بیتی داستان اور رہائی معمولی رد و بدل کے ساتھ سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ انگریز کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے کریں۔

قائد اعظمؒ یہ باتیں سن کر کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنی تیز نگاہ میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا "نوجوان! تم نے جو کہانی سنائی ہے' اس میں بہت سے جھول ہیں۔ تمہاری یہ کہانی جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود تمہارا لہجہ تمہارے جذبات کی صداقت کا مظہر ہے۔ تم نے جو کچھ کہا ہے' خلوص اور نیک نیتی سے کہا ہے۔ تمہارا مقصد بھی وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے' یعنی تم بس یہی چاہتے ہو کہ ہندوستان کے سرکردہ لیڈر کسی طرح انگریز کی اس سازش کا سدباب کریں مگر تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟"

"اس لیے جناب کہ اگر اس وقت یہ اتحاد ختم ہو گیا تو یہ ملک برادر کشی کے ایک بہت بڑے مقتل میں تبدیل ہو جائے گا پھر اس ملک کی آزادی اور بھی دور ہو جائے گی۔"

"تم بہت جذباتی بھی ہو اور جوشیلے بھی!" قائد اعظمؒ بولے "سیاست اجتماعی نفسیات کا کھیل ہے۔ اس وقت جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہے' اس سے پہلے بھی قائم تھا مگر وہ اتحاد بھی مصنوعی اور عارضی تھا جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے اور موجودہ اتحاد کی صورت بھی یہی ہے۔ یہ تمام تر مصلحتوں کے تحت وجود میں آیا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کے لیے دوسرے کو احمق بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اتحاد بھی پہلے اتحاد کی طرح جلد یا بدیر ختم ہو جائے گا' خواہ اسے ختم کرنے کے لیے انگریز سازش کرے نہ کرے۔ یقین مانو نوجوان! آزادی کی منزل اب بھی اتنی ہی دور ہے جتنی سن چودہ یا سن اٹھارہ میں تھی۔"

"گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے کچھ نہیں کریں گے؟"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا نوجوان! اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا' ضرور کروں گا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب

کچھ بے سود ہو گی۔"

"بے سود!" جوگیندر حیرانی سے بولا۔

"ہاں بے سود" قائد اعظمؒ نے کہا "ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ تانگے میں جتے ہوئے اس گھوڑے کے مانند ہیں جو سواریوں کو ان کی مرضی کے مطابق لے کر جاتا ہے۔ یہاں بوجھ کھینچنے والے کو لیڈر کہا جاتا ہے۔ یہ لیڈر کسی بھی جذباتی مسئلے کو اٹھا کر عوام کو مشتعل کر سکتے ہیں مگر ان کی توانائیوں کو صحیح سمت پر موڑنے کی ہمت اور جرات نہیں رکھتے پھر مشتعل عوام کی مرضی کے مطابق یہ لوگ اپنی سیاست کرتے ہیں' وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔"

قائد اعظمؒ نے جو کچھ کہا تھا' صحیح کہا تھا۔ جوگیندر اس مرحلے پر کہنے لگا "مگر جناب' اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔"

"میں یہ کوشش کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کانگریس کے سابق صدر گوکھلے بھی کوشش کرتے ہوئے ختم ہو گئے۔ بہرحال نوجوان!" قائد اعظمؒ پھر مجھ سے مخاطب تھے "میں نے تمہارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہی تھیں۔ دھرم تلہ میدان میں بھڑکائے جانے والے الاؤ کے موقعے پر تم نے جو تقریر کی تھی' اس کی اکا دکا باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ آخر تم کس سمت میں جدوجہد کر رہے ہو؟"

"جناب! میں ایک ایسی تنظیم کا رکن ہوں جو انگریز حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد پر یقین رکھتی ہے۔ جو سیاست کے ذریعے نہیں' اسی طاقت کے ذریعے انگریز کو ہندوستان سے نکالنا چاہتی ہے جس کے بل بوتے اس نے ہندوستان کو غلام بنایا ہے۔ ہم خود کو ہندوستان کی سیاست کا بازوئے شمشیر زن قرار دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جب ہماری سرگرمیاں پورے عروج پر ہوں گی تو آپ کی سیاسی جدوجہد تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی لیڈر اصلاحات اور ہوم رول کی بھیک نہیں مانگ رہے ہوں گے' مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہوں گے۔"

جذبات کی شدت سے قائد اعظمؒ کا چہرہ سرخ ہو گیا "کاش ایسا ہو سکے۔ کاش ہندو مسلم اتحاد' خلوص اور دیانت کے ساتھ صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے قائم ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ ہندو اس دیس کے مسلمانوں کو غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ انگریز سے صرف اپنے لیے مراعات چاہتا ہے' مسلمانوں کو مراعات دینا نہیں چاہتا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ اسی لیے ہوئی' ہندو نے اس پر اسی لیے شور مچایا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچا تھا۔ اس طرز عمل سے ہندوؤں نے مسلمانوں کو خود سے بہت دور دھکیل دیا' وہ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے قومی تشخص کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب ہندوستان ایک قوم کا نہیں' دو قوموں کا وطن ہے اور دوسری قوم جو عددی اعتبار سے کم سہی اپنے لیے وہی مراعات طلب کر رہی ہے جو اکثریتی قوم اپنے لیے طلب کر رہی ہے۔"

"تو آپ ایک پائیدار ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہیں؟"

"مایوسی کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے مگر فی الحال یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے متصادم ہونے کی راہ پر جا رہی ہیں۔ موجودہ اتحاد محض ریت کی دیوار ہے' محض عقل کا التباس ہے" قائد اعظمؒ بڑی خوب صورت اور رواں انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے "یہ دونوں قومیں کسی مشترکہ مقصد کے لیے متحد نہیں ہوئیں۔ تحریک خلافت سے ہندوؤں کو کوئی سروکار نہیں۔ ان کے درمیان مستحکم اتحاد کے لیے کوئی ایک قومی مقصد نہیں" قائد اعظمؒ ایک لمحے کے لیے رکے۔ ان کی تیز آنکھیں خالی دیوار کو گھورتی رہیں "شاید تمہیں یاد ہو' میں نے آج سے کئی برس پہلے بمبئی میں انگریز حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ ہم ہندوستان کے لیے نیشنل آرمی کے خواہش مند ہیں' اس کے لیے کرائے کے تنخواہ دار فوجی فراہم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ ایک عظیم مطالبہ تھا' ایک عظیم مقصد تھا' ایک مشترکہ اور متحدہ مقصد تھا مگر میرے اس مطالبے کی حمایت میں کسی ہندو لیڈر نے ایک لفظ نہیں کہا حالانکہ میں نے مسلم آرمی کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا تھا' نیشنل آرمی کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اگر اس مطالبے کو پورے ہندوستان کا مطالبہ بنا دیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ نیشنل آرمی قائم ہو چکی ہوتی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز جنگ میں مصروف تھا۔ اسے ایسا کرنا ہی پڑتا اور پھر ہم مسلح جدوجہد کی طرف تیزی سے قدم بڑھا چکے ہوتے' آزادی کے قریب پہنچ گئے ہوتے۔ اب پھر ہم بیس پچیس برس پیچھے چلے گئے ہیں۔"

قائد اعظمؒ خاموش ہو گئے۔ کمرے میں سناٹا پھیل گیا۔ نیشنل آرمی کے مطالبے کی اہمیت اس دن میری سمجھ میں آئی۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ قائد اعظمؒ وہ سیاست داں ہیں جو اپنی سیاست کی حکمت عملی مستقبل سے مربوط کر کے بناتے ہیں۔

"کچھ بھی ہو جناب!" میں بولا "ہم نے بہت چھوٹے پیمانے پر مسلح جدوجہد کا پروگرام بنایا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا خیال کیے بغیر ہم اس راہ پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری جدوجہد رائیگاں ہرگز نہیں جائے گی۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں ہر طرح تم سے تعاون کے لیے تیار ہوں مگر اتنا سوچ لو کہ تم نے ایک غلط وقت پر اور غلط ملک میں اس راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں تمہیں اتاترک شاید ہی ملے اور اگر اتاترک مل گیا تو شاید ہی کوئی عصمت انونیا انور جمال پاشا مل سکے۔"

قائد اعظمؒ سے مل کر ہم واپس آئے تو دونوں ہی خاموش تھے۔

"کیا ہم غلط سمت میں سفر کر رہے ہیں؟" کافی دیر بعد جوگیندر نے کہا۔

"ہم ایک مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد ہمارے سامنے واضح ہے۔ ہمارا سفر اسی سمت ہے۔ ضروری نہیں کہ منزل پر پہنچنے والے ہم ہی ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم راہ میں مر کھپ جائیں اور ہمارے پیچھے آنے والے منزل پر پہنچیں۔ فتح حاصل کرنے والی فوج کا ہر سپاہی تو زندہ نہیں بچتا۔ زندہ رہنے والے اس لیے فتح مند ہوتے ہیں کہ مرنے والوں نے ان کی طرف بڑھنے والے وار کو اپنے اوپر روک لیا تھا" میں نے جواب میں کہا تھا۔

بہرحال قائد اعظمؒ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سرکردہ لیڈروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں اس نئی انگریزی سازش سے آگاہ کریں گے اور ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کو مثبت اور مشترکہ بنیادوں پر استوار کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں گے۔

اس دن شام کو میں اور جوگیندر ایک بار پھر پارکس سرکس میں سیٹھ صدیق کی کوٹھی پر موجود تھے۔ سیٹھ صدیق نے گاندھی جی اور چند لیڈروں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا اور صبح ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ گاندھی جی کو شام کے وقت ہی اپنی کوٹھی پر لے آئیں گے' وہ اس وقت ہماری ان سے ملاقات کرا دیں گے۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے' گاندھی جی ایک اور ہندو رہنما کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ برسوں گزر جانے کے بعد کافی سوچنے پر بھی مجھے یاد نہیں آ رہا کہ گاندھی جی کے ساتھ وہ ہندو لیڈر کون تھا مگر قیاس کہتا ہے کہ وہ جمنا داس دوار کا داس ہی تھے۔

گاندھی جی مجھ سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگایا "بڑے جیالے اور نڈر نوجوان ہو" انہوں نے کہا "مجھے تمہاری وہ تقریر پسند آئی تھی مگر ابھی وہ راہ اختیار کرنے کا وقت نہیں آیا جس کے تم خواہش مند ہو۔"

اس کے بعد میں نے اور جوگیندر نے گاندھی جی کو اپنی ملاقات کا مقصد بتایا اور انہیں انگریزی سازش سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی نے ہماری باتیں سنیں اور پھر آنکھیں بند کیے دھیان گیان میں مصروف ہو گئے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں' جوگیندر' سیٹھ صدیق اور جمنا داس سبھی منتظر تھے کہ دیکھیں اس مسئلے میں گاندھی جی کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد گاندھی جی کی تیز اور باریک سی آواز ابھری "جمنا داس! سنا تم نے؟ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"بات یہ ہے مہاتما جی!" جمنا داس نے کہا "ہندو مسلم ایکتا کی ضرورت سبھی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے خلاف انگریزی سازش بھی کوئی نئی بات نہیں مگر سیٹھ صدیق نے ہم تک یہ بات پہنچانے کے لیے اس وقت دو گواہوں کی ضرورت محسوس کی' یہ نئی بات ہے۔ لگتا ہے سیٹھ صدیق کو یا تو اس بات پر یقین نہیں آیا یا اسے ہم پر بھروسا نہیں کہ ہم اس کی بات پر یقین کر لیں گے۔"

جمنا داس نے بڑی چالاکی سے یہ باور کرانا چاہا تھا کہ یہ سیٹھ صدیق کا مسئلہ ہے۔ اس میں جو زہر پنہاں تھا' وہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"آپ غلط کہہ رہے ہیں جمنا داس جی!" جوگیندر فوراً ہی بول اٹھا "ضرورت سیٹھ جی نے نہیں' ہم نے محسوس کی تھی۔ یہ بات تو سیٹھ جی کو ابھی اور اسی وقت معلوم ہوئی ہے۔ ہم نے تو ان سے بس اتنی درخواست کی تھی کہ ہماری ملاقات گاندھی جی سے کرا دیں' ہم انہیں ایک اہم اطلاع دینا چاہتے ہیں' ایسی اطلاع جو ہندوستان کے قومی اتحاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہم سیٹھ جی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست کو ٹھکرایا نہیں۔"

"ویری گڈ' بالک ویری گڈ!" جمنا داس نے کہا "زیادہ ابال نہ دکھاؤ' سیدھے سیدھے بتاؤ' چاہتے کیا ہو؟"

"ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے سرکردہ لیڈر' انگریز کی اس سازش کو ناکام بنانے کی کوشش کریں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کہاں سے یہ آگ بھڑک اٹھے۔ آپ اس آگ کو پھیلنے سے روکیں۔ ہندو مسلم ایکتا کو ہر صورت میں قائم رکھیں۔"

"یہ بات تم ہم سے کہہ رہے ہو؟" جمنا داس نے کہا

مہاتما جی نے کہا ہے کہ سوراج کا قیام عدم تشدد ہی سے ہو سکتا ہے مگر خلافت کے لیڈر محمد علی اور شوکت علی عدم تشدد کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ تشدد کا پرچار کر رہے ہیں' حکومت سے ٹکر لینے کی باتیں کر رہے ہیں پھر بھی ہم ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ بات تم مسلمانوں کو سمجھاؤ۔"

"محمد علی اور شوکت علی کے بارے میں الہامات کو جمنا داس!" گاندھی جی گیان دھیان سے برآمد ہوئے اور انہوں نے چھت پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا "یہ دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم انہیں نہیں سمجھ سکے" گاندھی جی رک کر پھر انہوں نے مجھ سے کہا "سنو نوجوان! میری زندگی' ہندو مسلم ایکتا اور بھائی چارے کے لیے وقف ہے۔ عدم تشدد کا پرچار اسی لیے ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی ہتیا کرتے رہیں۔ میں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا اور کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" انہوں نے ہم سے سوال کیا۔

"ہم چاہتے ہیں جناب کہ آپ اس معاملے کو کانگریس کی سطح پر اٹھائیں۔ سیٹھ صدیق اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے انگریز کی اس سازش کو عوام تک پہنچائیں۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی یہ کام مسلم لیگ سے بھی کرا سکتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں محمد علی جناح سے بھی مل چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کی اہم سیاسی جماعتوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔ ہم نے اپنا وہ فرض پورا کر دیا ہے جو اس دیس کی طرف سے ہم پر عائد ہے۔"

"اور اب تم کیا کرو گے؟" جمنا داس نے سوال کیا۔

"ہم وہی کریں گے جو ان حالات میں وطن پرستوں کو کرنا چاہیے" جوگیندر نے جواب دیا "یہ وقت صرف بدیسی کپڑوں کو آگ لگانے کا نہیں' نہ چرخا کاتنے اور نہ عدم تشدد کی تبلیغ کرنے کا وقت ہے۔ یہ وقت میدانِ عمل میں کود پڑنے کا ہے۔ ہم آپ کو جلد ہی بتا دیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں!"

"تم لوگ ہندوستان کو جہنم بنا دو گے" جمنا داس نے منہ بنایا۔

"جہنم تو یہ دیس اس وقت بھی ہے" جوگیندر نے پُرجوش آواز میں بولا "ہم سب غلامی کے جہنم کا ایندھن ہیں۔"

"تم لوگ انقلابی بنتے ہو" گاندھی جی نے کہا "مگر شاید انقلاب کی روح سے آشنا نہیں ہو۔ انقلابی وہ ہوتا ہے جو انقلاب کے لیے کام کرنے سے قبل اپنی حفاظت کا فن سیکھ لے پھر بغیر کوئی جان لیے مر جانے کا حوصلہ پیدا کرے۔"

"ہم نے مرنے اور مارنے کے گر سیکھ لیے ہیں مہاتما جی!" میری آواز میں چبھن سی تھی "میں اور میرے ساتھی ہر وقت جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں۔ ہم اس دیس کی آزادی اور آن پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں اور اس کے ہر دشمن کو جان سے مارنے کے لیے مستعد و چوکنا ہیں۔ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے' وہ پھانسی کے پھندے کی طرف جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہم ہراساں نہیں ہیں۔ ہمارے حوصلے بلند ہیں۔"

"ٹھیک ہے بالک!" جمنا داس کا لہجہ ٹھنڈا' ٹھہرا ہوا مگر بہا دینے والا تھا "تم نے اپنی بات مہاتما جی سے کہہ دی' انہوں نے تمہیں جواب بھی دے دیا' اب اور کیا چاہتے ہو؟"

پھر ہم وہاں سے چلے آئے تھے۔ سیٹھ صدیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس معاملے سے آگاہ کرنے کے لیے مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی کے پاس اپنا پیامبر روانہ کریں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنی بھرپور کوشش کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

وہاں سے واپسی پر ہم افسردہ سے تھے۔ قائد اعظم کا تجزیہ درست ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان اس وقت اتحاد کا راگ تو الاپ رہے تھے لیکن اس اتحاد میں خلوص کا فقدان تھا۔ دونوں فریق اس اتحاد کے لیے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے کوئی مشترکہ مقصد نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انگریز نے جو سازش تیار کی ہے' اس کا توڑ کرنا ان لیڈروں کے لیے ممکن نہیں ہوگا مگر مولانا جوہر کی تقریروں نے فضا بدل دی۔ ہندو اور مسلم باہم دست و گریباں ہونے کے بجائے اپنے اصل دشمن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قائد اعظمؒ نے بھی عملاً اس کے لیے بہت کام کیا۔ اور اس نتیجے میں سارا ہندوستان "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ کانگریس کے لیے اب کوئی اور راستہ نہیں رہا' سو اس نے بھی عدم تشدد کے ساتھ ساتھ مولانا جوہر کی آواز میں آواز ملانا شروع کر دی۔ ان دنوں تنظیم کے اجتماعات ہر دوسرے دن کلکتے میں ہو رہے تھے۔ شیام بازار میں سیٹھ موہن لال کی کوٹھی عارضی طور پر تنظیم کا مرکز بن گئی تھی۔ رحمان چارلس سے حاصل ہونے والی اطلاعات کے پیشِ نظر مجاہد اوّل نے مختلف صوبوں میں تنظیم کے کارکنوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ انہیں ہدایت تھی کہ وہ ہر قیمت پر ہندو مسلم اتحاد کو قائم

رکھنے کی کوشش کریں اور جیسے ہی انہیں اپنے صوبے میں اس قسم کی سازش کی اطلاع ملے' وہ فوراً اس سے آگاہ کریں۔ یہ خبریں خفیہ الفاظ میں تار کے ذریعے مجاہد اوّل کو سارے ہندوستان سے موصول ہو رہی تھیں۔ تار کس بھیج رہے تھے' یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ اسی دوران میں ماوا لنگر' رحمان چارلس اور چونی لال کو ٹھکانے لگوا دیا گیا تھا۔ ماوا لنگر نے زبردستی جس ہندو لڑکی کو اپنی داشتہ بنا رکھا تھا' اس کے قبضے سے چھڑا لی گئی تھی۔ چونی لال نے جو دولت سونے میں تبدیل کی تھی' وہ بھی اب تنظیم کے قبضے میں آ چکی تھی۔ میں نے جھے بیوکروں سے جو رقم وصول کی تھی' وہ بھی مجاہد اوّل کے حوالے کر دی تھی۔ اس میں صرف پانچ ہزار روپے کم تھے جو میں نے بخت خاں کو دیے تھے۔ بخت خاں نے بھی وہ پانچ ہزار مجاہد اوّل کو دے دیے تھے۔

سیاسی سطح پر کوششوں سے اور وطن پرست تنظیم کی عملی جدوجہد سے ایک بڑا طوفان احتیاطی تدابیر کے سبب ٹل گیا تھا اور یہ ہماری بڑی کامیابی تھی۔ اسی دوران میں جوگیندر کے توسط سے مجاہد اوّل کی ملاقات بنگال کے ایک انقلابی لیڈر سے بھی ہو چکی تھی۔ یہ ہندو انقلابی لیڈر اے کے گھوش ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم کا سربراہ تھا۔ مجاہد اوّل چاہتا تھا کہ اس دہشت پسند تنظیم کے کارکنوں سے وطن پرست تنظیم کے ارکان بعض آتشیں اسلحے اور بارودی دھماکوں کی تربیت حاصل کریں۔ گھوش نے اس پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مجاہد اوّل میرے' جوگیندر اور بخت خاں کے علاوہ ٹیپو کو بھی یہ تربیت دلوانا چاہتا تھا۔ اسی غرض سے اس نے پنجاب سے ٹیپو کو بنگال بلوا لیا تھا۔ نوجوان اے کے گھوش اس شخص کی اولاد میں سے تھا جسے انگریزوں نے اپنے خلاف تنظیم قائم کرنے پر پھانسی کی سزا دی تھی۔ گھوش کے چچا کو کالا پانی کی سزا ہوئی تھی۔ اب گھوش اپنے اسلاف کی روایات کا امین تھا۔ اس کا بھائی' فوج اور پولیس سے مقابلے کے دوران میں ہلاک ہوا تھا۔ اس کی بہن سوشیلا اس کی دستِ راست تھی۔

اے کے گھوش سے ہماری پہلی ملاقات ذکریا اسٹریٹ میں واقع ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ہوئی۔ مجاہد اوّل کے حکم پر ہم نے وہاں ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ اسی ہوٹل کی پہلی منزل پر خلافت کمیٹی کا دفتر تھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر کلکتے کی مشہور ناخدا مسجد تھی۔ وہ خود ہم سے ملنے آیا تھا۔ اس سے ایک روز قبل مجاہد اوّل کلکتے سے دہلی جا چکا تھا۔ گھوش سے ہماری یہ ملاقات بڑی پُرجوش رہی۔ وہ انتہائی انقلابی تھا' ویسا انقلابی نہیں جس کا تصور گاندھی جی کے ذہن میں تھا۔ بغاوت کا جذبہ اور آزادی حاصل کرنے کی امنگ اس کے روم روم میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ ایک مضطرب اور چوکنا شخصیت کا مالک تھا۔

گھوش ہم سے یوں ملا جیسے ہم برسوں کے دیرینہ دوست ہوں۔ ابتدائی تعارف کے بعد وہ فوراً بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس کی اردو اچھی تھی مگر وہ ہم سے اردو اور انگریزی دونوں ہی میں گفتگو کر رہا تھا۔ عام بنگالیوں کی طرح وہ بڑی روانی سے انگریزی بولتا تھا۔ پہلے اس نے ہم سے ہماری سرگرمیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ مجاہد اوّل کی ہدایت تھی کہ گھوش سے کچھ بھی نہ چھپایا جائے۔ ہم نے مختصراً اسے تمام تفصیلات بتا دیں۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے ہماری باتیں سنتا رہا۔

جب ہم سب کچھ بتا چکے تو وہ مسکرا کر بولا "یارو! اس پر مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اب ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ انقلابی فکر پیدا ہو رہی ہے ورنہ ہم تو سوچتے تھے کہ اٹھارہ سو ستاون کے بعد ان علاقوں کی ماؤں نے شہید اور سرفروش بیٹوں کو جنم دینا ہی بند کر دیا ہے۔" لفظ "یارو" اس کے منہ سے بڑا بھلا لگتا تھا۔ اس موقعے پر میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ گھوش نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "نا' نا! میں زوردار تقریر کرنے والے سیاسی لیڈروں کی بات نہیں کر رہا ہوں' نہ خواب دیکھنے والے ان لوگوں کی جنہیں تم مجاہدین کہتے ہو اور جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ترکی اور افغانستان کی طرف دیکھتے ہیں' ریشمی رومالوں پر خط و کتابت کرتے ہیں۔ میں تو ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتے ہیں۔"

"یہ اندازِ فکر کا فرق ہے" میں نے کہا "ورنہ باقی ہندوستان میں بھی آزادی کے متوالے بستے ہیں۔"

"نہیں یارو' یہ اندازِ فکر کا نہیں طریقۂ کار کا فرق ہے" گھوش زور دے کر بولا "تم لوگ صرف سیاسی جنگ کے قائل ہو مگر یہ بھول جاتے ہو کہ سیاسی جنگ ایک آزاد ملک میں دو پارٹیوں کے درمیان تحریر' تقریر' اجتماع اور صحافت کی آزادیوں کے ساتھ لڑی جاتی ہے۔ سیاست کی جنگ کسی غلام ملک میں لڑی ہی نہیں جا سکتی! ایسے ممالک میں صرف دو پارٹیاں ہوتی ہیں' ایک حاکموں کی دوسری غلاموں کی" گھوش نے روانی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اسی روز ہم ہوٹل سے اے کے گھوش کے گھر منتقل ہو گئے۔ وہ کلکتے کے مضافات میں اپنے کسی دوست کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اس کی انقلابی بہن سوشیلا

سے بھی ہوگی۔ وہ سانولی سلونی' دبلی پتلی' نازک اندام بنگالی حسینہ تھی۔ اس کے نقوش سیدھے سادے مگر پرکشش تھے۔ اس کے بال اتنے لمبے تھے کہ کمر سے بھی چار پانچ بالشت نیچے تک جاتے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک انقلابی لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔

ہماری تربیت تین ماہ جاری رہی۔ اس کے لیے ہمیں پہلے سندر بن اور کھلنا کے علاقے میں جانا پڑا اور پھر چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں۔ اس تربیت کے لیے سوشیلا ہماری نگراں تھی اور مزید دو افراد ہمارے ساتھ تھے۔ اس تربیت کے نتیجے میں ہم مشین گن اور رائفل چلانا نہ صرف سیکھ گئے تھے بلکہ ہمارا نشانہ بھی بہت صاف ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے مختلف قسم کے ڈائنا مائٹ اڑانے تھوڑ بنانے اور بارود سے چھوٹے موٹے دستی بم بنانے کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ جوگیندر اور سوشیلا بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ وہ جب بھی قریب ہوتے اور میں ان کی طرف دیکھتا تو انہیں اکثر مسکرا انداز میں بس خلا کو گھورتا ہوا پاتا۔ شاید وہ بھی مستقبل کے بارے میں میری اور فاطمہ ہی کی طرح سوچتے تھے۔

ہم نے اپنی تمام صلاحیتیں اس تربیت پر صرف کر دیں۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری یہ تربیت کسی اہم مہم کے سلسلے میں ہے' کسی بڑی مہم کے سلسلے میں! ہمیں اس تربیت کے لیے منتخب کرتے ہوئے مجاہدِ اول نے کہا تھا "میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ پوری طرح جمعی سے یہ تربیت حاصل کرو کیوں کہ یہ تربیت بعد میں ہماری تنظیم کی مہموں میں بہت کام آئے گی۔ اس تربیت کے خاتمے کے فوراً بعد تمہیں ایک نہایت اہم مہم درپیش ہوگی۔ وہ ایسی مہم ہوگی کہ انگریز حکومت ایک مرتبہ تو لرز کر رہ جائے گی۔ یہ حکومت اس بات کی توقع کر ہی نہیں سکتی کہ ہم ہندوستانی اس انداز میں بھی ان کے خلاف کارروائیاں کر سکتے ہیں۔"

اسے کے گھوش ہماری تربیت سے مطمئن تھا۔ جتنی تیزی سے ہم مختلف آتشیں اسلحے کے استعمال میں مہارت حاصل کرتے جا رہے تھے' اس پر وہ خوش تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار وہ ہم سے ملنے آتا یا پھر ہم ہی کسی جگہ اس سے مل لیا کرتے۔ وہ بہرحال ہمارے تربیتی کیمپ سے رابطہ ضرور قائم رکھتا تھا۔

جون کا مہینا شروع ہو چکا تھا جب ہم اپنی تربیت مکمل کر کے کلکتے واپس پہنچے۔ گھوش نے بڑی مسرت سے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ ہمیں دو دن بعد ہی نینی تال روانہ ہونا ہے۔

"نینی تال!" میں حیرانی سے بولا اور پوچھا "مگر کیوں؟"

"مجاہدِ اول کی طرف سے مجھے یہی ہدایت ملی ہے۔ سوشیلا بھی تمہارے ساتھ ہوگی" اس نے بتایا۔ میں نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔ "اس کے لیے خود تمہارے مجاہدِ اول نے مجھ سے کہا تھا۔ سوشیلا بہت اچھی نرس ہے۔"

دو روز کے بعد اے کے گھوش ہمیں ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہہ رہا تھا۔

ہدایت کے مطابق اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ٹرینیں تبدیل کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ اس سفر کے ساتھ ہی سوشیلا' جوگیندر کے لیے اپنے من مندر میں کئی دیپ جلا چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سوشیلا کے جذبات یک طرفہ نہیں تھے۔ جوگیندر بھی سوشیلا کے لیے وہی جذبات رکھتا تھا جو میرے دل میں فاطمہ کے لیے تھے۔ سوشیلا جب جوگیندر کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھوں کی جوت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی اور جوگیندر سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے لہجے کی گنگناہٹ میں ارتعاش سا پیدا ہو جاتا۔ اس کے گالوں پر جیسے انگارے دہکنے لگتے۔ اس کی خیالی رنگت میں جیسے کسی تھکی ہوئی شام میں پھوٹنے والی شفق گھل جاتی۔

یہ خواب کتنے حسین ہوتے ہیں! یہ تصور بھی کتنے شاداب ہوتے ہیں! انقلاب کی تپتی دوپہر میں سفر کرنے والوں کی زندگی میں خواب ناک' شاداب اور محبت سے شرابور لمحے بہت ہی کم آتے ہیں اور پھر زندگی بھر کا عذاب بن جاتے ہیں۔ مجھے جوگیندر اور سوشیلا پر بے حد پیار آنے لگا۔ ساتھ ہی میرا دل غیر یقینی مستقبل کے اندیشوں سے بوجھل کر رہ جاتا تھا۔ تب فاطمہ کا چہرہ میرے تصور میں اتر آتا۔ کلکتے سے رخصت ہوتے وقت اس نے کہا تھا "میں انتظار کروں گی" اس کے ان الفاظ کی مہک مجھے ابھی بوجھل اور شرابور کر ڈالتی۔

بریلی جنکشن ریلوے اسٹیشن پر ہمارا تنظیمی ساتھی حیدر علی منتظر تھا۔ وہ مجاہدِ اول کے پیغام کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ نینی تال میں جو مہم ہمیں سپرد کی جانے والی تھی' وہ جزوی طور پر ملتوی کر دی گئی تھی لہٰذا ہم سب کا نینی تال جانا ضروری نہیں رہا تھا۔ اب صرف مجھے اور ٹیپو کو نینی تال پہنچنا تھا۔ بخت خاں' جوگیندر اور سوشیلا کو شملہ پہنچنے کی ہدایت تھی۔ فاطمہ کے بارے میں بھی معلوم ہوا کہ اسے بھی کلکتے سے شملے پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ یہ خبر میرے لیے دل خوش کن تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھ جانے کے بعد پھر کم ہونے والا تھا۔ کلکتے کی نسبت شملہ بہت قریب تھا۔ میں سوچ رہا تھا' کاش مجھے بھی نینی تال کے بجائے شملے پہنچنے کا حکم ملتا۔ مجاہدِ اول کا پیغام سننے کے بعد میرے اور ٹیپو کے سوا باقی تینوں ساتھی بریلی جنکشن اسٹیشن پر ہی اتر گئے۔ ہمیں ابھی کاٹھ گودام جانا تھا جو اس لائن پر آخری اسٹیشن تھا۔ وہاں سے لاری کے ذریعے ہم نینی تال پہنچ سکتے تھے۔

نینی تال قدرت کی صناعی کا حسین شاہکار! پہاڑوں کے درمیان پُرسکون اور شفاف جھیل' انگشتری میں نگینے کے مانند تھی۔ دکھوں اور آلام سے بھری ہوئی اس دنیا میں یہ خطہ گوشۂ عافیت معلوم ہوتا تھا۔ جھیل کے چاروں طرف پہاڑوں پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ سڑک کا حلقہ تھا۔ رات کو جب آسمان کے ستارے اور مکانوں کی روشنیاں جھیل کی پُرسکون سطح پر اتر تیں تو یوں لگتا کہ سیاہ چادر پر کسی نے مقیش کے تاروں سے ستارے ٹانک دیے ہوں۔

ہمیں نینی تال پہنچے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ ہم وہاں ایک چھوٹے سے مکان میں مقیم تھے۔ یہ مکان ہم نے کرائے پر لیا تھا۔ ان تین دنوں میں تنظیم کے کسی رکن نے ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ سو ہمارے لیے سیر و تفریح کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

ہم دن بھر پہاڑوں اور وادیوں کی سیر کرتے' خودرو' خوش رنگ پھولوں کی خوشبو سے بوجھل فضا میں سانس لیتے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ قدرت نے انسان کے لیے تازگی اور خوشبو بکھیری تھی لیکن انسان ہی نے قدرت کے ان انعامات کو بعض کمزور انسانوں کے لیے شجرِ ممنوعہ بنا دیا تھا۔ قدرت نے ہندوستان کے پہاڑوں' وادیوں' میدانوں' دریاؤں اور صحراؤں میں تازگی اور فرحت گھول رکھی تھی لیکن غاصب غیر ملکیوں نے ہر جگہ ہندوستانیوں کے لیے قبرستان اور شمشان گھاٹ سجا دیے تھے۔ نینی تال سے تازگی اور فرحت ابھرتی تھی اور ہندوستان ایک متعفن جوہڑ بنا ہوا تھا۔

نینی تال میں یہ ہمارا چوتھا دن تھا۔ میں اور ٹیپو جھیل کے ساتھ ساتھ سڑک پر چہل قدمی میں مصروف تھے۔ شام کے سرمئی سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک ایک شناسا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ بھاری بھرکم جسم' دراز قد اور گھنی مونچھیں! میں ایک لمحے کو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے حیرانی اور تعجب کے سائے نظر آئے۔ یہ وہی شخص تھا جس سے لاہور میں میرا پالا پڑ چکا تھا۔ اسی کی وجہ سے سی آئی ڈی والے مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ علی حسن تھا' میرے ڈیڈی کا ماتحت!

میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے تیزی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹیپو کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے یقین تھا کہ علی حسن نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں جلد از جلد اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لیے میری رفتار از خود تیز ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ٹیپو نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں" میں بولا "جلدی چلو!"

"ہوا کیا؟" ٹیپو نے سوال کیا۔

"خطرہ!" میں نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ میرے قدموں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

اب ہم تقریباً دوڑ رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ علی حسن اپنی جگہ کھڑا ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ہم اس پتھریلی سڑک کے موڑ پر موجود تھے جو دائیں جانب ایک مکان کے ساتھ تھا۔ وہ سڑک اوپر کی طرف چلی جاتی تھی۔ میں تیزی سے لپک کر اسی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ موڑ پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ علی حسن اب بھی وہیں کھڑا تھا اور اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا پھر مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے ہمارے تعاقب کے لیے دوڑنا شروع کر دیا ہو۔

"بھاگ لو ٹیپو!" میں نے کہا۔

رات نے نینی تال کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر اپنے مکان کی طرف ہو لیے تھے لیکن اس وقت مجھے ہر طرف سے خطرات بڑھتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارا یہ مکان آبادی سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس وقت مجھے اس مکان سے خوف محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے خطرہ وہاں ہماری گھات میں ہو۔ علی حسن کو نینی تال میں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اب گویا نینی تال ہمارے لیے محفوظ نہیں تھا۔

میں نے اپنے خدشات کا اظہار ٹیپو سے کر ہی دیا "میرا خیال ہے ہمیں وہاں جاتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے" علی حسن سے متعلق تفصیلات میں اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

"کیوں نہ آج رات کسی ہوٹل میں گزاری جائے!" ٹیپو نے تجویز پیش کی۔

"ہوٹل ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے۔ نینی تال میں ہوٹل ہی کتنے ہیں؟" میں نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

"پھر؟" ٹیپو کے لہجے میں سوال بھی تھا اور تشویش بھی۔

"ہوں! میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔"

اس وقت اچانک مجھے سوجتی نائیڈو کا خیال آگیا تھا۔

میں نے ایک بنگلے پر ان کے نام کی تختی لگی دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ دو ایک مرتبہ انہیں سیر کرتے بھی دیکھا تھا لیکن ہر مرتبہ ان سے کتی کترا گیا تھا۔ سروجنی نائیڈو میرے خالو جان خان بہادر نواب ثناء اللہ خاں کی اچھی دوست تھیں۔ دو مرتبہ وہ علی گڑھ آئی تھیں۔ اسی موقع پر خالو جان کے ساتھ ان سے مجھے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک پُرجوش خاتون تھیں۔ قدرت نے ان کی زبان میں جادو گھول دیا تھا اور ان کی شخصیت میں جاذبیت و عظمت کے رنگ بھرے تھے۔ ان کا وجود آزادی کی چنگاریوں سے عبارت تھا۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتی تھیں۔ ہندوستان کے باشندوں کے لیے ان کے دل میں صرف محبت ہی محبت تھی۔ وہ ہندوستان میں آباد افراد کو صوبوں، قوموں یا نسل، فرقوں اور زبانوں کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتی تھیں۔ انہیں بلا تفریق رنگ و مذہب، ہر ہندوستانی عزیز تھا، خواہ وہ کسی صوبے، کسی مذہب کا ہو۔

پھر ہم دونوں وہاں سے واپس ہو لیے۔ میرا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط، اس وقت مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ مجھے اس بات کا ہوش تھا کہ اس مکان کو چھوڑ کر میں تنظیم کے لیے رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہوں۔

میرا خیال تھا کہ تنظیم کا کوئی نہ کوئی فرد یقیناً نینی تال میں ہماری نگرانی کر رہا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ ہم کہاں مقیم ہیں اور وہ تنظیم کی طرف سے ان احکام کا انتظار کر رہا ہوگا۔ جو اسے ہم تک پہنچانے تھے۔ اب اس مکان سے فرار ہو کے بعد یقیناً تنظیم کو ہم سے رابطہ قائم کرنے میں مشکل درپیش آسکتی ہے۔ سروجنی نائیڈو کے گھر تک کے سفر میں یہ تمام باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ اس کے لیے نیپو کو کام میں لاؤں گا۔ اب وہ اکیلا ہی نینی تال میں سیر کرے گا اور تنظیم کے کسی کارکن کو اس سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

سروجنی نائیڈو نے نہایت پُرجوش انداز میں ہمارا استقبال کیا "اوہ! مائی گرینڈ فری ڈم فائٹر!" ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے میرا استقبال کیا۔ فری ڈم فائٹر، مجاہدِ آزادی! یہ الفاظ میرے لیے دھماکے سے کم نہیں تھے "کیسے آئے؟" انہوں نے انگریزی میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میرے دوست ہیں نیپو" میں نے ان کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے نیپو کا تعارف کرایا۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو!" وہ نیپو سے مخاطب ہو گئیں پھر انہوں نے مجھ سے کہا "فری ڈم فائٹر کا دوست بھی فری ڈم فائٹر ہونا چاہیے۔"

"یہ آپ مجھے بار بار فری ڈم فائٹر کیوں کہہ رہی ہیں؟" میں بولا "آپ۔ آپ تو مجھے جانتی ہیں" میں ڈر رہا تھا کہ وہ کہیں میرا اصل نام نہ لے دیں!

"کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟" سروجنی نائیڈو بولیں۔ ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

میں نے پریشان سا ہو کر نیپو کی طرف دیکھا۔

سروجنی نائیڈو کی آواز پھر ابھری "خان بہادر نواب ثناء اللہ خاں کا بھانجا ہم لوگوں کی نظر میں فری ڈم فائٹر ہی ہے چاہے انگریز حکومت اسے دہشت پسند ہی کیوں نہ سمجھے۔ مجھے تم جیسے نوجوانوں سے محبت ہے" انہوں نے میرا نام نہیں لیا مگر یہ انکشاف ضرور کردیا کہ میرے خالو جان کا نام کیا ہے!

"آپ نے مجھے حیران ہی کردیا تھا" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا۔

"ابھی میں تمہیں اور حیران کروں گی" انہوں نے کہا "ویسے یہ بتاؤ نینی تال کب آئے؟ کہاں ٹھہرے ہو؟"

اس کے جواب میں جھوٹ کی چاشنی کے ساتھ میں نے انہیں اپنا مسئلہ بتا ہی دیا۔

سروجنی نائیڈو نے میری داستان سن کر گہرا سانس لیا اور کہا "اچھا۔ یہ بات ہے!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں "گویا تم چھپتے ہو؟" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو!" میں بولا "ورنہ ہم کہیں اور انتظام کرلیں گے۔"

"وہ نہیں" وہ کہنے لگیں "میں کچھ اور سوچ رہی تھی میرے لیے اس سے بڑا اور کوئی اعزاز نہیں کہ اس ملک کے فری ڈم فائٹرز مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ویسے خان بہادر تمہاری طرف سے خاصے پریشان ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ انہیں میری روش پسند نہیں" میں بولا۔

"انہیں کیا پسند ہے، کیا نہیں اس کا اندازہ تم شاید ہی کرسکو۔ ان کی پریشانیاں اس لیے ہیں کہ ان سے تمہارا قریبی رشتہ ہے۔"

"ویسے آپ کا میری روش کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے بچے کو تمہارے نقش قدم پر چلتے دیکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں جانتی کہ اگر اس نے ایسا فیصلہ کیا تو میرا کیا ردِعمل ہوگا! میرے جذبات کیا ہوں گے!"

اس کے بعد ہم مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

سروجنی نائیڈو بھی کئی قوم پرست لیڈروں کی طرح ہندوستان کی اس فضا پر تشویش میں مبتلا تھیں جو انگریز نے ہندوستان میں قائم کردی تھی۔ کئی انتہا پسند ہندو لیڈر ان دنوں کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف زہر اگل رہے تھے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں مصروف تھے۔ ان کے سرخیل پنڈت مدن موہن مالویہ تھے جنہوں نے کلکتے میں گاندھی جی کی اجازت سے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے ساتھ مذاکرات کیے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس یہودی وائسرائے سے یہ اجازت بھی لے آئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کردیں گے۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب برطانیہ کا شہزادہ ہندوستان کے دورے پر تھا۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد ہی انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں جو یہ ترویج ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پر آزادی کی راہ متعین کرنے کی کوشش میں تھی، وہ گند پھیلایا کہ یہ اتحاد جو پہلے مصنوعی تھا اور جسے مضبوط سہاروں سے مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی، زمیں بوس ہوگیا۔

ہندوستان کی سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں تین گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران میں ہم نے تین مرتبہ چائے پی، ساتھ ہی ہمیں وہ کمرا بھی دکھا دیا گیا جس میں رات بسر کرنا تھی۔ اول تو یہ موضوع ہی ہماری دلچسپی کا تھا پھر طرزِ کلام ہندوستانی نائٹ اینگل سروجنی نائیڈو کا، وقت کا کچھ پتا ہی نہ چلا کہ کب چپکے سے پر لگا کر اڑ گیا۔

رات کافی بھیگ چکی تھی اور سروجنی نائیڈو کی باتیں جاری تھیں۔ ایک مرتبہ انہیں جماہی آئی تو وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ انہوں نے فوراً ہی کہا "تم سوچتے ہوگے، میں کتنی بداخلاق ہوں کہ کھانے کو نہیں پوچھا۔ دراصل میں اپنے ایک مہمان کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آجائے گا مگر اب تو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ تم چاہو تو کھانا لگوا دوں؟"

"تو کیا آپ نہیں کھائیں گی؟" میں نے سوال کیا۔

"میں اپنے مہمان کا انتظار کروں گی" انہوں نے جواب دیا "وہ مہمان مجھے بہت عزیز ہے۔ ویسے تم لوگوں کو بھوک لگ رہی تھی تو کہا کیوں نہیں؟"

"میں آپ کی خوب صورت باتیں سن رہا تھا۔ ویسے آپ کے وہ مہمان ہیں کون؟"

"تم دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ میں نے کہا تھا نا تم سے کہ ابھی میں تمہیں اور حیران کروں گی۔ میں چاہتی تھی کہ ہم سب ساتھ کھانا کھائیں۔ تم میرے مہمان سے مل کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حیران بھی ہو گے۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ سروجنی نائیڈو کے مہمان کو دیکھ کر میں چونک ہی تو گیا۔ حیرانی اور خوشی اپنی جگہ مگر اس سے زیادہ مجھے پریشانیوں نے گھیر لیا۔

سروجنی نائیڈو کے وہ عزیز مہمان تھے خان بہادر نواب ثناء اللہ خاں، میرے خالو جان!

مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی عود کر آئی۔ ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر مچل کر رہ گئی اور پھر ان کی بزرگانہ شفقت پر خان بہادری غالب آگئی۔ اب ان کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں نے بھینچ کر نودمیدہ مسکراہٹ کو قتل کردیا تھا۔

"آؤ خان بہادر!" سروجنی نائیڈو نے ان سے کہا تھا "بیٹھو!"

انہیں دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ میرے خالو جان تھے اور مجھے بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ یقیناً مجھ سے بہت قریب تھے اور قریب ہو کر بھی بہت دور تھے۔ ہم دونوں عملی دنیا میں دو مخالف راستوں کے مسافر تھے، ایک دوسرے کے حریف تھے۔ وہ انگریز بہادر کے خطاب یافتہ تھے۔ انگریزوں کی خدمات کے صلے میں انہیں خان بہادری ملی تھی۔ دوسری طرف میں انگریز حکومت کا دشمن تھا، اس غاصب تاجر کا دشمن جو سات سمندر پار سے اس ملک میں تجارت کے نام پر لوٹ مار کرنے آیا تھا۔ وہ جس نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو اسلحہ کے گوداموں اور فوجی قلعوں میں تبدیل کردیا تھا، جس نے تجارت کے بہانے ہندوستان ہی سے حاصل کی ہوئی دولت کے بل بوتے پر سازشوں کے تار و پود پھیلائے تھے۔ اس نے انہی سازشوں کے بل پر بنگال کے قاسم، دکن کے صادق سے لے کر علی گڑھ کے خان بہادر تک مختلف وطن فروشوں اور قوم کے فروشندوں کو خرید کر ان کے ضمیر پر مہر لگادی تھی۔

خان بہادر ثناء اللہ خاں قہر آلود انداز میں مجھے اور نیپو کو گھورتے ہوئے آگے بڑھے پھر سروجنی نائیڈو کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"یہ یہاں کس لیے آیا ہے؟" خان بہادر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سروجنی نائیڈو سے پوچھا۔

"یہ تمہارا عظیم بھانجا ہے، فری ڈم فائٹر! یہ کسی کام سے یہاں آیا تھا کہ ـــ" پھر انہوں نے وہی جھوٹی کہانی جس میں سچ کی بھی کچھ آمیزش تھی، مختصر الفاظ میں سنادی۔ یہ وہی کہانی

تھی جو میں انہیں سنا چکا تھا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "اسے خطرہ ہے کہ خفیہ کے لوگ اس کے تعاقب میں ہیں۔ یہ اسی لیے پناہ لینے یہاں آیا ہے۔"

"اور تم نے انہیں پناہ دے دی!" خان بہادر کا لہجہ ایسا تھا جیسے سروجنی نائیڈو نے کوئی قصور کیا ہو۔

"ان جیسے نوجوانوں کو پناہ دینا بڑے فخر کی بات ہے خان بہادر!" سروجنی نائیڈو بے جھجک بولیں۔

"اور اس میں بڑے خطرات بھی پوشیدہ ہیں" خان بہادر ثناء اللہ خاں نے کہا "اگر یہ تمہارے مہمان نہ ہوتے تو انہیں گرفتار کرا کے خود مجھے خوشی ہوتی" انہوں نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" سروجنی نائیڈو نے اظہارِ حیرت کیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" خان بہادر اپنے مخصوص لہجے میں بولے "میں ابھی مرکزی انٹیلی جنس کے چیف ڈی سوزا سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ یہیں نینی تال میں موجود ہے۔ وہ آج ہی یہاں پہنچا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ۔۔۔" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا "اپنے ساتھیوں سمیت نینی تال آیا ہوا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنے آیا ہے کہ یہ لوگ یہاں کس چکر میں آئے ہیں!"

یہ خبر میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ ڈیڈی بھی نینی تال آ چکے تھے۔ اب علی حسن کی نینی تال میں موجودگی کا مطلب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

"ہم یہاں صرف سیرو تفریح کے لیے آئے ہیں" میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

"خاموش رہو!" خان بہادر نے مجھے ڈانٹ دیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ڈیسوزا یہاں آیا ہوا ہے؟" سروجنی نائیڈو نے خان بہادر سے معلوم کیا۔

"خود اس کے ایک پیغامبر کے ذریعے۔ نینی تال پہنچتے ہی اس نے مجھے پیغام بھجوایا تھا اور آج رات ملنے کو کہا تھا" خان بہادر بتانے لگے "اس کی وجہ سے خود میری حیثیت مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے حالانکہ اس سے ہر تعلق ختم کر لینے کا اعلان کر دیا ہے مگر حکومت کو میرے خلوص پر یقین نہیں رہا۔ وہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ جب ڈیسوزا نے مجھے یہ اطلاع دی کہ یہ بھی یہاں موجود ہے تو میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہے ڈیسوزا کیا سوچ رہا ہوگا؟"

"یہی کہ شاید تم اپنے بھانجے سے ملنے ہی کے لیے یہاں آئے ہو" سروجنی نائیڈو نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ہاں" خان بہادر نے تائید کی "ڈیسوزا کو بڑی مشکل سے یقین دلا سکا ہوں کہ یہ محض اتفاق ہے۔ بہرحال میں نے ڈیسوزا سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کی گرفتاری کے لیے بھرپور تعاون کروں گا۔ خود ڈیسوزا کی پوزیشن اس کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ یہ گرفتار ہو تو اس کی جان میں جان آئے۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے!" سروجنی نائیڈو نے پُرزور آواز میں کہا "یہ میرا مہمان ہے، میری پناہ میں ہے! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم ایسا نہیں کرو گے!"

"صرف اس حد تک وعدہ کر سکتا ہوں کہ جب تک یہ اس گھر میں مقیم ہے، میں اس کی مخبری نہیں کروں گا۔" خان بہادر نے فیصلہ سنا دیا "لیکن اس گھر سے اگر اس نے قدم باہر نکالا تو میں خود۔۔۔" انہوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا پھر کہنے لگے "مجھے امید ہے کہ ابھی اس میں اتنی شرافت باقی ہے کہ یہ پولیس کو نہیں بتائے گا کہ اس نے تمہارے گھر میں پناہ لی تھی۔"

"مگر۔۔۔" سروجنی نائیڈو نے کچھ کہنا چاہا۔

میں نے ان کی بات کاٹ دی "مجھے خوشی ہے خان بہادر صاحب کہ آپ نے میری شرافت کے بارے میں یہ رائے قائم کی۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں کہ اپنے سگے بھانجے کو گرفتار کراویں۔ میں ابھی باہر چلتا ہوں اور آپ سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ باہر جا کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ آپ مجھے جہاں بھی ساتھ چلنے کو کہیں گے، چلوں گا۔"

"بدتمیزی نہیں! خاموش بیٹھو اور یقین رکھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کروں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ خان بہادر جو کچھ کہہ رہے تھے، لفظ لفظ سچ تھا۔ وہ مجھے گرفتار کرا سکتے تھے کیوں کہ انہیں اپنی خان بہادری اتنی ہی عزیز تھی۔ بہرحال اس وقت سروجنی نائیڈو آڑے آئیں۔ انہوں نے خان بہادر کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ کھانے پر بھی فضا بوجھل سی رہی۔

شب خوابی کے کمرے میں پہنچنے کے بعد ٹیپو نے جو اب تک خاموش رہا تھا، مجھ سے کہا کہ ہمیں رات ہی کو یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے مگر میں نے اس کی یہ تجویز مسترد کر دی۔ میرا اب بھی وہی پروگرام تھا کہ تنظیم سے رابطے تک ہم یہیں مقیم رہیں۔ تنظیم سے رابطے کی صورت اب یہی رہ گئی تھی کہ ٹیپو دن میں اس مکان کی طرف جائے جہاں ہمارا قیام تھا اور یہ دیکھے کہ وہاں کیا حالات ہیں! میرا وہاں جانا اب خطرے سے خالی نہیں تھا۔ طارنوش کی حیثیت سے مجھے

۔۔۔نے والے اب نینی تال پہنچ چکے تھے۔ امکان یہ بھی تھا کہ ۔۔۔ محض وہم ہوا ہو۔ خان بہادر کی گفتگو سے تو یہی پتا چلتا تھا ۔۔۔ ابھی انتظامیہ کو ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں ہوا تھا۔

ڈیڈی کی نینی تال میں موجودگی بھی میرے لیے حیرت ۔۔۔ تھی۔ ساتھ ہی اس سے خطرات کی سنگینی کا بھی احساس ۔۔۔ تھا۔ میں اور ٹیپو انہی باتوں پر بہت دیر تک دبے دبے لہجے ۔۔۔ گفتگو کرتے رہے۔

"۔۔۔ ارے یار، جو ہوگا دیکھا جائے گا" ٹیپو بولا "فی الحال تو ۔۔۔ سو جاؤ۔"

ابھی میری آنکھ نہیں لگی تھی۔ میرے ذہن پر غنودگی سی ۔۔۔ تھی کہ کھڑکی پر ہلکی سی دستک کی آواز سن کر میں چونک ۔۔۔ میں نے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور تیزی کے ساتھ ۔۔۔ سے اتر گیا۔ میں نے دھیمی دھیمی روشنی میں دیکھا کہ ٹیپو ۔۔۔ اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"شاہین!" اس دفعہ دستک کی آواز کے ساتھ وہ آواز ۔۔۔ دی جو میرے دل سے تمام خوف زائل کر دیتی تھی، مجھے ۔۔۔ حوصلوں اور امنگوں سے سرشار کر جاتی تھی۔ یہ آواز ۔۔۔ رہنما مجاہدِ اوّل کی تھی۔ ٹیپو نے بھی یقیناً اس آواز کو ۔۔۔ لیا ہوگا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی کھڑکی کی طرف بڑھے

"جی مجاہدِ اوّل!" میں نے کہا تھا۔ کھڑکی کی دائیں ۔۔۔ باہر کی سمت دیوار سے لگا ایک ہیولا چپکا ہوا تھا۔

"فوراً اپنے ٹھکانے پر پہنچو!"

"مگر اسے مجاہدِ اوّل وہاں خطرہ ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"میں وہیں سے آ رہا ہوں" مجاہدِ اوّل نے بتایا "وہاں خطرہ نہیں ہے۔ فوراً وہاں پہنچو! تمہیں آج صبح تک نینی ۔۔۔ سے نکل جانا ہے۔"

"بہتر ہے" میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی مجاہدِ اوّل کا ہیولا ۔۔۔ سے ہٹ گیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مجاہد ۔۔۔ ہیولا دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

۔۔۔ ہم دونوں جلدی جلدی تیار ہوئے اور اسی کھڑکی کے ۔۔۔ کمرے سے باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس بنگلے ۔۔۔ کر اپنے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے تو گویا اب کچھ ۔۔۔ ہی تھا۔ میں نے خوش دلی سے سوچا اور خود کو ۔۔۔ محسوس کیا۔

۔۔۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم اس مکان میں تھے۔ دروازہ ۔۔۔ کر ہم نشست گاہ میں داخل ہوئے اب ہمیں سالار کا ۔۔۔ انتظار تھا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ ہمیں

ایک مرتبہ پھر حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ ٹیپو سے زیادہ میں حیرت زدہ تھا۔ دروازے میں "شکرا" کھڑا تھا۔

"خوش آمدید دوستو!" اس نے کھر کھراتے لہجے میں کہا "میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا" اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں، بھویں سکڑ کر آپس میں ملنے کے بعد ماتھے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لکیر بنا گئی تھیں۔ اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹوں سے باریک باریک دانت جھانک رہے تھے، مسکراہٹ کی دو لکیریں ہونٹوں کے گوشوں سے پھیل کر نیچے ٹھوڑی تک چلی گئی تھیں۔

ٹیپو اسے نہیں پہچانتا تھا مگر میں اچھی طرح اس سے واقف تھا۔ یہ وہی تھا جس سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی، وہی جس نے میرا امتحان لیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجاہدِ اوّل کے نائبین میں سے تھا۔ وہ عجیب شخصیت کا مالک تھا۔

اس سے پہلے کہ میں ٹیپو کو اس کے متعلق کچھ بتا سکتا، ٹیپو انتہائی تیزی کے ساتھ اس پر جھپٹا تھا۔ "شاہین! تم بھاگ لو" میں نے ٹیپو کی آواز سنی تھی۔

اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی ضرب بڑی زور سے ٹیپو کے سینے پر پڑی تھی اور وہ دوہرا ہو گیا تھا۔

"شاہین! ٹیپو! خالد!" ایک سرد آواز ابھری "یہ کیا ہو رہا ہے؟" یہ آواز مجاہدِ اوّل کی تھی پھر مجاہدِ اوّل نپے تلے قدم رکھتا ہوا اندر آ گیا۔ شکرے کا نام آج مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا "یہ کیا ہو رہا تھا؟"

"یہ۔۔۔ میں دراصل ٹیپو کو بتا نہیں سکا تھا کہ۔۔۔" میں وضاحت کرنے لگا۔

میری وضاحت کے بعد ٹیپو اور خالد نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔

—— مجاہدِ اوّل نے مجھے اور ٹیپو کو اگلے آٹھ ماہ کا پروگرام دیا۔ یہ پروگرام ایک کاغذ پر مختصر الفاظ میں تحریر تھا اور ہر نکتے کی وضاحت مجاہدِ اوّل زبانی کرتا جا رہا تھا۔ پروگرام کا پہلا حصہ نینی تال کی اطراف کے علاقے کی سیاحت تھی۔ یہ سیاحت اس بڑے اور اہم منصوبے کی تیاری کا پہلا مرحلہ تھی جو ہمیں ایک مناسب وقت پر سونپا جانا تھا۔ وضاحت کرتے ہوئے مجاہدِ اوّل نے کہا تھا "تمہیں اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے اس راستے کو بھی ذہن نشین کرنا ہے جس سے تم گزرو گے" اس کے ساتھ ہی مجاہدِ اوّل نے ہمیں اس علاقے کا ایک نقشہ بھی دیا تھا۔ یہ نقشہ ٹریسنگ پیپر پر بنا ہوا تھا جس پر

مختلف مقامات کے نام اور نشانات موجود تھے۔ مجاہد اوّل نے بتایا تھا "یہ نقشہ سروے آف انڈیا کے ایک سویئر رینڈال کی سروے رپورٹ کا حصّہ ہے۔ وہ اس راستے سے گزرا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم کس طرح اپنا راستہ تلاش کرتے ہو۔ تمہیں اپنا ذہن اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہیں۔ تمہیں یہ راستہ نہ صرف یاد رکھنا ہے بلکہ مختلف مقامات پر ایسی جگہیں بھی تلاش کرنا ہیں جہاں اس عظیم مہم کے دوران میں پناہ لے سکو جو مہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کے سپرد کی جائے گی۔ ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ تم وہ مہم سردیوں میں سر کرو گے۔ تمہارے ساتھیوں کو اسی لیے اس موسم سے آشنا کرنے کی خاطر پہاڑی مقامات پر متعین کردیا گیا ہے۔ سردیوں میں یہ تمام علاقہ برف سے ڈھکا ہوگا لہٰذا تمہاری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اس علاقے میں کچھ نشانیاں بھی ذہن نشین کرتے رہو' ایسی نشانیاں جو برف باری کے موسم میں بھی تمہیں نظر آتی رہیں۔ اس طرح تم راستہ نہیں بھولو گے۔"

اس پروگرام کا دوسرا مرحلہ برما کا سفر تھا۔ نینی تال کے علاقے میں ہمیں دو ہفتے تک سیاحت کرنا تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں رانی کھیت اور پھر وہاں سے آسام کے شہر گوہاٹی پہنچنا تھا۔ گوہاٹی میں اے کے گھوش کو ہمارے ساتھ شامل ہونا تھا اور پھر ہمیں گھوش کے ساتھ ناگا ہلز کے پار برما پہنچنا تھا۔

"مگر جناب' برما کے سفر کا مقصد کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہمیں برما سے اسلحہ لانا ہے' ایسا اسلحہ جو اس مہم کے لیے ضروری ہوگا جو تمہیں سردیوں میں درپیش ہوگی اور ایسا اسلحہ بھی جو ہمیں ہندوستان میں آسانی سے نہیں مل سکتا۔" مجاہد اول نے جواب دیا "اے کے گھوش' برما میں مقیم حریت پسند ہندوستانیوں کی ایک جماعت سے رابطہ رکھتا ہے۔ وہ ایک ماہ بعد برما جانے والا ہے۔ تمہیں اس لیے بھیجا جارہا ہے کہ تم اپنی تنظیم کی ضروریات کا اسلحہ لے کر بہ حفاظت بریلی پہنچ جاؤ۔"

"بریلی میں ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسلحہ لے کر جب تم واپس ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوگے تو تار کے ذریعے تم صفدر (جوگیندر کا تنظیمی نام) اس کے کلکتے کے پتے پر اپنی آمد کی اطلاع دو گے" مجاہد اوّل نے بتایا "اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد تم بھاگلپور پہنچو گے۔ وہاں تمہیں سب کچھ بتادیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب!" میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

"میں اور خالد بھی اسلحے کے لیے پاکستان جار... اس لیے اب تم اپنے اقدامات کے خود ذمے دار ہوگے۔ یاد رکھو کہ اس مہم پر ہماری بڑی اور اہم کامیابیوں کا ا... ہے۔ اس وقت تنظیم کے تمام اراکین غیر ملکی حا... فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ تم... ہندوستان میں سرگرم عمل خفیہ حریت پسند تنظیموں ... رابطہ پیدا ہوچکا ہے۔ موجودہ مہم کے بعد تمام شمالی ہ... میں پے در پے دھماکے ہوں گے۔ انگریز حکومت ل... جائے گی" مجاہد اوّل کی آواز آخری الفاظ ادا کرتے... پُرجوش ہوگئی۔

"ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا ہے؟" ... پوچھا۔

"آج ہی سورج طلوع ہونے سے قبل تمہیں ... سے نکل جانا ہے" مجاہد اوّل نے جواب دیا "ہاں' بعض مقامات کے گرد سرخ حاشیے بنادیے گئے ہیں... میں تمہیں خاص طور پر ان مقامات کا جائزہ لینا ... معلوم کرنا ہے کہ وہاں کچھ خاص قسم کی سرگرمیاں ... اگر تم وہاں کچھ خاص سرگرمیاں دیکھو تو یہ بھی معل... ان کی نوعیت کیا ہے لیکن اس سلسلے میں زیادہ کھو... کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میں اور ... کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس سفر کے لیے ضروری سا... بھرے ہوئے دو بھاری تھیلے خالد نے ہمارے ... کردیے۔

ہم سفر کے لیے تیار ہوگئے تو خالد نے ہمیں ... اخراجات کے لیے پانچ ہزار روپے دیے۔ اس ... اسلحے کی خریداری کے لیے رقم کا خیال آیا اور میں ... خیالات کا اظہار بھی کردیا۔ اس پر مجاہد اوّل نے ... اسلحے کی خریداری کے لیے رقم اے کے گھوش کی ... لوگوں تک پہنچ چکی ہے جو برما میں ہمارے لیے اسلح... کریں گے۔"

جب ہم مجاہد اوّل اور خالد سے رخصت ہو... مجاہد اوّل نے کہا "اس سفر میں تم دونوں ایک دو... محافظ اور رفیق ہو اگرچہ مجھے توقع نہیں کہ اس سفر... میں تمہارا مقابلہ کہیں کسی پولیس پارٹی یا سرکاری... ہوگا پھر بھی احتیاط۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے دو د...

دونوں کو دیں "یہ زہر کی گولیاں ہیں" مجاہد اوّل کی آواز کپکپا رہی تھی "بالفرض محال اگر تم پھنس ہی جاؤ اور تمہارے لیے کوئی راہ نہ ہو تو گرفتاری سے قبل ہی یہ گولیاں حلق سے اتارلینا پھر تم ان کی اذیت اور تشدد سے بچ جاؤ گے۔ وہ تم سے کچھ بھی نہ اگلوا سکیں گے" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے ہم سے زہر کی گولیاں لے کر دو چھوٹی چھوٹی موی تھیلیوں میں ڈال دیں "تو' خدا حافظ!" یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مجاہد اوّل کے لہجے میں لرزش محسوس کی تھی۔ وہ ہمیں کتنا عزیز رکھتا تھا! یہ بھی پہلا ہی موقع تھا کہ ہمیں زہر کی گولیاں دی گئی تھیں۔ اس سے میں نے اس مہم کی خطرناک نوعیت کا اندازہ لگالیا تھا۔

اس مکان سے نکل کر ابھی ہم نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک ہمارے راستے میں ایک شعلہ حائل ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ شعلہ کسی صحرائی بگولے کی طرح گردش میں ہو۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو اس شعلے کو کافی بلندی تک محیط در قصاں دیکھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ کیا ہے شاہین؟" نیپو کی خوف زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

ابھی میں نیپو کو کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ میری آنکھوں نے ایک اور حیرت ناک منظر دیکھا۔ وہ شعلہ رقصاں سمٹنے لگا اور پھر اس سے ایک نسوانی پیکر کے نقوش ابھرنا شروع ہوگئے۔ شعلوں کا وہ نسوانی پیکر اس قدر حسین' اتنا دل فریب اور پُرکشش تھا کہ میں ایک بے خودی کے سے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلادیے تھے جیسے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہو۔

"آؤ۔۔۔ آجاؤ طارنوش!" نسوانی پیکر کے آتشی لب حرکت میں آگئے "آؤ۔۔۔ آؤ میرے بچے' میری آغوش میں آجاؤ کہ میں تمہاری ماں طرطبہ ہوں۔"

اس آواز میں ایسی کشش' ایسا بلاوا تھا کہ میں کسی سحرزدہ کی طرح اس آتشی پیکر کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔

عین اسی لمحے جیسے کہیں بہت دور سے ایک آواز مجھے سنائی دی "رک جاؤ طارنوش! رک جاؤ ورنہ یہ تمہیں جلا کر خاک کردے گی۔"

میں پُراسرار راسنی کی آواز پہچان گیا مگر میرے قدم نہیں رک سکے۔ میں جیسے اپنے بس میں نہیں تھا اور اس آتشی پیکر کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔





آتشی پیکر اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگیا۔ وہ طرطبہ تھی' میرے باپ ہاموس کی دوسری بیوی' میری سوتیلی ماں! اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر حسین ہوگی۔

"میرے بچے!" طرطبہ کی سحرانگیز آواز ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں دوسرے ہی لمحے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سماچکا تھا۔ خلافِ توقع مجھے انتہائی ٹھنڈک کا احساس ہوا پھر جیسے ہی اس کے ہونٹوں نے میری پیشانی کو چھوا' میرے سارے وجود میں آگ سی لگ گئی اور میں چیخ اٹھا۔ عین اسی لمحے مجھے طرطبہ کی چیخ سنائی دی اور پھر پھنکار کی آواز آئی۔ میں ایک جھٹکے سے دور جا گرا۔ اس کے بعد میری آنکھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ طرطبہ کا وجود سمٹتے سمٹتے پھنکاریں مارتی ہوئی ایک ناگن کے پیکر میں تبدیل ہوگیا۔ یہ منظر میرے لیے ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز تھا۔ وہ ناگن



تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے ایک اور ناگن کو اس کی راہ میں حائل دیکھا۔ معلوم نہیں وہ کدھر سے لپک کر سامنے آگئی تھی۔ اس وقت نے میں نے اسنی کی خوشبو محسوس کی تھی۔ مجھے شاید طرطبہ کے حملے سے بچانے کے لیے اسنی نے بھی ناگن کا پیکر اپنالیا تھا۔ طرطبہ کو خود میں نے ناگن بنتے دیکھا تھا۔

وہ دونوں اپنے پھن پھیلائے ایک دوسرے پر حملے کررہی تھیں پھر ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یقیناً وہ دونوں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ اس چھوٹے سے میدان میں وہ حیران کن جنگ جاری تھی۔ ٹیپو مجھ سے کچھ فاصلے پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں ہوش میں تھا مگر جیسے میرے جسم میں جان نہیں تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ ٹیپو کی بے ہوشی کا سبب یقیناً وہ حیران کن مناظر ہی تھے جو شاید اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔

اسنی اور طرطبہ کے درمیان معرکہ آرائی جاری ہی تھی کہ سانپوں کا ایک گروہ میں نے تیزی سے ان دونوں کی طرف بڑھتے دیکھا پھر تو اس میدان میں ہر طرف سانپ ہی سانپ نظر آنے لگے جن کے رنگ نمایاں طور پر جدا تھے۔ ایک گروہ سیاہ سانپوں کا تھا اور دوسرے گروہ کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ میدان میدان جنگ میں تبدیل ہوگیا۔ ایک وقت اتنے سارے سانپ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

طرطبہ کا رنگ سیاہ تھا اور اسنی نے گہرا سبز رنگ اختیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسنی کے مددگار اہل ایمان جنات ہوں گے اور طرطبہ کی مدد کرنے کے لیے آنے والے کافر جنات ہی ہوسکتے تھے۔

کفر و ایمان کی جنگ جاری رہی اور لحہ بہ لحہ اس میں شدت آتی گئی۔ کبھی سیاہ رنگ والے گروہ کا غلبہ ہوجاتا اور کبھی سبز رنگ گروہ غالب آنے لگتا۔ میدان میں مردہ سانپوں کا اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان میں سیاہ و سبز دونوں ہی رنگ کے سانپ تھے۔

وہ معرکہ جانے کتنی دیر جاری رہا اور میدان میں پھنکاریں گونجتی رہیں۔ میری نظریں طرطبہ اور اسنی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں مجھ سے قریب ہی تھیں۔

معاً میں نے اپنے جسم میں عجیب سی قوت محسوس کی اور پھر تیزی سے میرا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا۔ میرے ہاتھ میں گراری دار چاقو تھا۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا اور چاقو کھول لیا۔ عین اس وقت جب طرطبہ پھن کاڑھ کر اسنی کو ڈسنے والی تھی میرا ہاتھ تیزی سے آگے بڑھا اور پھر میں نے اس کا پھن تیز دھار چاقو سے کاٹ دیا۔ طرطبہ کے بل کھل گئے اور اس کا جسم اسنی سے الگ ہوکر تڑپنے لگا۔ اسی کے ساتھ سیاہ رنگ سانپوں کا گروہ راہ فرار اختیار کرنے لگا۔ ان میں سے بہت کم ہی فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے۔ سبز رنگ سانپوں کے گروہ نے انہیں گھیر کر مارنا شروع کردیا تھا۔ سیاہ سانپوں کو شاید یہ علم ہوچکا تھا کہ طرطبہ ماری جاچکی ہے۔ میں نے اسنی کی طرف دیکھا تو وہ نڈھال سی سر ڈالے ایک طرف پڑی تھی پھر اچانک ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

کچھ ہی دیر میں اس میدان میں سے جنات غائب ہوچکے تھے۔ سبز رنگ سانپوں کے مردہ جسم بھی اب وہاں نہیں رہے تھے البتہ سیاہ رنگ سانپوں کے مردہ جسم ہر طرف بکھرے نظر آرہے تھے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیپو کو ہوش میں لانے کی کوشش کروں کہ مجھے اسنی کی مخصوص خوشبو اپنے گرد اگرد چکراتی محسوس ہوئی۔

"اسنی!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "تم... تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں طارنوش! ٹھیک ہوں میں۔" اسنی کی نڈھال سی آواز سنائی دی۔ "کچھ زخمی ہوں لیکن جلد ہی صحت یاب ... کے باوجود میں تم سے اس لیے ملنے آئی ہوں میرے بچے کہ عالم جنات میں ایک اندوہناک فیصلہ ہوا ہے۔" اسنی کی آواز سے دکھ کا اظہار ہورہا تھا۔

"کیا فیصلہ؟" میں نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"یہ کہ میں اب تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ مجھے صرف آخری بار تم سے ملنے کی اجازت ملی ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لیے طارنوش کہ طرطبہ تمہارے ہاتھوں قتل ہوچکی ہے اور اس کا تعلق بہرحال قوم جنات سے تھا۔ کافر قبیلوں اور جنات کے اہل ایمان قبیلوں کے درمیان اس بنیاد پر صلح ہوئی ہے کہ تمہیں میرے بھائی ہاموس کی طرف سے ورثے میں جو جناتی صفات ملی ہیں وہ سلب کرلی جائیں اور تم سے عالم جنات کا ہر رشتہ توڑ لیا جائے مگر اب مجھے اس کا کوئی رنج نہیں کیونکہ میری زندگی کا مقصد پورا ہوچکا ہے۔ ہاں اگر دکھ ہے تو صرف یہ کہ اس ملاقات کے بعد تم سے پھر کبھی میری ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ مبارک ہو تمہیں طارنوش کہ تم نے اپنے باپ اور میرے بھائی ہاموس کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ تمہارے باپ ہاموس کو قتل کرنے والی طرطبہ ہی تھی جو آج تمہارے ہاتھوں انجام کو پہنچ گئی۔"

اسنی سے یہ سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ میں نے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لے لیا تھا۔

"اس بدنصیب کی موت اسے خود ہی تم تک کھینچ لائی۔" اسنی مجھے بتارہی تھی۔ "وہ تمہارے باپ کی طرح تمہیں بھی ختم کردینا چاہتی تھی مگر عین وقت پر مجھے مفتی علیا لیش کی زبانی اس سازش کا علم ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ طرطبہ زہریلی ناگن بن کر تمہیں ڈس لیتی میں اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ طارنوش! میری حالت اس وقت ایسی نہیں کہ میں زیادہ دیر تمہارے پاس رک سکوں اس لیے مجھے اپنا ناگوار فرض ادا کرنے دو!"

"کیسا ناگوار فرض اسنی؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے قبیلے کے سردار نے یہ ناگوار فرض میرے ہی سپرد کیا ہے کہ میں تمہارے اندر موجود جناتی صفات سلب کرلوں۔ کیا تم اس پر آمادہ ہو میرے بچے؟"

"اے اسنی! اگر تجھے یہ حکم ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب میرے دل میں بھی کوئی حسرت نہیں رہی کہ میں نے اپنے باپ ہاموس کا انتقام لے لیا۔ مجھے تو اس پر خوشی ہے کہ اب میں بھی دوسرے عام انسانوں کی طرح ہوجاؤں گا۔ ہاں اگر کوئی ملال رہے گا تو بس یہ کہ تجھ سے نہ مل سکوں گا۔"

ادھر میرے الفاظ ختم ہوئے ادھر میں نے اپنے ماتھے پر اس خوشبو کا بوسہ محسوس کیا اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ پھر مجھ پر کیا گزری۔ معلوم نہیں مجھے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ٹیپو مجھے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔



ہم اسی نقشے کے مطابق سفر کررہے تھے جو ہمیں سالار نے فراہم کیا تھا۔ چیل کوٹی میں ہمیں قیام کیے دوسرا دن تھا کہ ایک قافلہ نظر پڑا۔ یہ قافلہ کوئی پچاس ساٹھ خچروں پر مشتمل تھا اور اس میں شامل تمام افراد غیر ملکی تھے۔ ان میں سے صرف پانچ انگریز مسلح تھے' باقی سب زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ زنجیر کا ایک سلسلہ تھا جو ہر ایک کی کمر کے گرد بندھا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ قافلہ ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا گلاب کوٹی کی طرف بڑھ گیا۔

تیسرے روز رات کے وقت جب ہم ایک غار میں مقیم تھے تو ہمیں اپنی تک ودو کا ثمر مل گیا۔ دور نشیب میں ہمیں ذرا دیر کو روشنی نظر آئی۔ ہم اپنی کمیں گاہ سے نکلے اور اسی طرف بڑھتے چلے گئے بعد مگر روشنی دیکھی تھی۔

بیس پچیس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ یہاں ایک پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی پہاڑی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تنگ سی وادی بن گئی تھی۔ یہ دونوں پہاڑیاں تھوڑے فاصلے پر جاکر مل جاتی تھیں۔ اسی سنگم پر کئی چھوٹی چھوٹی روشنیاں جھلملا رہی تھیں ہم پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

وہاں جو کچھ نظر آیا' اس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ کچھ تعمیراتی کام ہورہا ہے۔ اس کام کی نوعیت کا ہمیں علم تھا۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان ایک سمت سے دوسری طرف تک ایک موٹی اور مضبوط دیوار زیر تکمیل تھی۔ دیوار کا ایک کونا ایک پہاڑ میں اور دوسرا سرا دوسرے پہاڑ میں پیوست تھا۔ دیوار کے باہر خاردار تاروں سے ایک لمبا چوڑا احاطہ کھینچا گیا تھا۔ احاطے کے وسط میں لمبی سی ایک بیرک بنی ہوئی تھی جو تاریک تھی۔ احاطے کے چاروں کونوں پر نگرانی کے لیے مچان بنے ہوئے تھے۔

"یہ بندر آخر یہاں کیا کررہے ہیں؟" ٹیپو نے سرگوشی کی۔

"اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ سب کام نہایت رازداری سے کیا جارہا ہے۔" میں نے جواب دیا "آؤ واپس چلیں!"

ہم اسی رات گلاب کوٹی واپس پہنچ گئے۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا' معلوم کرچکے تھے۔ وہاں سے اگلے روز ہم جوشی مٹھ پہنچے جہاں ہماری ملاقات طارق بیگ سے ہوئی۔ اس سے دوستی کا سبب یہ تھا کہ وہ شستہ اردو بولتا تھا' وہ ہم سے گھل مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ علی گڑھ کے صادق بیگ کا پوتا ہے۔ صادق بیگ' آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سپہ سالار جنرل بخت خاں کا ایک ساتھی تھا۔ بخت خاں جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جن ساتھیوں کے ہمراہ نیپال کی طرف نکل گیا تھا' ان میں صادق بیگ بھی تھا پھر صادق بیگ نیپال سے گزرتا ہوا تبت پہنچ گیا تھا اور ایک بستی داپا کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ وہیں اس نے ایک تبتی عورت سے شادی کرلی۔ طارق کی دادی اور والدین اب بھی داپا میں رہتے تھے۔ طارق بیگ قلی کا کام کرتا تھا۔

طارق بیگ ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس علاقے میں فرنگی ایک مقام پر کوئی قلعہ بنا رہے تھے۔ ہم نے طارق کو بہ طور قلی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ ہم انگریزوں کے خلاف مصروف عمل ہیں تو اس کا جوش قابل

دیکھا تھا۔ انگریز [illegible] وہ اب بھی خود کو علی گڑھ کا کہتا تھا اور صرف اتنا جانتا تھا کہ اگر اس کے دادا کو انگریزوں کی وجہ سے ہندوستان نہ چھوڑنا پڑتا تو وہ علی گڑھ ہی میں پلا بڑھا ہوتا پھر ہم نے اسی کی معیت میں ان تمام جگہوں کی سیر کی جن کی نشان دہی نقشے میں کی گئی تھی۔ دو ہفتے کے بعد ہم رانی کھیت پہنچ گئے۔ اسی دن پہلی ٹرین سے ہم بریلی پہنچے جہاں ہم نے ٹرین تبدیل کرنے کے لیے بھاگلپور کا ٹکٹ لیا۔ بھاگلپور سے پھر چھوٹی لائن کی ٹرین کے ذریعے ہمیں گوہاٹی پہنچنا تھا۔

گوہاٹی میں اے کے گھوش اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ہمارا منتظر تھا۔ یہ علی احمد اور مولانا قاسم تھے۔ اگلے ہی روز ہم پانچوں برما روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں ایک برمی نوجوان سکھوتن ہمارا رہبر تھا۔ اس کا تعلق کاچین قبیلے سے تھا۔ اس نے مجھے منہ بولا بھائی بنالیا۔ دو ماہ سفر کے بعد ہم ایک بلند مسطح میدان میں پہنچے جس کے نیچے وادی پھیلی ہوئی تھی۔ وادی میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ سپرابوم گاؤں تھا اور یہاں کاچین قبیلہ بستا تھا۔ اس قبیلے کا سردار سکھوتن کا باپ تھا، اس نے ہماری مدارات کی۔ یہاں سے ہم ہاتھیوں کے ذریعے پندرہ دن میں میتکینا پہنچے اور پھر وہاں رکے بغیر ایک اور چھوٹی سی بستی راڈی کیانا میں قیام کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ہمارے ان دوستوں نے جو برما میں ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہے تھے، وہ تمام مطلوبہ اسلحہ ہمیں فراہم کردیا جس کی رقم ہم پہلے ہی ادا کر چکے تھے۔ اسی رات ہم نے راڈی کیانا سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس سے قبل گھوش نے برما میں مقیم ان ہندوستانی دوستوں سے ہمارا تعارف نہایت تفصیل سے کرایا جو مستقبل میں بھی ہمارے لیے اسلحہ کی مستقل فراہمی کا وسیلہ بن سکتے تھے۔ اب ہم ان سے براہِ راست رابطہ قائم کرسکتے تھے۔

جس وقت ہم برما سے روانہ ہوئے تھے گرمیوں کا موسم تھا اور اب گزرتے جاڑے تھے۔ اس سفر میں برما میں وہ رابطے پیدا ہوئے جو بعد میں سبھاش چندر بوس اور جنرل شاہنواز کے کام آئے۔

○☆○

فاطمہ سے میری وہ ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ بخت خاں اور جوگیندر نے یقیناً ہمارے لیے دانستہ تنہائی میں ملاقات کا وہ موقع فراہم کیا تھا۔ جوگیندر نے کچھ خریداری کا بہانہ کیا تھا اور بخت خاں بھی اس کے ساتھ یہ کہہ کر چل دیا تھا کہ مجھے بھی کچھ خریدنا ہے۔ ترکمان گیٹ [illegible] تنظیم ہی کے ایک کام سے فاطمہ اور بخت خاں کو لکھنؤ روانہ ہونا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز فاطمہ بہت بے چین تھی۔ میں اس میں گم تھا اور وہ نہ جانے کہاں گم تھی۔

"فاطمہ!" میں نے اسے پکارا۔

"ہوں!" اس نے ہنکارا بھرا اور میرے سینے کے بالوں میں اپنا منہ چھپالیا۔

"کیا سوچ رہی ہو تم؟"

"معلوم نہیں شاہین کہ مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور... اور پھر ہم... ہم کبھی نہ مل سکیں گے" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے فاطمہ!" میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر خود سے اور قریب کرلیا۔

"کیسی عجیب بات ہے شاہین کہ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو اور... اور میں تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی" وہ بڑی حسرت سے بولی۔

"تو سنو فاطمہ! تنظیم کے اصول کچھ بھی ہوں مگر میں آج تمہیں سب کچھ بتادوں گا کہ میرا اصل نام خار نوش ہے اور..." پھر میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔

اس نے سب کچھ بڑی حیرت سے سنا، میری آپ بیتی تھی بھی حیرت انگیز! آج اس کے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا تھا پھر ہم اس وقت تک ایک دوسرے میں گم رہے جب تک جوگیندر اور بخت خاں نہ لوٹ آئے۔

دوسرے دن صبح فاطمہ، بخت خاں کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوگئی۔ میں اور جوگیندر دہلی میں مجاہدِ اوّل کے حکم کا انتظار کررہے تھے۔

بخت خاں اور فاطمہ کو لکھنؤ گئے تیسرا دن تھا کہ وہ ہولناک اطلاع ہمیں مل گئی۔ فاطمہ کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور مقابلے کے دوران میں بخت خاں شدید زخمی ہونے کے باوجود فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ لکھنؤ میں وہ دونوں حضرت گنج کے علاقے میں ٹھہرے تھے۔ وطن پرست تنظیم کے اس ٹھکانے پر پولیس نے زبردست چھاپا مارا تھا۔ وطن پرستوں میں سے دو شہید ہوگئے تھے اور پانچ پولیس والے مارے گئے تھے۔ میرے لیے یہ خبر بھی انتہائی سنسنی خیز تھی کہ انٹیلی جنس کی ڈپٹی ڈائریکٹر کیتھی بھی ان دنوں لکھنؤ میں تھی اور یہ "کارنامہ" اسی کا تھا۔ لاہور میں اس سے میرا زبردست معرکہ ہوچکا تھا۔

"کیتھی اب تیری زندگی کے دن پورے ہو چلے ہیں۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا!" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

اسی روز جوگیندر اور میں لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ مقامی وطن پرست اراکین اب تک یہ سراغ نہیں لگا سکے تھے کہ فاطمہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ ان سے البتہ مزید دیگر باتوں کا علم ضرور ہوا۔ راجا صاحب محمود آباد کے ذریعے یہ معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے یوپی کے گورنر بٹلر کے ہاں فاطمہ کی فائل دیکھی تھی۔ خود بٹلر نے انہیں یہ کہتے ہوئے فائل دی تھی کہ اب ہندوستان کو شاید آزادی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہندوستان میں جتنی حریت پسند خواتین ہیں، ان میں فاطمہ سب سے کم عمر اور سب سے نڈر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک ہے۔

یہ سب سن کر میں نے کہا تھا "وہ ایک محبِ وطن لڑکی ہے اور محبت انسان کو نڈر بنادیتی ہے۔"

جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہوجاتا کہ فاطمہ کو کہاں رکھا گیا ہے، ہم اس کی رہائی کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مقامی وطن پرست ارکان اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ہمیں لکھنؤ پہنچے تیسرا دن گزر چکا تھا اور اب رات ہوچکی تھی۔ اسی رات ہمیں وہ اطلاع مل گئی جس کا ہم بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔

کیتھی نے فاطمہ پر تشدد کی انتہا کردی تھی مگر فاطمہ نے زبان نہیں کھولی تھی۔ فاطمہ سے وہ میرے اور مجاہدِ اوّل کے بارے میں معلوم کررہی تھی۔ فاطمہ کا بس یہی جواب تھا "میں نہیں جانتی، مجھے نہیں معلوم۔"

جن افراد نے فاطمہ کے متعلق معلومات فراہم کی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فاطمہ جیسی پُرعزم لڑکی نہیں دیکھی۔ اس کے ناخنوں میں سوئیاں پیوست کی گئیں، پیر کے تلوؤں پر ڈنڈے برسائے گئے، اس کے ماتھے پر رسی باندھ کر ڈنڈے سے بل دیے گئے مگر اس کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی۔

یہ تفصیلات سن کر میں کانپ گیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میری فاطمہ میری نازک سی کومل فاطمہ سے وہ درندے کتنا سفاکانہ سلوک کررہے تھے۔ میرا دل ان کے خلاف نفرت سے بھر گیا۔

اس کے علاوہ مقامی ساتھیوں نے جو کچھ معلوم کیا، یہ تھا کہ فاطمہ کو بٹلر ہاؤس کے ایک حصے میں رکھا گیا ہے۔ بٹلر یوپی کا گورنر تھا اور راجا صاحب محمود آباد سے اس کی دوستی تھی۔ بٹلر ہاؤس، لکھنؤ میں عہدِ غلامی کی بدترین یادگاروں میں سے ایک تھا۔ ان دنوں بٹلر ہاؤس کا ایک حصہ مکمل طور پر کیتھی کے تصرف میں تھا۔ گورنر بٹلر نے اس مکان میں سجنے والی شراب و شباب کی محفلوں کو چند روز کے لیے ملتوی کردیا تھا۔ فاطمہ، بٹلر ہاؤس کے اسی حصے میں تھی جو کیتھی کے تصرف میں تھا۔ کیتھی کا حکم تھا کہ فاطمہ کو اذیتیں دی جائیں لیکن اس حد تک کہ وہ مرنے نہ پائے۔ اس کے حکم کے مطابق فاطمہ کو اس وقت تک زندہ رہنا تھا جب تک وہ زبان نہ کھول دیتی۔

آخری خبر یہ تھی کہ کیتھی انگریز اہل کاروں پر سخت برہم تھی جو ابھی تک فاطمہ کی زبان نہ کھلوا سکے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ خود فاطمہ سے نمٹے گی۔

یہ وہی رات تھی۔ میں اور جوگیندر، بٹلر ہاؤس کے اسی حصے کی چھت پر موجود تھے۔ ہم نے زیادہ بھیڑ بھاڑ سے گریز کیا تھا ورنہ وہاں تک نہ پہنچ سکتے۔

نیچے قبرستان کا سا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سب انگریز تھے اور تیزی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ ان کے انداز سے گھبراہٹ اور تشویش عیاں تھی۔ اس عمارت کے اس حصے میں بہت سخت پہرا تھا۔ پہرے پر صرف انگریز فوجی متعین تھے۔ ان میں کوئی بھی ہندوستانی نہ تھا۔ واقعی میری فاطمہ بہت عظیم تھی، بہت نڈر تھی۔

ہم نے چھت سے جھانک کر نیچے پھیلے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ ان غیر معمولی سرگرمیوں کا سبب کیا ہے! ایک طرف سے گورنر بٹلر اور کیتھی بڑی تیزی سے اسی حصّے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی رفتار سے عجلت کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی عیاں تھی گویا انہیں کوئی بہت ہی بری خبر ملی ہو۔

ہم اس وقت طویل چھت کے ایک کونے پر تھے۔ صرف چار روشن دان اس حصّے میں ایسے تھے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ برآمدے کی چھت سے چپکے ہوئے ہم ان ہی روشن دانوں کی طرف بڑھ گئے۔

پہلے دو روشن دان جس کمرے میں کھلتے تھے' وہ خالی تھے۔ ہم وہاں سے آگے رینگ آئے۔

دوسرے کمرے میں گورنر بٹلر' کیتھی اور دو انگریز افسر موجود تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لوہے کا اسپرنگ والا پلنگ تھا۔ اس پر کوئی بستر نہ تھا۔ اس پلنگ پر فاطمہ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ اس کی ساری بے ترتیب تھی۔ بدن کے کھلے ہوئے حصّوں پر تشدّد کیے جانے کے نشانات تھے۔

"یہ سب کیا ہوا؟" کیتھی نے ایک انگریز افسر سے سوال کیا تھا "اسے زہر کس نے فراہم کیا تھا؟"

"کچھ پتا نہیں مس!" انگریز افسر نے جواب دیا "آپ چلی گئیں تو آپ ہی کی ہدایت کے مطابق میں آدھے گھنٹے بعد اس سے پوچھ گچھ کے لیے آیا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بتایا تھا کہ اس نے زہر کھالیا ہے۔"

فاطمہ مرچکی ہے۔ اس خیال سے میرے ذہن میں جیسے گرم گرم ریت کے بگولے اڑنے لگے۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ میرا سب سے حسین خواب بکھر کر رہ گیا تھا۔

"اس کی لاش کو چھیڑا گیا ہے؟" کیتھی نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

پھر کیتھی پلنگ پر جھکی اور اس نے فاطمہ کی لاش کو سیدھا کر دیا۔ فاطمہ کی گردن اس طرح مڑ گئی تھی کہ اس کا چہرہ روشن دان سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے رخساروں پر خراشوں کے نشان تھے' ماتھے پر سیاہی مائل لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے بازوؤں پر جگہ جگہ سے خون رس کر جم گیا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کی باچھوں سے لعاب سا بہہ گیا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

کیتھی نے جھک کر ایک مٹھی کو کھولا۔ اس میں سے سفید رنگ کا زردی مائل چھوٹا سا مڑا ہوا لفافہ نکل کر فرش پر گر گیا۔ کیتھی نے وہ لفافہ اٹھالیا جسے میں خوب پہچانتا تھا۔ ایسا ہی ایک لفافہ خود میرے پاس بھی تو تھا جس میں زہر کی گولیاں تھیں۔ مجاہد اوّل نے یقیناً کسی ایسے ہی موقعے کے لیے فاطمہ کو بھی زہر کی گولیاں دی تھیں۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میں چیخنا چاہتا تھا' فاطمہ کی لاش سے لپٹنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فاطمہ کے بھائی جوگیندر کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں رہی ہوگی۔

گورنر بٹلر' کیتھی کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

"پھر کیا ہوا تھا؟"

"میں نے ایک آدمی فوراً آپ کی طرف دوڑایا تھا جناب" اسی انگریز افسر نے جواب دیا "پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ مر گئی۔"

"کچھ بتایا؟" کیتھی نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں" انگریز افسر نے کہا "اس نے صرف یہ درخواست کی تھی کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں' میری لاش کو جلایا نہ جائے' دفن کیا جائے۔" انگریز افسر کا لہجہ بھی کچھ متاسفانہ تھا "آخری لمحات میں یہ میرے دیوتا' طارنوش میرے دیوتا کہتے کہتے خاموش ہوگئی تھی۔ مرتے وقت اس کی زبان پر طارنوش کا نام تھا۔"

"طارنوش!" کیتھی دانت پیستے ہوئے غرائی۔

"یہ واقعی ایک عظیم اور بہادر لڑکی تھی" گورنر بٹلر بولا "جس قوم میں ایسی لڑکیاں ہوں کیتھی' اسے زیادہ دن غلام نہیں رکھا جاسکتا۔ میں اس عظیم لڑکی کو سلام کرتا ہوں" اور واقعی بٹلر نے فوجی انداز میں فاطمہ کو سلامی دی۔

یہ منظر دیکھ کر کمرے میں موجود دوسرے انگریز افسروں نے بھی فاطمہ کی لاش کو سلامی دی تھی اگر سلامی کے لیے ہاتھ نہیں اٹھے تھے تو صرف کیتھی کے۔

"اس مجاہدہ کی آخری خواہش پوری کی جائے۔ اس کو دفن کیا جائے!" گورنر بٹلر نے حکم دیا پھر فاطمہ کی لاش کے احترام میں وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا اور باہر جانے کے لیے مڑ گیا۔

اسی وقت ایک فائر کی آواز گونجی تھی۔ یہ فائر میں نے کیا تھا مگر اس سے ذرا پہلے ہی جوگیندر نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر مجھے فائر کرنے کے ارادے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ میرا ہاتھ ہل گیا' نشانہ خطا ہوگیا اور کیتھی بچ گئی۔

اس کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہوگیا جوگیندر بولا "یہ کیا کیا تم نے! بھاگو!"

جوگیندر کے ساتھ میں امین آباد پارک کے علاقے میں واپس آگیا۔ بٹلر ہاؤس سے بچ کر نکل آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ میں شکستہ اور نڈھال تھا۔ میرا سینہ انتقام کی آگ سے دہک رہا تھا۔ کاش جوگیندر نے اس وقت میرا ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو فاطمہ کی قاتل کیتھی زندہ نہ ہوتی۔ غم کی شدّت کے باوجود میں دل ہی دل میں شرمندہ تھا کہ اپنی فاطمہ کا انتقام نہ لے سکا۔

جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں ہمارا دل گھبرانے لگا تو گومتی کے کنارے جا پہنچے۔ ہم دونوں گومتی کی لہروں کو کناروں سے سر پٹختے' سسکیاں لیتے سنتے رہے۔ آس پاس پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں ہوا دھیرے دھیرے غم سے بوجھل بہہ رہی تھی۔ پورا ماحول سوگوار اور غمگین تھا۔ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی پھر ہمیں محسوس ہوا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے تاریکی کا ایک حصّہ متحرک ہوگیا۔ یہ دھبا حرکت کرتا ہوا قریب آگیا۔ ایک سیاہ ہیولا ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا پھر اس دھبے سے آواز ابھری۔ اس نے ہم دونوں کو نام لے کر مخاطب کیا۔ وہ مجاہد اوّل کی آواز تھی جو اب کہہ رہا تھا "ہندوستان ایک عظیم اور بہادر بیٹی سے محروم ہوگیا ہے۔ یہ صرف تم لوگوں کا غم نہیں پورے ہندوستان کا غم ہے" مجاہد اوّل کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

ہم دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ ہمارے پاس کہنے کو تھا ہی کیا مگر میں نے مجاہد اوّل کے ان الفاظ کو حقیقت کے بہت قریب جانا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ہندوستان ہوں' ہاں میں ہندوستان تھا۔ میں اور میرے ساتھی اپنے اپنے وجود میں مکمل ہندوستان تھے۔ مجاہد اوّل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' یہ سارے ہندوستان کا غم تھا۔

"میں تمہارے غم کو خوب سمجھتا ہوں" مجاہد اوّل کی آواز پھر بلند ہوئی "تم سب میرے بچے ہو۔ میں تمہارے ہر ساتھی کی موت پر خون کے آنسو رویا ہوں۔ میرا یہ دل ایک قبرستان ہے جہاں نہ معلوم تمہارے کتنے ساتھیوں کی لاشیں دفن ہیں مگر ہر غم نے' ہر تازہ گھاؤ نے میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو اور بھڑکایا ہے۔ یہ غم مجھے بے عمل نہیں بناسکے۔ میں صفدر (جوگیندر کا تنظیمی نام) اور موہن لال سے شرمندہ ہوں۔ نہ میں اسے یہاں بھیجتا نہ شاید اس کی گرفتاری عمل میں آتی۔"

مجاہد اوّل ایک چٹان تھا جس میں ایک بے حد نرم دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے اعصاب آہنی تھے مگر دل گداز تھا۔ وہ ایک حریت پسند تنظیم کا سربراہ تھا' وہ سرفروشوں کی فوج کا بے جگر سوار تھا اسی لیے کبھی وہ جذبات کو اپنے مقصد پر غالب نہیں آنے دیتا تھا۔

"یہاں سے تم سیدھے ہربرشاد کے گھر جاؤ گے صفدر!" مجاہد اوّل نے جوگیندر کو مخاطب کیا "تم اس کے گھر سے واقف ہو۔ اس کے مہمان خانے کا دروازہ تمہیں کھلا ملے گا۔ وہاں سوشیلا تمہاری منتظر ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی یہاں پہنچی ہے۔ اچھا میں چلا۔ شاہین! تم امین آباد ہی میں ٹھہرو گے۔"

مجاہد اوّل چلا گیا اور پھر ہم دونوں بھی جدا جدا راستوں پر چل کھڑے ہوئے۔ ہربرشاد لکھنؤ کی نمایاں سیاسی شخصیات میں سے ایک تھا۔

پھر اسی روز رات ہونے سے قبل مجھے ایک مقامی ساتھی نے پیغام دیا کہ میں بھی جوگیندر اور سوشیلا کے پاس پہنچ جاؤں' سو میں نے ایسا ہی کیا۔

رات کا آخری پہر تھا کہ مجاہد اوّل بھی وہاں پہنچ گیا۔ سیاہ چمکتی آنکھوں نے کمرے اور ماحول کا جائزہ لیا پھر اس نے کہا "میرے بیٹو! میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں' اس لیے کہ اس غم کا داغ میرے دل پر بھی ہے مگر یاد رکھو' ہم ایک حقیقی جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ جنگ کوئی ڈراما نہیں ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور تم جانتے ہو کہ جنگ میں بہت سے دوست کام آتے ہیں۔ فاطمہ کا غم اپنی جگہ مگر ہمیں اس مقصد کو عزیز رکھنا ہے جس کے لیے فاطمہ نے اپنی جان دے دی اور مقصد کو قربان نہیں کیا۔ اس کے لیے زندگی کا سودا کرنا مشکل نہیں تھا۔ اذیتیں جب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو اس نے اپنی جان دینے کا فیصلہ کیا اور ہندوستان کی حریت پسند خواتین میں اپنا نام درج کرالیا۔"

"ہمیں اپنا مقصد اسی طرح عزیز ہے جیسے فاطمہ کو تھا" جوگیندر بول اٹھا۔

"اب میں تمہیں اس مہم کے بارے میں بتاتا ہوں کہ جس کے لیے ہم کئی ماہ سے تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہماری یہ مہم اسی سال سردیوں میں شروع ہوگی۔ تمہارے ساتھی اس مہم کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ شاہین! جس علاقے میں تم نے تعمیراتی کام ہوتے دیکھا تھا وہاں انگریز مہلک کیمیائی اسلحہ کا کارخانہ قائم کر رہے ہیں۔" مجاہد اوّل نے چند لمحے توقف کیا پھر بولنے لگا "اس کارخانے کی تعمیر کے لیے وہ مقا،

اس لیے چنا گیا ہے کہ کیمیائی اسلحہ کی تیاری میں استعمال ہونے والا خام مواد وہاں دستیاب ہے۔ انگریز اس کی تعمیر جرمن اور ترک جنگی قیدیوں سے کرا رہے ہیں۔"

"مگر جناب' انہوں نے یہ فیکٹری برطانیہ ہی میں کسی جگہ قائم کیوں نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ برطانیہ میں ایسا اسلحہ تیار کرنے کے لیے خام مال وافر مقدار میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ کے سبب برطانیہ میں جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ برطانیہ کے سیاست دانوں اور جنگی ماہرین کا خیال ہے کہ اگرچہ جنگ ختم ہو چکی ہے' جرمنی کی شکست ہوئی ہے لیکن جرمنی اس شکست کو ایک دائمی حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے یہ اسلحہ ساز کارخانہ ہندوستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں لگایا ہے تاکہ اس وقت برطانیہ میں سرگرم عمل جرمن جاسوسوں کو اس کی سن گن نہ لگ سکے' دوسرے اس لیے بھی کہ مستقبل میں ہونے والی جنگ میں جرمن اس تک آسانی سے نہ پہنچ سکیں۔ ان کا اندازہ ہے آئندہ جنگ بیس بائیس سال بعد متوقع ہے" مجاہد اوّل نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

"مگر اس کے لیے موسم سرما کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔ جب کہ وہ موسم اس مہم کو ... دشوار بنادے گا؟" جوگیندر نے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ اگلے دو تین ماہ میں یہ فیکٹری مکمل ہوجائے گی" مجاہد اوّل بتانے لگا "ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس فیکٹری کو اس وقت تباہ کیا جائے جب یہ مکمل ہو کر اپنا کام شروع کردے تاکہ انگریزوں کی یہ کوشش قطعی طور پر ناکام ہوجائے۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کرنے کا ایک اور سبب بھی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ کیمیائی اسلحہ کا یہ فارمولا ایک جرمن سائنس داں کے ذہن کی اختراع ہے۔ انگریزوں نے اس سائنس داں کو عین اس وقت اغوا کیا جب وہ اس فارمولے پر کامیاب تجربہ کرچکا تھا۔ اس کا معاون دراصل ایک انگریز سائنس داں تھا۔ اسی نے جرمن سائنس داں کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔ جرمن سائنس داں کو اغوا کرکے سیدھا ہندوستان پہنچایا گیا۔ اسے ہندوستان میں کہاں رکھا گیا ہے اس کا علم صرف وائسرائے کو ہے۔"

مجاہد اوّل جو کچھ بتا رہا تھا' اسے ہم بڑی ... اور انہماک سے سن رہے تھے۔

"کہا جاتا ہے کہ نینی تال کے علاقے ... والی اسلحہ ساز فیکٹری کا نقشہ اس سائنس داں ہی کی مدد سے تیار کیا گیا ہے" مجاہد اوّل بتا رہا تھا۔

"کیمیائی اسلحہ کی تیاری کا فارمولا اس کے ذہن میں ہے۔ لاکھ تشدد کے باوجود اس نے یہ فارمولا انگریزوں کو نہیں بتایا۔ ہاں وہ اس پر ضرور آمادہ ہو گیا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے' اس فارمولے پر عمل درآمد کرتے ہوئے مطلوبہ مہلک بم تیار کرتا رہے گا۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح وہ اس ہتھیار کی ہلاکت آفرینی کو محدود کرسکے گا۔ یہ ہماری سب سے اہم مہم ہوگی" مجاہد اوّل نے پرزور و پرجوش آواز میں ہم سے کہا "اس فیکٹری کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لیے ضروری اسلحہ' اس مہم کے آغاز سے بہت پہلے اس علاقے میں تمہارے مستقر پہنچ جائے گا۔ نینی تال کے مضافات میں سیاحت سے متعلق ٹیپو نے اپنی جو رپورٹ پیش کی ہے' اس کے مطابق ہم نے اس علاقے میں' بعض غاروں کے اندر اپنے مورچے اور مستقر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت تک ٹیپو ان غاروں میں یہ گولہ بارود جمع کرچکا ہوگا۔ ان دنوں ٹیپو اسی کام میں مصروف ہے اور طارق بیگ بھی اس کے ساتھ ہے۔ طارق کی وجہ سے ٹیپو کو بڑی آسانی ہوئی ہے۔ وہ علاقہ طارق کا دیکھا بھالا ہے اور مقامی بولی سے بھی واقف ہے۔ وہ خوش ہے کہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے خلاف مصروف جہاد ہے۔"

"میں ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں جناب! اگر مناسب سمجھیں تو بتادیں" میں بولا اور پھر مجاہد اوّل کی اجازت پا کر کہا "اس فیکٹری سے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ کیا وہی انگریز ولسن ہے جسے ہم نے راولپنڈی میں اغوا کیا؟"

"کسی حد تک!" مجاہد اوّل نے جواب دیا "وہ دبلا پتلا منحنی شخص بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ثابت ہوا۔ وہ واقعی اپنے تنگ سینے کے چھوٹے سے پنجرے میں شیر کا دل رکھتا تھا۔ اس نے ہمیں چھوٹی چھوٹی باتیں بتائی تھیں لیکن ان سے ہمیں بہرحال ایسے اشارے مل گئے جو ہمارے لیے بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ اس کے بعد تمہیں اور ٹیپو کو نینی تال کے علاقے کی سیاحت پر بھیجا گیا تھا پھر باقی معلومات ہم نے اپنے ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ انگریزوں میں بھی غدار ہوسکتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں موجود انگریز افسر' وارن ہیسٹنگز کی طرح دولت کی ہوس رکھتے ہیں۔ بہرحال ٹیپو نے اس علاقے میں اب تک کام کے بارے میں جو رپورٹ ... ہے' یہ اس کی نقل ہے" مجاہد اوّل نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم اس رپورٹ کا مطالعہ کرو۔ اس میں فیکٹری کا ایک نقشہ بھی ہے جو ٹیپو نے کسی طرح حاصل کیا ہے۔ تم اس رپورٹ اور نقشے کا بہ غور مطالعہ کرو اور سوچو کہ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے! ایسا ایک منصوبہ ٹیپو بھی تیار کر رہا ہے۔ میں بھی اپنے طور پر سوچ رہا ہوں۔ ہم سردیوں میں نینی تال کے مضافات میں اپنی مہم کے مستقر پہنچ کر ان تینوں منصوبوں پر غور کریں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ کون سا منصوبہ قابل عمل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے ہمارے پاس تین متبادل منصوبے ہوں جن میں موقع پر معمولی ردوبدل کی جاسکے۔"

"اس عرصے میں ہم کیا کریں گے؟" جوگیندر نے سوال کیا۔

"اب سے دو ماہ بعد تم دونوں شملے پہنچو گے اور وہاں کے پہاڑی علاقے میں زندگی گزارنے کی مشقیں کروگے۔ سوشیلا تم سے پہلے روانہ ہوجائے گی" پھر مجاہد اوّل اٹھ کھڑا ہوا۔ چلنے سے پہلے اس نے سوشیلا کو مخاطب کیا "تم بہادر بھائی کی بہن اور بہادر باپ کی بیٹی ہو' مجھے خوشی ہے' اس مہم میں تم نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔"



پھر وہ مہربان رات آ ہی گئی جو ہمارے لیے ماں کی آغوش کے مانند تھی۔ آج رات میرے سینے میں بھڑکتا ہوا انتقام کا الاؤ سرد ہونے والا تھا۔ میں اور جوگیندر اسی رات لکھنؤ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ آج ہی رات ہمیں کیتھی سے فاطمہ کا انتقام لینا تھا۔ ہری پرشاد سے رخصت ہو کر ہم رات کی تاریکی میں باہر آگئے۔

ہم اس وقت اسلحہ سے خاصے لیس تھے۔ ہمارے پاس چار پستول تھے' چاروں میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اسی کے ساتھ ہمارے پاس فالتو راؤنڈز بھی تھے۔ جوگیندر کے پاس ایک تھیلے میں چھ دستی بم تھے۔ ہم بٹلر ہاؤس کی طرف بڑھتے رہے۔ ابھی ہم ایک موڑ پر کھڑے ہی تھے کہ دو سپاہی ہمارے سامنے آگئے۔ وہ ہمارے پاس سے گزر گئے۔ ہم دیوار سے چپک کر بے حس و حرکت ہوگئے تھے۔ آس پاس کہیں کوئی اور شخص نہیں تھا پھر ہم ان سپاہیوں کے پیچھے روانہ ہوگئے اور پھر انہیں پستول سے دھمکا کر ایک طرف لے چلے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مسجد تھی جس کے پہلو میں کنواں بنا ہوا تھا۔ کنویں کے پیچھے املی کا گھنا پیڑ تھا۔

جان کس کو پیاری نہیں ہوتی! وہ خاموشی سے وہی کرتے رہے جو ہم ان سے کہہ رہے تھے۔ ہم نے ان کی وردیاں

اتروالیں اور ہاتھ پیر باندھنے کے ساتھ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تب ہم نے اپنے کپڑے اتار کر ان کی وردیاں پہن لیں۔ انہیں کنویں میں لٹکا کر ہم بٹلر ہاؤس کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں ہمیں اپنی وردی سے سپاہی سمجھا جاتا۔

بٹلر ہاؤس کے جس حصے میں کیتھی مقیم تھی' اب ہمارے سامنے تھا۔ اس طرف حفاظتی انتظامات غیر معمولی ہی نظر آئے۔ گیٹ پر مسلح سپاہی موجود تھے۔ ہم ادھر سے گزرتے ہوئے مشرق کی سمت میدان کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کونے پر بنے ہوئے مچان پر ایک مسلح فوجی پہرا دے رہا تھا۔

میں نے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے نیچے دیکھ کر ہماری طرف ہاتھ ہلایا اور پھر اپنی جگہ مستعد کھڑا ہو گیا۔ اب ہم نسبتاً تاریکی میں تھے۔

"آج تو بہت زیادہ چوکسی ہے" میں نے جوگیندر سے دھیمی آواز میں کہا "گزشتہ مرتبہ جب ہم داخل ہوئے تھے تو ایسا نہیں تھا۔"

اس وقت ہم ایک درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ درخت پر سے ٹارچ کی روشنی چمکی گئی۔

"کون ہے؟" میں نے سوال کیا' ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی اوپر ڈالی۔ درخت میں بنے ہوئے مچان پر ایک سپاہی موجود تھا۔

"ٹھیک ہے" اوپر سے کہا گیا۔

"کوئی خاص بات؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"ہر طرف سناٹا ہے" جواب ملا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم نے بٹلر ہاؤس کا پورا چکر لگالیا۔ واقعی بہت سخت پہرا تھا' چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔

"اب کیا کیا جائے؟" میں نے بے چین آواز میں جوگیندر سے کہا "میرے لیے یہ خیال سوہان روح ہے کہ فاطمہ کی قاتل اس دیوار کی دوسری طرف موجود ہے اور میں کچھ نہیں کرسکتا" میں واقعی سخت الجھن میں گرفتار تھا۔ گیٹ سے اندر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس درخت پر چڑھ کر کچھ روز پہلے ہم دونوں بٹلر ہاؤس میں داخل ہوئے' اس پر بھی آج پہرا تھا۔

"بس ایک ترکیب ہے" جوگیندر بولا۔ اس وقت ہم پھر اسی درخت کی طرف بڑھ رہے تھے جو مشرقی دیوار کے ساتھ تھا اور جس پر ہمارے اندازے کے مطابق ایک سپاہی موجود تھا۔ جوگیندر نے اچانک مجھ سے پوچھا "تمہارے پاس غلیل ہے؟"

"ہے اور اس کے اسپیشل کارتوس بھی موجود ہیں" میں نے جوگیندر کو بتایا۔

"لاؤ مجھے دو" جوگیندر نے کہا "درخت کے نیچے پہنچ کر تم اس پر ٹارچ کی روشنی ڈال کے بات کرنا۔ اس دوران میں میری کوشش یہی ہوگی کہ تاک کر ایسا نشانہ لگاؤں کہ وہ سپاہی بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو جائے۔"

"اگر اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوا؟" میں نے ایک امکانی خطرے کی نشان دہی کی۔

"وہ تو جب تم اس سے بات کرو گے تو معلوم ہو جائے گا" جوگیندر نے جواب دیا "اس وقت یہی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے اگر کوئی اور بھی ہوا تو کچھ اور سوچیں گے۔"

پھر میں چند قدم آگے نکل گیا۔ اب میں اس درخت کے نیچے تھا "سب کچھ ٹھیک ہے؟" میں نے روشنی اوپر ڈال کر پوچھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے" جواب دیا گیا "تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ ذرا پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا "ڈر کے مارے سالے کا پیشاب ہی اترا چلا آرہا ہے۔"

اوپر سے پہلے ہنسی کی آواز ابھری تھی جس کا اختتام ہلکی سی کراہ پر ہوا۔ جوگیندر کا نشانہ واقعی سچا تھا۔ سپاہی آواز نکالے بغیر درخت پر سے نیچے آرہا تھا۔ بھد کی آواز کے ساتھ وہ زمین پر گر چکا تھا۔ اس کے بعد سپاہی کو اچھی طرح باندھ کر جھاڑیوں میں ڈالنا اور رسی کے سہارے مچان پر پہنچنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی میں ہمیں دس منٹ لگے تھے مگر محسوس ایسا ہو رہا تھا جیسے ایک زمانہ بیت گیا ہو۔ اس مچان سے ہم ایک سیڑھی کے سہارے بٹلر ہاؤس میں اتر گئے۔

وسیع و عریض اور خوب صورت لان میں کراٹے کی باڑھ سے روشیں بنائی گئی تھیں۔ باڑھ کے ساتھ ساتھ قطعات کے اندرونی حصوں میں پھولوں کے تختے تھے۔ ہم دونوں پولیس والوں کے مخصوص انداز میں ان روشوں پر بڑھتے رہے۔ صرف ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر بٹلر ہاؤس کا مہمان خانہ تھا جس میں کیتھی ٹھہری ہوئی تھی۔

ہم نے چاروں طرف سے گھوم کر گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لیا۔ ہم اس عمارت سے دور ہی دور رہتے تاکہ کوئی شخص ہمیں قریب سے نہ دیکھ پائے۔ ہم دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیتھی اس وقت گیسٹ ہاؤس کے کس حصے میں ہے۔ اب ہم چکر لگاتے ہوئے گیسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے کی طرف آنکلے تھے کہ کیتھی نظر آگئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں چند افراد کے ساتھ بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔

کیتھی کو دیکھ کر میرے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ جوگیندر کو یقیناً میرے جذباتی ہیجان کا اندازہ تھا۔ اس نے اسی لیے میرا شانہ دبا کر مجھے ذرا دیر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے ادھر سے گزر کر پھر اسی جگہ آگئے جہاں سے بٹلر ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔

"واپسی کے بارے میں کچھ سوچا؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"واپسی کے بارے میں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے جوگیندر کی طرف دیکھا "کیا یہی راہ مناسب نہیں؟" میں نے اسی سیڑھی کی طرف اشارہ کیا جو درخت پر مچان تک جاتی تھی۔

"ہاں، یہ بھی ہے لیکن ہمیں یہاں سے بہت تیزی کے ساتھ نکلنا ہوگا" جوگیندر بولا۔

"اس احاطے سے نکلنے کے بعد دیکھا جائے گا" میں نے جوگیندر سے کہا۔ اس وقت مجھے جوگیندر کی احتیاط پسندی بالکل نہیں بھائی تھی۔

"دوسری طرف کاریں کھڑی ہیں" جوگیندر کہنے لگا "کیا خیال ہے اگر ہم یہاں سے کسی کار میں فرار ہو جائیں؟"

"یہ ہو سکتا ہے" میں بولا "لیکن دھماکا ہوتے ہی کیا ایک دم گیٹ بند نہیں کر دیا جائے گا؟"

"اول تو اس افراتفری میں کوئی شخص بھی فوری طور پر کسی فیصلے کے قابل نہیں ہوگا پھر بھی اگر ایسا ہوا تو ہماری یہ وردیاں کام آئیں گی" جوگیندر نے جواب دیا "میرا تو خیال ہے ہمیں یہی کرنا چاہیے۔"

اسی وقت اس پیڑ پر نیچے سے ٹارچ کی روشنی پھینکی گئی جس کے ذریعے ہم بٹلر ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک آواز بھی ابھری۔ "پریم پال! کہاں ہو تم؟"

آواز دینے والے نے شاید اس سپاہی کو آواز دی تھی جو اس مچان پر پہرا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹارچ کی روشنی مچان پر پڑی پھر اچانک سیٹیاں گونج اٹھیں۔

گویا ہمارے فرار کی یہ راہ مسدود ہو چکی تھی۔ میں نے جوگیندر کا بازو پکڑا اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئے۔ سیٹیوں کی آواز کے ساتھ ہی ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ محافظ دوڑ کر اسی سمت آرہے تھے اور ہم گیسٹ ہاؤس کے مغربی پہلو میں پہنچ گئے تھے۔

"تم اپنا کام کرو!" جوگیندر نے کہا "میں کار اسٹارٹ کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے تھیلے سے ایک دستی بم نکالا، اس کی سیفٹی پن کھینچی اور اسے گیسٹ ہاؤس کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے پھینک دیا۔ زبردست دھماکا ہوا۔ میں اس دوران میں دوسرے دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ چکا تھا۔ اسی وقت میری نظر ڈرائنگ روم کے سامنے والے برآمدے پر پڑی۔ کیتھی اور اس کے مہمان وہیں دہشت زدگی کے عالم میں موجود تھے۔ دوسرا بم میں نے برآمدے میں اچھال دیا۔ آخری بار لپک کر کار کی طرف بھاگتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تھا اور میرے سینے میں بھڑکتا ہوا الاؤ جیسے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ دستی بم کیتھی کے سامنے گرا تھا اور پھر کیتھی کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ دھماکے سے برآمدے کی چھت نیچے آرہی تھی۔ کیتھی کے مہمانوں میں سے اگر کوئی بم سے زندہ بچ گیا ہوگا تو چھت گرنے سے بچنا محال تھا۔ مجھے کسی اور کی موت زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے تو کیتھی کی موت سے دلچسپی تھی جسے میں نے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ فاطمہ کو تو خیر قبر کی آغوش میسر آگئی تھی مگر کیتھی کے نصیب میں یہ بھی نہیں تھا۔ اس کا جسم ٹکڑوں ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر گوشت کے لوتھڑوں کی صورت میں بکھر گیا تھا۔

جوگیندر دھماکوں کے شور اور لوگوں کی چیخ و پکار کے دوران ایک کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں ایک آفت آگئی تھی۔ دھماکوں سے تباہ ہونے والی عمارت سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ کار تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہی خطرہ سامنے آچکا تھا جس کا تذکرہ میں نے جوگیندر سے کیا تھا۔ گیٹ پر دو فوجی موجود تھے۔ وہ دونوں گیٹ کے ایک ایک کواڑ کو دھکا دے کر بند کر رہے تھے۔ جوگیندر نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

"گیٹ کھولو۔ گیٹ کھولو!" جوگیندر زور سے چیخا "میجر نے ڈاکٹر بلانے کو کہا ہے۔ مس کیتھی زخمی ہیں۔"

دونوں فوجی متذبذب کھڑے تھے۔

"جلدی کرو گیٹ کھولو!"

"تم کون ہو؟" ایک فوجی نے پوچھا۔

اسی وقت دوسرے فوجی نے پہلو میں لگا ہوا پستول نکالنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے پہلے میں اپنے پستول سے گولی چلا چکا تھا۔ جوگیندر نے دوسرے فوجی کو نشانہ بنایا تھا پھر میں نے کار سے اتر کر گیٹ کا جو ایک پٹ بند ہو چکا تھا، کھول دیا۔ جوگیندر نے کار کو گیٹ سے نکالا۔ میں لپک کر کار کے دروازے سے کار میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت عقب سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ وہ کئی افراد تھے۔

"ہالٹ!" ادھر سے کہا گیا پھر گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں مگر اس وقت تک کار گیٹ سے مڑ کر ہوا ہو چکی تھی۔

O☆O

فیکٹری کی تباہی کے لیے منتخب کیے جانے والے تمام سرفروش مستقر میں جمع تھے۔ ہماری تعداد نو تھی، یعنی میں، مندر، نیجو، حیدر علی، سراج الدولہ، طارق، سوشیلا، بخت خاں اور اعجاز! بخت خاں اب صحت یاب ہو چکا تھا۔ اعجاز ہمارا ایک نیا ساتھی تھا۔ ہمارے علاوہ خالد اور مجاہد اول بھی موجود تھے۔

مجاہد اول اس وقت بھی حسب معمول اپنے مخصوص لباس میں تھا اور چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ مجاہد اول نے تمام افراد پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "کیا پوری ٹیم موجود ہے" تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر مجاہد اول نے گفتگو شروع کی "فیکٹری کی تباہی کے لیے تم لوگوں نے جو منصوبے پیش کیے تھے، میں نے ان سب کا جائزہ لے لیا ہے۔ اس جائزے کے بعد ہم نے آخری منصوبہ بنایا ہے جس میں تمام منصوبوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ تمام منصوبے اس لیے ناقص تھے کہ تم لوگوں کو نہ تو مکمل معلومات حاصل تھیں، نہ تازہ ترین حالات کا علم تھا۔ تازہ ترین حالات یہ ہیں کہ اس فیکٹری میں کام شروع ہو گیا ہے۔ جرمن سائنس دان ڈاکٹر شمٹ یہیں موجود ہے۔ یہاں ترک اور جرمن جنگی قیدیوں کی تعداد سو کے قریب ہے۔ انگریز فوجیوں کی تعداد تیس سے چالیس کے درمیان رہتی ہے پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ نیجو اور طارق کی رسائی اس فیکٹری تک ہو گئی ہے۔ وہ کچن کے لیے تقریباً روزانہ ہی سامان لے کر فیکٹری جاتے ہیں۔ اس آمد و رفت کے نتیجے میں جرمن سائنس دان ڈاکٹر شمٹ سے بھی ان کے تعلقات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان ترک اور جرمن قیدیوں سے بھی ان کی جان پہچان ہو گئی ہے جو کچن میں کام کرتے ہیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شمٹ ہماری مدد کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو خطرناک بم اب تک تیار ہو چکے ہیں، یہاں سے لے جانے سے پہلے ہی تباہ کر دیے جائیں۔"

یہ واقعی اہم باتیں تھیں اور ان سے ہم اپنے منصوبے کو زیادہ مؤثر بنا سکتے تھے۔

"ہم نے جو منصوبہ تیار کیا ہے، اس میں ان تمام باتوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے" مجاہد اول نے بتایا اور غار کی ایک دیوار پر چاک سے نقشہ بنا کر اپنے منصوبے کی تفصیلات بیان کرنا شروع کر دیں۔

یہ اس مربوط فیکٹری کی مکمل تباہی کا منصوبہ تھا جو دو حصوں پر مشتمل تھا۔ چار افراد کی ایک پارٹی کو خالد کی قیادت میں جوشی مٹھو کی طرف سے کانوں اور سرنگ کے دہانے پر یلغار کرکے سرنگ کے راستے ہم سے آملنا تھا۔ دوسری پارٹی کو جس میں سات افراد شامل تھے اصل فیکٹری پر یلغار کرنا تھی۔ اس کی قیادت خود مجاہد اوّل نے اپنے ذمے لی تھی۔ اس پارٹی کو دو حصوں میں منقسم ہوکر اپنا کام کرنا تھا۔ ایک حصے کا سربراہ میں تھا' دوسرے کا جوگیندر۔

"آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد۔" مجاہد اوّل نے کہا "ہم یہ فیکٹری مکمل طور پر تباہ کرچکے ہوں گے۔"

باہر موسم کی پہلی برف باری کے آثار ہویدا تھے۔ ہوا بہت سرد اور تیز تھی۔ شام ہی کو ژالہ باری ہوئی تھی۔

پھر وہ پندرہ دن بھی گزر ہی گئے۔

تمام ماحول برف کی سفید چادر اوڑھے رات کی خاموشی میں جیسے دم سادھے ہوئے تھا۔ وہ چاند کی چودھویں رات تھی۔ میں اپنے ساتھیوں اور طارق کے ساتھ سفید لباس پہنے اس غار سے نکلا جو گلاب کوٹی کے محاذ پر ہماری آخری چوکی کا کام دے رہا تھا۔ اس مہم کے لیے ہمارے دستے نے سفید لباس پہن رکھے تھے تاکہ سفید پس منظر میں ہماری نقل و حرکت نہ دیکھی جاسکے۔ حد تو یہ ہے کہ اس دن مجاہد اوّل نے شاید پہلی مرتبہ اپنے مخصوص سیاہ لباس کے بجائے سفید لباس پہنا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی سفید نقاب تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ پانچ منٹ بعد جوگیندر اپنی پارٹی کے ساتھ یقیناً نیچے پہاڑ کے دامن میں قیدیوں اور انگریز محافظوں کی بیرکوں کے آس پاس پہنچ جاتا پھر پوزیشن لیتے ہی اسے اپنے چند ساتھیوں سمیت انگریز محافظوں کی بیرک پر دستی بم پھینکنا تھے۔ اس ہنگامے اور افراتفری کے دوران میں ٹیپو کو رائفلوں کے بوجھ کے ساتھ خاردار تاروں کی باڑھ سے گزر کر جرمن اور ترک قیدیوں کی بیرکوں میں پہنچنے کے بعد انہیں رائفلیں اور کارتوس فراہم کرنا تھے پھر ان قیدیوں کو بھی ہمارا ساتھ دینا تھا۔ اس ہنگامے کے دوران میں ان تین محافظوں کا بھی خاص خیال رکھا جانا تھا جو احاطے کے باقی تین کونوں پر بنے ہوئے مچانوں پر متعین تھے کیوں کہ پہلے کونے پر متعین پہرے دار کو تو پہلے ہی ہلے میں نشانہ بنایا جانا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جوشی مٹھو کی کانوں کی سمت سے خالد اور اس کے ساتھیوں کو اپنی کارروائی شروع کرنا تھی۔

مجھے بھی ٹھیک اسی وقت طارق کے ساتھ حرکت میں آجانا تھا۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی خام مال لے جانے والی لفٹ جیسی ٹرالی کو پہاڑ کی کوکھ میں زیرِ زمین بنی ہوئی فیکٹری سے اوپر آنا تھا۔ ڈاکٹر شمٹ نے یقین دلایا تھا کہ وہ اور اس کے چند ساتھی اس ٹرالی میں ایسی خرابی پیدا کردیں گے جس کی وجہ سے خام مال اوپر سے نیچے آنا بند ہوجائے گا اور خطرناک قسم کے بموں کی تیاری رک جائے گی۔ انگریز اتنے پاگل ہورہے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کوئی تاخیر برداشت نہیں کریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں ایک ہفتے بعد مقررہ تعداد میں یہ بم تیار کرکے راولپنڈی بھیجنا تھے۔ جہاں سے ان بموں کو کیمبل پور بھیجا جانا تھا۔ کام رک جانے کی صورت میں بموں کی تیاری میں مصروف شفٹ کے قیدیوں کو بھی بیرکوں کے اندر بھیج دیا جانا تھا۔ ڈاکٹر شمٹ کو چند ساتھیوں سمیت فیکٹری میں رہ کر ہی ٹرالی کی مرمت کرنا تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ پہلے دھماکے کے بعد ہی وہ ٹرالی کو اوپر بھیج دے گا۔

پانچ منٹ بعد ہی تباہی کی یہ مشینری حرکت میں آگئی۔ فضا میں ایک سنسناہٹ ابھری یا پھر یہ سنسناہٹ صرف میرے کانوں میں ابھری تھی۔ میں زمین دوز فیکٹری کے لوہے ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں طارق کے ساتھ موجود تھا۔ ہماری نظریں سامنے اس مچان پر لگی ہوئی تھیں جس کے نیچے فیکٹری میں اترنے والی لفٹ جیسی ٹرالی کی حرکت کے لیے کنواں بنا ہوا تھا۔ اس ٹرالی سے ایک طرف پہاڑ میں موجود کان سے خام مال کھود کر نیچے پہنچایا جاتا تھا۔ کان کا دہانہ اس ٹرالی کے نظام سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اور طارق کان کا پہلے ہی جائزہ لے چکے تھے' وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

اب میں اور طارق نیچے پہاڑ کے دامن میں پہلے دھماکے کی آواز کے منتظر تھے پھر ہمارے کانوں نے وہ آواز سن ہی لی۔ پہلے دھماکے کی خوشگوار آواز کے بعد ہی پے در پے کئی دھماکے ہوئے مگر میرے کان مچان کے نیچے بنے ہوئے کنویں میں ٹرالی کے کھسکنے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

ہماری توقع کے عین مطابق ٹرالی کے قریب بنے ہوئے مچان پر متعین محافظ چونک کر نیچے اترا تھا اور میری رائفل کی نکلی ہوئی گولی نے اسے لاش میں تبدیل کردیا تھا۔ میں اور طارق اگلے لمحے دوڑتے ہوئے مچان کے نیچے پہنچے۔ ٹرالی اوپر آچکی تھی اور ہمیں نیچے لے جانے کی منتظر تھی۔

پھر ہم تیزی سے خام مال لے جانے والی ٹرالی میں سوار ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم زمین دوز فیکٹری میں اتر رہے تھے۔ نیچے پہاڑ کے دامن میں ابھرنے والا شور اب ہمارے

کانوں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ کنویں سے گزر کر ٹرالی اس زمین دوز ہال میں پہنچ گئی جہاں فرش پر اسے ٹھہرنا تھا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ ڈاکٹر شمٹ اور اس کے دو ساتھی' دو انگریز محافظوں سے الجھے ہوئے تھے۔ میں نے پستول نکالا اور ٹھیک اس وقت گولی چلادی جب ان میں سے ایک محافظ ڈاکٹر شمٹ کو دھکا دے کر رائفل سیدھی کرچکا تھا۔ انگریز محافظ گولی کھاکر الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ دوسرا انگریز محافظ بھی اسی انجام سے دوچار ہوا تھا۔ اسی دوران میں ٹرالی فرش پر پہنچ کر رک چکی تھی۔ ہم دونوں اچھل کر ٹرالی سے نکلے۔ اسی وقت دھائیں کی ایک آواز ہوئی۔ ایک سیٹی سی میرے کان کے پاس سے گزر گئی پھر دوسرا دھماکا ہوا اور میرے الٹے بازو میں آگ اتر گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ انگریز محافظ جو میری پہلی گولی سے زخمی ہوا تھا' سرنگ کی دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا اور اس کی رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسے تیسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ طارق کے پستول سے نکلی ہوئی گولی نے اسے دوسری دنیا کی سیر کرادی تھی۔

اس عرصے میں ڈاکٹر شمٹ کے دونوں ساتھی' انگریز محافظوں کی رائفلوں پر قبضہ کرچکے تھے۔ ان کے علاوہ ہم بھی پانچ رائفلیں اور کافی گولیاں ایک لمبے سے تھیلے میں لائے تھے۔ ڈاکٹر شمٹ نے ایک انگریز محافظ کی کمر سے ایک پیٹی کھول کر میری گردن میں ڈال دی تھی اور میرا زخمی بازو اس پٹی کے حلقے میں ڈال دیا تھا۔

"تم میں سے ایک۔۔۔" میں نے ڈاکٹر شمٹ کے ایک ساتھی سے کہا "کانوں کی طرف آنے والے راستے کے دہانے پر جم جاؤ اگر اس طرف سے کوئی انگریز محافظ ادھر آئے تو بلا دریغ اسے گولی ماردینا۔ ویسے اس کی امید نہیں۔"

پھر میں' ڈاکٹر شمٹ' اس کے ساتھی اور طارق کے ہمراہ سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ دہانہ پہاڑوں کے دامن میں اس طرف کھلتا تھا جہاں جوگیندر اور اس کے ساتھی مصروفِ جنگ تھے۔

دو دستی بموں سے سرنگ کے دہانے پر لگا ہوا آہنی جنگلا ٹوٹ گیا۔ ان دھماکوں کی آواز زیرِ زمین تعمیرات کی دیواروں میں دیر تک گونجتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم سرنگ کے دہانے پر تھے۔

جرمن اور ترک جنگی قیدی' جوگیندر کی پارٹی کے لائے ہوئے اسلحے سے جنگ کررہے تھے۔ انگریز محافظ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے اور ابھی بہرحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ فاتح کون ہوگا' مفتوح کون!

سرنگ کا گیٹ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ترک اور جرمن قیدیوں کے ساتھ ہم نے اپنے ساتھیوں کے پُرجوش نعرے سنے۔ ان کی طرف سے فائرنگ میں شدت آگئی۔ دوسری طرف سے انگریز محافظوں نے بھی فائرنگ تیز کردی۔ اس فائرنگ کے درمیان زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں کی چیخیں بھی ابھر رہی تھیں۔

ہم پانچوں سرنگ کے ٹوٹے پھوٹے گیٹ سے ذرا فاصلے پر سرنگ کی دیوار سے چپکے کھڑے تھے پھر ڈاکٹر شمٹ کے اشارے پر اس کے دو ساتھی فرش پر رینگتے ہوئے گیٹ سے باہر پہنچے ہی تھے کہ پے در پے کئی گولیاں چلیں اور وہ دونوں سرنگ کے باہر ہی الٹ گئے۔

"ایک!" قیدیوں کی بیرک سے ایک آواز ابھری۔ ابھی یہ آواز ختم ہی ہوئی تھی کہ دستی بموں کے پے در پے تین دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے انگریز محافظوں کی بیرک میں ہوئے تھے۔ میں' طارق اور ڈاکٹر شمٹ فرش سے چپک کر کھسکتے ہوئے سرنگ سے باہر آئے اور لپک کر ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں ہوگئے۔

ترک اور جرمن قیدیوں کا ایک دستہ فائر کرتا ہوا انگریز محافظوں کی بیرک کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ان کے عقب سے بھی ترک فوجی بیرک سے مسلسل فائر کررہے تھے۔ انگریز محافظ جو دستی بموں کے دھماکوں سے پریشان ہوکر رہ گئے تھے پھر سنبھل چکے تھے اور انہوں نے یلغار کرنے والے قیدیوں پر فائرنگ شروع کردی تھی۔

"سیکنڈ کیپی اٹیک!" قیدیوں کی بیرک سے پھر کاشن ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی محافظوں کی بیرک پر دستی بموں کی بارش ہوئی۔ قیدیوں کا ایک اور دستہ نعرے لگاتا ہوا انگریز محافظوں کی بیرک کی طرف بڑھا۔

اسی وقت انگریز محافظوں کی بیرک سے تین فائر ہوئے اور بیرک کی ٹوٹی ہوئی چھت سے آگے پیچھے تین روشن لکیریں آسمان کی بلندیوں میں پہنچ کر گم ہوگئیں۔ انگریز محافظوں نے شاید یہ آتشی فائر اپنے ساتھیوں کو خطرے کی اطلاع دینے اور مدد طلب کرنے کے لیے سگنل کے طور پر کیے تھے۔ اس کے سوا ان فائروں کا کوئی اور مقصد نہیں ہوسکتا تھا۔ آسمان کی بلندیوں پر پہنچنے والی یہ روشن لکیریں بہت تیز تھیں۔

لڑائی بہت زوروں پر تھی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ ڈاکٹر شمٹ اپنی جگہ نہیں تھا۔

"طارق!" میں نے کہا "ڈاکٹر شمٹ کہاں گیا؟"

محافظوں اور قیدیوں کی بیرکوں کے درمیان برف سے ڈھکے ہوئے میدان میں کئی افراد مردہ پڑے ہوئے تھے۔ کئی افراد فائرنگ کرتے ہوئے محافظوں کی بیرک کی طرف کھسک رہے تھے۔ اسی وقت پھر دستی بموں کے دھماکے ہوئے۔

دستی بموں کے دھماکے کے بعد دو اور دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر شمٹ کی تیز آواز ابھری۔ "انگریزوں کی بیرک سے دور رہو!۔۔۔ انگریزوں کی بیرک سے دور ہٹ جاؤ!۔۔۔ دور ہٹ جاؤ!"

ڈاکٹر شمٹ کی آواز جوگیندر نے بھی سن لی تھی اور یلغار کرنے والے بعض قیدیوں نے بھی! انھوں نے اسی لیے بلند آواز میں ڈاکٹر شمٹ کا پیغام دہرایا۔ ذرا دیر میں یہ پیغام ہر طرف گونج گیا۔ پیش قدمی کرنے والے قیدی پسپا ہونے لگے۔

انگریزوں کی طرف سے مزاحمت ختم ہوگئی۔ اس دوران میں کئی انگریز محافظوں نے بیرک سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ سب گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ انگریز فوجیوں کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

شمٹ میرے پاس واپس پہنچ چکا تھا۔

نصف گھنٹے کے بعد ہم سب مل کر زخمیوں اور مرنے والوں کا شمار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمٹ اور مجاہدِ اوّل سرنگ کے اندر باتوں میں مصروف تھے۔

اس یلغار میں تمام انگریز محافظ جن کی تعداد چالیس تھی، کام آگئے تھے۔ سینتیس ترک اور جرمن قیدی مارے گئے تھے، پندرہ شدید زخمی ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سراج الدولہ شہید ہوا تھا۔ بہرحال ہماری کوشش کامیاب رہی تھی۔ فیکٹری پر اب ہمارا قبضہ تھا۔

ترک اور جرمن قیدی اب ایک منظم اور مسلح فوجی یونٹ کی صورت میں مستعد تھے۔ خود کار نظام کی طرح وہ جرمن کرنل شولز کی کمان میں اس طرح سرگرم تھے جیسے کوئی فوج قلعے میں محصور ہو کر ایک جنگی پلان کے مطابق اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اسی دوران میں تمام زخمیوں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس کام میں سوشیلا بھی پیش پیش تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں مجاہدِ اوّل اور ڈاکٹر شمٹ دو گہرے دوستوں کی طرح کمرے سے نکل آئے۔ ہم سب لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

"دوستو!" ڈاکٹر شمٹ نے کہا "میں تمہارا تعارف ہندوستان کے ایک عظیم مجاہد سے کرا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجاہدِ اوّل کا تعارف مختصر مگر مؤثر انداز میں کرایا۔ "مجاہدِ اوّل اور اس کے ساتھیوں کا مقصد اس ہولناک فیکٹری کو تباہ کرنا تھا۔ اسی مقصد کے تحت اس کے ساتھیوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ اب اس فیکٹری کی مکمل تباہی کا کام ہم کریں گے۔ ہمیں یہ فیکٹری اس طرح تباہ کرنا ہے کہ انگریز اسے دوبارہ استعمال نہ کرسکیں۔ انگریز فوجیوں نے اپنی ہلاکت سے قبل خطرے کا سگنل دیا تھا۔ اس کے بعد ادھر فوجی کمک آنا لازمی ہے لیکن برف باری کی وجہ سے یہ کمک یہاں سات آٹھ گھنٹے سے قبل نہیں پہنچ سکتی۔ اسی مدت میں ہمیں اس تمام شیطانی نظام کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے۔ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے مجاہدِ اوّل کے ساتھیوں نے آس پاس دو مقامات پر بارود، ڈائنامائٹ اور متعلقہ سامان ذخیرہ کر رکھا ہے۔ وہ مقامات تمہیں دکھا دیے جائیں گے۔ کرنل شولز اس پلان کے انچارج ہوں گے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر شمٹ خاموش ہوگیا۔

پھر مجاہدِ اوّل نے مختصر سی تقریر میں ترک اور جرمن قیدیوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس فیکٹری کی مکمل تباہی ہندوستان، ترکی اور جرمنی کے اتحاد کی علامت بن کر تاریخ کے صفحات میں درج ہوگی۔ مجاہدِ اوّل کی مختصر سی تقریر کے خاتمے پر فضا ترک جرمن اور ہندوستان کی دوستی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

"ٹیپو! طارق!" مجاہدِ اوّل کی آواز گونجی "تم دونوں کرنل شولز کو وہ غار دکھاؤ گے جہاں ہم نے فیکٹری کی تباہی کے لیے دھماکا خیز سامان کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔"

یہ حکم سنتے ہی ٹیپو اور طارق، کرنل شولز کی طرف بڑھ گئے۔ کام شروع کرنے سے قبل جرمن قیدیوں نے سب لوگوں کو گرما گرم کافی پلوائی اور پھر وہاں ایک سرگرمی شروع ہوگئی۔ کرنل شولز اس دوران میں ایک میز پر بیٹھا تیزی سے کاغذوں پر اپنا پلان مرتب کر رہا تھا۔ اس کام میں تین ترک اور جرمن فوجی اس کی مدد کر رہے تھے۔

اس نے اپنے ساتھیوں کے تین گروپ بنائے تھے۔ دو گروپوں کو ٹیپو اور طارق کے ساتھ ان غاروں سے تباہی کا سامان فیکٹری میں منتقل کرنا تھا۔ ان میں سے ایک غار گلاب کوٹی کی طرف، دوسرا جوشی مٹھ کی سمت تھا۔ تیسرے گروپ کے سپرد فیکٹری میں تباہی کی تیاریاں مکمل کرنا تھا۔

میں، جوگیندر اور سوشیلا کے ساتھ ایک میز کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ ٹیپو اور طارق دو پارٹیوں کو لے جا چکے تھے پھر میں نے ڈاکٹر شمٹ کو کرنل شولز کے ساتھ بیرک سے نکل کر فیکٹری کی طرف جاتے دیکھا۔ بیرک اب خالی ہو چکی تھی۔ صرف دو جرمن اور ترک قیدی بیرک کے باہر پہرے پر موجود تھے۔ مجاہدِ اوّل، ڈاکٹر شمٹ اور شولز کو بیرک کے برآمدے میں چھوڑ کر واپس آگیا۔

"کہو دوستو!" مجاہدِ اوّل نے کہا "کیسا رہا؟"

"بہت سنسنی خیز!" سوشیلا بولی۔

"سراج الدولہ۔۔۔" جوگیندر نے کہنا چاہا۔

"ہاں سراج الدولہ!" مجاہدِ اوّل دکھ بھرے لہجے میں بولا "ہمارے دلوں کے قبرستان میں اپنے ایک اور ساتھی کی قبر کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ایک اور گمنام مجاہد آزادی کی راہ میں کام آگیا۔ ہمارے دل، ہمارے جسم غلامی سے بنجر ہو جانے والی اس سرزمین میں کھاد بن کر اس دیس کی سرزمین کا بانجھ پن ختم کردیں گے اور اسے وہ زرخیزی عطا کریں گے جس سے آزادی کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔"

"اب ہمارا کام کیا ہے؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"ہمیں اب یہاں سے واپس چلنا ہے۔ چیل کوٹی اور گلاب کوٹی کے راستے رانی کھیت یا کاٹھ گودام پہنچنا اب خطرے سے خالی نہیں ہے" مجاہدِ اوّل نے جواب دیا "پھر ہم سب ایک ساتھ واپس بھی نہیں چل سکتے۔ ہمیں یہاں سے ٹکڑیوں میں واپس جانا ہوگا۔"

"خالد اور اس کے ساتھی؟" میں نے سوال کیا۔

"انہیں یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ہماری طرف سے پہلا رابطہ قائم ہوتے ہی اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ وہ اس وقت جوشی مٹھ کی سمت اس غار میں موجود ہوں گے جہاں ہم نے دھماکا کرنے والی اشیا کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔۔۔ میں نے طارق کو ہدایت کردی ہے کہ وہ خالد کو وہاں سے نکل جانے کے لیے کہہ دے۔ طارق، شولز کی ایک پارٹی لے کر اسی طرف گیا ہے" مجاہدِ اوّل نے بتایا۔

"اور یہ جرمن اور ترک قیدی؟" یہ بھی میں نے ہی دریافت کیا۔

"یہ لوگ فیکٹری کو تباہ کرنے کے بعد تبت، سنکیانگ اور کاشغر کے راستے فرار ہو کر ترکی پہنچنے کی کوشش کریں گے" مجاہدِ اوّل بولا "صفدر! (جوگیندر کا تنظیمی نام) ٹیپو کے واپس آتے ہی تم، سوشیلا اور ٹیپو یہاں سے واپس ہو لو گے۔ تمہیں یہاں سے مسوری پہنچنا ہے جہاں سے تم دہرہ دون پہنچو گے۔ ٹیپو اس علاقے سے خوب واقف ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم صحیح سلامت مسوری پہنچو گے۔"

"مگر جناب، میں اس فیکٹری کو تباہ ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں" جوگیندر نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"فیکٹری کی تباہی چھ سات گھنٹے سے پہلے ممکن نہیں" مجاہدِ اوّل نے کہا "اس دوران میں ہمیں یہاں سے دور نکل جانا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ امدادی سگنل ملنے پر انگریز کس پیمانے پر کارروائی کریں گے۔"

"مگر ہم اس فیکٹری کی تباہی کے بعد بھی تو نکلنے کی کوشش کرسکتے ہیں" سوشیلا بول اٹھی۔

"تم اگر ساتھ نہ ہوتیں تو شاید میں یہ بات مان لیتا" مجاہدِ اوّل کہنے لگا "میں اپنے بیٹوں کا غم برداشت کرسکتا ہوں۔ میں نے اپنے متعدد بیٹوں کے غم برداشت کیے ہیں لیکن فاطمہ کے بعد۔۔۔ اس کے بعد میں اپنی کسی اور بیٹی کا غم برداشت نہیں کرسکتا۔ نہیں میری بیٹی نہیں! سوشیلا! تمہیں میری بات ماننا ہی پڑے گی" اس وقت مجاہدِ اوّل کا لہجہ اتنا غم ناک تھا کہ ہم سبھی اداس ہوگئے تھے۔ فاطمہ کا ذکر ہی ایسا تھا۔

"اور آپ؟" جوگیندر نے مجاہدِ اوّل سے معلوم کیا۔

"میں اس فیکٹری کی تباہی تک یہیں رہوں گا پھر میں ترک اور جرمن قیدیوں کے ساتھ یہاں سے درہ کامٹ کی طرف جاؤں گا۔ انہیں درہ کامٹ پر چھوڑ کر میں واپس شملے پہنچوں گا۔ تمہارے جانے کے بعد طارق کے ساتھ شاہین لال پہاڑ کی طرف جائے گا۔ اس وقت کسی زخمی کو ہم اس علاقے سے لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

ہم سب خاموش ہوگئے۔ مجاہدِ اوّل نے جو کچھ کہا تھا، قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ اس پروگرام میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں تھی لیکن ہم تینوں مجاہدِ اوّل کے اس فیصلے سے مایوس ہوئے تھے کیوں کہ ہم تینوں ہی اس فیکٹری کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

"ایک اہم بات اور سنو! یہ بات اس پارٹی میں صرف تم تینوں ہی کو بتائی جارہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ بات کسی اور کو نہیں بتاؤ گے" مجاہدِ اوّل نے چند لمحے توقف کیا پھر بتانے لگا۔ "میں نہیں جانتا کہ میری واپسی کب تک ہوگی۔ مزید ہدایات کے لیے اگر تمہیں تنظیم کے سرکردہ لوگوں سے رابطے کی ضرورت محسوس ہو تو دہلی کے نیشنل ٹریڈرز کی معرفت خالد کو خط لکھ دینا پورا پتا میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔ یاد کرلو! یا اس سے مل لینا اگر تم دہلی میں ہو! نیشنل ٹریڈرز گنج میں ہے اور اس کا پوسٹ بکس نمبر چھے سو دس ہے۔ یہ ہماری تنظیم کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے اور ہماری تنظیم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا ذریعہ بھی!"

نصف گھنٹے کے بعد ٹیپو واپس آگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد

ان تینوں کو میں رخصت کررہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو پتا نہیں تھا کہ اب ہم کتنی مدت کے بعد ملیں گے اور ملیں گے بھی یا نہیں! ہم سب کی آنکھیں نم تھیں۔ ان تینوں نے سراج الدولہ کی قبر پر کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی اور چند منٹ کی خاموشی کے بعد روانگی اختیار کی۔ میں انھیں چھوڑنے کے لیے پہاڑی کے اوپر اس جگہ آیا جہاں مچان کے نیچے سامان لے جانے والی ٹرالی کا نظام موجود تھا اور جہاں سے میں طارق کے ساتھ فیکٹری میں اُترا تھا۔

"سنو!" میں نے جوگیندر کو مخاطب کیا "مجھے نہیں پتا کہ ہم اب کب ملیں گے اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردینا!" یہی الفاظ میں نے ٹیپو اور سوشیلا سے بھی کہے۔ جواب میں ٹیپو اور جوگیندر نے مجھے گلے سے لگالیا پھر ہم سبھی کی پلکیں بھیگ گئیں۔

میں چٹان پر بنے ہوئے مچان کے پاس کھڑا ہوا ان تینوں کو دور ہوتے دیکھتا رہا۔ جرمن اور ترک فوجی ٹرالی سے دھماکا کرنے والا سامان پہاڑی کی کوکھ میں اُتار رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد میرے تینوں ساتھی پلٹ کر دیکھتے اور ہاتھ ہلاتے۔ وہ پہاڑی کی بلندی پر چڑھتے چلے گئے۔ ڈھلتے چاند کی دھندلائی ہوئی روشنی میں جھلملاتے برف پر وہ سفید دھبّوں کے مانند حرکت کررہے تھے پھر فاصلوں نے انھیں نگل لیا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

"تم لوگ پھر ملوگے؟" مجاہدِ اوّل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میں وہاں کب تک رہوں گا؟"

"زخم مندمل ہونے تک" مجاہدِ اوّل نے جواب دیا "پھر جب تم ٹھیک ہوجاؤ گے تو طارق کے ساتھ شیلانگ پہنچو گے۔"

"شیلانگ!" میں نے حیرت سے کہا "مگر وہ تو بہت دور پڑے گا۔"

"ہاں شیلانگ!" مجاہدِ اوّل بولا "تمھیں صحت یاب ہونے میں تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ اس دوران میں برف باری سے راستے بند ہوجائیں گے اور تم اسی علاقے میں پھنس جاؤ گے۔ جب تم واپسی کے لیے تیار ہوگے تو شمالی ہند میں ہماری کارروائیاں عروج پر ہوں گی۔ اس وقت اس طرف سے آنا تمھارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔"

"آپ سے میری ایک درخواست ہے" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں" مجاہدِ اوّل بول اٹھا "تم اس فیکٹری کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے" مجاہدِ اوّل واقعی قیافہ شناس تھا۔

جوگیندر وغیرہ چلے گئے تو تقریباً نصف گھنٹے بعد طارق بھی واپس آگیا۔ اس وقت میں کرنل شولز کے پاس ہی کھڑا تھا۔ مجاہدِ اوّل، ڈاکٹر شمٹ سے باتیں کررہا تھا۔ کرنل شولز نے طارق کے ساتھ واپس آنے والے سے جرمن زبان میں چند باتیں کیں اور ڈاکٹر شمٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"کہو، تمام سامان ضرورت کے مطابق ہے؟" مجاہدِ اوّل نے کرنل شولز سے پوچھا۔

"آپ لوگوں نے کمال کیا ہے۔ یہ تو اتنا سامان ہے کہ اس کی تین فیکٹریاں تباہ کی جاسکتی ہیں۔ ہم اس تمام سامان سے تو یہ فیکٹری سرمہ بنادیں گے۔"

صبح کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فیکٹری کی تباہی کا کام آخری مرحلے میں داخل ہوچکا تھا۔ ڈائنا مائٹ کی چھڑیں اور بارود کے تھیلوں کو مختلف جگہ باندھا جارہا تھا۔ تار پھیلائے جارہے تھے۔ ترک اور جرمنی فوج کے ماہر سپاہی یہ تمام کام نہایت انہماک اور استغراق سے کررہے تھے۔

اندازے کے مطابق انگریز فوج کی کمک وہاں پہنچنے میں ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا کہ کرنل شولز نے کام ختم ہوجانے کی اطلاع دی۔

تمام لوگ تباہ ہونے والی فیکٹری اور سرنگ سے محفوظ فاصلے پر اس جگہ جمع ہوگئے جہاں وہ لیور تھا جس سے کئی تار آکر منسلک ہوئے تھے۔ یہ ایک بلند مقام تھا جہاں سے ہمیں نیچے وہ پہاڑی نظر آرہی تھی جس کے بطن میں وہ خطرناک فیکٹری موجود تھی۔

مجاہدِ اوّل، ڈاکٹر شمٹ اور ایک ترک میجر ناصر بے نے مل کر اس لیور کا ہینڈل ایک طرف کھینچا اور چند لمحوں بعد ہی اس علاقے میں جیسے زلزلہ آگیا۔ پے در پے اتنے ہول ناک دھماکے ہوئے کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ ان دھماکوں کی ہول ناک آواز وادی میں گونجتی رہی۔ مٹی، پتھر اور برف کا ملا جلا بادل بلند ہوا تھا پھر دیر تک دھویں اور مٹی کا مرغولہ فضا میں بلند رہا تھا۔

اس کے بعد کانوں کو دھماکوں کے ذریعے تباہ کردیا گیا۔

پھر ہم سب وہاں سے تیزی کے ساتھ فیکٹری کی سرنگ کے اس دہانے کی طرف بڑھے تھے جو جوشی مٹھ کی طرف تھا۔ اس طرف کرنل شولز کو صرف اب کانیں تباہ کرنا تھیں جس کا نظام پہلے ہی سے تیار ہوگیا تھا۔

"تم اب یہاں سے سیدھے جوشی مٹھ کی طرف روانہ ہوجاؤ گے" مجاہدِ اوّل نے مجھے اور طارق کو ہدایت دی "اب ہمارے ساتھ تمھارا رہنا مناسب نہیں ہے۔"

ہماری اور ان کی راہیں جدا ہوگئیں۔ طارق نے جوشی مٹھ جانے کے لیے طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ ایسا راستہ تھا جس پر انگریز فوج کی کمک سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہیں تھی۔

ہم چلتے رہے۔ اس وقت میرا زخمی ہاتھ بہت تکلیف دے رہا تھا۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے کوئی ڈیڑھ گھنٹا ہوا تھا کہ خاموش پہاڑوں میں دھماکوں کی آواز سنائی دی۔

"وہ کانیں بھی تباہ کردی گئیں" میں نے مسرت سے کہا۔

طارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوشی مٹھ ابھی کافی دور تھا۔ اس کی نگاہیں پہاڑوں کے نشیب و فراز میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"جوشی مٹھ کتنی دور ہے؟" میں نے طارق سے پوچھا۔

"تین گھنٹے کا راستہ ہے" طارق نے بتایا "کیوں، کیا ہاتھ میں تکلیف ہو رہی ہے؟"

"اس کی پروا نہ کرو" میں بولا "تم یہاں رُک کیوں گئے؟"

"آرام کرنا چاہو تو یہاں ایک غار ہے" طارق نے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں یہیں آرام کرنا چاہیے یا آگے جاکر! بات یہ ہے کہ میں تمھیں لے کر رات کے وقت جوشی مٹھ پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ کوئی زخمی جوشی مٹھ آیا ہے۔"

سورج کی تیز چمک برف پر منعکس ہوکر آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ برف باری کی وجہ سے ہمارا راستہ اور بھی دشوار گزار ہوگیا تھا۔ بعض جگہ تو طارق میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سہارا دے کر آگے بڑھاتا۔ ایسے مواقع پر مجھے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اپنے زخمی ہاتھ کو بھی حرکت دینا پڑتی جس سے تکلیف اور بھی شدید ہوجاتی تھی۔

ڈھائی گھنٹے کے بجائے یہ سفر چار گھنٹے کا ثابت ہوا۔ اس وقت میں تھک کر چور ہوچکا تھا۔ وہ چھوٹا سا غار مجھے کسی محل سے بھی زیادہ آرام دہ محسوس ہوا تھا۔ ٹھنڈ سے میری ٹانگیں پنڈلیوں تک سن ہوکر رہ گئی تھیں، ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ غار کے نیم سرد ماحول میں آکر میں نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

پتھر اور مٹی کے فرش پر اپنے تھیلے رکھ کر ہم بیٹھ گئے۔ طارق نے تھرماس سے گرم گرم کافی نکالی اور میری طرف بڑھادی۔

اس غار میں پناہ لیے ہمیں ابھی ایک ہی گھنٹا ہوا تھا کہ نیچے پہاڑی راستے پر ہم نے سرگرمی محسوس کی۔ میں اور طارق غار کے دہانے پر آگئے۔ نیچے انگریز فوج کا ایک دستہ تیزی سے ایک سمت بڑھتا جارہا تھا۔

"یہ لوگ کدھر جارہے ہیں؟" میں نے طارق سے دریافت کیا۔

"اسی فیکٹری کو خام مال فراہم کرنے والی کانوں کی طرف" طارق نے جواب دیا۔

"گویا دونوں طرف سے فیکٹری کی حفاظت کرنے آئے ہیں" میں تلخ لہجے میں بولا۔

○☆○

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، میری پریشانی بڑھتی گئی۔ طارق کہہ کر گیا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ میں واپس آجائے گا لیکن اب اسے گئے ہوئے تین گھنٹے ہوچکے تھے۔ مجھے یقین ہوچلا تھا کہ طارق کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ میرے لیے اب ضروری ہوگیا تھا کہ میں خود بستی کی طرف جاؤں اور دیکھوں کہ کیا معاملہ ہے؟

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ بستی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہوا بہت تیز ہوگئی تھی۔ برف باری کا سلسلہ کسی وقت بھی شروع ہوسکتا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دو ہی راستے تھے یا تو واپس اسی غار میں جاکر رات گزاروں جہاں دن میں ہم نے آرام کیا تھا یا پھر بستی میں جاکر طارق کا پتا چلاؤں کہ اس پر کیا بیتی؟ میں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بستی کی طرف روانگی سے پہلے میں نے مزید ایک گھنٹے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ جب بستی میں جاؤں تو کوئی بھی جاگتا ہوا نہ ہو اور نہ مجھے دیکھنے والا ہو۔ پتھروں کے درمیان کھڑے ہوئے میری حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ سردی کی وجہ سے میرا تمام جسم سن ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے پیروں کو جنبش دینا چاہی تو ایسا لگا جیسے رگوں میں خون منجمد ہوکے رہ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا، دائیں ہاتھ کو شانے کے جوڑ سے پھرکی کی طرح گھمایا، تھرماس سے کافی نکال کر پی اور سوچنے لگا، میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

ٹھیک گیارہ بجے میں وہاں سے چلا۔ میرا رُخ سردار مکھن کے مکان کی طرف تھا۔ سردار مکھن سے میری ملاقات پہلی بار طارق نے ہی کرائی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی

جب میں پہلی بار ٹیپو کے ساتھ اس علاقے کا جائزہ لینے آیا تھا۔ سردار کھمن کا مکان بستی کے ایک سرے پر تھا۔ یہ چھوٹا سا مکان دو منزلہ تھا۔ اس کا مہمان خانہ بالائی منزل پر تھا۔ مکان کیوں کہ پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا تھا اس وجہ سے اس پر پڑی ہوئی ٹین کی ڈھلوان چھت پہاڑی کی طرف سے اتنی نیچے تھی کہ اس پر آدمی بغیر کسی مشکل کے چڑھ سکتا تھا۔ اسی سمت دیوار میں روشن دان بھی بنے ہوئے تھے۔ میں لمبا چکر کاٹ کر پہاڑی سے گزرتا ہوا اسی سمت آیا تھا۔

اس وقت میں نے اچانک بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ میں لپک کر مکان کے کونے پر آیا اور جھانک کر دیکھا۔ نیچے تین چار آدمی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آواز سن کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ یہ آواز میرے ڈیڈی ڈیسوزا کی تھی۔

"ڈیڈی یہاں کہاں سے آگئے؟" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ انٹیلی جنس کے چیف یعنی میرے ڈیڈی ڈیسوزا کی وہاں موجودگی میرے لیے حیران کن تھی۔

پھر لکڑی کے زینے پر چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ طارق پھنس ہی گیا ہے۔

اچانک ہوا اور بھی تیز ہو گئی ساتھ ہی برف باری بھی ہونے لگی۔

وہ آوازیں اب بالائی منزل پر آگئی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے ہٹ کر اب پہلے روشن دان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ لوگ اس کمرے سے گزر کر جس میں یہ روشن دان کھلتا تھا، پہلے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں تیسرے روشن دان کے پاس آ گیا۔ میں اس روشن دان میں سے جھانک کر نیچے نہیں دیکھ سکا تھا اور آوازیں سن کر مکان کے کونے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

میں نے روشن دان سے جھانک کر دیکھا۔ طارق اندر کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔

"یہ ہے وہ؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"جی ہاں" ایک انگریز فوجی نے جواب دیا۔

"تمہیں یقین ہے؟" ڈیڈی نے پھر انگریز فوجی سے سوال کیا۔ ابھی تک انہوں نے طارق سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ سوال تو وہ انگریز فوجی سے کر رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں طارق کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

"جی ہاں سر! مجھے یقین ہے۔ میری ڈیوٹی بھی فیکٹری پر رہی تھی۔ انہی دنوں میں نے اسے وہاں سامان وغیرہ لاتے دیکھا تھا" فوجی نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ڈیڈی نے اس مرتبہ طارق سے سوال کیا۔

"طارق!"

"کہاں رہتے ہو؟"

"دانا میں۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"مزدوری، قلی کا کام کرتا ہوں۔"

"تم فیکٹری میں سامان لے کر جاتے تھے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"جی ہاں" طارق بولا "صاحب لوگوں نے حکم دیا تھا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" ڈیڈی نے سردار کھمن کی طرف مڑ کر تصدیق چاہی۔

"مجھے نہیں پتا صاحب، یہ کس فیکٹری کا سامان لے جاتا تھا" سردار کھمن بولا "مجھے تو بس یہی معلوم تھا کہ یہ محنت مزدوری کرتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم جناب کہ ادھر کوئی فیکٹری بھی تھی۔"

"تم نے سردار کھمن کو فیکٹری کے بارے میں بتایا کیوں نہیں تھا؟" اس مرتبہ ڈیڈی نے طارق سے سوال کیا۔

"صاحب لوگوں نے منع کر دیا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں ورنہ مجھے مار ڈالا جائے گا" طارق نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"فیکٹری کس نے تباہ کی ہے؟" ڈیڈی نے اچانک سوال کیا۔

"جی!" طارق نے حیرت کی انتہائی کامیاب اداکاری کی "فیکٹری تباہ..."

ڈیڈی اس وقت طارق کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے "ہاں بتاؤ، فیکٹری کس نے تباہ کی ہے؟" ڈیڈی نے اپنا سوال دہرایا۔

"جی مجھے پتا نہیں!... کیا فیکٹری تباہ ہو گئی؟ کب؟"

"اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟" ڈیڈی نے طارق کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے معلوم کیا۔

"ساپو بان سے" طارق نے جواب دیا "میں جوشی مٹھ جا رہا ہوں۔"

"ساپو بان کدھر ہے؟" ڈیڈی نے سردار کھمن کو مخاطب کیا۔

"شمال میں سرائے طوطا کی طرف" سردار کھمن نے بتایا۔

"کون کون سے دن تم فیکٹری میں سامان لے جاتے تھے؟" ڈیڈی پھر طارق سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔

"جس دن صاحب لوگ کہتے تھے۔ میں کل سامان لے کر گیا تھا۔ اب انہوں نے ایک ہفتے بعد سامان لانے کو کہا تھا۔"

"کیا کیا سامان منگایا تھا انہوں نے؟"

طارق نے کوٹ کی ایک جیب سے ایک کاغذ نکال کر ڈیڈی کی طرف بڑھا دیا "یہ سامان ہے جی!"

ڈیڈی نے وہ فہرست پڑھ کر واپس کر دی "تم پہلی مرتبہ فیکٹری کس طرح پہنچے تھے؟"

طارق نے انہیں وہی تفصیل بتا دی جو وہ ہمیں سنا چکا تھا۔

"اس کا ایک اور بھائی بھی ہے" انگریز فوجی نے ڈیڈی کو بتایا۔

"تمہارا بھائی کہاں ہے؟" ڈیڈی نے پلٹ کر طارق سے دریافت کیا۔

سردار کھمن کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ طارق بول اٹھا "وہ رانی کھیت میں ہے۔"

"کل کس وقت تم فیکٹری گئے تھے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"دوپہر کے وقت۔"

"کوئی خاص بات تو تم نے وہاں نہیں دیکھی تھی؟"

"نہیں جناب!" طارق بولا "مجھے کیوں پکڑا گیا ہے جناب؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

ڈیڈی نے انگریز فوجی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ہم فی الحال اسے یہیں روکیں گے۔" پھر وہ پلٹ کر طارق سے مخاطب ہوئے "یہ کہتا ہے، تمہارے کچھ ساتھی بھی تھے، تمہارے ساتھ اسے یہ بات سرائے طوطا کی طرف سے آنے والوں نے بتائی تھی۔ تمہارے وہ ساتھی کہاں ہیں؟"

"جی!" طارق نے پھر حیرت کی اداکاری کی "میں تو اکیلا ہی آیا ہوں۔ راستے میں تو مجھے کوئی نہیں ملا۔ کن لوگوں نے بتایا تھا...؟ انہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"ہم دیکھیں گے اس غلط فہمی کو!" ڈیڈی عجیب سے لہجے میں بولے "آج رات تم یہیں رہو گے۔"

"مگر جناب، مجھے پتا تو چلے کہ میرا قصور کیا ہے؟"

"سردار کھمن! اس کے لیے یہاں سونے کا انتظام کرو" ڈیڈی نے کہا "اور تم سنو! کل ہم تمہارے بھائی کو بھی رانی کھیت سے بلوائیں گے پھر دیکھیں گے تمہارا کیا کیا جائے!" یہ کہہ کر ڈیڈی نے سامنے باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ کھڑکی لکڑی کے موٹے تختوں کی تھی "سردار کھمن! اس کھڑکی میں تالا ڈال کر چابی میرے حوالے کر دو" پھر ڈیڈی اس کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے باقی لوگ بھی کمرے سے نکل گئے۔

میں اب دوسرے روشن دان سے کمرے میں جھانک رہا تھا "اب میں سوؤں گا۔ تمام دن ہو گیا ہے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے! ایک کپ گرم گرم کافی بنا لاؤ" ڈیڈی کی آواز آئی۔

اب مجھے انتظار کرنا تھا، سو انتظار کرتا رہا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈیڈی کو کافی دے دی گئی اور پھر وہ بیچ والے کمرے میں موٹے اور نرم بستر پر سو گئے۔ ان کے برابر والے کمرے میں انگریز فوجی سو رہا تھا۔ طارق کے کمرے کی کھڑکی میں تالا لگا کر چابی ڈیڈی کے حوالے کر دی گئی تھی اور درمیان والے کمرے کا دروازہ ڈیڈی نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ طارق کے لیے بھی بستر فراہم کر دیا گیا تھا لیکن وہ سویا نہیں تھا۔ وہ مضطرب تھا اور مسلسل ٹہل رہا تھا۔ اسے یقیناً میرے بارے میں تشویش تھی پھر وہ اٹھ کر دیواروں میں کیلیں تلاش کرنے لگا۔ دو ایک کیلوں کو اس نے ہلا جلا کر بھی دیکھا مگر اسے مایوسی ہوئی۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہوا اور بھی زنّاٹے سے چلنے لگی تھی۔ برف باری کچھ اور شدید ہو گئی تھی۔ میں نے باری باری دونوں کمروں کا جائزہ لیا۔ انگریز فوجی اور ڈیڈی سو گئے تھے۔ اس وقت میں نے روشن دان کو آہستہ سے دھکا دے کر کھولا اور منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔

طارق نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا اور میں نے روشن دان کے خلا سے ہاتھ نکال کر اسے اشارہ کیا۔ ہنگامی حالات کے لیے مخصوص کٹ بیگ سے میں نے رسی نکالی اور اس کے ایک سرے میں مضبوط موٹا تار باندھ کر اسے روشن دان سے نیچے لٹکا دیا۔

طارق نے رسی کو پکڑ کر دو مرتبہ جھٹکا دیا۔ اس اشارے کا مطلب یہی تھا کہ میں رسی چھوڑ دوں، سو میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد طارق نے موٹے تار کی مدد سے تالا کھولا اور کھڑکی کے پاس ہی لگی ہوئی کھونٹی سے رسی باندھ کر باہر لٹکا دی۔ چند لمحوں بعد وہ رسی کے سہارے کھڑکی کے راستے باہر پہنچ گیا تھا پھر وہ چکر کاٹ کر میرے پاس آ گیا۔ ہم بغیر کچھ کہے سنے تیزی سے چل دیے۔ ہم دونوں اس جگہ پہنچے جہاں طارق مجھے چھوڑ کر سردار کھمن سے ملنے گیا تھا۔ وہاں برف ہٹا کر ہم نے اپنے تھیلے نکالے اور دریا کے ٹھنڈے پانی میں اتر گئے پھر دریا پار کر لیا۔

برف باری کا طوفان اور شدید ہو گیا تھا۔

"اب ہم کہاں چلیں گے؟" میں نے چیخ کر طارق سے پوچھا۔

"تھوڑی دور پر ایک غار ہے" طارق نے جواب دیا۔

"مگر وہ ہمارے قدموں کے نشانات سے وہاں پہنچ جائیں گے" میں بولا۔

"اتنی شدید برف باری ہے' صبح تک یہ نشانات مٹ جائیں گے۔ ویسے اس وقت کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا۔"



برف باری کا طوفان اگلے دن بھی جاری رہا۔ جس غار میں ہم نے پناہ لے رکھی تھی' وہ چھوٹا بھی تھا اور نم بھی۔ کافی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ سردی ہمارے جسم گلانے دے رہی تھی لیکن ہم اس غار سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

طارق کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ وہ لوگ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم دریا پار کا راستہ اختیار کریں گے۔ اس موسم میں دریا پار کرنا واقعی ایک مشکل کام تھا۔ برف باری نے ہمارے لیے سامنے دیکھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ تیز ہوا ہمارے قدم اکھاڑے ڈال رہی تھی لیکن ہم پہاڑی دریا کے درمیان ابھرے ہوئے پتھروں اور چٹانوں پر سے گزرتے ہوئے بس بڑھتے ہی چلے گئے تھے۔ دریا پار کرنے کا یہ قدرتی راستہ عام دنوں میں بھی بے حد خطرناک تھا۔ ذرا سا پاؤں پھسلتے ہی دس بارہ فٹ گہرائی میں جا گرتا پھر برف اور پانی کی تہ میں دھنس کر وہیں بے بسی سے ختم ہو جانا قوی امکانات میں سے تھا لیکن طارق کی مہارت اور جان بچانے کی لگن نے ہمیں یہ پل صراط پار کرا ہی دیا تھا۔

رات ہوتے ہی برف باری کا طویل اور خوف ناک سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔

"بس اب ہمیں یہاں سے نکل لینا ہے" طارق نے مجھ سے کہا۔

"اب ہم کدھر جائیں گے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہم سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھے ہیں" طارق نے کہا "پہلے ہم سیابان' سرائے طوطا' جوما اور مالاری سے گزرتے ہوئے بمپا پہنچے لیکن اب یہاں سے سیدھے بمپا جائیں گے۔ یہ راستہ اگرچہ بہت خطرناک ہے لیکن محفوظ ہے۔ اس موسم میں کوئی بھی یہ راستہ اختیار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسا کروں بھی یا نہیں کیوں کہ تم زخمی بھی تو ہو!"

"میرے زخم کی پروا نہ کرو!" میں بولا "بس یہاں سے بہ حفاظت نکل چلو!" مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ عام راستے اب ہمارے لیے زیادہ ہی خطرناک تھے۔ میں انٹیلی جنس کے چیف ڈیسوزا' یعنی اپنے ڈیڈی کو اچھی طرح جانتا تھا' وہ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

ہم وہاں سے نکل گئے۔ میرا زخمی بازو اب بہت زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ زخم کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ فرسٹ ایڈ کا جو سامان ہمارے پاس تھا وہ اس قسم کے زخموں کے مندمل کرنے کے لیے ناکافی تھا مگر ہم کر بھی کیا سکتے تھے پھر سردی نے میرے پیروں کو تقریباً سن کر دیا تھا۔ پیروں کی انگلیاں سوج گئی تھیں جن کی وجہ سے جوتے پہننا مشکل ہو گیا تھا۔ یہی حالت کانوں کی تھی جن کی لویں پھول کر لٹک گئی تھیں۔ طارق اگرچہ روزانہ برفانی ریچھ کی چربی سے میرے ہاتھ پاؤں اور چہرے کی مالش کرتا تھا لیکن سردی کچھ اتنی شدید تھی کہ وہ بھی کچھ اثر کرتی معلوم نہ ہوتی تھی۔

"اس کی مالش سے اگر کوئی فائدہ نہیں طارق تو اتنی درد سری مول کیوں لے رہے ہو؟" میں نے ایک روز کہا تھا۔

"اگر اس کی مالش نہ کر رہے ہوتے تو اب تک ہمارا گوشت شدید سردی سے گل چکا ہوتا" طارق نے بتایا اور میں کانپ کر رہ گیا۔

مالاری تک کے اس ہول ناک سفر نے مجھے نیم جاں کر دیا تھا۔ میرا تمام وجود ایک ٹھنڈا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا۔ ساٹھ میل کا یہ سفر کتنا کٹھن اور دشوار گزار تھا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن میں ہم کبھی پانچ میل سے زیادہ سفر نہ کر سکے اگر طارق میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں کبھی زندہ سلامت مالاری تک بھی نہ پہنچتا۔ وہ اس علاقے کا کیڑا تھا اسی لیے ہم نے ہر رات کسی نہ کسی غار میں گزاری لیکن صرف بسکٹ کھا کھا کر تو ہم اپنی توانائی بحال نہیں رکھ سکتے تھے۔

پندرہویں دن ہم مالاری سے چار میل کے فاصلے پر ایک غار کے سامنے کھڑے تھے اور طارق کے چہرے پر الجھن تھی۔ اس کی الجھن کا سبب میری سمجھ میں بھی آگیا تھا۔ وہ برف پر بنے ہوئے پیروں کے نشانات دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہاں انسانوں کی آمد و رفت رہی ہو۔

"دیکھا جائے گا" میں نے کہا "مجھ میں اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے" یہ کہہ کر میں غار میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے طارق بھی آگیا۔

غار کے اندر پہنچ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

چھوٹے سے اس غار میں چوڑا سا نرم اور گرم بستر بچھا ہوا تھا اور موٹے موٹے کمبل رکھے تھے۔ ایک طرف بڑا سا تھرماس اور اس کے ساتھ ٹارچ رکھی تھی۔

ہم دونوں غار کے اندر اس سامان کو دیکھتے رہے۔ میرے قدموں میں سکت نہیں تھی۔ میں وہیں اپنے تھیلے پر بیٹھ گیا اور تھرماس اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا۔ ڈھکنے کے اندر ایک کاغذ رکھا تھا۔ میں نے تھرماس کی بوتل سے کارک ہٹایا۔ اندر سے گرم گرم کافی کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ طارق ایک مرتبہ پھر باہر جا چکا تھا۔

میں نے تھرماس سے کافی انڈیلنے کے لیے ڈھکنا سیدھا کیا تو میری توجہ پھر کاغذ پر گئی۔ میں نے کاغذ نکال لیا۔ اس کاغذ پر ایک تحریر بھی تھی۔

شاہین! طارق!

اطمینان سے کافی پیو اور آرام کرو' رات کسی وقت ملاقات ہوگی۔

مجاہد اوّل

"طارق!" میں چیخا "ادھر آؤ!"

وہ لپکتا ہوا واپس آیا۔ جب میں نے اسے تمام بات بتائی تو وہ حیران رہ گیا۔ ہم نے جلدی جلدی گرم گرم کافی کے دو دو مگ پیے پھر برفانی علاقے میں سفر کا لباس اتار کر بستر میں گھس گئے۔

"مجھے حیرت ہے' اس غار کا علم مجاہد اوّل کو کیسے ہوا؟" طارق بولا۔

"ہوا ہوگا یار!" میں نے کہا "آرام کرو!"

کئی دن کے بعد ہمیں اطمینان' سکون اور مناسب بستر ملا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کافی دنوں بعد ہمیں تحفظ کا احساس بھی ہوا تھا۔ یہ احساس مجاہد اوّل کی تحریر نے دلایا تھا۔ ایسے صبر آزما حالات میں بھی وہ ہماری طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔ یہ بڑی بات تھی پھر یہ کہ مسلسل تھکن نے ہمیں نڈھال کر رکھا تھا۔ اونی کمبلوں کی گرمی رفتہ رفتہ ہمارے جسموں میں بیٹھی ہوئی سردی کو ختم کر رہی تھی۔ ذرا دیر میں ہم گہری بے ہوشی کی نیند میں کھو گئے تھے۔

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا کہ مجاہد اوّل نے ہمیں جگایا۔ غار کے ایک کونے میں ٹارچ روشن تھی۔ مجاہد اوّل ہمارے لیے کھانا لایا تھا جسے ہم دونوں نے سیر ہو کر کھایا۔ غنودگی کے اثر سے رفتہ رفتہ ہمارے ذہن صاف ہوتے چلے گئے۔

"میں تین دن سے یہاں روزانہ تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں" مجاہد اوّل کی کھرکھراتی آواز ابھری۔

"آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم یہاں آئیں گے؟" طارق نے سوال کیا۔

"تمہارا یہ خیال درست نہیں کہ یہ غار تمہاری دریافت ہے" مجاہد اوّل نے کہا "بہرحال سنو! فیکٹری کی تباہی کے بعد ترک اور جرمن ساتھیوں کو روانہ کر کے میں گلاب کوٹی پہنچا تھا۔ میں نے اپنے ترک اور جرمن ساتھیوں سے بہت کہا کہ میں انہیں تبت کی سرحد تک پہنچا آؤں مگر انہوں نے میری بات نہ مانی۔ ان کی ضد تھی کہ میں واپس چلا جاؤں کیونکہ ہندوستان میں میری زیادہ ضرورت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ انگریز فوج ان کا تعاقب ضرور کرے گی" میں بولا۔

"یہ ان کی قسمت ہے" مجاہد اوّل نے طویل سانس لیا "لیکن ترک اور جرمن واقعی زندہ قومیں ہیں۔ انہوں نے تعاقب کے خطرے کو بھانپ لیا تھا اس لیے ان کے زخمیوں اور پانچ فوجیوں نے سوسائڈ (خودکشی) اسکواڈ بنا لیا ہے۔ یہ اسکواڈ جوشی مٹھ کی سمت کارخانے کی سرنگ کے دہانے سے قریب ایک تنگ درے میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ وہ دو تین سو فوجیوں کے دستے کو ایک ہفتے تک وہاں روک سکتے ہیں۔ اس ایک ہفتے میں ان کے ساتھی بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ ایک ہفتے کے بعد یا تو وہ اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں گے یا ناکامی کی صورت میں خود کو ختم کر ڈالیں گے۔ طارق! کافی نکالو!"

طارق نے تین مگوں میں تھرماس سے کافی انڈیلی۔

مجاہد اوّل نے کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا "بہرحال میں گلاب کوٹی میں تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ انٹیلی جنس کے ڈیسوزا نے جوشی مٹھ میں طارق کو پکڑ لیا تھا لیکن وہ رات کے وقت اپنے ساتھی کی مدد سے فرار ہو گیا۔ ڈیسوزا کا خیال تھا کہ تم دونوں یا تو مالاری کی طرف جا سکتے ہو یا پھر گلاب کوٹی کی طرف لہٰذا اس نے اپنے چند لوگوں کو گلاب کوٹی کی طرف روانہ کر دیا اور خود چند انگریز فوجیوں کے ساتھ مالاری کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں گلاب کوٹی سے جوشی مٹھ پہنچا۔ وہاں طارق کے ایک دوست کی حیثیت سے میں سردار مکھن سے ملا' سردار مکھن' طارق کے لیے بہت پریشان تھا۔ اسے یہ یقین دلانے میں کہ میں طارق کا دوست ہوں' بڑی مشکل پیش آئی تھی۔"

"تو پھر اس غار کا پتا سردار مکھن ہی نے آپ کو بتایا ہوگا" طارق بولا۔

"ہاں" مجاہد اوّل نے کہا "اسی نے مجھے بتایا کہ مالاری جانے کے لیے کون سا محفوظ راستہ استعمال کر سکتے ہو! وہ میرے ساتھ مالاری آیا ہوا ہے۔ اسی نے اندازاً بتایا تھا کہ تمہیں تین دن قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"اب کیا حالات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیسوزا یہاں سے آگے بڑھ گیا ہے" مجاہد اوّل نے بتایا "لیکن یہاں مالاری میں اس نے کچھ فوجی طلب کر لیے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ طارق داپا کا رہنے والا ہے لہٰذا وہ اس علاقے میں داپا تک تمہارا تعاقب کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر داپا تو تبت میں ہے" میں نے کہا "وہاں ڈیسوزا کے کیا اختیارات ہوں گے؟"

"یہ تم کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو؟" مجاہد اوّل بولا "اصل اختیارات طاقت سے حاصل ہوتے ہیں' وہ اس کے پاس ہے" مجاہد اوّل نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے مزید کہا "میں اب یہاں سے لوٹ جاؤں گا۔ ڈیسوزا درہ نیٹے کی راہ سے داپا کی طرف گیا ہے کیوں کہ وہ راستہ مختصر ہے۔ تم ایسا کرو کہ درہ چار موئے سے گزر کر لال پہاڑ پہنچو۔"

پھر مجاہد اوّل نے میرے زخم کی ڈریسنگ کی جو بہت ہی خراب ہو چکا تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے زخم سے آس پاس کی کھال اور گوشت گلنے لگا تھا۔ ڈریسنگ کے دوران میں مجھے سخت تکلیف ہوئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے زخم کے لیے میں مناسب دوائیں نہ لا سکا۔ ارے' تمہیں تو بخار بھی آ رہا ہے!" مجاہد اوّل کی آواز میں تشویش تھی۔

"تھکن کی وجہ سے آگیا ہوگا" میں بولا۔

"بہرحال تم کل اور آرام کرو پھر تمہیں اپنے سفر پر روانہ ہونا ہی ہے" مجاہد اوّل نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے سیدھا نینی تال ہی جانا چاہیے تھا" میں نے کہا۔

"نینی تال' رانی کھیت یا کاٹھ گودام کا صرف ایک راستہ اس برف باری میں کھلا ہے۔ اس طرف سے کسی زخمی آدمی کا جانا یا پھر طارق کا جانا' اب اور بھی خطرناک ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تم طارق کے ساتھ تبت کی طرف نکل جاؤ اور جب مکمل طور پر صحت یاب ہو جاؤ تو واپس ہندوستان آ جاؤ۔"

اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ مجاہد اوّل کو اپنے ایک ایک سرفروش کا کتنا خیال تھا۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی تھی کہ انٹیلی جنس کے چیف' یعنی میرے ڈیڈی ڈیسوزا میرے تعاقب میں ہیں' وہ فوراً حرکت میں آگیا تھا پھر اس نے نہ جانے کیا کیا خطرات مول لے کر اور ہم سے رابطہ قائم کر کے ہماری رہبری کی تھی' اسی کے ساتھ ان خطرات سے بھی آگاہ کیا تھا جو ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اگلی رات ہم دونوں پھر اسی سرد جہنم میں سفر کے لیے تیار تھے۔

مجاہد اوّل نے ہمیں گرم جوشی سے رخصت کیا۔ اس وقت اس کا لہجہ بوجھل تھا "اچھا میرے بیٹو' خدا حافظ! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ چھ ماہ بعد میں تمہاری طرف سے پیغام کا انتظار شروع کر دوں گا' پتا یاد ہے نا نیشنل ٹریڈرز کا؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

یہ سفر پہلے مرحلے سے بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ بہ مشکل تمام اٹھارہ دن بعد ہم درہ چار موئے سے گزر کر شلشال پہنچے تھے۔ لال پہاڑ ابھی بہت دور تھا مگر اب ہمارے لیے مزید سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ وجہ یہ تھی کہ درہ چار موئے میں ایک چٹان سے گزرتے ہوئے میں نیچے کھڈ میں گر گیا تھا اور پھر سخت جدوجہد کے بعد طارق مجھے وہاں سے نکال پایا تھا۔ اس عرصے میں میری دائیں ٹانگ برف میں مسلسل دبی رہنے کی وجہ سے بالکل سن ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اس نے مجھے نکالا تو یہ پتا چلا کہ میرے لیے اب اس ٹانگ پر زور دے کر چلنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ہمارا یہ سفر اور بھی کٹھن ہو گیا تھا۔ یہ طارق ہی کی ہمت تھی کہ وہ مجھے اس علاقے سے لے کر شلشال آیا تھا۔ طارق کا کہنا تھا کہ یہاں اس کے ماموں کا ایک دوست بدھ خانقاہ میں بھکشو ہے۔ طارق نے اسی بدھ بھکشو سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ خانقاہ ہمارے لیے بہت اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ یہیں بھکشو نے ایک مقامی وید سے میرا علاج کرایا۔ وید نے اپنی سی تمام کوشش کی لیکن پھر مجبور ہو کر میری زندگی بچانے کے لیے میرا الٹا ہاتھ کاٹ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا گوشت مسلسل سردی کھاتے کھاتے گلتا جا رہا تھا۔ خیریت یہ تھی کہ گوشت گلنے کا رخ نیچے کی طرف زیادہ تھا اگر اوپر کی طرف ہوتا تو میری زندگی کا چراغ گل ہو جاتا۔

میری دائیں ٹانگ میں نہ صرف موچ آئی تھی بلکہ برف میں پانچ گھنٹے دبے رہنے کی وجہ سے اس کا گوشت بھی گلنے لگا تھا۔ میرا پیر اپنی جگہ بٹھانا اس صورت میں ناممکن تھا کیوں کہ ذرا سے دباؤ سے گوشت میں انگلیاں دھنس سکتی تھیں اس لیے پہلے وید نے گوشت کو گلنے سے روکنے کا علاج کیا۔ جب وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو پیر کی اتری ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ بٹھانا ناممکن ہو چکا تھا کیوں کہ گوشت سڑنے کے بعد اس کا

اندمال اس طرح ہوا تھا کہ پیر کو ٹخنے کے جوڑ پر گھمانا بھی محال ہو گیا تھا۔

مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں سات ماہ لگے۔ اس دوران میں دو مرتبہ ڈیڈی ادھر سے گزرے بھی لیکن بھکشو کی وجہ سے انہیں میرا پتا نہ چل سکا۔ اس عرصے میں طارق بھی اپنے ماں باپ سے مل آیا تھا۔

پھر وہ دن آ ہی گیا جب میں اور طارق اس مہربان بھکشو سے رخصت ہو رہے تھے۔

ہم نیپال سے ہو کر دار جلنگ پہنچے اور وہاں سے کلکتہ! کلکتے میں ہم نے مچھوا بازار کے علاقے میں ایک بڑا سا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ ہمارے پاس کافی رقم تھی جو ہمیں تبت کے سفر سے قبل دی گئی تھی۔ اپنے قیام کا انتظام کرنے کے بعد ہم نے مجاہد اوّل سے نیشنل ٹریڈرز دہلی کے پتے پر رابطہ قائم کیا اور اسے کلکتے میں اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔ ایک ہفتے بعد ہی میرے پاس جوگیندر پہنچ گیا اور ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح بہت دیر تک گلے مل کر روتے رہے۔

اس عرصے میں جوگیندر پر بھی ایک قیامت گزر چکی تھی جس کا علم مجھے کلکتہ پہنچتے ہی ہو گیا تھا۔ موہن لال' یعنی جوگیندر کے والد کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان پر حراست کے دوران سخت تشدد کیا گیا تھا اور پھر انہیں بھی وہی راہ اپنانا پڑی تھی جو ان کی عظیم بیٹی فاطمہ نے اپنائی تھی۔ انہوں نے زہر کھا کر اپنی زندگی ختم کر لی تھی مگر زبان نہیں کھولی تھی۔

میری حالت دیکھ کر جوگیندر نے کہا تھا "شاہین! یہ سب کیا ہو گیا؟" وہ اب بھی مجھے میرے تنظیمی نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔ اب تک اسے میرا اصل نام معلوم نہیں ہوا تھا اور میں بھی اب یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ میرا نام طارنوش تھا۔ اس نام سے میری زندگی کی بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں جنہیں اب میں بھلا دینا چاہتا تھا۔ اب عالم جنات سے میرا رابطہ قطعی طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ موروثی طور پر مجھے پراسرار قوتیں اپنے باپ ہاموس سے ملی تھیں' وہ قبیلہ جنات کے سردار ملیقا کے فیصلے کے مطابق سلب کر لی گئی تھیں۔ اسی فیصلے کے مطابق جنات پر یہ پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ یہ کیسا خود غرضانہ فیصلہ تھا! میں اپنے اجداد سے بچھڑ گیا تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ پہلے تو میں مکمل طور پر نہ جن تھا نہ انسان' اب انسان تو بن گیا تھا! کاش میری ماں ایک جن کے عشق میں مبتلا نہ ہوتی پھر یوں اسے در بہ در نہ ہونا پڑتا! مگر اب یہ سب کچھ سوچنا لا حاصل تھا۔ مجھے پراسرار اسی بھی یاد آتی مگر جلد ہی اس کا خیال میں اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔ میرے خیال میں وہ بھی خود غرض ہی تھی۔ وہ میرے ذریعے اپنے بھائی' یعنی میرے باپ ہاموس کا انتقام لینا چاہتی تھی اور جب انتقام لے لیا تو مجھے بے سہارا چھوڑ گئی۔ مجھ پر گزشتہ دنوں کیا کیا نہیں بیت گئی تھی مگر اسی نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی تھی۔ میں بھی اب اسے بھول جانا چاہتا تھا۔

جوگیندر اور میں دیر تک ایک دوسرے کو اپنی کتھا سناتے رہے۔ اس نے مجھے مجاہد اوّل کا ایک خط دیا جس میں میرے لیے ایک ہولناک خبر تھی۔ اس عرصے میں طویل عرصے بیمار رہنے کے بعد میری ممی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ مجاہد اوّل نے مجھ سے تعزیت کی تھی۔ وہ خط پڑھ کر میں نے پھاڑ دیا اور بہت حوصلے کے ساتھ خود پر قابو کیے رہا کہ کہیں جوگیندر کو میری حالت کا اندازہ نہ ہو جائے۔

اس کے بعد جوگیندر بولا "اور ہاں شاہین' ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔ میری سوشیلا کی منگنی ہو گئی ہے۔ خود مجاہد اوّل نے یہ منگنی کرائی ہے۔ انہوں نے سوشیلا کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں' اللہ نے مجھ سے فاطمہ لے کر مجھے سوشیلا جیسی بیٹی عطا کر دی ہے۔"

مجاہد اوّل ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اسے فاطمہ کی جگہ دوسری بیٹی مل گئی تھی مگر میری فاطمہ تو مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

پھر جوگیندر چلا گیا۔ مجاہد اوّل نے اسے اسی لیے بھیجا تھا کہ وہ میرے بارے میں مکمل رپورٹ دے کہ میری جسمانی حالت کیسی ہے؟ مجاہد اوّل کو یقین تھا کہ اس سفر میں میرا بازو ناکارہ ہو گیا ہوگا لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اب میں ایک معذور آدمی تھا۔

کٹے ہوئے بازو اور ناقص پیر کی وجہ سے اب میں تنظیم کی چھاپا مار مہموں کے لیے ناکارہ ہو چکا تھا۔ میری افادیت اب صرف اتنی رہ گئی تھی کہ میں سال میں ایک آدھ بار برما کا چکر لگاؤں اور تنظیم کے لیے اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کرتا رہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک اور ذمے داری یہ بھی تھی کہ تنظیم جو نئے ارکان بھیجے انہیں اسلحہ کے استعمال کی تربیت دوں۔

میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں عین اس وقت ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا جب ہماری تنظیم جوان ہو چکی تھی۔ جب تنظیم کے اراکین بڑے بڑے معرکے سر کر رہے تھے' وہ انگریزوں پر ضرب لگانے کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں مصروف عمل تھے' میں قطعی بے عمل پڑا تھا۔ میں ان کے کارناموں

کے واقعات سنتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔
میرے کڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے سیاسی حالات ہم انقلابیوں کے خیال میں ہماری توقع کے برعکس مسلسل کروٹ لے رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے دور ہو کر ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن گئے تھے۔ ان دونوں قوموں کو باہم دست و گریباں کرنے کی وہ سازش جس کا سراغ ہمیں کلکتے ہی میں ملا تھا' اب کامیاب ہو چکی تھی۔
بارہ برس کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا۔ اب [illegible] تھا۔ اسی عرصے میں ذاتی طور پر مجھے دو مرتبہ شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ پہلی افسوس ناک خبر مجھے چھے سال پہلے ملی تھی کہ میرے نانا جان نواب فرقان علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ دوسری خبر ڈیڈی کے متعلق تھی۔ یہ خبر مجھے گزشتہ سال ملی تھی۔ میرے ڈیڈی تنظیم ہی کے ایک دیرینہ رکن اور میرے عزیز دوست بخت خاں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ تنظیم کے ساتھ دہلی میں ہونے والے ایک معرکے میں یہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ خود میرا یار بخت خاں بھی اس معرکے میں شدید زخمی ہوئے کے بعد کچھ ہی روز میں خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔
سیاسی سطح پر بھی اس بارہ سال کے عرصے میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ سائمن کمیشن' چودہ نکات' نہرو رپورٹ! اس کے درمیان پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم فسادات' سب کچھ ہوتا رہا۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر کیا تھا لیکن چودہ نکات اور نہرو رپورٹ نے دونوں قوموں کو متحارب فریق بنادیا تھا اور پورا ہندوستان ان کی باہمی آویزشوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔
پھر [illegible] کا دستور نافذ ہوا۔ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ تب دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے عزائم کیا ہیں۔ پورے ہندوستان میں کانگریسی وزارتوں کے تحت ہندوؤں نے منظم طور پر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ سرکاری سطح پر انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی پر کاری ضربیں لگائیں۔ کانگریسی وزارتوں نے سب سے زیادہ مظالم سی پی برار اور بہار میں توڑے۔
اس پُرآشوب دور میں تنظیم کی سرگرمیاں انہی علاقوں میں زوروں پر رہیں۔ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے والوں کے خلاف کارروائیاں کرتے لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔
سی پی برار' بہار' یوپی وغیرہ میں کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے زیر اثر مسلمانوں پر جہاں انسانیت سوز مظالم توڑے جا رہے تھے' وہیں ان کی تہذیبی' معاشرتی' مذہبی اور معاشی زندگی پر بھی حملے کیے جا رہے تھے۔ ان ہنگاموں سے متاثر ہو کر بنگال کے انتہا پسند ہندو بھی صوبے کی فضا کو مسموم بنانے کے درپے ہو چکے تھے۔ تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ بنگال کو اس قسم کے ہنگاموں سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اسی مقصد کے تحت تنظیم کے کئی سرفروش کلکتے پہنچ چکے تھے۔ میں کلکتے میں عارضی طور پر بچھوا بازار کے جس مکان میں مقیم تھا اسی کو ہنگامی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔
کلکتے پہنچنے والے سرفروشوں میں جوگیندر اور سوشیلا بھی تھے۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ ایک عرصے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس مرتبہ مجھے جوگیندر کچھ بجھا بجھا سا لگا۔ یہ وہ جوگیندر نہیں تھا جسے میں جانتا تھا' مضطرب' بے چین' سیماب صفت' آتش زیرپا! جوگیندر کی جگہ اس بار ایک کھویا کھویا سا شخص میرے سامنے تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے سینے میں دہکنے والا انقلابی الاؤ سرد پڑ چکا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے پوچھا بھی مگر وہ مجھے ٹال گیا۔
ایک دن جب میں جوگیندر کے سر ہو گیا تو وہ مردہ سی آواز میں بولا "شاہین! لگتا ہے میرے سارے خواب بکھر گئے ہیں' تمام آدرش کھو گئے ہیں۔"
میں سمجھا کہ شاید وہ ہندوستان کی عام سیاسی فضا اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے سبب پریشان ہے۔ میں نے اسی لیے اس سے کہا "یہ حالات تو ہمیشہ سے تھے میرے یار! ہم نے کبھی ان سیاسی لیڈروں سے بہتری کی توقع نہیں کی تھی۔"
اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں اور کہنے لگا "میں زندگی کے اس نازک دوراہے پر آپہنچا ہوں شاہین کہ اب مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔ میں ان دو راستوں میں کون سے راستے پر چلوں' یہ تو سوچنا ہی ہوگا۔ میں ابھی تک قطعی طور پر طے نہیں کر سکا کہ جو فیصلہ میں کرنا چاہتا ہوں' وہ حقیقت پسندانہ تجزیے پر مبنی ہے یا اس میں سراسر میری جذباتیت کو دخل ہے۔"
"مجھے بتاؤ" میں نے کہا "شاید کسی فیصلے تک پہنچنے میں تمہاری مدد میں کر سکوں۔"
"جب میں اپنے رستے کے بارے میں کسی یقینی نتیجے تک پہنچ جاؤں گا تو تمہیں بھی بتادوں گا۔" اس نے کہا۔
دو دن بعد مجھے اس کی ذہنی کشیدگی کا علم ہوا۔
تنظیم کے کارکنوں کا اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ تمام کارکن وہاں سے جا چکے تھے۔ اس اجلاس میں طے کیا گیا تھا کہ کلکتے کو ہندو مسلم فسادات کی آگ سے بچایا جائے' ہندو انتہا پسندوں کو ہر قیمت پر ان کے مذموم عزائم سے باز رکھا جائے۔ یہ وہ صوبہ تھا جو اب تک فرقہ وارانہ فسادات سے بچا ہوا تھا۔
اس دوران میں بھی جوگیندر کچھ بجھا بجھا سا رہا۔ اب تک وہ ہر اجلاس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا تھا۔ وہ بحث کے ساتھ ساتھ تجاویز بھی پیش کرتا تھا لیکن اس روز وہ محض خاموش تماشائی بنا رہا۔
جب تمام کارکن وہاں سے چلے گئے تو مجاہد اوّل نے مجھے اور جوگیندر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس مکان کا یہ کمرا صرف مجاہد اوّل کے لیے مخصوص تھا۔ اس کمرے کو مجاہد اوّل نے اس لیے پسند کیا تھا کہ اس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ مجاہد اوّل کسی وقت اس کمرے میں آتا تھا اور کب وہاں سے چلا جاتا تھا' ہمیں کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ اندر کھلنے والا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ہمیں ہدایت تھی کہ تین مرتبہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوں۔
"آج تم بہت خاموش ہو" مجاہد اوّل نے جوگیندر کو مخاطب کیا "اس کی کوئی خاص وجہ ہے کیا؟"
"جی ہاں" جوگیندر نے جواب دیا "میں خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔"
"کہو کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے مجاہد اوّل نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہ کھولی اور کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی پھر اسے دوبارہ تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ اب وہ اس کاغذ کو انگلیوں سے تھپتھپا رہا تھا۔
"میں بہت شرمندہ ہوں جناب!" جوگیندر بولا "بہرحال میں تنظیم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"
جوگیندر کا یہ جملہ میرے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا کہ میں نے جو کچھ سنا ہے' وہ حقیقت ہے۔
"ہوں!" مجاہد اوّل نے گہرا سانس لیا۔ میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر اس کی انگلیاں اور تیزی سے پڑنے لگیں "اس بات پر ہم بعد میں غور کریں گے کہ تم تنظیم کو چھوڑ سکتے ہو یا نہیں' پہلے وجہ بتاؤ کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟"
تو یہ بات تھی جس پر جوگیندر سوچ رہا تھا' جس نے اسے ذہنی طور پر پراگندہ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا۔
"تنظیم سے علیحدگی کا فیصلہ میں نے بہت غور و خوض کے بعد کیا ہے حالانکہ میرے والد' میری بہن اسی تنظیم پر قربان ہو چکے ہیں۔ اس تنظیم کو میرے خاندان نے اپنے خون سے تقویت دی ہے۔"
"جذبات پر اپنے فیصلے کی عمارت نہ اٹھاؤ!" مجاہد اوّل نے کہا "سیٹھ موہن لال مجھے اپنے بھائی کی طرح عزیز تھا۔ ناظمہ مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز تھی۔ ان لوگوں کے بارے میں جو جذبات میرے ہیں انہیں تم اس لیے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت تم خون کے رشتوں کو زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔ خون کے اس رشتے کی اہمیت کے لحاظ سے تم جان لو کہ ناظمہ مجھے اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ تم آج اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات صرف سیٹھ موہن لال جانتا تھا۔ تم وہ اسباب بتاؤ جن کی بنا پر تم نے تنظیم سے علیحدگی کا فیصلہ کیا ہے۔"
"بات یہ ہے جناب!" جوگیندر نے کہا۔ "اس کا بھی مجھے بہت افسوس لگا تھا۔ میں ایک خاص نظریے کے ساتھ تنظیم میں شامل ہوا تھا مگر اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تنظیم کا نظریہ میرے نظریات سے متصادم ہے۔"
میرے سر پر جیسے پے در پے گولے پھٹ گئے' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ اچانک جوگیندر ہم سے اتنی دور کیسے چلا گیا ہے؟ میں نے سوچا تھا۔
"اب تم نے بات کی ہے کام کی!" مجاہد اوّل سرد لہجے میں بولا "کچھ یاد ہے' تم اس تنظیم سے کب آ کے اس میں وابستہ ہوئے تھے اور یہ کب انتالیس جب تمہیں اٹھارہ برس لگے یہ معلوم کرنے میں کہ تنظیم تمہارے نظریات سے متصادم ہے؟"
"اس کا احساس مجھے گزشتہ چند مہینوں میں ہوا ہے" جوگیندر نے کہا "میں اس خیال سے تنظیم میں شامل ہوا تھا کہ تنظیم قومی بنیادوں پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یہ فرقہ وارانہ خطوط پر کام نہیں کرے گی مگر تجربے سے پتا چلا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔"
"تم بہت گھٹیا بات کہہ رہے ہو!" مجاہد اوّل کی آواز میں تلخی گھل گئی۔
"میں بڑے دکھ سے یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں" جوگیندر بولا۔
"تم نے یہ غلط اندازہ کیسے لگایا؟" مجاہد اوّل نے سوال کیا۔

"پچھلے دنوں سی پی برار' بہار اور یوپی میں تنظیم کی سرگرمیوں کی بنا پر! ہر جگہ تنظیم مسلمانوں کی خاطر حرکت میں آئی ہے' اس نے مسلمانوں کی حمایت کی ہے اور انگریزوں کے خلاف اپنی عظیم جدوجہد کو فراموش کردیا ہے۔"

"تم نے تنظیم کے ان مقاصد کو نہیں سمجھا جو پچھلے دنوں تنظیم کی بنیاد رہے ہیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ تنظیم کو مسلمانوں کی حمایت میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہماری کارروائیوں کا اصل مقصد فرقہ وارانہ فسادات کو روکنا تھا بالکل اسی طرح جیسے رحمان چارلس سے ملنے والی اطلاعات کے بعد تنظیم نے ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوششیں کی تھیں' اسی طرح تنظیم کی یہ مہمیں بھی تھیں۔"

"مگر ہر جگہ نتیجہ کیا نکلا؟ تنظیم کے اراکین کو مسلمانوں ہی کی مدد کرنا پڑی یا ان کی حمایت میں تنظیم کو میدان میں اترنا پڑا۔ آج تک کہیں بھی تنظیم ہندوؤں کی حمایت میں سرگرم عمل نظر نہیں آئی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا منطقی ذہن رکھنے والا اور حقیقت پسند انسان بھی جذباتیت کا شکار ہوکر منطقی استدلال اور حقیقت پسندی سے منحرف ہوگیا ہے" مجاہد اوّل کے لہجے سے دکھ کا اظہار ہورہا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے لہجے میں سختی اور غصہ بھی تھا۔

جوگیندر خاموش رہا۔

پھر میں نے دکھ پر غصے کو غالب آتے دیکھا۔ مجاہد اوّل کہہ رہا تھا "مجھے بتاؤ' تنظیم نے جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے حق میں کارروائی کی ہے' کیا وہاں مسلمان مظلوم نہیں تھے؟ مجھے بتاؤ کہ اب تک جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں' کیا ان میں پہل ہندوؤں نے نہیں کی؟ وہاں تمام تر شرارت ہندوؤں نے نہیں کی؟ تم مجھے ایک بھی ایسا علاقہ بتاؤ جہاں مسلمانوں نے فساد کی آگ بھڑکائی ہو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے تنظیم کے بارے میں اس نہج پر سوچا" مجاہد اوّل کے لہجے میں تاسف تھا "ویسے اس کے علاوہ چھ اور بھی باتیں تم نے محسوس کی ہیں؟"

"جی ہاں" جوگیندر بولا "تنظیم میں اب صرف واحد شخص میں ہوں جو مسلمان نہیں ہے کیوں کہ سوشیلا تنظیم کی باقاعدہ رکن نہیں ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ!" مجاہد اوّل نے کہا "بات یہ ہے کہ انسان جب حقائق کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ اسی انداز میں سوچتا ہے۔ کبھی تم نے یہ سوچا کہ اگر یہ تنظیم صرف مسلمانوں کی ہے تو تم اس میں کیسے شامل ہوگئے؟ اور

کیا تم بھول گئے کہ اس تنظیم میں تم خود کس طرح شامل ہوئے؟ ویسے ایک بات میں تمہیں بتادوں کہ تنظیم کے چار بڑوں میں سے دو ہندو بھی ہیں جنہیں تم تنظیم کے بنیادی ارکان کہہ سکتے ہو۔"

جوگیندر خاموش ہوگیا لیکن اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم ہے۔

"میرا خیال ہے کہ تم تنظیم چھوڑنے کا فیصلہ حتمی طور پر کرچکے ہو" مجاہد اوّل نے چند لمحے خاموش رہ کر جوگیندر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ویسے مجھے بتاؤ کہ اب تمہاری راہ کیا ہوگی؟"

"جدوجہد کی راہ میری زندگی ہے" جوگیندر نے جواب دیا "میں کمیونسٹ پارٹی کے تحت کام کروں گا۔"

"شاید تم زیرِ زمین چھاپا مار تنظیموں کا ایک بنیادی اصول بھول گئے" مجاہد اوّل کہنے لگا "ان میں داخل ہونے کا راستہ تو ہوتا ہے' باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا' سوائے موت کے!" مجاہد اوّل کا لہجہ سرد اور فیصلہ کن تھا۔ میں کانپ اٹھا "آج رات تم مزید غور کرلو' صبح تم میرے ساتھ ناشتا کروگے۔ میں نے جو باتیں تمہیں بتائی ہیں' ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرلو۔"

"صبح بھی میرا فیصلہ یہی ہوگا" جوگیندر بولا "میں نے فیصلہ جذباتی انداز میں اور اچانک نہیں کیا ہے۔"

"بہرحال صبح ناشتا تم میرے ہی ساتھ کروگے۔ اس تنظیم کے رکن کی حیثیت سے تمہارے لیے یہ میرا آخری حکم ہے" مجاہد اوّل نے کہا اور وہ پرچہ جو اس کی انگلیوں کے نیچے دبا ہوا تھا' اٹھالیا "تمہارے اس ذہنی خلجان کا تنظیم کو علم تھا۔ یہ دیکھو' تنظیم کے چار بڑوں میں سے ایک کی تمہارے بارے میں رپورٹ! اس میں لکھا ہے کہ جوگیندر جس کا تنظیمی نام صفدر ہے' تنظیم کے بارے میں شبہات کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ اس تنظیم کو حریت پسند چھاپا مار تنظیم کے بجائے فرقہ وارانہ اور جنگجو جماعت سمجھنے لگا ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے راستے سے ہٹادیا جائے ورنہ وہ تنظیم کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتا ہے۔ کرم چند" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے وہ پرچا جوگیندر کو تھمادیا۔

جوگیندر نے وہ پرچا پڑھا اور مجاہد اوّل کو واپس دے دیا۔

"تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ چھاپا مار تنظیموں کا یہی اصول ہوتا ہے کہ برگشتہ ہونے والے رکن کو ختم کردیا جائے

لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا ہے کیوں کہ یہ میرا ایمان ہے' تم تنظیم سے الگ ہو کر بھی تنظیم کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ کم از کم میری تربیت اتنی ناقص نہیں ہو سکتی۔"

جوگیندر کچھ دیر خاموش رہ کر کمزور لہجے میں بولا "میں پھر شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں مگر مجبور ہوں۔"

"میں تمہاری مجبوری جانتا ہوں" مجاہد اوّل نے کہا "پھر بھی تنظیم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں یہ مایوسی بھی تنظیم سے ہوئی اگر تمہارا انداز فکر اسی طرح غیر منطقی' جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ رہا۔ اچھا اب تم لوگ جاسکتے ہو۔"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سنو!" مجاہد اوّل نے جوگیندر کو مخاطب کیا "تم چاہو تو اسی وقت رخصت ہو' صبح ناشتے پر ملاقات کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ... تم یہ سمجھو' میں صبح تک تمہیں اس لیے روک رہا ہوں کہ کرم چند کے مشورے پر عمل کیا جاسکے۔ ایسا نہیں ہے جوگیندر بیٹا!" پہلی بار مجاہد اوّل نے اس کا تنظیمی نام ... لیا تھا۔ اس کا مطلب میں نے یہی لیا کہ جوگیندر کو اب تنظیم سے الگ کیا جاچکا ہے۔ مجاہد اوّل اب کہہ رہا تھا "ایک باپ بھی ایک اچھے اور فرماں بردار بیٹے سے ایسا سلوک نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تو ایسی اولاد کی حفاظت کرتا ہے جوگیندر! تم مجھے شاہین سے زیادہ عزیز ہو' مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز ہو! مجھے دکھ ہے کہ تم جو ایک اچھے اشتراکی انسان بننا چاہتے تھے' محض ایک اشتراکی بندہ بن کر رہ گئے ہو۔ میں جانتا ہوں' ایسا کس لیے ہوا ہے' کس نے تمہاری وسیع النظری کو تنگ دلی سے تبدیل کردیا ہے!"

"یہ میرا اپنا فیصلہ ہے جناب!" جوگیندر نے کہا "مجھے کسی نے سکھایا پڑھایا نہیں ہے۔"

"شاید تم بھی صحیح کہہ رہے ہو مگر نادانستگی میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد حقیقت تم پر ظاہر ہوجائے گی۔ اچھا الوداع!"

اس کمرے سے نکل کر میں نے محسوس کیا کہ دنیا بدل چکی ہے۔ میں دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ جوگیندر مجھ سے دور چلا گیا ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئے جہاں طارق موجود تھا۔

"سوشیلا بی بی چلی گئی ہیں" طارق نے جوگیندر کو بتایا "وہ بال گنج میں اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ پتا جانتے ہیں وہیں پہنچ جائیں' انھیں دیر ہوجائے گی۔"

"کب گئی تھی سوشیلا؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"ابھی دس پندرہ منٹ پہلے ہی گئی ہیں" طارق نے جواب دیا۔

"اچھا شاہین' میں چلتا ہوں" جوگیندر نے کمزور لہجے میں کہا۔

"واپس نہیں آؤ گے؟"

"آؤں گا' سوشیلا کو لے کر" جوگیندر بولا "شاید نہ آتا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ مجاہد اوّل کو یہ خیال ہو' میں نے ان کی نیت پر شبہ کیا ہے اور اس ڈر سے چلا گیا ہوں کہ کہیں مجھے صبح تک ٹھکانے نہ لگادیا جائے! صبح میں' مجاہد اوّل کے ساتھ ناشتا کروں گا۔ تنظیم کے رکن کی حیثیت سے ان کے اس آخری حکم کی تکمیل میرا فرض ہے۔"

پھر جوگیندر چلا گیا اور تنہائی کا بکھراؤ سناٹا میرے گرد اگرد پھیل گیا۔ دیر تک میں پلنگ پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر وہ کون ہے جس نے جوگیندر کے خیالات کو اس قدر تبدیل کردیا ہے؟ رات کو دو بجے تک میں جوگیندر اور سوشیلا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئے۔ وہ اب نہیں آئیں گے۔ میں نے سوچا تھا بھلا اب وہ واپس آکر کیا کریں گے؟ وہ رفاقت جو ختم ہوچکی تھی' اب بحال نہیں ہوسکتی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے میں سوگیا لیکن یہ نیند سکون و اطمینان کی نیند نہیں تھی۔

رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہوچکی تھی کہ مجاہد اوّل نے اچانک مجھے اور طارق کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔

"پولیس آگئی ہے اور مکان کی ناکابندی کررہی ہے" مجاہد اوّل نے بتایا۔

ہم دونوں اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ مجاہد اوّل کے ہاتھ میں اسلحہ کا ایک تھیلا اور ہاتھ میں پستول تھا۔ ہم نے بھی اسلحے کے وہ تھیلے اٹھالیے جو ہمیشہ ہمارے بستروں کے ساتھ تیار رکھے رہتے تھے۔ اب پستول ہمارے ہاتھوں میں بھی تھے۔

"دستی بم نکال لو!" مجاہد اوّل نے کہا "طارق! تم میرے ساتھ رہو گے۔ شاہین! تم میرے کمرے میں جاؤ' تم وہاں ہمارے آنے تک ٹھہرو گے۔"

"مگر آپ؟" میں بولا۔

"تم جاؤ!" مجاہد اوّل نے سخت لہجے میں حکم دیا "دھر کا دروازہ کھلا رکھنا' دوسری طرف سے کسی کو اندر نہ آنے دینا!"

طارق تم میرے ساتھ آؤ۔

میں وہاں سے اس کے کمرے میں آگیا جہاں مجاہد اوّل کا قیام تھا۔ اندر کا دروازہ میں نے پورا کھول دیا اور پچھلے دروازے کی طرف متوجہ ہوگیا جو گلی میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کے باہر محتاط آہٹیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ایک دستی بم میں نے اپنے کٹے ہاتھ کی بغل میں دبا رکھا تھا۔ میں کمرے میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے مجاہد اوّل اور طارق کی کارروائیاں دیکھ سکتا تھا۔

ان دونوں نے جلدی سے وہ کمرا کھولا تھا جس میں ہنگامی ضرورت کے لیے تھوڑا بہت اسلحہ اور بارود رکھا تھا۔ طارق اور مجاہد اوّل نے اس کمرے میں بارود کے تھیلے اور دستی بم بیرونی دروازے کے آگے ڈھیر کردیے تھے۔ دروازے کے دونوں طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے اوپر بھی کمرے بنے تھے۔ اس طرف کا دروازہ صحن سے پھوٹنے والی گلی میں تھا۔ مجاہد اوّل اور طارق نے دھماکا کرنے والے مادے کا ڈھیر اسی گلی میں لگایا تھا۔ یہ ڈھیر دروازے تک گیا تھا پھر وہ دونوں تیزی سے میری طرف آئے تھے۔ انہوں نے ایک راکفل بھی انھار کھی تھی۔

"ہم اس کمرے کی چھت پر جارہے ہیں" مجاہد اوّل نے مجھے بتایا "ہم چھت سے فائرنگ کرکے گلی صاف کریں گے پھر جب تم ٹرک رکنے کی آواز سن لو تو دروازہ کھول کر ٹرک میں داخل ہوجانا۔"

"اور آپ؟"

"ہم چھت سے ٹرک میں کود جائیں گے" مجاہد اوّل نے جواب دیا "تم ایسا کرنا کہ جیسے ہی ہم اوپر سے فائرنگ شروع کریں، بارود اور دستی بم کے اس ڈھیر پر پے درپے فائر کرتے جانا تاکہ سب کچھ ایک ہی دھماکے سے اڑ جائے" یہ کہہ کر مجاہد اوّل، طارق کو لے کر ایک سیڑھی کے سہارے چھت پر چلا گیا۔

میں اس وقت حیران تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ ٹرک کہاں سے آئے گا؟ کون اسے چلا رہا ہوگا؟ کیا مجاہد اوّل کو پولیس کے اس چھاپے کا پہلے سے علم تھا؟ کیا اسے سن گن مل گئی تھی؟ اگر سن گن مل گئی تھی تو پہلے ہی سے کیوں نہ اس مکان کو خالی کردیا گیا؟ اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا۔

میں نے سیڑھی چڑھتے ہوئے مجاہد اوّل کی آواز سُنی "ٹیپو! ہم آرہے ہیں گولی نہ چلا دینا!"

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ گویا ٹیپو بھی یہاں موجود تھا اور چھت پر تھا۔

اچانک پے درپے تین فائر ہوئے پھر فائر ہوتے ہی چلے گئے۔ میں بھی پستول سے فائر کرچکا تھا۔ بارود کے ذخیرے میں زوردار دھماکے ہوئے تھے، دروازہ ٹوٹا تھا پھر دونوں طرف کے کمروں کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ بالائی کمرے بھی نیچے آرہے تھے۔ باہر ایک شور و غوغا مچ چکا تھا پھر مجھے دو اور دھماکوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ ان کے بعد ایسے ہی دو دھماکے اور ہوئے۔ یہ دھماکے دستی بموں کے تھے اور باہر کی سمت ہوئے تھے۔ باہر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ پولیس کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دروازے پر اب بھی دھماکے ہورہے تھے۔ پولیس کے سپاہی شور مچا رہے تھے پھر مزید چند دھماکے ہوئے۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مجاہد اوّل، طارق اور ٹیپو نے باہر کھڑے ہوئے پولیس کے ٹرکوں کو دستی بموں سے نشانا بنایا تھا۔ میں لپک کر باہر کھلنے والے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے گلی میں ایک ٹرک کے داخل ہونے کی آواز سُنی تھی۔

میں نے تیزی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھولا، باہر آیا اور لپک کر ٹرک میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت اوپر سے دھم دھم کرکے مجاہد اوّل، طارق اور ٹیپو ٹرک میں کودے تھے پھر مجاہد اوّل ہمیں بیٹھنے کی ہدایت دے کر ٹرک سے اتر کے آگے گیا تھا۔ مجاہد اوّل، ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تو ٹرک تیزی سے روانہ ہوا۔

یہ گلی کیا، ایک تنگ سڑک تھی۔ ابھی ہمارا ٹرک گلی کے موڑ پر بھی نہ پہنچا تھا کہ گلی کے دوسرے سرے سے پولیس کے چند سپاہی گلی میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے ٹرک پر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ ٹرک کے پہلو میں جو تختے تھے، ہم ان کا سہارا لے کر گھٹنوں کے بل بیٹھے جوابی فائرنگ کررہے تھے اور ٹرک اپنی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسی وقت گلی میں پہلو کے ایک دروازے کی آڑ سے بھی ایک شخص نے فائرنگ شروع کردی۔ اچانک ہمارا ٹرک لہرایا پھر بڑی مشکل سے پہلو کی دیواروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اور ایک جگہ رک گیا۔

پولیس کے سپاہی عقب سے ٹرک کی طرف آرہے تھے۔ ٹرک رُکا ہوا تھا۔ پولیس نے یقیناً بہت بڑی تعداد میں چھاپا مارا تھا۔

پھر مجاہد اوّل کی آواز اُبھری "شاہین! حیدر علی ہلاک ہوگیا ہے اور میں زخمی ہوں۔ تم عقب کا خیال رکھو، میں ٹرک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

طارق اور ٹیپو نے عقب سے آنے والے سپاہیوں پر بے تحاشا فائرنگ شروع کردی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے دو دستی بم بھی سپاہیوں پر مارے تھے۔ ٹرک اب بھی بے حرکت تھا۔

پھر میں نے اسی شخص کو چیختے ہوئے سُنا جو ایک دروازے سے سپاہیوں پر فائرنگ کررہا تھا "ٹرک کیوں روک رکھا ہے؟ ٹرک نکال کرلے جاؤ!"

یہ آواز میرے لیے مسرت انگیز حیرت کا باعث ہوئی۔ یہ آواز میرے دوست جوگیندر کی تھی۔

"جوگیندر!" میں نے چیخ کر کہا "ٹرک کا ڈرائیور ہلاک ہوگیا ہے۔"

پھر میں نے جوگیندر کو تیزی سے ٹرک کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اسی وقت دو پولیس والوں نے آڑ سے نکل کر جوگیندر پر گولیاں چلائیں۔ میں نے بھی پستول سے سپاہیوں پر فائر کیے۔ گولیاں جوگیندر کے دائیں بائیں نکل گئیں۔ آخرکار وہ ٹرک میں داخل ہو ہی گیا۔

"شاہین! تم عقب کا خیال رکھنا!" جوگیندر کی آواز آئی "میں ٹرک اسٹارٹ کررہا ہوں۔"

میں ڈرائیونگ کیبن کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اب سامنے کی گلی مجھے دور تک نظر آرہی تھی۔ میں نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ جوگیندر کو کور کرسکوں۔ عقب سے ہونے والے حملے کو تو طارق اور ٹیپو سنبھال سکتے تھے مگر سامنے سے آنے والی کوئی گولی حیدر علی کی طرح جوگیندر کا بھی کام تمام کرسکتی تھی جب کہ مجاہد اوّل بھی زخمی ہوچکا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جوگیندر کی مدد کرنے کے قابل تھا بھی یا نہیں!

"طارق! ٹیپو! دو دستی بم پیچھے پھینک کر آگے آجاؤ!" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کرتے ہی میرے قریب آگئے۔ جوگیندر ٹرک اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اب مجھے پیچھے سے زیادہ آگے کی فکر تھی۔ اس کے باوجود میں پیچھے کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ پولیس والے آڑ لیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے آرہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ٹرک جب گلی کے نکڑ تک پہنچے گا تو پولیس والے خاصے قریب آچکے ہوں گے۔

"جیسے ہی ٹرک گلی کے نکڑ پر پہنچنے والا ہو، تم دونوں ایک ایک دستی بم دائیں بائیں پھینکنا!" میں نے ٹیپو اور طارق کو ہدایت دی پھر چیخ کر جوگیندر سے بولا "ٹرک پوری رفتار سے دوڑاؤ جوگیندر!"

جوگیندر میرے کہنے کے ساتھ ہی اس پر عمل کرچکا تھا۔ ٹرک ابھی گلی کے موڑ سے چھے سات فٹ دور تھا کہ ٹیپو اور طارق نے دائیں بائیں ایک ایک دستی بم اچھال دیا۔ ٹھیک اس وقت دو دھماکے ہوئے جب ٹرک گلی سے نکل کر مڑ رہا تھا۔ دھماکوں کی شدت سے ٹرک ایک طرف ذرا سا لہرایا تھا اور پھر سڑک پر مڑ کر تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اس تمام ہنگامے کے مرکز سے خاصی دور پہنچ چکے تھے۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب ہم کہاں جارہے تھے! ٹرک مختلف موڑ کاٹتا ہوا ایک انجانی منزل کی سمت بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جوگیندر اسی طرف جارہا ہوگا جدھر جانے کی ہدایت اسے مجاہد اوّل نے دی ہوگی پھر مجھے حیدر علی کی ہلاکت اور مجاہد اوّل کے زخمی ہونے کا خیال آیا۔ معلوم نہیں مجاہد اوّل کے زخم کی نوعیت کیا ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔

پھر ٹرک ایک مضافاتی علاقے میں داخل ہوگیا۔ یہاں چاروں طرف کھیت اور ہموار میدان تھے۔ راستہ بھی کچا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک ایک بڑے سے احاطے میں جاکر ٹھہر گیا۔ چاروں طرف نارئیل اور اناناس کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ٹرک رکتے ہی خالد اور چند سرفروشوں نے ٹرک کو گھیر لیا تھا۔

"تمام سرفروشوں کو خبر کردو کہ وہ تنظیم کے عارضی ہیڈ کوارٹر کا رخ نہ کریں" مجاہد اوّل نے خالد کو ہدایت کی "اس ٹرک کو بھی ٹھکانے لگادو اور ٹرک میں حیدر علی کی لاش ہے، اسے یہیں احاطے میں دفن کردو۔"

"آپ بھی تو زخمی ہیں، پہلے۔۔۔"

"میری فکر نہ کرو! زخم ٹھیک ہوجائیں گے۔ پہلے اس خطرے کو دور رکھنے کے انتظامات کرو جو بہت قریب آچکا ہے" مجاہد اوّل نے کہا "یہ تینوں میرے زخم کی ڈریسنگ کردیں گے۔"

ہم تینوں مجاہد اوّل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"وہ سوشیلا کہاں ہے؟" اچانک مجاہد اوّل نے پوچھا۔

"اپنی ایک سہیلی کے گھر ہے وہ" جوگیندر نے جواب دیا۔

مجاہد اوّل کے دائیں بازو اور دائیں رخسار پر ہی زخم آئے تھے۔ اس نے ہمیں رخسار کے زخم کی پروا نہ کرنے کی ہدایت کی۔ "اس کی پروا نہ کرو گولی بس چھیلتی ہوئی رگڑ کھا کر گزر گئی تھی تم بازو کے زخم کی ڈریسنگ کردو! گولی گوشت پھاڑ کر نکل گئی ہے۔ خیریت ہے کہ ہڈی بچ گئی۔"

ہم نے زخم کی ڈریسنگ کے لیے مجاہد اوّل کا بازو کھولا تو

زخم سے اوپر کئی نام بازو پر گدے ہوئے دیکھے۔ کئی نام ہمارے جانے پہچانے تھے۔

"اب ناموں میں حیدر علی کے نام کا اضافہ بھی ہوجائے گا" مجاہدِ اوّل نے طویل سانس لے کر کہا۔

فرسٹ ایڈ کے سامان سے ہم نے ڈریسنگ بھی کی اور وہ نام بھی پڑھتے رہے۔

"فاطمہ کا نام تلاش کر رہے ہو؟" مجاہدِ اوّل مجھ سے بولا "بس وہ۔۔۔ وہ ایک نام میرے سینے پر نقش ہے۔" زخم کی ڈریسنگ ہوگئی تو مجاہدِ اوّل نے کہا "تم لوگ اب جاؤ، چہرے کے زخم کی ڈریسنگ میں خود کرلوں گا۔"

میں نے دیکھا، خون سے سیاہ نقاب تر ہورہی تھی۔ سیاہ نقاب کے پھٹے ہوئے حصّے سے سرخ سرخ گوشت جھلک رہا تھا۔

ہم باہر آگئے۔ خالد نے بتایا کہ ایک شخص موٹر سائیکل پر تمام سرفروشوں کو مطلع کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، ایک سرفروش اس ٹرک کو دریائے ہگلی میں گرانے لے گیا ہے۔ ناریل کے ایک درخت کے نیچے ہم نے حیدر علی کے لیے قبر کھودی اور اپنے اس عزیز ساتھی کو قبر میں اتار دیا۔ اس وقت میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ کاش اس کی جگہ میں مرجاتا۔ میں نے سوچا تھا، اس طرح تنظیم ایک صحیح و سالم عملی سرفروش سے تو محروم نہ ہوتی مگر کتنی خواہشیں، کتنی تمنائیں ایسی ہوتی ہیں جو تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں اگر سب خواہشیں پوری ہوتی چلی جائیں تو مشیت ایزدی کا قائل کون رہے!

اس کام سے فارغ ہوئے تو صبح صادق طلوع ہوچکی تھی۔ خالد ہمیں ایک کمرے میں چھوڑ کر جہاں ہمیں سونا تھا، مجاہدِ اوّل کے پاس چلا گیا تھا۔

"ارے ہاں ٹیپو! یہ تم چھت پر کہاں سے آٹپکے تھے؟" میں نے موقع ملا تو پوچھا "اور حیدر علی ٹرک لے کر وہاں کیسے وقت پر آپہنچا؟"

"جب سے مجاہدِ اوّل اس مستقر پر آکر مقیم ہوئے تھے، میرا ٹھکانا وہی چھت تھی" ٹیپو نے بتایا "مجاہدِ اوّل نے یہ انتظام پیش بندی کے طور پر کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کو کسی بھی وقت بے خبر اور مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور حیدر علی کی ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی تھی۔ میں رات کو جاگتا تھا، دن میں سوتا تھا اور حیدر علی جو وہاں سے تھوڑی ہی دور ایک ٹرک کے ساتھ موجود ہوتا تھا، دن کو نگرانی کرتا تھا اور رات کو سوتا تھا۔ ہنگامی حالات میں مجھے اور حیدر علی کو یہ حکم تھا کہ کسی بھی صورت ٹرک لے کر ہمیں اس مکان کے دروازے تک پہنچنا تھا۔ ظاہر ہے کہ دھماکے ہوتے ہی حیدر علی نے صورتِ حال کا اندازہ کرلیا تھا۔"

ناشتے پر مجاہدِ اوّل بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن اس وقت وہ کچھ کھا نہیں رہا تھا۔ اس نے جوگیندر کو مخاطب کیا "جوگیندر! مجھے خوشی ہے کہ اس وقت تم ہمارے ساتھ ناشتے پر موجود ہو" چہرے کے زخم کی وجہ سے وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کررہا تھا۔

"آپ کا حکم تھا جناب!" جوگیندر بولا۔

ناشتے کے بعد جوگیندر رخصت ہوگیا لیکن اب میرے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ رات کے تجربے کے بعد میں ایک مسرت سی محسوس کررہا تھا۔ جوگیندر اب بھی میرا دوست تھا، ہماری منزلیں اب بھی ایک ہی تھیں۔

جوگیندر چلا گیا تو خالد نے بتایا "مجاہدِ اوّل کے چہرے کا زخم خاصا گہرا ہے، جبڑے کی ہڈی صاف نظر آرہی ہے، کافی گوشت اڑ گیا ہے۔ بس خیریت ہی ہوگئی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے، ٹانکے لگ جائیں گے تو زخم جلد بھر جائے گا۔"

اسی رات مجھے ہدایت کی گئی کہ میں کلکتے سے ڈھاکا چلا جاؤں۔



دوسری جنگِ عظیم چھڑے دو ایک مہینے ہی ہوئے تھے۔ جرمن تباہ کن یلغار کرتا ہوا یورپ میں بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے مجاہدِ اوّل کا پیغام ملا کہ میں، طارق کے ساتھ فوراً برما جاکر تنظیم کے لیے مسلسل اور مستقل اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کروں۔ یہ ہدایت بھی تھی کہ اب میں مستقلاً برما ہی میں ڈیرے ڈال دوں اور اسلحہ کو ہندوستان لانے کا کام طارق کے سپرد کردیا جائے۔ طارق اب تنظیم کا رکن بن چکا تھا۔ تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس وقت جب کہ انگریز کی تمام تر توجہ اور طاقت جنگ پر لگی ہوئی ہے، تنظیم کو پورے ہندوستان میں اپنی چھاپا مار سرگرمیوں میں اضافہ کردینا چاہیے۔

میں حکم کی تعمیل میں برما چلا گیا اور اپنا کام انجام دینے لگا۔ یہیں ۱۹۴۱ء کے اواخر میں میری ملاقات کریم غنی سے ہوئی۔ وہ ایک سچا مسلمان، پکا محبِ وطن اور پُرجوش انقلابی تھا۔ میں برما ہی میں مقیم تھا کہ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں جاپان مشرقِ بعید میں داخل ہوگیا۔ پرل ہاربر پر حملے سے لے کر برما پر چڑھتے سورج کا پھریرا لہرانے تک صرف چند ماہ کا عرصہ تھا۔ سنگاپور، ملایا اور برما میں لاکھوں فرنگی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انگریز فوجیں برما سے بڑی افراتفری میں بھاگیں۔ میں

ان دنوں منڈالے میں تھا۔ ایک دن کریم غنی میرے پاس آیا۔ برما کے حریت پسند رہنما کی حیثیت سے اس کی شخصیت جانی پہچانی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اسی نے مجھے سبھاش چندر بوس، کیپٹن شاہنواز، لیفٹیننٹ ڈھلوں اور کیپٹن عبدالرشید سے ملوایا۔ یہ لوگ برما اور ملایا میں ہندوستانی فوجیوں کی مدد سے آزاد ہند فوج قائم کررہے تھے اور اس کے لیے جاپانی جنرل سے بات ہوچکی تھی۔

اس دن برما میں قائم کیے جانے والے آزاد ہند ریڈیو سے آزاد ہند فوج اور حکومت کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس حکومت میں کریم غنی کو وزیرِ دفاع بنایا گیا۔ کریم غنی نے ایک خاص ارادے سے مجھے لیڈروں سے ملوایا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا "لو بھئی یہ ہیں ہمارے وزیرِ اطلاعات و نشریات!"

میں حیران ہی تو رہ گیا تھا اور پھر اس اعزاز سے نرمی کے ساتھ انکار کردیا تھا۔ اس سلسلے میں وطن پرست تنظیم میری سب سے بڑی مجبوری تھی۔ مجاہدِ اوّل کی اجازت کے بغیر میں کوئی عہدہ قبول نہیں کرسکتا تھا۔ یہی مجبوری میں نے اصرار کرنے پر ظاہر بھی کردی۔ اس کے ساتھ میں نے کہا "میری تمام ہمدردیاں اور خدمات آپ کے لیے وقف ہیں۔ میں آزاد ہند فوج کے ایک ادنیٰ اعزازی کارکن کی حیثیت سے ہر خدمت بجالاؤں گا۔"

اس دن میری تمام سرگرمیاں آزاد ہند ریڈیو کے پروگراموں کے لیے وقف ہوگئیں۔ آج بھی اگر آزاد ہند فوج کے کچھ لوگ زندہ ہیں تو انھیں اپنا ایک ننگا اور لنگڑا ساتھی ضرور یاد ہوگا جس کی آواز و الفاظ نے اس وقت ایک آگ لگادی تھی، ایک اودھم مچادیا تھا۔

جنگ کیوں کہ اب ہندوستان کی سرحدوں تک آپہنچی تھی اس لیے اپنی تنظیم سے میرا رابطہ بالکل منقطع ہوگیا تھا۔ تنظیم کے لیے سامانِ حرب کی فراہمی کا سلسلہ بھی معطل ہوگیا تھا۔

پھر ۱۹۴۵ء کا وہ منحوس دن آگیا جب جاپان پر ایٹم بم گرایا گیا۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ برما میں جاپانی فوج اسیر ہوئی اور انگریز فوج پھر فاتح ٹھہری۔ آزاد ہند فوج کے اراکین پکڑ لیے گئے۔ میں بہ مشکل تمام کریم غنی کے ساتھ فرار ہوکر سرابوم کی اس بستی میں پہنچا جو کہ مشن کی بستی تھی۔ وہاں قیام کے دوران میں ہمیں کچھ پتا نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے کیا نہیں! انگریز فوجیں پورے برما میں ان ہندوستانی فوجیوں کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں جنھوں نے جاپان کے تعاون سے

آزاد ہند فوج بنائی تھی۔

ہم ڈیڑھ سال تک سرابوم میں چھپے رہے۔ اس عرصے میں، میں نے بہت احتیاط کے ساتھ برما کی ایک تجارتی فرم کے لیٹر ہیڈ پر مجاہد اوّل کو نیشنل ٹریڈرز دہلی کی معرفت خط لکھا جس میں صرف اپنی خیریت کی اطلاع دی اور تازہ ہدایات طلب کیں پھر میں جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اڑتی ہوئی خبریں مل رہی تھیں کہ برطانیہ ہندوستان کو آزادی دینے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ بے چین و مضطرب کریم غنی سے صبر نہ ہوسکا اور وہ برما کی پُرشور سیاست میں حصہ لینے نکل گیا پھر میری اس سے ملاقات تقریباً بیس سال قبل کراچی میں ہوئی تھی۔ اسے برما کی حکومت نے جلاوطن کردیا تھا۔ یہ انقلابی شخص بعد میں برما کی اسمبلی کا رکن بنا' ڈاکٹر یوبا کا سیکریٹری رہا پھر برما کے مسلمانوں کے لیے مؤثر آواز اٹھانے کی پاداش میں جلاوطن ہوکر سنگاپور پہنچا۔ وہاں ایک مسئلے پر انگریز حکام نے اسے گرفتار کرایا۔ جیل میں اسے زہریلے ٹیکے لگائے گئے جس سے وہ تپ دق اور فالج کا مریض بن گیا۔ مرتا کھپتا کسی نہ کسی طرح وہ پاکستان آیا اور کراچی کے جناح اسپتال میں گمنامی کی موت مرگیا۔ آخر دم تک وہ ایک مجاہدانہ شان سے مسلمانانِ عالم کی خدمت کرتا رہا' نام و نمود اور صلے کی تمنا کیے بغیر! وہ موتمر العالم اسلامی کے ہفت روزہ مسلم ورلڈ کو مرتب کرتا رہا۔ جب وہ مرا تو اس کے قریب کوئی نہ تھا' سوائے موتمر کے ایک بوڑھے ملازم کے! مرنے سے پہلے اس کی صرف ایک خواہش تھی' وہ بھی پوری نہ ہوسکی کہ وہ کسی طرح برما جاکر اپنے بچوں سے مل لے۔ کراچی میں میری اس سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ آخری مرتبہ جب میں اس سے ملنے گیا تو پتا چلا' وہ اسپتال میں ہے' اسپتال گیا تو پتا چلا وہ مرگیا ہے۔ وہ ایسا ہی سیماب صفت آدمی تھا۔ اس کے ساتھ چلنے والے ہانپ جاتے تھے' وہ ہمیشہ ان سے آگے رہتا تھا۔

اپریل ۱۹۴۷ء کے اوائل میں مجھے اپنے خط کا جواب ملا۔ مجھے فوراً کلکتہ پہنچ کر جوگیندر سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی اور یہ نوید بھی دی گئی تھی کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے اور مسلمانوں کے مطالبے پر پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔ یہ جواب مجھے خالد کی طرف سے ملا تھا۔ تنظیم میں اس کی حیثیت میرے ہم پلہ ہی تھی۔ وہ بھی مجاہد اوّل کا نائب تھا مگر مجھ سے عمر میں بڑا' زیادہ تجربہ کار اور زیادہ سینیئر تھا۔ اسی شخص نے کراچی میں میرا امتحان لیا تھا۔ اسے میں بھول نہیں سکتا تھا۔

محسن کا باپ مجھے سرحد تک چھوڑنے آیا تھا۔ آگے اور

خون کے سمندر سے گزرتا ہوا اس کلکتے میں پہنچا جہاں ان دنوں انسانی لہو ارزاں تھا۔ آسام کی سرحدوں سے کلکتے تک میں نے ہر طرف ابلیس کو رقص کرتے دیکھا' ان انسانوں کو دیکھا جن کی آزادی کے لیے ہم جدوجہد کررہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کے دشمن' ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ انہیں اپنی وحشت میں نہ پھول جیسے بچوں پر پیار آتا تھا' نہ نازک سی کومل سی عورتوں اور دوشیزاؤں پر رحم آتا تھا' نہ بوڑھوں اور معذوروں پر وہ ترس کھاتے تھے۔ انسان اپنی تمام حسین خصوصیات کھو بیٹھا تھا۔ اب وہ ایک وحشی اور خوں خوار' سفاک اور بے رحم درندہ تھا۔ کاش کوئی ایسی بھی تنظیم ہو جو انسان کو اس کے وحشی روپ سے نجات دلانے کے لیے قائم ہو۔ کاش کوئی ایسی تنظیم قائم ہو کہ انسان کو درجہ انسانیت پر فائز کرسکے۔ میں یہی سوچتا اور خون کے آنسو روتا ہوا سفر کرتا رہا۔

میں عین اس دن کلکتے پہنچا جس دن تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا تھا۔ جوگیندر میرا منتظر تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ تقسیم ہند کے منصوبے کی خبر ہم دونوں نے ریڈیو پر سنی تھی اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے تھے اور مبارک باد بھی دی تھی۔ یہ بیک وقت یہ خوشی اور غم کا موقع تھا۔ خوشی اس بات کی کہ برصغیر کو انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات مل گئی تھی' غم اس بات کا کہ ایک ملک تقسیم ہوگیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی' بہت بڑی خوش خبری تھی' ایک ایسی منزل تھی جس تک پہنچنے کے لیے ہندوستان نے دو صدیوں کا سفر کیا تھا اور منزل پر پہنچنے والے آپس میں دست و گریباں تھے۔

"آزادی مل رہی ہے شاہین!" جوگیندر نے کہا "مگر یار یہ کیسی آزادی ہے کہ جی اندر ہی اندر رو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں شاہین' ہندوستان ہندوؤں کی اپنی تنگ دلی سے تقسیم ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی مکمل حکمرانی چاہتے ہیں۔ وہ اختیارات میں مسلمانوں کو حصہ نہیں دینا چاہتے۔ وہ ہندوستان کو انسانوں کا نہیں صرف ہندوؤں کا وطن بنانا چاہتے ہیں۔"

"آدمی جب مذہب کے نام پر انسان دشمنی کو اپنا مسلک بنالے تو ایسے ہی تنظیم ایسے جنم لیتے ہیں" میں نے کہا تھا۔

"مجاہد اوّل کا کہنا قطعی درست تھا۔ میں قدم قدم پر مایوس ہوا ہوں۔ تنظیم سے علیحدگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کوئی بھی انسانوں کے بارے میں انسانی بنیاد پر اور انسانی سطح پر سوچنے کے لیے تیار نہیں۔"

اچانک ہی مجھے سوشیلا کا خیال آگیا تھا اور جوگیندر سے پوچھا تھا "یہ میری بھابی سوشیلا کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں ہیں' میرے دل میں!" جوگیندر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا' پھر سر پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "اور یہاں میرے ذہن میں!"

"کیا مطلب؟" میں نے سہم کر پوچھا "کیا کہہ رہے ہو؟"

"تمہیں وہ رات یاد ہوگی جب مچھوا بازار میں تنظیم کے عارضی ہیڈ کوارٹرز پر چھاپا پڑا تھا؟" جوگیندر نے کہا "وہ چھاپا سوشیلا کی مخبری پر پڑا تھا۔ اس رات جب میں تمہارے ساتھ مجاہد اوّل کے کمرے میں گیا تو سوشیلا دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس روز کی ملاقات میں مجاہد اوّل سے تنظیم چھوڑنے کے متعلق بات کروں گا۔ دورانِ گفتگو میں جب اس نے مجاہد اوّل کا یہ جملہ سُنا کہ صبح میں ناشتا انہی کے ساتھ کروں اور یہ کہ تنظیم سے نکلنے کا موت کا سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے سمجھا کہ مجاہد اوّل نے صبح تک مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ یہ سُن کر فوراً ہی وہاں سے چلی گئی اور کسی نہ کسی طرح اس نے پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی۔ پولیس کے لیے وطن پرست تنظیم کا نام کافی تھا۔ سو وہ اسی لیے بڑی تعداد میں آئی تھی۔ اسے شدید مقابلے کا پہلے ہی سے احساس تھا۔ میں سوشیلا کی سہیلی کے گھر بالی گنج پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ چلی گئی تھی اور مجھ سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہہ گئی تھی" جوگیندر روتے غم انگیز لہجے میں کہتا رہا پھر وہ اچانک جیسے کہیں گم ہوگیا۔ خود ہی وہ تھوڑی دیر بعد چونک کر کہنے لگا "سوشیلا رات گئے واپس آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ مچھوا بازار سے مجھے زندہ نکلنے دیا جائے گا۔ اس نے اپنی سہیلی سے مل کر ایسا انتظام کیا تھا کہ میں نہ پکڑا جاؤں۔ اس کی سہیلی کے والد اس علاقے کے ڈی ایس پی تھے پھر باتوں ہی باتوں میں اس کی سہیلی نے مجھے بتایا کہ سوشیلا کیا قدم اٹھا چکی ہے! جب مجھے یہ پتا چلا تھا تو میں اندھا دھند وہاں سے مچھوا بازار پہنچا تھا' عین اسی وقت جب کہ پولیس چھاپا مار چکی تھی۔ اسے بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر وہی ہوا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا کیا تھا تم نے؟" میں نے تمام اندیشوں کے ساتھ پوچھا۔

"سوشیلا تنظیم کی مخبری کرنے والوں کے انجام سے

حقیقت میرے چھٹنے سے بدل سکتی تو میں آج تک مسلسل چیختا ہی رہتا "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا جوگیندر! سوشیلا نے جو کچھ کیا تھا، صرف تمہارے لیے کیا تھا۔"

"مجاہد اوّل نے کہا تھا۔" جوگیندر گلوگیر لہجے میں بولا "تنظیم میں داخل ہونے والے اپنی انفرادی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ایک بڑی مشین کے کل پرزے بن جاتے ہیں جو اس مشین کو متحرک رکھتے ہیں۔ پرزہ خراب ہو جاتا ہے تو اسے بدلنا ہی پڑتا ہے، سو میں نے ایسا ہی کیا۔ میری وجہ سے تنظیم سے سوشیلا بھی ایک حد تک وابستہ تھی۔ تنظیم کی باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود وہ کئی مہموں میں حصہ لے چکی تھی۔ میں نے تنظیم کا رکن بننے کے بعد جتنا عرصہ گزارا تھا، اس کا یہی تقاضا تھا کہ تنظیم سے غداری کرنے والا، اسے نقصان پہنچانے والا کوئی بھی ہو، اسے ختم کر دیا جائے۔"

"اور آج تک تم اس کی یاد دل میں بسائے بیٹھے ہو!" میں نے کہا اور ریڈیو پر رکھی ہوئی سوشیلا کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اس دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔" جوگیندر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

جوگیندر نے بتایا کہ ملک بھر میں فرقہ وارانہ خونی فسادات کے بعد تنظیم کے کارکنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے عزیزوں کے پاس چلے جائیں۔ اسے خالد نے اطلاع دی تھی کہ میں اس کے پاس پہنچنے والا ہوں لہٰذا وہ کلکتے میں میرا انتظار کرے۔ جوگیندر آخر میں بولا "اس دنیا میں اب تمہارے سوا میرا کوئی ایسا نہیں شاہین جسے میں موجودہ معنوں میں اپنا عزیز کہہ سکوں اس لیے میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

کلکتے سے میں نے اپنے تمام ہی عزیزوں اور دوستوں کو تار دیے تھے مگر پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ ڈاک، تار اور مواصلات کا نظام گڑبڑ تھا۔ میں نے پھر دہلی چلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ جوگیندر میرے ساتھ تھا۔

آگ، خون، آہوں، کراہوں، شور شغب، غیظ و غضب اور تباہی و بربادی کے نظارے دیکھتے ہوئے ہم ایک ہفتے کے بعد بہ مشکل تمام دہلی پہنچے، اجاڑ اور ویران دہلی میں! محبت اور اخوت کی وہ فضا جو دہلی کو دہلی بناتی تھی، اب اس کی جگہ خوف و دہشت نے لے لی تھی۔ میں قرول باغ گیا۔ جہاں میں پلا بڑھا تھا، اس گھر میں تالا پڑا ہوا تھا پھر میں اپنی ننھیال گیا تو حویلی ویران پڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ میری ننھیال والے لاہور چلے گئے ہیں کیوں کہ اب دہلی میں مسلمانوں کا رہنا محال ہو گیا ہے۔ ایک پڑوسی نے لاہور کا وہ پتا بھی بتایا جہاں ماموں وغیرہ گئے تھے۔ بڑے ماموں احتیاطاً پتا لکھ کر دے گئے تھے۔

"کیا دہلی کے سوا کہیں اور تمہارا کوئی قریب عزیز نہیں؟" جوگیندر جو میرے ساتھ تھا، اس نے پوچھا۔

اس پر مجھے اپنی خالہ جان کا خیال آگیا جو مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں پھر مجھے بھائی عطا اللہ خاں یاد آئے البتہ اپنے خالو جان خان بہادر ثناء اللہ خاں کے خیال سے کچھ کوفت محسوس ہوئی۔ ان سے میری آخری ملاقات نئی دہلی میں مسز سروجنی نائیڈو کے بنگلے پر ہوئی تھی۔

"تم کیا سوچنے لگے شاہین؟" جوگیندر نے مجھے ٹوکا۔

"علی گڑھ چلتے ہیں، وہاں میری سگی خالہ رہتی ہیں" میں نے جواب دیا۔

ہم اسی وقت ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ وہاں ہماری ملاقات اسٹیشن سے باہر آنے والے ایک آشنا شخص سے ہوئی۔ یہ لکھنؤ کی ایک سیاسی شخصیت ہری پرشاد تھا۔ جوگیندر اور میں لکھنؤ میں اسی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب فاطمہ کی گرفتاری کے بعد میں اور جوگیندر لکھنؤ گئے تھے۔ ہری پرشاد نے ہمیں اور ہم نے انہیں پہچان لیا۔

"آپ یہاں دہلی میں؟" میں بولا "وہ بھی ان حالات میں؟"

"دراصل میں گیا تو علی گڑھ تھا، اپنے عزیز دوست خان بہادر ثناء اللہ خاں سے ملنے! علی گڑھ میں ایسی خبر ملی کہ مجھے مجبوراً دہلی آنا پڑا۔"

ہری پرشاد سے اپنے خالو جان کا ذکر سن کر میں چونک اٹھا اور میں نے اسے مزید کریدا۔

"وہاں خان بہادر کی کوٹھی میں تالا پڑا ہے۔ وہاں کوئی نہیں ملا ہوا یہ کہ خان بہادر علی گڑھ میں نہیں تھے۔ ان کے پیچھے علی گڑھ میں فساد ہو گیا پھر جو بھگدڑ مچی تو بھابی صاحبہ میاں عطا اللہ اور صاحب زادی شگفتہ کو لے کر دوسرے عزیزوں کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو گئیں۔ خان بہادر علی گڑھ واپس پہنچے تو انہیں یہ علم ہوا پھر وہ بھی لاہور کے لیے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو ایک عزیز اور تھے" ہری پرشاد بتا رہا تھا "انہی عزیزوں میں سے ایک کی زبانی معلوم ہوا کہ دہلی سے قبل اس ٹرین پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا جس میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ زخمی ہونے والوں میں خان بہادر بھی شامل ہیں۔"

ہری پرشاد سے کچھ مزید کہے سنے بغیر ہم الٹے قدموں لوٹ لیے۔ علی گڑھ جانا اب لاحاصل ہی تھا۔ میرے خالو لاکھ خان بہادر سہی، تھے تو میرے سگے خالو ہی اور اس وقت مشکل میں تھے کیوں کہ خالہ جان اور بچے ان سے بچھڑ گئے تھے پھر یہ کہ وہ نہ معلوم کتنے زخمی تھے! انہیں میری مدد کی ضرورت ہو سکتی

جلد ہی ان کا سراغ مل گیا۔ اسپتال سے وہ دو دن بعد ہی جامع مسجد میں منتقل ہو گئے تھے جہاں دلی کے خاناں بہادر مسلمانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔

دلی ان دنوں فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ انسان نے انسانیت کو ننگا کر دیا تھا' اس کی حرمت و عزت کو پامال کر دیا تھا۔ میں اور جوگیندر وحشت و بربریت کے اس طوفان سے گزر کر جامع مسجد پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں ہمیں اپنا کچھ ہوش نہیں تھا۔ جوگیندر کے جسم پر ایسا لباس تھا کہ اسے کوئی ہندو کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا جامع مسجد میں ہم نے خان بہادر کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملنے تھے نہ ملے۔ اس دوران میں البتہ ان کے ایک عزیز سے ضرور ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ خان بہادر تین دن قبل جامع مسجد سے چلے گئے تھے کیوں کہ یہاں یہ خبر پہنچی تھی کہ جس گاڑی سے خالہ جان وغیرہ لاہور روانہ ہوئی تھیں' وہ امرتسر میں کاٹ دی گئی تھی۔ وہ شخص بتا رہا تھا "خان بہادر صاحب! اپنے بچوں کے لیے بہت پریشان تھے۔ ہم نے انہیں بہت روکا کہ وہ زخمی ہیں' ان کے زخم خطرناک ہیں' ابھی انہیں یہاں سے نہیں جانا چاہیے مگر وہ نہ مانے۔ وہ یہی کہتے تھے کہ میں نہیں رک سکتا۔ میرے سب بیٹے بچھڑ گئے ہیں۔ میں اپنی شگفتہ کو تلاش کروں گا' کہیں وہ بھی مجھ سے نہ چھن جائے۔"

یہ سن کر میری آنکھوں میں شوخ و شریر شگفتہ کا حسین سراپا گھوم گیا۔ میری خالہ جان اس سے میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہو گی؟ خالہ جان کیسی ہوں گی؟ بھائی عطاءاللہ بھی خیریت سے ہوں گے یا نہیں؟ یہ سب کچھ سوچ کر میرے دل کو دھکا سا لگا اور خالو جان کی بے بسی پر بھی ترس آیا کہ وہ سب سے بچھڑ گئے تھے۔

وہ شخص مزید بتا رہا تھا "خان بہادر کے سر میں شدید زخم آئے ہیں جس کی وجہ سے ان کا ذہنی توازن بھی کچھ خراب ہو گیا ہے۔ کبھی تو وہ ہوش مندوں کی طرح باتیں کرتے ہیں' کبھی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے اور نہ معلوم کیا کیا باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

وقت نے کیا کیا کروٹیں لی تھیں! وہ خان بہادر جنہیں اپنے بیٹے اور بیٹی سے زیادہ اپنی خان بہادری عزیز تھی' لاٹ بہادر کے راج کا خاتمہ ہوتے ہی پھر اپنوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ آج پھر انہیں اپنا بیٹا اور بیٹی یاد آ رہے تھے۔ وہ خان بہادر جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے' اپنی بیٹی کی تلاش میں آج ایک عام آدمی کی طرح محض ایک باپ بن کر خاک چھانتے پھر رہے تھے۔

دلی کے فسادات اتنے شدید تھے کہ ہم بس جامع مسجد میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک ماہ وہاں محصور رہنے کے بعد میں نے اور جوگیندر نے وہاں سے ہر قیمت پر نکلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں اس بارے میں جوگیندر کو سب کچھ بتا چکا تھا کیوں کہ اب اس رازداری کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب جوگیندر کی سمجھ میں یہ معما آ گیا تھا کہ اس کی بہن فاطمہ کے ہونٹوں پر مرتے دم "میرے دیوتا طارنوش" کیوں تھا۔

ہم کس طرح دلی سے نکلے اور کس طرح مختلف سواریاں بدلتے ہوئے اٹاری پہنچے یہ ایک الگ دل خراش داستان ہے۔ آخری سفر ہم نے ایک بیل گاڑی میں کیا۔ کئی جگہ ہماری بیل گاڑی کو آگے بڑھنے کے لیے لاشوں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سفر کتنا ہول ناک رہا ہو گا اور انسان نے انسان پر کتنے مظالم کیے ہوں گے!

کیسا عجیب اتفاق تھا کہ میں نے اپنی انقلابی زندگی کا پہلا سفر تقریباً ربع صدی قبل بیل گاڑی میں کیا تھا اور اپنی انقلابی زندگی کا اختتامی سفر بھی بیل گاڑی ہی میں کیا۔

کتنا عجیب سفر تھا' چلے تو دوپہر تھی' منزل پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی' سورج غروب ہو رہا تھا۔

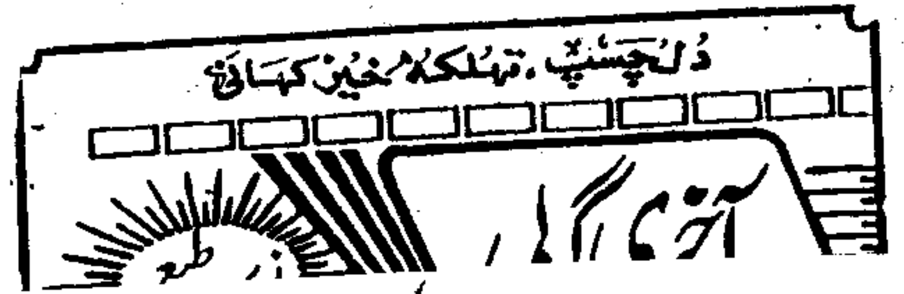
اس طوفانی سفر کا آغاز ہم نے "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کی پرسوز لے کے سائے میں کیا اور یہ سفر "لے کے رہیں گے پاکستان' بٹ کے رہے گا ہندوستان" کی رزمیہ دھن کی تعبیر کے موقع پر اختتام کو پہنچا تھا۔ ہم پچیس برس پہلے اپنے بدترین سامراجی دشمن اور نو آبادیاتی آقا پر ضرب کاری کا عزم جواں لے کر نکلے تھے اور منزل پر پہنچے تو آزادی کے زخموں سے چور تھے۔ ہم نے جوانی کی دوپہر میں کوچ کیا تھا اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے تو منزل آئی تھی۔

ربع صدی کا یہ سفر ہم مڑ کر دیکھتے تو کل ہی کی بات لگتی تھی۔

اٹاری پنجاب کا وہ علاقہ تھا جو تقسیم ہند کے منصوبے کے مطابق پاکستان میں شامل ہونے والا تھا مگر بعد میں ایسا نہیں ہوا بہرحال اس وقت لاہور' امرتسر ریلوے لائن پر یہ گویا پہلا پاکستانی ریلوے اسٹیشن تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہندوستان کی طرف سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجروں کے لیے پاکستان میں مہینوں تک پہلا پڑاؤ بنا رہا۔

یہ چودہ اگست کا دن تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اسٹیشن کے آس پاس میدان میں آزادی کے خون ریز سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ کر آنے والے شکستہ حال



خودرو جھاڑیوں کے بجائے انسان نکل پڑے ہیں۔

ہم نے اپنی بیل گاڑی اسٹیشن کے پاس ہی دیوار کے ساتھ روک دی۔ راستے میں ہم نے ایک مختصر سے خاندان کو جو میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل تھا' اپنی گاڑی میں بٹھالیا تھا۔ اسے ہم بیل گاڑی کے پاس ہی چھوڑ کر خانماں برباودں کی اس عارضی بستی کا چکر لگانے کے لیے نکل پڑے۔ وہ سب شکستہ حال تھے' خاک بہ سر تھے' زخم زخم تھے' اپنے اندر بھی اور باہر بھی! انہوں نے آزادی کی بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ ان سے مطالبہ پاکستان کی بڑی بھاری قیمت لی گئی تھی۔ جان' مال' عزت' آبرو' سبھی کچھ ان سے چھین لیا گیا تھا پھر بھی وہ خوش تھے کہ سب کچھ لٹا کر پاک سرزمین پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں بے حد جوش و خروش تھا کیوں کہ اس رات قیام پاکستان کا باضابطہ اعلان ہونے والا تھا "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگ رہے تھے۔

"ان کا جرم کیا ہے طارنوش؟" جوگیندر مجھ سے مخاطب ہوا "صرف یہی نا کہ انہوں نے بھی اپنی آزادی طلب کی تھی لیکن ان لوگوں نے جو صدیوں سے ان کے ساتھ تھے' جو خود آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے' ان لوگوں سے وہی سلوک کیا جو انگریز دو سو برس سے ہندوستان کے عوام کے ساتھ کرتا آرہا تھا۔ مجھے بتاؤ طارنوش' لوگ اصولوں کو اتنا توڑتے موڑتے کیوں ہیں؟ مجھے بتاؤ کہ وہ جو غالب ہوتے ہیں' طاقت ور ہوتے ہیں' اتنے تنگ دل کیوں ہو جاتے ہیں؟"

میں جوگیندر کی بات کا کیا جواب دیتا' خاموش رہا۔

رات گیارہ بجے ہی سے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑا ہجوم تھا۔ اسٹیشن ماسٹر اپنا ریڈیو نکال لایا تھا اور سب لوگ قیام پاکستان کا اعلان سننے کے لیے بے چین تھے۔

میں اور جوگیندر بھی اسی بھیڑ میں شامل تھے۔ ہمارے ساتھ ہی ایک خستہ حال اور نحیف بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار ہمارے درمیان سے ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ اعلان ہوا۔

لوگوں میں بے پایاں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ من چلوں نے خوشی کے اس موقعے کو شایانِ شان طریقے پر منانے کے لیے پٹاخوں کا انتظام کیا تھا۔

پھر لوگوں نے رقص شروع کیا اور اس دوران میں ہجوم جو پیچھے ہٹا تو ہم دور تک اس کے ریلے میں بہ گئے۔ اسی درمیان ایک انسانی چیخ ابھری' پھر وہ چیخ کئی چیخوں میں بدل گئی۔

میں اور جوگیندر تیزی سے ادھر لپکے۔ یہ وہی بوڑھا تھا جو ہجوم کے مسرت سے بے قابو ہو جانے کی وجہ سے لڑکھڑا کر گرا تھا اور لوگوں کے قدموں میں روندا گیا تھا۔

لوگوں کو ہٹاتے ہوئے ہم اس کے پاس پہنچے۔ اس کے سر پر پٹیوں سے خون بہنے لگا تھا۔ ہم اسے اٹھا کر پلیٹ فارم کے ایک کونے پر لے آئے۔

بوڑھا نیم بے ہوش تھا۔ اس کے سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی بغل میں ایک گٹھری دبی ہوئی تھی۔ ہم نے وہ گٹھری لینا چاہی تو اس نے ہمیں جھڑک دیا "نہیں' یہ نہیں لو!"

یہ آواز میرے لیے ایک مانوس آواز تھی۔ یہ آواز میرے خالو جان خان بہادر ثناء اللہ خاں کی آواز تھی جنہیں میں ان کے بڑھاپے اور چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے نہیں پہچان سکا تھا۔ میں کوئی بیس سال بعد انہیں دیکھ رہا تھا۔

"خالو جان!" میں نے کہا "میں ہوں طارنوش۔"

"طارنوش!" خان بہادر ثناء اللہ خاں بولے "طارنوش میرے بیٹے! تو کہاں تھا؟۔۔۔ شگفتہ' میری شگفتہ! میرا عطاء اللہ!" یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئے۔

"کیا یہ تمہارے خالو جان ہیں؟" جوگیندر نے کہا "جن کے لیے ہم علی گڑھ جا رہے تھے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں خالو جان پھر کراہ اٹھے "طارنوش! میں نے معلوم کیا تھا۔ ابھی اس اسٹیشن سے یونین جیک اتار کر سبز ہلالی پرچم لہرایا جائے گا۔ میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مجھے ان کی زبان سے یہ بات سُن کر حیرت تو ہوئی مگر کچھ بولا نہیں۔ ہم انہیں اٹھا کر ایسی جگہ لے آئے جہاں سے اٹاری اسٹیشن کی چھت پر لہراتا ہوا یونین جیک نظر آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی آہستہ آہستہ یونین جیک نیچے کھسکا چلا آیا۔ میں نے غور سے خالو جان کے چہرے کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی تھی۔ ان پر سخت نقاہت طاری تھی لیکن شاید وہ اپنی تمام قوت مجتمع کر کے خود کو ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے پھر یونین جیک کی جگہ سبز ہلالی پرچم بلند ہوا اور لہرانے لگا۔

"پاکستان!" ایک صدا گونجی۔ "زندہ باد!" جواب آیا۔

زندہ باد کے اس پُرزور جواب میں میرے خالو جان کی

ت آواز بھی شامل تھی۔

ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں! مہاجروں کے اس عارضی کیمپ میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ ہم خالو جان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے' سوائے یہ کہ ہم ان کے پاس بیٹھے رہیں۔ عجیب بے بسی تھی!

رات کے پچھلے پہر خالو جان کو تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا اور وہ مجھ سے بولے "طارزوش بیٹا! تمہارا بھائی عطااللہ خان ابھی لاہور نہیں پہنچا۔ ایک عزیز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ابھی ہندوستان میں ہے۔ تمہاری خالہ جان اور شگفتہ بھی ابھی وہیں ہیں۔"

"میں انہیں تلاش کروں گا' ہندوستان میں۔ وہ سب آپ کے پاس پہنچ جائیں گے" جوگیندر بول اٹھا۔

"یہ میرا دوست جوگیندر ہے' خالو جان!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانتا ہوں' سیٹھ موہن لال کا بیٹا جوگیندر! موہن لال ہمارے ہی قصبے جلالی کا تو تھا' علی گڑھ کا قصبہ جلالی! وہ بھی میرا بڑا گہرا اور عظیم دوست تھا۔" خان بہادر ثناء اللہ خان نے اٹک اٹک کر کہا "تم دونوں یوں ہی میرے پاس بیٹھے رہو۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ دیر تک ہمیں دیکھتے رہے۔ ہمارے ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھے پھر ہمارے ہاتھوں پر ان کی گرفت مضبوط ہوئی۔

"خدا حافظ!" ان کے منہ سے نکلا اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

صبح ان کی تدفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں' ہم پر ایک اور انکشاف ہوا۔

خان بہادر ثناء اللہ خان کے دائیں بازو پر ہماری تنظیم کے بہت سے اراکین کے نام گدے ہوئے تھے۔ جوگیندر نے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا' ان ناموں کے نیچے زخم کا ایک سیاہ نشان تھا۔

میں نے تیزی سے ان کی قمیص ہٹا کر ان کا سینہ دیکھا۔ ان کے سینے پر فاطمہ کا نام گدا ہوا تھا۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی یتیم ہو گیا ہوں۔

پھر میں اور جوگیندر پہلی مرتبہ خان بہادر کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے اس لیے کہ وہ ہمارا مجاہد اوّل بھی تھا۔

اگلے روز شام ڈھلے میں' جوگیندر کو رخصت کر رہا تھا جو واپس ہندوستان جا رہا تھا۔

اختتام



